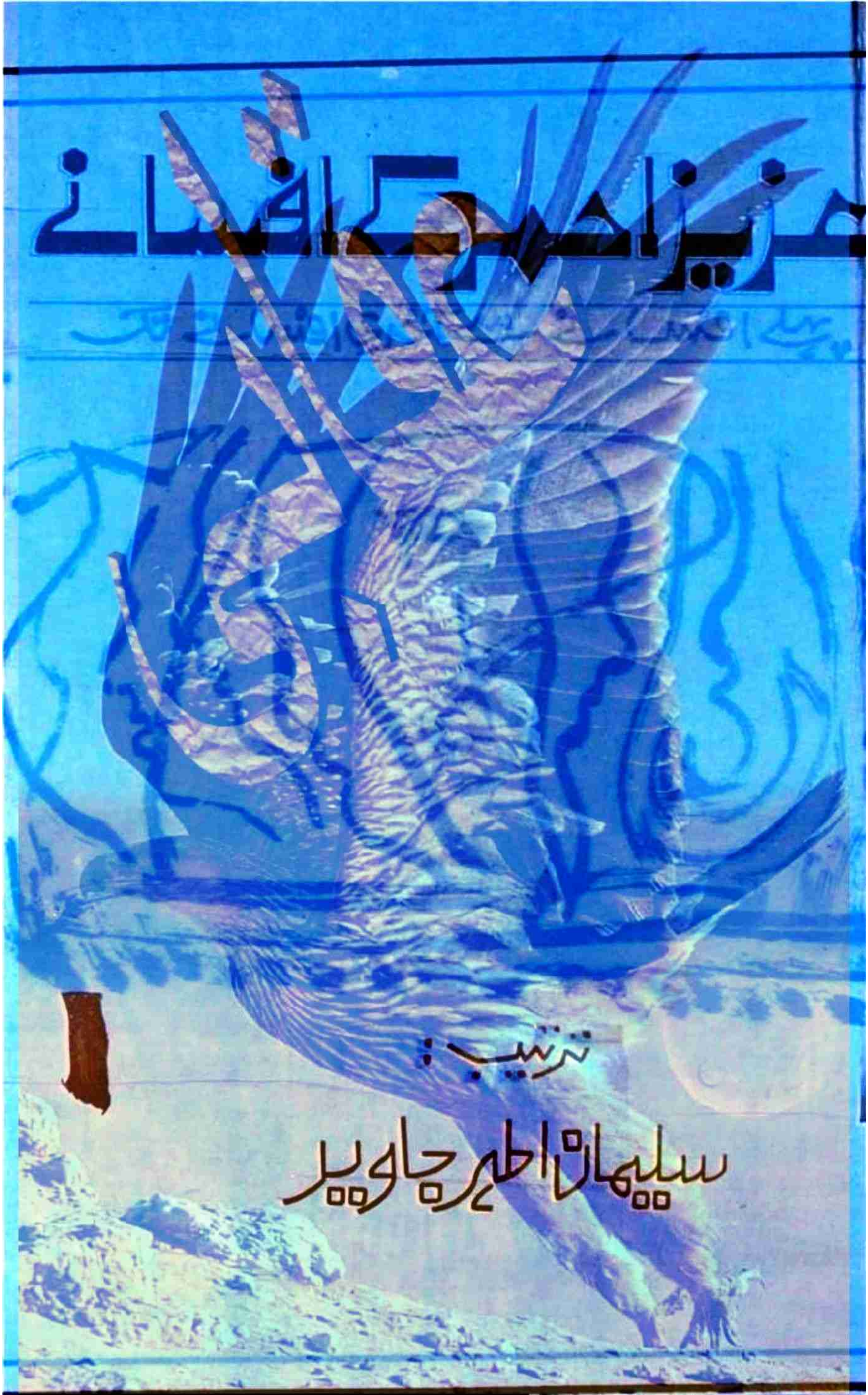
عزیز احمد کے افسانے



ترتیب:

سلیمان اطہر جاوید

عزیز احمد کے افسانے

پہلے افسانے سے آخری افسانے تک

ترتیب:

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید

موڈرن پبلشنگ ہاؤس

۹ گولا مارکیٹ - دریا گنج

نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

اشاعت : ۱۹۹۶ء
قیمت : تین سو پچاس روپے
کتابت : سجّاد علی خاں
سرورق : رزّاق ارشد

زیر اہتمام :
پریم گوپال متّل

ناشر :
موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

عزیز احمد کے شہر **حیدرآباد** کے نام

سلیمان اطہر جاوید کی کتابیں

۱۔ رشید احمد صدیقی: شخصیت اور فن (دوسرا ایڈیشن)
۲۔ اسلوب اور انتقاد
۳۔ تنقیدِ شعر
۴۔ ادب میں ابہام اور اس کے مسائل
۵۔ تنقیدی افکار
۶۔ چہرہ چہرہ داستان
۷۔ تاریخ تلگو ادب اور فنونِ لطیفہ
۸۔ مکاتیبِ رشید احمد صدیقی
۹۔ اُردو شاعری میں اشاریت
۱۰۔ عزیز احمد کی ناول نگاری
۱۱۔ رشید احمد صدیقی۔ (ساہتیہ اکیڈمی ایڈیشن)
۱۲۔ تنقید اور تہذیب
۱۳۔ اقبال: ماورائے دیر و حرم
۱۴۔ غالب کے نمائندہ نقاد

ترتیب

عزیز احمد کے بارے میں

پیدائش: ۱۱ر نومبر ۱۹۱۴ء، بارہ بنکی، اُترپردیش

تعلیم: والد بشیر احمد، پیشۂ وکالت کے سلسلے میں حیدرآباد میں بس گئے تھے۔ عزیز احمد کی تعلیم حیدرآباد میں ہوئی۔ ۱۹۳۴ء میں جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے کیا اور ریاست حیدرآباد کے وظیفہ پر اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن روانہ ہوئے۔

ملازمت: ۱۹۳۸ء میں لندن سے واپس ہونے پر جامعہ عثمانیہ میں انگریزی کے ریڈر مقرر ہوئے دو سال بعد آصفِ سابع نظام حیدرآباد کی بہو، شہزادی دُرِّ شہوار کے سکریٹری مقرر ہوئے اور چار سال تک خانوادۂ شاہی سے منسلک رہے۔ ۱۹۴۶ء میں پھر یونی ورسٹی آ گئے۔ تقسیمِ ہند کے بعد پاکستان کا رُخ کیا اور ۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۸ء حکومتِ پاکستان کے مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ زیادہ عرصہ تک فلم اور مطبوعات کے محکمہ کے ڈائرکٹر رہے۔ ۱۹۵۸ء میں اسکول آف اورینٹل اور افریکن اسٹڈیز لندن میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۰ء میں ٹورنٹو یونی ورسٹی کنیڈا میں شعبۂ اسلامیات میں تقرر ہوا اور آخر تک وہیں رہے۔ (۱۹۷۶ء میں قائد اعظم لکچرز کے لیے آخری بار پاکستان آئے۔)

وفات: ۱۶ر دسمبر ۱۹۷۸ء کو کنیڈا میں بعارضہ کینسر

تصانیف: ناول :- مرمر اور خون
ہوس
گریز
آگ
ایسی بلندی ایسی پستی
شبنم

ناولٹ : تیری دلبری کا بھرم
جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں

افسانوں کے مجموعے : بیکار دن بیکار راتیں (دسمبر ۱۹۵۰ء)

رقصِ ناتمام

تنقید: ترقی پسند ادب

اقبال نئی تشکیل

اقبال اور پاکستانی ادب

ترجمے: دانتے: طربیہ خداوندی

ابسن: معمارِ اعظم

ارسطو: فنِ شاعری

شکسپئیر: رومیو جیولٹ

گارساں دتاسی: خطبات، مقالات

ہیرالڈلیم: تیمور

چنگیز

تاتاریوں کی یلغار

شاعری: ماہِ لقا اور دوسری نظمیں (۱۹۴۳ء)

"سینو رینا نے کہا

سیاسیات: نسل اور سلطنت

انتخابِ نظم: انتخابِ جدید

اسلامیات:

1. STUDIES OF ISLAMIC CULTURE IN THE INDIAN ENVIRONMENT 1964
2. ISLAMIC MODERNISM IN INDIA AND PAKISTAN — 1967
3. RELIGION AND SOCIETY IN PAKISTAN — 1971
4. A HISTORY OF ISLAMIC SOCIETY — 1976

عزیز احمد کے ناولوں، افسانوں اور دیگر تحریروں کے دوسری کئی زبانوں میں ترجمے ہوئے جن میں قابلِ ذکر اُن کے ناول "ایسی بلندی ایسی پستی" کا ترجمہ ہے جو ڈاکٹر رالف رسل نے "The Shore & the Wave" کے بعنوان کیا جس کی اشاعت ۱۹۷۱ء میں لندن سے عمل میں آئی۔

"

پیش لفظ

عزیز احمد ممتاز ناول نگار ہی نہیں مایۂ ناز افسانہ نگار بھی ہیں۔ عزیز احمد کی ناول نگاری پر لکھنے کے دوران اُن کی اور تحریروں بالخصوص افسانہ نگاری سے بھی دلچسپی پیدا ہوئی۔ اُن کے کئی افسانوں کو ایک سے زیادہ مرتبہ پڑھنے کا موقع ہوا۔ بعض احباب نے خواہش کی کہ عزیز احمد کی افسانہ نگاری پر بھی لکھا جائے۔ خصوصاً پاکستان سے بعض دوستوں نے نہ صرف شدید طور پر اصرار کیا بلکہ پاکستانی جرائد میں شائع شدہ عزیز احمد کے افسانوں کی زیراکس کاپیاں مہیا کردیں۔ محترم ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی عرصہ ہوا عزیز احمد کی افسانہ نگاری پر مقالہ کی فرمائش کی تھی۔ برادرم پریم گوپال مِتّل صاحب سے تذکرہ ہوا تو انھوں نے عزیز احمد کے افسانوں کا انتخاب شائع کرنے پر فوراً آمادگی ظاہر کردی، اور طے پایا کہ میں (۹) افسانے منتخب کرکے اپنے مقدمہ کے ساتھ انھیں دے دوں۔ یہ کام تقریباً مکمل کرلیا کہ پریم صاحب کہنے لگے کیوں نہ عزیز احمد کے سارے افسانوں کا مجموعہ شائع کردیا جائے اور پھر اُن کا تقاضہ بڑھتا گیا۔ اس طرح مجھے عزیز احمد کے افسانوں کا ایک اور مرتبہ مطالعہ کرنا پڑا اور اُن کے افسانوں کے حصول کے لیے تگ و دو ــــ عزیز احمد کے افسانوں کے صرف دو مجموعے شائع ہوتے ہیں اور اِدھر کئی افسانے بکھرے پڑے ہیں، بہرکیف مَیں نے انھیں یکجا کیے۔ خود پریم گوپال مِتّل صاحب نے دوڑ دھوپ کی اور بعض افسانے

فراہم کیے۔ افسانوں کے حصول کے سلسلے میں، میں مشہور افسانہ نگار محترمہ جیلانی بانو کا بھی شکرگزار ہوتا ہے جن کی وجہ سے چند افسانے ملے۔ جناب ابوسعادت جلیلی (پاکستان) نے بعض افسانوں کی زیراکس کاپیاں ارسال فرمائیں اور ڈاکٹر افضال الدین اقبال نے بھی دو افسانوں کی زیراکس کاپیوں سے شاد کیا۔ میں ان دونوں کا بھی ممنون ہوں۔

پریم گوپال متل صاحب سے میرے جو مراسم ہیں اُن کی روشنی میں شکریہ سے بات نہیں بنے گی۔ اُن کے تعلق سے میرے جو احساسات ہیں اُن کا اظہار بھی ممکن نہیں۔ مختصر یہ ہے کہ اُن کی دلچسپی نہیں ہوتی تو عزیز احمد کے افسانوں کا یہ مجموعہ شائع ہی نہیں ہوتا ـــــ ہاں میں آپ سب قارئین کی طرف سے پریم گوپال متل صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

سلیمان اطہر جاوید

شعبۂ اُردو،
ایس۔ وی۔ یونی ورسٹی
تروپتی۔ ۵۱۷۵۰۲ (آندھرا پردیش)

سلیمان اطہر جاوید

عزیز احمد کی افسانہ نگاری

اُردو فکشن کی تنقید نے عزیز احمد سے انصاف نہیں کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ خود عزیز احمد اُردو فکشن کے تعلق سے اپنا حق ادا نہیں کر پائے۔ عزیز احمد نے اور جو بھی لکھا ہو، اُردو فکشن کو اُن کی دین ہے۔ عزیز احمد نے اس وقت لکھا جب کہ ایک خاص زاویۂ نظر عام تھا اور عام ہوتا جا رہا تھا، تاہم وہ اس رَو میں بہہ نہیں گئے۔ انھوں نے تنقید کی۔ اس زاویۂ نظر کے معائب اور محاسن کو واضح کیا اور خود اپنے انداز سے لکھا۔ خاص طور پر ناول اور افسانے ـــــ انھوں نے ایسی کوئی راہ نہ نکالی ہو لیکن آج بھی اُن کا انداز، اُن کا اپنا انداز ہے اور اُردو ناول اور افسانہ، آج ترقی کی خواہ کتنی ہی بلندیوں پر پہنچ گئے ہوں عزیز احمد کا فن آج بھی متوجہ کرتا اور اپنی انفرادی اور امتیازی حیثیت کا لوہا منواتا ہے!

عزیز احمد نے کچھ ایسے زیادہ افسانے نہیں لکھے۔ اُن کے افسانوں کے صرف دو مجموعے شائع ہوئے "بیکار دن بیکار راتیں" اور "رقصِ ناتمام" ـــــ پہلے میں سات اور دوسرے میں گیارہ افسانے ہیں۔ و نیز ادبی جراید سے، جن میں پاکستانی جراید لایقِ ذکر ہیں؛ مجھے بعض احباب کے تعاون سے دس افسانے دستیاب ہو سکے اور یہی ہے عزیز احمد کے افسانوں کا سرمایہ! میرے نزدیک افسانوں کی یہ کچھ زیادہ تعداد نہیں لیکن کمیت میں

زیادہ نہ ہونے کے باوجود عزیز احمد کے افسانے کیفیت کے اعتبار سے اُردو فکشن کا ایک وقیع حصہ ہیں۔

اشاریتی افسانے، پلاٹ لس افسانے، اینٹی افسانے اور نہ جانے کیا اور کیسے عجیب و غریب افسانے اس دَوران لکھے گئے اور اب بھی لکھے جا رہے ہیں۔ اس سے قبل بھی جو افسانے لکھے گئے ہوں، عزیز احمد کے افسانوں کا رنگ اُن سے بھی جُدا تھا اور جہاں تک روایتی افسانوں کا تعلق ہے عزیز احمد نے تو ایسے افسانے لکھے ہی نہیں۔ سچ پوچھئے تو عزیز احمد نے اپنے ہم عصر افسانے سے ایک نوع کی بغاوت کی۔ بڑی مہذب، شُستہ اور شائستہ بغاوت، جس کا مقصد روایات کو تہس نہس کرنا نہیں بلکہ روایات کا احترام برقرار رکھنا، عصری معاشرت کے پس منظر کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دینا اور عصری علوم اور عصری میلانات سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی راہ نکالنا تھا۔

عزیز احمد کا مطالعہ بغایت وسیع تھا۔ کتابی مطالعہ بھی اور زندگی اور زمانے کا مطالعہ بھی ــــــ انھیں حالات بھی کچھ ایسے ملے۔ تعلیمی وظیفہ پر وہ یورپ جا کر واپس ہوئے ہی تھے کہ جامعہ عثمانیہ میں انگریزی کی ریڈرشپ ملی۔ یورپ میں انھوں نے مغرب کو دیکھا ہو لیکن من بعد ریاست حیدرآباد کے نظامِ ہفتم کی بہو شہزادی دُرِ شہوار کے معتمد کی حیثیت سے شاہی خاندان اور امراء و رؤساء کے ساتھ رہنا اور اِدھر اندرونِ ملک مسوری اور کشمیر وغیرہ جانا اور بیرونِ ملک یورپ کی سیاحت اُن کا معمول بن گیا۔ انگریزی کا اُستاد ہونا یوں کام آیا کہ انگریزی اور انگریزی کے توسط سے دیگر مغربی زبانوں کے شعر و ادب اور فکر و فلسفہ سے آگہی ہوئی اور مغرب کی سیاحت سے وہاں کی معاشرت کو اپنے طور پر دیکھنے برتنے اور اس کے بارے میں نتائج اخذ کرنے کے مواقع ملے۔ مغرب کے علوم کی تازہ لہروں سے اُن کو مسلسل واقفیت ہوتی رہی۔ وہاں کے لوگوں سے ملنے ملانے اور اُن سے مراسم کی وجہ سے وہ مغرب کی زندگی کی تصویروں کو اُن کے حقیقی پیچ و خم کے ساتھ اور اُن کے صحیح تناظر میں دیکھ پائے۔ چنانچہ اپنے ہم عصروں میں عزیز احمد کے ہاں مغرب کی زندگی جس قدر زیادہ، بھرپور اور چلتی پھرتی ملتی ہے وہ کسی اور کے یہاں نہیں۔ عزیز احمد کا مغرب کے ادب، وہاں کی معاشرت،

سیاست اور ثقافت کا مطالعہ گہرائی اور گیرائی کا حامل تھا اُن کے بہت کم افسانے ایسے ہیں جہاں مغرب کی جھلک نہ ملتی ہو۔ ٹھیٹ مشرقی ماحول کے افسانوں میں بھی وہ مغربی طرزِ زندگی کو ہلکے پھلکے انداز ہی میں سہی کہیں نہ کہیں ضرور لے آتے ہیں، مغرب کے تھوڑے بہت تذکرہ کا جواز وہ نکال ہی لیتے ہیں اور ایسے تو اُن کے کئی افسانے ہیں جن کی فضا یکسر مغربی ہے، کردار، مناظر، واقعات وغیرہ وغیرہ ــــ بس ہیرو کی حیثیت سے عزیز احمد (میں یا آزاد) ہوں گے اور سب کچھ مغرب! ــــ اُن کے مجموعہ "بیکار دن بیکار راتیں" میں ایسے افسانے کم ہیں۔ وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ اس وقت تک اُن کو یورپ کی سیاحت کا موقع کم ملا۔ "رقصِ ناتمام" میں ایسے افسانے زیادہ ہیں۔ "موشکا"۔ "رائیگاں تبسم" ــــ "رومۃ الکبریٰ کی ایک شام" اور "خطرناک پگڈنڈی" ــــ اور دیگر افسانوں میں "دیا سلائی کی اہمیت" وغیرہ۔

عزیز احمد کا مغرب کی تاریخ، سیاست، معاشرت اور وہاں کی روزمرہ کی زندگی کا مطالعہ خاصی گہرائی کا حامل اور تجزیاتی انداز لیے ہوتا ہے۔ وہ کبھی تو چلتے چلاتے اور کبھی باریک بینی کے ساتھ ان چیزوں کا تذکرہ کرتے ہیں کہ مغرب کی زندگی کے مختلف پہلو، خوبیاں اور خرابیاں ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ افسانہ "خطرناک پگڈنڈی" میں برِاعظم یورپ کی سیاست پر تبصرہ کس قدر بلیغ ہے:

> "روس اور جرمنی کے پویلین آمنے سامنے تھے۔ روس کے پویلین پر ایک مرد اور ایک عورت کے شاندار مجسمے، ہتھوڑا اور درانتی لیے ہوئے گویا جرمنی سے مقابلہ کرنے کے لیے بڑھ رہے تھے۔ اُدھر جرمنی پویلین کا عقاب ایک شانِ استغنا سے پر پھیلائے گردن موڑے، نازی سواستکا کو پنجوں میں لیے ہوئے روسی ہتھوڑے اور درانتی کا جواب بے پروائی اور بے نیازی سے دے رہا تھا۔"

اور یہاں دیکھیے "رومۃ الکبریٰ کی ایک شام" میں سیاسی انقلابات پر وہ کتنی گہرائی سے بات کرتے ہیں:

"رہ گئے عوام ۔ نہ فاشسٹی انقلاب اُن کا تھا نہ کوئی اور انقلاب
اُن کا ہوگا"

اور جب مجسمہ سازی کی بات آتی ہے تو گویا وہ مجسمہ کی رُوح میں اُترتے ہیں اور پوری فن کارانہ بصیرت کے ساتھ مجسمہ کا "مطالعہ" ہوتا ہے کہ کوئی عجب نہیں مجسمہ ساز کی رُوح بھی وجد کرنے لگتی ہو۔ افسانہ وہی "روما الکبریٰ کی ایک شام" ہے اور تذکرہ ہے میکیل آنجلو کے بنائے ہوئے حضرت موسیٰ کے مجسمہ کا۔ یہ عزیز احمد کی تاریخی بصیرت ہے جو اُن کے قلم سے صفحۂ قرطاس پر پھیل جاتی ہے، ملاحظہ ہو:

"راستے میں کلیسائے 'سان پیتروان ونکولی' میں میکیل آنجلو کا بنایا ہوا مجسمہ دیکھنے ٹھہر گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس مجسمے کا شکوہ، اس کا جلال ہی دیکھنے والے کو ختم کردے گا۔ داڑھی کے مرمریں بال کئی سانپوں کی طرح بل کھاتے ہوئے ناف تک پہنچتے تھے، آنکھوں میں پیغمبرانہ جلال تھا۔ میکیل آنجلو کے تمام مجسموں کی طرح اعصاب میں مردانہ حُسن تھا۔ سَر کے بال اُلجھے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا ہزاروں سال پہلے کی عبرانی شاعری نے سنگین لباس پہن لیا ہے۔ یہ مجسمہ تھا یا عبرانیت مجسّم تھی"

مغربی ادب سے عزیز احمد کی بے اندازہ واقفیت کی ایک ہلکی سی جھلک دلکش انداز میں —— افسانہ ہے "جھوٹا خواب" ——

"جب وہ برآمد ہوئی تو گہرے چاکلیٹ کے رنگ کا چینی تراش کا فراک پہنے تھی۔ مجھے جیسی توقع تھی وہ کچھ ایسے ہی تھی یعنی پرل بک کے ناولوں کے امریکی فلموں میں لوئی رائز اور کیتھرن ہیپ برن کے ایک عجیب امتزاج کا نمونہ"

عزیز احمد کے یہاں جنس نگاری پر میں آگے چل کر گفتگو کروں گا لیکن اس موقع پر صرف اتنا عرض کروں گا کہ مختلف ممالک کے نسوانی حُسن کا اُن کا مطالعہ اور مشاہدہ بھی خاصا دلچسپ ہے۔ پیرس کی ایک نمائش کا ذکر ہے۔ یہاں وہ مختلف ممالک کی لڑکیوں کا نظارہ

کرتے ہیں۔ کہیں اُن لڑکیوں کے ممالک کی ثقافت اور تہذیب کی روشنی میں کہیں سیاست کے پس منظر میں، کہیں اُن کے علاقائی حُسن کے زاویہ سے۔ غرض بڑے متنوّع انداز میں۔ ملاحظہ ہو:

"اس نمائش میں اُس نے ہر پویلین میں، راستوں میں، نمائش کی عجیب و غریب گاڑی میں، نمائش گاہ کی ہوٹلوں، قہوہ خانوں میں ایسی ایسی عجیب و غریب حسن و جمال والی لڑکیاں دیکھیں کہ اُس نے آج تک کبھی اس طرح یکجا نہیں دیکھی تھیں۔ امریکن لڑکیاں طرح طرح کے فیشن ایبل لباس پہنے ہنستی، امریکن لہجہ میں باتیں کرتی جاتی تھیں۔ انگریز لڑکیاں جنھیں سنجیدگی کی تعلیم بچپن سے دی جاتی تھی، پیرس کے اثر سے ذرا کھُل کر ہنس بول رہی تھیں۔ اسکنڈی نیویا کی سنہرے بالوں والی سادگی سے بے اختیار ہنسنے والی لڑکیاں' اطالیہ کی کالی آنکھوں، کالے بالوں والی عورتیں جن کو دیکھ دیکھ آزاد کو مشرقی حُسن یاد آتا ہے۔ اسپین کی خانہ جنگی کی پناہ گزین لڑکیاں، بعض اچھے کپڑوں میں —— جن کے والدین جنرل فرانکو کے طرفدار تھے اور بعض خستہ حال —— جو جمہوریت کی حامی تھیں۔"

یہ تو چند ایک اقتباسات تھے۔ لیکن عزیز احمد کے ہاں اُن کے کئی افسانوں میں مغرب کی جھلکیاں کئی رنگوں اور کئی رُوپوں میں مل جاتی ہیں۔ یوں کہیے، وہ اپنے قاری کو ہندوستان میں رہتے ہوئے یورپ کی سیر کرا دیتے ہیں۔ "مدن سینا اور صدیاں" میں ہسپانیہ کے مظلوم پناہ گزینوں کا ذکر، سرمایہ دارانہ نظام اور مارکسی فلسفہ پر بحث تو "ستا پیسہ" میں پولینڈ کے پناہ گزینوں کے حالِ زار کی سمت اشارہ۔ "ممُوسکا" میں ہٹلر اور اس کے حامیوں کی سیاست، نسلی تعصب، ہٹلر کے با اختیار ہونے کی نشانی، "نازی موریل اور اسی میں یورپ کی اچھی خاصی سیر —— یہ میونشن کے باغات، پارک اور مختلف یادگاریں ہیں۔ ازار کا پل، لسیورک، وہاں کی جھیل، ہوف گارتن، گمنام سپاہی کی قبر، جرمنی کے عجائب خانے، رقص گاہیں، قہوے خانے —— "رائیگاں تبسّم" میں تی تیان

کی کھینچی ہوئی میگڈالین کی تصویر۔ "پوشا مالن" میں ازبکستان کی جمہوریتِ شوریٰ کا حوالہ کہ ازبک زبان روسی رسم الخط میں تحریر کی جائے۔ جاوا کے باشندوں کے رقص کا احوال: "روما الکبریٰ کی ایک شام" میں یورپ کی سیاست پر اظہارِ رائے، خصوصاً وہاں کے فاشزم پر زور، ہٹلر اور مسولینی کی ملاقات کا حوالہ، یونانیوں کے فنِ تعمیر پر اظہارِ خیال اور کروچے کے فلسفۂ اظہاریت کی صراحت، نیز وہاں کے باغوں اور راستوں وغیرہ کی سیر۔ "خطرناک پگڈنڈی" میں مغربی معاشرت، وہاں کے سطحی اور وقتی رومان، جنسی زدگی اور نائٹسوں کا حال۔ "دیا سلائی کی اہمیت" میں امریکہ کی جنوبی ریاستوں کے رہنے والوں کے مزاج اور اُن کے نسلی تعصب کے علاوہ یورپ میں ہندوستانیوں کے مسائل، وہاں کے بارے میں ہندوستانیوں کے تاثرات اور اُن کی وہاں کی تہذیب سے ہم آہنگ ہونے کی سعی اور اس سلسلے میں دشواریاں ——— اور اس کے علاوہ بھی اور اِدھر ایشیائی ممالک کے تعلق سے انڈونیشیا سے جاپان کا تخلیہ، برطانیہ کی دخل اندازی، منشور اوقیانوس اور سامراجی استحصال، وغیرہ وغیرہ!

قطع نظر اس کے جہاں تک اپنے وطنِ عزیز کا تعلق ہے عزیز احمد کے قلم کی طرنگی مزید لائقِ داد ہوتی ہے۔ "رقصِ ناتمام" کے پہلے افسانہ "اور بستی نہیں یہ ....": ہمیں کیا کچھ نہیں۔ غدر کے مارے ہوئے دہلی کے پُرانے شرفاء، زوال آمادہ معاشرے میں اخلاقی بحران، عورتوں کی بے راہ روی، کالج کی لڑکیوں کی عشق بازیاں، جنسی تفریح، ہندو مسلم اتحاد، ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان شادیاں۔ حسن اور حسن کی نوعیت کے تذکرے، سب کچھ اور نہایت دلکش انداز میں۔ یہاں دیکھیے پنجاب اور کشمیر کے حسن کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ہندوستان بھر میں شاید پنجاب ہی میں عورتوں کا حسن مریضانہ نہیں۔ ورنہ مَیں نے تو کشمیر میں پیاری سے پیاری عورتوں پر بھی موت کی زردی دیکھی ہے۔"

اور یہاں خاص طور پر پنجاب کے حسن کی ستائش ہے:

"شمال میں رنگ بھی تو صاف ہوتا ہے"۔ مسٹر کپور نے کہا: "لیکن پنجاب میں رنگ کے ساتھ ہیلتھ بھی ہے"۔

"بیکار دن بیکار راتیں" میں سیاسی قایدین کا تذکرہ:

"اِتنے میں مسز سروجنی نائیڈو آئیں اور سب اُٹھ کھڑے ہوئے اور سندھ کے لیڈر صاحب اُن سے گاندھی جی کی صحت کے متعلق گفتگو کرنے لگے"۔

اور یہ بھی آزادی سے قبل کی سیاست ہے۔ افسانہ "زرِ خرید" کا اقتباس:

"مرکزی اسمبلی میں سو فیصد نشستیں جیت لینے کی خوشی میں اس شام بمبئی کے بہت سے مسلمان محلوں میں چراغاں تھا۔ محمد علی روڈ، بھنڈی بازار وغیرہ میں ہر چھوٹی سی دوکان پر روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ بابِ پاکستان، بابِ محمد غزنوی اور جناح کی بڑی بڑی تصویروں پر بجلی کی روشنی اُجالا کر رہی تھی۔ پنواڑیوں کی دوکانوں پر جمگھٹا تھا اور چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں سے سستے فلمی گانے، ریڈیو گراموفون کے ذریعہ نشر ہو رہے تھے۔ سڑک پر ہزاروں آوارہ گرد چھوٹے چھوٹے ٹوپیاں پہنے ہوئے میمن، بوہرے، خوجے اور دھوتی پہنے ہوئے ہندو، تماشا تو تماشا ہی ہے، تصویر چاہے گاندھی کی ہو چاہے جناح کی"۔

اور پھر اسی سیاسی منظر نامہ کے اور رُخ اور پہلو بھی لائقِ دید ہیں۔ ۱۹۴۷ء سے قبل برصغیر کیا اور کتنے سیاسی نشیب و فراز سے نہیں گزرا، کتنی ہنگامہ آرائیاں اور لوٹ مار ——— عزیز احمد نے نہایت گہرائی کے ساتھ ان واقعات اور حوادث کا جائزہ لیا ہے اور اپنے افسانوں میں نہایت غیر افسانوی انداز میں ان سب کو پیش کر دیا ہے۔ شہرِ نگاراں، بمبئی کی یہ تصویر ملاحظہ ہو:

"سال بھر کے بعد حیدرآباد میں پھر اسی ذہنی بیکاری سے اُکتا کر میں بمبئی آیا۔ اب ہنگامے ہو رہے تھے۔ کانگریس نے آئی۔ ان۔ اے کے لیے ہنگامہ کیا، کمیونسٹ پارٹی کا دفتر لوٹا گیا اور ان کا چھاپہ خانہ توڑا گیا۔

مسلم لیگ نے رشید ڈے منایا۔ ہندوستانی بحریہ نے بغاوت کی اور مجھے
یقین ہو گیا کہ اب شاید میری اور میرے جیسوں کی ذہنی اور علمی بیکاری ختم ہو
لیکن پھر ہندو مسلم فساد شروع ہوا۔ غنڈے کے چھرے بیٹھوں، گردنوں آنکھوں
میں بھونکے جانے لگے۔ موٹروں سے مشین گن نے بھائیوں پر گولیاں چلائیں۔
اور میں کھاتا پیتا، مزے اڑاتا بیکار پھر مطمئن ہو گیا کہ اس ملک میں کچھ نہیں
ہوگا۔ شاید یہ آزادی کے قابل ہی نہیں۔" (بیکار دن بیکار راتیں)۔

برِ صغیر میں یہ وہ زمانہ ہے کہ فسادات کی آگ نے ابھی ابھی شدت اختیار کی تھی۔ مذہب کی بنیاد پر مسائل کو دیکھا، تولا اور پرکھا جانے لگا تھا۔ ملک کی تقسیم کی باتیں ہو رہی تھیں۔ فرقہ وارانہ فضا، اور مکدر ہوتی جا رہی تھی۔ یہ باتیں عزیز احمد کے کئی افسانوں کا موضوع ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے اور کئی افسانہ نگاروں نے فرقہ وارانہ فسادات پر قلم اٹھایا۔ منٹو جیسے افسانہ نگار اس ضمن میں بہت زیادہ کامیاب بھی ہیں لیکن عزیز احمد کا اپروچ کچھ اور ہے۔ اوّل تو فسادات کا تذکرہ اُن کے یہاں پس منظر کے طور پر ہے۔ دوم یہ کہ وہ نہایت معروضی انداز میں فسادات پر قلم اُٹھاتے ہیں۔ اُن کا انداز اگرچہ بیانیہ ہوتا ہے لیکن پُر تاثیر ـــــ اس خصوص میں وہ عوام کو نہیں حالات اور واقعات پیدا کرنے والے قائدین کو ذمہ دار قرار دیتے ہیں جو اپنے مفادات کے لیے، اپنے لیے اقتدار کے حصول اور اس کے تحفظ کے لیے فسادات کے کھیل کھیلتے ہیں۔ ہاں فسادات کا ذکر کرتے ہوئے اُن کے لہجہ میں ایک کاٹ ضرور ہوتی ہے۔ یہ کاٹ کبھی طنز کی صورت اختیار کر جاتی ہے اور کبھی تاثیر کو شدید کرنے کے کام آتی ہے۔ فسادات کے موضوع پر عزیز احمد کے تین چار افسانے بالخصوص لائقِ ذکر ہیں۔ "کالی رات" قاتل کبیر" میرا دشمن میرا بھائی" اور" نفرت کیوں تھی" ـــــ یہ افسانے فسادات کا حل نہ پیش کرتے ہوں لیکن قاری کے لیے ایک سوالیہ نشان ضرور کھڑا کر دیتے ہیں۔ اسے سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ یہاں عزیز احمد کا قلم کسی مروت اور رعایت کے بغیر دو ٹوک انداز میں آگے بڑھتا ہے۔" نفرت کیوں تھی" میں فسادات کا پس منظر دُھندلا دُھندلا ہے۔" میرا دشمن میرا بھائی" میں لہجہ میں تلخی در آئی ہے۔" قاتل کبیر"

میں ضمیر کی آواز حاوی ہے اور "کالی رات" میں راست اور تکلف برطرف کی کیفیت لیے ہوئے فسادات کے موضوع پر المیہ اپنے عروج پر ہے ۔ یہ بڑا غضب کا افسانہ ہے۔ اس اقتباس سے اندازہ ہوگا:

" پاکستان اور ہندوستان کی سرحد پر ایک معبد میں جو معلوم نہیں مسجد تھا یا مندر یا کلیسا، ایک عورت کی لاش سڑ رہی تھی اور جہاں سے دیوی ماتا انسان کو، کائنات کو، انسانِ کامل کو جنم دیتی ہے وہاں ایک کتاب کا ورق بہیمیت اور قتل کے بعد ٹھونس دیا گیا تھا۔ ذرا ہندوستان کے وزیرِ اعظم اور پاکستان کے قائدِ اعظم کو بلاؤ اس کالی رات میں شاید وہ پڑھ کر بتا سکیں کہ یہ ورق کس مقدس کتاب کا ہے۔ قرآنِ مجید کا؟ مقدس وید کا؟ گرنتھ صاحب کا؟ انجیلِ مقدس کا؟ کمیونسٹ مینی فیسٹو کا؟ برگساں کے ارتقائے تخلیقی کا؟

شرما کے انسانِ کامل نے سیڑھی پھر اس کنوئیں میں لٹکا دی جس میں لاشیں سڑ رہی تھیں اور نیچے اُترنا شروع کیا۔ اس زینے پر جہاں درندے تھے ـــــ اس زینے پر جہاں حشرات الارض تھے جہاں لاشوں میں بلبلاتے ہوئے کیڑے تھے اور پھر انسانِ کامل معدوم ہوگیا۔"

اسی کے ساتھ انھوں نے جہاں بھی موقع ہوا ملک کے واقعات، مسائل، مقامات اور اشخاص وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے کہیں تفصیل سے کہیں اختصار کے ساتھ اور کہیں وہ محض اشارہ کرتے ہوئے گذر جاتے ہیں مثلاً مسلم لیگ، کانگریس، مارکسزم، عدم تشدد، ہندو مسلم اتحاد اور سکھوں کے دہلی چلو کے نعرے ہیں تو اشخاص میں جہاں ہز ہائی نس بیگم آغا خاں، سروجنی نائیڈو، سَر اکبر حیدری، نظام الملک آصف جاہ اور گاندھی جی وغیرہ کا تذکرہ ہے تو فلمی ہستیوں میں نرگس، جدن بائی، اشوک کمار، موتی لال، کلجیت کور، منورما۔ نیز خبر رساں ادارے رائٹر اور اخبارات میں ٹائمز آف انڈیا اور اسٹیٹسمن وغیرہ کے بارے میں کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ مل جائے گا۔

عزیز احمد واقعات کو صحیح تناظر میں دیکھنے اور انھیں حقائق کو ملحوظ رکھتے ہوئے صفحۂ قرطاس پر سجانے کی سعی کرتے ہیں۔ سب سے پہلے میں اُن کی منظر نگاری کا ذکر کروں گا۔ عزیز احمد نے دُنیا دیکھی اور خوب دیکھی تھی۔ اپنا شہر، اپنا ملک اور دُنیا کے کئی علاقے، علاقائی تہذیب، قومی تہذیب اور بین الاقوامی تہذیب کے کئی پہلوؤں سے انھیں واسطہ رہا لیکن انھوں نے ان مناظر اور تہذیبوں کی ظاہری چمک دمک اور چکا چوند میں خود کو محو نہیں کر دیا بلکہ ان کے اندر جھانکنے اور اُن کی تہہ تک پہنچنے میں بھی کامیابی حاصل کی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ منظر نگاری کرتے ہیں تو اُن میں ایک حرکت، ایک زندگی محسوس ہوتی ہے اور اُن کے تہذیبی مرقعے چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ منظر نگاری کا مفہوم یہ نہیں اور نہ ہونا چاہیے کہ آپ جو کچھ دیکھ رہے ہیں وہی ترقیم کر دیں بلکہ ناول نگار کے قلم میں ایک ماہر مصوّر کے برش کی خاصیت ہونی چاہیے۔ وہ منظر کو کیمرے کی آنکھ کی طرح نہیں دیکھے بلکہ اس کی اپنی آنکھ بھی محوِ نظارہ ہو وہ اپنی نظر ہی سے نہیں زاویۂ نظر سے بھی کام لے۔ عزیز احمد نے جب بھی اور جہاں بھی منظر نگاری کی ہے وہاں صرف منظر ہی نہیں ان کی نظر اور زاویۂ نظر کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ وہ ڈوب کر بلکہ اس کا ایک حصّہ بن کر منظر کو کاغذ پر منتقل کرتے ہیں کہ خود قاری کے سامنے منظر آموجود ہوتا ہے بلکہ کہیں کہیں تو قاری بھی خود کو منظر کا ایک حصّہ متصوّر کرتا ہے۔ اچھے فکشن اور اچھے فکشن نگاروں کا یہ ایک وصفِ خاص رہا ہے۔ دیکھیے یہاں ایک ہلکا سا منظر ہے لیکن کیسی جاذبیت کے ساتھ عزیز احمد نے اس کو پیش کیا ہے:

"اتنی اچھی صبح کاذب تھی۔ ہر طرف دُھند ہی دھند تھی۔ نہ زندگی اور موت کی طرح غیر متعین اور نامعلوم۔ صبح صادق تک معلوم نہیں یہ باقی رہے گی یا غائب ہو جائے گی کسی غیر مرئی جانور کی طرح۔ اس ٹھنڈی نازک اور ریشمی صبح کو سِندھ کا ڈیلٹا اور کچھ کارَن اور کاٹھیاواڑ کے میدان کِتنے خوبصورت معلوم ہوتے۔" (نفرت کیوں تھی)۔

اور یہ وادیٔ کشمیر ہے! کشمیر کے حُسن اور یہاں کے حسین مناظر کا بیان نہ جانے ہمارے

کتنے افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں نے کیا ہے۔ عزیز احمد نے کشمیر کے بارے میں ناول "آگ" بھی لکھا اور دو ایک افسانے بھی۔ افسانہ "زُون" میں کشمیر کی زندگی کے کئی پہلوؤں کی عکاسی ہوتی ہے۔ اس اقتباس میں کشمیر کی بہار دیکھیے واقعی پُر بہار ہے، کیتنی طراوت کا احساس ہوتا ہے:

"بہار اس سال جلد آگئی تھی اور ابھی سے چنار کے پتے چوڑے چکلے اور گہرے سبز رنگ کے ہو چکے تھے۔ خودرو پھولوں کی بہار قریب الختم تھی۔ سُرخ سُرخ پھُول جنھیں لالہ کہہ لیجیے یا کوکنار اب بھی ہزاروں کی تعداد میں بام پور کے راستے میں سر ہلا رہے تھے مگر سری نگر میں کم ہی نظر آتے۔ جہانگیر کا پُورا سامانِ طرب قدرت پھر سنوار رہی تھی۔"

عزیز احمد کی منظر نگاری کا کمال یہ بھی ہے کہ وہ منظر کو پس منظر کے طور پر استعمال کرتے ہوئے اس سے یا تو کرداروں کے اُجاگر کرنے کا کام لیتے ہیں یا افسانہ کے مرکزی خیال یا اس کے مقصد کو ابھارنے یا اس کی صراحت کرنے یا مجموعی طور پر افسانہ کے تاثر کو شدید کرنے کے کام میں لاتے ہیں۔ اس طرح منظر، معنویت کا حامل ہو جاتا ہے اور صرف نظروں سے دیکھنے کی چیز نہیں غور و فکر سے کام لینے کا عنوان بھی بن جاتا ہے۔ میں اُن کے افسانوں سے اس نوعیت کے دو، ایک اقتباسات پیش کروں گا۔ افسانہ "ستاپیسہ" سے:

"آخر رمبا ختم ہوا اور ہال بھر میں تمام میزوں پر ناچتے ہوئے جوڑے واپس آئے۔ جیسے کشتیٔ نوح سے کبوتروں کے سیکڑوں جوڑے کسی نامعلوم جزیرے کو دیکھنے کے لیے اُڑ گئے ہوں اور تھکاوٹوں کی لذّت اور مسکراہٹوں کی جھوٹ کی شاداب ٹہنیاں اپنے ہونٹوں اور اپنے خون کی روانی میں دبائے ہوئے پھر اپنے اپنے کابکوں میں آ بیٹھیں۔"

اور یہ اقتباس بھی "ستاپیسہ" ہی سے ہے۔ ہے تو سیٹھ شیو داسانی کے ڈرائنگ روم کا نقشہ لیکن اس سے سیٹھ کے کردار پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اُن کے مزاج کی وضاحت ہو جاتی ہے:

"رام لال نے ڈرائینگ روم کا جائزہ لیا۔ دیواروں پر ہلکا پینٹ، فرش پر بڑے بڑے چکنے ٹائلز، اور ان پر کم از کم دس ہزار کا بخارا کا قالین، بھرے اسپرنگ کے صوفے، اخروٹ کی تپائیاں، چاندی کے ایش ٹرے۔ ایک دیوار پر ارونا کی قدِ آدم تصویر اور اس کے سوا اور کئی تصویریں، جن میں کسی سے بھی کسی خاص بلند ذوقی کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔"

جہاں تک کردار نگاری کا تعلق ہے عزیز احمد کو اس میں بڑا ملکہ حاصل ہے۔ اُن کے کردار، کردار نہیں ہوتے، دراصل ہمارے سامنے، آگے پیچھے، چلتے پھرتے افراد ہوتے ہیں۔ اُن کے کردار دراصل ہم ہوتے ہیں، قاری خود ہوتے ہیں۔ عزیز احمد کے افسانوں کی ایک اہم خصوصیت حقیقت نگاری ہے اور یہ حقیقت نگاری اور پہلوؤں کے ساتھ ساتھ کچھ زیادہ ہی جلوہ گر ہوتی ہے اُن کے کرداروں سے۔ یوں بھی عزیز احمد کے بعض ناولوں اور افسانوں کے کردار واقعہ یہ ہے کہ حقیقی ہیں۔ جہاں تک حیدرآباد کا تعلق ہے بیشتر اصحاب اُن کے ناولوں اور افسانوں کے کئی کرداروں سے بخوبی واقف ہیں بلکہ آج بھی اُن کے چند کردار حیات ہیں۔ عزیز احمد کرداروں پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے باوجود کرداروں کو فطری طور پر آگے بڑھنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ وہ کرداروں کا گلا نہیں گھونٹ دیتے اور نہ کرداروں کی راہ خود متعین کرتے ہیں بلکہ کرداروں کو اُن کے مزاج اور رفتار کے مطابق نشوونما کی گنجائش فراہم کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے کردار تحرک کے حامل ہوتے اور فکشن کے کردار نہیں ہمارے معاشرے کے افراد معلوم ہوتے ہیں ___ اور اس کردار نگاری کے سلسلے میں انھوں نے کسی کو معاف نہیں کیا ہے۔ نہ اپنے آباو اجداد کو، نہ اپنے ہمعصروں کو، نہ سیاسی قائدین اور مذہبی پیشواؤں کو اور نہ کسی کو۔ نیز ہر کردار کو وہ اُس کے مزاج اور ماحول کے مطابق اُجاگر کرتے ہیں۔ یہاں "اجداد" کا کردار کتنی عمدگی سے منعکس ہوتا ہے:

"میرے لیے بیکاری کا سوال بڑا اہم ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وقت کس طرح کاٹا جائے میرے اجداد کو اتنی زحمت نہ اُٹھانا پڑتی تھی۔ وہ

صبح کو افیون کھاتے تھے۔ پھر دودھ میں جلیبیاں ڈال کر کھاتے۔ پھر صبح نو بجے سے دوپہر کے کھانے کے وقت تک شطرنج کھیلتے رہتے۔ دوپہر کا کھانا کھا کے چار یا پانچ بجے تک قیلولہ کرتے پھر شطرنج اور گنجفہ میں منہمک ہو جاتے۔ ملاقاتی یا اہلِ غرض آتے تو اُن سے چاپلوسی کی باتیں سُنتے رہتے اور خوش ہوتے جاتے۔ رات کا کھانا کھا کے بچوں کو سوتا اور بیوی کو کوستا چھوڑ کے رنڈیوں کا گانا سُننے چلے جاتے۔ دو، تین بجے رات کو واپس آتے اور دوسرے دن پھر وہی ..... ۔" (بیکار دن بیکار راتیں)

معاشرتی بصیرت کے بغیر ایسی کردار نگاری ممکن نہیں۔ یہ چند افراد کی نہیں ایک نسل کی کردار نگاری ہے۔ اسی طرح عزیز احمد کی تاریخی بصیرت بھی بے مثال ہے انھوں نے کئی جگہوں پر، خواہ برصغیر کی تاریخ کے کردار ہوں یا یورپ کی تاریخ کے، ان کو روشنی میں لانے میں کسی تکلف سے کام نہیں لیا۔ ان کا قلم اکہرے کا کام بھی کرتا اور کردار ظاہرہ ہی نہیں باطنی طور پر بھی اُجاگر ہو جاتا ہے۔ جہانگیر اور نور جہاں مغلیہ سلطنت کے دو بڑے نام ہیں تاریخ میں تو ان کی جگہ محفوظ ہے ہی، روایات کے ہالوں میں بھی اُن کی شخصیات آگئی ہیں۔ اُن پر کچھ افسانوی رنگ بھی چڑھ گیا ہے۔ حقیقت اپنی جگہ، رومانی فضا کے باعث یہ کردار کچھ اور ہو گئے ہیں۔ کچھ تاریخ، کچھ افسانہ، کچھ عزیز احمد کا طرزِ ادا ـــــ انھوں نے عورت کی نفسیات، اس کے عشق، مرد کی فطرت اور اس کی ہوس کو تاریخ کے اوراق سے ڈھونڈ نکالا ہے۔ اس طرح کہ نور جہاں اور جہانگیر کے کردار گویا "زندہ" ہو جاتے ہیں۔ نور جہاں کے الفاظ میں:

"سلطنت اس (جہانگیر) نے شراب کے ایک جام کے عوض میرے حوالے کر دی تھی۔ مَیں نے بہت سے امراء کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ مَیں نے اس کی کوشش کی کہ جہانگیر کے بعد میرا نام چلے۔ اِدھر حسن و جمال کے محاذ پر مَیں نے بہت سی نفاستیں ایجاد کیں۔ عرقِ گلاب سے غسل کرنے کے اصول دریافت کیے۔ خوشبوؤں، پیشوازوں، زیوروں میں نئی نئی ایجادیں کیں۔ میرے تاج میں ہیرے جگمگاتے تھے۔ انہی میں سے ایک ہیرا جہانگیر بھی تھا۔" (زرین تاج)

مَیں سمجھتا ہوں نور جہاں کا کردار فکشن میں اتنی خوبی سے شاید ہی کسی نے پیش کیا ہو۔ اور یہ دیکھیے، یہ بھی نور جہاں ہی کی زبانی، جہانگیر کا کردار۔ وہ جو معروف ہے، نور جہاں دوسرا کبوتر چھوڑنے کے بارے میں بتاتے ہوئے کہتی ہے:

"کہتے ہیں میری یہ ادا شہزادے کے دل میں کھب گئی اور مجھ پر دل و جان سے عاشق ہو گیا جیسا وہ اس سے پہلے دل و جان سے انار کلی پر عاشق ہو گیا تھا اور اس سے پہلے ...... (زریں تاج)

جس فن کار نے تاریخ کے بارے میں اتنی گہرائی سے کام لیا ہو اُس نے اپنے دَور کو کتنی سنجیدگی اور باریکی کے ساتھ نہیں دیکھا ہوگا۔ عزیز احمد کے افسانے پڑھتے ہوئے اُن کی عصری حسیّت اور تجزیاتی نگاہ کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ وہ کرداروں کو کس گہرائی سے اور کس کس زاویے سے گرفت میں لاتے ہیں۔ یہاں کوئی ایک فرد نہیں، لگ بھگ سارا متوسط طبقہ ہے:

"چہرے پر زردی چھائی ہوئی، سینہ اندر کو دھنسا ہوا، شکل و صورت اچھی خاصی تھی۔ مگر آنکھیں اندر کی طرف گھُسی جا رہی تھیں، گال پچکے ہوئے تھے۔ یہ ہندوستان کا متوسط طبقہ۔ حیاتین ا، ب اور د کی کمی۔"
(اور بستی نہیں یہ ......)

یہ کیفیت کچھ ہندوستان ہی تک محدود نہیں یہ تو آج کل کے نوجوانوں اور نوجوانی کا حالِ زار ہے۔ خواہ وہ ہندوستان سے متعلق ہوں یا دنیا کے کسی اور خطّہ سے۔ یہ نوجوان غالباً فرانس سے تعلق رکھتا ہے لیکن بہر حال اسی صدی اور اسی عہد کا ـــــ ناک نقشے اور رنگ روغن میں کچھ ایسا فرق نہیں۔ عزیز احمد کے الفاظ میں:

"اس کو نوجوان کہنا صرف اس وجہ سے صحیح ہے کہ حقیقت میں اس کی عمر زیادہ نہیں تھی اور وہ اسی دون کے ساتھ یونی ورسٹی میں پڑھتا تھا لیکن اس کی صورت، اس کے شانوں کے بے وقت خم اور اس کی چھوٹی آنکھوں اور لمبی ناک اور چوڑے دہانے کے عدم تعاون اور اس کی مریل سی چال دیکھ کر معلوم

ہوتا تھا کہ جوانی اور بڑھاپا دونوں نے ایک ساتھ اس نوجوان کی زندگی میں قدم رکھا ہے۔" (خطرناک پگڈنڈی)

کرداروں کے تعلق سے ان کے سراپے، جبلت پھرت اور ایسی ہی ظاہری باتوں کا بیان اہمیت رکھتا ہے لیکن اتنی اہمیت نہیں رکھتا بلکہ اچھی کردار نگاری اسی وقت ممکن ہے جب کہ شخصیت کے اندرون کا مطالعہ کیا جائے اس کی نفسیات کو سمجھتے ہوئے اس کو پرکھا جائے۔ عزیز احمد کے افسانوں میں کردار نگاری کچھ ایسی ہی ہوتی ہے۔ وہ کرداروں کے ظاہر اور باطن میں مطابقت کو محسوس کرتے ہیں۔ اور اس کا بیان بایں طور کرتے ہیں کہ ظاہر و باطن کی ایک دوسرے میں جھلک مل جاتی ہے۔ اس کی عمدہ مثال یہ کردار ہے:

"کسی نے اس کے شانوں پر آہستہ سے ہاتھ رکھا وہ سمجھا بھا سکر ہوگا، لیکن یہ ایک اجنبی تھا۔ ادھیڑ عمر کا نیلے ٹویڈ کا سوٹ پہنے بھڑک دار ٹائی میں سونے کا پن لگائے جیسے ابھی ابھی اسٹاک ایکسچنج میں سٹہ کھیل کر آرہا ہو۔" (ستا پیسہ)

اور یہاں دیکھیے وہ اپنے ایک کردار قریشی کا تعارف ہی اس انداز سے کراتے ہیں کہ کردار کے سارے پہلو اور اس کی شخصیت کے سارے رنگ برافگندہ نقاب ہو جاتے ہیں:

"پہلگام سے واپسی کے ہفتہ بھر بعد قریشی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ چیچک کے داغ مگر سینہ بڑا بھرا ہوا اور طاقت اتنی کہ اپنے دونوں ہاتھوں اور سینے کے شکنجے میں کس کر مضبوط سے مضبوط عورت کی پسلیاں توڑ دیں۔ جنگلات کے ٹھیکیدار۔ اُن کو یا تو دیوداروں سے عشق تھا یا عورتوں سے۔ دیوداروں سے ان کو پیسہ ملتا تھا اور اسے عورتوں پر خرچ کرتے تھے۔ سری نگر کی ہر سیاح یا مقامی عورت جس کا کسی فیشن ایبل گھرانے سے تعلق ہو اس کی زندگی کی تمام تفصیلات سے یہ آگاہ رہتے۔" (کوکب)

اور ایک ایسا ہی کردار امجد حسین کا ہے۔ خود عزیز احمد کی زبانی سنیے:

"امجد حسین جس کے لیے زندگی میں محض دو قدریں تھیں۔ کتابیں اور عورتیں ایک شوق نے اس کی بصارت کم کردی تھی اور دوسرے شوق

نے بصیرت اور اکثر دونوں کی حد تک اس کے مطالعہ کی سطحیت چھپائے نہ چھپتی۔" (رزِ خرید)

اسی کے ساتھ جہاں تک مذہبی پیشواؤں کے کردار کا تعلق ہے عزیز احمد کا قلم وہاں بھی دو ٹوک اور اسی طرح رواں دواں ہے۔ مذہبی رہنماؤں کی زندگی، ان کی ظاہرداری، پُر تصنع زندگی اور مذہب کے نام پر استحصال کرنے کی خُو کو وہ خوب سمجھتے ہیں۔ "تصوّرِ شیخ" میں انھوں نے ایسے لوگوں کا کچّا چِٹھا پیش کر دیا ہے۔ ایک ایسے ہی کردار کو دیکھیے:

"حضرت کا جلال بڑھتا جا رہا تھا۔ عبادت اور تقویٰ میں شدّت ہوتی جا رہی تھی لیکن حضورِ قلب غائب ہوتا جا رہا تھا۔ وہ خطرات کا الزام لگا کر اپنے مقتدیوں کو نمازیوں کی صف سے نکلوا دیتے لیکن ان کے اپنے دل میں خطرات کے سوا اور کچھ نہ تھا۔"

ہرچند کہ اور افسانوں میں بھی تھوڑے بہت لیکن اس افسانے "تصوّرِ شیخ" میں عزیز احمد کے وسیع مذہبی معلومات کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کی نگاہ مغرب کے علوم، طرزِ معاشرت اور شعر و ادب ہی پر نہیں، مشرقی اور اسلامی افکار پر بھی خاطر خواہ تھی چنانچہ داراشکوہ کے "مجمع البحرین" اس کے عقاید، سلسلۂ نقشبندیہ اور ایسی ہی باتوں کے حوالے ان کے ہاں مل ہی جاتے ہیں۔

عزیز احمد، مغربی شعر و ادب اور سماجی علوم کے اپنے گہرے مطالعہ کی وجہ سے کوئی عجب نہیں مغربی دانشوروں، اُن کے فن اور اسلوب سے متاثر بھی ہوئے ہوں۔ اُن سے استفادہ بھی کیا ہو۔ ایمیلی زولا، آلڈس ہکسلے اور ہیورنی نکلسن کے اثرات اُن کے یہاں تلاش کیے گئے ہیں۔ خاص طور پر عزیز احمد کی کردار نگاری پر —— عزیز احمد نے خود ہکسلے سے متاثر ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ تھوڑا بہت ہکسلے سے انھوں نے لیا دیا بھی ہو لیکن یہ کہنا کہ ہکسلے کی انھوں نے پیروی کی ہے اور ہکسلے نے جس طرح اپنے ناولوں میں ایک کردار کو دو کرداروں میں بانٹا SPLIT OF CHARACTER ہے عزیز احمد بھی اسی کی تقلید کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ کہتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ عزیز احمد کے افسانے "اور بسنتی نہیں یہ ......" میں الف خاں اور بے خاں اس کی مثال ہیں —— اور زبانوں ہی کا

نہیں، اُردو فکشن ہی کا اگر تھوڑا بہت گہرا مطالعہ کرلیں تو بات واضح ہوگی کہ ایسے بھی کردار ہوں گے جو زندگی کے ایک ہی کردار سے بنتے ہیں لیکن ایسے بھی بہت سے کردار ہوتے ہیں جنھیں ناول/افسانہ نگار زندگی کے کئی کرداروں کو ملاکر بناتا ہے اور بعض اوقات زندگی کا کوئی ایک کردار، ناول یا افسانے میں ایک سے زاید کرداروں میں بانٹ دیا جاتا ہے۔ یہ عمل ہمارے بیشتر فن کاروں کے یہاں عام ہے۔ ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ مغربی ادب کے مطالعہ کی وجہ سے عزیز احمد کے یہاں یہ ٹکنک نکھر گئی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ عزیز احمد کے یہاں اگرچہ مغربی معاشرت اور ماحول ملتا ہے لیکن کردار کو بانٹ دینے کی ٹکنک انھوں نے جس افسانہ (اور بستی نہیں یہ .....) میں استعمال کی ہے اس میں قطعی ہندوستانی فضا ہے۔ مجموعی طور پر عزیز احمد نے مغرب سے جو بھی اور جتنا بھی استفادہ کیا ہو اس کو اپنے افسانوں میں ہندوستانی معاشرت کے مطابق پیش کیا ہے۔ اس لیے اُن کے یہاں یہ ساری چیزیں مانگے کا اُجالا نہیں ایک ضرورت اور اندرونی اُپج [INNER URGE] کے طور پر ملتی ہیں۔

عزیز احمد کے یہاں فطرت نگاری اور حقیقت نگاری میں بھی مغربی ادب سے تھوڑے بہت استفادہ کا حصّہ ہے۔ خاص طور پر کرداروں اور منظر نگاری میں ـــــ اپنے قلم پر عزیز احمد کی گرفت مضبوط ہوتی ہے۔ وہ اعتدال اور توازن کے دامن کو نہیں چھوڑتے جو اچھی فطرت نگاری اور حقیقت نگاری کے لیے لازم ہے۔ ان کے کردار، جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جاچکا ہے بالعموم ہمارے معاشرے کے افراد ہوتے ہیں ان کو اپنے افسانوں میں پیش کرتے ہوئے وہ افراط و تفریط سے بہت کم کام لیتے ہیں۔ سوائے اس کے کہ کہیں کہیں افسانوی رنگ دے دیتے ہوں۔ پریم چند کے بعد اُردو فکشن میں حقیقت نگاری اور فطرت نگاری کے سلسلے میں منٹو، عصمت چغتائی اور حیات اللہ انصاری وغیرہ کے نام لیے جاتے ہیں۔ عزیز احمد بھی اُن میں ایک نمایاں نام ہے۔

نفسیات سے دلچسپی نے عزیز احمد کی حقیقت نگاری کے رنگ کو چوکھا کردیا ہے۔ پتہ نہیں وہ نفسیات کے طالب علم رہے یا نہیں لیکن انسانی نفسیات کا اُن کا مطالعہ غضب کا ہے۔ باریک بینی کے ساتھ انسانی شخصیت کے مطالعہ نے اُن کی نفسیات

نگاری کو ایک رنگ دے دیا ہے۔ خواہ عورت ہو یا مرد، بوڑھے ہوں یا جوان یا بچے اور پھر کسی مزاج مذاق اور مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، اپنے کرداروں کی نفسیات نگاری میں انھیں ید طولیٰ حاصل ہے۔ چھوٹی چھوٹی اور معمولی معمولی باتیں، جو بظاہر بے تعلق، بے معنی اور بے ربط معلوم ہوتی ہیں، عزیز احمد کچھ ایسے موقع و محل کے ساتھ اُن کا استعمال کرتے ہیں کہ وہ معنویت کی حامل اور بلیغ ہو جاتی ہیں۔ کہیں وہ تفصیل سے کام لیتے ہیں اور کہیں اشاروں میں شخصیات کی نفسیات اور اُن کے ذہنی خد و خال متشخص کر جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں اُن کا عمدہ ترین افسانہ "رقصِ ناتمام" ہے بلکہ نفسیاتی زاویہ سے یہ اُن کے فن کا شہکار ہے۔ حیدر آباد کی جاگیر دارانہ تہذیب کے پس منظر میں اس افسانے کے کرداروں لفٹننٹ سکندر علی خاں اور اُن کی بیوی سلطانہ ہی کی نفسیات کی ترجمانی میں عزیز احمد کامیاب نہیں بلکہ اُن کی لڑکی کا نفسیاتی مطالعہ بھی انھوں نے بڑی ہنر مندی سے کیا ہے۔ پیدائش سے لے کر جوانی اور شادی تک کی نفسیات! اپنی شادی کے بارے میں پیام سُن کر جس کے لیے وہ آمادہ نہیں کسی لڑکی کے کیا جذبات و احساسات ہوتے ہیں عزیز احمد کے قلم سے ملاحظہ ہوں:

"اُسے اپنے اس انقلاب پر حیرت ہوئی۔ پیام کا علم ہونے تک وہ بالکل دوسری چیز تھی۔ اس کی نسوانیت زندہ تھی۔ آزاد تھی اور اب اس پیام کے علم نے اُسے بالکل بدل دیا۔ اس کی شخصیت اس کی خودی فنا ہونے لگی۔ وہ ایک معمولی ہندوستانی لڑکی بن گئی جس کے والدین حسبِ دستور بغیر اس کی مرضی کے اُسے دوسری جگہ منتقل کر رہے تھے جیسے کوئی اپنے مکان کے پُرانے فرنیچر کو بیچ ڈالتا ہے ہاں اس میں اور اس پُرانے ٹوٹے ہوئے پلنگ میں جو برآمدے میں پڑا ہوا ہے، کیا فرق تھا؟ وہ پلنگ بھی کسی کو دے دیا جائے گا یا شاید یہ سب اُسی کی غلطی تھی اُس نے تعلیم پا کے اور کتابیں پڑھ کے اور اپنی ساتھی لڑکیوں کی مثالیں دیکھ دیکھ کر اپنے آپ کو دھوکا دے رکھا ہو۔ وہ ہندوستان کو، اپنے گھر کو اپنی اصلیت کو بھول گئی ہو۔"

اسی افسانے میں باپ لفٹننٹ سکندر علی خاں کی ذہنی کیفیت اور اس کی اُلجھنوں کو کچھ اس طریقہ سے پیش کیا گیا ہے کہ نفسیاتی مطالعہ کی ایک بہت اچھی مثال سامنے آتی ہے۔ الفاظ کے استعمال کا اہتمام اور جُملوں کا دروبست بھی توجہ کا طالب ہے:

"جب وہ (لفٹننٹ سکندر علی خاں) اپنے کمرے کے قریب پہنچا تو معلوم ہوتا تھا کہ چاروں طرف سے بادل اس کے دماغ کے اندر سمائے جا رہے ہیں۔ دماغ کے اندر دُھند پھیلی ہوئی تھی۔ اِتنے میں بہت دُور، بجلی کی ایک ذراسی جھلک نظر آئی اُس نے تسکین سی محسوس کی اور اپنے کمرے کے اندر ایک آرام کُرسی پر اسی طرح یونیفارم پہنے لیٹ گیا اور عجیب منتشر خیالات کے ہجوم میں بالکل کھو گیا۔"

اور آگے ملاحظہ ہو:

"اسی طرح آرام کُرسی پر لیٹے لیٹے اس کا دماغ اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا جس طرح کوئی کشتی متلاطم موجوں میں ہچکولے کھاتی رہے اور اس کے ملاح اسی طرح سوتے رہیں۔ مختلف متضاد اور مُسلسل لکیروں کی طرح بے معنی خیالات اِدھر اُدھر جمع ہوتے ایک دوسرے کو قطع کرتے اور پھر دوسرے خیالات میں کھو جاتے۔ ان تمام خیالات پر وہی کثیف کہر چھائی ہوئی تھی۔

کمرے میں بالکل اندھیرا تھا اور وہ اس کمرے میں اسی طرح بیٹھا تھا گویا وہ خود بھی اس تاریکی کا ایک حصہ تھا۔"

اور یہ میاں بیوی ہیں جن میں ذہنی ہم آہنگی نہیں جو ایک دوسرے سے قطعی غیر آسودہ ہیں۔ ہر ایک اپنی اپنی دُنیا میں۔ پاس رہ کر بھی ایک دوسرے سے دُور بہت دُور ——— اس کیفیت کا اظہار ایسا آسان نہیں تھا اور پھر ایسے شستہ انداز میں:

"دونوں بچے سو رہے تھے اور یہ دونوں بیٹھے ہوئے تھے اُن کے دماغ میں کوئی خیال نہیں تھا پھر بھی کچھ سوچ رہے تھے جس طرح

موضوع کو کچھ ایسا اختیار نہیں کیا گیا تھا۔ (ویسے آج ہمارے ادب میں جنس کو جس طرح برتا جارہا ہے اس کا عزیز احمد کے دَور میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا) اس سلسلے میں عزیز احمد پر فرانسیسی شعر و ادب کا اثر بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ بالعموم اُردو کے جنس نگار فن کاروں کے بارے میں کہا جاتا ہے لیکن دیکھا جائے تو یہ عزیز احمد کا اپنا امتزاج بھی تھا ___ مغرب کے قید و بند سے معرا معاشرہ میں انھوں نے اپنی زندگی کے کئی سال گزارے خصوصاً پیرس اور لندن کی فراخدلانہ صحبتیں اُنھیں میسّر آئیں اور خود ہندوستان میں جس کھلے معاشرہ میں انھیں رہنے کا موقع ملا ___ ان سب نے اُن کے مزاج کی تشکیل میں حصہ لیا اور اُن کے افسانوں میں بھی یہی چیزیں در آئیں۔ ظاہر ہے ان کا الزام فرانسیسی جنس نگاروں پر عاید کرنا زیادتی ہوگا۔ مَیں عزیز احمد کے افسانوں کا اس زاویہ سے تجزیہ کرنے سے قبل آل احمد سرور کی خود نوشت سوانح " خواب باقی ہیں "؎۱ سے دو اقتباسات پیش کروں گا جس سے عزیز احمد کی شخصیت اور اُن کے مزاج کے اس پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ ماسکو میں ۱۹۶۰ء میں انٹرنیشنل اور نیشنلسٹ کانگریس کا اجلاس تھا۔ سرور صاحب اس اجلاس میں شریک تھے۔ عزیز احمد بھی آئے ہوئے تھے۔ سرور صاحب کے قلم سے عزیز احمد کے بارے میں ملاحظہ ہو:

> "عزیز احمد سے حیدر آباد میں ملاقات ہو چکی تھی اور خط و کتابت بھی تھی۔ مَیں نے یہ دیکھا کہ اُن کے ساتھ اکثر کوئی نہ کوئی حسین اسکالر ہوتی۔ کریملن کے ڈنر میں عزیز احمد شریک نہ ہوئے وہ کسی روسی خاتون کے ہاں مدعو تھے۔"؎۱

اور جب بعد میں عزیز احمد سے ملاقات ہوئی تو بقول سرور صاحب:

> "مَیں نے پوچھا، آپ کریملن کے ڈنر میں نظر نہیں آئے تو بولے میری ایک حسینہ کے یہاں دعوت تھی۔"؎۲

بتائیے جب خود عزیز احمد کا مزاج ایسا ہو تو فرانسیسی جنس نگاروں کو کیوں بدنام

؎۱ آل احمد سرور" خواب باقی ہیں" ایجوکیشنل بک ہاؤز، علی گڑھ ۱۹۹۱ء پہلی بار ص ۲۰۲ - ۲۰۳

؎۲ " خواب باقی ہیں" ص ۲۰۵

کیا جائے۔ ان کو درمیان میں لانا ہی بیکار ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جنس کے تذکرہ سے عزیز احمد کا مقصد لذت اندوزی نہیں۔ وہ کبھی تو افسانوں میں رنگینی اور کشش پیدا کرنے کے لیے کبھی (مغربی) معاشرہ کے پیچ وخم کو حقیقت پسندانہ زاویہ سے واضح کرنے کے لیے اور کبھی موضوع کا حق ادا کرنے کے لیے جنس اور حُسن کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ویسے اس میں شبہ نہیں عزیز احمد حُسن پر فریفتہ ہیں اور حُسن خواہ کسی شے میں، کسی جگہ ہو وہ اُس کی پرستش کرتے ہیں۔ اس اقتباس سے اندازہ ہوگا:

"ریس کورس پر حُسن ہی حُسن۔ ہوا میں اُڑتے ہوئے ساڑیوں کے پلوؤں میں حُسن سَر سے ڈھلکتے ہوئے آنچلوں میں حُسن، سڈول جسموں کے اطراف لپیٹی ہوئی ساڑیوں کے شکنوں میں حُسن۔ چہروں میں حُسن، کٹی ہوئی لہراتی ہوئی زلفوں میں حُسن، نیلی شربتی کالی آنکھوں میں حُسن، چمکتے ہوئے ہموار دانتوں میں حُسن، ہاتھوں کے ہلانے، زبان کے ہلانے، ہونٹوں کی جنبش، قدموں کی رفتار میں حُسن۔ مَیں گھوڑ دوڑ کیا خاک دیکھوں۔" (بیکار دن بیکار راتیں)

سرور صاحب کے بیان کی تصدیق عزیز احمد کے ناولوں اور افسانوں کو پڑھتے ہوئے ہو ہی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک اور اقتباس:

"کالو وکیشن ہال میں نمائش تھی۔ بین الاقوامی نمائش سے مجھے کیا خاک دلچسپی ہوتی۔ مَیں تو اِن لڑکیوں کو دیکھنے آیا تھا جو نمائش دیکھنے آئی تھیں۔" (بیکار دن بیکار راتیں)

عزیز احمد کے افسانوں میں حُسن پرستی اور جنس، شاخِ گل میں بادِ سحرگاہی کے نم کی طرح ہوتی ہے۔ رنگینی اور رعنائی کی کیفیات کی حامل۔ یوں اُن کے افسانوں کی فضا رخاصی دلآویز ہو جاتی ہے۔ کہیں وہ اپنے طور پر حُسن پرستی کا اظہار کرتے ہیں اور کہیں اُن کے کردار حُسن کے متلاشی ہوتے ہیں لیکن یہ کوئی روایتی اور مشرقی انداز کی حُسن پرستی نہیں۔ یہ حسین تفریح جنس پرستی کے زمرہ میں آتی ہے۔ وقت بھی گزر جائے، پیاس بھی بجھ جائے۔ اور تفریح بھی ہو جائے۔ کمال یہ ہے کہ عزیز احمد جس ماحول کو پیش کرتے ہیں اُس حسن پرستی

اُس کا ایک جزو معلوم ہوتی ہے۔ بالعموم مغربی ممالک کی تفریح گاہوں اور وہاں کے آزادانہ ماحول میں پرورش پائے کرداروں کی روشنی میں ——— اس تناظر میں عزیز احمد جو بھی کہتے ہیں نہ وہ بے محل معلوم ہوتا ہے اور نہ پیوند سازی ——— اسی ماحول، واقعات اور کرداروں کی مطابقت کے باعث یہ باتیں لذت پرستی کے ذیل میں بھی نہیں آتیں، بلکہ افسانے کا ایک جزو لاینفک معلوم ہوتی ہیں۔ آزاد اگرچہ ہندوستانی ہے لیکن شہر ہے پیرس اور نمائش کا موقع موڈ بھی تفریحی ——— اب یہ پڑھیے:

"اس مجمع کو دیکھ کر آزاد نے ایک گہری سانس لی۔ کاش میرے ساتھ اس وقت میری کوئی دوست ہوتی۔ اس نے خیال کیا۔ یہیں کسی دوست کو کیوں نہ ڈھونڈوں۔ تروکاویرو سے وہ نیچے اُترا اور نمائش کی بھیڑ میں گم ہوگیا۔ ڈھونڈ رہا تھا کہ اُسے کوئی لڑکی اکیلی مل جائے یا زیادہ سے زیادہ دو لڑکیاں ہوں تو کسی ڈھب سے بات چیت شروع کرے۔ ایک گھنٹہ گذر گیا اور اس نے ہار مان لی۔ اُس نے کئی مرتبہ موقع اور بے موقع اشارے بھی کیے۔ آنکھ بھی ماری تھی۔ "معاف کیجیے میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے" بھی کہا۔ مگر کسی طرح کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ اور وہ دل برداشتہ ہو کے پھر تروکاویرو کے راستے سے نمائش سے باہر نکلا۔

یوں تو پیرس میں کئی لڑکیوں سے اس کی دوستی تھی مگر اس بار اُسے ایک نئی دوست کی تلاش تھی۔ یوں تو تازہ بتازہ نو بہ نو کا اصول اُسے ہر چیز میں پسند تھا۔

اس لیے بجائے اس کے کہ وہ کسی پرانی دوست کو دوسرے روز نمائش میں اپنے ساتھ لاتا اُس نے طے کیا کہ جس طرح ممکن ہو جلد سے جلد ایک نئی دوست ڈھونڈنی چاہیے تاکہ نمائش دیکھنے کا دُہرا لطف آئے۔"

عزیز احمد کے بیشتر کردار عاشق مزاج، نظر باز اور دل پھینک ہوتے ہیں۔ ہر وقت مخالف جنس کے متلاشی! عزیز احمد نے اپنے افسانہ "اور بستی نہیں یہ....." میں اپنے

تین کرداروں حسینی، ویاس اور کھڑک سنگھ کے بارے میں مرکزی کردار الف خاں کے تاثرات کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

"حسینی، ویاس اور اس سارے گروہ کی زندگی کا مقصد بجز کناٹ پیلس کے چکر کاٹنے اور لڑکیوں کو آوارہ بنانے، خود آوارہ گردی کرنے کے اور کچھ نہ تھا۔ ہر بڑے شہر میں اس قسم کے حشرات الارض ہوتے ہیں اُن کے لیے زندگی کی اور کوئی قدر نہیں ہوتی۔"

یہ تبصرہ حسینی، ویاس اور اس سارے گروہ ہی پر نہیں عزیز احمد کے تقریباً سارے کرداروں پر صادق آتا ہے۔ افسانہ پڑھیے، خود الف خاں بھی اس کی زد میں ہے۔ نیز اُن کا ایک اور کردار "آزاد" ــــــ خواہ وہ کسی افسانے میں ہو ہر جگہ اس کی حسن پرستی اور عاشق مزاجی جھلکتی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ "مموشکا" میں شولتزے، "زُون" میں سکندر "جُو سستا پیسہ" میں سیٹھ شیوداسانی، "زرّیں تاج" میں ارشد، "زرخرید" میں امجد، اور "کوکب" میں قریشی صاحب سب اسی حمام کے کردار ہیں۔ پھر یہی نہیں کہ مرد کردار ہی ایسے ہوں ان کے یہاں نسوانی کردار بھی دل پھینک اور خود کو سپرد کر دینے والے ہوتے ہیں کئی لڑکوں کی دوست اور مردوں سے جنسی قربت کی خواہاں! "خطرناک پگڈنڈی" کی ای دون کچھ اسی نوعیت کا کردار ہے۔ اس کی حقیقت کا اندازہ لگائیے:

"کچھ دیر بعد جب اُس نے ای دون کو سہارا دے کر گھاس پر سے اٹھایا تو اُسے ایک طرح کی طمانیت ہوئی۔ یہ لڑکی معصوم نہیں تھی اور وہ اس کی زندگی میں پہلا مرد نہیں تھا۔ اس سے پہلے کوئی اور کامریڈ، کوئی اور انقلاب پسند اور مادہ پرست، اس لڑکی کو چُوم چُکا تھا۔ اس کے جسم سے آزادی برت چکا تھا۔"

اور اب کسی نوجوان لڑکی پر ایک عمومی تبصرہ:

"چھیڑ سے بڑھ کر نوجوان لڑکی اور کسی چیز سے خوش نہیں ہوتی۔ خواہ وہ چھیڑ جسمانی ہو یا زبانی۔"

لیکن عزیز احمد کے یہاں یہی سب کچھ نہیں، یہ تو اُن کے افسانوں کا ایک رُخ ہے۔ اس سے قطع نظر ان کا رویّہ سنجیدہ ہوتا ہے اور وہاں بھی وہ گہرائی اور باریکی سے کام لیتے ہیں کہ اُن کے افسانوں کی سطح خاصی اُونچی ہو جاتی ہے۔ وہ افسانہ میں قصّہ کی دلچسپی برقرار رکھنے کے سارے سامان کرتے ہیں، افسانہ پن پر ان کی توجہ بھرپُور ہوتی ہے لیکن اسی کے ساتھ وہ افسانہ کو صرف قصّہ تک محدُود نہیں رکھتے بلکہ اس میں فلسفہ، تاریخ، سیاست، معاشرت، معیشت، تہذیب، نظریات، اصُول اور اقدار سب کچھ سمیٹ لیتے ہیں کہ افسانہ کا کینوس کشادہ، بے حد کشادہ ہو جاتا ہے اور قاری کے لیے خیال انگیز ـــــ اس طرح اُن کے افسانے ایک نئی جہت کا پتہ دیتے ہیں۔ اس اقتباس سے ان کے افسانوں کی معنوی تہہ داری کا اندازہ ہوگا :

> "میری بیکاری اس قسم کی نہیں، میری آنتیں بیکار نہیں، میرا دماغ بیکار ہے اور وہ اس لیے کہ سات پُشتوں سے میرے اجداد نے کبھی محنت نہیں کی۔ انھیں ایک بڑی ترکیب سُوجھی تھی۔ محنت دوسرے کریں اور کھائیں وہ خود۔ میرے اجداد نے قانون بنائے کہ وہ جو اُن کے لیے محنت کرتے ہیں خود کھانے سے محروم رہیں۔ اخلاق ایجاد کیے جنھوں نے ضمیر کو بے ہوش کر دیا۔" (بیکار دن بیکار راتیں)

اور اس ذیل کے اقتباس سے اندازہ ہوگا کہ وہ کس اثر انگیزی کے ساتھ برِّصغیر (غیر منقسم ہندوستان) کا نقشہ کھینچتے ہیں :

> "اے امیر المومنین! یہ اُس ملک کے سفر کا حال ہے جسے ہندوستان کہتے ہیں۔ جہاں دن رات سُورج چمکتا ہے مگر دن نہیں نکلتا۔ جہاں زمین سونا اُگلتی ہے مگر انسان کا پیٹ نہیں بھرتی جہاں رفعی، سانپ، بچھو طرح طرح کے حشرات الارض ہوتے ہیں مگر انسان سے زیادہ زہریلا اور کوئی کیڑا نہیں ہوتا جہاں سے ہزاروں طلسماتی داستانیں نکلتی ہیں مگر جو خود ایسا طلسم ہے جو کسی داستان میں سما نہیں سکتا۔ اے امیر المومنین، اسی مُلک

ہندوستان میں ایک شہر کلکتہ ہے۔"   (میرا دشمن میرا بھائی)

اور اس شہر کلکتہ کا احوال بھی ملاحظہ فرمالیں:

"جب میں تجارت کے لیے اس شہر میں پہنچا تو مجھ سے کسی نے کہا، یہ شہر طلسمات میں گرفتار ہے فرنگ کی ایک ساحرہ ہے جس نے اس پر جادو کر دیا ہے اس کی عمارتیں چار منزل پانچ منزل تک اٹھتی جاتی ہیں۔ اس کی سڑکیں کسی طلسمی شہر کی سڑکوں کی طرح کشادہ ہیں پھر بھی طلسمات کا یہ اثر ہے کہ ہزاروں آدمیوں کو ان چار منزل پانچ منزل کی عمارتوں میں رہنے کی جگہ نہیں ملتی حالانکہ ان میں سے اکثر عمارتوں میں ایک آدمی چار پانچ کمروں پر قابض ہے اور اکثر تو کئی کئی عمارتیں ایک ہی کی ملکیت ہیں مگر کسی کے کام نہیں آتیں اور سڑکیں جو راستہ چلنے کے لیے ہیں اُن پر راتوں کو ہزارہا انسان سوتے ہیں۔"

اور یہاں دیکھیے ہندوستان ہی کی تصویر کشی ــــ تلخ انداز میں لیکن کتنی بھاری حقیقت کو کیسی گہرائی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے:

"اور ان موجوں کی دوسری طرف ہندوستان ہے۔ یہ ایک بہت بڑا قبرستان ہے۔ جہاں چالیس کروڑ مُردے دفن ہیں۔ اور سب مردے بھوت بن گئے ہیں اور اس بات پر جھگڑ رہے ہیں کہ قبرستان کے دو ٹکڑے ہو سکتے ہیں یا نہیں ہو سکتے۔"   (جھوٹا خواب)

عزیز احمد نے جہاں تہاں بلاغت سے بھی کام لیا ہے وہ نہایت اختصار کے ساتھ لیکن جامع انداز میں اپنے خیالات کا نچوڑ پیش کر دیتے ہیں جس سے اُن کے ارتکازِ فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ ایک ایک دو، دو جملے ہیں لیکن اپنے اندر ایک جہانِ معنی رکھتے ہیں، قارئین کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہوئے۔ ان مسائل کے بارے میں ہم کو جھنجھوڑتے ہوئے جو ہمارے اطراف واکناف میں لیتے ہیں اور اپنی زندگی اور ہماری غفلت کی شہادت دیتے ہیں۔ سب سے پہلے برطانوی جنگی جہاز پہ نائب امیر البحر

کا یہ جملہ:

"ہندوستان نے اس جنگ میں دو ہی طرح کے اسلحہ سے ہماری مدد کی ہے۔ گورکھا سپاہی اور انفارمیشن افسر۔ ایک جان بیچتا ہے دوسرا ایمان"۔ (جھوٹا خواب)

وسط اُتر پردیش میں متوسط مُسلم گھرانوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس گھر میں یا خدا پر عقیدہ تھا یا پریوں، بھوتوں اور جناتوں پر۔ ابھی تک کوئی انسان سے واقف نہ ہونے پایا تھا"۔ (تصویرِ شیخ)

اور یہ جملے بھی ملاحظہ کرلیں، کتنی عمق کے حامل ہیں۔ ان میں فکر بھی ہے اور فلسفہ بھی:

"جو آسانی سے حاصل اور آسانی سے فنا ہو گیا وہ ہوس ہے اور جو مشکل سے حاصل ہوا اور کبھی فنا ہوا کبھی فنا نہیں ہوا، عشق ہے اور جو بڑی مشکل سے حاصل ہو کبھی فنا نہیں ہوگا عرفان ہے"۔ (زریں تاج)

"آوارگی کے قصّے عورت کی زندگی میں شروع ہوتے ہیں اور مرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتے"۔ (زریں تاج)

"دوست اور عشاق ایک دوسرے کی تابعداری کرتے ہیں۔ محبت ایک فریق کے استبداد اور دوسرے کی غلامی کو برداشت نہیں کر سکتی"۔

(مدن سینا اور صدیاں)

"عورتیں ہمیشہ چٹان کے کنارے رہتی ہیں اور ہر لمحے اُن کے گر کر پاش پاش ہو جانے کا امکان ہے"۔ (رقصِ ناتمام)

"عبادت گاہ کا اثر زائر اور عبادت گزار پر ہوتا ہے۔ عبادت گاہ، عبادت گزار پر چھا نہ جائے تو اس کی تعمیر مکمل کیونکر کہلائے"۔ (رومۃ الکبریٰ کی ایک شام)

اور اب کچھ خالص سیاسی تبصرے ـــــ اس امر کی صراحت ضروری نہیں کہ عزیز احمد ادب میں ہر چند کہ ترقی پسند خیالات کے حامل تھے لیکن ترقی پسند تحریک کو شدت کے ساتھ انھوں نے قبول نہیں کیا۔ اُن کے سیاسی خیالات بھی کچھ ایسے نہیں۔ مارکسزم اور کمیونزم سے تو اُن کی وابستگی کا سوال ہی کیا تھا؟ اپنی اس عدم وابستگی ہی کے باعث شاید انھوں نے بعض باتیں بڑی گہری اور کاری کہہ دی ہیں اور انداز بھی تکلف برطرف والا۔ یہاں وہ اشتراکیوں کو دو حصّوں میں تقسیم کرتے ہیں:

"ہندوستان میں اشتراکی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ پہلی قسم میں وہ لوگ ہیں جن میں سے صرف چند کو "قلب او کافر دماغش مومن است" کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس پہلی قسم کے زیادہ تر اشتراکی گورنمنٹ آف انڈیا یا صوبجاتی سرکاروں میں اچھے اچھے عہدوں پر فائز ہیں، ملک کے بہت سے ادیب، بہت سے شاعر، بہت سے اخبار نویس اسی قسم میں گنے جاتے ہیں۔"

(مدن سینا اور صدیاں)

آج سوویت روس کا انجام جو بھی ہوا ہو، بعض لوگ ابتدا ہی سے اس کے بارے میں شکوک و شبہات کا شکار تھے سوویت روس اور مارکسزم کے حامیوں کی تعداد خاصی سہی لیکن اس کے ناقدین اور معترضین بھی کم نہ تھے۔ بعض نے سیاسی بنیادوں پر اعتراض کیا، بعض نے محض تعصب سے کام لیا، بعض کے اختلافات کی وجہ کچھ اور تھی۔ بعض ایسے بھی تھے جنھوں نے خالص علمی نقطۂ نظر سے کام لیا اور معروضیت کو پیشِ نظر رکھا۔ مارکسزم کی معاشی اور تہذیبی بنیادوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کی کمزوریوں کو اُجاگر کیا۔ عزیز احمد کا شمار ایسے ہی افراد میں ہوتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ مارکسزم پر کسی سیاسی یا تہذیبی یا معاشی نوعیت کے مقالہ میں نہیں یہ باتیں وہ اپنے افسانوں میں کہہ جاتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا کینوس ہوتا ہی ایسا کشادہ اور لچکدار ہے کہ وہ اپنے عہد کے معاشرتی، معاشی، تہذیبی، سیاسی اور علمی و ادبی مسائل اور موضوعات اور افراد کی خدمات کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ اُردو افسانے کے اُفق کو ایسا کشادہ بہت کم نے کیا ہے اور اُن میں عزیز احمد کی حیثیت امتیازی ہے۔ مارکسزم

پر یہ تبصرہ حقیقت سے کسی قدر ہم آہنگ اور کیسے سُلجھے ہوئے لب ولہجہ میں ہے :

"یہ شبہ اس کے دل میں عرصہ سے کھٹک رہا تھا کہ مارکس معاشیین کا امام فلسفیانہ اسلحہ سے اچھی طرح مسلح نہ تھا۔ مابعد الطبیعات پر اچھی طرح حاوی ہوئے بغیر فلسفہ اور تہذیب کو انھیں کے ہتھیاروں سے شکست دیے بغیر مادیت ارتقار بالضد کوئی باقاعدہ فلسفیانہ نظام نہیں بن سکتی۔ مارکس کے بہت سے عقیدت مندوں نے اس قسم کا شک محسوس کیا تھا مثلاً بازاروف، بوگدانوف، لونا چارسکی، برمن، ہل فونڈ، پوش کے وِچ اور سود روف۔ انہی کے جواب میں لینن نے " مادیت اور تجرباتی تنقید" لکھی۔"

(مدن سینا اور صدیاں)

اس کے برعکس انھیں اقبال سے یہ شکوہ تھا کہ اقبال کے پاس معاشی نظام کی کوئی طاقت نہیں۔ بس یہ ایک جُملہ :

"اقبال کے تصورات کے پیچھے بھی معاشی نظام کی طاقت نہیں۔"

(بیکار دن بیکار راتیں)

اقبال سے تو انھیں اور بھی شکوے رہے۔ اگرچہ اقبال کی تفہیم میں عزیز احمد کا بھی اپنا حصہ رہا لیکن جہاں اقبال کی شاعری اور فلسفہ کے بعض پہلو انھیں قابلِ اعتراض محسوس ہوئے انھوں نے کسی رو رعایت کے بغیر اُن پر اظہارِ خیال کیا۔ اقبال مسولینی سے متاثر ہوئے، اس کی ستائش کی اور نظم لکھی۔ عزیز احمد کا بھی مسولینی کے کردار اور یورپ کی سیاست کا مطالعہ کم نہیں تھا۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ مسولینی اس کا استحقاق نہیں رکھتا تھا اور مسولینی پر اقبال کی نظم اُن کے کسی کمزور لمحے کی تخلیق ہے۔ یہ تاثر اس وقت کا ہے جب کہ مسولینی روم میں داخل ہو رہا ہے :

"رومۃ الکبریٰ میں اس قیصر کے خیر مقدم کی شان کو دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لیے بھی مرعوب نہیں ہوا۔ بہت دنوں سے اُس نے خدا کا شکر ادا نہیں کیا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے بھی جاہ و جلال کے اس پس منظر سے اس کی خودی کمزور نہ ہو سکی۔ وہ اشتراکیوں کے ہمدرد، اس بھیڑیے سے مرعوب

نہ ہوا۔ اس سے وہ غلطی سرزد نہ ہوئی جو مشرق کے سب سے بڑے شاعر سے کمزوری کے لمحے میں سرزد ہوئی تھی۔" (رومتہ الکبریٰ کی ایک شام)

اور یہاں حالی بھی عزیز احمد کی زد میں آ گئے۔ ویسے خود حالی کو بھی اعتراف ہے کہ ان کی شاعری "اُبالی کھچڑی" ہے۔ عزیز احمد بھی تو یہی کہتے ہیں:

"لیکن ان لیڈر صاحب کی ایک صفت سے آزاد کو بڑی طمانیت ہوتی تھی۔ ان کا وعظ مسدس حالی کی طرح روکھا پھیکا نہ ہوتا تھا۔"

(رائیگاں تبسم)

اور یہ ہندوستان اور اردو ادب سے دور، کروچے کی اظہاریت پر تبصرہ:

"کروچے نے اپنی اظہاریت میں سلطنت کے دخل در معقولات کے حق کو تسلیم کر لیا۔" (رومتہ الکبریٰ کی ایک شام)

عزیز احمد نے زیادہ تر افسانے دوسری جنگِ عظیم کے دوران تحریر کیے۔ چنانچہ اُن کے بیشتر افسانوں میں دوسری جنگِ عظیم کا حوالہ بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر ضرور ملتا ہے۔ وہ جنگ کے واقعات کو یا تو افسانے کے پس منظر کے طور پر استعمال کرتے ہیں یا ان واقعات کا حوالہ دیتے گزرتے ہیں یا جنگ کے اثرات کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں "زرّیں تاج" اور "بیکار دن بیکار راتیں" میں جنگ کا پس منظر حاوی ہے۔ بلیک آؤٹ، جنگی جہازوں کی گھڑگھڑاہٹ، خوف و دہشت کی فضا، ٹینکوں اور توپوں کی گھن گرج، فوجی لاریوں اور مشین گنوں کا شور، سائرن کی خوفناک آواز، پٹرول کی راشننگ اور قیمتوں کی افزونی —— یوں وہ اپنے افسانوں میں ایک واقعی فضا پیدا کر لیتے ہیں۔ جنگ کے پہلے دن کا منظر ملاحظہ ہو:

"آج جنگ کا پہلا دن تھا سب جگہ بلیک آؤٹ تھی لیکن چاند نے اپنا ٹھنڈا سا چراغ آسمان پر جلا رکھا تھا اور سوئی ہوئی زمین پر انسان یا سنہرے خواب دیکھ رہے تھے یا ایک دوسرے کو تباہ کرنے میں اسی روشنی سے مدد لے رہے تھے۔ یہ عجیب طرح کی ٹھنڈی روشنی ہے۔ چاند کی روشنی

جس سے دو طرح کے جنون کی قندیلیں جلتی ہیں۔ جنگ کے جنون کی اور
عشق کے جنون کی۔" (زرّیں تاج)

یہ تو جنگ کا پہلا دن تھا۔ جنگ میں کون جیتا اور کون ہارا، اس کی اہمیت اپنی جگہ لیکن یہ بات زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ جنگ کے دوران اور جنگ کے بعد عام آدمی کتنا متاثر ہوا۔ عزیز احمد نے اپنے افسانوں میں بالعموم حقیقت پسندی سے کام لیا ہے لیکن ایسے مواقع پر اُن کی حقیقت پسندی اور زیادہ حقیقت پسند ہو جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ افسانہ نہیں، واقعی کوئی زیست کر رہا ہے۔ ان چند اقتباسات سے اندازہ ہوگا:

"پھر اس موضوع پر گفتگو ہونے لگی کہ جنگ کی وجہ سے بمبئی میں مکان اور فلیٹ نہیں ملتے۔ پگڑی دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ سیکڑوں کی جگہ ہزاروں کی پگڑی دو، تب کہیں جا کے کوئی فلیٹ لو۔"

(بیکار دن بیکار راتیں)

"جب جنگ شروع ہوئی تو میں نے کہا اب جرمن دوائیں نہیں آنے کی۔ میں نے بمبئی کے ہر کیمسٹ کی دوکان سے بھر بھر کے دوائیں خریدیں۔ اس میں کوئی دس بیس لاکھ بنا لیے۔" (سستا پیسہ)

"بنچ محل تک وکٹوریا کا کرایہ دو روپے ہوا۔ جنگ سے پہلے وکٹوریا والا بارہ آنے لیتا تھا۔" (بیکار دن بیکار راتیں)

عزیز احمد پیدا تو شمالی ہند میں ہوئے لیکن اُن کا بچپن اور جوانی کا زمانہ حیدرآباد میں گزرا۔ یہیں اُن کی ساخت پرداخت ہوئی اُن کی ذہنی نشو و نما بھی۔ یوں حیدرآباد کو اُن کے وطن کی حیثیت حاصل ہے۔ اُن کے کئی ناولوں اور افسانوں کے پس منظر اور اُن کے کردار اور واقعات وغیرہ کا تو حیدرآباد ہی سے تعلق ہے۔ خاص طور پر "ہوس" "مرمر اور خون" "ایسی بلندی ایسی پستی" اور "شبنم" ناولوں کے کردار اور مقامات حیدرآبادی

ہیں۔ اور آج بھی کئی کردار بقیدِ حیات ہیں جنھیں عزیز احمد نے فکشن کا روپ دے دیا ہے۔ اسی طرح اُن کے بعض افسانے "پاپوش"، "یوشا مالن" اور "رقص ناتمام" وغیرہ حیدر آباد معاشرتی پس منظر کے علاوہ، اپنے کرداروں، مقامات اور حیدر آبادی اُردو کے مقامی رنگ اور لب ولہجہ کی وجہ سے چاشنی کے حامل ہیں۔ اس کے علاوہ بھی اپنے دیگر کئی افسانوں میں انھوں نے جہاں تہاں حیدر آباد کے تذکرے کی گنجائش نکالی ہے۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں:

"تین دن تک وہ شہر میون شن (جس کو انگریز میونک کہتے ہیں اور حیدر آباد کے اُردو اخبارات میونخ) کی سڑکوں اور گلیوں کی خاک چھانتا رہا۔"

یا کہیں انھوں نے لکھا ہے "لاسلکی حیدر آباد میں ریڈیو کو کہتے ہیں" ونیز اُن کے ہاں حیدر آباد کے بدنام محلہ محبوب کی مہندی کا بھی تذکرہ ہے۔ بنجارہ ہلز کا ذکر تو انھوں نے کئی جگہوں پر مختلف ناموں سے کیا ہے۔ مہاراجہ کشن پرشاد، سر اکبر حیدری اور نظام الملک آصف جاہ جیسی شخصیتوں کے بارے میں بھی ہے اور حیدر آباد کے جاگیر داروں اور امراء کے روز و شب، سیاسی اونچ نیچ، آویزش، باہمی رقابتیں، معاشرتی آداب، رنگ ڈھنگ کو بھی انھوں نے ترقیم کر دیا ہے۔ حیدر آباد میں خواتین کا پردہ کس رنگ کا تھا خاص طور پر کشن پلی (بنجارہ ہلز) کے علاقہ میں، ملاحظہ ہو:

"کشن پلی میں کوئی بھی پردہ نہیں کرتا۔ ان پہاڑیوں میں پردہ تو پردہ تخلیہ بھی ذرا مشکل ہی ہے۔ بنگلے ٹیلوں پر اور نشیبوں میں اس طرح بکھرے ہیں کہ ہر ایک بنگلہ دوسرے کے لیے منظرِ عام ہے۔ مکانوں کو ہوادار بنانے کے لیے کھڑکیوں کی وہ کثرت ہے کہ ایک مکان سے دوسرے مکان کے کمرے کا سارا فرنیچر گن لیجیے۔ اس لیے نواب دلبر علی خاں کے گھرانے میں پردہ کا کوئی خاص اہتمام نہ تھا۔" (پاپوش)

اور یہی پردہ کسی تخصیص کے ساتھ، سکینہ بیگم اور نواب دلبر علی خاں کی لڑکیوں کے حوالہ سے:

"سکینہ بیگم اور نواب دلبر علی خاں کی دو لڑکیاں بھی تھیں۔ ایک زینب تھی جو اَب کوئی سولہ سترہ سال کی ہو گئی تھی۔ زینب پر پابندی تو زیادہ نہ تھی مگر وہ ماں باپ سے پوچھے بغیر دل افروز، مہر نگار، شوبھا یا کسی اور "آپا" کے بنگلے نہ جا سکتی تھی۔ جب دفتر کے وقت ان آپاؤں کے میاں چلے جاتے تب وہ کبھی سکینہ بیگم کے ساتھ کبھی اپنی چھوٹی بارہ سالہ بہن شہر بانو کے ساتھ ان کے یہاں جاتی۔ یوں اِن لڑکیوں پر پردے کی کوئی سخت پابندی نہ تھی برآمدے میں وہ عموماً پھرتی رہتیں۔ محلّے کے دو ڈھلے بھائیوں میں سے کسی سے آمنے سامنے آ کے بات چیت تو نہ کرتیں مگر دُور سے اُن کو دیکھ کر چھُپنے کی بھی کوشش نہ کرتیں اور کشن پلی میں کوئی کسی سے چھُپتا ہی نہ تھا۔"

(پاپوش)

اس سلسلے میں ایک اور بات: عزیز احمد کو حیدر آباد کی مقامی زبان لکھنے پر بھی بڑی دسترس حاصل تھی۔ وہ اس امر کو محسوس کرتے ہوئے کہ اُردو ادبی زبان کی حیثیت سے شمال ہو کہ جنوب، مشرق ہو کہ مغرب ایک ہی صورت رکھتی ہے لیکن جہاں تک زبان کے بولے جانے کا تعلق ہے، مقامی حالات، علاقائی زبانوں کے اثرات اور تہذیبی و معاشرتی اسباب وعلل کے سبب، ہر علاقے کی زبان کچھ مختلف، کچھ امتیازی حیثیت ضرور رکھتی ہے۔ حیدر آباد کی مقامی زبان کا بھی یہی حال ہے۔ خصوصاً گھریلو عورتوں اور ملازمین اور بازار میں زیادہ تر یہی ذریعۂ اظہار ہے۔ عزیز احمد کے ناولوں اور افسانوں میں جہاں کہیں ایسے کردار آئے ہیں اُن کی زبان پر مقامی اثرات کی چھاپ محسوس کی جا سکتی ہے۔ مثلاً خاص طور پر افسانہ "پاپوش" میں سکینہ بیگم، نواب دلبر علی خاں اور دل افروز کے مکالموں میں یہ رنگ نکھرے ہوئے انداز میں سامنے آتا ہے۔

عزیز احمد کو زبان و بیان پر بڑا قابو ہے۔ انھیں الفاظ کا مزاج داں کہنا چاہیے۔ لفظوں کے استعمال اور جملوں کے دروبست پر وہ پوری گرفت رکھتے ہیں۔ اور کرداروں اور موضوع کے اعتبار سے موقع و محل کو ملحوظ رکھتے ہوئے زبان کے استعمال پر انھیں قدرت

حاصل ہے۔ معنوی سطح کو تہہ دار بنا دینے اور مفہوم میں دلکشی پیدا کرنے کا ہنر بھی وہ جانتے ہیں چنانچہ حسین، دلکش اور رنگین لیکن موزوں تشبیہات سے انھوں نے عمدگی سے کام لیا ہے کہ افسانوں کی معنوی فضا اور بھرپور اور دلکشی اور افزوں ہو جاتی ہے۔ میں یہاں چند ایسے ہی جملے درج کرتا ہوں جن سے زبان کے تعلق سے اُن کے فن کارانہ عمل کا اظہار ہوتا ہے:

"یہ کہہ کے اُس نے باغیچے کا دروازہ کھولا اور کسی عجیب راز کی طرح درختوں کی تاریکی میں غائب ہو گئی۔ (حموشکا)

"ہم سب وہاں سے آگے چلتے ہیں کسی اور جنگل میں جو زُلفوں کی طرح تاریک ہے"۔ (زرّیں تاج)

"دونوں ہاتھوں کی پانچ پانچ اُنگلیاں، ہتھیلیاں سمیت اُس نے انکار میں اس طرح ہلائیں جیسے دو گورے سانپ ساتھ ساتھ اپنے پھَن پھیلائیں"۔ (زرخرید)

"دور میلوں تک سمندر پہ چاندنی اور دُھند میں خاموش سی آویزش تھی۔ یہ سب چور بازار کے سگریٹوں کا دُھواں معلوم ہوتا تھا"۔ (ستاپیسہ)

"اس کے چہرے پر وہ چمک آئی جو کسی دوشیزہ پر بدکاری کی پہلی ترغیب انگیز دعوت کے ساتھ آتی ہے"۔ (ستاپیسہ)

"اُس نے بجائے آہستہ آہستہ پینے کے ایک بڑا سا گھونٹ حلق سے اُتارا۔ اس طرح نہیں جیسے کوئی محبوبہ کا ہلکا سا پیار لے اس طرح جیسے کوئی

کسی قحبہ کے گال میں کاٹ کھائے۔" (سستا پیسہ)

"اب کے پھر برانڈی کا گلاس اُس نے اس طرح مُنہ سے لگایا جیسے کوئی اپنی باعصمت محبوبہ کی کالی مخملیں زلفوں کا بوسہ لے۔"
(سستا پیسہ)

"رام لال نے بڑی احتیاط سے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مَسل کے بُجھایا اور وہسکی کا ایک ہلکا سا گھونٹ اس طرح لیا گویا یہ اُس سیاہ پوش انگریز لڑکی کے بالائی کے بنے ہوئے رخساروں کا لمس تھا۔"
(سستا پیسہ)

عزیز احمد نے شعر گوئی پر زیادہ توجہ نہیں دی ہو لیکن وہ شاعر بھی ہے۔ اُن کے شعری مجموعے "مہ لقا اور دُوسری نظمیں" اور "سینورینا نے کہا" شائع ہو چکے ہیں۔ گزشتہ صفحات میں دیے گئے اُن کے افسانوں کے کئی اقتباسات سے اندازہ ہو گا کہ انھوں نے کہیں کہیں نثر میں بھی شاعری کی ہے۔ خصوصاً منظر نگاری کے ضمن میں اُن کا قلم جادو جگاتا ہے۔ اُن کا رومانی اندازِ بیان، شگفتہ اور حلاوت آمیز کہ پڑھیے اور بڑھتے چلے جائیے۔ گزشتہ صفحات کے کئی اقتباسات سے اس کا اظہار ہو ہی چکا ہے۔ مَیں یہاں ایسے ہی شاعرانہ اسلوب کی بس ایک اور مثال پیش کروں گا۔ کتنا سرشار اور دلآویز اسلوب ہے:

"فارسی اشعار تھے کہ بادلوں کی طرح اُمڈتے یاد آتے چلے جاتے تھے۔ اس نے حسین رات کی طرف دیکھا۔ معشوقوں کی طرح دلربا اور خونریز معشوقوں کے رُخِ زیبا جیسا چاند، اُن کی آنکھوں کی طرح چمکتے ستارے، اُن کی زُلفوں کی طرح سیاہ درختوں اور چٹانوں کے سائے۔ اُن کی پلکوں کی طرح سڑک کے کنارے صف بستہ درخت، اُن کی حنائی اُنگلیوں اور

سُرخ ہونٹوں کی سرخ سرخ " (زرّیں تاج)

فنّی طور پر عزیز احمد کے افسانے نئی منزلوں کا پتہ دیتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو انھوں نے اُردو افسانے کو کئی پہلوؤں سے نکھار دیا اور اس سلسلے میں مغربی ادبیات سے گہری واقفیت اُن کے کام آئی۔ اہم بات یہ ہے کہ اُن کے افسانوں میں کوئی بندھا ٹکا پلاٹ نہیں ہوتا۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اُن کے ہاں کوئی روایتی انداز کا پلاٹ ہوتا ہی نہیں اسی لیے قاری کو اُن کے افسانوں میں ایک بکھراؤ کا احساس ہوتا ہے لیکن باطنی طور پر ہر بات اور ہر واقعہ ایک دوسرے سے مربوط اور منسلک کہ معنوی طور پر افسانہ میں وحدت پائی جاتی ہے۔ یہی وحدت اُن کے ہاں ایک گہرائی اور وزن پیدا کرتی ہے۔ اور اُن کے افسانوں کی سطح کچھ اُونچی ہو جاتی ہے۔

جہاں تک افسانے کی ابتدا اور اس کے انجام کا تعلق ہے، یہاں بھی عزیز احمد نے اپنی امتیازی حیثیت برقرار رکھی ہے اُن کے افسانے بالعموم غیر رسمی انداز میں اور کبھی کبھی تو ایک جھٹکے کے ساتھ شروع ہوتے ہیں کہ قاری اپنے ماحول سے ہٹ کر فوراً عزیز احمد کے افسانے کی فضا میں پہنچ جاتا ہے۔ "ستنا پیسہ"۔ "رقصِ ناتمام"۔ اور "زون" جیسے افسانوں سے اندازہ ہوگا۔ اسی طرح اُن کے زیادہ تر افسانوں کا انجام غیر متوقع اور اچانک ہوتا ہے۔ قاری محسوس کرتا ہے کہ ابھی کچھ اور ہوگا یا اختتام کچھ ایسا ہوگا لیکن ورق اُلٹتے ہی معلوم ہوتا ہے کہ افسانے کچھ ڈھنگ سے اپنے انجام سے ہمکنار ہوگیا۔

موضوعات اور مواد کے بارے میں اس سے کوئی انکار نہیں کرے گا کہ عزیز احمد کے یہاں ایک اچھوتا پن پایا جاتا ہے۔ وہ لبسا اوقات نُدرت سے کام لیتے ہیں۔ "مدن سینا اور صدیاں" میں انھوں نے کئی داستانوں کو جو مختلف ادوار اور مختلف ممالک سے تعلق رکھتی ہیں ایک لڑی میں پرو کر تکنیکی طور پر نئے پن کا مظاہرہ کیا ہے اور زمان و مکاں کی وسعتوں کو سمیٹنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ "تصورِ شیخ" میں عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی کی کیفیات کی تصوف کے آئینہ میں عکاسی ہے۔ "رقصِ ناتمام" اور "بیکار دن بیکار راتیں" بھی اپنی تکنیک کے اعتبار سے متوجہ کرتے ہیں۔ کردار نگاری کے بارے میں جیساکہ عرض کیا جاچکا ہے، مختصر یہ ہے کہ عزیز احمد

کردار نگاری میں اعتدال سے کام لیتے ہیں اُن کے یہاں جذباتیت ہے لیکن اُن کے کردار اپنا توازن نہیں کھوتے۔ منظر نگاری میں تو اُن کا جواب نہیں۔ اسی طرح واقعات اُن کے افسانوں کا اہم عنصر ہوتے ہیں۔ فطرت نگاری اور حقیقت نگاری کی وجہ سے اُن کے واقعات میں ایک جان پڑجاتی ہے۔ واقعات نگاری سے عزیز احمد نے بڑا کام لیا ہے۔ اُن کا ہر افسانہ اپنے عہد کے واقعات سے عبارت ہوتا ہے۔ کہیں پس منظر کے طور پر، کہیں بطور حوالہ اور کہیں اشارۃً وہ اپنے عہد کے معاشی، معاشرتی، سیاسی اور ادبی حالات کا نہ صرف بیان کر جاتے ہیں بلکہ اُن پر اظہارِ خیال بھی کرتے ہیں۔ کبھی اپنے طور پر اور کبھی اپنے کرداروں کی زبانی کہ اُن کے افسانے اپنے دور کی تفسیر بن جاتے ہیں ___

___ ان سب کے ساتھ اپنے دلآویز اسلوب کی وجہ سے بھی اُن کے افسانے قاری کے لیے بڑی جاذبیت رکھتے ہیں۔ آج سے لگ بھگ نصف صدی قبل ہی اُن کے افسانے نئے اور اچھوتے محسوس ہوتے تھے اور آج بھی ندرت اور بانکپن کے باعث اُن کے افسانوں کی انفرادی حیثیت برقرار ہے۔ عزیز احمد نے مواد اور فن دونوں زاویوں سے اردو افسانے کی مرتبت کو بلند کیا کہ اُن کے افسانے مغربی روایات اور رُجحانات کے حامل محسوس ہوتے ہیں۔ لیکن اُن کے ہاں مغرب کی تقلید بھی نہیں۔ مغرب سے استفادہ کے باوجود، مغرب سے ہٹ کر عزیز احمد کے افسانے اُردو افسانے ایک نئی جہت اور ایک نئے سفر کی نوید ہیں۔

○○

باغبان

ندی کے کنارے ایک چھوٹا سا باغ تھا۔

باغ کی سطح ذرا نیچی تھی، اور کبھی کبھی برسات میں ندی کا پانی، باغ کے نشیبی حصوں میں پہنچ جاتا تھا۔ پاس ہی سے سڑک گذرتی تھی، جہاں سے باغ کا منظر قابلِ دید تھا۔ راہ گیر جاتے جاتے ضرور نظر بھر کر پھولوں کے تختے کو دیکھ لیتے۔ اور بچے ندی کے پُل پر بیٹھ کر پھلوں پر للچائی ہوئی نظریں ڈالتے۔

ندی آہستہ آہستہ بہتی، اور درختوں کا سایہ اُس پر لرزتا ہوا معلوم ہوتا۔ ہوا چل کر ٹہنیوں کو ہلاتی، اور پھول رقص کرنے لگتے۔ انسان کا تھکا ہوا دماغ دن بھر کے کام کاج کے بعد فطرت کی ان دلکشیوں میں کس قدر لطف پاتا ہے۔

اس باغ کا مالک جب دن بھر کی محنت کے بعد اس باغ میں آتا ہے تو اس کی مسرت کی کوئی انتہا نہ ہوتی۔

لیکن ایک ہستی ایسی بھی تھی، جس کو اس باغ سے بے پایاں محبت تھی۔ وہ اس باغ کا مالی تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس باغ کا مالی جس نے اپنا خون پسینہ ایک کر کے اِن پودوں کو پالا پوسا تھا۔ گرمیوں میں ان کو پانی دیا تھا، دن دن بھر ان پودوں کی تراش خراش کی تھی۔ اور ان کی زندگی اور ترقی کا خیال اس کا نصب العین بن گیا تھا۔

وہ اکیلا تھا۔ اُس کا کوئی رشتہ دار نہ تھا ـــــ شاید کوئی دُور کا عزیز ہو۔ مگر ایسا تو کوئی نہ تھا جس کی کفالت اس کے ذمّہ ہو۔ اس لیے بھی باغ اس کے لیے دنیا تھا۔ اس کی ساری محبت ان پودوں میں محصُور ہو گئی تھی۔ وہ ان کو پروان چڑھتے دیکھ کر خوش ہوتا، جیسے کوئی اپنے بچوں کو پروان چڑھتے دیکھ کر خوش ہو۔ تنخواہ اس کی تن پوشی کے لیے کافی تھی۔ اور اسے لے دے کے اگر کوئی فکر تھی تو صرف باغ کی۔

وہ باغ کی خدمت اس لیے نہیں کرتا تھا کہ یہ اس کا فرض تھا۔ غالبًا اُس نے اپنے فرض کو کبھی محسوس نہیں کیا۔ وہ پودوں کو اپنے بچّے سمجھتا، اور ان سے محبت کرتا۔ جیسے کوئی باپ اپنے بچّے سے محبت کرے۔

جب ہوا پھُولوں کی بھینی بھینی خوشبو کو اُڑا کر پریشان کرتی تو مست ہو جاتا! اس کے دل میں محبت کا پاکیزہ ترین جذبہ تھا۔ اور یہ اسی محبت کا اثر تھا کہ وہ ان پھُولوں کی خوشبو میں ایک خاص فرحت اور لذّت پاتا۔ وہ اکثر محبت بھری نظروں سے ندی کو تکا کرتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ندی اس کے باغ کے پاس سے بہتی تھی۔ اور اس کے درختوں کو پانی دیتی تھی۔

اور اس طرح اس کی زندگی، مسرت، کیف اور لطف سے لبریز تھی۔ یہ سب محبت کا اثر تھا۔ اور محبت جو ہر دل میں کم و بیش موجود رہتی ہے، اس کے دل میں بھی تھی۔ اور اسے دنیا و مافیہا سے بے پروا بنا چکی تھی۔

اس کا مالک جب باغ میں آتا، اور باغ کی ترو تازگی کو دیکھتا تو ٹھنڈی سانس بھر کر کہتا "یہ سب مالی کی محبت کا اثر ہے۔ ہر ہر پھُول سے مالی کی محبت کی خوشبو آ رہی ہے۔"

شاید وہ اپنی محبت کو یاد کرنے لگتا، جو اس کے نوجوانی کے زمانے کی بہترین یادگار تھی۔

(۲)

دن گذرتے گئے۔ مالی بُڈھا ہوتا گیا، اور درخت تناور ہوتے گئے۔

اس کے مالک نے باغیچہ دوسرے کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ باغبان اب بہت بڈھا ہو گیا تھا، درختوں کو اب بڈھے کی خدمات کا احتیاج نہ تھا۔ بڈھے کے ہاتھ پیر، اب درختوں کی خدمت کر بھی نہ سکتے تھے۔ حالاں کہ اس کی دلی محبت بڑھتی جارہی تھی۔ اس کی حالت ان پرندوں کی سی تھی جو درختوں کی ٹہنیوں پر بیٹھ کر اور پھولوں سے مخاطب ہو کر نغمہ سرائی کرتے۔ بڈھا مالی بہت فرطِ مسرت سے کوئی دیہاتی راگ گانے لگتا۔

ایک دن نئے آقا نے بڈھے مالی کو بلا کر کہا "یہ لو اپنی تنخواہ۔ اب تم بڈھے ہو گئے، باغ تم سنبھال نہیں سکتے، جاؤ اور گھر بیٹھ کر اللہ اللہ کرو۔ اب تم کام نہیں کر سکتے اور یہ خدا کو یاد کرنے کا زمانہ ہے۔ اور یہ لو انعام۔"

بڈھے مالی نے ہاتھ جوڑ کر کہا "حضور میری ایک تمنا پوری کر دیں گے؟"

"کیا؟"

"مرنے کے بعد میری قبر پر اس باغ کا ایک پھول ڈال دیجیے گا؟"

یہ کہہ کر کہنہ سال باغبان نے ایک سرد آہ بھری، اور لاٹھی ٹیکتا ہوا باہر نکل گیا۔

○○

تصوّرِ شیخ

جاڑوں کے دن تھے۔ میاں واجد نے کرتے کے دامن سے اپنی سڑ سڑ بہتی ہوئی ناک پونچھی۔ صدری کا بیچ کا بٹن ٹوٹ گیا تھا۔ ایک ہاتھ اپنی صدری کے اندر ڈال کے جسم کھجانے لگے۔ دوسرے ہاتھ سے خشخشی بالوں سے بھرا ہوا کالا کسیرو سر کھجایا۔ میاں واجد کی عمر اب کوئی چودہ سال کی ہوگی۔ مگر ان کے کالے چیچک زدہ چہرے پر جوانی کی بہار صرف کالے بدنما رونگٹوں کی شکل میں نمودار ہو سکی تھی۔

آمنہ باجی ان کی بڑی پھوپھی زاد بہن کی آواز باورچی خانے سے آئی۔ "واجد ذرا منہ ہاتھ تو دھوؤ آدمی بنو۔ تمہارے بھائی درگاہ شریف سے آتے ہوں گے.... ارے سکینہ او سکینہ چل بیٹا جلدی سے دسترخوان بچھا۔"

میاں واجد نے آنکھیں ملیں۔ صبح اٹھنے اور حوائج ضروری سے فارغ ہونے کے بعد سے اب تک وہ برابر سر کھجانے اور آنکھیں ملنے میں مصروف تھے۔ پھر باورچی خانے جا کے انہوں نے آمنہ باجی سے گرم پانی مانگا۔ اس نے اپنے ملگجے بادامی دوپٹے سے کیتلی پکڑ کے تھوڑا سا پانی ان کے لوٹے میں ڈال دیا۔ یہ باورچی خانے کے آگے ہی موری کے کنارے پیڑھی بچھا کے دانت مانجھنے لگے۔ اور کوئلے کی سیاہی سے تھوڑی ہی دیر میں ان کے دانتوں کی رنگت بھی ان کے چہرے کی سی ہو گئی۔

یہ موری گھر کے اندرونی آنگن میں بڑی خصوصیت رکھتی تھی۔ باورچی خانے،

غسل خانے' پاخانے سب کی غلاظت اسی سے ہوتی ہوئی بہتی تھی۔ اور اس کا رنگ بدلتا جاتا تھا۔ گرمیوں میں تو خیر اس کی بو قابل برداشت ہوتی۔ لیکن جاڑوں میں بھی سوائے اس گھر کے رہنے والوں' مکھیوں اور کلبلاتے ہوئے کیڑوں کے کوئی اس موری کو نظر بھر کے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ غزل کے پہلے اور دوسرے مصرعوں کی درمیانی خالی جگہ کی طرح یہ آنگن کے بیچوں بیچ بہتی تھی۔ اور گرمیوں میں جب پلنگ باہر ڈالے جاتے تو کبھی یہ کسی کے سرہانے بہتی کبھی کسی کے پائینتانے۔ اس گھر کے رہنے والوں کو اس سے مفر نہیں تھا۔ جس طرح شاعر کو قافیے اور ردیف سے نجات نہیں۔

گھر کی ساخت وہی تھی جو وسط یوپی کے دیہاتوں میں عام ہے۔ سڑک کے کنارے دو کمرے تھے جن پر چونا پڑا تھا۔ دونوں صاف تھے۔ دونوں میں تخت بچھے تھے اور تختوں پر گاؤ تکیہ اور چاندنی کا فرش تھا۔ ان میں سے ایک دیوان خانہ تھا۔ دوسرا مہمان خانہ۔ دونوں کے بیچ میں ایک بڑا سا دروازہ تھا اور اندر آنے کی گلیاری۔ ان کمروں کے بعد مردانہ صحن آتا تھا' جس میں ایک چبوترہ تھا جس پر گرمیوں میں گرم گرم خاک رہتی اور برسات میں لانبی لانبی گھاس اور طرح طرح کے کیڑے۔ اور کبھی کبھی ایک آدھ گرگٹ۔ سیدھے ہاتھ پر ایک بڑا سا کمرہ تھا اس کے بعد ایک اور گلیاری جس پر ٹاٹ کا پرانا پھٹا ہوا پردہ پڑا رہتا۔ اس پردے کے بعد زنانہ آنگن تھا۔ جس میں یہ مشہور و معروف موری بہتی تھی۔ زنانے صحن میں تین طرف دالان تھے۔ اور ہر دالان کے ساتھ دو دو کوٹھڑیاں اور ایک طرف جدھر ٹاٹ کا پردہ تھا' ادھر باورچی خانہ' غسل خانہ وغیرہ۔ اسی گھر میں چودہ سال پہلے میاں واجد نے آنکھیں کھولی تھیں۔ ان کی زچگی ایک ان پڑھ گنوار سی دایہ نے کی تھی۔ کسی نے ان کی آنکھوں میں سلور نائٹ ریٹ نہیں ڈالا۔ ان کی ماں اسی زچگی میں سپٹی سیمیا ہو کے ختم ہو گئیں۔ گھر بھر کی عورتوں کا عقیدہ تھا کہ ادھر باہر کے آنگن میں جو سوکھا سا انار کا درخت ہے یہ اس پر رہنے والی پریوں کی کارستانی تھی۔ واجد کے چچا زاد بھائی سید بسم اللہ شاہ معروف پریوں سے زیادہ مشیت ایزدی کو اپنی بیوی کی ممانی کی اس بے وقت موت کا ذمہ دار قرار دیتے تھے۔ اس گھر میں یا خدا پر عقیدہ تھا یا پریوں' بھوتوں اور جناتوں پر۔ ابھی تک کوئی انسان سے واقف نہ ہونے پایا تھا۔

درگاہ شریف میں محض پریوں کا نہیں چڑیلوں کا بھی علاج ہوتا تھا۔ بیسیوں عورتیں

دیوانیوں کی طرح قبروں کو پھلانگتی ایک دیوار سے دوسری دیوار تک دوڑتیں۔ اور دیواروں پر دوہتڑ مارتیں۔ جو زیادہ "چڑیل" قسم کی چڑیلیں تھیں۔ وہ دیواروں اور قبروں سے سر پھوڑتیں۔ یہ سب عورتیں اپنے ظالم خاوندوں یا ظالم تر ساسوں اور نندوں سے بھاگ بھاگ کر آئی تھیں۔ بعض ڈھونگ رچائے تھیں بعض کا ڈھونگ ہسٹریا بن گیا تھا۔ کہیں کہیں وہ ہلکا سا خط عبور ہو گیا تھا جو ہوش اور سچ مچ کی دیوانگی کے درمیان ہے۔ بہت سی عاشقوں کی تلاش میں گھروں سے بھاگ بھاگ کر آئی تھیں۔ یہاں سب کی مراد پوری ہوتی تھی، مشرقی دیوار کے قریب "کڑھائی" تھی۔ یہ ایک گڑھا سا تھا۔ جب کوئی چڑیل اس کڑھائی میں جا گرتی تو حضرت صاحب کے غضب سے جل کر راکھ ہو جاتی اور جس عورت پر اس نے قبضہ کیا تھا وہ تھکی تھکائی لیکن بھلی چنگی ہو کر نکلتی۔

سید بسم اللہ شاہ ---- حنائی ریش، دوپلی ٹوپی، انگرکھا، چست پاجامہ، ہاتھوں میں ارض مقدس کی تسبیح لئے ہوئے درگاہ شریف میں فاتحہ پڑھ کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں گھسیٹے نے ہاتھ جوڑ کے گھر والی کا حال کہا۔ "ہجور تاویج گھول کے پلایا۔ اب تو سسری جرا ٹھیک ہے۔" سید بسم اللہ شاہ نے تسبیح پڑھتے پڑھتے سر کے اشارے سے "اچھا" کہا۔ اور اسی طرح وظیفہ میں مشغول گھر کی طرف بڑھتے گئے۔ گھسیٹا اپنا لٹھ لئے جس کے سرے پر تارکول چڑھا ہوا تھا مودبانہ پیچھے پیچھے چلا۔ تسبیح پر وظیفہ ختم کر کے سید بسم اللہ شاہ معروف اس سے مخاطب ہوئے۔ "اچھا گھسیٹے، جا دو رکعت نماز شکرانہ ادا کر۔ دو پیسے کی کھٹیاں دو پیسے کے بتاشے فاتحہ دے کے درگاہ شریف میں چڑھا آ۔"

جب گھر پہنچ کر سید بسم اللہ شاہ ناشتہ کرنے دستر خوان پر بیٹھے اور پراٹھے اور گائے کے گوشت کے کوفتے سر جھکائے کھا رہے تھے، تو ان کی بیوی آمنہ نے چھوٹے ماموں زاد بھائی واجد کی شکایت کی۔ "خدا کے لئے اسے آدمی بنایئے، کچھ پڑھایئے لکھایئے۔ صاحبزادے ماشاء اللہ سے اتنے بڑے ہوئے، کب تک اس طرح ہلمبے لگاتے رہیں گے۔ نرے خل پترے، نہ بات کرنے کی تمیز نہ اور کسی بات کا سلیقہ۔"

واجد سر جھکائے پراٹھے اور کوفتے کھاتا رہا۔ اور جب اس کے حصے کے پراٹھے ختم ہو گئے تو اس نے باسی چپاتیوں سے باقی ماندہ کوفتے کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ آمنہ کے

اس طرف سکینہ چپ چاپ بیٹھی لقمے توڑ رہی تھی۔ اس کی گہری سانولی رنگت، اور چھوٹے سے دہانے پر پسینے کے قطرے نمودار تھے۔ وہ میاں واجد کی بیوی بننے والی تھی۔ اسے میاں واجد سے گھن نہیں آتی تھی۔ شرم ضرور آتی تھی۔ اپنی بڑی آپا سے میاں واجد کی یہ شکایت سن کر اس کے ململی لہریا دوپٹہ کے نیچے اس کے سینے میں خفیف سا ہیجان پیدا ہوا جس کا مقصد کچھ نہ تھا، محض اعصابی ہیجان تھا۔

سید بسم اللہ شاہ نے اس روز سے ارادہ کر لیا کہ اب میاں واجد کی واقعتاً" تربیت ہونی چاہیے۔ سکینہ کا تیرھواں ہی سال تھا مگر خیر دو ایک مہینے میں جوان ہو جائے گی۔ ذرا پاؤں میں بیڑی پڑے تو خود میاں واجد کو ذمہ داری محسوس ہو۔ دوسرے یہ کہ ان کی روحانی تربیت ہو۔ حقے کی دو تین چلمیں خالی کر کے سید بسم اللہ شاہ معروف نے طے کیا کہ اب میاں واجد ان کی بیعت کر سکتے ہیں۔ ان کی اپنی اولاد نہیں تھی۔ سجادگی انہیں بیوی کے خاندان سے ملی تھی۔ اب اچھا یہی ہے کہ یہ بیوی ہی کے خاندان کو واپس چلی جائے۔ لیکن اس کیلئے انہیں میاں واجد پر کتنی کڑی محنت کرنی ہو گی۔ کتنی توجہ کرنی ہو گی۔ اس کا بھی حضرت سید بسم اللہ شاہ معروف کو پورا احساس تھا۔

حقہ پی کر انہوں نے لانبا پیچ دار نیچہ ایک طرف رکھ دیا۔ اور ملازم سے جو ان کے پیر دبا رہا تھا کہا۔ "کلو، حقے کو تازہ کر کے لائیو، اور طاق میں ادھر جو دو تین پتلی پتلی کتابیں رکھی ہیں نا، ذرا مجھے لا دیجیو۔"

کلو نے داراشکوہ کے رسائل حضرت سید بسم اللہ شاہ معروف کو لا دیئے۔ وہ ان رسائل کا رد لکھ رہے تھے کہ ان میں بجز الحاد و زندقہ کے اور کچھ نہ تھا۔ انہوں نے قلمدان سے قلم کی نوک ٹھیک کی۔ بادامی کاغذ سامنے رکھ کے بسم اللہ کہہ کے عینک لگائی اور شاہزادہ داراشکوہ کی مجمع البحرین کو پڑھنا شروع کیا۔

"فقراء ہند کے نزدیک برہما یعنی جبرائیل علیہ السلام کی عمر اور برہماند کے باقی رہنے کی مدت دنیا کے اٹھارہ انج سال ہے۔ ہر ایک انج ایک ہزار سال کا ہوتا ہے......"

سید بسم اللہ شاہ نے "نعوذ باللہ" کہہ کے بادامی کاغذ پر اس فقرے کے رد میں دو تین سطریں لکھیں۔ اور پھر وہ سوچ میں پڑ گئے۔ اب ان پر .سط کا عالم طاری ہونے کو

تھا۔ قبض کی کیفیت دور ہوتی جا رہی تھی۔ کلو نے حقہ لا کے رکھ دیا' بے خیالی میں انھوں نے اٹھائی..... اور ایک ہلکا سا کش لیا۔ اب اردو اور فارسی اساتذہ کے اشعار ذہن کے ایک لاجوردی بحر ذخار میں آبدار موتیوں کی طرح چمک جاتے اور روح کی گہرائیوں میں جوت سی جگا جاتے۔ مجاز کے تمام پردے چاک چاک تھے۔ یہ "پری محل والے دارا شکوہ" کے اٹھارہ انچ اور اٹھارہ ہزار سال۔ اس کافر منش صوفی نے وقت کی ابدیت کی کیا تحقیر کی ہے۔ دہر کو برا مت کہو' دہر خدا ہے۔ دہر جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں۔ آزاد کی آب حیات والے مرزا مظہر جان جاناں ابدیت کے لاجوردی بحر بیکراں میں معلوم نہیں کہاں غرق ہو گئے۔ ان کا ایک شعر البتہ آغوش صدف سے جھانک رہا تھا۔ جیسے سانپ کا من جیسے اندھیرے میں کوہ نور:

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی ایک شہر میں قاتل رہا ہے

اپنے گھٹنے پر ہاتھ مار کے سید بسم اللہ شاہ معروف تڑپ گئے۔ "آہا' کیا بات کہدی ظالم نے۔ کیا بات کہہ گیا ظالم۔ کیا شعر اسے نصیب ہو گیا۔" اور اس کے بعد اس عالم وسط میں خود ان پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اب وہ سید بسم اللہ شاہ گم تھے' اور حضرت معروف بجولوی زیادہ قافیوں کا سیلاب تھا کہ آتا چلا جا رہا تھا۔ آمد ہی آمد تھی۔ وجد ہی وجد تھا۔ بسمل رہا ہے' دل رہا ہے' قاتل رہا ہے' محفل رہا ہے' خاموشی ساحل رہا ہے' دوری منزل رہا ہے آب و گل رہا ہے۔ ہر طرف انبساط ہی انبساط تھا۔ نشاط ہی نشاط۔ روح کا رقص اور وجدان۔ ردیف اور قافئے اور عروض اور تشبیہات اور لف و نشر مرتب کے ذریعہ ذرہ آفتاب سے' قطرہ دریا سے ہمکنار ہو رہا تھا' فنا تھی۔ لیکن اس میں بھی کیف نشاط تھا۔

حضرت سید بسم اللہ شاہ صاحب کو بجولی شریف کی درگاہ کے سجادہ نشین کی حیثیت سے صرف کانپور کے آس پاس کے قصبوں کے شرفا جانتے ہوں گے لیکن بحیثیت شاعر جہاں کہیں اردو بولی' اردو غزل گائی جاتی تھی' ان کا نام سب کی زبان پر تھا۔ ان کا شمار چوٹی کے شعراء میں تھا۔

آٹھ دس ماہ بعد میاں واجد کی شادی سکینہ سے ہو گئی۔ یہ سکینہ جو شادی سے پہلے آمنہ باجی کی طرح ان کی پھوپھی زاد بہن تھی۔ ان سے عمر میں سال بھر چھوٹی تھی۔ چیچک نے میاں واجد کے مقابل اس پر رحم کیا۔ اسے لڑکی سمجھ کے صرف اپنے ہلکے سے لمس سے ایک دو چھوٹے سے نشان چھوڑ کر چل دی۔ کسی ارضی اور سماوی آفت نے اس چھوٹی سی میٹھی میٹھی، سانولی بلکہ ذرا کالی کالی صورت کو بگاڑا نہ تھا۔ جب شادی ہو گئی تو سکینہ کے سلمے ستارے کے بھاری کام کے پائنچے دار غرارے، اور لچکے سے لدی ہوئی ریشمی اوڑھنیاں میاں واجد کے لئے علم جمالیات کا دفتر کھولنے لگتیں۔ اب تمام تر حسن ایک ریشمی غبار تھا، جس میں ریشم ہی ریشم تھا۔ ملبوس کا، جلد کا ریشم، آواز کا، تنفس کا ریشم، پسینے کی ٹھنڈک کا، دل کی دھڑکن کا ریشم۔ اب واجد کا شعور بیدار ہوا، حواس خمسہ بیدار ہوئے انکی ناک جو آنگن کی گندی موری کی طرح بہتی تھی، اب اطمینان سے اکیلے ہی میں سڑ سڑ کر لیتی ورنہ وہ بھی اب محتاط اور متین ہو گئی تھی۔

میاں واجد کو اپنی چھوٹی ننھی سی دلہن سے عشق تھا۔ اگرچہ اب تک عشق کا ذکر انہوں نے زیادہ تر شعراء کے دیوانوں ہی میں پڑھا تھا۔ جن کا حضرت سید بسم اللہ شاہ صاحب معروف کے دیوان خانے کے ہر طاق پر انبار لگا تھا۔ یہ عشق کیا تھا، اگر کوئی میاں واجد سے پوچھتا تو وہ شاید کھسیانے ہو کر ہیں ہیں کرنے لگتے۔ مگر انہیں یقین تھا کہ اس قسم کی محبت میں جو انہیں اپنی چھوٹی سی ریشمی بیوی کے ساتھ ہے اور باقی ہر طرح کی محبت میں بڑا فرق ہے۔ ان پر خطوط اور رنگ کے آہنگ کا راز منکشف ہونے لگا تھا۔ انہیں محسوس ہونے لگا تھا کہ جسم سے وابستہ اور جسم سے ماورا ایک کشش ہوتی ہے جو آگ ہی آگ ہوتی ہے اور اپنے آپ کو اس آگ کا مطلب اچھی طرح سمجھانے کیلئے انہوں نے دیوانہ وار اردو اور فارسی اساتذہ کے دیوان پڑھنا شروع کئے۔ اور ان پر اور سارے گھر پر ایک اور سربستہ راز منکشف ہوا کہ ان کے گلے میں بلا کا جادو، ان کی آواز میں بلا کا سریلا پن ہے۔ اپنے شاگرد اور ہم زلف میں سوز و گداز کی یہ ابتدائی نشانیاں دیکھ کے سید بسم اللہ شاہ معروف نے طے کر لیا کہ اب تربیت کا وقت آگیا ہے۔

خانقاہ میں قوالی کی مجلس تھی، جو عرس شریف کے ختم پر ہر سال ہوا کرتی تھی۔ شیخ

حسین قوال نے بڑے غضب کی آواز پائی تھی۔ وہ گاتا رہا "تجلی ہے یا تاجدار مدینہ۔" سید شریف کو حال آیا۔ سید بسم اللہ شاہ معروف تسبیح پڑھتے رہے اور جھومتے رہے اور کبھی کبھی ان کی زبان سے بے اختیار "ہا" نکل جاتا۔ قوالوں کے گلے بیٹھ گئے۔ چاندنیوں کا فرش باسی ہو گیا۔ گاؤ تکئے مسلے گئے۔ تبرک تقسیم ہوا۔ اور حضرت سید بسم اللہ شاہ معروف گھر واپس آئے۔ ان کی بیوی آمنہ نے ان کے سر میں ناریل کا تیل ڈالا اور آہستہ آہستہ دبانا شروع کیا۔ ان کے دماغ میں تازگی اور سرور سرایت کر گیا۔ ان نازک نازک ہتھیلیوں اور ناریل کے ٹھنڈے تیل کا سرور' اور پھر اس کیف کے عالم میں آرزو ہی آرزو تھی۔ آرزو جو اشعار بنتی چلی جا رہی تھی۔ دو طرح کی آرزو تھی۔ آرزو کی دو متضاد کیفیتیں تھیں۔ حرکت و نمو کی آرزو اور سر فنا کی آرزو۔

ہر جنبش مژہ میں نہاں تیر آرزو
دل میں جگر میں بس گئی تصویر آرزو
ہستی شہید غم سہی' دل محو دید ہے
وہ سحر آرزو تھی یہ تکبیر آرزو

پھر قافیوں کا سیلاب آیا' اور حضرت معروف بجلوی کو بہا لے گیا۔ ان کی بیوی نے سر پر تیل کی مالش ختم کرنے کیلئے تیل کے کٹورے میں آخری مرتبہ اپنی انگلیاں ڈبوئیں اور ان سے ان کے سر کی جلد کو اور کھوپڑی کی ہڈی کو دبا کے پوچھا' "بس؟"

انہوں نے کہا "ہاں بس" اور اٹھ کے باہر مردانے میں چلے گئے اور اپنی بیاض نکالی۔ کلو نے حقہ بھر کے رکھ دیا۔

اندر آمنہ نے تیل کا کٹورہ طاق پر رکھا۔ بیسن سے ہاتھ دھوئے اس کے چہرے کی جھریاں اور اس کے سفید ہوتے ہوئے بال تھک کر اس کے چہرے پر ساکن ہو گئے جیسے کسی مرے ہوئے کیڑے سے چیونٹے چمٹے ہوئے ہوں۔ اسے زندگی میں کوئی خاص تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ وہ اسی گھر میں پیدا ہوئی۔ اسی میں اس کے ماں باپ مرے۔ اسی میں اس کی شادی ہوئی۔ بس ایک اولاد کی تمنا تھی۔ خدا نے اولاد نہیں دی۔ لیکن اس نے اپنی چھوٹی سی بہن سکینہ کو اولاد کی طرح پالا۔ وہ پیڑھی پر پراٹھے پکاتی رہی۔ شامی کبابوں میں مسالہ بھرتی رہی۔ نان خطائیاں بیلتی رہی۔ شب برات میں حلوے پکاتی رہی۔ زندگی کی

صبح دوپہر ہو گئی۔ پھر سہ پہر آئی۔ اور اب شام قریب تھی۔ اس نے بہت کم اس گھر سے باہر قدم نکالا تھا۔ ڈولی میں بیٹھ کے وہ عزیزوں اور برادری والوں کی تقریبوں میں شریک ہونے ضرور جاتی رہی۔ لیکن اسنے کبھی آزاد تازہ ہوا کی خنکی محسوس نہ کی۔ آسمان کی شکل اس کی نظروں میں اس کے صحن کی سی تھی اور ڈولی پر باہر جاتے ہوئے اگر کہیں سے آسمان کا کوئی کونا نظر آجاتا تو اسے حیرت ہوتی کہ آسمان اتنا بڑا ہے۔ اس نے کبھی لہلہاتے کھیت نہیں دیکھے تھے۔ وہ گنگا سے زیادہ دور نہیں رہتی تھی، لیکن کبھی اس نے گنگا کی پر شوکت روانی نہیں دیکھی تھی۔ جس کے کنارے اس کے آباؤ اجداد کا کارواں آکر اترا تھا۔

اور رفتہ رفتہ جیسے جیسے زندگی کی سہ پہر ڈھلتی گئی، شام آتی گئی۔ اس کے پیٹ میں درد بڑھتا گیا۔ بجولی میں شروع میں دعاؤں اور منتوں کے ذریعہ علاج کیا جاتا تھا، پھر یونانی علاج ہوتا تھا۔ اور جب حالت بالکل بگڑ چکتی تو انگریزی علاج شروع ہوتا۔ نظریہ یہ تھا کہ یہ سب وقت کی بات ہے، وقت آتا ہے تو خاک کی چٹکی سے شفا ہو جاتی ہے۔ وقت نہیں آتا تو ارسطو کے علاج سے بھی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی اس وقت کے نظریے میں کبھی کبھی تدبیر کی اہمیت کا خیال آجاتا۔ اور جب دعاؤں اور منتوں اور یونانی علاج سے فائدہ نہیں ہوا تو کانپور سے ڈاکٹر سلیم کو بلایا گیا۔ جنھوں نے پہلی نظر ہی میں یہ تشخیص کی کہ یہ سرطان ہے۔ ابھی وقت تھا اور انہوں نے سید بسم اللہ شاہ معروف کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی بیوی کو پٹنہ لے جائیں۔ لیکن آمنہ کسی طرح راضی نہیں ہوئی۔ "کتنا خرچہ ہو گا، کتنی زیر باری ہو گی۔ ڈاکٹریوں ہی بکا کرتے ہیں آپ خیال نہ کیجئے، آپ پریشان نہ ہوئیے۔"

بسم اللہ شاہ پریشان تو ضرور تھے۔ پریشان کیسے نہ ہوتے شریف آدمی تھے۔ لیکن وہ بھی تقدیر کے قائل تھے۔ مشیت ایزدی بجولی میں اور پٹنہ میں یکساں کام کرتی ہے۔ پھر آوارہ گردوں کی طرح بی بی کو دنیا بھر میں علاج کے لئے لے کے پھرنے سے کیا حاصل۔ پھر ان کے نقطہ نظر سے ازدواجی محبت میں ایک حد تک نفس دوں کی چاشنی تھی۔ جس کی سرکوبی ضرور تھی۔ کبھی کبھی یہ خیال بھی آجاتا کہ انسان کی زندگی کی کچھ قیمت ہوتی ہے خواہ وہ عورت ہی کیوں نہ ہو۔ مگر وہ یہ کہہ کے دل کو تسلی دے لیتے کہ بیوی ہی کی تو ضد ہے کہ پٹنے نہیں لے جانے دیتیں۔ غرض پھر ڈاکٹری علاج چھوڑ کے یونانی علاج ہوتا رہا۔

حضرت سید بسم اللہ شاہ معروف اپنے مریدوں پر توجہ کرتے رہے۔ سیر افلاک کرتے رہے۔ مقامات کی سیر فرماتے رہے۔ سلوک و معرفت کے جاوے طے کرتے رہے اور آمنہ میں اتنی بھی سکت نہ رہی کہ وہ اٹھ کے باورچی خانے میں آلو ہی چھیل سکتی یا اپنے میاں کے سر میں تیل ڈالتی۔ اب ہر فرض سکینہ کے سپرد تھا۔ اور میاں واجد کو ذرا ذرا کوفت تھی کہ ان کی اپنی جوان جوان چھوٹی سی دلہن صبح سے لیکر شام تک باورچی خانے میں پھکنی پھونکتی رہے۔ مگر یہ بہرحال ضروری تھا کہ کھانا پکے' پیٹ کے دوزخ کا پر ہونا ضروری تھا۔ اور پھر آمنہ نے خوشامد کی "بیٹا ذرا اپنے دولہا بھائی کے سر پر تیل کی مالش کر دیا کر۔ ان کی ساری عمر کی عادت ہے۔ اب مجھ کمبخت سے بستر سے اٹھا نہیں جاتا۔ ان کے قدموں کے نیچے میری جنت ہے۔ میں قیامت کے روز خدا کو کیا منہ دکھاؤں گی۔"

بسم اللہ شاہ معروف کو اپنے تقویٰ پر بڑا اعتماد تھی۔ بیوی کی بیماری کی وجہ سے ان کے آرام میں ہر طرح کا خلل پڑ رہا تھا۔ لیکن وہ سوائے صبر و شکر کے کبھی ایک کلمہ شکایت زبان پر نہ لاتے۔ ننھی سی سالی سکینہ' جو ان کی شادی کے وقت صرف دو سال کی تھی' اب ماشاء اللہ سے بڑی ہو گئی تھی۔ وہ ان کے سر میں تیل لگاتی تو نرم نرم ہتھیلیوں اور ناریل کے تیل کی خنکی کا سرور تو ضرور محسوس ہوتا لیکن معلوم ہوتا تھا یہ ان کی اپنی بیٹی جیسی ہے۔

وہ دنیا کے تمام مصائب و آلام سے بے نیاز تھے۔ جو غم تھا وہ غم عشق' عشق حقیقی میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ ایک بے خبری تھی جو غم روزگار پر حاوی تھی۔ جو کچھ درگاہ سے مل جاتا تھا کافی تھا۔ اگر مرید کچھ دے جاتے تو یہ مزید نعمت تھی۔ بیوی بیمار سہی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کی تکلیف سہی۔ لیکن میر تقی میراور فانی کے برعکس حضرت معروف کے کلام میں یاسیت و قنوطیت کا فقدان تھا۔ ان کے نزدیک عشق میں' یاس کی فراوانی میں غم روزگار کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ اسی لئے انہوں نے تمام تر توجہ نشاط' کیف اور انبساط پر کی تھی۔ اس نشاط' کیف' انبساط کی بنیاد حیرت اور بے خبری پر تھی۔ شبنم کا نزول پھولوں کی نمود' طیور کے نغمے' یہ سب حیرت ہی حیرت کا سامان تھے۔ کسے فرصت تھی کہ وہ غم دنیا' اپنے' اپنے متعلقیں یا اپنے اردگرد کے انسانوں کی مصیبتوں کی طرف توجہ کرے۔

اس درمیان میں سید بسم اللہ شاہ معروف، میاں واجد کو سلوک و طریقت کے ابتدائی مراحل طے کرا رہے تھے۔

بڑا سوال اور مرحلہ یہ ہے کہ پیر طریقت اپنے مرید کے دل سے ماسوا کے نقوش محو کردے۔ اس کے بغیر حقیقی لو نہیں لگ سکتی۔ سلسلہ نقشبندیہ میں پیر طریقت اپنے مرید کو ایک عارضی بت پرستی کے دور سے لے کے گزرتا ہے۔

آہستہ آہستہ انسان کا دل پرانے پیاروں، عقیدوں، مرکزوں سے ٹوٹتا ہے۔ سلسلہ نقشبندیہ میں یہ پیر اپنے مرید کے دل سے ماسوا کے خطرات نکالنے کیلئے اپنا تصور بندھواتا ہے۔ یہ تصور شیخ ہے۔ اس میں مرید کا دل نقرہ و فرزند و زن کی بجائے مرشد کے تصور سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ اور پھر جب مرید انہماک اور توجہ کی کیفیت حاصل کر لیتا ہے تو مرشد آخری بت شکنی کرتا ہے اور اپنے مرید کے دل سے خود اپنا نقش مٹا دیتا ہے۔ شیخ خود مرید کے دل میں تصور شیخ کو پاش پاش کر دیتا ہے۔ اور پھر اسے منازل و افلاک کی سیر کرانے لے جاتا ہے۔ اسکی توجہ کی گرمی بڑھتی جاتی ہے۔

تصور شیخ کے مرحلے سے کچھ عرصہ قبل میاں واجد نے شاعری شروع کی تھی۔ اس شاعری میں بڑا ترنم اور بڑی (مجازی) سوز و گداز کی کیفیت تھی۔ اب تک یہ لہریا دوپٹے والی، عطر حنا میں بسی ہوئی نوجوان ننھی سی دلہن کا عشق تھا۔ غالب نے سہل ممتنع کو بیدل کا تصور اور اس کا طرز بیان توڑ کے حاصل کیا۔ میاں واجد کو کانپور کے اطراف کی آب و ہوا، اردو زبان، دلہن کے عشق، اور حافظ شیراز نے شروع ہی سے "تحفتاً" سہل ممتنع میں کمال عطا کر دیا۔ اس کی پانچویں یا چھٹی غزل پر اصلاح کرتے ہوئے سید بسم اللہ شاہ معروف نے لکھا "یہ خدا کی دین ہے۔ یہ انداز، یہ بیان بڑے بڑے کہنہ مشقوں کو نصیب نہیں ہوتا۔ ذالک فضل اللہ یعطی من یشار۔"

میاں واجد کی یہ ابتدائی شاعری وصل کی شاعری تھی۔ وصل کا ذکر تو ذرا کم تھا، مگر وصل کی کیفیت نمایاں تھی۔ اس میں ان آنکھوں کا ذکر تھا جن کا طریقہ سب سے جداگانہ ہے۔ جو جھکی رہتی ہیں۔ مگر اس سمت دیکھ لیتی ہیں، جدھر وہ دیکھنا چاہتی ہیں۔ یہ اپنے اور "اس کے" عشق کی شاعری تھی کہ دل سامنے لا کر رکھ دیا۔ اب اس کے بعد نظر کا اختیار ہے کہ وہ جو چاہے کرے۔ ان آنسوؤں کا تغزل جو مژہ تک آتے آتے خشک ہو گئے تھے۔

یہ مزے کی شاعری تھی۔ وصل میں بھی فراق کی لاعلاج بے قراری کی شاعری' وہ کیفیت جس کو بیدل نے بڑے کمال سے بیان کیا ہے۔

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نرفت رنج خمار ما
چہ قیامتی کہ نمی رسی زکنار ما بہ کنار ما

شاعری میں یہ نگاہ ناز اور ذوق جاں نثاری کا زمانہ تھا۔ ابھی عاشقی خامکاری تھی۔ جمال ہر دم جمال نو بنتا جاتا تھا' تازہ خیال استوار نہیں ہونے پاتے تھے۔ معشوقہ کا وقت تو زیادہ تر باورچی خانے میں روٹیاں سینکتے دھوبن کو کپڑے دیتے' دوپٹوں کو رنگتے' آنچلوں پر گوٹیں ٹانکتے صرف ہوتا تھا۔ اسے اپنے میاں (جو اب بجولی میں صرف گھسیٹے وغیرہ کی زبان پر واجد میاں باقی رہ گئے تھے لیکن جو یو۔ پی بلکہ ہندوستان بھر میں حضرت واجد بجولوی کے نام سے مشہور ہونے لگے تھی)۔۔۔۔ کی ساری شاعری میں صرف ان کا ترنم پسند تھا۔ اور ایک مبہم سا خوشی کا احساس تھا کہ اس کے میاں کا یہ کہنا تھا کہ وہ ان کی شاعری کی بھی محبوبہ ہے۔ میاں سے محبت ایک طرح کا فرض تھا۔ جس کی وہ روحانی' ذہنی اور جسمانی طور پر پابند تھی۔ لیکن سکینہ کو "عشق" کے معنی سکھانا ناممکن تھا۔ اس کی یہی ناسمجھی میاں واجد (معاف کیجئے گا حضرت واجد بجولوی) پر اس کی مشق ناز' اس کی جفا' اس کا ستم' اس کی بے نیازی سب کچھ تھی۔ روایت رودکی کی جوئے مولیاں حافظ کے رکنا باد و مصلیٰ اور آتش کی "کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ۔" سے ہوتی ہوئی اس گھر میں گھس آئی تھی۔ جس میں گندی موری بہتی تھی۔ اور آمنہ باجی بچاری سرطان میں مبتلا زندگی کے آخری چند روز کاٹ رہی تھی۔ لیکن واجد کو اپنی ہر لغزش سے عشق کا لطف یقین پیدا تھا۔ ہر موج تبسم یعنی سکینہ کے پان کھائے ہوئے سانولے ہونٹوں کی مسکراہٹ برق طور تھی۔ اس کا روئے آتشیں (جو دراصل بہت سانولا تھا) صبح دلبری کی طرح روشن تھا۔ اس کی رنگت کالی سہی' شاعری میں وہ سیمیں اندام تھی۔ کمر اس کی البتہ پتلی تھی۔ اس لئے موئے کمر کو طرح طرح باندھا جا سکتا تھا۔ زلفیں (یعنی تیل میں چپڑی ہوئی چوٹی) تو سیاہ تھیں ہی۔ لب لعلیں صرف پان کی سرخی سے لال ہو جاتے۔ مگر اس سے کیا۔ جوانی ہے' جوانی ہے جوانی۔ اگر کبھی نظر کی حقیقت کا مقابلہ واجد دل کی حقیقت سے کرتا تو کہتا اس سے کیا۔ میں نے اسے اپنے دل میں جو کچھ سمجھا وہ ویسی ہی ہے۔ نظر

تو محض فریب ہی فریب ہے۔ نظر تو محض فانوس کی گردش ہے۔ اصلی نظر تو باطنی نظر ہے، چشم مجنوں۔ اسی سے لیلیٰ کو دیکھنا چاہئے۔ حضرت جامی کا کیا بے مثل شعر ہے۔

موجب حسن تو تنہا نہ خدوخال فتاد
عشق مانیز ز اسباب جمال است تر

غرض واجد کا "مجازی" عشق اور ان کی "مجازی" شاعری ان کے شباب کے ساتھ ابھی اس والہانہ مرحلہ پر تھی کہ حضرت سید بسم اللہ شاہ معروف نے انہیں راہ طریقت میں تصور شیخ کے مرحلے میں داخل کیا۔ اب خود حضرت معروف کے تصور کے سوا انہیں تمام نقوش یہاں تک کہ سکینہ، اس کی جوانی، اس کے لہریے دوپٹوں اور اس کے ریشمی حسن کا تصور بھی حرف غلط کی طرح مٹانا تھا۔ عشق میں یکسوئی کی ضرورت ہے۔ تمام "باطل" نقش مٹ جاتے ہیں۔ عورت محبت کی چیز نہیں رہتی۔ وہ تو صرف بچے پیدا کرنے کیلئے ہوتی ہے۔ اسی لئے تو فارسی شاعری نے عورت کا پیچھا چھوڑا (معاذ اللہ رودکی سمرقندی نے انار پستان کا ذکر کیا ہے۔ کس قدر سوقیانہ مضمون ہے۔ مگر حضرت معروف بجلوی کا یہ بھی کہنا تھا کہ غالباً یہ کتابت کی غلطی ہے دراصل انار بستان ہوگا۔ کسی شریر النفس کاتب نے دو نقطے اور بڑھا دیے۔) فارسی شاعری نے عورت کا پیچھا چھوڑا اور تصور شیخ کی ہو رہی ہے۔ جہاں تصور شیخ سمجھ میں نہیں آیا، امرد پرستی ہو گیا۔ غرض اس مرحلے پر حضرت معروف بجلوی واجد کی ساری توجہ اپنی شبیہہ مبارک پر منعطف کرانا چاہتے تھے۔ اور اس سلسلے میں اور سب نقوش کے ساتھ سکینہ کا نقش بھی مٹنا ضروری تھا۔ اس نقش کا مٹنا اتنا آسان نہ تھا۔ یہ جنس کو روحانیت..... رومان کو عرفان بنانا تھا۔ لیکن بہرحال یہ عظیم الشان رسہ کشی شروع ہو ہی چکی تھی۔

سرطان بڑا موذی مرض ہے۔ سب سے اچھی موت وہ ہے جو ہنستے کھیلتے حرکت قلب بند ہونے سے واقع ہو۔ یہ ہندوستانی شریف عورتوں کو پردے کے اندر نصیب نہیں کیونکہ دق عموماً عارضہ قلب سے بازی لے جاتا ہے۔ سرطان کی وجہ تو معلوم نہیں۔ لیکن وہ بھی ٹاٹ کے پردے اور چہار دیواری سے گھرے ہوئے مکانوں میں اکثر آتا ہے۔ جہاں منڈیر پر بیٹھے ہوئے کاؤں کاؤں کرتے ہوئے کوؤں کے سوا اور کوئی مہمان نہیں

آتا۔ اور خانہ دل اگر کبھی خدانخواستہ خداوند مجازی کے عشق سے خالی رہا تو ہمیشہ خالی رہ جاتا ہے۔ خیر بچاری آمنہ کو تو اپنے خداوند مجازی حضرت سید بسم اللہ شاہ معروف سے بڑی محبت تھی۔ تمام عمروہ فرض کی پابندی کرتی رہی۔ اس نے کبھی اپنی طرف سے کسی فرض میں کوتاہی نہیں کی۔ جاڑوں میں وہ راتوں کو اٹھتی تھی' اور پانی گرم کرتی تھی تاکہ اس کے میاں گرم پانی سے نماز تہجد کیلئے وضو کر سکیں۔ تمام عمروہ خدمت کرتی رہی اور مرتے وقت یہی افسوس کرتی مری کہ وہ اچھی طرح میاں کی خدمت نہ کر سکی' جن کے قدموں کے تلے اس کی جنت ہے۔

تابوت' عود' کافور' کفن سب مرحلے طے ہو گئے۔ حضرت سید بسم اللہ شاہ نے اس صدمہ جانکاہ کو اسی صبر کے ساتھ برداشت کیا جو بزرگوں کا شیوہ ہے۔ رفیقہ حیات کی جدائی کے غم میں ایک دو آنسو تو ضرور ریش مقدس پر جھلکے۔ لیکن اس کے بعد دیکھنے والوں کو ان کا صبر تحمل اور وقار دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ اور میاں واجد پر تو ان کے اس ضبط اور اس تسلیم و رضا کا کچھ اتنا اثر ہوا کہ اس کی عقیدت کہیں زیادہ بڑھ گئی۔

لیکن کچھ ہی عرصے بعد درگاہ شریف کی خانقاہ کے نمازیوں نے.... جن میں سے اکثر حضرت سید بسم اللہ شاہ کے مرید تھے.... یہ محسوس کیا کہ حضرت کا جلال بہت بڑھ گیا ہے۔ نماز کیلئے صفیں ایستادہ ہوتیں' نیت باندھنے سے پہلے حضرت بسم اللہ شاہ صاحب دفعتاً" شیر کی طرح پلٹتے اور فرماتے۔ "اس کو نکال دو۔" "اس کو نکال دو" دو دو تین تین آدمی صفوں میں سے خارج کر دیے جاتے۔ اور نماز ختم ہونے کے بعد وہ اپنے ساتھیوں سے اعتراف کرتے کہ بے شک ان کے دلوں میں خطرات آ رہے تھے۔ شبراتی حلوائی نے اقبال کیا۔ "بھیا ہمرے ہجرت صاحب ٹھیکے کین ہمرے دل میں آوت رہے کہ جلیبین کے گھی ماں تھوڑا سا میٹھا تیل ملائے دیں۔" میاں گھسیٹے نے جواب دیا۔ "بھیا آکھر پیر جادے ہیں۔ کھد پیر ہیں۔ بجرگن کی ہربات سچی ہوت ہے۔"

اپنے اس جلال سے--- جو نیک نیتی پر مبنی تھا--- اگر کسی کو اطمینان نہیں تھا تو خود حضرت سید بسم اللہ شاہ صاحب کو۔

ادھر اپنے شیخ اپنے رہبر کامل سے واجد کی والہانہ عقیدت پرستش اور عشق بنتی جا رہی تھی۔ سکینہ کے لہریا دوپٹہ اور اس کی نیم باز انکھڑیوں میں جمال ہی جمال تھا۔ لیکن شیخ کی نرگس مستانہ میں جلال کی ایک شان تھی۔ یہ جلال جمال کی تکمیل اور اس کی شدت ظہور ہے۔ شیخ کے گھنگھریالے بالوں، ان کی چوڑی پیشانی کے نیچے ان کی دو طاقتور آنکھیں تھیں۔ ان آنکھوں میں کس غضب کی ساحرانہ جاذبیت تھی۔ بالکل تلوار کی دھار کی طرح۔ ایک ایسی تلوار کی دھار جو ساری دنیا سے اس کا رشتہ منقطع کرنا چاہتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا یہ آنکھیں اسے کھینچ لیں گی۔ اپنے آپ میں جذب کرلیں گی جیسے روشنائی جاذب میں جذب ہو جاتی ہے۔ اور ان آنکھوں کے نیچے ہی سے باجبروت حنائی ریش شروع ہوتی تھی۔ شیخ کا، رہبر کامل کا چہرہ بز بریشہ طریقت کا چہرہ تھا۔ اس کی آن بان، اس کی شوکت، اس کا جلال حضرت معروف بجلوی کی شخصیت نے واجد کے ذہن اور اس کے قلب کے گوشے گوشے کو مسخر کرلیا۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ سکینہ اب محض اس کے جسم کی مہمان ہو کر رہ گئی ہے۔ اب بھی شعر سکینہ کا ذکر کرتے۔ مگر اب شعر کے معانی اور مطالب دو سطحوں پر حرکت کرتے۔ مجازی معنوں میں تو سکینہ اب بھی محبوبہ تھی لیکن وہ تو محض تفصیل تھی۔ مقصود اصلی کچھ اور تھا جس کا پہلا مرحلہ حضرت معروف کا تصور تھا۔ مجاز اور حقیقت کا تضاد اندر سے واجد کی ہستی کو کھائے جا رہا تھا۔ کاش برق جمال اس قید تعین کو پھونک دیتی جس میں سکینہ اسے گرفتار کئے ہوئے تھی۔ تصور شیخ دل کو تو مجازی محبت سے آزاد کرا رہا تھا۔ مگر نگاہیں ابھی تک زلف معنبر اور شانہ میں الجھ رہی تھیں۔ اس کشمکش میں ایک نظر کعبہ پر جمی تھی تو دوسری بت خانے پر۔ شیخ کا ادب تھا، شیخ کا تصور تھا، شیخ کی آنکھوں کا سحر تھا۔ مگر آغوش سکینہ کی یاد اور سکینہ کی طلب سے بھرپور تھی۔ دونوں طرف سے مجبوری تھی۔ ایک طرف جان کی مجبوری۔ ایک طرف جسم کی مجبوری۔ ایک قید جسم تھی اور دوسری طرف قید جان۔ شیخ کی توجہ سے کبھی کبھی ایسے مرحلے اور مقامات آتے جو مجاز سے بہت دور کسی بے نام حقیقت کی طرف بہالے جاتے۔ کوئی واجد کی طرف دیکھتا اور زمان و مکان دونوں معدوم ہو جاتے۔ تخت رواں کی طرح دل اسے کسی ایسے مقام پر لے جاتا جہاں کوئی اور موجود ہوتا۔ لیکن کون؟ اور ان تجربوں کے بعد دل میں غم کی ہلکی میٹھی کسک باقی رہ جاتی۔

یہ تجربہ گزر جاتا۔ کھانا مزے کا نہ ہوتا' کوئی اور چھوٹی سی بات ہوتی۔ واجد اور سکینہ میں لڑائی ہوتی۔ وہ منہ پھلا کے' بان کے پلنگ کے پائنتانے دوپٹے سے منہ چھپا کے پڑ رہتی۔ لڑائی کے بعد منانے کی منزل آتی۔ واجد اسے لاکھ مناتا' وہ نہ مانتی۔ وہ اور زیادہ روتی جاتی۔ تب وہ نسوانیت جو شاعر کے مزاج میں ہوتی ہے۔ اپنی بیوی سے کہتی' دیکھو اگر تم نہ مانو تو ہمارا جنازہ دیکھو۔ یہ ایک بڑی عام انفعالی رومانی کیفیت تھی۔ جو واجد محسوس کرتا۔ یہ کہ وہ مرگیا ہے' اس کی بیوی نے چوڑیاں توڑ ڈالی ہیں۔ بال بکھرے ہوئے ہیں۔ لہریے رنگوں کی جگہ سفید دوپٹہ ہے۔ بیوہ کا سوگ اور یہ کیفیت شاعری بن جاتی۔ اچھا جتنا ناز کرنا ہے کرلو۔ مگر جب ہم دنیا سے اٹھ جائیں تو کیا کرو گی۔ راتوں کو بسترِ سے اٹھ اٹھ کے آہیں بھرا کرو گی۔ پہروں اداس رہو گی۔ برسوں تمہارے چہرے کا رنگ اڑا اڑا رہے گا۔ اور جب تم کو اس کا پورا احساس ہو جائے گا کہ مرنے والے واپس نہیں آتے تو رو رو کے مغفرت کی دعا کرو گی۔

پھر ایک مرحلہ ایسا آتا کہ گھر' صحن کی غلیظ موری' دانت مانجھنے کا منجن بیوی کے چمکتے ہوئے دانت جو سلک گہر تھے' در دندان تھے۔ سب کچھ تھے۔ سب باطل معلوم ہوتے۔ حرف غلط کی طرح مٹتے ہوئے۔ حضرت سید بسم اللہ شاہ معروف' رہبر کامل شیخ کا باجبروت چہرہ جلتے ہوئے آفتاب کی طرح سامنے آجاتا۔ سوا نیزے پر آفتاب۔ جلال الدین رومی کے قلم سے دیوان شمس تبریز کی بارش ہونے لگتی۔ ایک ایسا عالم نظر آتا کہ دو جہاں کا حسن نظروں سے گرنے لگتا۔ کسی نے پہلے تو چراغ جلا کے دو جہاں کا حسن دکھایا اور پھر پھونک مار کے چراغ بجھا دیا۔ اب اس ظلمت میں نور ہی نور تھا۔ جمال ہی جمال۔ خود اپنی ہستی اس جمال کی نبض بن گئی۔ اور دھڑکنے لگی۔ اپنی ہی ہستی شمع بن گئی اور جگمگ جگمگ کرنے لگی۔ کبھی بے خودی ہوتی۔ کبھی ہوش آتا۔ اور وہ باجبروت باشوکت چہرہ اپنی طرف کھینچ رہا ہوتا۔ اوپر کی طرف' افلاک کی سیر کو لے جانے کیلئے' مقامات کی جانب رہنمائی کے لئے۔

ادھر رہبر کامل' سید بسم اللہ شاہ معروف کا جلال بڑھتا جا رہا تھا۔ جوں جوں ان کا جلال بڑھتا جا رہا تھا' دیہاتیوں کے اعتقاد میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ ایک عجیب بات یہ تھی

کہ وہ کبھی واجد کو سخت ست نہ کہتے۔ ایک مرتبہ بھی انہوں نے اسے نماز کی جماعت سے نہیں نکالا۔ یہ سب تھا۔ مگر اپنے جلال کی اس زیادتی کی وجہ سے خود حضرت معروف کو اطمینان نہ تھا۔ انہوں نے تقوی میں بہت شدت کے ساتھ اضافہ کیا تھا۔ اب اکثر وہ ساری ساری راتیں جاگ جاگ کر وظائف پڑھنے میں صرف کر دیتے۔ انہوں نے بجائے تکیے کے اینٹوں پر سر رکھ کے سونے کی مشق شروع کی تھی۔ اپنا کفن سلوا لیا تھا۔ خانقاہ میں بہت وقت صرف کرنے لگے تھے۔ لیکن شاعری کا چشمہ دفعتاً" خشک ہو گیا تھا۔ جسطرح ان کی شاعری میں نشاط کی کیفیت منتقل ہو گئی تھی۔ جلال کی کیفیت منتقل نہ ہو سکی۔ وہ ایسا کلام زیادہ پڑھنے لگے تھے جس میں جلال کا ظہور تھا۔ خواہ وہ آئمہ تلیس ہی میں سے کسی کا کیوں نہ ہو۔

نخل شمیم کہ در شعلہ دودِ ریشہ ما
عافیت سوز بود سایہ اندیشہ ما

سکینہ ان کی چھوٹی سی سالی ان کے سر میں تیل دباتی تو پہلے تو اس لمس سے نفس پر کوئی اثر نہ پڑتا۔ مگر بیوی کے انتقال کے بعد اس لمس میں ایک طرح کی کشش پیدا ہو گئی۔ یہ لڑکی کسی اور کی منکوحہ بھی تھی۔ میاں واجد کی۔ میاں واجد اب تصور شیخ کے مرحلے میں اپنے مرشد کامل کو سب ہی کچھ سمجھتے تھے۔ حضرت سید بسم اللہ شاہ معروف بجولوی کو اپنے تقوی پر بڑا اعتماد تھا لیکن انہوں نے بایں سن و سال اپنی ہستی کے اندر نفس دوں کی شورش سنی۔ انہیں ایک گھنٹہ پہلے سے انتظار تھا کہ اب تیل دبانے کا وقت آئے گا اور اب سکینہ آکر ان کے سر میں تیل دبائے گی۔ نازک نازک جوان نسوانی انگلیاں معلوم ہوتا تھا اندر ہی اندر ان کے دل میں گھسی جا رہی ہیں۔ ان کی روشن پیشانی سے سجدوں کے نشان مٹا رہی ہیں۔ پھر ضمیر ملامت کرتا کہ معروف یہ لڑکی تمہارے سامنے گھٹنیوں چلتی تھی۔ تم نے اسے اپنی گود میں کھلایا ہے۔ اپنی بیٹی کی طرح پالا ہے کیا سالہا سال کا تقوی شیطان اپنی ایک جنبش ابرو سے مٹا دے گا۔ یہ سب تھا مگر اب انہیں چوبیس گھنٹے تیل داتبے ہوئے نازک نازک ہاتھوں کا دھیان رہنے لگا۔ اس دھیان کو دل سے نکالنے کیلئے انہوں نے تقوی میں زیادتی شروع کر دی۔ اشراق اور تہجد پہلے بھی بہت کم ناغہ ہوتی تھیں۔ اب وہ ساری ساری رات وظائف پڑھنے میں گزارنے لگے۔ مگر

ایک ہیجان تھا جو ان کے اور توجہ قلب کے درمیان حائل تھا۔ انہیں اس کا اطمینان تھا کہ یہ ہیجان نفسانی نہیں۔ لیکن اتنا ضرور تھا کہ سکینہ جو پہلے محض دختر تھی اب نیم دختر نیم دلبر بن گئی تھی۔ اس عمر میں اور اس قدر زہد و اتقا کے بعد' طریقت کے ان تمام مراحل طے کرنے اور دوسروں کی رہنمائی کر چکنے کے بعد نسوانی شباب کا اس قدر اثر لینا' یہ خود جہنم کی بشارت تھی۔ وہ لاکھ معشوق حقیقی سے لو لگانا چاہتے' سکینہ کی تیل دباتی ہوئی انگلیاں' اسکی نازک حنا سے لال لال ہتھیلیاں' انگلیوں کی پوریں جن میں مہندی رچی ہوئی تھی۔ ان کے اور اس اعلیٰ عشق کے درمیان حائل ہو جاتیں جس میں پہلے کیف ہی کیف تھا' نشاط ہی نشاط تھا۔

پھر رفتہ رفتہ نیم دختر' نیم دلبر کی دلکشی محض مہندی رچی ہوئی پتلی پتلی انگلیوں کی دل کشی نہ رہی۔ اب سکینہ کی آواز کا اتار چڑھاؤ...... اور اس کے سینے کا اتار چڑھاؤ دونوں قیامت ڈھانے لگے۔ شاعری کا سرچشمہ جو سوکھ چلا تھا اس میں مجاز کی لہریں پیدا ہوئیں۔ حضرت معروف بجولوی نے کئی غزلیں لکھیں۔ اور پھاڑ ڈالیں اور توبہ و استغفار کیا۔ لیکن سکینہ جب نظر آ جاتی' باورچی خانے میں' دستر خوان پر' تیل دباتے وقت اس کے سینے کا تموج ساری دنیا کو غرق کر دیتا۔ حالانکہ اس کا سینہ دوپٹے کی دوہری تہہ سے ڈھکا رہتا۔ ان نسوانی آتش فشانوں کے تموج میں کوہ طور نظر سے اوجھل رہا تھا۔ حضرت کا جلال بڑھتا جا رہا تھا۔ عبادت اور تقویٰ میں شدت ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن حضور قلب غائب ہوتا جا رہا تھا۔ وہ خطرات کا الزام لگا کے اپنے مقتدیوں کو نمازیوں کی صف سے نکلوا دیتے لیکن ان کے اپنے دل میں خطرات کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

تصور شیخ کمال پر تھا۔ اب اگر سید بسم اللہ شاہ میں حقیقی رہنمائی کی صلاحیت باقی ہوتی' یا اگر وہ حقیقی رہنمائی کر سکتے تو ان کا فرض تھا کہ واجد کے قلب میں اپنے تصور کو پاش پاش کر دیں' اور توجہ کر کے اسے اعلیٰ مقامات کی سیر کرائیں۔ لیکن ان کی اپنی روح مفلوج ہو چکی تھی۔ معلوم نہیں انہوں نے اپنا تصور پاش پاش کرنے کی کوشش بھی کی یا نہیں لیکن واجد کی گرویدگی کا یہ عالم تھا کہ اسے ساری کائنات اپنے مرشد کامل اپنے شیخ کی نورانی صورت سے وابستہ معلوم ہوتی تھی۔ اسی سے تمام جذبے' تمام کیف پیدا ہوتے

تھے۔ وہیں مناظر قدرت، گل و بلبل و دراج و ساز، برشگال و بہار کا حسن انتہا کو پہنچتا تھا۔

اور پھر ایک دن آیا۔

فجر کی نماز کے بعد حضرت سید بسم اللہ شاہ خلاف معمول واجد پر برس پڑے۔ اسے مقتدیوں کی صف سے نکال دیا۔ ان کے جلال کا یہ عالم تھا کہ منہ سے کف جاری تھی۔ پھر جب انہوں نے نماز پڑھائی تو ان کی آواز میں حد درجہ رقت تھی۔ وہ نماز پڑھ کے بہت دیر وظائف پڑھتے رہے۔ گھر آئے بھی تو واجد سے بات نہ کی۔ ڈر کے مارے واجد نے ناشتہ ساتھ نہیں کیا اور اپنے پلنگ پر تکیہ میں منہ چھپائے روتا رہا۔ ظہر کے قریب حضرت سید بسم اللہ شاہ حوائج ضروری سے فارغ ہو کے، گھڑے سے وضو کیلئے لوٹے میں پانی بھر رہے تھے۔ اس نے دوڑ کے لوٹا ان کے ہاتھ سے لے لیا، اور پانی بھرنے لگا۔ حضرت نے غصے کا اظہار نہیں فرمایا۔ خاموش رہے۔ اس پر ہمت کر کے واجد نے ان کے قدموں پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ حضرت نے اسے اٹھا کر سینے سے لگایا۔ اس نے بھی وضو کر کے ظہر کی نماز ان کے ساتھ ادا کی اور اس کے بعد حضرت نے اسے اپنے سامنے بٹھا کے سمجھانا شروع کیا۔ "واجد میں نے تجھے اوپر کھینچنے کی، اعلیٰ تر مقامات تک پہنچانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن تیرا دل دنیا میں اٹکا ہوا ہے۔ تجھ میں طریقت کے راستے پر چلنے کی طاقت نہیں۔"

واجد روحانی دہشت اور ادب سے خاموش سنتا رہا۔ اور حضرت کہتے رہے "عشق حقیقی سے پہلے دنیا کی تمام محبتیں، آرزوئیں، تمام تعلقات مٹانا پڑتے ہیں۔ تجھ میں اس کی طاقت نہیں۔ تیرا دل اپنی بیوی میں اور اپنی جوانی میں اتنا الجھا ہوا ہے کہ تو طریقت کی راہ چلنے کے قابل نہیں۔"

معلوم ہوتا تھا کسی نے واجد کے دل کا چور پکڑ لیا۔ کیا یہ واقعہ نہیں تھا کہ اس کے حواس بیوی کے رنگین ملبوس، اس کی عطر میں بسی ہوئی جوانی میں اسیر تھے۔

اس نے کہا "حضرت! یہ واقعہ ہے۔ کوئی بات، میرے دل کی کوئی واردات آپ کی نظر سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن خدا کے واسطے مجھے بے یار و مددگار، تنہا نہ چھوڑیئے۔ میری مدد فرمایئے کہ کس طرح میں اپنے نفس کے اس جال سے چھوٹوں۔"

حضرت نے گردن جھکا لی۔ ان کی آنکھوں میں ریا کی وہ غیر معمولی چمک نمودار

ہوئی جو واجد کے سوا غالباً ہر ایک کو نظر آ جاتی۔ ان کے چہرے پر خون دوڑ گیا۔ ان کے گلے سے جو آواز پیدا ہوئی اس میں حیوانیت کا ذرا سا شائبہ تھا۔ لیکن واجد تو شیخ کے تصور کا غلام گردن جھکائے ہوئے اس کا منتظر تھا کہ حضرت کا اشارہ ہو اور وہ اپنی جان قربان کر دے۔

دفعتاً" حضرت نے بزرگانہ اور مشفقانہ انداز سے اسکے سر کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ معلوم ہوتا تھا اس لمس سے جنت کے دروازے کھل گئے۔ انہوں نے کہا۔ "میاں واجد ایک صورت ہے مگر اس کیلئے بڑی نفس کشی اور بڑے صبر کی ضرورت ہے۔ تم اس امتحان میں پورے نہیں اترو گے۔"

"میں جان تک نثار کرنے کو تیار ہوں۔" واجد کی آواز میں بڑا جذبہ اور تاثر تھا۔ اور اس کی آنکھیں اس جذبے کا اظہار کر رہی تھیں۔

"یہ قربانی جان کی قربانی سے بھی زیادہ سخت ہو گی۔" حضرت کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔

"میں ہر قربانی کیلئے حاضر ہوں۔"

"تو سنو، تمہیں سکینہ کو طلاق دینا ہو گی۔ مگر میاں واجد یہ کافی نہیں۔ وہ اس گھر میں رہے گی۔ ظاہر ہے اس کا اور کون ہے۔ اور وہ جا کہاں سکتی ہے۔ طلاق کے بعد بھی کہیں اسی میں تمہارا دل نہ اٹکا رہے۔ اس لئے عدت کے زمانے کے فوراً بعد اس کا نکاح ثانی ضروری ہے۔ اگر کسی اور سے نکاح ہو تب بھی تمہارے دل سے مجازی عشق کی خلش نہیں جائے گی۔ وصل جب فراق بن جاتا ہے تو اور زیادہ مہلک ہو جاتا ہے۔ محض تم کو اس عذاب سے بچانے کیلئے میں تیار ہوں کہ عدت کے بعد سکینہ سے نکاح کر لوں......"

معلوم ہوتا تھا کہ میاں واجد پر بجلی سی گری۔ یہ بجلی اور سب کچھ جلا گئی لیکن تصور شیخ اپنی جگہ قائم تھا۔

"میں بوڑھا ہوں، میرے لئے ہوس کا زمانہ گزر گیا۔ میں اپنے نفس کو بیس برس پہلے مار چکا ہوں۔ میرا نکاح تمہیں دنیا کے پھندے سے نجات دلانے کا محض ایک وسیلہ ہو گا۔ میں تمہاری خاطر یہ قربانی کرنے کو تیار ہوں۔ محض تمہاری خاطر۔ اس کے سوا اور

کوئی صورت نہیں۔ تمہیں میری جگہ سجادہ نشین ہونا ہے' اور تمہاری اصلاح اتنی مشکل ہے۔ یہی ایک صورت باقی تھی اور یہ میں نے بیان کر دی۔

میاں واجد کی ہستی کا ذرہ ذرہ اس برق سے جل اٹھا تھا' جو ان پر کچھ عرصہ پہلے گری تھی۔ یہ برق اس کے نفس دوں کو جلا گئی تھی۔ اب تحت الثریٰ سے ثریا تک شیخ ہی کا تصور تھا۔ زہے قسمت کہ اس کی نجات اور فلاح کے لئے شیخ نے خود یہ قربانی قبول کی تھی۔ وہ شیخ کے قدموں پر گر پڑا اور کہا "حضرت جو آپ کا حکم ہو۔ مجھے بسرو چشم منظور ہے۔ میں آپ کے حکم کی بنا پر اپنی بیوی کو تین بار طلاق دیتا ہوں۔"

اس روحانی لین دین میں کسی نے بچاری سکینہ سے نہیں پوچھا کہ اس کی مرضی کیا ہے۔ سب بھول گئے کہ وہ بھی جاندار ہے۔ اور اخلاق اور شریعت نے اسے بھی کچھ حق دیا ہے۔ پہلی اطلاع اسے یہی ملی کہ واجد نے اسے طلاق دے دی ہے۔ اس کے لئے مسئلہ بہت سیدھا سادا تھا۔ وہ طریقت کے پیچ و خم اور تصور شیخ کے طلسمی اثر سے ناواقف تھی۔ اس کے نزدیک واجد' بدشکل اور چیچک رو نہیں بلکہ دنیا کا سب سے حسین آدمی تھا کیونکہ وہ جوان تھا' اور اس کے جسم کو اس نے اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ حضرت سید بسم اللہ شاہ معروف بوڑھے تھے۔ اس نے انہیں کبھی مرد سمجھ کے دیکھا نہیں تھا۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا وہ انہیں دولہا بھائی کہتی آئی تھی۔

یہ انقلاب' یہ لین دین' یہ روحانی خرید و فروخت جو اس کے نزدیک محض جسمانی خرید و فروخت تھی اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ رات بھر واجد اندر نہیں آیا۔ اور وہ آتا کیسے' سکینہ اب اس کے لئے نامحرم تھی۔ لیکن رات بھر وہ بھی روتا رہا۔ اور فجر کی نماز کے لئے حضرت کے ساتھ خانقاہ نہ جا سکا۔ سکینہ صبح کو اس کے کمرے میں گھس آئی اور اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ "میرے پیارے' میری جان تمہیں کیا ہو گیا؟ کہیں شریفوں میں آج تک طلاق ہوئی ہے۔ اس بڈھے کا جنازہ نکلے۔ وہ اپنی حرص میں تم کو مجھ سے چھڑانا چاہتا ہے۔"

واجد نے اس کے ہاتھ اپنے گلے سے ہٹا کے اسے دھکیل دیا۔ سکینہ کیا بک رہی ہو؟ تمہیں حضرت کے متعلق یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ تمہاری آنکھ کا پانی بالکل مر گیا ہے۔ اب میں تمہارے لئے نامحرم ہوں۔ تمہیں میرے سامنے بھی نہ آنا چاہئے تھا۔

صبر کرو' جو کچھ ہے' خدا کے حکم سے ہے۔"

کچھ ایسی بیدردی سے واجد نے اسے دھکیلا تھا کہ وہ دیوار سے لگی روتی رہی۔ لیکن جب واجد کمرے کے دروازے سے باہر جانے لگا تو راستہ روک کے کھڑی ہو گئی۔ "میں تو تمہیں نہ جانے دوں گی۔ تم میرے شوہر ہو۔ میں بھی دیکھتی ہوں کون مجھے تم سے چھڑا سکتا ہے۔ میں زہر کھا کے مر جاؤں گی مگر اس بڈھے کھوسٹ سے شادی نہ کروں گی۔"

واجد نے اسے للکار کے ڈانٹا۔ "خبردار مردار' اگر تو نے حضرت صاحب کو کچھ کہا' ہٹ مجھے جانے دے۔"

اور وہ سہم کے ہٹ گئی۔ واجد کمرے کے باہر نکل آیا۔ مگر اب کوہ طور بھی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ سکینہ نے حضرت سے جو بدتمیزی کی تھی۔ اس پر دو تین منٹ خون کھولا کیا۔ پھر کسی نے دفعتاً" بحر منجمند شمالی کو اس کے خون میں حل کر دیا۔ طریقت' سیر افلاک' مقامات' جذب' کشف' سلوک' توجہ کے ساتھ تمام راستے بند ہو گئے۔ تصور شیخ بے شک باقی رہا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ سکینہ کی صورت تھی۔ مظلوم' بے کس' بے بس' روحانی شاعری اور کیف کا دروازہ بند ہوا۔ مجازی شاعری کا دروازہ کھل گیا۔ وصل کا نہیں' فراق کا۔ "میں تو تمہیں نہ جانے دوں گی۔ تم میرے شوہر ہو۔ میں بھی دیکھتی ہوں کون مجھے تم سے چھڑا سکتا ہے....."

بے خبر چیچک رو نوجوان جو اب تک اپنی بیوی کی جوانی' اور اس کے لہریا دوپٹہ کی ترنگ میں شاعری کرتا تھا اس کو کبھی یہ خیال بھی نہیں گزرا تھا کہ بیوی بھی جاندار ہے۔ اور وہ بھی محبت کر سکتی ہے۔ وہ اب تک اس کو روایتی "حسن" کا مظہر سمجھتا تھا۔ اور عشق کو اپنی میراث سمجھے بیٹھا تھا' جس کا رخ وہ جدھر چاہے پھیر دے۔ مجاز کی طرف یا حقیقت کی طرف۔ اسے جدائی کے لمحے میں سکینہ کے "حسن" کی بغاوت' اس کی بے بسی' اس کا "عشق" یاد آ گیا' اور شعر کا سرچشمہ جاگ اٹھا۔ اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اس سے محبت کی گئی ہے۔ وہ محض عاشق نہیں' محبوب بھی ہے۔ کوئی چشم تر اس کیلئے بھی رو رہی ہے۔ اس کیلئے کوئی زلف پریشان اور الجھی الجھی تھی۔ کسی کے نفس کا زیر و بم اسے بلا رہا تھا۔ کسی کی نظریں اس کی منت کر رہی تھیں۔ اس کی طلب میں کوئی اپنی گھٹی

ہوئی تربیت بھول کے لغزش کر رہا تھا۔ کوئی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے، اور پھر چاروں طرف دیکھ کے آہیں بھر رہا تھا۔ یہ آنکھیں خشک ہو جائیں گی، مگر جب اس کی یاد آئے گی ان سے آنسوؤں کا سیلاب ابل پڑے گا۔ جوش غم، جوش حیا، پر بھاری تھا۔ نازک نازک شفاف سینہ نالوں سے زیر و زبر تھا۔ ایک آغوش خالی تھی، جو اس کے آغوش کے لئے بے تاب تھی۔ خدنگ نظر، در دنداں، شعلہ رخ، تیر مژگاں، لب لعلین سب میں معشوقانہ علامات عاشقانہ صفات بن گئے تھے۔ آنکھوں سے شبنم آگ بن کے ڈھلک رہی تھی۔ اور حسن کا دل دھڑک رہا تھا۔ اور آخر میں حسن کی وہ شکست، وہ تلوار کی دھار جس کا نام فراق ہے، جس سے مفر نہیں۔

اور اس کے بعد اندھیرا ہی اندھیرا۔

وہ نسوانی کشش کی شمع گل کر کے کوہ طور کی طرف بڑھنا چاہتا تھا لیکن وہ جس نے کوہ طور بنایا ہے، اس نے اسے ہمیشہ کیلئے اس کی نظروں سے اوجھل کر دیا۔ اب ایک کی جگہ دو مورتیں تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کی ضد۔ ایک مرشد کامل کی صورت، تصور شیخ اور دوسرے سکینہ کی آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی بے بس صورت اسے روکتی ہوئی۔ ان دونوں کی مقناطیسی کشش برابر برابر تھی۔ وہ نہ ادھر جا سکتا تھا نہ ادھر۔ اور اس کیلئے ایک ہی راستہ باقی تھا۔ اس گھر سے باہر، ان دونوں کی پرستش میں ان دونوں سے دور۔

اس آپ کی زمین سے الگ آسمان سے دور۔

اس نے جلدی جلدی دو تین جوڑے کپڑے نکالے، کچھ روپے اس کے پاس تھے، وہ جیب میں ڈالے اور گٹھری پیٹھ پر لاد کے چل کھڑا ہوا۔ تین کوس پر ریلوے اسٹیشن تھا۔

میاں گھسیٹے راستے میں ملے اور انہوں نے پوچھا بھی۔ ”میاں کا بھوا۔ کاہے! اتے سبیرے سبیرے اسٹیشن برات ہو؟ ہم تم کو پہنچائے آئیں؟“

اس نے آنسو روک کے انکار میں سر ہلایا اور آگے بڑھ گیا۔

بیس برس گزر گئے۔ اس درمیان میں اس نے پنجاب کے ایک شاعر اقبال کا بھی ذکر سنا اور اس کا کلام بھی جستہ جستہ پڑھا۔ لیکن اس شعر کے معنی اس کی سمجھ میں نہیں آئے۔

کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لئے
سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقد حیات

ایسے شعر پڑھ کے وہ کہتا۔ "ماں، ان پنجابی ڈھگوں کو کبھی شاعری نہیں آئے گی۔" اس کے برخلاف حضرت معروف بجلوی کا ایک ایک شعر اس کے حرز جاں تھا۔ ایک مرتبہ گھر سے نکلنے کے بعد پھر وہ کبھی ان کے سامنے نہیں آیا۔ کسی شہر میں وہ ہوتا اور حضرت آنے والے ہوتے۔۔۔۔۔ یوں تو حضرت درگاہ شریف کو چھوڑ کر باہر جاتے ہی بہت کم تھے۔۔۔۔ تو وہ وہاں سے چل دیتا۔ لیکن اس نے گھر سے نکلنے کے کچھ ہی روز بعد بڑا درد میں ڈوبا معذرت نامہ لکھا اور حضرت نے اسے تہہ دل سے معاف فرما دیا۔ یہ بھی لکھا کہ "ہدایت منجانب اللہ ہے۔ کسی کو نصیب ہوتی ہے کسی کو نہیں۔ ہدایت تمہاری قسمت میں نہیں تھی۔"

اس بیس برس کے عرصے میں شاعری میں اس کا اپنا نام حضرت معروف بجلوی کے برابر ہی برابر مشہور ہو گیا۔ اس کی شاعری رندی کی شاعری تھی۔ رندی اور بے نام، بے مقصد عشق کی شاعری۔ ہر جگہ حسن کی پرستاری، حسن کے "عین" کی پرستاری۔ ایسا معشوق جو ہر معشوق میں موجود ہے۔ اور اس کا اپنا بجز غزل اور جذبہ شعر کے کہیں مقام نہیں۔

وہ شراب پیتا رہا۔ حافظ کی طرح غالب کی طرح۔ یار لوگوں نے کہا کہ اس کے شرب مدام کے دھوکے میں نہ آنا۔ اس نے بھی پیالے میں عکس رخ یار دیکھا ہے۔ وہ خود بھی شک کے عالم میں تھا ممکن ہے ایسا ہو۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس کے عشق میں حقیقت کس قدر ہے۔ اور مجاز کس قدر۔ خبر کس قدر ہے اور بے خبری کس قدر۔ بے خبری بہرحال زیادہ تھی۔ اور ایک حد تک افشردہ انگور تھی۔ یہ نسخہ شاعروں کے لئے افیون سے کسی قدر افضل ہے۔ اور اس سے حسن کی عجیب عجیب کیفیتیں نظر آتی ہیں۔

دہر جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں

یار لوگوں نے غالب کو صوفی بنا دیا۔ تو پھر واجد کی شاعری کو کیوں حسن حقیقت یا حقیقت حسن کا پرتو نہ سمجھا جائے۔ پھر اس نے غالب سے زیادہ "ترنم" سے حسن حقیقت کا مشاہدہ کیا تھا۔ شراب میں مدہوش، ننگ دھڑنگ، سر اور پیر کا ہوش نہیں۔ صرف حسن

حقیقت سامنے تھا۔ شعری ترنم' قافیوں' بندشوں' استعاروں اور ترکیبوں سے جھلکتا ہوا حسن حقیقت۔۔ حسن ہر طرف سے امڈا چلا آتا تھا۔ نظر نظر میں نفس نفس میں سماتا جاتا تھا۔ ایک پردہ اٹھتا تھا تو لاکھوں پردے گرتے تھے۔ لیکن یہ حسن بہرحال بے جہت تھا۔ کبھی ادھر سے نمایاں ہوتا کبھی ادھر سے۔ اس حسن حقیقت نے انسان کو الوہیت بخشی' ملکوتیت بخشی' کیف دیا' سرمستی دی' سب کچھ دیا' سب کچھ سکھایا۔ انسان بننا نہ سکھایا۔ ادھر سے آنسو بہہ رہے تھے' ادھر سے آنسو بہتے رہے۔ اور دور سالہا سال کے اس پار مرشد کامل حضرت معروف بجولوی کا شاندار پرنور چہرہ اور اس کے پاس ہی سکینہ کا بے بس' محبت میں اور نفرت میں بے بس چہرہ' سب ایک خلائے پرنور میں حل ہو جاتے۔ کئی سال ہوئے حضرت معروف بجولوی کی سکینہ سے شادی ہو چکی تھی۔ لیکن کیا ان دونوں کا وصل ان دونوں سے اس کا اپنا روحانی وصل نہیں تھا۔ اسے تمام عالم ایک ہمہ گیر مسلسل آغوش معلوم ہوتا۔ زندگی آغوش در آغوش معلوم ہوتی۔ جیب میں اگر دام ہوتے تو وہسکی ورنہ دیسی ٹھرا۔

اس کا کوئی خاص پیشہ نہ تھا۔ اس نے کئی پیشے اختیار کرنا چاہے۔ مگر شاعری کے سوا اور کسی پیشے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ مشاعروں کیلئے سیکنڈ کلاس کا کرایہ' اور کبھی کبھی معاوضے کے روپے آجاتے' پچاس سے لیکر ڈھائی سو تک۔ یہ زیادہ تر شراب پر خرچ ہو جاتے۔ کبھی بچ جاتے تو کوئی دوست زبردستی کپڑے بنوا دیتا۔ اس کا اپنا کوئی مکان نہ تھا۔ یو پی بھر میں ایک شہر سے دوسرے' ایک قصبے سے دوسرے قصبے' ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں' وہ کسی نہ کسی کا مہمان ہو کے ہفتوں مہینوں رہتا' پھر میزبان یا اس کے نوکروں کی کوئی بات ناگوار خاطر ہوتی اور کہیں سے پیسے آجاتے تو وہ چل دیتا۔

بیس سال بیت گئے۔ حضرت معروف بجولوی کا انتقال ہو گیا۔ وہ ہفتوں روتا رہا۔ اور سب کے کہنے سننے سے ان کے مرقد مبارک کی زیارت کیلئے اس نے بجولی شریف کا ارادہ کیا۔ وہ گھر نہیں گیا جہاں سکینہ تھی۔ سیدھا خانقاہ شریف پہنچا۔ یہاں اپنا مختصر سا سامان ایک حجرے میں رکھوایا۔ غسل کیا۔ عطر لگایا۔ پہلے درگاہ شریف میں فاتحہ پڑھا۔ پھر اپنے مرشد کامل حضرت سید بسم اللہ شاہ معروف کی قبر پر حاضر ہوا۔ وہاں پہنچنا تھا کہ زندگی کے آثار معلوم ہوئے۔ وہی رعب دار نورانی چہرہ سامنے تھا۔ تصور شیخ۔ کوئی اسے گلے

لگا رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "میں نے تیری تمام نالائقیوں کو معاف کیا۔" بیتاب ہو کے وہ مرقد سے لپٹ کے رونے لگا جس پر حال ہی میں گچی کا منقش کام ہوا تھا' اور نئی نئی ہری چادر چڑھائی گئی تھی۔

وہ اتنا رویا' اتنا رویا کہ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ پھر وہ اٹھا۔ میاں گھسیٹے نے کہا۔ "بھیا! بی بی بلاوت ہیں۔ تھکے ماندے اتے برس بعد گھر آئے ہو۔ جرا کھانا کھائے لو۔" اس نے انکار کیا۔ کہا "حضرت کے مرقد کی زیارت کرلی۔ اب واپس جاؤں گا۔ میری طرف سے سلام عرض کر دینا۔" لیکن میاں گھسیٹے کے ہاتھ سکینہ کا پیغام پھر آیا "آخر تم میرے ماموں زاد بھائی بھی تو ہوتے ہو۔ ایک وقت کا کھانا کھاتے جاؤ تو کیا بگڑ جائے گا؟" وہ گھر آیا' باہر کا صحن طے کر کے' اس نے ٹاٹ کا وہ پردہ اٹھایا جو زنانے دروازے پر پڑا رہتا ہے۔ صحن کی موری کے بیچ آنگن میں سکینہ کھڑی تھی۔ اس کے بالوں پر سفیدی غالب آ چکی تھی۔ اس سفیدی پر دھوپ جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔ فراق کی گھڑی کی وہ بیتابی اور بیقراری نہیں تھی۔ اس کی جگہ ایک ایسا غم تھا جو بیس سال تک دل کی گہرائیوں میں بس چکا تھا۔ لیکن اس ضبط کے پیچھے اب بھی نظر بیقرار تھی۔ ہونٹ کانپ رہے تھے' آنکھوں سے خاموش آنسوؤں کا سیلاب بہا چلا جا رہا تھا۔ سر سے قدم تک رعشہ تھا۔ لرزش تھی۔ لہریا دوپٹہ کی جگہ سفید بیواؤں جیسا دوپٹہ تھا۔ ہاتھوں کی چوڑیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ یہ وہ رومانی تصویر تھی جو واجد کو اپنی شادی اور شاعری کے زمانے میں اکثر نظر آیا کرتی تھی۔ وہ زندہ تھا۔ مگر سکینہ آنسو بہا رہی تھی۔ اور باوجود اس تمام عقیدت کے جو تصور شیخ سے وابستہ تھی۔ ایک لمحہ کے اندر واجد پر یہ منکشف ہو گیا کہ یہ رعشہ' یہ لرزش سب اس کیلئے ہے۔ حضرت معروف بجولوی کے لئے نہیں۔

ایک بار پھر عدت کا زمانہ گزرا۔ ایک بار پھر سکینہ سے اس کا نکاح ہوا اور وہ سنبھل گیا۔ اس کی رندی ذرا ذرا کم ہوئی۔ اس کی شاعری میں نشاط اور کیف کی کیفیت پھر سے پیدا ہوئی۔ سکینہ کے منع کرنے اور اس کی زبردستی کے باوجود وہ شراب پھر بھی چوری چھپے پی ہی لیا کرتا کیونکہ کہتے ہیں۔

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

○○

مدن سینا اور صدیاں

(۱)

تب وی تال نے کہا:

----- "مہاراج! اگلے زمانے میں ایک راجہ تھا جس کا نام ویرا باہو تھا۔ انگ پورہ اس کی راجدھانی تھی اور دور دور کے راجے اس کو باج دیتے تھے۔ سات سمندر پار کے سوداگر چھوٹے چھوٹے جہازوں میں بیٹھ کر بھارت ورش میں آتے' اور اس کی راجدھانی سے موتی' مسالے' ہیرے' اور نہ جانے کیا کیا خرید لے جاتے۔ بیوپار کی برکت سے انگ پورہ کے ویش بہت امیر ہونے لگے۔ اور انگ پورہ کے ویش سوداگروں کے مکان روپ اور صفائی میں دوسرے ملکوں کے راجوں کی ڈیوڑھیوں کا مقابلہ کرنے لگے۔ انہیں ویش امیر سوداگروں میں سے ایک کا نام ارتھادت تھا۔ اس کے ایک بیٹا تھا' انمول ہیرے جیسا' جس کا نام دھن دت تھا۔ ایک بیٹی تھی جو دوسری تمام لڑکیوں میں یوں دمکتی جیسے کنکروں میں سچا موتی۔ اس کا نام مدن سینا تھا۔

ارتھادت اپنے بیٹے دھن دت کو ساتھ لے کر سمندر کنارے کے کسی شہر کو چلا جاتا تھا جہاں افریقہ اور روم دیس کے سوداگر مال خریدنے آتے تھے۔ اس کی بیٹی مدن سینا اپنی سکھیوں' سہیلیوں کے ساتھ باغ میں کھیلا کرتی۔

ساون کا مہینہ آیا۔ مدن سینا اور اس کے سکھیاں جھولتی اور گاتی جاتی تھیں۔ آکاش بادل کی رضائی اوڑھے ہلکی ہلکی پھوار برسا رہا تھا۔ مدن سینا اور اس کی سکھیاں

پنچھیوں کی طرح چہچہا رہی تھیں۔ اتنے میں ہوا کا ایک جھونکا آیا اور بڑی بڑی بوندیں درختوں سے گرنے لگیں۔ کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور دھرم دت کو پاس کھڑا دیکھ کر مدن سینا کی ایک سکھی بول اٹھی۔ تیرا دوست یہاں نہیں۔ وہ تو اپنے پتا جی کے ساتھ سمندر کنارے کے شہر کو گیا ہے۔

مدن سینا نے دیکھا کہ دھرم دت اسے برابر گھور رہا ہے۔ شرم سے اس نے گھونگھٹ کاڑھ لیا۔ دھرم دت اسی طرح گم سم کھڑا رہا جیسے وہ اندھا، گونگا یا بہرا ہے۔ بچارا کیا کرتا۔ اتنی دیر میں پریم کے تیروں نے اس کی سمجھ بوجھ کو چھلنی کر دیا تھا۔ وہ سوداگر بچہ بھلا کیا جانتا تھا کہ اس کے دوست دھن دت کی بہن مدن سینا جوان ہو کر ایسی سندر نکلے گی۔ وہ ایک پاگل کی طرح مدن سینا کو گھور ہی رہا تھا کہ مدن سینا اور اس کی سکھیاں چڑیوں کی طرح آپس میں چہچہائیں، کھلکھلائیں، اور پنچھیوں کی طرح پھر سے اڑ کر مدن سینا سمیت مکان میں کہیں غائب ہو گئیں۔

جب دھرم دت کی آنکھوں نے مدن سینا کو اوجھل پایا تو اس کے دل کو بڑا دھچکا لگا۔ گم سم وہ اپنے گھر واپس پہنچا۔ اور صبح تک چاند کی کرنوں کے زخم سہتا، چاندنی کے بھالے کھاتا۔ بچھونے پر کروٹیں بدلتا رہا۔

نور کے تڑکے اٹھ کے وہ سیدھا ارتھادت کے باغ کی طرف چلا۔ اب بھی آسمان سے ہلکی پھلکی پھوار برس رہی تھی اور پتیوں کے کٹوروں میں پانی اور اوس میں امتیاز مشکل تھا۔ ابھی اننگ پورے سے رات کے اندھیارے کا بادل اٹھنے نہیں پایا تھا۔ باغ میں مدن سینا اکیلی تھی۔ بالوں کے لئے پھول چننے آئی ہو گی۔ اس کی سہیلیاں معلوم نہیں اپنے اپنے گھروں میں تھیں یا ابھی مدن سینا ہی کے یہاں پڑی سو رہی تھیں۔ شاید اوس اور صبح کاذب کے پانی کی بوندوں اور ہوا کی بھینی بھینی خوشبو اور پتوں میں گرگٹوں کی سرسراہٹ سے انہیں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ ان کے ہردے ابھی جاگنے نہیں پائے تھے یا شاید جاگ جاگ کے سو گئے تھے۔

اکیلی مدن سینا نے پھول توڑنے میں پھر پیروں کی چاپ سنی اور اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اور پھر اس نے کسی کو چھلانگ مارتے دیکھا اور کانٹوں کی باڑھ سرسرا کر رہ گئی۔

پھر مدن سینا نے دھرم دت کو اپنے پاس کھڑا پایا۔ اس طرح کہ گویا وہ اسے اپنے ہاتھوں میں جکڑ لے گا اور خوف سے اس کا جسم کپکپانے لگا۔ اس کے ہاتھوں سے شبنم اور پانی سے دھلے پھول گر گئے۔ اور بارش کی ہلکی ٹھنڈی پھوار میں بھی اس کی مانگ کے نیچے پیشانی پر پسینے کے گرم گرم قطرے نمودار ہوئے اس نے چیخنا چاہا مگر چیخ نہ سکی۔ اس در کے مارے کہ اس کی داسیاں یہاں اسے اس نوجوان کے پاس اس وقت دیکھیں گی تو اسے نردوش نہ سمجھیں گی۔ اور کیا اس کی سکھیاں اسے یہ کہہ کے بدنام نہ کریں گی کہ وہ خود بڑی رات گئے یا اتنے تڑکے دھرم دت سے ملنے آئی ہو گی۔

اتنے میں دھرم دت کے ہاتھ جو اسے بھینچنے کے لئے اٹھ رہے تھے، نیچے گرے، دھرم دت اس کے چرنوں میں گر پڑا۔ "مدن سینا تو میری نہ ہوئی تو میں مر جاؤں گا۔"

مدن سینا نے اس سے کہا۔ "دھرم دت۔ یہ آج تجھے کیا ہو گیا۔ معلوم ہے میں کنواری ہوں اور میرے پتا نے میری منگنی ایک دوسرے دیش کے سوداگر سمدرت سے کی ہے۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں اس سے میرا بیاہ ہونے والا ہے۔"

دھرم دت زمین سے اٹھ کھڑا ہوا اور دانتوں سے اپنا ہونٹ کاٹ کے اس نے کہا۔ "جو ہونا ہے ہو جائے۔ تیرے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔" اس کے ہاتھ پھر اٹھے۔ مدن سینا کو بھینچنے کے لئے۔ اور وہ خوف سے پھر تھر تھر کانپنے لگی۔ کہیں یہ زبردستی نہ کرے۔ بدنامی کے ڈر سے وہ چلا بھی نہیں سکتی تھی۔ اس نے جلدی سے پیچھے ہٹ کر کہا۔

"سن تو، پہلے میرا بیاہ تو ہو جانے دے۔ میرے پتا کی تمنا تو پوری ہو جائے کہ وہ مجھ کنواری کو دلہن بنتی دیکھیں۔ پھر میں تیرے پاس ضرور آؤں گی کیونکہ تیرے پریم نے میرے دل کو موہ لیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ دونوں ہاتھوں سے اسے روکتی ہوئی اور پیچھے ہٹی۔

راستہ روک کے دھرم دت نے کہا۔ "میں ایسی عورت سے پریم نہیں کر سکتا جو پہلے کسی اور مرد سے ہم آغوش ہو چکی ہو۔"

اور مدن سینا نے ڈر کر کہا۔ "اچھا تو میں بیاہ ہوتے ہی فوراً تمہارے پاس آؤں گی اور اس کے بعد اپنے پتی کے پاس جاؤں گی۔"

اس پر بھی دھرم دت نے اس کا ہاتھ پکڑ ہی لیا اور اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک مدن سینا نے بھگوان کی قسم کھا کے اپنے وعدے کی توثیق نہیں کی۔ تب اس نے اس

کا ہاتھ چھوڑا اور چھلانگ مار کے کانٹوں کی باڑ کود گیا۔

پانی کی پھوار رک گئی تھی۔ مدن سینا کا دل جو دھک دھک کر رہا تھا۔ اب بیٹھنے لگا۔ وہ بہت اداس اداس گھر کے اندر گئی۔

جب بیاہ کا دن آیا اور سب رسمیں پوری ہو چکیں تو مدن سینا اپنے پتی سمردت کے گھر گئی۔ خوشیوں میں دن گزرا اور جب اکیلے میں اس کے پتی نے اسے اپنے آغوش میں جکڑنا چاہا تو وہ تڑپ کے نکل گئی اور دھیرے دھیرے روتے اور آنسو پونچھتے ہوئے سر جھکا کر اس نے کہا۔۔۔۔ "میرے پتی' میرے بالم' میرے ناتھ' میں تجھے اپنی جان سے زیادہ چاہتی ہوں۔ لیکن مجھے جو کہنا ہے سن اٹھ اور وعدہ کر کہ تو مجھے سزا نہیں دے گا۔ تاکہ میں جو کہنا چاہتی ہوں تجھ سے کہہ سکوں۔"

جب سمردت قسم کھا چکا تو مدن سینا نے چند روز پہلے جب اس کے والد اور بھائی سفر پر تھے۔ دھرم دت کے باڑھ پھاند کے اندر آنے اور بارش کی ہلکی پھوار اور شبنم اور آنسوؤں کی کہانی اسے سنائی۔ اور آخر میں اس سے کہا۔ "میرے ساجن اب تو بتا' اب میں کیا کروں' میں تو اس پاپی سے بچن ہار چکی ہوں۔"

سمردت قسم تو کھا ہی چکا تھا۔ نہ وہ اسے سزا دے سکتا تھا نہ اسے روک سکتا تھا۔ اس نے مدن سینا کو اجازت دے دی کہ اپنا قول پورا کرنے کو جہاں اس کا جی چاہے جائے۔

وہ اٹھی' اور اپنے پتی کے گھر سے باہر چلی گئی۔

اس رات کو آسمان پر گہرے بادل چھائے تھے۔ مگر بجلی نہیں چمک رہی تھی کہ انگ پورے کی سڑک پر کوئی چور ڈاکو گھات لگائے بیٹھا ہو تو نظر آ جائے یا کوئی کالا یا چتکبرا سانپ کہیں کنڈلی مارے بیٹھا ہو تو پاؤں پڑنے سے پہلے ہی راہی کو خبر ہو جائے۔

مدن سینا اس اندھیرے کی وجہ سے اپنے جیون سے اور بھی بے پروا ہو کر دھرم دت کے گھر کی طرف جا رہی تھی کہ بڑ کے ایک موٹے تنے کے پیچھے سے لپک کے ایک ہٹے کٹے ڈاکو نے اسے دبوچ لیا۔ نہ وہ اسے چھوڑنا چاہتا تھا نہ اس کے زیوروں کو۔ اس کے آگے ہاتھ جوڑ کے دیش سوداگر کی لڑکی نے دھرم دت سے اپنے وعدے' شوہر کی اجازت اور سب واقعات بیان کئے اور آخر میں منت کر کے کہا۔ "ڈاکوؤں کے راجہ بس

مجھے گھنٹہ بھر کے لئے چھوڑ دو۔ میں اپنا قول پورا کر لوں۔ اس کے بعد میں یہیں واپس آؤں گی۔ جیسا سلوک تمہارا جی چاہے کرنا اور تم کوئی چنتا نہ کرو۔ میں اپنا بچن پورا کروں گی۔"

ڈاکو نے یہ سن کر اسے جانے کی اجازت دے دی۔ اور وہ سیدھی دھرم دت کے گھر پہنچی۔ جو اتنے دنوں سے اس کے عشق اور اس کی تمنا میں بے چین تھا لیکن اسے اپنے گھر میں دیکھ کر اچنبھے سے اسے سکتہ ہو گیا۔ پھر اس نے پوچھا۔ "تم یہاں کیسے آنے پائیں۔"

مدن سینا نے اپنی اور اپنے بالم کی گفتگو اس کے سامنے دہرائی تو دھرم دت جو اس کے سوا کسی اور کو کبھی چاہ نہ سکتا تھا' کہنے لگا۔ "تم نے تو اپنا بچن پورا کیا لیکن تم جو کسی دوسرے کی پتنی ہو میرے کس کام کی ہو جس طرح تم آئی ہو ویسی ہی چلی جاؤ کوئی تمہیں دیکھنے نہ پائے۔ ایک آنکھ سے ہنستی اور دوسری سے روتی مدن سینا اسی راستے سے واپس ہوئی۔ لیکن اس نے ڈاکو سے بھی بچن ہارا تھا اور اس بڑ کے سامنے اس ڈاکو سے ملنا تھا۔ بڑ کے پاس پہنچتے پہنچتے اس کا دل بیٹھنے لگا۔

بڑ کی آڑ سے ڈاکو کلہاڑی لئے پھر دھم سے سامنے آ کودا۔ اسے مدن سینا کے آنے کی تو آشا نہیں تھی۔ مگر وہ دوسرے امیر راہگیروں کو لوٹنے کا انتظار کر ہی رہا تھا۔ مدن سینا کو اتنی جلدی واپس آتے دیکھ کر اس نے کہا۔ "کیوں کیا ہوا؟"

اور مدن سینا نے یہ قصہ بیان کیا کہ دھرم دت نے ہاتھ لگائے بغیر ہی اسے چھوڑ دیا۔ اس پر اس ڈاکو نے اسے کہا' جو اب تک اپنی کلہاڑی سے درخت کی لکڑی کی طرح ہزاروں کے سر توڑ چکا تھا۔ "تیری سچائی سے خوش ہو کر میں بھی تجھے چھوڑتا ہوں۔ جا اپنے سونے چاندی اور عزت کے زیوروں سمیت اپنے گھر جا۔"

سمدروت۔ جس کا دل پہاڑی ندی کی طرح سر پٹک رہا تھا۔ کواڑ پر ہلکی سی تھاپ کی آواز اور زیوروں کی چھنا چھن سن کے اٹھا۔ مدن سینا نے اس کے چرنوں کو چھو کے جب سر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں جو آنسو چھلک رہے تھے وہ رنج یا بے کسی کے نہیں' خوشی اور پریم کے تھے۔ سمدروت سے اس نے رات کی کہانی سنائی۔ کس طرح سچ اور اپنے بچن کے پاس کی وجہ سے دھرم دت اور ڈاکو دونوں کے دلوں میں بھگوان نے ترس اور رحم

ڈالا- کس طرح وہ پاک اور اچھوتی اپنے ساجن' اپنے ناتھ کے پاس واپس آئی- سمدرت کو اپنے گھرانے کی آبرو بچنے سے زیادہ خوشی اس کی ہوئی کہ اس نے ایسی سچی اور قول کی پکی استری پائی اور اس کے بعد مرتے دم تک دونوں نے ہنسی خوشی دن گزارے-

قصہ ختم کر کے ویتال نے مہاراج تری وی کرم سینا سے پوچھا- "جے مہاراج کی- اب مہاراج یہ بتائیں کہ ان تینوں میں سب سے زیادہ فراخدلی سے کس نے کام لیا- مدن سینا کے پتی نے یا دھرم دت نے یا ڈاکو نے-"

تب مہاراج نے کچھ سوچ کے اسے جواب دیا- "ویتال- ان تینوں میں سچ پوچھو تو دراصل فراخدل وہ ڈاکو ہی تھا- اس کا پتی ہی اسے کیسے نہ جانے دیتا- جب کسی پتنی اور کسی مرد میں کسی قسم کا بندھن ہو تو کوئی شریف پتی اسے کیسے روک سکتا ہے- دھرم دت اس لیے اس سے دست بردار ہو گیا کہ وقت گزر جانے کی وجہ سے اس کا عشق سرد ہو چکا تھا اور شاید وہ ڈرتا تھا کہ مدن سینا کا پتی دوسرے دن راجہ سے اس کی شکایت نہ کر دے- لیکن ڈاکو' وہ بے اصول' بدمعاش' اندھیارے کا باسی' وہ سچ مچ فیاض اور فراخدل تھا کہ اس نے ایسی خوبصورت عورت کو جواہرات سمیت چلے جانے دیا-"

معلوم نہیں ویتال اب کہاں ہے- اور کس حال میں ہے- کشمیر کے کسی پہاڑ پر جہاں ناظر سے اس کی ملاقات ہوئی تھی' کوئی اور پچیسی لکھ رہا ہے یا شہروں اور دیہاتوں میں آوارہ پھر رہا ہے- ممکن ہے وہ کبھی شیواگرام بھی گیا ہو- اور اس نے مدن سینا کے اصولوں کو اہنسا اور ستیہ گرہ کے لقب سے سیاست پر چسپاں ہوتے دیکھا ہو- یہ صدیوں کا تانا بانا- سچائی کا تقاضا تو یہی ہے کہ غنیم حملہ رنا چاہتا ہے تو گھر کے دروازے کھول دو- بھارت ماتا کی عصمت اور عزت کو ہاتھ لگائے بغیر وہ الٹے قدم واپس ہو جائے گا- اس کا کیا علاج کہ فاشسٹ شہنشاہیاں دھرم دت اور ڈاکو اتنے شریف بھی نہیں-

اور معلوم نہیں ویتال بابو کو پتہ ہے یا نہیں کہ مدن سینا کی اولاد چار دانگ عالم میں پھیل چکی ہے- اس کی اور سمدرت کی اولاد کا اثر برما میں راج کماری تھودھما تساری کے فیصلوں پر بھی ہوا- بہار دانش' طوطی نامہ' داستاں چہل وزیر اور معلوم نہیں کہاں کہاں پھرتے ہوئے اس کے پوتے پوتیوں نے سنا ہے کہ گرین لینڈ جانے والے وائکنگ سیاحوں میں گھر کر اس نے چستان کی پہاڑیوں کی بھی سیر کی- اسی خاندان کی ایک شاخ نے

سائبریا کے برفستانوں میں قیام کیا جہاں سے انہیں گزشتہ جنگ عظیم کے بعد نکال دیا گیا۔

(2)

لیکن مہاراج تری وی کرم سینا نے اپنے قولِ فیصل میں یہ کیوں کہا۔ "جب کسی پتنی اور کسی اور مرد میں کسی قسم کا بندھن ہو تو کوئی شریف پتی اسے کیسے روک سکتا ہے۔"

کیا ابن حزم سے ہوتا ہوا یہ سلسلہ انڈریاس، کیپی لانس تک پہنچتا ہے۔ کرون وسطیٰ کے درباری آداب عشق میں اس کی تفسیر ملتی ہے جب ملکہ اور خواتین ایک دربار عشق یا عدالت عشق ترتیب دیتی تھیں، جس میں عاشقوں کی بے وفائی اور معشوقاؤں کی جفا پر استغاثے ہوتے تھے۔ اور احکامات اور سزائیں دی جاتی تھیں۔

ایک خاتون الف کو مدن سینا کی طرح اپنے پتی ہی سے محبت تھی۔ یہ اور بات تھی کہ اس جاہلیت کے زمانے میں خاوند' خداوند نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ نائٹ اپنی زندگی اور اپنی خدمت کو مذہب اور خواتین کی خدمت کے لئے یکساں وقف رکھتے تھے۔ بہرکیف اس خاتون الف پر دھرم دت کی طرح ایک مرد شریف کاؤنٹ جی عاشق تھا۔ عاشق اور معشوقہ کی بحث و حجت کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو دونوں حریفوں نے میری ملکہ شامپین سے فیصلہ چاہا اور اس نے کئی خواتین کے مشورے سے یہ فیصلہ صادر کیا۔

"ہم اعلان کرتے ہیں اور ہم اسے امر طے شدہ سمجھتے ہیں کہ عشق ایسے دو افراد کے درمیان اپنی طاقتوں کا اثر نہیں ڈال سکتا جو ایک دوسرے سے منکوح ہوں۔ کیونکہ عشاق ایک دوسرے کو ہر چیز آزادی سے دیتے ہیں، کسی جبر یا مجبوری سے نہیں۔ لیکن شادی شدہ جوڑے میں فریقین مجبور ہیں کہ بطور فرض ایک دوسرے کی خواہشیں پوری کریں۔ اور ایک دوسرے سے امر میں انکار نہ کریں۔۔۔۔"

اس فیصلہ کی تاریخ یکم مئی 1174ء ہے۔

اس کے آٹھ یا نو سو سال بعد اس فیصلہ پر دو یہودیوں کارل مارکس اور ا۔ لنگز نے نظر ثانی کی۔ ان کا فیصلہ یہ ہے:۔

"ہمارے بورژوا اپنے مزدوروں کی بیویوں اور بیٹیوں ہی پر اکتفا نہیں کرتے۔ رنڈیوں کا تو ذکر ہی کیا' انہیں ایک دوسرے کی بیویوں کو پھسلانے میں انتہائی لطف آتا ہے۔"

(3)

مجھ جیسے راوی پر کون اعتبار کرے گا---- اور یوں بھی ہندوستانی مورخوں کو کون سند کے قابل سمجھتا ہے---- لیکن میرے خیال میں سمدرت اور مدن سینا کی اولاد اس طرح ولایت پہنچی ہو گی کہ جب شام اور مصر کی فتح کے بعد خسرو پرویز قسطنطنیہ پر ایک طرف سے بڑھ رہا تھا۔ اور اس کا حلیف وحشی اور قوم کا کاغان (خاقان) یورپی جانب سے۔ اس وقت خسرو پرویز کو صلح کیلئے جو تاوان جنگ باز نطینی قیصر نے پیش کیا۔ وہ ایک ہزار طلائی مہروں' ایک ہزار نقرئی مہروں' ایک ہزار ریشمی عباؤں' ایک ہزار گھوڑوں اور ایک ہزار کنواری لڑکیوں پر مشتمل تھا۔

ان ایک ہزار کنواریوں میں سیرا یا شیریں شامل نہیں تھی۔ مشرقی افسانہ نگاروں کے برخلاف مغربی مورخوں کو اس سے اتفاق نہیں کہ یہ سیرا یا شیریں باز نطینی قیصر موریس کی بیٹی تھی۔ لیکن وہ یہ ضرور مانتے ہیں کہ سیرا یا شیریں کسی مشہور اعلیٰ رومی گھرانے کی چشم و چراغ تھی۔ جس طرح اس کے رومی نام سیرا کو بگاڑ کر ایرانی افسانہ نگاروں نے اسے شیریں بنا دیا---- اس لفظ میں ایرانی تصور حسن کی روح پنہاں ہے---- اسی طرح اس کے شوہر شہنشاہ کو اس کی زندگی ہی میں پرویز کا لقب ملا۔ جو ظاہر کرتا ہے کہ اس کے مردانہ حسن میں ستاروں کی سی جگمگاہٹ تھی۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ خسرو پرویز کو اپنی ملکہ شیریں سے جس قدر عشق تھا' ملکہ اسی والہانہ عشق سے اس کا جواب نہ دے سکتی تھی۔ اب مدن سینا' دھرم دت اور سمدرت کے مثلث نے یہ شکل اختیار کی۔

مدن سینا	شیریں
سمدرت	خسرو پرویز

فرق اتنا تھا کہ مدن سینا کو اپنے شوہر ہی سے محبت تھی۔ لیکن شیریں کا دل اپنے حسین شوہر شہنشاہ کا نہیں۔ ایک کمین و کمتر مزدور کا غلام ہو چکا تھا یہاں تیشہ اور جوئے شیر اور کوہ کنی کا قصہ دہرانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن مدن سینا کی طرح شیریں نے بھی وصل کا وعدہ کیا تھا۔ سمر دت کی طرح خسرو پرویز نے اس وعدے کی توثیق کی۔ سمر دت اپنے وعدے پر اس لئے قائم رہا کہ اس وقت عورت خانگی جائیداد نہیں بننے پائی تھی۔ لیکن شیریں اور فرہاد دونوں ایرانی شاہان شاہ کی رعایا اور اس کی ملکیت تھے۔ یہ اور بات تھی کہ وہ شیریں کے جسم کا مالک تھا۔ اس کے دل کا مالک نہ بن سکا۔ لیکن اس نے سمر دت کے برخلاف وعدہ پورا نہ ہونے دیا۔ "گرسنہ مزدور طرب گاہ رقیب" نے کم ظرفی سے اپنی جان دے دی۔ شیریں کا دل اور زیادہ ٹوٹ گیا۔ خسرو پرویز کو اس وعدہ شکنی اور کامل فتح کے بعد اتنی بھی مسرت اور اتنا بھی اطمینان نصیب نہ ہو سکا جتنا رومی صوبوں کی فتح کے بعد۔ اس نے ان ہزار بازنطینی کنواریوں سے معلوم نہیں کس طرح دل بہلایا۔ اور دل بہلا ہی رہا تھا کہ اسکندرون کی خلیج پر ہر قلیس اعظم کی فوجیں اتریں ---- رومی شہنشاہ کے پیشرو نے شیریں اور ایک ہزار کنواریوں کو ایرانی کے سپرد کیا تھا۔ ہر قلیس نے ترک خان کو اپنی خوبصورت بیٹی بھینٹ چڑھانے کا وعدہ کیا۔ دست گرد کے قلعہ میں اپنی بے شمار خواصوں اور عورتوں کو جن کی تعداد تین ہزار تھی ---- چھوڑ کر خسرو پرویز بھاگ نکلا اور پھر ایک تاریک برج میں اس کے ساتھ اس کے انسانیت ناشناس بیٹے نے وہی سلوک کیا جو اکثر تاریخ میں ہوتا آیا ہے۔ ہر قلیس ممکن ہے کہ ان ہزار رومی لڑکیوں کو چھڑا لایا ہو۔ جو اب کنواریاں نہ رہی تھیں۔ ممکن ہے جب بازنطینی شہنشاہ زیتون کی شاخوں اور بے شمار چراغوں میں گھرا ہوا قسطنطنیہ واپس ہوا تو اس کے جلوس میں ہزارہا ایرانی دوشیزائیں ہوں۔ ممکن ہے اس سلسلے میں ایران کے پڑوسی راج انگ پورہ کے تاجروں کی بہو بیٹیاں بھی ہوں اور اس طرح مدن سینا کی اولاد قسطنطنیہ پہنچی ہو۔

جب بازنطینی شہنشاہ ہر قلیس قسطنطنیہ میں ایران سے مصر و شام کے صوبوں کو واپس چھین لینے کی خوشیاں منا رہا تھا تو شام کے ایک گمنام گاؤں پر عرب کے ایک غیر معروف شہر مدینہ کے باشندوں سے اس کے فوجیوں کی کچھ جھڑپیں ہوئیں۔ اس واقعہ کو

ہر قلیس نے اس وقت اتنی ہی اہمیت دی جتنی اس نے اور ایرانی شاہان شاہ نے عربی پیغمبر کی چٹھیوں کو دی تھی۔

لیکن بہت جلد ریگستان کی فوجیں مرو سے لے کر مصر تک چھا گئیں جو صوبے ہر قلیس نے ایرانیوں سے واپس چھینے تھے۔ عربوں نے فتح کر لئے۔ یہاں تک کہ حضرت ابو ایوب انصاری کے پرچم کو صرف یونانی آتش روک سکی۔ اور یونانی آتش کے زیر سایہ مدن سینا کی اولاد قسطنطنیہ میں پروان چڑھی اور یہاں سے بہ سلسلہ تجارت بڑھتی ہوئی مغربی یورپ تک پہنچی۔ جنوبی فرانس میں اس نے مانی کے اثرات کو باقی رکھا۔ لاطینی مصنفوں سے اس کا حال بوکاچیو اور چاسر نے سنا۔

لیکن جس طرح ویتال نے مہاراج تری وی کرم سینا سے پوچھا تھا میں آپ سے پوچھتا ہوں۔ "سب سے زیادہ کم ظرف کون تھا؟ خسرو پرویز؟ یا شیریں؟ یا فرہاد؟"

چاسر کے فر۔ینکلین یعنی چودھویں صدی عیسوی کے اس زمیندار نے جو غلام تو نہ تھا مگر عالی خاندان اور شریف النسل بھی نہ ہوتا تھا۔ کچھ اس قسم کا قصہ بیان کیا۔

آرموریکا میں جس کو بری طینی بھی کہتے ہیں۔ مدن سینا کی اولاد میں ایک خاتون تھی جس کا نام ڈوری گن تھا۔ اسی ملک میں ایک نائٹ بھی تھا ملک کے شریف ترین طبقے کا نمائندہ۔ اس کا نام آر وے راگس تھا۔ اسے اس خاتون سے عشق تھا اور وہ بے حد زحمت اٹھاتا اور کوشاں رہتا کہ بہترین طریقے پر اس خاتون کی خدمت کر سکے۔ اپنی خاتون کو خوش کرنے کیلئے اس نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے' بڑی بڑی مہمیں سر کیں۔ تب کہیں جا کر وہ ڈوری گن کو جیت سکا۔ اس کی قابلیت و شہامت کو اس خاتون نے اپنے شایان شان پایا۔ خاص طور پر اس کے عجز اور اس کی تابعداری کی وجہ سے اس کی خدمت اور اس کی درخواست پر اس نے ایسا ترحم کا جذبہ محسوس کیا کہ اس نے اسے اپنا شوہر یا اپنا آقا بنایا۔ آردے راگس نے خود اپنی مرضی سے یہ قسم کھائی کہ وہ ایک نائٹ کی طرح اپنی خاتون کی خواہش کے خلاف کبھی اپنا حکم چلانے کی کوشش نہ کرے گا۔ کبھی رشک و حسد کا اظہار نہ کرے گا۔ ہمیشہ اس کی اطاعت کرے گا۔ ہر بات میں اس کی مرضی کا پابند رہے گا۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی عاشق اپنی معشوقہ کی مرضی کا پابند ہوتا ہے۔

ڈوری گن نے بڑے انکسار سے اس کا شکریہ ادا کیا۔ "جناب جس طرح مجھے آپ نے اپنی مردانہ شرافت سے اس قدر حکومت بخشی ہے۔ اسی طرح میں بھی اس کا وعدہ کرتی ہوں کہ آپ کی خادمہ اور سچی بیوی رہوں گی۔ اس کا میں آپ سے پکا عہد کرتی ہوں۔"

دوست اور عشاق ایک دوسرے کی تابعداری کرتے ہیں۔ محبت ایک فریق کے استبداد اور دوسرے کی غلامی کو برداشت نہیں کر سکتی۔ جب استبداد آتا ہے تو عشق کا دیوتا اپنے پر پھڑپھڑاتا ہے اور یہ جا' وہ جا' رخصت۔ ہر چیز کی طرح محبت کی روح بھی آزاد ہے۔ فطرتاً" عورتیں بھی غلامی نہیں' آزادی چاہتی ہیں---- (اقبال نے زمرد کے گلوبند کی ایک ہی کہی----) اور مرد بھی۔

یہ معاہدہ سیدھا سادہ مگر کتنا عاقلانہ تھا۔ خاتون کو اپنا شوہر کیا ملا بیک وقت آقا بھی ملا اور خادم بھی۔ محبت میں غلام اور ازدواج میں آقا۔ نائٹ کو آقائی بھی ملی اور خدمت بھی۔ خدمت؟ نہیں اس سے زیادہ تو آقائی ہی کیونکہ اسے بیوی بھی ملی اور محبوبہ بھی۔

کارہائے نمایاں سرانجام دینا ہر نائٹ کا فرض تھا۔ اس فرض کو انجام دینے آر دے راگس انگلستان کے جزیرے میں گیا جسے برطانیہ بھی کہتے ہیں۔ کتاب کہتی ہے کہ یہاں اسے دو سال لگ گئے۔ اس درمیان میں اس کی بیوی ڈوری گن اسے اپنے دل کی زندگی کی طرح چاہتی رہی۔ اس کے فراق میں روتی اور آہیں بھرتی' تڑپتی' راتوں کو جاگتی' نالہ و زاری کرتی' فاقے کھینچتی ہے۔

آر دے راگس کے خط کبھی کبھی آتے۔ کبھی وہ برطینی کے ساحل پر کھڑی ہو کے اس کے جہاز کا انتظار کرتی اور چٹانوں کو دیکھ دیکھ کر ہول کھاتی۔ اس ڈر سے دعائیں مانگتی کہ کہیں اس کے شوہر' اس کے محبوب کا جہاز بھی ان چٹانوں سے ٹکرا کے پاش پاش نہ ہو جائے۔ خدایا تو دیکھتا ہی ہے کہ کتنے انسانوں کو یہ چٹانیں غارت کرتی ہیں لاکھوں انسانوں کی جانیں ان چٹانوں نے چھینی ہیں کیا تیرے انسانوں کا یہ حشر ہونا ضروری ہے جو تیری صنعتوں میں تیرے شاہکار سمجھے جاتے ہیں جنہیں تو نے اپنی شبیہہ کے مطابق بنایا ہے---- بہت کم وہ خوش ہوتی یا ہنستی بولتی۔ مگر مئی کی چھ تاریخ کو اپنی سہیلیوں کے جبر کرنے سے وہ ایک ناچ میں گئی۔ اس ناچ میں ڈوری گن کے ساتھ ایک اسکوائر ناچ رہا

تھا۔۔۔۔ اسکوائر یعنی قرون وسطیٰ کا بڑا زمیندار، لیکن کسی نائٹ کا محض ہمراہی یا اردلی اور اس کی خاتون کی متابعت کرنے والا یا ہم رکاب یا ملتفت۔۔۔۔ تازگی اور آہنگی میں شمالی یورپ کے مئی کے مہینہ کا جیسا۔ اس کا نام آرے لیس تھا۔ ناچنے اور گیت گانے میں عدیم المثال تھا۔ نوجوان تھا، مضبوط تھا، صالح تھا، امیر تھا اور عقلمند تھا۔ لوگ اسے پسند کرتے تھے اور اس کی قدر کرتے۔ اس زندہ دل اسکوائر کو دنیا میں سب سے زیادہ ڈوری گن سے محبت تھی۔ اس حال میں اسے دو سال سے زیادہ ہو گئے تھے لیکن اس نے اپنا درد دل کسی سے نہ کہا تھا۔ ناامیدی اس پر غالب تھی۔ زبان سے کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ صرف اپنے گیتوں میں وہ اپنے دل کا دکھ کچھ نہ کچھ نچوڑ لیتا۔ عام انداز میں واسوخت لکھتا۔ یہ بتاتا کہ وہ عشق میں گرفتار ہے اور کوئی اسے نہیں چاہتا۔۔۔۔ گیتیں، نغمے، نظمیں، واسوختیں لکھتا، اور بتاتا کہ وہ اپنے غم کا اظہار نہیں کر سکتا مگر وہ اس طرح عذاب بھگت رہا ہے جیسے دوزخ میں کوئی خبیث روح، صدائے بازگشت کی طرح اس کی قسمت میں بھی موت لکھی ہے۔

لیکن اس ناچ کے موقعہ پر اس نے ہمت کر کے ڈوری گن سے حال دل کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ میری ساری خدمت بیکار ہے۔ میرا دل پارہ پارہ ہو رہا ہے۔ خانون میرے رنج اور درد پر رحم کیجئے۔ کیونکہ آپ کا ایک لفظ مجھے جلا یا مار سکتا ہے۔"

وہ آرے لیس کی طرف دیکھنے لگی۔ "اس سے پہلے میں نہیں سمجھ سکی تھی کہ تمہارا مطلب کیا ہے لیکن آرے لیس اب میں تمہاری خواہش کو سمجھ گئی۔ اس خدا کی قسم جس نے مجھے روح اور جان دی کہ کسی اور کی بیوی ہوتے ہوئے میں بیوفائی نہیں کر سکتی۔" پھر اس نے مذاق میں کہا۔ "آرے لیس، اس خدائے بلند و برتر کی قسم جو اوپر ہے چونکہ میں دیکھتی ہوں کہ تم اس قدر گڑگڑا کر التجا کر رہے ہو۔ اس لئے سنو کہ اسی دن میں تمہاری معشوقہ بنوں گی۔ جس دن بری طینی کے ساحل کی یہ دیو ہیکل چٹانیں جن سے ٹکرا ٹکرا کے جہاز اور کشتیاں پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ ساحل سے ہٹ جائیں گی۔ ایک ایک پتھر ہٹ جائے گا۔ اس دن میں وعدہ کرتی ہوں میں تمہاری معشوقہ بنوں گی۔"

اس سے زیادہ ناممکن اور کیا چیز ہو سکتی۔ فرہاد کو پہاڑ کاٹنے کی جو شرط پیش کی گئی تھی۔ اسے انسان کی محنت پورا تو کر سکتی تھی۔ وہی شرط یہاں پھر دہرائی گئی لیکن وہ اگر

کٹھن تھی تو یہ ناممکن۔

آرے لیس اپنے گھر واپس گیا۔ اسے یقین آگیا کہ اب موت سے بچنا مشکل ہے۔ اپنے دل کو اس نے سرد ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ سورج کے دیوتا سے اس نے گڑگڑا گڑگڑا کر دعا مانگی کہ کسی معجزے کے ذریعے یہ چٹانیں ہٹ جائیں۔ دعائیں پوری نہ ہوئیں اور ڈوری گن کا شوہر گھر واپس آگیا۔ اپنے نوجوان اور شریف و باعزت نائٹ کو دوبارہ پا کے وہ پھولے نہ سماتی تھی۔

جادو اور طلسمات' انسان عاقل کی عقل سے زیادہ پرانے' پہلے شاید مشرق میں چل نکلا' پھر مغرب میں کچھ ایسے مقبول ہوئے کہ جون آف آرک کی جان اس الزام میں گئی' اور اس الزام میں اٹھارویں صدی میں کیسا نووا کو ایسی سخت قید بھگتنی پڑی کہ اس سے اس کا نکل بھاگنا' انسان کی قوت ارادی اور اس کے جذبہ آزادی کا معجزہ ہے۔ کسی لاطینی مصنف کے دماغ نے جو مشرقی داستانوں سے سرشار تھے۔ مدن سینا کے ڈاکو کو جو انگ پورہ کی ایک سڑک پر بڑ کے پیچھے چھپ کے راہگیروں کو لوٹا کرتا تھا ایک جادوگر راہب بنا دیا۔ یہ راہب جو جادوگر بھی تھا' اور فلسفی بھی آرے لیس اور اس کے بھائی کو مشرقی طلسمات کے تماشے دکھانے لگا' جیسے کٹھ پتلی کا کھیل۔ بازوں سے چھوٹے چھوٹے پرندوں کا شکار' شکاری کتوں سے ہرنوں کی ڈاروں کا شکار۔ اور اس نے اپنی شعبدہ کاری سے آرے لیس کو ڈوری گن کے ساتھ خود اپنے آپ کو ناچتا دکھایا۔ اور ایک ہزار پونڈ کے معاوضے میں اس نے بری طینی کی ساری چٹانیں غائب کرنے کا ذمہ لیا۔

اور قرون وسطیٰ میں جادو کا جو زور تھا۔ اس زور سے چٹانیں غائب ہو گئیں۔ اب موجیں نرم نرم خراماں خراماں پھیلتی پھیلتی بری طینی کے ساحل تک آ جاتیں۔ پہاڑوں سے سر نہ ٹکراتیں' چٹانوں سے پٹک کر جھاگ نہ اگلتیں۔

جادو نے وہی کام کر دکھایا جو فرہاد جیسے پتھر پھوڑنے والے کے تیشے نے کیا تھا۔

آرے لیس نے ڈوری گن کو اس کا وعدہ یاد دلایا۔ اپنے درد عشق کا ذکر کیا۔ اسے سمجھایا کہ اب بھی وہ اپنا وعدہ پورا نہ کرے تو وہ اس کی بے گناہ موت کی ذمہ دار ہو گی۔ اپنے باغ کو اس نے ملنے کا مقام تجویز کیا۔

وہ رخصت ہو گیا' تو وہ حیران کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اس کے چہرے پر خون کے

ایک قطرے کے آثار بھی نہ تھے۔ ایک دو روز روتی آہ و زاری کرتی رہی۔ اس طرح غش کھا کھا جاتی کہ دیکھنے والوں کو دکھ ہوتا۔ لیکن کسی سے اس نے کہا نہیں کہ اس کی حالت غیر کیوں ہے۔ کیونکہ اس کا شوہر دو تین دن کیلئے باہر گیا ہوا تھا۔ اکیلے میں وہ قسمت کا گلہ کرتی۔ جس نے اس کیلئے یہ جال پھیلایا تھا۔ جس سے نکلنے کا موت یا بے عزتی کے سوا اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔ پھر بھی وہ سمجھتی کہ جسم کی بے حرمتی سے تو موت ہی اچھی ہے۔ اس سے پہلے بھی تو شریف بیویوں اور کنواریوں نے اپنے جسم کو پامالی سے بچانے کیلئے اپنی جانیں لے لی ہیں۔

ایک دو روز وہ یہی سوچتی رہی یہاں تک کہ اس کا قابل عزت نائٹ آردے راگس گھر واپس آیا اور اسے زار زار روتے دیکھ کے اس کا سبب پوچھا' تو وہ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے آرے لیس سے اپنی شرط کا ذکر کیا۔ جس کا پورا ہونا ناممکن تھا۔ مگر جو پوری ہو گئی اور اپنے وعدے کا ذکر کیا۔

اس کے شوہر نے اپنے چہرے کو بشاش بنا کے دوستانہ الفاظ میں اسے سمجھایا۔ "کہ قول پورا کرنے سے بڑھ کے انسان کا کوئی اور فرض نہیں" پھر وہ بھی بے اختیار رونے لگا اور اس نے کہا "اور کسی سے اس واقعہ کا ذکر نہ کرنا تاکہ میں اس طرح اپنا رنج برداشت کر سکوں اور تم بھی اپنے چہرے سے تکدر ظاہر نہ ہونے دینا تاکہ لوگ اس کا سبب نہ تاڑ جائیں۔" پھر اس نے اپنے ایک اسکوائر اور ایک خادمہ کو حکم دیا کہ ڈوری گن کو فلاں مقام پر پہنچا آئیں۔

بازار ہی میں آرے لیس ملا اور ڈوری گن سے پوچھا کہ کہاں جا رہی ہے۔ اس نے جواب دیا۔ "افسوس' تمہارے باغ کو' جہاں تم نے بلایا تھا اور جہاں اپنا وعدہ پورا کرنے کیلئے جانے کا میرے شوہر نے حکم دیا ہے۔"

اس واقعہ پر آرے لیس کو سخت حیرت ہوئی اور اسے بڑا ترس آیا---- اس پر بھی کیونکہ وہ اس طرح گریہ و زاری کر رہی تھی۔ اور قابل عزت نائٹ آردے راگس پر بھی جس نے اسے اپنا وعدہ پورا کرنے کیلئے کہا تھا۔ تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ اپنی ہوس پر قائم رہنا بڑی کمینگی ہو گی۔ فیاضی اور شرافت کے خلاف بڑا سخت جرم ہو گا۔ اس لئے اس نے خاتون کو اس کا ہارا ہوا قول معاف کر دیا۔ اور کہا

"اسکوائر---- نائٹ کا اردلی بھی شرافت کا فرض اسی طرح بے جھجک ادا کر سکتا ہے، جیسے کوئی نائٹ۔"

جادوگر راہب کو اس نے پانچ سو پونڈ لے جا کے دیئے۔ اور باقی رقم کے لئے مہلت مانگی۔ جادوگر کے پوچھنے پر آرے لیس نے کہا کہ اس کی محبوبہ اس کے باغ تک آئی مگر اس کی نہ ہوئی۔ آردے راگس نے اپنی شرافت سے گوارا کر لیا کہ خواہ صدمہ اور کوفت سے اسے موت ہی کیوں نہ آئے وہ اپنی بیوی کو بدعہدی کا مرتکب نہیں ہونے دیگا۔ اور جب اس نے خود ڈوری گن کو اس قدر مغموم دیکھا تو اس نے اسے بغیر چھوئے ہوئے باغ سے واپس جانے کی اجازت دی۔

جادوگر راہب نے اسے ہزار پونڈ معاف کر دیئے۔ اور کہا "ایک راہب بھی تم لوگوں کی طرح شرافت کے کام کر سکتا ہے۔"

چاسر کے فر-لنکلن نے ویتال کی طرح پوچھا۔ "آقاؤ قبل اس کے کہ ہم آگے بڑھیں بتاؤ ان میں سب سے زیادہ شریف اور فیاض کون تھا؟" اس قسم کے سوال قرون وسطیٰ میں اکثر پوچھے جاتے تھے۔ اور سوالات عشق کہلاتے تھے۔

کلاس میں ایک لڑکی نے اٹھ کے پروفیسر کو جواب دیا۔ "میرے خیال میں ڈوری گن سب سے زیادہ فیاض تھی۔ وہ خودکشی کر سکتی تھی، لیکن اس طرح اس کا وعدہ پورا نہ ہوتا۔"

سب ہنسنے لگے۔

(4)

جس شب رگھبیر پیلس میں ہسپانیہ کے مظلومین کی امداد کے لئے ناچ اور تفریحات کا جلسہ تھا۔ اس شام کو پانی زور سے برسا تھا۔ مالا بار ہل کی سڑکیں ڈھلوانوں پر موٹر کے ٹائروں کو پھسلا پھسلا کے گویا نیچے گرا رہی تھیں۔ رگھبیر پیلس سے کوئی ایک فرلانگ ادھر ادھر موٹروں کا ایسا ہجوم تھا کہ راستہ ملنا ہی مشکل تھا۔ مجبوراً" سرمد رنے اپنے شوفر سے کہا۔ "اگر گاڑی آگے نہیں بڑھ سکتی تو ہم یہیں اتر جاتے ہیں، کیوں ڈارلنگ۔"

جواں سال لیڈی سمر رائے نے بے بسی سے اپنی سفید ساڑھی اور اس کے کامدانی کام اور نفیس بنارسی بورڈر کی طرف دیکھا۔ یہاں سے رگھبیر پیلس تک فرلانگ بھر کا فاصلہ طے کرنے میں سر سمر کے شارک اسکن کے جاکٹ پر اگر کوئی دھبہ آجائے تو کوئی خیال بھی نہ کرے گا' لیکن اس ساری پر سوئی کی نوک کے برابر بھی کوئی داغ لگ جائے۔ تو اس کی شام کرکری ہو جائے گی۔

"میں سمجھتی ہوں اترنا ہی پڑے گا۔ اس طرح تو گھنٹہ بھر سے پہلے راستہ نہیں ملے گا۔"

ڈرائیور نے بڑی مشکل سے اس قدر دروازہ کھولنے میں کامیابی حاصل کی کہ چندرا---- یہ لیڈی سمر کا نام تھا---- بمشکل اپنی ساری کو اپنے جسم سے لپٹائے اتر سکی۔ اور پھر موٹروں کی بھیڑ میں آدمیوں اور گارڈوں سے دامن بچاتی ہوئی اپنے شوہر کے ساتھ وہ رگھبیر پیلس کے پورٹیکو تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔ پورٹیکو ہی میں مسز سنگھ کھڑی تھی۔

وہ مسکرا کے ان دونوں کی طرف بڑھی۔ "شام بخیر چندرا' آپ اچھے تو ہیں سر سمر۔ آپ کو کہاں اترنا پڑا---- ایک فرلانگ---- ہاہا" اس کا موٹا جسم سر کے مصنوعی گھنگھریالے بال' نچلا چوڑا ہونٹ' اور اورنگ آبادی ہمرو کا کوٹ سب اسی ہنسی میں لہرائے۔ "چندرا ڈارلنگ وشواش نگر کے تینوں راجکمار اس میز پر ہیں۔ تینوں مہابیر' رگھبیر اور رگھوبیر۔ تینوں تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ خصوصاً رگھوبیر---- اوہ ڈارلنگ جب سے اس نے تمہاری تصویر "آون لوکر" میں دیکھی ہے۔ وہی جو ڈنکن نے کھینچی تھی۔ تب سے تمہارے متعلق بحران میں مبتلا ہے۔ قطعی طور پر بحران میں---- اور آج تم بالکل جادو کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہو۔ ساحرہ سی---- کیوں سر سمر---- ڈارلنگ مجھ پر فرض ہے کہ تمہیں ان سب سے ملاؤں۔ اس طرف سر سمر۔"

سر نوشیرواں افراسیاب سے باتیں کرتے مڑ کر سر سمر نے مسز سنگھ سے کہا۔ "ابھی ایک منٹ میں مسز سنگھ۔ آپ لوگ جائیں میں ابھی وہاں آتا ہوں۔"

سر نوشیرواں نے ایک نوجوان یوروپین عورت کو دیکھ کر سلام کیلئے سر خم کیا۔ اس کے ساتھ ایک گہرے سانولے رنگ کا ہندوستانی نوجوان تھا۔

"کون ہیں؟" سرمد رنے پوچھا۔

"مسٹر اور مسز وحید امجد" سر نوشیرواں نے اس گزرتے ہوئے جوڑے کا غائبانہ تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "یہ عورت آسٹرین ہے۔۔۔۔۔ کئی رجواڑوں میں پیانو بجانے کی تعلیم دے چکی ہے۔ اپنے شوہر کی تقدیر اس کی بنائی ہوئی ہے۔ اس کا تشہیر و اشتہار کا کاروبار ہے اور اب یہ حالت ہے کہ میرین ڈرائیو میں دو سو روپے کے فلیٹ میں رہتا ہے۔ شادی سے پہلے مجھ سے ڈیڑھ سو کی نوکری مانگنے آیا تھا۔۔۔۔ لیکن سمد ر۔ کچھ پیو گئے نہیں۔" اس نے سمد ر کا بازو پکڑ کے کہا۔ "آج دو بار ہیں۔ ایک اوپر اور ایک قطب شمالی والے کمرے میں۔ اور یہ قطب شمالی وغیرہ کمرہ دیکھنے کے قابل ہے، چلو۔"

اس برآمدے کے بعد ایک اور بڑا نیم برآمدہ سا تھا، جس میں کین میک کا ناچ آرکسٹرا ٹانگو بجا رہا تھا اور کوئی چار سو جوڑے ناچ رہے تھے۔ روشنی اور ہسپانوی موسیقی کے سیلاب میں طرح طرح کے ہندوستانی اور یورپی زنانے لباس کالے یا نیم سفید پوش مردوں کے ساتھ گھوم رہے تھے۔ گویا روشنی موسیقی کی صوتی حرکت اور انسانی جسم اور جنسوں کی کشش کی حرکت سب ایک زندگی کی مرکب حرکت میں ضم ہو رہی تھیں۔ میزوں کے درمیان سے جان پہچان والوں کو سر کے اشارے یا تبسم سے سلام کرتے یا جواب دیتے۔ کسی کسی میز پر ایک آدھ منٹ کے لئے ٹھہر کر کوئی بات کرتے ہوئے وہ بائیں طرف کے دروازے میں مڑے اور اس مشہور "قطب شمالی" والے کمرے میں پہنچے۔ جہاں ایئر کنڈیشنگ کے ذریعہ اس قدر سردی کا انتظام کیا گیا تھا کہ رقص کے سانسوں اور موسیقی سے گرم کمرے سے نکل کے یہاں داخل ہونے پر یقیناً سردی معلوم ہوتی تھی۔ کمرے کی دیواروں پر اور دیواروں کے ساتھ ساتھ اور فرش پر روئی کے گالوں اور سفید کاغذ کی کترن سے برف کی طرح کی شکلیں تھیں، برفانی پہاڑ، برفانی ٹیلے جما ہوا برف۔ برف کے جزیرے ایک طرف ایک وہیل نما صوفہ تھا۔ ایک طرف قطب شمالی کے ریچھ کی شکل کی ایک کرسی تھی۔ ایک اسکیمو خیمے کے نیچے شراب کی بوتلیں اور گلاس، طرح طرح کے مرکبات، طرح طرح کے جام تھے اور دو انگریز لڑکیاں اسکیمو کپڑے پہنے ساقی گری کر رہی تھیں۔ "جون، میرے لئے ایک گملٹ اور تم سمد ر؟"

"گملٹ" سرمد رنے اختصار سے جواب دیا۔ "شکریہ۔"

کھلے ہوئے دروازے سے سر سمد ر نے راجکماری کی میز کی طرف دیکھا۔ تین نیم ڈرا ویدی راجکمار۔ تینوں کا رنگ کالا سا' بال گھنگھریالے' تینوں ٹیل کوٹ پہنے۔ تینوں انگلستان کے پبلک اسکولوں کے پڑھے ہوئے۔ لیٹن اور ہیرو اور پھر آکسفورڈ' ساتھ ہی ایک امریکن لکھ پتی' ہندوستان میں ایک امریکی موٹر کمپنی کا جنرل ڈائریکٹر اور ہوائی فوج کا ایک انگریز گروپ کیپٹن۔ بیڑے کا ایک کوموڈور اور کئی انگریز' پارسی' مسلمان' ہندو میز پر وہسکی' سوڈے' برانڈی' جن' کاک ٹیل اور گملٹ کے گلاسوں کی شفاف چمک اور اس ہجوم میں کوموڈور کی سفید وردی کو اس نے اٹھتے دیکھا۔ میز کے دوسرے کنارے سے اس کی اپنی بیوی چندرا ہنستی ہوئی اٹھی پھر وہ رقص کرنے والوں کے ہجوم میں رقص کے سیلاب میں غائب ہو گئے۔ اور سر سمد ر نے اپنا گملٹ ختم کیا۔ محسوس کیا کہ اس کے ادھیڑ اعصاب کو اس سے زیادہ تیز چیز کی ضرورت ہے۔ جون کی طرف مسکرا کر اس نے کہا۔ "مس بریڈلے---- ڈبل جن پلیز۔" جون نے پیسے لے کے ڈبل جن کا گلاس اسے اور وہسکی سوڈا کا گلاس سر نوشیرواں کو دیا۔ قطب شمالی والے کمرے میں اس سے چند قدم کے فاصلے پر وہیل نما صوفے پر مہاراجہ وشواش نگر شارک اسکن کا جیکٹ پہنے' بڑے انداز سے کاک ٹیل کا گلاس گھما گھما کر خورشید مقدس جی سے باتیں کر رہے تھے---- بوہرہ تاجر جو اپنے سسر کے سٹے کے روپیہ کی وجہ سے اب لکھ پتی بن گیا تھا۔ خان بہادر بن ہی چکا تھا۔ اور ابھی سے راجوں اور مہاراجوں سے اس طرح کندھے سے کندھا بھڑا کے ملنے کی کوشش کرتا تھا گویا وہ اس کے ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں۔ ریس کورس پر پانی کی طرح روپیہ خرچ کرتا۔ اس کا اپنا اصطبل مہاراجہ مانڈو کے اصطبل سے کچھ کم نہیں تھا۔ اور اس کا گھوڑا ذوالفقار دو سال سے برابر عرب ڈاربی جیت رہا تھا۔

سر نوشیرواں نے رازدارانہ انداز میں سر سمد ر سے کہا۔ "اس نودولتیے کو دیکھو----"

"ہوں۔"

کھلے ہوئے دروازے سے پھر بوڑھے کوموڈور کی آغوش میں ادھیڑ سر سمد ر نے اپنی جوان بیوی کا جیتا جاگتا مسکراتا جسم دیکھا۔۔ موسیقی ختم ہوئی' دوبارہ شروع ہوئی۔ اب راجکمار رگھوبیر کے ساتھ اس کی بیوی ناچنے کو اٹھی۔ ٹم تم تن تن۔ من۔ من۔ ایک۔

-دو تین- چار- ایک- دو- تین- چار "قطب شمالی والے کمرے کے مصنوعی برفانی فرش پر سرسمدر کے پاؤں وقت کا اندازہ کرنے لگے- بینڈ نے ایک جھرجھری لی، ہنسی، قہقہوں، ہم آغوش جسموں کی گفتگو کی رفتار، جن کے گلاس میں سما گئی- ایک انگریز لڑکی آلہ مکبرالصوت کے پاس کھڑی ہو کے ہسپانوی انداز میں، انگریزی لہجے کے ساتھ ایک فرانسیسی "پونما" گانے لگی- "رافائے لی جو-" اور "جو" کا او معلوم ہوتا تھا قیامت کی خبر لائے گا-

رگھوبیر کے جسم سے لپٹی ہوئی، آنکھوں سے آنکھیں بندھی ہوئیں، لیکن ٹانگیں---- محرک اور جسم کے سارے پہچان سے بے پروا اور بے تعلق ٹانگیں---- مشین کی طرح، کوچ کرتی ہوئی فوجوں کی طرح، موسیقی کی پابندی کرتی ہوئی ٹانگیں الجھے بغیر ذرا سی بھی غلطی کئے بغیر برابر رقص کر رہی تھیں- سرسمدر نے جلدی سے جن کا گلاس ختم کیا- مسکرا کے جون کا شکریہ ادا کیا- اور سرنوشیرواں سے پوچھا- "اوپر بھی ناچ ہو رہا ہے-"

"ہاں مگر وہاں ذرا دوسرے درجے کے لوگ ہیں-"

"تو بہت ہی دلچسپ ہو گا-" سرسمدر نے کہا- اور اس نے محسوس کیا کہ اگر وہ یہیں نیچے کے رقص کے کمرے میں ناچے گا- تو اس کی بیوی کی آزادی میں خلل پڑے گا اور وہ پورا لطف نہ اٹھا سکے گی-

"وہ سرنوشیرواں افراسیاب کو وہیں چھوڑ کے اپنی سیاہ پتلون کی جیب میں ایک ہاتھ ڈالے مسکراتا ہوا باہر نکلا- اس کی بیوی چندرا رگھوبیر کے جسم سے ذرا انچ بھر دور ہٹ کے اس کی طرف دیکھ کے مسکرائی- اس نے بھی مسکرا کے اس کی مسکراہٹ کا جواب دیا- پھر باہر کے برآمدے کی بھیڑ سے ہوتا ہوا چوڑے چوبی زینے پر سیٹی بجاتا ہوا چڑھنے لگا-

"دوسرے درجے" کے کچھ لوگ نیچے اتر رہے تھے- اس "دوسرے درجے میں مہاراجاؤں، اعلیٰ ترین حکام اور لکھ پتی کارخانوں کے مالکوں کے سوا سب ہی شامل تھے- جونیئر آئی- سی- ایس، چھوٹے کارخانوں کے مالک، بڑے تاجر، فلم کمپنیوں کے ڈائریکٹر اور ہندوستانی پردہ سیمیں کے درخشاں ستارے، مہاراجاؤں کے کنٹرولر اور اے- ڈی-

سی۔ میجر اور ان سے کم درجے کے فوجی افسر۔

اوپر کا ناچ ہال بہت بڑا تھا اور کوئی ایک ہزار کے قریب لوگ اس کے بے شمار ستونوں کے درمیان ناچ رہے تھے۔ چاروں طرف برآمدوں میں میزیں کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں اور سرمدر واپس جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ مہاراجہ مانسرور کے ایک اے ڈی سی نے سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے اسے دیکھ لیا۔ "ہلو سرمدر۔"

"اوہ، گڈ ایوننگ۔" سرمدر نے جواب دیا۔ وہ اکثر مہاراجہ مان سرور کی پارٹیوں میں بلایا جا چکا تھا۔ "یہاں اوپر تو تل رکھنے کی جگہ نہیں ہے۔"

"سرمدر اگر آپ جگہ تلاش کر رہے ہیں تو ہماری میز پر چلئے۔"

"ضرور شکریہ۔"

اس اے ڈی سی کا نام آفریدی تھا۔ میز پر بمبئی کے ایک مشہور تاجر کا بیٹا اکرام بھائی۔ دو لڑکیوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ آفریدی نے سرمدر کا اس سے اور دونوں لڑکیوں سے تعارف کرایا۔ ایک لڑکی کا نام اس نے چھایا دیوی بتایا۔ یہ اینگلو انڈین تھی، لیکن بڑی ہی فیشن ایبل ساڑھی پہنے۔ ایک زمانے میں فلمستان کی مشہور پری رہ چکی تھی۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب ہندوستانی فلموں کی پریاں بالعموم اینگلو انڈین ہی ہوتی تھیں، اور بولتے فلم کا شمار نوادرات میں ہوتا تھا۔ پھر ان ستاروں پر زوال آیا۔ بہت کم باقی رہیں۔ زیادہ تر ادھر ادھر نکل گئیں۔ چھایا نے بھی اودھ کے ایک تعلقدار صاحب سے شادی کی۔ وہ پی کے اسے خوب ٹھوکتا تھا۔ تین چار سال بعد یہ طلاق لے کے اٹھ کھڑی ہوئی اور اب "غیر وابستگی" کے عالم میں بمبئی میں مقیم تھی۔ دوسری لڑکی شیریں پارسی تھی۔ موٹی، بھدی، پست قد اور بے ہنگم چہرے پر چوتھائی انچ غازے کی تہ جمی تھی۔ بالائی لب کے روئیں جو اس غازے کے بغیر شاید اچھی خاصی مونچھیں معلوم ہوتے، اب بھی غازے کی اس دبیز تہہ سے بغاوت پر آمادہ تھے۔

آفریدی نے سب کے لئے وہسکی اور سوڈا منگوایا۔ سرمدر نے چھایا سے ناچنے کی فرمائش کی۔ یہ وی آنا کا والٹس تھا۔ ہلکا، شیریں، تیز۔ اس نے اپنے سینے کے مقابل چھایا کا نوجوان جسم محسوس کیا۔ بھرے بھرے بازو اور شانے۔ سینے ابھی تک سخت۔ بال رنگے ہوئے مگر گھنے، اور گردن اور شانوں اور پشت کو حسین سے حسین تر بناتے ہوئے، جسم

گداز اور گٹھا ہوا ہونٹ سرخ' آنکھیں چمکتی ہوئی اور بناتی ہوئی۔

"آپ بہت اچھا ناچتے ہیں ،گر سمدر۔" چھایا ۔نے اس سے کہا اور اس کے دانتوں اور اس کی پلکوں نے مل کے جال پھینکا۔

"نہیں مجھے تو ناچنا کچھ یوں ہی سا آتا ہے۔ لیکن آپ بہت اچھا ناچتی ہیں۔ جیسے کوئی پری ناچے۔" اس کلمہ تحسین پر وہ ہنسی' اس کا پورا جسم ہلا اور ہلتے ہی سینوں سے لے کر رانوں تک اس کے چٹے ہوئے گداز جسم کے تمام عضلات میں ہنسی اور گدگداہٹ کی سی جنبش ہوئی۔ اس جنبش نے سر سمدر کے ادھیڑ جسم سے ٹکر کھائی۔

"آپ بہت خوبصورت ہیں۔ غیر معمولی۔۔۔۔ جیسے گریٹا گاربو۔"

"اوہو" اس نے کلے پھلا کے اور پھر ہنس کے کہا۔ "یہ تو تعریف نہیں ہوئی سر سمدر۔ گریٹا گاربو تو ہرگز خوبصورت نہیں۔"

"پھر آپ کسے خوبصورت سمجھتی ہیں؟"

"جون کرافرڈ۔ میرے خیال میں جون کرافرڈ بہت خوبصورت ہے۔"

"چھایا دیوی آپ اس سے کہیں خوبصورت ہیں۔ آپ میں بڑی کشش' بڑی غیر معمولی دلفریبی ہے۔ بالکل کسی راجکماری کی سی۔"

وہ پھر ہنسی' پھر جسم کی ایک ایک رگ' ایک ایک عضو ہنسا' پھر اس کی بوٹی بوٹی نے سر سمدر کو چھیڑا۔ "دیکھئے سر سمدر آپ نے پھر غلطی کی۔ راجکماریوں سے زیادہ تو ان کی ساریاں خوبصورت ہوتی ہیں۔"

"آپ کا ذہن ایسا ہی تیز ہے جتنی آپ کی صورت دلکش ہے۔۔۔۔ چھایا دیوی آپ نے فلم کی زندگی ناحق چھوڑی۔ مجھے یقین ہے اب بھی آپ واپس جائیں تو بمبئی میں تو کوئی اور ایکٹرس آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔"

"وہ دن گزر چکے" چھایا نے کہا۔ "اب اس مارکیٹ میں میری ساکھ نہیں رہی۔ ہاں اگر مجھے کسی بڑے آدمی کی مدد مل سکے تو شاید۔۔۔۔" اور اس کی بھوری آنکھوں نے سر سمدر کی آنکھوں کو چھیدنے کی پوری کوشش کی' اس کا جسم رقص کے آخری گھماؤ میں سر سمدر کے جسم سے اس قدر قریب آگیا کہ اس قربت کی تیزی نے وی آنا کے والٹس کے آخری گھماؤ کو دس درجہ اور زیادہ تیز کر دیا۔

میز کی طرف واپس آتے ہوئے اس نے کہا۔ "شکریہ چھایا دیوی ـــــ اس مسئلے کے متعلق پھر تفصیل سے بات چیت کریں گے۔ آپ دو ایک روز میں مجھ سے آفس میں ملیں ـــــ مجھ سے جو ہو سکے گا ـــــ بمبئی کی تمام فلم ایکٹرسوں میں آپ ـــــ"

شیریں اکرام بھائی کی گود میں بیٹھی تھی۔ سر سمدر نے ویٹر سے اور وہسکی اور سوڈا اور خواتین کے لئے کاک ٹیل لانے کو کہا۔ آفریدی نیچے مہاراجہ کے پاس گیا تھا۔

شیریں نے اکرام بھائی کے کالر کو چھیڑتے ہوئے پوچھا۔ "اس سیاہ پردے کے پیچھے کیا ہے۔" اور اس نے دور ایک پردے کی طرف اشارہ کیا۔

سر سمدر نے جواب دیا۔ "بڑا خراب بھیڑیا۔"

"اوہ" شیریں نے مصنوعی طور پر سہم کے کہا۔

آفریدی آگیا۔ اور دوسرا ناچ لیمبتھ واک شروع ہوا۔ آفریدی نے چھایا اور اکرام بھائی نے شیریں کو سنبھالا۔ دونوں لڑکیوں نے سر سمدر سے معافی مانگی۔ اس نے بھی اجازت چاہی وہ خود متوسط طبقے کی اس صحبت سے سیر ہو چکا تھا۔ چوڑے چوبی زینے اتر کے پھر اس نے نیچے کی رقص گاہ کا قصد کیا راستے میں کوموڈور نشے میں دھت بحری فوج کے ایک اور افسر سے کاک ٹیل کا گلاس ہاتھ میں لئے کہہ رہا تھا۔ "میرے خیال میں لیڈی سمدر بہت آسانی ہے ـــــ"

سر سمدر کو دیکھ کر اس کے ساتھی افسر نے کہا۔ "شش شش ش۔"

نشے میں جھوم کر کوموڈور نے کہا۔ "شش ش ش۔" اور دونوں دوسری طرف مڑ گئے۔ رقص گاہ کے ایک ستون کے قریب اس کی بیوی رگھوبیر سے باتیں کر رہی تھی۔ لیکن اس کی آنکھیں ایک نوجوان افسر کے چہرے پر جمی تھیں جو دور کھڑا ہوا اسی انگریز لڑکی سے باتیں کر رہا تھا جس نے کچھ دیر پہلے مائیکروفون پر فرانسیسی گیت گائے تھے۔ ایک ہندوستانی فوجی افسر چیکوسلاویکیہ کے سفارت خانے کے ایک افسر سے کہہ رہا تھا۔ "یہ ٹیکسی ناچنے والی (وہ لڑکیاں جو دس روپیہ چندہ داخل کرنے پر آپ کے ساتھ ایک ناچ ناچتی ہیں) ـــــ یہ جو ادھر سیدھے ہاتھ کی طرف کھڑی ہے۔ مس اسکرین۔ ڈورا اسکرین ذرا اس کا جسم تو دیکھئے۔ مکمل ـــــ اگر یہ تیار ہو جائے تو میں آج اس سے شادی کر لوں ـــــ" سر سمدر نے اس لڑکی کی طرف دیکھا۔ اونچا قد دبیز جسم، سینے خوب

ابھرے ہوئے' اینگلو انڈین۔ وہ مسکرایا اس نے اپنی بیوی کی طرف نگاہ ڈالی۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ لیمبتھ واک۔۔۔۔ ناچنے والوں کے ہجوم میں اس نے اپنی بیوی کو دیکھا۔ ایک جھٹکے میں وہ رگھوبیر کے جسم پر آگری' دونوں ہنسے' اور چمٹ گئے اور پھر ناچنے لگے۔

"تیتری میرے ہاتھوں کی بنائی ہوئی ہے۔" وہ تلخی سے مسکرایا اور قطب شمالی والے کمرے کی طرف چلا۔ بوڑھا سر نوشیرواں افراسیاب اب بھی وہیں تھا۔ اور وہسکی پر وہسکی چڑھائے جا رہا تھا۔ "ہیلو سمر! خوب لطف اٹھا رہے ہو؟"

ناچ ختم ہوا مائیکرو فون پر کسی نے اعلان سنایا۔ "ہسپانیہ کے مظلوم پناہ گیروں کی امداد کے لئے لندن کے لارڈ میئر نے جو چندہ جمع کرنا شروع کیا ہے۔ اس سلسلے میں ہم بمبئی سے بھی حتی الامکان مدد کر رہے ہیں۔ سب سے زیادہ مجھے ان رضا کار خواتین کا شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے آج کے شو اور ناچ کو کامیاب بنانے کے لئے خاص طور پر محنت کی ہے۔ ان میں سب سے زیادہ تعریف کی مستحق مس ڈورا اسکرین ہیں۔ مس ڈورا اسکرین بار سلونا کی فتح کے وقت اسپین میں موجود تھیں۔ انہوں نے وہاں کے حالات اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں اس شولری کے جذبے کے تحت جو نوجوانی اور انسان پرستی ہی کا حصہ ہے مس ڈورا اسکرین کے ایک پیار کا نیلام ہو گا۔۔۔۔" یہ کہہ کے وہ ہنسا۔ مجمع نے زور و شور سے تالیاں بجائیں۔ ہال میں مرد عورت سب ساتھ ساتھ کھچا کھچ بھر گئے۔ جو پیچھے تھے وہ اسٹولوں پر کھڑے ہو گئے۔ مس اسکرین ڈورا۔ سینے خوب ابھرے ہوئے' دبیز جسم' اونچا قد' ذرا اس کا جسم تو دیکھئے' مکمل' آرکسٹرا کے تخت پر مسکراتی کھڑی تھی' تبسم اور آنکھیں دونوں میں چمک تھی اور شاید شرم کی بھی ذرا سی جھلک ہو۔ پھر پیار کا نیلام ہوا۔ پچاس سے شروع۔ سو ہوا تو کپتانوں نے بولی بند کر دی۔ ہزار تک بڑے تاجر کارخانوں کے مالک بولیاں بولتے رہے۔ اس کے بعد صرف کروڑ پتی اور مہاراجے باقی رہ گئے اور بالآخر مہاراج وشواش نگر نے چار ہزار چھ سو روپیہ میں مس ڈورا کا ایک بوسہ خریدا۔ وہ مونچھوں پر تاؤ دیتے آگے بڑھے اور بڑھائے گئے۔ ان کی گھنی خضاب لگی ہوئی مونچھوں نے ڈورا اسکرین کے لبوں کو ایک سیکنڈ کے دسویں حصے کے لئے چھوا۔ اور پھر حسینہ نے ہنس کے اپنا منہ ہٹا لیا۔ مہاراجہ کے تینوں بیٹے مہابیر' رگھبیر اور رگھوبیر مجمع کے پیچھے آپس میں کچھ کہہ کے ہنسے اور ٹہلنے لگے۔

اور سمدر سوچنے لگا۔ "کیوں؟ نیلام کیوں؟ کیا مہاراجہ یوں چار ہزار چھ سو روپے نہیں دے سکتے تھے۔ یا نیلام ہی ہونا تھا تو کسی اور چیز کا کیوں نہیں ہوا۔ پکاسو کی کسی تصویر کا نیلام ہو سکتا تھا۔ جو جمہوریت پسندوں کی طرف سے لڑ رہا ہے۔ یا کسی اور تصویر کا' کسی بلا کا نیلام ہو سکتا تھا۔ ایک عورت کے بوسے کا انعام کیوں؟ کیا وہ بھی تجارت کا مال ہے؟"

تجارت کے مال کا خیال آتے ہی سمدر کو اپنی بیوی چندرا کا خیال آیا۔ اپنی بنائی ہوئی تیتری کا۔ یہ پر پرزے اسی نے تو نکالے تھے۔ پروں کی جگہ ریشمی ساڑیاں سینکڑوں کی' ہزاروں کی ساڑیاں۔ پر نکل چکنے کے بعد اڑنے سے کون روک سکتا ہے۔ ادھر ادھر اس نے اپنی بیوی کو ڈھونڈھا۔ قطب شمالی والے کمرہ کے دروازے پر سگریٹ کے دھوئیں میں اس کا چہرہ چھپا ہوا تھا۔

آہستہ سے چندرا کے پاس جا کے اس نے کہا۔ "ڈارلنگ اب گھر چلو گی۔" چندرا مسکرانے لگی۔ چھایا کی طرح اس کے دانتوں اور پلکوں نے مل کے جال بچھایا۔ "اب تو کہیں جا کے پارٹی پر لطف ہو رہی ہے۔ اور آپ ابھی سے چلنے کو کہتے ہیں۔"

"تو پھر ڈارلنگ مجھے اجازت دو۔ صبح سویرے مجھے بورڈ آف ڈائریکٹرز کی ایک مجلس میں جانا ہے اور بھی بہت سے کام ہیں۔ راجکمار رگھبیر سے کہنا وہ تمہیں گھر چھوڑ دیں۔"

آخری جملے کے طنز پر چندرا کے لبوں نے ذرا پیچ و تاب کھایا۔ مگر فوراً ہی سنبھل کے وہ مسکرانے لگی۔ اور اس کے ماتھے کی بندی کھل سی گئی۔ "شکریہ۔ ڈارلنگ" اس نے اپنے شوہر سے کہا۔

ناچ تو شاید دو ڈھائی بجے ختم ہو گیا ہو گا مگر صبح کے پانچ بجے کے قریب وہ گھر آئی۔ رگھبیر ہی کی موٹر میں۔ گاڑی سے اترنے کے بعد رگھبیر نے چندرا کے ہاتھ کو ایک طویل بوسہ دیا۔ پھر سمدر کھڑکی سے ہٹ آیا۔ اور سوتا بن کر مسہری پر لیٹ رہا۔ چندرا دبے پاؤں آئی ـــــ اس کی مسہری کے قریب۔ ایک لمحہ تک وہ سوچتی رہی کہ اپنے سوتے ہوئے شوہر کو پیار کرے یا نہیں؟ پھر اس کے چہرے پر تلخی کی سیاہی اور اس کے ہونٹوں پر ایک طنز آمیز کجی پیدا ہوئی۔ اور وہ ساری کو فرش پر پھینک' اپنی مسہری پر لیٹ رہی۔

سات بجے سر سمدر اٹھے۔ ان کی تیتری مسہری پر غافل پڑی سو رہی تھی۔ اس کے

پر توڑنا کس قدر آسان تھا؟ چاندی ہی کے تو تھے۔ چاندی کا دروازہ بند کر دو۔ تیتری اور اس کے پر دونوں غائب۔ اور تیتری پھر کملا کیڑا بن جائے گی۔ ایک طلاق کے بعد دوسرا ملنے میں اتنی آسانی نہ ہو گی۔ مگر انہیں چندرا پر بڑا ترس آیا۔ ان کی بیوی مگر سن میں ان کی بیٹی کے برابر۔ اور وہ سوچنے لگے کہ ان کی بیٹی ہوتی تو کیا وہ اس کے پر نوچتے۔ کیا وہ اسے روتا دیکھ سکتے۔ اپنے وکیل کے پاس جانے کا ارادہ انہوں نے ملتوی کر دیا۔

کپڑے بدلتے ہوئے وہ سوچنے لگے۔ ہم سب میں زیادہ فیاض کون ہے ---- میں؟ جو مالک ہوں اور اپنی ملکیت پر جبر نہیں کرتا؟ یا ڈورا جس نے اپنا پیار بیچا؟ یا میری چندرا جس نے اپنے ریشمی آرام و آسائش کے لئے اپنے والدین کو اپنا جسم میرے ہاتھوں بیچ لینے دیا۔ وہ ہنسا۔ سماج کے اس کھنکھتے ہوئے راج میں کون فیاض ہے؟ کون فیاض رہ سکتا ہے؟ یہاں تو ہر طرف لین دین ہی لین دین ہے۔ یہاں شکر و شکایت اور گلہ شکوہ کیا؟"

(5)

رات کے ساڑھے سات بجے کے قریب صغیر اپنے چھوٹے سے فلیٹ کو واپس آیا۔ ماہم میں مچھلیوں کی بو یہاں تک آتی تھی۔ مگر شہر میں فلیٹ مہنگے تھے۔ دروازہ مقفل تھا، جس کے معنی یہ تھے کہ ناہید جہاں اس کی بیوی ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ ابھی تک نہیں آئی تو کھانا کب پکے گا۔ قریب کے ایرانی ہوٹل کے کھانے کا نام سن کر اسے ابکائیاں آتی تھیں۔

ہندوستان میں اشتراکی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ پہلی قسم میں وہ لوگ ہیں جن میں سے صرف چند کو "قلب او کافر، دماغش مومن است" کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس پہلی قسم کے زیادہ تر اشتراکی گورنمنٹ آف انڈیا یا صوبجاتی سرکاروں میں اچھے اچھے عہدوں پر فائز ہیں۔ ملک کے بہت سے ادیب، بہت سے شاعر، بہت سے اخبار نویس اسی قسم میں گنے جا سکتے ہیں۔ اگر وجہ جواز کی کمی تھی تو جون ۱۹۴۱ء سے وجہ جواز بھی مل گئی۔ اور اب یہ ممکن ہو گیا کہ کوئی مالا بار ہل بمبئی یا جوبلی ہل حیدر آباد یا مال لاہور یا کنگ ایڈورڈ روڈ نئی

دہلی میں قیام کرے اور اشتراکی ہونے کا دعویٰ کرے۔ ان میں سے ممکن ہے۔ بعض ایسے ہوں۔ جنہیں اشتمالی تحریک سے تھوڑی بہت ذہنی ہمدردی ہو۔ مگر ایسا شاید ہی کوئی ہو جو وقت آنے پر اپنے ان ایبل پتے تک سے دست بردار ہونے کو تیار ہو۔ دوسری قسم کے اشترا . ، ہیں جو برسوں جیل بھگت چکے ہیں۔ مزدوروں کے ساتھ رہ کے انہی کی خوراک کھا چکے ہیں۔ بیماریوں میں ایک خوراک دوا کے لئے ترس چکے ہیں۔ ایسے اشتراکیوں میں سے بہت سوں نے کبھی سرکاری یا کسی اور آرام دہ ملازمت کی کوشش نہیں کی۔ جب موقع آیا تو اس سے انکار کیا اور ۲۲ جون ۱۹۴۱ء کو اپنے لئے آرام طلبی یا جاہ طلبی کا بہانہ نہیں بنایا۔

صغیر اور اس کی بیوی ناہید جہاں دونوں کا شمار اس دوسرے قسم کے اشتراکیوں میں تھا۔ وہ اگرچہ یو پی کا رہنے والا تھا۔ لیکن عرصے سے بمبئی میں سوت کے کارخانے کے مزدوروں کی تنظیم کرتا رہا تھا۔ اس کی قابلیت اور اس کی خوبی تحریر کو دیکھ کر اب دو تین سال ہوئے ایک مقامی قومی اخبار میں اسے ڈیڑھ سو روپیہ کی جگہ دی گئی تھی۔ جنگ کے زمانے میں، اور وہ بھی بمبئی کی زندگی کے لئے ڈیڑھ سو روپیہ کیا ہوتے ہیں۔ لیکن اب وہ تنہائی اور ٹھوکروں کی زندگی سے تھک گیا تھا ---- بے زار نہیں ہوا تھا۔ وقت پڑے تو وہ اب بھی ایک ادنیٰ سپاہی کی طرح اپنی خدمات پیش کرنے کو تیار تھا ---- لیکن دو سال کی جیل، خراب غذا، دن رات بیمار۔ مزدوروں کی قربت کی وجہ سے وہ تھک ضرور گیا تھا۔ اس نوکری نے اسے دم لینے کی ذرا سی مہلت دی۔ اور قدرت نے اسے ایک رفیق بھی عنایت کیا۔ یہ رفیق یا رفیقہ حیات اس کی بیوی ناہید جہاں تھی۔ اس نے ایک متوسط طبقے کے بورژوا خاندان سے بغاوت کی تھی۔ تعلیم مکمل کئے بغیر چل کھڑی ہوئی تھی۔ آل انڈیا نرسس ایسوسی ایشن کی سرپرستی میں اس نے نرسنگ کی تربیت البتہ حاصل کر لی تھی اور اس کے سوا اسے لکھنے کا سلیقہ تھا۔ اردو افسانے اچھے خاصے لکھ لیتی تھی اور رسالوں سے کچھ نہ کچھ معاوضہ مل جاتا۔ افسانوں کے دو تین مجموعے بھی چھپ چکے تھے۔ جن سے یکمشت آمدنی ہو جاتی۔

صغیر سے ناہید جہاں کی ملاقات دہلی میں نئے ادیبوں کے ایک جلسے میں ہوئی۔ ناہید کا پہلا عاشق اس سے الگ ہو چکا تھا اور اس کی یادگار اس کا پہلا بچہ اس زندگی سے۔ اب

وہ تیس سال کی تھی، لیکن اب بھی اس کے کندنی جسم پر زردی اور جھریاں کہیں پھٹکنے نہ پائی تھیں۔ ہندوستانی لڑکیوں کے چہروں کی بے رونقی کے دو اسباب ہوا کرتے ہیں۔ پہلے تو اس بے رونقی کا باعث تازہ اور صاف ہوا کی کمی تھی۔ بڑی حد تک یہ سبب اب بھی باقی ہے۔ لیکن ایک تھوڑی سی تعداد ایسی لڑکیوں کی بھی ہے---- خصوصاً" بڑے شہروں میں---- جن کے نزدیک تازہ اور صاف ہوا کے استعمال کی واحد شکل یہ ہے کہ ان کا چہرہ طرح طرح کے غازوں، لوشنوں، کریموں سے تھوپا اور رنگا جائے۔ تاکہ جب وہ ہوا کھانے نکلیں تو دائیں بائیں دونوں طرف چاہنے والوں کے جنازے نکل جائیں۔ جس پارٹی میں وہ جائیں وہاں آدھے نوجوان تو دیکھتے ہی بے ہوش ہو جائیں۔ اور باقی آدھے جو بے ہوش نہ ہوں وہ سجدے میں گر پڑیں۔ ناہید نے پہلے سبب سے بغاوت کی تھی اور دوسرے سے احتیاط برتی تھی۔

صغیر کے چہرے پر البتہ زردی تھی۔ تھکن کی، زخمی سپاہی کے رخساروں کی زردی۔ زردی جو اس کے دبلے رخساروں سے ہو کر اس کی مونچھوں تک چلی گئی تھی۔ اس دبلے لانبے چہرے پر مونچھیں کتنی دلچسپ معلوم ہوتی تھیں۔ دلچسپ لیکن مضحکہ خیز نہیں۔ کیونکہ صغیر کی آنکھیں اگرچہ اندر دھنس گئی تھیں۔ ان میں اب بھی کشش تھی۔ اب بھی ایک طرح کی جاذبیت تھی۔ اس کے دبلے لانبے چہرے کے خدوخال میں اب بھی تناسب تھا۔ اس کا سینہ بھی اندر کو دھنس رہا تھا مگر ناہید جانتی تھی اس کا علاج کتنا آسان ہے۔ حیاتین الف اور د اور سینہ کی مچھلیاں پھر ابھر آئیں گی۔ اسے خود اپنی تیس سال کی عمر کا احساس تھا۔ اسے بھی رفاقت کی ضرورت تھی۔ اور چند ملاقاتوں کے بعد، چند روز ساتھ پھرنے کے بعد اس نے صغیر کے لئے ایک طرح کی محبت محسوس کی۔ ایسی محبت جو والہانہ عشق کے مقابل انس سے زیادہ قریب تھی۔ ہمدردی، انس، رفاقت، انسانیت کی محبت---- اور اس طرح دونوں کی شادی ہو گئی۔ ناہید اپنے میاں کے ساتھ بمبئی گئی۔ جہاں اسے ایک ہسپتال میں میٹرن کی جگہ مل گئی۔ اور اس نے آہستہ آہستہ نرسوں کی تنظیم شروع کی۔ اس روز صغیر نے اپنی کھادی کی شیروانی اتاری۔ کھادی کے کرتے اور پاجامے کو اس نے بڑے چوکور آئینے میں دیکھا۔ جس میں ناہید، جو لبوں پر سرخی نہیں لگاتی تھی، اپنے گداز، بھرے ہوئے جسم، چوڑے صحت مند سینے اور اس پر سادہ یونیفارم

کی بہار دیکھ لیا کرتی تھی۔ خصوصیت سے وہ اپنے بالوں کا تماشا دیکھتی جو اس کے گھٹنوں تک پہنچتے تھے۔ اور صغیر کو ان بالوں سے عشق تھا۔ آئینے میں اپنے کھدر کے لباس کو دیکھ کر صغیر کو ذرا سی کوفت ہوئی۔ چند متناسب جسموں پر تو بے شک کھدر اچھے سے اچھے کپڑے سے زیادہ کھلتا ہے۔ ورنہ عموماً" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کسی پتلے تکئے اور کسی گاؤ تکیہ پر کسی نے موٹا جھوٹا غلاف چڑھا دیا ہو۔

اس کے لکھنے کی میز پر ایک چٹھی تھی۔ "میں مقبول کے ساتھ سینما دیکھنے جا رہی ہوں۔ ممکن ہے مجھے واپسی میں دیر ہو۔ نعمت خانے میں کچھ سینڈوچ بسکٹ رکھے ہیں۔ ناہید۔"

صغیر اس چٹھی کو پڑھ کے سکتے کے عالم میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اس کا دماغ اچھی طرح سمجھ نہیں سکا۔ اس کی متاہل زندگی میں یہ پہلی بار تھی کہ اس کی بیوی' اس کے کسی دوست کے ساتھ سینما دیکھنے گئی تھی۔ اور شاید تنہا۔ کم از کم مقبول دادر میں سیوا جی پارک کے قریب تنہا رہتا تھا۔ صغیر اپنے آپ سے حجت کرنے لگا۔ مجھے یہ فرض کرلینے کا کیا حق ہے کہ وہ مقبول کے ساتھ تنہا سینما گئی ہے۔ ممکن ہے اور بھی کئی لوگ ہوں۔

وہ اپنے میز پر بیٹھ کے کام کرنے لگا۔ آج کل وہ اس مبحث پر تحقیق کر رہا تھا کہ کیا مارکسیت مذہب کی غیر معاشی قدروں کو برداشت کر سکتی ہے۔ یہ شبہ اس کے دل میں عرصے سے کھٹک رہا تھا کہ مارکس معاشیین کا امام فلسفیانہ اسلحہ سے اچھی طرح مسلح نہیں تھا۔ مابعد الطبیعات پر اچھی طرح حاوی ہوئے بغیر فلسفے اور مذہب کو انہی کے ہتھیاروں سے شکست دیئے بغیر مادیت ارتقا بالضد کوئی باقاعدہ فلسفیانہ نظام نہیں بن سکتی۔ وہ عملی نظام بن جائے لیکن فلسفیانہ نظام نہیں بن سکتی۔ مارکس کے بہت سے عقیدت مندوں نے اس قسم کا شک محسوس کیا تھا۔ مثلاً بازارف' بوگدانوف' لوناچارسکی' ہل فونڈ' برمن' یوش کے وچ اور سودروف۔ انہی کے جواب میں لینن نے مادیت اور تجربی تنقید لکھی تھی۔ لیکن لینن کے دلائل سے صغیر کی تشفی نہیں ہو سکی تھی۔

وہ کام کرنے لگا۔ ساڑھے نو بجے۔ دس بجے۔ لیکن ناہید نہیں آئی۔ اب تک اسے آجانا چاہئے تھا۔ سینما زیادہ سے زیادہ ساڑھے آٹھ بجے ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ وہ لوگ فورٹ کے کسی سینما کو گئے ہوں۔ ممکن ہے بس ملنے میں دیر ہوئی ہو۔ اس

نے نعمت خانے سے سینڈوچ نکال کے کھائے۔ کام کرنا چاہا۔ مگر ناہید کی ہنستی ہوئی صورت' اس کے بھرے بھرے بارونق گال اور سفید دانت' اس کے چوڑے شانے' اس کے جسم کی گرمی برابر حائل ہو کے اوراق کو دھندلا کر دیتے۔ سطروں کا مطلب خبط کر دیتے۔ دماغ کی منطقی راہ میں طرح طرح کے روڑے اٹکاتے۔ استدلال کے سامنے یکلخت اعصابی' جذباتی خندقیں پیدا کر دیتے۔ ایک خلا پیدا ہو جاتا اور دل میں ایک طرح کا وہم سا ہونے لگتا۔

پھر گیارہ بجے دادر کی طرف سے اور فورٹ سے معلوم نہیں کتنی بسیں آئیں اور سامنے کی سڑک سے شور مچاتی گزر گئیں۔ اس نے لینن کی کتاب اور اپنی نوٹ بک دونوں کو بند کیا اور ٹہلنے لگا۔ اب پہلی مرتبہ ایک عجیب طرح کا جذبہ سا ابھرنے لگا۔ ایسا جذبہ جو اگر تکمیل کو پہنچے تو صدمہ کہلائے۔ لیکن اس ابتدائی درجے میں اس کے لئے کوئی نام نہیں تھا۔ اس جذبے کے ساتھ ساتھ' اس کے متوازی ایک اور جذبہ تھا' خلجان کا سا۔ اس کا نام متعین تھا۔ شک۔

اس نے سگریٹ سلگایا اور ٹہلنے لگا۔ سوچنے لگا کہ مجھے شک اور کسی قسم کے صدمے کا حق ہی کیا ہے۔ ناہید یا اس کا جسم میری ملکیت تو ہے نہیں۔ کیا اس مہاجنی تمدن سے پہلے بربریت کے سنہری دور میں تمام عورتیں تمام مردوں اور تمام مرد تمام عورتوں کی ملکیت نہیں ہوتے تھے۔ ممکن ہے یہی قانون فطرت ہو۔ ممکن ہے "جوڑے دار" شادیاں قانون فطرت کی خلاف ورزی ہوں۔ تمدن کی صبح کاذب کے ساتھ ساتھ تو یہ شادیاں وجود میں آئی ہیں۔ پہلے مائیں بہنیں حرام ہوئیں' پھر قبیلے کی عورتیں حرام ہوئیں۔ پھر ایک مرد اور ایک عورت کی جوڑے دار شادیاں ہونے لگیں۔

اور وہ سوچتا رہا۔ قانون فطرت؟ لیکن انسان کا کام تو فطرت کے قانون کی پابندی نہیں' اسکی تسخیر ہے۔ ہل اور ٹریکٹر' دوربینیں اور خوردبینیں سب قانون فطرت توڑنے کے لئے ہیں۔ زمین اور زندگی اور ستاروں پر انسان کے حکم چلانے کے لئے ہیں۔

ناہید۔ ناہید۔ ناہید ابھی تک نہیں آئی اور مقبول یقیناً خوبصورت ہے۔ چھ فیٹ دس انچ قد۔ پنجابی۔ سرخ و سفید۔ لڑکیوں کی حد تک تو وہ اسم بامسمی ہے۔ سب کی سب اس پر کیسے مرتی ہیں۔

پھر دوسرا سگریٹ پہلے سگریٹ ہی سے جلا کے اس نے سوچنا شروع کیا۔ ناہید اور مقبول۔ لیکن ان جوڑے دار شادیوں میں صرف ایک شریک حیات کی پابندی عورتوں ہی پر لازم قرار دی گئی۔ عصمت کا مطالبہ صرف ان سے کیا گیا۔ رہ گیا یہ نظریہ کہ عصمت کی قید عورتوں نے خود اپنے اوپر عاید کی ہے۔ اس کے معاشی وجود کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ممکن ہے اس میں کچھ اصلیت نکلے۔ جب عورت اس قدر قربانی پر تیار ہو گئی تو مرد جو مویشیوں اور غلاموں کو اپنی خدمت اور مزدوری کے لئے استعمال کر رہا تھا۔ عورت کو بھی اپنی خادمہ کی طرح استعمال کرنے لگا۔ انسان قدیم کی سمجھ میں آگیا کہ بچے کی پیدائش میں باپ کا بھی کچھ حصہ ہوتا ہے۔ حق مادری اور قانون وراثت مادری کے خاتمے کے ساتھ ساتھ عورت کی جنس کو پوری معاشی اور عمرانی شکست ملی۔ کیا ناہید بھی میری اس طرح کی باندی، اس طرح کی کنیز ہے۔ کیا اور سب آزادیوں کی طرح جنسی آزادی کا سوال خود بخود نہیں پیدا ہوتا۔ لاطینی لفظ، "فیمولس" کے معنی گھریلو غلام کے ہیں اور فیمیلیا کے معنی غلاموں کی اس کل تعداد کے ہیں۔ جو کسی ایک مرد کی ملکیت ہو۔ یہی لفظ فیمیلیا آج بھی اطالوی میں استعمال کیا جاتا ہے۔

عورت کس لئے دوسرے مردوں کے پاس نہ جائے۔ اسی لئے نا کہ وراثت پدری کی حد تک شک کا امکان باقی نہ رہے۔ میاں صغیر تمہارے پاس کون سا اثاثہ، کون سی جائیداد ہے؟ رفتہ رفتہ عصمت کا یہ تخیل کم از کم مشرق میں، اپنے معاشی پس منظر سے نکل کر مقصود بالذات بن گیا۔ عزت کو مال اور جان دونوں سے زیادہ اہمیت دی جانے لگی۔ ہم مشرقی ہمیشہ تصورات کے دیوانے رہے۔۔۔۔ ازبام خانہ تابہ ثریا ازان من۔ مشرقی مرد تو ہمیشہ بام خانہ سے ثریا تک علم کلام، صاحبدلی، عزت نفس، عصمت تخیل کے ہوائی قلعے بناتے رہتے اور بام خانہ کے نیچے رہنے والی گھر والی کو انہوں نے ان خیالی محلوں کے پاس بھی نہ پھٹکنے دیا۔ امیر خسرو اپنی لڑکی کو دیوار کی طرف پشت کر کے بیٹھے رہنے کی تعلیم دیتے رہے۔ کبھی کبھی مرد بھی ان ہوائی قصروں سے نیچے اتر آئے۔ اور امرد پرستی اور بہیمیت کے گندے دلدل میں ایسے غوطے لگاتے کہ حیرت ہوتی۔

ابن یمین ــــ اس کا دیوان بڑی آب و تاب سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ صغیر اس کے ورق الٹتا رہا اس میں موعظت اور پند اور حق پرستی ہر ہر شعر سے ہویدا

تھی- یہاں تک کہ وہ ایک غزل پر پہنچا- ایسی فحش غزل کہ مرزا کانی اور جعفرزٹلی شرما جائیں-

ابنِ یمین کے دیوان سے اس کے دماغ کی منطقی حرکت جو اس کی جذباتی بے چینی سے برابر لڑ رہی تھی پھر اسے گھریلو عورت کی طرف واپس لے آئی- اور صغیر نے سوچنا شروع کیا- قرون وسطیٰ بلکہ یونان قدیم کے ---- اور پھر الف لیلہ کے وہ دو مشہور ڈرامائی کردار- چالاک عاشق اور بیوقوف شوہر- وہ ڈرامہ جس کو ا-لنگز نے بڑی خوبصورتی سے اس ایک جملے میں بیان کیا ہے- شوہروں نے بیویوں پر فتح پائی' لیکن ان شکست کھانے والیوں نے اپنی عالی ظرفی سے فاتحوں کے لئے تاج کا انتظام کر دیا ---- اور تاج؟ فرانسیسی اور سترہویں اور اٹھارویں صدی کے انگریزی ڈرامہ کا وہ سنگینوں کا تاج- سنگینوں کا تاج جو غریب شوہر کو تو نظر نہیں آتا- لیکن جسے اور سب دیکھ دیکھ کے ہنستے ہیں- سنگینوں کا تاج جس کے معنی یہ ہیں کہ اس بادشاہ کی ملکہ ہرجائی ہے- اس بادشاہ کی ملکہ دوسرے مردوں کے جسم سے واقف ہے-

اس رفتار تخیل سے ایک منٹ کے لئے صغیر کا جذبہ رشک سارے دماغی استدلال پر حاوی ہو گیا- آئینہ میں اس نے اپنا چہرہ دیکھا جو لال ہو رہا تھا- اس کے زرد چہرے کو لال ہونے کے مواقع بہت کم ملتے تھے- یہ سرخی زردی کی ضد نہیں اس کی انتہا تھی- آئینے میں اسے اپنے سر پر کہیں سینگ نظر نہیں آئے- خدا کا شکر ہے- دنیا' یہاں تک کہ ہندوستان- کم سے کم شہروں کا ہندوستان ---- قرون وسطیٰ کو صدیوں پیچھے چھوڑ آئے تھے- ورنہ سینگوں کا اگ آنا کچھ عجیب بات نہ ہوتی- اب ہنسنے والوں کے حربے دوسرے ہیں- زیادہ تر تو پیٹھ پیچھے بھونڈا مذاق کر کے جس میں جنسی فعل کی طرف بازاری اصطلاح میں اشارہ ہوتا ہے- ہنس لیتے ہیں اور معاملہ رفت گذشت ہو جاتا ہے- بعض ذرا بیدردی سے بدنصیب شوہر کے سامنے بھی ذکر کر دیتے ہیں- لیکن صاف صاف نہیں' اشارتاً" اور طنزاً"- اور اس امر سے بالکل مطمئن کہ ان کے اپنے گھر محفوظ ہیں- ذرا مسخرے اپنے گھروں کی تو نبض دیکھیں-

لیکن اسی درمیان میں انسان نے جنسی تعلق میں ایک ایسا ارتقائی جذبہ تخلیق کیا ہے- جسے کوئی اور حیوان نہیں جانتا- عشق کا جذبہ' والہانہ کشش کا جذبہ ایک دوسرے

کے لئے مکمل قربانی اور کامل ایثار کا جذبہ۔ اگر اس کی اور ناہید کی شادی کی تہ میں یہ جذبہ کسی نہ کسی طرح پیدا ہو چکا ہے تو دونوں فریقوں پر عصمت واجب آتی ہے۔ تب تو وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے ہیں اور دونوں میں سے کوئی کسی اور کے لئے نہیں ۔۔۔۔

سینما کے بعد مقبول کے فلیٹ میں وہ انتظار کرتی رہی۔ یعنی اس کا تحت الشعور انتظار کرتا رہا کہ جو حسین نوجوان اس کے سامنے صوفے پر بیٹھا ہے۔ اب اس کا ہاتھ اس کے جسم سے مس کرے گا۔ اب اس کے لب، اس کے اپنے لبوں کو طلب کریں گے اور ناہید خود اپنے آپ کو کوئی جواب نہ دے سکی، کوئی فیصلہ نہ کر سکی کہ اگر ہاتھ بڑھیں یا لب قریب آئیں تو وہ مزاحمت کرے یا نہیں اور مزاحمت کرے تو کس قدر۔ وہ خود تو جانتی نہ تھی۔ شاید عین وقت پر وہ تصفیہ کر سکتی۔ کھانے کے بعد اس تنہائی میں اور سب طرح کی باتیں ہوئیں۔ کاغذ کے کارخانوں کے مزدوروں کی انجمن کے متعلق جس میں مقبول کام کر رہا تھا۔ نرسوں کی زندگی کے متعلق، جنگ اور جدید ادب پر تبصرے ہوئے۔ کچھ مشتبہ مذاق بھی ہوا اور مقبول نے ناہید کے حسن کی تعریف بھی کی۔ لیکن عاشقی کی تھوڑی بہت کوشش کی تو صرف آنکھوں میں۔

اور آنکھوں کا باہمی ربط ناقص سا تھا۔ ایک طرح کی جنسی کشش ضرور تھی۔ لیکن نگاہوں کا ربط جذب مطلق کا ربط نہیں تھا۔ مقبول کو اپنے دوست کا، اور ناہید کو اپنے شوہر کا لحاظ تھا۔ اور یہ لحاظ، نہ بھی ہوتا، تب بھی نگاہوں میں صرف گنگنی سی گرمی تھی، آگ نہ تھی اور بجلی کا تو کہیں دور دور پتہ نہ تھا۔ اس لئے نہ ہاتھوں نے ربط قائم کرنے کی کوشش کی، نہ لبوں نے۔

مگر نگاہوں کی یہ ہلکی سی کشش کیا تھی؟ اور اس سے عارضی لطف کیوں حاصل ہوا؟ یہ سوال ناہید نے مقبول کے فلیٹ سے واپس ہوتے ہوئے سوچا۔ غالباً" اس قسم کی خفیف سی جنسی کشمکش جو جسمانی ربط کی طلبگار تھی ایک طرح کا نفسیاتی سیفٹی والو ہے۔ ایک مرد سے والہانہ عشق کے بعد جذبات کی سیرگاہ۔ دل کی خفیہ تمنائیں نکالنے کا ایک بے خطر ذریعہ۔ شاید اسی لئے مغربی تمدن کا حکم ہے کہ بیویاں اپنے شوہروں کے ساتھ

رقص نہ کریں- دوسروں کے ساتھ ناچیں- اور دعوتوں کے میزوں پر اپنے شوہر کے ساتھ نہ بیٹھیں دوسرے مردوں کے پاس بیٹھیں- انہی رعایتوں سے شاید یورپ نے ازدواجی زندگی کی عصمت کو کامیاب بنانا چاہا- مطلق العنانی حکمرانی کے سوا یہی ایک صورت تھی-

اب ساڑھے گیارہ ہو چکے تھے- وہ بس سے اتر کر سیڑھیاں چڑھنے لگی- بے چینی سے یہ خیال اسے پریشان کرنے لگا کہ کہیں صغیر کو شک نہ ہو- کہیں وہ کچھ اور نہ سمجھ رہا ہو- اس کے بعد پھر عشقیہ ازدواجی زندگی میں ایک کانٹا سا کھٹکنے لگے گا- اسی لئے شاید عورتوں نے شروع شروع میں عصمت کو اپنے اوپر لازم گردانا تھا- پھر ناہید کو تعجب ہوا کہ کیوں وہ خود صغیر کے سامنے اپنی بریئت پیش کرنا چاہتی ہے- اسے یقین دلانا چاہتی ہے کہ وہ معصوم ہے اور وہ صرف اسی کو چاہتی ہے- آخر وہ اس کی ملکیت تو نہیں-

اور صغیر نے زینوں پر اس کے قدموں کی چاپ پہچانی- دروازہ کھولا- وہ ہنستی ہوئی کھری آنکھیں، اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے کچھ کہنا ہی چاہتی تھیں کہ دو گداز گورے ہاتھ بڑھے اور ان ہاتھوں نے اس کے جسم کو گھیر لیا، دو گداز نازک لبوں نے اس کے لبوں پر مہر لگا دی اور یہ بوسہ، یہ لمس اتنا سچا، اتنا والہانہ تھا کہ فریقین میں سے کسی کو نہ کچھ پوچھنے کی ضرورت رہی- نہ جواب دینے کی-

"پیارے تم نے وہ سینڈوچ کھائے- جلدی میں تمہارے لئے میں اور کچھ نہ بنا سکی- کہو تو ابھی انڈوں کا خاگینہ تل دوں-"

تب وی تال نے پوچھا- "مہاراج آپ بتایئے ان تینوں میں سب سے زیادہ فراخ دل اور فیاض کون تھا؟ مقبول جس نے اپنے دوست کا لحاظ کیا، یا صغیر جس نے عورت کی ذات اور اس کے حق کا لحاظ کیا-"

مہاراج تری وی کرم سینا نے کہا- "ویتال اس عجیب آنے والے زمانے کے لحاظ سے میں بھلا کیا تصفیہ کر سکتا ہوں کیونکہ تو کہتا ہے کہ اس عجیب زمانے میں کشتیاں مچھلیوں کی طرح پانی کے اندر چلیں گی- اور مکان ہوا میں پنچھیوں کی طرح اڑیں گے- اور

لوہے کی نلیوں میں سے آگ نکلے گی۔ لیکن اس آگ کی بھٹی سے پگھل کر نکلنے کے بعد اگر انسان سچ مچ کھرا سونا بن جائے۔ اور ایسا واقعہ جیسا تو بیان کرتا ہے' پیش آئے تو میں تو یہ کہوں گا کہ صغیر' ناہید اور مقبول تینوں برابر فیاض تھے۔ یا یہ کہ ان میں سے کوئی خاص طور پر فیاض اور فراخدل نہ تھا۔ ہر ایک اپنا اور دوسرے کا حق جانتا تھا۔ اور دل اور جسم کی محبت میں امتیاز کر سکتا تھا' ان دونوں کے فرق کو سمجھتا تھا۔"

"جے مہاراج کی" ویتال نے کہا اور خاموش ہو گیا۔

OO

زرخرید

میجر رشید کا گول منگول چہرہ مسکرایا۔ سانولے موٹے ہونٹوں سے بڑے بڑے مگر ہموار دانت نمودار ہوئے۔ دونوں گالوں میں گڑھے پڑ گئے۔ اس نے اپنے بُش شرٹ کے کپڑے کا بلٹ ڈھیلا کیا۔ اور اپنے بچپن کے دوست امجد حسین پر اپنی چوٹ کا اثر دیکھنے لگا۔ دوسرے لمحے مسکراہٹ کی جگہ ایک اس قسم کی نیم سنجیدگی نے لے لی۔ جس میں مذاق اور شباب کی حسن سنجی برابر کی شریک ہوتی ہے۔

"امجد یار تم اس مرتبہ بمبئی آئے نہیں۔ وہاں ایک لڑکی تھی شیریں ... ..."

امجد نے اس کی طرف بات کاٹنے کے لیے دیکھا۔ امجد حسین جس کے لیے زندگی میں محض دو قدریں تھیں۔ کتابیں اور عورتیں۔ ایک شوق نے اس کی بصارت کم کر دی تھی، اور دوسرے شوق نے بصیرت اور اکثر دونوں کی حد تک اس کی مطالعے کی سطحیت چھپائے نہ چھپتی۔ بات کاٹ کے اس نے کہا "کون شیریں۔ وہی پارسی لڑکی جو قلابے کے بس ٹرمینس کے پاس رہتی ہے"۔

"نہیں یار وہ نہیں۔ یہ مسلمان ہے۔ شیریں نیاز بھائی۔ کیا بتاؤں یار کیا لڑکی ہے۔ میری شادی نہیں ہوئی ہوتی تو میں اس سے شادی کر لیتا۔ کیا جسم۔ کیا آنکھیں۔ اس کا رنگ، انداز ... ..." اور میجر کے چہرے پر کچھ وہ کیفیت نمودار ہوئی جو کسی مشاعرے

یں کسی صاحبِ دل پر کوئی چبھتا ہوا شعر سن کر طاری ہوتی ہے۔

"تم اس سے ملے کہاں؟"

"ریس کورس پر۔ پھر نذیر کے ساتھ۔ وہ نذیر کی بڑی دوست ہے۔"

"یار نذیر کی دوست تو وہ پارسی لڑکی ہے۔ وہی شیریں جو قلابے ہیں ...."

"نہیں امجد میں اس پارسی لڑکی کو بھی جانتا ہوں۔ وہی نا جس کی ذرا ذرا سی مونچھیں بھی ہیں۔ مگر نہیں یار وہ تو سانولی ہے۔ ڈھل بھی چکی ہے کوئی پینتیس سال کی ہوگی۔ وہ نہیں جی۔ یہ شیریں تو اور ہی چیز ہے۔ یار بمبئی میں اس سیزن میں اس سے اچھی لڑکی تو میں نے نہیں دیکھی۔ اگر میری شادی نہیں ہوئی ہوتی تو میں اس سے ضرور شادی کر لیتا ....."

امجد نے میجر رشید کو آہستہ آہستہ خیالات میں کھوتے دیکھا۔ اس کا چہرہ بحرالکاہل کے کسی نامعلوم حصے میں ناممکن جہاز کی طرح نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ اور میجر رشید اس وقت دراصل اپنی ساری موجودہ زندگی پر لعنت بھیج رہا تھا۔ اس کی بیوی نزہت بی بی۔ واہ کیا نام ہے۔ صورت شادی کے وقت اچھی خاصی تھی۔ مگر کہاں وہ اور کہاں شیریں میکس فیکٹر کا اعجاز تھی۔ مگر خدا میکس فیکٹر کو زندہ رکھے۔ اور اب تو نزہت بی بی کی واحد مصروفیت اس کی اپنی ماں سے بارہ گھنٹے کی لڑائی تھی۔ اور پھر اس کی اپنی بے بی آسٹن۔ خدا کی لعنت اس بے بی آسٹن پر۔ معلوم ہوتا ہے صندوق میں بیٹھے چلے جا رہے ہیں۔ کسی دن تو فورڈ دی ایٹ یا شورلٹ کا خواب پورا ہوگا۔ واہ کیا قسمت ہے۔ نہ شیریں جیسی خوبصورت۔ میکس فیکٹر، خوبصورت بیوی ملی نہ خوبصورت موٹر۔ یارو ساری زندگی بے بی آسٹن ہی میں گذر گئی۔ تاج محل، ممتاز محل کو دور ہی سے دیکھتے رہ گئے .....

میجر نذیر کے ساتھ امجد حسین پیتن سی روڈ پیتیت ہال کے قریب کھڑا بس کا انتظار کر رہا تھا۔ پندرہ منٹ گذرے، آدھا گھنٹہ ہوا اور میجر نذیر نے پینتالیسویں مرتبہ اپنے پتلون کی کریز ٹھیک کی۔ حیدرآباد میں یونیفارم کی پابندی تھی۔ پوپ اور بریڈلے اور آسٹن اینڈ آف ریجنٹ سٹریٹ کے سلے ہوئے تمام گرم سوٹوں میں کیڑا لگ جا رہا تھا۔ لیڈی فرامرز اسے ٹیلرز ماڈل یا مانی کون کہتی ہے کہتی رہے۔ مگر میجر نذیر کو

درحقیقت کپڑوں کا شوق تھا۔ نیا مکان بنوا چکنے کے بعد ذرا تنگ دستی کے عالم میں اس نے کچھ عرصے کے لیے اپنے شوفر کو برطرف کردیا تھا۔ لیکن کپڑے پہنانے والے نوکر کو نہیں۔ میجر نذیر کے سر کے سیاہ بال برل کریم سے ہمیشہ چمکتے رہتے۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں دونوں طرف بڑی فیشن ایبل ٹیڑھی سی تراش کے ساتھ کٹی ہوئی تھیں۔ جوتے کا تلا اور ایڑی ذرا اونچی تھی۔ تاکہ قد اونچا معلوم ہو۔ پستہ ہونا معاشرہ میں اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا۔

"یہ بی ون لائن کی بسیں بمبئی بھر میں سب سے زیادہ بے قاعدہ ہیں"۔ اس نے امجد حسین سے مخاطب ہو کے کہنا شروع کیا۔ اور پھر دفعتاً ایک سنہری بالوں والی اجنبی لڑکی سے خطاب کر کے اس نے جملہ پورا کیا۔ "کبھی کبھی تو ایک ایک گھنٹہ انتظار کے بعد بھی بس نہیں ملتی۔ اور کبھی یکے بعد دیگرے بسوں کی قطار لگ جاتی ہے"۔

سنہری بالوں والی لڑکی مسکرائی۔ مگر کوئی جواب نہیں دیا۔ اور سڑک کی دوسری جانب دیکھنے لگی۔

"یہ کون ہے؟" کتابوں اور عورتوں کے دلدادہ امجد حسین نے اُردو میں آہستہ سے سوال کیا۔

"یہ؟" میجر نذیر نے مسکرا کے آتی ہوئی بس کی طرف دیکھا۔ "خیر اتنی دیر کی زحمت کے بعد۔ معاف کرنا۔ یہ لڑکی؟ میں خود نہیں جانتا۔ اسے کہیں دیکھا ضرور ہے۔ غالباً فرانسیسی قنصل خانے میں۔ وہاں شاید ٹائپسٹ ہوگی اور کیا جی"۔

اتنے میں بس آہی گئی۔ امجد کا قاعدہ تھا کہ بس میں وہ ہمیشہ کسی لڑکی کے بازو بیٹھنے کی کوشش کیا کرتا۔ اکثر وہ بارکس روڈ سے فلورا فونٹین فلورا فونٹین سے سی لائن پر میرین ڈرائیو محض اسی لیے چکر لگایا کرتا تھا کہ کسی اچھی سی لڑکی کا ساتھ ہوجائے۔ اس وقت بات چیت کرنے کی کوشش کی جائے۔ مگر اس مرتبہ میجر نذیر کی رعایت نزہت بی بی۔ داہ کریمٹ پر قیام کیا جس پر نذیر پہلے سے بیٹھ چکا تھا۔ اور کھڑکی سے باہر کی گجراتی ساڑیوں کی بہار دیکھتا رہا۔

اس کے تین چار دن بعد کا ذکر ہے۔ جہاج محل (دراصل جہاز محل۔ لیکن یہ سورت کے کسی خوبجے کی اصلاح تھی) جہاج محل میں شام کاٹے نہیں کٹتی تھی۔ بس تیسرے مالے کی کھڑکی سے بیٹھے سمندر کو دیکھتے رہیئے۔ یہ کچھ پتھریلا حصہ تھا۔ جس کے آگے نیچا سا بند باندھ دیا گیا تھا۔ مدّ کے عالم میں سمندر کی موجیں اس بند کو پھاندکر آتی رہتیں۔ یہاں تک کہ بند کے اندر کے حصے میں سمندر کی سطح کے برابر پانی آجاتا تھا۔ پھر جب جزر شروع ہوتا تو یہ پانی معلوم نہیں کس ترکیب سے نکل جاتا۔ پتھریلی زمین مٹیالی مٹیالی کالی کالی باقی رہ جاتی اور شام کے وقت میجر نذیر اور امجد حسین دیکھتے رہتے کہ کوّوں کے غول کے غول! اس پتھریلی چٹان زمین پر شور مچاتے۔ منڈلاتے رہتے کیوں کہ سمندر ہٹنے سے پہلے شاید یہاں مچھلیاں یا ان کوّوں کی اور کسی قسم کی غذا چھوڑ جاتا۔

میجر نذیر نے کہا۔ "شام کا وقت یہیں بیٹھے بیٹھے گذارنا بالکل ناقابلِ برداشت ہے۔"

"تو پھر چلو چلیں؟"

"کہاں۔"

"ہاربر بار، پیرلیسن ڈائری کہیں تھوڑی دیر بیٹھ کے چلے آئیں۔"

"ہاربر بار جانے کے معنی وہسکی — اور وہ بھی تو کمبخت اسکاچ نہیں دیتے — اور سوڈا آبا اور کسی چیز کے پیچھے دس بارہ روپے پھینکنے کے تھے۔"

"نوپ" اچھے کپڑوں کے پرستار میجر نذیر نے سر ہلا کے کہا۔

"تو پھر ولنگڈن چلو۔"

"اس روز گئے تھے اور ہم تم اکیلے اُلّو کی طرح ایک میز پر بیٹھے سنبوسے کھاتے اور کافی پیتے رہے۔ اور سوائے اس باؤلے پارسی پسٹن جی کے کسی سے بات تک نہیں ہوسکی۔"

اور میجر نذیر نے کپڑوں کی کریز پر ایک مطمئن نظر ڈال کے کہا۔ "گاڑی میں کتنا پٹرول ہوگا۔"

"کل چور تار سے ڈیڑھ گیلن لیا تھا۔ ایک آدھ گیلن پہلے کا ہوگا۔"
"تو چلو کسی لڑکی کو ساتھ لے کر ولنگڈن یا سی سی آئی چلیں۔ وہاں تھوڑی دیر بیٹھیں۔"
"ولنگڈن میں تو آج ناچ بھی ہوگا۔" امجد حسین نے کہا۔
"آپ کی دعا سے خاکسار ذرا اچھا ہی ناچتا ہے۔" اور میجر نذیر نے پھر اپنے کپڑوں پر ایک نظر ڈالی۔
"لیکن کس کو ساتھ لیا جائے؟"
اور اس سوال کے ساتھ میجر نذیر نے اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی سیاہ کتاب نکالی جس پر سنہری حروف میں لکھا ہوا تھا۔ "ٹیلیفون نمبرز" اس میں میجر صاحب نے اپنے ہر ملنے والے اور ملنے والی کا ٹیلیفون نمبر درج کر ڈالا تھا۔ جس زمانے میں ان کی رجمنٹ بغداد میں تھی۔ اس زمانے میں حبیبہ فرموش، اور بہت سی یہودنوں کے پتے انھوں نے لکھ ڈالے تھے۔ اس کے سوا لاہور، سری نگر، کلکتہ، لکھنؤ، حیدر آباد، منصوری، بمبئی، پونا، مدراس، بنگلور، غرض ہر اس شہر میں جہاں ان کا کچھ عرصے کے لیے قیام رہا تھا۔ انھوں نے کارآمد ملاقاتیوں، اور ان سے زیادہ لڑکیوں کے پتے درج کر لیے تھے۔
چنانچہ پہلے تو کوئینز روڈ پر گرینز کورٹ میں رہنے والی ایک اینگلو انڈین لڑکی سے انھوں نے ٹیلیفون ملایا۔ میجر رشید آکے ٹیلیفون کے پاس کھڑا ہوا۔ اس کی عادت تھی کہ جب نذیر یا امجد اپنی کسی دوست سے ٹیلیفون پر باتیں کرتے ہوتے تو وہ ضرور آ ٹپکتا۔ ان کی باتیں سنتا اور پھر بالکل بے تعلق ہو کر چل دیتا۔ ایک دن تو اس نے امجد حسین کو بے وقوف بنانے کی اچھی خاصی کامیاب کوشش کی تھی۔ نذیر علی الصباح ہوائی جہاز سے حیدر آباد جا رہے تھے۔ کسی ضروری کام سے ان کی طلبی ہوئی تھی۔ رشید انھیں پہنچانے جوہو ایروڈروم گیا۔ اسے معلوم تھا کہ امجد آٹھ سے پہلے سو کے نہیں اٹھتا۔ اس دن چوکیدار نے اسے سات بجے اٹھا دیا۔ "دھنی، ادھر ماہیم سے کوئی بائی تم سے بات کرنے مانگتا۔" اس وقت کون بائی ہوں گی اور وہ بھی ماہیم سے۔ امجد حسین کھڑبڑا کے اٹھا۔ ادھر سے ایک بھاری سی نیم زنانی آواز نے کہا۔ "میں سرلا بائی ہوں۔ ماہیم سے بول رہی ہوں۔ میں مسٹر امجد حسین سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ آپ مسٹر امجد حسین ہیں۔ آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔" "کون سرلا بائی۔" امجد حسین سر کھجانے لگا۔ "میرا آپ کا بس پر ساتھ ہوا تھا۔ آپ نے مجھے اپنا ٹیلیفون نمبر دیا تھا۔ میں سرلا بائی ہوں

ماہیم والی۔"

"سرلابائی سرلابائی" امجد حسین سوچتا رہا۔ اور سرلابائی کی نیم زنانی آواز پھر آئی ۔ "میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ کہاں ملوں"۔ امجد حسین کو اس نیم زنانی آواز میں میجر رشید کے لہجے اور دبی ہوئی ہنسی کی ذراسی آہٹ معلوم ہوئی۔ اور اس نے کہا۔ "کیوں بے رشید کیا جو ہو ایرو ڈروم سے بات کر رہا ہے"۔ ادھر سے نیم زنانی آواز نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "مسٹر حسین میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔ میں آپ سے کہاں ملوں؟" امجد حسین نے جواب دیا۔ "تاج محل میں"۔ آواز نے پھر کہا۔ "تاج محل میں کس جگہ؟ میں گیارہ بجے پام کورٹ میں آپ کا انتظار کروں گی"۔ "پام کورٹ میں نہیں۔ تاج محل میں آفس کے پاس جہاں لِفٹ ہے"۔ لیکن زنانی آواز نے بڑے مصنوعی سُریلے پن سے جواب دیا۔ "مسٹر امجد حسین، وہاں لِفٹ کے پاس تو بہت سے لوگ آتے جاتے ہیں۔ وہاں آپ سے ملتے مجھے بڑی شرم آئے گی"۔ یہ سرلابائی کون ہے؟ امجد حسین نے سوچنا شروع کیا۔ اور طرح طرح کی سانولی سلونی نیم کامیاب سنیما ایکٹرسوں کی تصویریں اس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگیں۔ ٹیلیفون والی آواز کا نیم زنانہ پن ایک طرح کی مردانہ ہنسی میں تحلیل ہو گیا۔ لیکن نیم زنانہ آواز پھر نمودار ہوئی۔ "تو مسٹر امجد حسین پھر آج گیارہ بجے پام کورٹ میں۔" اور امجد حسین نے چڑ کر کہا۔ "چل بے رشید یہ بتا نذیر چلے گئے یا نہیں"۔ "معاف کیجیے گا میں سمجھی نہیں"۔ نیم زنانی آواز نے پھر کہا اور امجد حسین نے جھنجھلا کے ٹیلیفون رکھ دیا۔ رشید کے کمرے میں جا کے دیکھا تو وہ غائب تھا۔ اس نے ایک چٹھی پر لکھا۔ "ڈیر رشید۔ ماہم سے تمھاری ایک دوست سرلابائی نے ٹیلیفون کیا ہے۔ وہ تم سے پام کورٹ میں گیارہ بجے ملنا چاہتی ہیں۔ ان کی آواز بھی تم سے بہت ملتی جُلتی ہے۔ امجد"۔

رشید نے اس وقت بھی امجد کو مشورہ دیا کہ یار وہ ہماری تمھاری دوست ہے نا ماہم والی سرلابائی اسے لے کے ناچنے چلے جاؤ۔ اِدھر میجر نذیر احمد برابر ہلو ہلو کیے جا رہا تھا۔ گرینز کورٹ والی اینگلو انڈین لڑکی کی ماں نے یہ خبر سُنائی کہ وہ ابھی تک دہرہ دُون سے واپس نہیں آئی۔ جہاں وہ نذیر سے ستمبر میں ملی تھی۔

نذیر نے اپنی چھوٹی سی ٹیلیفون کے نمبر والی کتاب پر پھر ایک نظر ڈالی۔ اور ایک اور نمبر ملایا۔ "کیا میں مسٹر عباس باٹلی والا سے بات کر سکتا ہوں؟" پھر اپنے مخاطب کے لہجے کو سمجھ کر اس نے گفتگو شروع کی۔ "تم کون ہے۔ چوکیدار ہے کیا۔ اچھا چوکیدار دھنی ادھر ہے۔ ارجن آفس سے نہیں آیا۔ اچھا ادھر بائی جی ہے۔ وہ بھی نہیں ہے کدھر گیا ہے۔ وہ بھی باہر گیا۔ سیٹھ کے ساتھ گیا؟ بچہ لوگ کے ساتھ گیا؟ اچھا اپنے فرینڈ کے ساتھ گیا۔" اسی چھوٹی سی کتاب کے ورق الٹتے ہوئے اس نے کہا۔ "چلو گلشن باٹلی والا بھی کہیں باہر گئی ہے۔ وہ بھی گئی۔"

پھر اس نے ایک اور نمبر ملایا۔ "مس مہرو کے پرائیوٹ نمبر سے۔ ہاں ہاں سر کلینو فرامرز کا مکان ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ مس مہرو کے پرائیوٹ ٹیلیفون سے میرا نام! میجر نذیر، رقص کے انداز میں میجر نذیر آہستہ آہستہ پیر پٹکنے لگا۔ اس نے امجد حسین کی طرف مُسکرا کے دیکھا جواب ملنے میں دیر ہو رہی تھی۔ اس نے ٹیلیفون کے چونگے پر ہاتھ رکھ کر اس نے کہا۔ "اسٹریتھ مور پر مارسئی سے لے کر بمبئی تک میرا اس کا ساتھ رہا۔ کیا لڑکی ہے بھائی، امجد۔ اب تو بالکل بدل گئی ہے۔ اب تو زیادہ تر انگریزوں کے ساتھ۔ ... .. یس ہلو ہلو..... انگریزوں کے ساتھ ... .. ہلو ہلو۔ ہاں مہرو ڈارلنگ ... ... تم ہی پہچانو۔ کیا میری آواز بھی یاد نہیں؟ ... ... ہاں ہاں... ... میرا نام تمھارے آدمی نے بتایا ہوگا ... ... نہیں؟ تم نے خود پہچانا؟ ... ... تھینک یو ڈارلنگ۔ صدیوں سے تم سے مُلاقات نہیں ہوئی۔ کتنے دن ہوئے دو ہفتے ... ... مہرو ڈارلنگ کاش پھر اسٹریتھ موڑ پر میرا اور تمھارا ساتھ ہوتا۔ وہی ۱۹۳۷ء کی طرح ... ... ڈارلنگ ..... اچھا سنو مہرو۔ یہاں میرے ساتھ میرے ایک دوست ہیں امجد۔ ہم ولنگڈن کلب جانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ شام کسی طرح کاٹے نہیں کٹتی۔ تم چلوگی؟ ... ... ارے ... ... ارے ... ... کیوں! ... .. کہاں؟ مہاراجکمار راج بھوج کے یہاں ... ... کاک ٹیل ڈانس ... ... ارے ارے ... ... خیر اگر تم پہلے ہی سے وعدہ کر چکی ہو ... ... اچھا ڈارلنگ کسی اور دن ..... اچھا ..... اچھا، شام بخیر مہرو۔"

"بھئی وہ تو مہارا جکمار بھوج کے یہاں کاک ٹیل پارٹی میں جا رہی ہے۔ اور اور تو کوئی لڑکی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے"۔ اور ٹیلیفون کا آلہ ہاتھ سے رکھ کر میجر نذیر نے کرسی کی پشت کا سہارا لے کر پتلون کی کریز پھر سے ٹھیک کی۔

رشید نے کہا۔ "شیریں نیاز بھائی کو کیوں ساتھ نہیں لے جاتے"۔

"نہیں رشید"۔ نذیر نے کہا۔ "گذشتہ ہفتے میں نے بہت کوشش کی۔ اُس نے باہر آنا جانا بالکل چھوڑ دیا ہے"۔

"میں نے سُنا ہے کہ وہ راج رتن بھائی جوہری کے ہتھے چڑھ گئی ہے۔ اور وہ اسے کہیں آنے جانے نہیں دیتا"۔ رشید نے پتلون کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈال کے اور دیوار کا سہارا لے کر کہا۔

"ممکن ہے بھئی۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتا"۔ نذیر نے جواب دیا۔

"میں نے سنا ہے بڑی خوبصورت لڑکی ہے"۔ امجد نے کہا۔

"خوبصورت؟ بے حد خوبصورت"۔ نذیر نے جواب دیا۔

اسی طرح دیوار سے اپنی پیٹھ کو کسی قدر رگڑ کے رشید نے پوچھا۔ "نذیر گذشتہ سال تو اس سے بتھاری بڑی دوستی تھی"۔

"بڑی دوستی تو نہیں، چھوٹی دوستی ضرور تھی۔ اصل میں وہ اصغر مرحوم کی دوست تھی۔ مگر کیا اچھی لڑکی ہے امجد"۔ نذیر نے امجد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کے کہا۔ "قد و قامت بات چیت، کلچر، اگر وہ درحقیقت راج رتن بھائی جوہری کی داشتہ بن گئی ہے تو بڑی حیرت ہے اصغر تو اس سے شادی کرنے کو بالکل تیار تھا۔ اور بھی کہیں نہ کہیں اس کی شادی ہو ہی جاتی۔ کیا لڑکی ہے امجد"۔

امجد نے کہا۔ "تو یار ذرا ٹیلیفون ملا کے تو دیکھو"۔

"بیکار ہے۔ وہ نہیں آئے گی"۔ پھر بھی ذرا رکاوٹ کے ساتھ نذیر نے جیب سے وہی ٹیلیفون نمبروں والی کتاب نکالی۔ اور نمبر ڈائل کرنا شروع کیا۔ "ہلو ہلو..... ہلو..... کون تم ہو۔ شیریں..... پہچانو..... ہاں نذیر۔ میں ابھی تک بمبئی میں ہوں.....

ہاں شیریں ... ... ایچیں اسٹکیس کے بعد حیدر آباد جاؤں گا ... ... شیریں تم کیسی ہو۔ آخر اس دن تم نہیں آئیں ... ... اچھا پھر کب؟ ... ... آج کیوں نہیں؟ ... ... شیریں ہمارا ارادہ ولنگڈن کلب جانے کا تھا ... ... خیر وہاں نہ سہی تاج سہی ... ... وہاں بھی نہیں؟ ... ... کیوں؟ ... ... کیا بات ہے؟ نہیں میں پوچھنا بھی نہیں چاہتا ہوں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم آج چلو۔ ہمارے ساتھ۔ میرے ایک دوست ہیں امجد ... ... نہیں؟ ... ... شیریں شیریں ... ... یہ تو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ ... ... میں خود آؤں۔ کہاں؟ تمھارے یہاں۔ تمھارا پتہ کیا ہے۔ ذرا ٹھیرو میں لکھ لوں ... ... ہاں ... ہاں ... ... ہاں ... ... اچھا بھائی کھلر کے پل کے آگے ... ... اچھا میں سمجھا ... ... ہاں۔ اچھا میں آتا ہوں شیریں ... ... تمھیں ساتھ چلنا ہوگا ... ... نہیں؟ خیر میں آتا ہوں۔ میں اپنے دوست امجد کو بھی ساتھ لیتا ہوں۔ اچھا شکریہ۔ خدا حافظ۔ خدا حافظ۔"

بڑی ہی نرم اور سُریلی آواز میں خدا حافظ کہہ کے میجر نذیر نے ٹیلیفون کا ریسور رکھا۔" امجد پھر کیا ارادے ہیں۔ بھائی کھلر کے آگے رہتی ہے چلتے ہو تو چل کے مل لو۔ مگر وہ ساتھ نہیں آئے گی۔ میں نے جب زور دیا تو وہ ٹیلیفون پر کہنے لگی۔ نذیر تم زیادہ اصرار کروگے تو میں رو دوں گی، معلوم ہوتا ہے وہ راج رتن بھائی والی افواہ کچھ ٹھیک ہی ہے۔"

"معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔" رشید نے کہا۔" یا ممکن ہے اس کے والدین اسے باہر آنے جانے سے روکتے ہوں۔"

"بہرحال ... ..." میجر نذیر نے کہا اور آستینوں کی کریز کا امتحان لینے لگا۔

"چلو۔" امجد نے کہا۔

مرکزی اسمبلی میں سو فیصد نشستیں جیت لینے کی خوشی میں اس شام بمبئی کے بہت سے مسلمان محلّوں میں چراغاں تھا۔ محمد علی روڈ، بھنڈاری بازار وغیرہ میں ہر چھوٹی سی چھوٹی دکان پر روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ باب پاکستان، باب محمود غزنوی اور جناح کی بڑی بڑی تصویروں پر بجلی کی روشنی اُجالا کر رہی تھی۔ پنواڑیوں کی دکان پر جمگھٹا تھا اور چھوٹے چھوٹے

ہوٹلوں سے سستے فلمی گانے، ریڈیو، گراموفون کے ذریعے نشر ہو رہے تھے، سڑک پر ہزاروں آوارہ گرد چھوٹے چھوٹے ٹوپیاں پہنے ہوئے میمن، بوہرے، خوجے اور دھوتی پہنے ہوئے ہندو، تماشا تو تماشا ہی ہے۔ تصویر چاہے گاندھی کی ہو چاہے جناح کی۔

جگمگاتی ہوئی کمانوں، قمقموں اور مجمع دیکھتے ہوئے میجر نذیر نے ایکسلریٹر دبایا بھائی کھلر کے پل کے اسی طرف اس نے گاڑی روک لی۔ اب سستے گراموفونوں۔ ریکارڈوں کا شور بہت پیچھے رہ گیا تھا۔

"یہاں سے راستہ پوچھنا پڑے گا۔" میجر نذیر نے ہونٹ اور دانتوں کے درمیان اپنی چھوٹی سی مونچھوں کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

کوئی میمن جو قریب گذر رہا تھا اسے امجد نے پکارا۔ "مولانا"

اور نذیر نے راستہ پوچھا۔

ایک پتلی تاریک سی گلی سے جو کر موٹر پھر ایک ذرا چوڑی سی سڑک پر پہنچی۔ جس پر ٹرام کی پٹریاں بچھی ہوئی تھیں اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کوئی ٹرام کھڑکھڑاتی ہوئی گذر جاتی۔

"یہ تو وہ اسکول ہے جس کا پتہ اس نے مجھے بتایا اور کہا تھا کہ یہیں اس کا چھوٹا بھائی ہمارا انتظار کرے گا۔"

ایک بارہ تیرہ سال کا لڑکا سفید قمیص اور نیکر پہنے موٹر کے قریب پہنچا۔ اور پوچھ

"آپ میجر نذیر ہیں؟"

"ہاں" میجر نے ہنس کر کہا۔ اس نے اور امجد نے آئینے چڑھائے، پھر اس نے گاڑی کو قفل لگایا۔ سڑک سے آگے موٹر نہ جا سکتی تھی۔ ایک پتلی سی گلی تھی۔ جس پر پتھروں کا فرش تھا۔ اور دونوں جانب، جدید وضع کے چھوٹے چھوٹے دو دو تین تین منزل کے ایسے مکانات تھے جن میں تین چار خاندان رہ سکیں۔

گلی کے ختم پر آخری مکان پر چھوٹے رہنما نے نذیر اور امجد کی طرف دیکھا۔ اتنے میں نچلی منزل کا دروازہ کھلا۔ دروازے پر بی۔ جی۔ شیخ، بیمہ ایجنٹ کا نام ایک تختی پر لگا ہوا

تھا۔ دروازہ کھُلا اور بجلی کی روشنی کی ایک لہر آئی۔ ایک جوان لڑکی شلوار قمیض کا سفید ریشمی سُوٹ اور اس پر سیاہ جارجٹ کا دوپٹہ اوڑھے کھڑی تھی۔ اس کا قد اچھا خاصا بلند تھا۔ رنگ بہت گورا، اُنگلیاں بھی لمبی، چہرے کی تراش لانبی لیکن خوبصورت ہونٹوں پر لپ اسٹک کی بڑی ہلکی سی سرخ تحریر تھی اور برق بین السطور کی طرح اس کے ہموار دانت ایک تبسم میں جگمگا رہے تھے۔ بال ترشے ہوئے نہیں تھے۔ لیکن پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ اس نے میجر نذیر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میجر نذیر نے اس کا ہاتھ "ہوشیریں" کہہ چکنے کے بعد بھی آدھ منٹ تک اپنے پنجے میں رکھا۔ ایک اور خاتون اس لڑکی کے پیچھے کھڑی تھی۔ اس کی ماں۔ جن کے دانت کب کے ناہموار ہو چکے تھے۔ اور ہونٹوں اور آنکھوں کے قریب جھرّیاں نمودار ہو چلی تھیں اور جسم بے ڈول ہو چلا تھا۔

میجر نذیر نے امجد کا تعارف شیریں اور اس کی والدہ مسز نیاز بھائی دونوں سے کرایا۔ شیریں نے امجد کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کوئی کسی دروازے سے آنے والے اجنبی کی طرف دیکھے۔ ذراسی میزبانی لیکن بڑی ہی دُور سے وہ مسکرائی۔ اور پھر دفعتہً اس کی آنکھیں میلوں پیچھے ہٹ گئیں۔

اس نے نذیر اور اس کی بیوی کی خیریت پوچھی۔ اور نذیر نے شکریہ ادا کر کے پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا۔ اس کی ماں مسز نیاز بھائی مسکرائی۔ نذیر نے کہا۔

"ہم اس لیے آئے ہیں کہ شیریں کو اپنے ساتھ لیجا کے کہیں سَیر کرا لائیں۔"

"نہیں نذیر تم نے وعدہ کر لیا تھا کہ یہیں بیٹھ کے باتیں کرو گے۔ میں باہر تو نہیں آتی۔"

نذیر نے کہا۔ "مسز نیاز بھائی آپ کو ہماری سفارش کرنا پڑے گی۔"

مسز نیاز بھائی ہنسیں، ناہموار دانت ہنسے۔ "شیریں چلی کیوں نہیں جاتی ہو۔ تھوڑی دُور تک ڈرائیو کے لیے۔ کب تک۔

شیریں نے تعجب اور غصّے سے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ اور پھر مُسکرا کے اس نے کہا۔ "نہیں نذیر۔ کیوں کیا یہاں باتیں نہیں کر سکتے۔ میں نے باہر آنا جانا بالکل چھوڑ دیا

ہے۔"

"کب سے ؟ آخر کیوں ؟" نذیر نے پھر اس کا ہاتھ دبایا۔

مسنر نیاز بھائی نے اس کے بجائے جواب دیا۔"سال بھر سے۔ لوگوں نے معلوم نہیں کیا کیا ہمارے متعلق مشہور کیا۔"

شیریں نے جلدی سے کہا "پہلے تو یہ مشہور کیا کہ میں جنید کے ساتھ لاہور بھاگنے والی ہوں اور جنید اپنی بیوی کو طلاق دے رہا ہے۔"

" یہ اور اسی طرح کی ہزاروں باتیں ہم لوگوں کے متعلق مشہور ہونے لگیں تو شیریں کے والد نے باہر آنا جانا کم کرا دیا۔"

نذیر نے کہا۔" لیکن میں تو تم کو پانچ چھ سال سے جانتا ہوں۔ میری بات دوسری ہے۔"

" بے شک" شیریں نے پھر اپنے خوبصورت ہموار دانتوں کی بجلی لہرا کے کہا۔ " لیکن نذیر میری تم سے درخواست ہے، التجا ہے، باہر چلنے کے لیے مجبور نہ کرو۔ اس کے علاوہ مجھے ولنگڈن سے نفرت ہے۔"

" خیر ولنگڈن نہ سہی سی سی آئی سہی۔"

" اوہ نذیر" وہ کھلکھلا کے ہنسی " وہ ولنگڈن سے بدتر ہے۔"

" پھر تاج سہی۔ چلو بار بر بار میں تھوڑی دیر بیٹھو۔"

شیریں نے صوفے پر اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ سیاہ جارجٹ کا دوپٹہ ایک بھر ڈھلک گیا۔ دونوں ہاتھوں کی پانچ پانچ انگلیاں سمیت اس نے انکار میں اس طرح ہلائیں جیسے دو گورے گورے سانپ ساتھ ساتھ اپنے پھن ہلائیں۔

یہ دیکھ کر کہ امجد بالکل خاموش بیٹھا تھا، نذیر نے کہا۔" مسنر نیاز بھائی یہ میرے دوست امجد حسین بہت اصرار کر رہے تھے کہ شیریں کو ساتھ لے چلو۔ یہ وہاں حیدرآباد میں فولاد کی انڈسٹری میں ہیں۔ میرے بڑے خاص دوستوں میں سے ہیں۔ بمبئی میں انھیں زیادہ لوگ نہیں جانتے۔ اس لیے اگر شیریں میرے اور ان کے ساتھ چلی جائے تو کیا ہرج ہے۔"

"جاتی کیوں نہیں ہو"۔ شیریں کی ماں نے دفعتاً سفارش کا پورا ارادہ کرکے اپنی بیٹی سے کہا۔

شیریں جو اسی طرح دور دراز نظر سے دور ہونے والی دور رہنے والی نظر سے امجد کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اپنی ماں کی طرف پلٹی: "ممی آپ کو کیا ہوگیا ہے؟"

"تھوڑی دیر کے لیے چلی بھی جاؤ"۔ مسز نیاز بھائی نے کہا۔

"ممی"، کہہ کے شیریں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنی ماں کو منع کیا۔ اور ایک ٹھنڈی گہری سانس لی۔

"ہم حیدرآبادیوں کے ساتھ باہر جانے میں بدنامی نہیں ہوسکتی"۔ امجد نے کہا۔

"نہیں ہوسکتی؟ کیا کہنا"۔ شیریں اپنی کرسی سے اچھل ہی پڑی۔ "نذیر تم کو معلوم ہے۔ یہاں کیا مشہور ہوا تھا یہ کہ اصغر سے میری شادی ہوگئی ہے"۔

"شیریں"۔ نذیر نے پتلون کی کریز دونوں گھٹنوں پر ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ "تمھیں معلوم ہے کہ اصغر کا انتقال ہوگیا"۔

"نہیں"۔ شیریں کے منہ سے ایک دبی سی چیخ نکل گئی۔ امجد نے فوراً تجزیہ کیا اس چیخ میں تاسف نہیں حیرت ہی حیرت تھی: "کب؟"

"کوئی مہینہ بھر ہوا"۔ نذیر نے کہا۔

"ارے ارے مجھے بڑا افسوس ہوا"۔ شیریں نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں جوانی کا رس اور جوانی کی چمک تو تھی۔ مگر ایک ایسی بے کیفی تھی گویا آنکھیں جذبے، افسوس اور احساسات سے ہمیشہ کے لیے بیگانہ ہو چکی ہیں۔

مسز نیاز بھائی نے افسوس کا اظہار کرکے پوچھا۔ اور نذیر اصغر مرحوم کی موت کے حالات بیان کرنے لگا۔

اور امجد سوچنے لگا۔ اگر اصغر کی شادی اس لڑکی شیریں سے ہو جاتی تو اسے اس طرح عین جوانی میں موت نہ آجاتی۔ بیچارا اصغر۔" خدا مغفرت کرے"۔ مگر وہ پیدا

ہی اسی لیے ہوا تھا کہ اپنے ہاتھوں اپنی زندگی تباہ کرے۔ عنفوانِ شباب میں اس نے گھوڑوں کی سواری کے ساتھ ساتھ ناچنا اور شراب پینا سیکھا۔ لڑکیوں کی موجودگی میں اس کی زبان کھل جاتی اور وہ گھنٹوں عاشقی کی باتیں کر سکتا۔ لیکن اپنے ساتھی افسروں کی صحبت میں زیادہ سے زیادہ وہ محض گالیاں دیتا رہتا۔ پہلے اس کے دانت سفید سے زرد اور مٹیالے ہو گئے۔ حالانکہ اس کی عمر ابھی پینتیس سال ہی کی تھی۔ پھر اس نے گھوڑ دوڑ میں اپنی بساط سے زیادہ روپیہ خرچ کرنا شروع کیا۔ اور وہ دس ہزار کا غبن۔ خدا اس کی مغفرت کرے۔ خیر جائداد وغیرہ بیچ کے اس نے اپنی عزت بچائی۔ کمیشن باقی رہ گیا۔ نوکری سے نہیں نکالا گیا۔ مگر پھر چھ مہینے کے بعد گیارہ بجے دن ہی سے اس کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں، چڑھ جاتیں اور اس نے جنرل کلیمنٹ بنول کو گالی دے دی جو اس کی رجمنٹ کا مہمان تھا۔ اور وہ میجر سے پھر کپتان ہو گیا۔ بچارا، بچارا، اصغر۔ اور جب اسکاچ وہسکی کے پیسے نہیں رہتے تو وہ جم خانہ وہسکی پر اُتر آیا۔ پھر ٹھّرے پر، اور عورتوں کی حد تک بھی یہی حشر ہوا۔ اس انگریز کرنل کی بیوی سے۔ کیا عورت تھی، کیا جسم، کیا حسن تھا۔ لیکن اس کے پیچھے اصغر نے سب کچھ لٹا دیا۔ دادا کا گھر بیچا۔ اپنی موٹر بیچ دی۔ یہاں تک کہ اپنا فرنیچر...... پھر چھایا دیوی۔ اس نے بھی اصغر کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا۔ چھایا دیوی کا بھی کیا جسم تھا۔ سڈول، گداز، ایک زمانے میں سینما ایکٹرسوں کی سرتاج تھی۔ اب یہ حالت ہے کہ ریس کورس پر آتی ہے تو کوئی پلٹ کر دیکھتا بھی نہیں، جوانی ڈھل چکی ہے، مگر اب بھی...... خیر اس نے بھی بچارے اصغر کو تباہ کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ غلطی بھی اصغر کی تھی۔ اور اسی چھایا دیوی کی وجہ سے تو شیریں اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔

اور امجد سوچتا رہا کہ اصغر کی شادی اگر شیریں کے ساتھ ہوتی تو نہ اصغر اس طرح تباہ ہوتا، نہ اتنی جلدی مر جاتا نہ شیریں زرخرید لونڈی کی طرح راج رتن بھائی کے دمکتے ہوئے ہیروں کی عوض بک جاتی۔ رشید اور نذیر دونوں کا بیان تھا کہ شیریں کی نسبت اصغر کے ساتھ ہو گئی تھی۔ اور وہ اصغر کو پسند کرتی تھی۔ لیکن ایک دن رٹز ہوٹل میں جب وہ اصغر سے ملنے آئی تو اس نے اصغر کو چھایا دیوی کی گردن میں باہیں ڈالے دیکھا۔ اور وہ اسی طرح

دروازے سے باہر نکل گئی۔ اور اس کے بعد اس نے کبھی اصغر سے بات نہ کی۔ اصغر بھی گالیاں دے دے کے خاموش ہو گیا۔

یہاں تک کہ دن رات کی شراب خوری اور سرمستی اور بے ادبی اور حماقتوں کی وجہ سے بہت سی رعایتوں کے بعد کورٹ مارشل نے بالآخر اصغر کو فوج سے برخواست کر دیا۔ انگریز کرنل کی بیوی کو تو بہت دور بھیجا ہی جا چکا تھا، چھایا دیوی ...... دوسرے شکار کھیل رہی تھی، اور بہرحال اس کے پاس اتنا پیسہ نہ تھا کہ وہ اصغر کی پرورش کرتی اور اس کے بعد زندگی کے بقیہ ایک دو سال اصغر نے دیسی ٹھرا پی پی کے دھڑنیوں کے ساتھ گذارے۔ ایک رات دفعتاً اس کے دل میں درد اٹھا۔ دھڑنیاں گھبرا گئیں۔ مگر کوئی ڈاکٹر نہ آسکا۔ رات تاریک تھی۔ تاریکی بڑھنے لگی۔ خدا مغفرت کرے مگر اصغر پیدا ہی اس لیے ہوا تھا کہ اپنی زندگی اپنے ہاتھوں تباہ کرے۔ اور شیریں نے اس روز بڑی غلطی کی تھی جو چھایا دیوی کے ساتھ اسے دیکھ کر اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلی گئی۔ پھر اس کے بعد کسی اور فیشن ایبل اور اچھے طبقے کے نوجوان نے اس سے شادی کرنے کی خواہش نہیں ظاہر کی۔ اور بچارا اصغر اندھیری بڑی ہی تاریک رات کو جب اس کا دم نکلا تو دھیڑنیاں رونے لگیں اور کسی نے اس کا منہ قبلے کی طرف نہیں کیا ......

شیریں نے اصغر کی موت کا ذکر کچھ نذیر اور کچھ امجد کی زبانی اس طرح سنا گویا اسے اس شخص سے کبھی دور کا بھی واسطہ نہ رہا تھا۔ وقت گذر چکا تھا۔ لیکن بات بھی نہیں رہی تھی۔

پھر جنید کا ذکر آیا۔

پھر نذیر نے بھنڈی بازار میں چراغاں اور باب پاکستان کا ذکر کیا۔ لیکن شیریں اور اس کی والدہ دونوں کانگریس کی طرف دار تھیں۔ شیریں نے تو یہ بھی ارادہ ظاہر کیا کہ وہ عنقریب ''وبک آئی'' کو چھوڑ کر کانگریس کی والنٹیر بننے والی ہے۔

امجد نے ہنس کر کہا۔ ''کھادی کی ساڑی آپ پر بہت خوبصورت معلوم ہوگی۔''

پھر ولنگڈن یا ہاربر بار کے ساتھ چلنے کا اصرار شروع ہوا۔ اب نو بج رہے تھے۔

شیریں نے پھر صوفے کے دونوں بازوؤں پر دونوں ہاتھ پھیلا کے سانپ کے پھنوں کی طرح انکار میں پنجے ہلائے۔ مگر آخر کار اپنی ماں کے اصرار سے چلنے پر ڈر کے نیم راضی ہوئی۔

امجد سوچ رہا تھا وہ کونسی طاقت تھی جس نے اس کی آزادی سلب کرلی تھی۔ قدامت ہرگز نہیں۔ محبت؟ غالباً نہیں۔ پھر کیا۔ سکے، ہیرے، نیلم، انگوٹھیاں، بروچ، کان کے آویزے۔ شاید۔ شاید۔

لیکن وہ چلنے کو نیم راضی ہوئی تو گھڑی دیکھ کر نذیر نے کہا۔ "نو بج رہے ہیں"۔ اب اس حماقت کی کیا ضرورت تھی؟ نو بج رہے تھے تو بجا کریں۔ شیریں جو کپڑے بدلنے کے لیے اُٹھی تھی۔ پھر بیٹھ گئی"۔ اب بہت دیر ہو گئی ہے"۔ نذیر بھی خاموش ہو گیا۔ اور شیریں کی ماں نے بہت اصرار سے نذیر اور امجد کو آئندہ اتوار چائے کی دعوت دی۔

اس کے گھر سے واپس ہوتے ہوئے امجد نے نذیر سے پوچھا۔" پہلے تو آپ لوگوں کے ساتھ یہ خوب اِدھر اُدھر آتی جاتی تھی نا!"

"ہاں بہت ریس کورس، تاج، ولنگڈن، ایک مرتبہ میں، اصغر، یہ شیریں اور آمنہ پونا بھی گئے تھے۔ ویک اینڈ گذارنے۔ مگر اب وہ نہیں آئے گی۔ امجد۔ میں نے کہہ دیا تھا نا؟"

"کوئی بات ضرور ہے"۔

" میرے خیال میں تو وہ راج رتن بھائی جوہری کا قصہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اس نے اسے رکھ لیا ہے۔ اور اِدھر اُدھر کہیں آنے جانے نہیں دیتا"۔

" افسوس ہے ایسی خوبصورت لڑکی اور پھر شریف خاندان کی۔ وہ یک آئی ایم افسر بھی ہے اور وہ اس طرح ایک جوہری کی داشتہ بن کر رہے"۔

باب محمود غزنوی پر بجلی کے قمقمے جگمگا رہے تھے۔ اور چائے کی دوکانوں اور ہوٹلوں سے سستے فلمی گانے کی صدائیں آ رہی تھیں۔

" ہاں افسوس کی بات تو ضرور ہے"۔ نذیر نے اسٹیرنگ وہیل کو گھما کے سامنے

سے آتی ہوئی بس سے اپنی گاڑی بچا کے کہا۔" اور امجد مجھے حیرت تو یہ ہے کہ پہلے یہ ایسی نہیں تھی۔"

" احتیاط سے رہتی تھی!"

" بڑی احتیاط سے۔ اب دیکھو نا میں اتنے سال سے جانتا ہوں۔ بے تکلفی ہے اس زمانے میں بڑی مشکل سے کبھی ایک آدھ اچٹتا ہوا بوسہ بھی دیا تو بہت۔ ورنہ بس اخلاق برتتی تھی۔ لیکن بڑی شرافت سے رہتی تھی۔ اصغر مرحوم تو اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔"

" ہاں مجھے معلوم ہے۔"

" اپنے ہاتھوں اس نے اپنی جان لی۔"

" جب تم اصغر کا ذکر کر رہے تھے تو میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر شیریں کی شادی اس سے ہو جاتی تو دونوں کی زندگی سدھر جاتی۔"

" ہاں۔ شاید۔"

ہارن بی روڈ پر روشنیاں کم ہو رہی تھیں۔

نذیر نے کہا۔" اس کا باپ انشورنس کا ایجنٹ ہے۔ ایسی کیا آمدنی ہوتی ہوگی۔"

" یہ تو شاید اس کا سوتیلا باپ ہے نا؟"

" ہاں سوتیلا۔ مجھے یقین ہے جب ہم تم اس کے یہاں ڈرائنگ روم میں باتیں کر رہے تھے تو وہ پردہ کے پیچھے بیٹھا ہوگا۔"

" یہ راج رتن بھائی کے ہاتھ پھنسی کیسے؟" امجد نے کہا۔

" معلوم نہیں، امجد کہاں کھانا کھائیں گے؟ ارجن ٹی نا چلتے ہو؟"

" چلو۔"

" ممکن ہے اسے راج رتن بھائی سے محبت ہو؟" امجد نے کہا۔

" ممکن ہے۔"

" لیکن میرے خیال میں تو یہ محض جواہرات کی چمک ہے۔ اکثر شریف لڑکیاں

جواہرات اور بنارسی ساڑیوں کی وجہ سے جوہریوں اور بنیوں کے ہاتھ گروی ہو جاتی ہیں۔"

"ممکن ہے۔" اور اس نے ارجن ٹی نا کے سامنے گاڑی روکی۔" دیکھا امجد مہرو کیسی جھوٹی ہے۔ کہہ رہی تھی مہاراجکمار راج بھوج کے یہاں کاک ٹیل ڈانس میں جا رہی ہوں۔ مگر اس کی گاڑی یہاں کھڑی ہے۔"

اتوار کے دن صبح کو لکھ پتی سیٹھ ہارون یعقوب جو بیجا پور کی طرف فولاد کی مصنوعات کا ایک کارخانہ کھول چکے تھے۔ اور امجد کے فولاد کے سامان کے کارخانے میں بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ ناشتہ کرکے آئے تھے۔ اس لیے صرف پھل کھائے اور چائے پی۔ ایک چیکو چھیلتے چھیلتے شیریں نیاز بھائی کا ذکر سُن کر کہنے لگے۔"

"ابھی بمبئی میں ویسی گرل نہیں ہے۔ ابھی تو جرا خراب ہو گئی ہے۔ پہلے بہت خبصورت تھی۔ ویری ویری بیوٹی فُل۔ مگر وہ بالکل بیکار ہے۔ وہ جیل میں ہے نا۔ ابھی یہاں تو یہ مشہور ہے کہ راج رتن بھائی اس کو رکھیلا ہے۔"

"اچھا تو یہ سچ ہے؟" امجد نے پوچھا۔

"یہ کیسا معلوم پڑے گا۔" سیٹھ ہارون یعقوب نے کہا۔" پن ہم ایسا سُنے لا ہے راج رتن بھائی جو لیرا اس کو قفل کُنجی میں رکھے لا ہے۔" پھر بڑی ہی فصیح انگریزی میں سیٹھ ہارون یعقوب نے بتایا کہ جب سے وہ راج رتن بھائی کی معشوقہ بنی ہے۔ وہ اس کو کہیں آنے جانے نہیں دیتا۔

"شاید اس کو بھی راج رتن سے عشق ہوگا۔" امجد نے کہا۔

"ہاں ممکن ہے۔" چائے میں دودھ ڈالتے ہوئے میجر نذیر نے کہا۔

"مَیں نے سُنا ہے راج رتن بھائی اچھا خاصا ہینڈسم آدمی ہے۔" میجر رشید نے اپنا سرویٹ تہہ کر کے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"اِدھر دیکھو مَیں ایک بات بولتا ہوں نا۔" سیٹھ صاحب نے اس رائے سے

قطعی طور پر اتفاق یا اختلاف کیے بغیر کہا۔" ہم بھی بہت سا چھوکری لوگ رکھا۔ اکھا بمبئی کو معلوم ہے۔ مگر عشق وشق ہمارا سمجھ میں نہیں آیا۔ اجی کپڑا دیتا ہے، کیا؟ بنارسی ساڑی ریشم، جارجٹ، زیور دیتا ہے۔ کیا؟ ہیرا جواہر، ایرنگ، بروچ، نیک لیس، بریسلٹ اور جو لڑکی جرا خبصورت ہے تو تھوڑے دن سواری کو موٹر دینا مانگتا۔ اچھا فلیٹ میں رکھنا مانگتا۔ بس راج رتن بھی ایسا کیے لا ہے۔ نہیں تو اکھی بمبئی میں ایک سے ایک خبصورت جوان ہے۔ شیریں ہمارے میجر نذیر پر کیوں نہیں مرے لا ہے۔ میجر نذیر تو راج رتن بھائی سے زیادہ خبصورت ہے۔"

" میں آداب بجالاتا ہوں۔" میجر نذیر نے کہا۔

" ہم جھوٹ نہیں بولتا۔ سچی بات بولنے منگتا۔"

" لیکن وہ کسی اچھے لڑکے سے شادی کیوں نہیں کر لیتی۔ اس طرح کسی کی رنڈی رہ کر رہنے میں وہ عزت تو محسوس نہیں کرتی ہوگی۔" امجد نے کہا۔

انگریزی میں فلسفیانہ انداز سے سیٹھ ہارون یعقوب نے جواب دیا۔" اب وہ بدنام ہو چکی ہے۔ اس سے شادی کون کرے گا۔ اب بہت دیر ہو چکی ہے۔"

" بے شک۔" میجر رشید نے سر ہلایا۔ اور خلالوں کا ڈبہ میجر نذیر کی طرف سرکا دیا۔

سیٹھ ہارون یعقوب نے اُردو میں پھر تشریح شروع کی۔" ہم آپ سے بولتے اس کا باپ چھوٹا انشورنس ایجنٹ۔ صبح سے شام تک چکر کرے لا ہے۔ پھرے لا ہے مرے لا ہے۔ تو چار پیسے کمائے لا ہے۔ اور لڑکی ویک آئی میں فنیشن ایبل بنے لی ہے۔ اجون ریس کورس، تاج محل، ولنگڈن کلب، جوہو میں خرچا کرنے کو پیسا کدھر سے آئیں گا۔ میرا تو ایسا دل بولتا کہ یہ اس کا سوتیلا باپ ہے نا۔ یہ شیخ، یہ اس کو بھڑائے لا ہے۔"

" دیوس۔"

میجر رشید معافی چاہ کے اٹھے۔ اور سیٹھ ہارون یعقوب نے امجد حسین سے مخاطب ہو کے انگریزی میں کہا۔" آپ کے یہاں گوداوری اسکیم میں اگر...."

اسی اتوار کو چار بجے جب امجد اور میجر نذیر شیریں نیاز بھائی کے مکان پر پہنچے تو دروازہ شیریں ہی نے کھولا۔ وہ گلابی رنگ کا غرارے دار لمبی پائنچے دار پاجامہ اور اسی رنگ کی قمیص اور اسی رنگ کی اوڑھنی اوڑھے تھی۔ اس سال بمبئی ریس کورس پر غرارے دار پاجامے بہت مقبول ہو گئے تھے۔ سب سے پہلے نرگس کو جدن بائی یہی غرارے دار پاجامے پہنا کے لائی۔ نرگس تو کھلے میدان میں غرارے دار پاجامے اور بلند قد اور پہلوان جیسے جسم کی نمائش کرتی پھرتی۔ کالج جانے والی شریف لڑکیاں اور وہ لڑکیاں جو ہندوستانی فلم اکثر دیکھ لیتی ہیں۔ اس کی طرف رشک سے دیکھ لیتیں۔ مگر جنگ سے پہلے ہر سال ولایت' اور دورانِ جنگ میں ہر سال کشمیر جانے والی لکھ پتیوں کی لڑکیاں ذرا معصوم سی حقارت اور بُعد سے تمام سینما ایکٹرسوں کی طرف دیکھتی ہوئی، اپنے اپنے باکسوں میں جا بیٹھتیں۔ جدن بائی اپنی لڑکی کے حُسن اور اس کی مقبولیت سے بالکل مطمئن ایک بنچ پر بیٹھی رہتیں۔ جہاں سے گھوڑ دوڑ کا آخری حصہ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ اور ان کے قریب پہلی مہارانی کتھا گڑھ پاندان کھولے ہندوستان بھر کے والیانِ ریاست کو بیٹھی دعائیں دیتی رہتیں۔ اور مہارانی صاحبہ کے والد ماجد، حنائی ریش، انگرکھے اور دوپلی ٹوپی، میں ہر اس شخص کو جوان کی غیر معمولی شخصیت سے واقف نہیں تھا۔ استاد جی معلوم ہوتے۔ نرگس کو دیکھ دیکھ کر اور کچھ اور ناکتخدا لڑکیوں کو، جن کا تعلق غالباً یو۔پی اور پنجاب سے تھا یہ ہمت پڑی کہ اگلے ہفتے ریس میں غرارے دار پاجامے پہن کے آئیں۔ پھر کچھ بوہرہ لڑکیاں اس لباس میں آئیں اور پھر یہ لباس چل نکلا۔ یہاں نہیں، ویرانے، جو اسی سال "شکاری" میں نام پیدا کر کے مشہور ہو چلی تھی اور جس سے محسن عبداللہ ذرا اچھے سے نینا کی وہی بُش شرٹ پہنے نینا کا غم غلط کر رہے تھے ___ ویرا نے لباسِ شب خوابی پر دوپٹہ اوڑھ کر ریس کورس کو زینت بخشی۔ افسوس کہ یہ لباس چل نہ سکا۔

شیریں نے نذیر سے ہاتھ ملایا۔ لیکن امجد کو محض ایک شفقت آمیز تبسم سے اجنبیوں کی طرح خوش آمدید کہا۔ جس سے وہ جل بھُن کر رہ گیا ہوگا۔ مگر کسی کے دل اور اخلاق پر کسی اور کو کیا اختیار۔ شیریں کی ماں نے البتہ ہاتھ ملایا۔

دفعتاً سامنے کے کمرے کے دروازہ کا پردہ سرکا۔ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی برآمد ہوا۔ جو یقیناً بی جی شیخ تھا۔ لڑکی کا سوتیلا باپ۔ اور امجد کو معاً خیال آیا کہ نذیر کا کہنا ٹھیک تھا۔ اس سے پہلے جب ہم دونوں یہاں تھے تو وہ یقیناً اس پردے کے پیچھے بیٹھا ہوگا۔

شیریں نے دونوں سے اس کا تعارف انگریزی میں یہ کہہ کر کرایا۔ "یہ ڈیڈی ہے"۔ "ڈیڈی" کی موجودگی میں نذیر نے شیریں کے ساتھ وہ بے تکلفی نہیں برتی۔ نہ اس کا ہاتھ کئی کئی منٹ کے لیے اپنے ہاتھ میں لیا۔ نہ اس کی طرف محبت سے آنکھیں جھپکا کے دیکھا۔ نہ چھیڑ کے لیے اس کے کسی چاہنے والے کا ذکر کیا۔

جوں جوں کباب، پکوڑیاں، سنبوسے، بُھنے ہوئے پستے، سیو دال، اور پھر کیک کی گردش ہوتی گئی گفتگو سنجیدہ سے سنجیدہ تر ہوتی گئی۔ زیادہ تر سیاسیات۔ "پہلے انگریزوں کو نکالو۔ ہندو مسلمان راجاؤں، مہاراجوں، سیٹھوں، ساہوکاروں کی عزّت ہم پر فرض ہے۔ لیکن انگریزوں کی نہیں"۔ مسٹر بی جی شیخ نے دُہرایا۔

"لیکن انگریزوں کی نہیں"۔ امجد کی طرف پیسٹری کی پلیٹ بڑھاتے ہوئے مسز نیاز بھائی نے کہا۔ عجیب بات تھی اپنے دُوسرے اور زندہ شوہر کے نام پر شیریں کی والدہ مسز شیخ نہیں کہلاتی تھیں۔ مگر اپنے مرحوم شوہر یعنی شیریں کے والد کے نام پر ابھی تک مسز نیاز بھائی مشہور تھیں۔ یہ غالباً زر یا شاید حسن کے زور کا اثر تھا۔ لڑکی کی حیثیت اس خاندان میں مرکزی تھی۔

میجر نذیر نے اس سیاسی مسئلے پر کوئی رائے دینی مناسب نہ سمجھی۔ اس نے دیکھا کہ شانے کے قریب مسٹر بی جی شیخ کے سوٹ کو کیڑوں نے کاٹ کے ایک چھوٹا سا چھید بنا دیا ہے۔ اور استری کا کپڑا جو نظر آرہا ہے بہت بوسیدہ ہے۔ اس کا سُوٹ کم سے کم دس سال پُرانا ہے۔ اور اس نتیجہ پر پہنچ کر میجر نذیر نے اپنے پوپ اینڈ بریڈلے کے سِلے ہوئے پتلون کی کریز ٹھیک کی۔ اور مسٹر شیخ اور ان کی بیوی کی سیاسی رائے کا جواب محض ایک با اخلاق ہنسی سے دیا۔ "ہی ہی ہی"۔

امجد، فولاد کے کارخانے کا مالک، مکار، اشتراکیت بگھارنے لگا۔ شیخ صاحب میں انگریزوں سے نسلی تعصب کا قائل نہیں۔ دیکھیے نا۔ اگر انگریز مہاجن کی جگہ ہندوستانی مہاجن لے لے۔ تب بھی وہی بات ہوگی۔ غریب ہندوستانی نئے مہاجن کا غلام بن جائے گا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہندوستانی مہاجن کے راج میں آپ کو محنت کے معاوضے میں پیٹ بھر کھانا ملے گا۔"

پھر ہمت کر کے شیخ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے امجد نے بیدردی سے وار کیا "کیا ہندوستانی مہاجن کے راج میں آپ کی لڑکیوں کی عصمت اور عزت محفوظ رہے گی؟"

مسٹر بی جی شیخ کسی مجرم مریض کی طرح تلملا گئے۔

امجد نے آخر میں کہا۔ "اصلی راج مزدور کا راج ہے۔"

میجر نذیر پتلون کی کریز درست کر کے پھر ہنسے۔ "ہی ہی ہی۔ مسٹر نیاز بھائی میرے دوست امجد حسین بڑے پکے اشتراکی ہیں۔ یہ لندن اسکول آف اکنامکس میں پڑھنے کا اثر ہے۔ وہاں ایک بڑا مشہور پروفیسر ہے۔ کیا نام ہے اس کا امجد لاسکی؟ — لاسکی؛ لاسکی، لاسکی تو شاید حیدرآباد میں ہم لوگ ریڈیو کو کہتے ہیں۔ یہ لاسکی کا اثر ہے۔ ممکن ہے ایک دن امجد اپنی فیکٹری مزدوروں کے نام منتقل کر دیں۔ ہی۔ ہی۔ ہی۔ مگر یہ تو ذرا مشکل ہے.... یقیناً یو شیریں مجھے تلے ہوئے مٹر بہت پسند ہیں۔"

چلتے وقت مسٹر بی جی شیخ نے حیدرآباد کے تقریباً ایک درجن امراء اور اعلیٰ قدر اعلیٰ عہدیداروں سے اپنی قریبی رشتہ داری یا دلی دوستی اور بے تکلفی کا تذکرہ کیا، اور اس کے بعد میجر نذیر سے بھی خواہش ظاہر کی کہ وہ بھی مذکورۂ بالا امراء اور عہدہ داروں کے حلقہ میں شامل ہونے کے باعث اخلاقی طور پر مجبور ہیں کہ بیمہ اور انشورنس کے کاروبار میں مسٹر شیخ کی مدد کریں۔

جس کا میجر نذیر اور امجد دونوں نے پختہ وعدہ کیا۔

اگلے ہفتے، گھوڑ دوڑ میں نذیر اور امجد پرانے بابیوں سے "ٹپ" پوچھتے پھر رہے تھے۔ ممبروں کے احاطے میں باکسوں کے اس سائبان کی طرف جہاں گھوڑے پھرا کے دکھلائے جاتے ہیں۔ بمبئی کا پورا فیشن ایبل طبقہ، عورتیں اور مرد چکر لگا رہے تھے۔ بیٹھے ہوئے تھے۔ کھڑے ہوئے کسی بورڈ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یا اپنے جیتے ہوئے ٹکٹوں کے روپے لینے قطار در قطار

کھڑے تھے۔ جہاں ہزاروں کے وارے نیارے ہو رہے تھے۔ وہاں دو تین سیٹھ بھی تھے۔ اپنے مارواڑی ٹھاٹھ میں۔ زری کی ٹوپی اور ململ کی دھوتی۔ گیبرڈین کا کوٹ اور سفید پتلون پہنے دھوپ کی عینک لگائے۔ ایک نوجوان نے اپنی ساتھی نوجوان عورت سے کہا "بلیک برنس وِن۔ چکورتی پلیس"۔ اس کے ساتھ جو نوجوان عورت تھی۔ ..... اس کے بال سیاہ تھے۔ بلاؤز ذرا گہرا سُرخ تھا۔ ہونٹوں کی لپ اِسٹک کی سُرخی اس سے ذرا مدھم تھی اور ساڑی ہلکی کریم سبز رنگ کی تھی۔ تین لڑکیاں۔ تینوں سَر ایوب خاں کے خاندان کی۔ کالے کالے لباس، گورے گورے رنگ، مازندرانی خدوخال سامنے سے گذر گئیں۔ ایک لڑکی زرد رنگ کی بنارسی ساڑی پہنے، شانوں پر کالے کٹے ہوئے بال بکھرائے۔ پژمردہ اور تھکی ہوئی سی۔ دو سنجیدہ لیکن خوش خوش، شلوار پوش لڑکیوں سے آہستہ آہستہ میٹھی باتیں کر رہی تھی اور اس کے سر پر درخت کی گھنی چھاؤں تھی۔ سامنے سے لوگ فلیٹ ٹوپیاں پہنے، عورتیں رنگا رنگ کی ساڑیاں پہنے، تیتریاں، ہزاروں کی تعداد میں آ اور جا رہے تھے۔ ایک خوبصورت سی انگریز عورت گذری جس کا فراک ساری کی نقل تھا۔ سیاہ بلاؤز اور لال جھالر۔ ایک لڑکی گجراتی میں ہنستی ہوئی باتیں کرتی آ رہی تھی۔ "اگر میں اسی طرح ہارتی رہی ... آہا آشا" اور آشا ٹھٹھک کے کھڑی ہو گئی۔ چاکلیٹ کی زمین پر ریشم کے بڑے بڑے کنول کے پھول، چہرے پر میکس فیکٹر اور آنکھوں پر دھوپ کی چوڑی سی عینک اور اس کا نصف اِنچ موٹا فریم"۔ میر دولا..... چکوری ... ... سنی سائیڈ"..... "میں تو عرب ڈرابی کے دن ضرور آؤں گی"۔

ہر ہائی نس بیگم آغا خان۔ نئی بیگم آغا خان خراماں خراماں ٹہل رہی تھی۔ بلند قامت، باوقار۔ ہلکی نارنجی رنگ کی ساری پہنے۔ ان کے ساتھ ایک اور خاتون اور ایک سکریٹری، اے، ڈی، سی دونوں ہمرکاب۔ بیگم آغا خان۔ سراپا تمکنت، وقار، تبسم، "باجپائے۔ باجپائے۔۔" نذیر احمد نے پُکار کے کہا۔

راجہ باجپائے نے گھوم کے دیکھا "نذیر؟ ... ... ابھی آیا ... ... ابھی ذرا کبی سے ٹپ لے کے۔ تم تو زیادہ نہیں کھیلتے نا۔ یہ دیکھو نمبر ۷۔ برنرڈشٹ اچھا گھوڑا۔ ... اجی نہیں آؤٹ سائیڈ رہے۔ تو اس سے کیا۔ مجھے اس کے ٹرینر نے کہا مہاراجہ کشکش اسے اسی لاکھ میں خریدنا

چاہتے ہیں۔ وِن نہیں تو پلیس تو یقینی ہے۔... ... اچھا ابھی آیا۔"

کھانس کے راجہ باجپائے نے زمین پر تھوکا۔ اور اِدھر جہاں گھوڑے گھمائے جا رہے تھے۔ غائب ہو گئے۔ گذشتہ ریس کا کپ دیا جا رہا تھا۔ بیگم صاحبہ رشید النظفر کپ دے رہی تھیں۔ نذیر احمد تو اِدھر دیکھ رہا تھا۔ امجد چُپکے سے اُتر آیا۔ اور فیشن ایبل مجمع کو دیکھتا ہوا پھر آوارہ گردوں کی طرح پھرنے لگا۔ وہ موٹی سی ذرا گرم سی انگریز عورت جس نے اس سکھ سے شادی کی تھی۔ کمبخت بلا ناغہ ہر میٹنگ میں آتی ہے۔ اس کے موٹے تازے چہرے مصنوعی جنجر کے رنگ کے بالوں اور سُنہری ساڑی پر نظر پڑنا ضروری ہے۔ آج سُنہری کمخواب ... ..." اور یہ حشرات الارض ان کو معلوم نہیں۔ ممبروں کے احاطے کے ٹکٹ کیسے مل جاتے ہیں۔ نو دو لیتے یا سٹہ کھیلتے ہیں، یا فلم کمپنیوں سے خرید کر تھیٹروں کو بیچتے ہیں۔ کمبختوں کو کوئی اچھے گھرانے کی لڑکی نہیں ملتی۔ تو ان ایکسٹرا لڑکیوں کو رنڈیوں کو اُٹھا لاتے ہیں۔ جوتے کے ایک بڑے متموّل سوداگر نے یہ الفاظ اپنے ساتھی سے کہے اور امجد نے اس گروہ کی طرف دیکھا جس کے متعلق یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ لڑکی جو ساتھ تھی اس کے لبوں پر سستی، گہری سُرخی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔ اور راتوں کے جاگنے سے پلکیں بوجھل تھیں۔ مگر یوں بُری نہ تھی۔

گھنٹی بجی اور ریس شروع ہوئی۔ راجہ باجپائے کی پیشین گوئی غلط نکلی۔ برنرڈشا بارا اور بلیک پرنس جیتا۔ فیوریٹ کے جیتنے سے ملتا ہی کیا ہے۔ بس ایک دو روپے اور کیا۔ اور جب وہ قطار میں اپنی جیت کے پیسے لینے کھڑا تھا تو اس نے اپنے سیدھے جانب دوسری قطار میں میجر رشید کو شیام نرائن سے باتیں کرتے دیکھا۔

"شیام نرائن یہاں بھی موجود" امجد نے اپنے دل میں کہا "مگر یہ خبیث رشید اس سے میرا تعارف نہیں کرائے گا۔"

شیام نرائن کا رنگ ذرا سانولا اور قد بلند تھا۔ لیکن اس کی تینوں لڑکیاں سرخ و سفید، میانہ قد اور بڑی حسین تھیں۔ امجد شیام سے منصوری میں ملا تھا۔ مگر کچھ ایسی تلخ سیاسی بحث ہوئی تھی کہ رشید نے اسے ایک بہانہ بنا لیا اور شیام نرائن کی لڑکیوں سے کبھی امجد کا تعارف

نہیں کرایا۔

ایک مرہٹہ لڑکی فیروزی رنگ کی ساری پہنے، اپنے پیسے لے کے واپس لوٹی۔ رشید بدستور شیام نرائن سے باتیں کر رہا تھا۔ اور بار بار امجد کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اس کے بعد جو ریس ہوئی اس میں سامنے کے سبزے پر کھڑے کھڑے نذیر نے پلٹ کے جو دیکھا تو بکسوں والے سائبان کے نیچے کی نشستوں میں ایک ذرا بدصورت سی پارسی لڑکی تنہا بیٹھی تھی۔

"شیریں۔" نذیر اس کا نام لے کے اس کے پاس جا بیٹھا۔

امجد نے پلٹ کے دیکھا۔ یہ شیریں نیاز بھائی نہیں تھی۔ بلکہ وہ پارسی شیریں تھی جس سے وہ پہلے مل چکا تھا۔

وہ بھی پارسی شیریں کے دوسرے جانب کرسی پر بیٹھ کے باتیں کرنے لگا۔ سب ڈیول ہی پر کھیلنا چاہ رہے تھے۔" اتنا ہاٹ فیورٹ ہے۔ کیا دے گا۔ ایونز تو ہو ہی چکا ہے۔"

لیکن چونکہ ڈیول ہی محفوظ تھا۔ امجد نے ڈیول کے لیے دس روپے نذیر کے حوالے کیے۔ نذیر خود بھی ڈیول ہی پر ٹکٹ لینے کے ارادے سے اٹھا۔ اور امجد اگرچہ کہ پارسی شیریں سے باتیں کر رہا تھا۔ لیکن اس کی نظریں میجر رشید پر لگی ہوئی تھیں۔ جو شیام نرائن کی تینوں حسین لڑکیوں سے ہنس ہنس کے باتیں کر رہا تھا۔

پھر معلوم نہیں رشید کو کیا شرارت سوجھی۔ وہ امجد اور شیریں کے پاس پہنچا۔ اور امجد سے کہا شیام نرائن جی تمھیں بلا رہے ہیں۔ چلو شیام نرائن جی اور ان کی لڑکیاں تو معلوم نہیں کہاں غائب ہو گئے تھے۔ لیکن رشید نے امجد کو لے جا کے مہارانی صاحبہ کتھاگڑھ کے والد ماجد کے پاس لا بٹھایا، جو اپنی حنائی ڈاڑھی میں کنگھی کر رہے تھے۔ اور آلتی پالتی مارے بینچ پر بیٹھے کبھی اپنی صاحبزادی اور کبھی جدن بائی سے اپنی سب سے چھوٹی پوتی کے حسن کی تعریف کر رہے تھے۔ امجد کو انھوں نے بڑے تپاک سے بٹھالیا اور پھر رشید کہیں غائب ہو گیا۔ کوئی آدھے گھنٹے کی مسلسل کوشش کے بعد، امجد، مہارانی کتھاگڑھ کے والد ماجد کی سرپرستانہ اور

مشفقانہ گفتگو سے پیچھا چھڑا کے بھاگا۔

ایک سانولی سی لیکن بڑی ملیح صورت، چھریرے بدن کی عورت انوکھے ڈیزائن کی بڑی ہی خوبصورت ساڑی پہنے کسی طرف سے آ کے راسے کے قریب کھڑی ہو گئی۔ تین اسٹاف آفسر جھک کر آداب بجالائے۔ تین اے ڈی سی تعظیماً سر جھکا کے ذرا ذرا فاصلے پر کھڑے ہو گئے۔ اس نے کسی اسٹاف آفسر سے کچھ پوچھا اس نے جواب دیا۔ "نہیں یور ہائی نس۔" پارسی امیرزادیوں نے بے تعلق ہو کر یہ منظر دیکھا۔ اور بے پروا "وِن" کے ٹکٹوں کی کھڑکیوں کی طرف چلی گئیں۔ پھر وہ ملیح خوبصورت مہارانی سیڑھیوں کی طرف گئی۔ نذیر نے امجد کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "جانتے ہو کون ہے۔"

"نہیں۔"

"مہارانی پیپل نگر۔ چھوٹی مہارانی۔"

"اچھا۔ وہی جو پیشوا زیور کے راجہ کی بیٹی تھی۔"

"جس کی شادی امرت نگر کے تیسرے راجکمار بھرت چندر سے ہوئی۔ پھر اس سے طلاق لے کے یہ مسلمان ہو گئی۔ اور اس نے ہمارے تمہارے دوست سیٹھ یعقوب ہارون سے شادی کی۔"

"نہیں جی۔"

"سیٹھ یعقوب ہارون کو کیا سمجھتے ہو۔ کروڑ پتی تھا۔ رحیم بھائی کے ساتھ تباہ ہوا۔ اب بھی اس کے پاس دو تین کروڑ تو آسانی سے نکل ہی آئے گا۔ پھر جب جنگ شروع ہوئی تو سیٹھ یعقوب ہارون کو اس ری کلیمیشن والے جھگڑے میں پھنسا کے نکل گئی اور ایک امریکن کپتان سے شادی کی اس کا نام میں بھولتا ہوں۔ پھر آخر اسے بھی چھوڑا۔ اور گذشتہ سال یہیں ریس کورس پر میں اس کا اور مہاراجہ پیپل نگر کا رومانس دیکھا کرتا تھا، اب بڑی مہارانی تک اس سے کانپتی ہے۔"

آگے "وِن" کے کھمبے کے قریب رشید شیام نرائن جی اور ان کی تینوں لڑکیوں سے باتیں کر رہا تھا۔ امجد نے نذیر سے کہا۔ میں اس شیریں کے پاس بیٹھا تھا۔ جب یہ رشید

مجھے اٹھا لایا۔ تم کسی ترکیب سے جا کے اس کو ان لوگوں کے پاس سے ہٹا لاؤ۔ نذیر نے جا کے رشید سے کہا "بھئی بیگم پارہ تمھیں پوچھ رہی تھیں۔ تم ان سے ملے ہو نا؟" رشید کہتا ہی رہا "میں نے ریس کورس تو کیا کبھی سینما میں بھی بیگم پارہ کی صورت نہیں دیکھی" لیکن نذیر اسے زبردستی لے ہی آیا۔

گھوڑے جیتتے اور ہارتے رہے۔ انسان شرطیں لگاتے اور پچھتاتے رہے۔ عورتیں اپنی ساڑیوں اور میکس فیکٹر کی کریموں، پاؤڈروں اور لبوں پر لگانے کی سرخیوں کی نمائش کرتی رہیں۔ اُدھر دیکھو اشوک کمار جودھ پوری کوٹ پہنے بیٹھا ہے اس کو جانتے ہو وہ کون ہے۔ روزنتھال ہے۔ جوہری فرانسیسی یہودی مہاراجہ کشمیر کا بڑا دوست ہے۔ انگریز سپاہی خاکی یونیفارم پہنے "وِن" کے کھمبے کے قریب کٹہرے سے لگے کھڑے ہیں۔ اور وہ جو لڑکی ہے، وہ مشہور سنیما ایکٹرس ہے، دیکھو اس کی پیٹھ ننگی ہے، اور کیسی تنگ چولی پہنے ہے۔ دو ملازمین ترکی ٹوپی، سفید کوٹ اور نیکر پہنے کھڑے ہیں۔ وہ احاطے کے اندر کیسے آ گئے؟ وہ تیس سال کی دو عورتیں چلی جا رہی ہیں۔ رفتار اور اُونچی ایڑی کی وجہ سے ان کی کمر لچک رہی ہے اور ہوا ان کی ہلکی جارجٹ کی ساڑیوں کے پلّو اڑا رہی ہے۔ وہ دیکھو گندمی رنگ، چہرے پر داغ۔ شارک اسکن کا کوٹ، گلے میں دُوربین۔ موتی لال ایکٹر کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔" بڑا مسخرا ہے۔ اس دن جب میں نے اسے ٹیلیفون کیا، اس نے میری آواز نہ پہچانی اور پوچھا کون ہے۔ میں نے کہا۔ فلموں میں نوکری کرنا چاہتا ہوں۔ کہنے لگا میں کیا کروں۔ میں نے کہا۔ مدد کیجیے۔ بڑی مشکل سے آپ کا ٹیلیفون نمبر ڈھونڈا ہے۔ موتی لال نام کے بمبئی میں جتنے آدمی ہیں۔ سب کو ٹیلیفون کر چکا ہوں۔ ورنہ آپ کا سراغ کیسے ملتا۔ کہنے لگا۔ غلط نمبر ملایا ہے میں موتی لال ایکٹر نہیں، موتی لال مسالے والا ہوں۔ کیا لیجیے گا۔ ہینگ یا زعفران؟ اور یہ کہہ کے ظالم نے ٹیلیفون کا ریسیور رکھ دیا۔" یہ کہہ کے دادِ طلب نظروں سے شیام نرائن جی نے رشید کی طرف دیکھا۔

چونکہ اِن کی لڑکیاں اس مذاق پر خوش ہو کے ہنس رہی تھیں، رشید نے ہنسنا ضروری سمجھا۔

گھوڑ دوڑ ہوتی رہی۔ ایک اینگلو انڈین گلے تک بند گیبرڈین کا سُوٹ پہنے ہاتھ

میں دُور بین لیے پھر رہا ہے۔ نہیں یار یہ اینگلو انڈین نہیں یہ تو ارباب ہے۔ فرنٹیئر ارباب جی۔
یہ ایک پنجابی لڑکی کا تبصرہ تھا، جو ابھی ارباب خاں سے باتیں کر رہی تھی۔ خود لمبی تڑنگی، بال ترشے ہوئے لیکن بالوں میں سینکڑوں پنیں۔ پُرانی وضع کے کرن پھول، ناخنوں پر گہری سُرخ پالش لگائے، سیاہ زمین کی ساڑی پر۔ سفید سُرخ، زرد پھول، اور اس کے ساتھ یہ غالباً اس کا شوہر اور ارباب سے ناواقف۔ اور ادھر یہ صاحب جو اپنی کتاب پر گھوڑوں کو دیکھ دیکھ کر نشانات لگا رہے ہیں۔

یہ جو سبز سرج کا سُوٹ پہنے فلیٹ ہیٹ لگائے، مینڈک کی سی آنکھیں نکالے چلے آ رہے ہیں۔ گنگنا نگر کے مہاراجکمار ہیں۔ اِدھر دیکھو اس گجراتن کی جالی کی ساڑی تو دیکھو اور وہ دوسری بھی۔ گجرات کے حُسن کے ہم بڑے قائل ہیں۔ پنجاب اور گجرات۔ ورنہ دوسرے صوبوں میں اگر حُسن ہے تو نمک نہیں۔ یا نمک ہے تو بس نمک ہی نمک۔ دیکھو تیسری مہارانی پیپل نگر مہاراج کے پاس کس شان سے بیٹھی ہے۔ اُدھر مہاراج شیرو نا ہیں ادھر وہ دیکھو یہ ایک میل کی ریس ہے۔

وے گے بانڈ کنگ۔ وے گے بانڈ کنگ۔ سلطانہ، سلطانہ۔ کم آن سلطانہ۔ کم آن جنجر بیر۔ کم آن۔ وے گے بانڈ کنگ۔ کم آن۔ کم آن سلطانہ۔ وے گے بانڈ کنگ۔ کم آن سلطانہ۔ سلطانہ اور پھر تالیاں ہی تالیاں۔

دروازے کے قریب زمین پر بے تکلفی سے تھوک کے راجہ باجپائے نے کہا۔" نذیر یار مت پوچھ میں تین ہزار روپیے ہارا۔ دو ہزار تو صرف وے گے بانڈ کنگ پر ہارا۔ کیا گھوڑا مار کھا گیا۔ بس دو ہیڈ سے۔ خیر سویپ سٹک میں ضرور جیتے گا۔۔۔۔ ہلو راج رتن۔۔۔ راج رتن۔۔۔۔ تم نذیر سے واقف ہو۔ میجر نذیر۔ راج رتن بھائی جویلر۔ نمستے بھابھی جی۔"

امجد نے جو نذیر کے ساتھ تھا، راج رتن بھائی کی طرف غور سے دیکھا۔ گورا رنگ، لمبی سی ناک، آنکھیں بڑی بڑی اور خوبصورت، سر کے بالوں میں کہیں کہیں سفید ڈورے۔ اُوپر کا دھڑ لمبا۔ نیچے کا مقابلتاً چھوٹا۔ ململ کی قمیص کے اندر بنیان، ململ کی دھوتی، سر پر گاندھی ٹوپی۔

اور ان کی شریمتی جی جو ہاتھ جوڑ کے راجہ باجپائے کو نمستے کر رہی تھیں۔ وہی گجراتن تھیں جن کی جالی کی ساڑی امجد کو پسند آئی تھی۔ ماتھے پر سہاگ کا چمکتا ہوا تارہ۔ کندن کی دمک۔ رنگ بہت

زیادہ گورا نہیں۔ مگر ملیح۔ یوں بظاہر دیکھنے میں شیریں سے بھی کہیں کم عمر۔ ایک بڑی سی پیکرڈ میں راج رتن بھائی اور ان کی شریمتی جی بیٹھ گئیں۔

راجہ باجپائے کسی اور سے اپنی تین ہزار کی ہار کا ذکر کرنے لگے۔ امجد نے آہستہ سے نذیر سے کہا: "یہی تھے راج رتن بھائی جوہری؟"

"ہاں۔"

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ ان کی شادی ہو چکی ہے۔"

"ہو چکی ہے۔"

"تو پھر شیریں؟"

راجہ باجپائے اب پھر نذیر کی طرف مخاطب ہو گئے تھے۔ "شیریں؟ کیا؟"

امجد نے کہا: "میں پوچھ رہا تھا کہ راج رتن بھائی کی شادی ہو چکی ہے۔ پھر شیریں کا کیا ہوگا؟"

راجہ نے کہا: "ابھی شادی تو راج رتن کی اب ہوئی ہے۔ کوئی دو مہینے ہوئے اور شیریں اس کے پاس سال بھر سے ہے۔ شیریں سے بیاہ کیسے ہو سکتا ہے جی بیوی تو اپنی ذات کی دیوی چاہیئے اور یہ شیریں تو ..... یوں ہی ..... کیا بتاؤں نذیر پچھلے ہفتے دو ہزار جیتا تھا۔ اس مرتبہ تین ہزار ہارا۔" اور اچھی طرح کھنکھار کر راجہ باجپائے نے اپنی حلق صاف کی۔

○○

پگڈنڈی

۱۹۳۷ء کی بین الاقوامی نمائش کے زمانے میں پیرس پر عجیب بہار تھی۔ یوں تو پیرس ہی کا حسن کیا کم ہے مگر اس زمانے میں تو اس حسن کو چار چاند لگ گئے تھے۔ دریائے سین کے دونوں کناروں پر تروکاویرو سے لے کر مینار الفیل تک اور اس سے بھی آگے ایک نیا شہر آباد ہو گیا تھا۔ ہر ملک کا محل، دیکھنے والوں کو اس ملک میں آنے کی ترغیب دینے کے لئے نئی نئی جدتوں سے سجا ہوا تھا۔

روس اور جرمنی کے پویلین آمنے سامنے تھے۔ روس کے پویلین پر ایک مرد اور ایک عورت کے شاندار مجسمے ہتھوڑا درانتی لئے گویا جرمنی سے مقابلہ کرنے کے لئے بڑھ رہے تھے۔ ادھر جرمن پویلین کا عقاب ایک شان استغنا سے پر پھیلائے گردن موڑے نازی سواستکا کو پنجوں میں لئے ہوئے، روسی ہتھوڑے اور درانتی کا جواب بے پروائی اور بے نیازی سے دے رہا تھا۔

یہ منظر ہونے والی جنگ کا نقشہ کھینچ رہا تھا۔ برطانیہ اور اطالیہ کے پویلین دور تھے، روس اور جرمنی کے اس مقابلے کو دیکھ کر ان دو ملکوں کی طرف بھی کبھی کبھی خیال جاتا تھا، اور فرانس میں تو نمائش تھی ہی۔

ان خیالات میں غرق آزاد نے پہلے جرمن پویلین دیکھا اور اس میں وہ چیزیں دیکھیں جنہیں جرمن تمدن سے بظاہر زیادہ تعلق معلوم نہیں ہوتا تھا۔ لیکن بہرحال وہ

جرمنی میں صرف چند مہینے رہا تھا۔ ہاں جو جنگی نغمے زور شور کے ساتھ اس پویلین میں گرج رہے تھے' ان سے اور عقابوں اور سواستکا کے نشانات سے آزاد ضرور مرعوب ہوا۔

اس کے بعد جب وہ روسی پویلین میں پہنچا' تو وہاں اسٹالن کی تصویر دیکھی۔ مزدوروں کی موٹر دیکھی اور اسی قسم کی بہت سی چیزیں جو ایک طرف تو دیکھنے والے کو روس کی سیاحت کی دعوت دیتی تھیں اور دوسری طرف طرح طرح سے اشتمالی طرز حکومت کی کامیابی کا پروپیگنڈا کر رہی تھیں۔

آزاد اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ بین الاقوامی نمائش دراصل ایک عالی شان ایجنسی ہے۔ سیاحت کا شوق دلانے کے لئے صرف روس کے ہتھوڑے درانتی اور جرمنی کے عقاب حقیقت کی جھلک دکھا رہے تھے۔ وہ ایک ایسی جنگ کی پیشن گوئی کر رہے تھے جو ہونے والی ہے۔

بہرکیف آزاد ان دونوں جنگجو قوموں کے محلوں سے نکل کر جاپان' انگلستان' مصر' کناڈا' ممالک متحدہ امریکہ' سویڈن' ناروے وغیرہ کے پویلین دیکھتا رہا اور باقی کو دوسرے دن کے لئے ملتوی کر کے تروکاویرو واپس پہنچا۔ یہاں اونچے چبوترے سے اس نے نمائش کے میدان پر نظر دوڑائی۔ شام ہو چکی تھی اور چاروں طرف روشنیوں کا وہ طوفان تھا جو اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ عمارتوں کے اس ہجوم میں ایفل مینار اور بھی زیادہ حسین معلوم ہو رہا تھا۔

اس نمائش میں اس نے ہر پویلین میں' راستوں میں' نمائش کی عجیب و غریب گاڑی میں' نمائش گاہ کے ہوٹلوں میں' قہوہ خانوں میں' ایسی ایسی عجیب و غریب حسن و جمال والی لڑکیاں دیکھیں جو اس نے آج تک اس طرح یکجا کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ امریکن لڑکیاں طرح طرح کے فیشن ایبل لباس پہنے ہنستی' امریکن لہجے میں باتیں کرتی جاتی تھیں۔ انگریز لڑکیاں جنہیں سنجیدگی کی تعلیم بچپن سے دی جاتی تھی' پیرس کے اثر سے ذرا کھل کر ہنس بول رہی تھیں۔ اسکنڈے نیویا کی سنہرے بالوں والی سادگی سے بے اختیار ہنسنے والی لڑکیاں۔ اطالیہ کی کالی آنکھوں' کالے بالوں والی عورتیں جن کو دیکھ دیکھ کر آزاد کو مشرقی حسن یاد آتا تھا۔ اسپین کی خانہ جنگی کی پناہ گزیں لڑکیاں' بعض اچھے کپڑوں

میں ---- جن کے والدین جنرل فرانکو کے طرفدار تھے ---- اور بعض خستہ حال ---- جو جمہوریت پسندی کی حامی تھیں۔

اس مجمع کو دیکھ کر آزاد نے ایک گہری سانس لی۔ کاش میرے ساتھ اس وقت میری کوئی دوست ہوتی۔ اس نے خیال کیا ییں کسی دوست کو کیوں نہ ڈھونڈ لوں۔

تروکا ویرو سے وہ پھر نیچے اترا اور نمائش کی بھیڑ میں گم ہو گیا۔ ڈھونڈھ رہا تھا کہ اسے کوئی لڑکی اکیلی مل جائے۔ یا زیادہ سے زیادہ دو لڑکیاں ہوں تو کسی ڈھب سے بات چیت شروع کرے۔

ایک گھنٹہ گزر گیا' اور اس نے ہار مان لی۔ اس نے کئی مرتبہ موقع اور بے موقع اشارے بھی کئے تھے' آنکھ بھی ماری تھی' "معاف کیجئے میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے" بھی کہا مگر کسی طرح کوئی کامیابی نہ ہوئی اور وہ دل برداشتہ ہو کر پھر تروکا ویرو کے راستے نمائش سے باہر نکلا۔

یوں تو پیرس میں کئی لڑکیوں سے اس کی دوستی تھی۔ مگر اس بار اسے ایک نئی دوست کی تلاش تھی۔ یوں تو تازہ بتازہ نو بہ نو کا اصول اسے ہر چیز میں پسند تھا' لیکن عشق و محبت کی حد تک تو آزاد کے لئے یہ زریں اصول تھا۔

اس لئے بجائے اس کہ کے وہ کسی پرانی دوست کو دوسرے روز نمائش میں اپنے ساتھ لاتا اس نے طے کیا کہ جس طرح ممکن ہو جلد سے جلد ایک نئی دوست ڈھونڈنی چاہئے۔ تاکہ نمائش دیکھنے کا دہرا لطف آجائے۔

چنانچہ دوسرے دن وہ "سو تے 'نترنا سیونال وزاتیو دیاں" گیا۔ یہ طلبا کی ایک بین الاقوامی انجمن تھی۔ آزاد عرصے ۔ تے ۔ کا ممبر تھا۔ لندن سے جب کبھی وہ پیرس آتا تو زیادہ تر وقت اسی کلب میں گزارتا۔ اس قلب میں اسے بہت سی کامیابیاں ہو چکی تھیں۔

وہ دو مہینہ کے بعد پیرس اور اس قلب میں آیا تھا۔ اس کے دوست اور شناسا جا بجا بیٹھے تھے۔ وہ "ہلو" "بوں ژور مدموزیل" "بون جورنو سینیورا" "ہلو" "بوں ژور" "دی گیت اس"۔ "اسلام علیکم یا اخی" "ہلو" "ہاؤ یو" "آپ بھی یہیں ہیں" "ہلو" کہتا ہوا' اور کبھی کبھی تبسم کا جواب تبسم سے دیتا ہوا' شناساؤں کو سر کے خم سے سلام کرتا ہوا سیکرٹری کی میز پر پہنچا۔ سیکرٹری کے ساتھ ایک اور لڑکی اسی میز پر بیٹھی چائے پی رہی

تھی۔ آزاد نے اس سے پہلے اس لڑکی کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔

سیکرٹری تقریباً چھبیس ستائیس برس کی عمر کی ایک فرانسیسی عورت تھی۔ اس نے اٹھ کر آزاد سے ہاتھ ملایا۔ اور ہنستے ہوئے اس سے پوچھا "پیرس کب پہنچے؟" اور اس کے بعد اسی لڑکی سے آزاد کا تعارف کرایا۔

"موسیو آزاد۔ آندو (ہندوستانی) مدموزیل ودال۔"

اس کے بعد سیکرٹری نے آزاد سے پوچھا "رودبار طوفانی تو نہیں تھی؟" یہ سوال اکثر رودبار کے اس پار انگلستان میں پوچھا جاتا ہے۔ سیکرٹری آزاد کو انگریز نہ سہی برطانوی تو سمجھتی تھی۔

ادھر ادھر کی دو تین باتوں کے بعد آزاد نے سیکرٹری سے کہا۔ "مدموزیل کا نام ودال ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ودال پر دوانس (جنوبی فرانس) کے ایک پرانے شاعر کا بھی نام تھا۔"

اس پر سیکرٹری نے ہنس کر کہا۔ "مدموزیل ودال بھی جنوبی فرانس کی رہنے والی ہیں۔"

مدموزیل ودال جو غالباً اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ ایک ہندوستانی سے بات کر رہی تھی، ہنس کر کہنے لگی۔ "میں جنوبی فرانس میں----- یونیورسٹی میں پڑھتی تو ضرور ہوں۔ مگر میرا وطن برگنڈی ہے۔"

"برگنڈی؟"

"جی موسیو۔ معلوم نہیں موسیو ہمارے چھوٹے سے ملک کے جغرافیہ سے اچھی طرح واقف ہیں یا نہیں۔ ہندوستان تو ایک چھوٹا سا برِ اعظم ہے۔"

"نہیں مجھے یورپ کی تاریخ کہیں کہیں سے یاد ہے۔ برگنڈی میں اٹیلا اور اس کے وحشی ہن ساتھیوں کو شکست ہوئی تھی۔ اس شکست کی اصلی وجہ تو آپ کو معلوم ہے؟"

مدموزیل ودال نے کہا۔ "عام تاریخی وجہ تو ہم سب کو معلوم ہے، لیکن شاید موسیو کو اور کوئی وجہ بھی معلوم ہو۔"

"جی ہاں۔" آزاد نے مسکرا کر کہا۔ "اٹیلا اور اس کے ساتھی برگنڈی کی عورتوں کے حسن کو دیکھ کر ایسے مبہوت ہو گئے کہ لڑنا بھول گئے۔ اسی وجہ سے ان کو شکست

ہوئی۔"

آزاد کے اس جواب کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اجنبی فرانسیسی لڑکی اپنے ہم وطنوں کی اور اس طرح بالواسطہ اپنے حسن کی تعریف سن کر ذرا خوش ہوئی، ہنس پڑی اور کھل کے باتیں کرنے لگی۔

مدموزیل ووال کے بال راکھ کے رنگ کے تھے، چہرہ ذرا لمبا تھا، مگر ناک نقشہ اچھا تھا۔ لبوں پر سرخی لگاتی تھی۔ دانت سفید اور شفاف تھے، اور جب ہنستی تو بھلی معلوم ہوتی۔ اس کو خوبصورت کہنا تو مبالغہ تھا مگر اچھی خاصی عورت تھی۔ جسم ذرا دبلا پتلا تھا۔ کپڑوں کی حد تک یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ زیادہ فیشن ایبل اور غالباً" امیر بھی نہیں۔ وہ ہلکے زرد رنگ کی جاکٹ پہنے ہوئے تھی۔ اگر وہ اچھے کپڑے پہنے ہوتی تو شاید اور زیادہ بھلی لگتی۔ مگر اس لباس میں بھی طالب علمانہ سادگی کی ایک کیفیت تھی۔

آزاد اور اس میں بہت جلد ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ پہلے تو ہندوستان کی سیاسیات کے متعلق، اس کے بعد ہسپانیہ کی خانہ جنگی کے متعلق۔ اسی اثناء میں سیکرٹری نے اسے ای وون کہہ کے مخاطب کیا۔ اس طرح آزاد کو معلوم ہو گیا کہ اس لڑکی کا پہلا نام ای وون ہے۔ اس کے بعد گفتگو کا رخ مغربی سیاسیات کی طرف پلٹا۔ اس نے آزاد سے کہا کہ وہ ایک مناسب حد تک "اشتراکیت" کی حامی ہے اور یہ سن کر آزاد پورا اشتراکی بن گیا۔ اور اس نے سرمایہ داروں فاشسٹوں اور رجعت پسندوں کی خبر لینی شروع کی۔ وہ وال اسٹریٹ کے سرمایہ داروں کی شان میں کچھ ارشاد کر رہا تھا کہ اس میز پر ایک اور نوجوان پہنچا۔ اور ای وون ووال نے آزاد سے اس کا تعارف کرایا۔

اس کو نوجوان کہنا صرف اس وجہ سے صحیح ہے کہ حقیقت میں اس کی عمر زیادہ نہیں تھی، اور وہ ای وون کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ لیکن اس کی صورت، اس کے شانوں کے بے وقت خم، اس کی چھوٹی آنکھوں اور لمبی ناک اور چوڑے دہانے کے عدم تعاون، اور اس کی مریل سی چال دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ جوانی بڑھاپا، دونوں نے ایک ساتھ اس نوجوان کی زندگی میں قدم رکھا۔

یہ بھی ای وون کی طرح السنہ قدیمہ کا طالب علم تھا۔ اور دونوں میں بہت پرانی اور خاندانی دوستی تھی۔ دو ہی چار منٹ کے بعد آزاد کو معلوم ہو گیا کہ اس رقیب سے ڈرنے

کی کوئی وجہ نہیں۔ اور نہ یہ اس کی راہ میں مزاحم ہونے کی اہلیت رکھتا ہے۔

آزاد کا خیال صحیح تھا۔ ای ودن اسی کی طرف متوجہ تھی اور اپنے پرانے دوست کی موجودگی بلکہ اس کی ہستی کو فراموش کئے ہوئے تھی۔

اب شام کے آٹھ بجے تھے' رات ہو رہی تھی۔ چائے کی نشست ختم ہو رہی تھی اور کلب کے ممبر دو دو تین تین کی ٹکڑیوں میں رات کا کھانا کھانے' یا سینما جانے' یا سیر کرنے یا نمائش دیکھنے کے لئے رخصت ہو رہے تھے۔ میمبروں کی ایک پارٹی کسی سوشلسٹ جلوس میں شریک ہونے جا رہی تھی۔ اس پارٹی کی لیڈر ایک بڑی خوبصورت فرانسیسی لڑکی تھی۔ جو مصر کے کسی فرانسیسی مدرسے میں انگریزی پڑھاتی تھی۔ اور چھٹیوں میں پیرس آئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا اس سے ای ودن کی بہت دوستی تھی۔ اس نے ای ودن کے پاس آ کے پارٹی کے ساتھ چلنے کو کہا۔ ای ودن نے اس کا تعارف آزاد سے کرایا۔ اور آزاد سے ساتھ چلنے کو کہا۔ آزاد کو اچھی طرح معلوم تھا کہ فرانسیسی پولیس یہ قطعاً" پسند نہیں کرتی کہ غیر ملکی اجنبی ان کے ملک کے سیاسی جلسوں یا جلوسوں میں شریک ہوں مگر ای ودن سے دوستی بڑھانے کا یہ خداداد موقع تھا۔ وہ فوراً ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گیا۔

اس پر ای ودن نے اپنے پرانے مریل ساتھی سے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ وہ تو خود بھی اشتراکیت پسند تھا۔ تیار کیوں نہ ہوتا۔ الغرض یہ پارٹی جو تقریباً بیس پچیس افراد پر مشتمل تھی اور جس میں آدھے کے قریب عورتیں تھیں باسٹیل کی طرف چلی۔ یہاں ایک زمانے میں وہ قید خانہ تھا جس کو انقلاب فرانس نے صفحہ ہستی سے مٹا دیا اور اب اس جگہ صرف ایک مینار یادگار کے طور پر موجود ہے۔

جلوس کی رونق' نعروں' جھنڈیوں اور ہنگاموں کے بعد جب یہ لوگ واپس ہوئے تو موقع دیکھ کر آزاد نے ای ودن ووال کو نمائش دیکھنے کی دعوت دی۔

"کل میں "لاسورس" (ایک قہوہ خانہ) میں آپ کا انتظار کروں گا۔ کتنے بجے آپ آسکیں گی؟"

ای ودن نے کہا۔ "میں اپنے والد سے پوچھوں گی۔ آپ کو معلوم ہے کہ فرانس میں لڑکیوں کو آزادی نہیں دی جاتی۔ میں کل صبح نو بجے تک آپ کو ٹیلی فون کے ذریعے

اطلاع دوں گی کہ میں چل سکوں گی یا نہیں۔"

فرانس اور دوسرے لاطینی ممالک میں متوسط طبقے کی لڑکیوں کو اتنی آزادی نہیں ہوتی جتنی انھیں شمالی یورپ کے ممالک یا جرمنی میں دی جاتی ہے۔ آزاد کو یہ معلوم تھا پھر بھی اسے اپنے ہوٹل کا ٹیلی فون نمبر لکھا دیا۔

مجبوری تھی۔ اگر وہ نہ آئی یا اگر وہ نہ آسکی تو کل پھر کسی اور کو ڈھونڈنا پڑے گا۔

میٹرو (زمین دوز ریل کے) اسٹیشن پر وہ رخصت ہوا۔ اس کا ہوٹل وہاں سے فرلانگ بھر تھا۔ وہ ٹہلتا ہوا پہنچ گیا۔

دوسرے دن صبح کے نو بجے تک وہ انتظار کرتا رہا۔ مگر ٹیلی فون پر اسے کوئی اطلاع نہ ملی۔ اسے غصہ آگیا۔

اسی غصے کے عالم میں اس نے حجامت بنائی' کپڑے بدلے' ناشتہ کیا اور ساڑھے دس بجے نیچے اترا۔ ہوٹل کی لابی میں اس کے نام تین خط تھے۔ دو پر انگلستان کے ٹکٹ تھے۔ ایک سادہ لفافہ تھا۔ جس پر صرف اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کوئی خود آکر یہ خط دے گیا ہے۔

اس نے ہوٹل کے چوکیدار سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایک نوجوان خاتون جو ہلکے زرد رنگ کی جاکٹ پہنے تھی یہ خط لائی تھی۔ اس نے پوچھا بھی کہ "موسیو آزاد کو اطلاع کراؤں؟" مگر اس خاتون نے کہا۔ "نہیں یہ خط کافی ہے۔"

آزاد نے خط کھولا۔ خط فرانسیسی میں تھا اور جلدی میں لکھا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔

"پیارے آزاد!"

یہ خط میں تمہیں جلدی میں سیکرٹری کے کمرے سے لکھ رہی ہوں۔ مجھے آج نو بجے سے پہلے ٹیلی فون کرنے کا موقعہ نہیں ملا۔ معاف کرو۔

میں یہ سوچ رہی ہوں کہ اگر میں اپنے والد سے یہ کہوں کہ میں ایک نوجوان کے ساتھ تفریح کے لئے جانا چاہتی ہوں تو وہ ہرگز اجازت نہ دیں گے۔

چونکہ تم بہت ہمدرد دوست ہو اور چونکہ میں خود تمہارے

ساتھ نمائش کی سیر کرنا چاہتی ہوں۔ اس لئے مجھے ذرا مہلت دو کہ
میں اپنے والد کو آہستہ آہستہ تیار کروں۔ جلدی کرنے سے کوئی
فائدہ نہیں۔

مجھے امید ہے کہ آج "کلب" میں تم سے ضرور مل سکوں
گی۔ وہاں جانے کی تو مجھے اجازت ہے۔ اورد آ

"ای ودن"

اس خط کو، جو ذرا عجیب اور غیر معمولی سا تھا، پڑھ کر آزاد نے اپنے دل میں کہا۔ کیا مہمل بک رہی ہے۔ خیر "پیارے آزاد" تو ایسی بری ابتدا نہیں۔ مگر یہ "ہمدرد دوست" کا کیا مطلب ہے۔ اور یہ مہلت مانگنا اور "والد کو آہستہ آہستہ تیار کرنا۔" یہ چھوکری میرا وقت ضائع کر رہی ہے۔

آزاد نے قطعی ارادہ کر لیا کہ وہ کلب نہیں جائے گا۔ چنانچہ ادھر ادھر پھرتا رہا۔ تیسرے پہر کو کلب جانے کو طبیعت چاہی تو اس نے دل میں کہا۔ کلب نہیں جاؤں گا۔ نمائش جاؤں گا۔ پھر اس خیال سے کوفت ہوئی کہ اکیلے نمائش جانے سے کیا حاصل۔ پھر سوچا کسی پرانی دوست کو لے جاؤں۔ مگر اس میں کیا لطف۔ اس نے کلب جانے کا ارادہ کر لیا۔

وہ تقریباً پانچ بجے کلب پہنچا۔ پرانے شناساؤں اور دوستوں سے باتیں کرتا رہا چھ بج گئے۔ مگر مدموزیل ای ودن نہ آئی۔

اس نے ایک پرانی دوست سے دوسرے دن نمائش چلنے کا وعدہ لیا اور دل ہی دل میں ای ودن کو برا بھلا کہتا ہوا کلب سے باہر نکلا۔ لیکن باہر نکلا ہی تھا کہ ای ودن نظر آئی ــــــ وہی ہلکا زرد جاکٹ پہنے ہوئے۔

آزاد نے ٹوپی اٹھا کر سلام کیا۔

ای ودن کے کہا۔ "چلو"

آزاد نے کہا۔ "کہاں؟"

ای ودن بولی۔ "تم تو آج نمائش کو چلنے والے تھے۔"

"مگر تمہارا خط آیا کہ اجازت ملنا مشکل ہے۔"

والد تو یہی سمجھیں گے کہ میں کلب میں ہوں۔ مگر اس اثناء میں ہم دونوں نمائش کا پورا چکر لگالیں گے۔ ہاں شرط یہ کہ ساڑھے آٹھ تک مجھ کو واپس پہنچ جانا ہے۔"

دونوں نمائش پہنچے۔ دروازے سے داخل ہونے کے بعد تروکے ویرو کے چبوترے پر آزاد نے ای ودن کی تصویر لی۔ پس منظر میں ایفل مینار تھا۔ اس پس منظر کے ساتھ ای ودن بہت اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ آزاد کو صرف یہی ایک خیال تھا کہ کاش وہ اس ہلکے زرد جاکٹ کے بجائے اچھے کپڑے پہنے ہوتی۔

خیر دونوں نے نمائش کی سیر کی۔ وہیں کھانا بھی کھایا اور جب باہر نکلے تو نو بج رہے تھے۔ دیر ہو جانے کے باعث ای ودن بہت پریشان تھی۔ کچھ اس کی پریشانی کے باعث اور کچھ نمائش سے باہر نکلنے والے مجمع کے لحاظ سے آزاد کو خفیف ترین سطحی اختلاط کا بھی موقع نہ ملا۔ اور نمائش میں تو دونوں اس قدر محو تھے کہ کچھ اور طرح کی باتیں کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔

اس کے بعد تین دن تک ای ودن کلب نہیں آئی اور نہ آزاد کو اس کی کوئی اطلاع ملی۔

آزاد اسے روزانہ انگریزی میں خط لکھ رہا تھا (اس کے والد کو انگریزی نہیں آتی تھی۔) آزاد کے خط بہت مختصر ہوتے تھے۔ دو یا چار سطریں۔ ہر خط میں دوبارہ ملنے کی درخواست ہوتی تھی۔ احتیاطاً" اس کے سوا کچھ نہیں۔

تین دن کے بعد آزاد ذرا مایوس ہونے لگا۔ مگر چوتھے دن جب وہ دوپہر کا کھانا کھانے اپنے ہوٹل واپس آیا تو اسے ہوٹل کی لابی میں ایک لفافہ ملا۔ لفافے پر ای ودن کے خط میں اس کا نام درج تھا۔ لفافے کے اندر جاذب کا ایک ٹکڑا تھا۔ جس پر پنسل سے لکھا تھا۔

"پیارے آزاد!"

میں سمجھی تھی کہ تم ہوٹل میں نہ ملو گے۔ اس لئے میں اس ٹکڑے پر یہ الفاظ لکھ کر لائی تھی۔ تم نے پیرس کے باہر کہیں تفریح کرنے کو لکھا تھا۔ کل ہم کہیں تفریح کرنے چلیں؟ میں تمہیں لینے دو ڈھائی بجے تک آؤں گی۔

کل تک رخصت۔

ای ودن

آزاد نے فوراً اس خط کا جواب اثبات میں دیا۔ دوسرے دن وہ آئی۔ دونوں پیرس کے شمالی اسٹیشن گاردو نارو تک زمین دوز ریل میں گئے۔ وہاں پہنچے تو جس گاؤں کو وہ جانے والے تھے وہاں جانے والی گاڑی کے چھوٹنے میں پاؤ گھنٹہ دیر تھی۔

ای ودن نے کہا۔ "والد سے میں بہانہ کر کے آئی ہوں کہ مجھے ایک سہیلی سے ملنا ہے۔ میں بڑے میاں کو لاکھ یقین دلاؤں کہ میری اور تمہاری دوستی جنسی خواہشات سے بالکل پاک ہے۔ مگر انہیں ہرگز یقین نہ آئے گا۔ ان اگلے وقت کے لوگوں کے نزدیک ایک نوجوان مرد اور جوان عورت میں خالص دوستی ناممکن ہے۔"

آزاد نے اپنے دل میں کہا۔ آثار تو کچھ اچھے نہیں معلوم ہوتے لیکن کوشش کرنے میں کیا ہرج ہے۔

ای ودن اسی طرح بکتی جا رہی تھی۔ "ہماری تمہاری دوستی کی کڑی دونوں کی ذہنی ہمدردی ہے۔ تم بھی اشتراکیت پسند ہو۔ (آزاد نے اپنے دل میں کہا۔ "اس کا دارومدار تو موقع محل پر ہے") اور میں بھی اشتراکیت پسند۔ عورت اور مرد دونوں اگر تھوڑی دیر کے لئے اپنی جنس کو بھول جائیں اور دوش بدوش کام کریں تو بہت جلد انقلاب پیدا کر سکتے ہیں (آزاد نے دل میں کہا یہ تو مارکس اور لینن کی تعلیم کے خلاف ہے اور فرائڈ کی تعلیم کے تو بالکل خلاف ہے) میں تم کو اس وجہ سے بہت پسند کرتی ہوں کہ تم اتنے دور دراز ملک کے کامریڈ ہو، پھر بھی بنی نوع انسان کی فلاح کے متعلق ہمارے اور تمہارے خیالات ایک ہیں۔"

ابھی ای ودن کی تقریر ختم نہیں ہوئی تھی کہ ریل نے سیٹی دی اور وہ دونوں سوار ہو گئے۔

جس چھوٹے سے گاؤں میں وہ پہنچے وہ پیرس سے بیس میل کے فاصلے پر واقع ہے اور دریائے سین کے کنارے آباد ہے۔ اس گاؤں میں مشکل سے بیس پچیس مکان ہوں گے۔ سین کے کنارے ایک میلے کچیلے ہوٹل میں ایک کھرے میز پر آزاد اور ای ودن نے بدذائقہ کافی پی اور پھر تفریح کو روانہ ہوئے۔

پیرس کی چہل پہل اور پھر بین الاقوامی نمائش کی شان و شوکت کے بعد جنگل کی اس فضا میں خاص لطف تھا۔ اس خاص لطف کو آزاد نے اس لئے اور بھی زیادہ محسوس کیا کہ جنگل کی اس فضا اور اس کم و بیش تنہائی میں ایک فرانسیسی حسینہ ----- خیر حسینہ نہ سہی، اچھی خاصی قبول صورت لڑکی، اس کے ساتھ تھی۔

دونوں نے سین کا پل عبور کیا جو پکی سرخ اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ اس کے بعد سڑک کو چھوڑ کر دونوں سیاسیات حاضرہ اور یورپ میں انقلاب کے امکانات پر بحث کرتے ہوئے ایک پگڈنڈی پر ہو لئے جس کے ایک طرف دریائے سین اور دوسری طرف گھنے درخت تھے۔

موسم بہت پیارا تھا۔ آسمان پر ہلکا ہلکا ابر چھایا ہوا تھا۔ مگر فضا زبان حال سے کہہ رہی تھی کہ آج پانی نہیں برسے گا۔ دھوپ نہ ہونے کی وجہ سے درخت اور زیادہ گھنے معلوم ہو رہے تھے اور سین کا پانی اور زیادہ میلا معلوم ہو رہا تھا۔

ٹہلتے ٹہلتے وہ دونوں گاؤں میں دور نکل آئے۔ ندی کے دوسری طرف کھیتوں میں کسان نظر آ رہے تھے۔ لیکن پگڈنڈی پر ان کے سوا کوئی نہ تھا۔

دونوں سیاسیات حاضرہ کو بھول گئے اور خاموش چلتے رہے۔ ایک درخت کی ٹہنی پگڈنڈی پر لٹک آئی تھی۔ ای ودن اس پر چڑھنے لگی۔ آزاد نے اسے ہاتھ کا سہارا دیا۔ اور جب وہ کود کے اتری تو اپنا ہاتھ اس کی کمر میں حمائل کیا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔

کچھ دیر تک دونوں اسی طرح چلتے رہے۔ آزاد رفتہ رفتہ اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کرنے لگا۔ لڑکی کی کمر بہت پتلی تھی۔ اس نے ہاتھ ذرا اوپر بڑھایا۔ پسلی کی ہڈیاں صاف محسوس ہوتی تھیں۔ آزاد نے پہلی بار اچھی طرح محسوس کیا کہ ای ودن کتنی دبلی ہے۔ آزاد کا ہاتھ اور اوپر بڑھا اور پھر اپنے بازو سے اسے لپٹائے ہوئے اسی پگڈنڈی پر اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

اس درمیان میں دونوں میں سے کسی نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ پگڈنڈی پہلے ہی سے ویران تھی، اب دریا کا کنارا چھوڑ کے گھنے درختوں کے درمیان سے ہو کے گزرتی تھی۔

آزاد نے اسی طرح ای ودن کو لپٹائے ہوئے اس سے پوچھا۔ "تمہارا بوسہ لوں؟"
لڑکی آہستہ آہستہ کانپ رہی تھی۔ پھر بھی اس نے پوچھا "کیوں؟"
اس عجیب سوال کا جواب دینے میں آزاد نے تامل نہ کیا۔ زور سے بھینچ کے اس نے پہلے اس کے لبوں کا ایک طویل بوسہ لیا۔ پھر اس کی وجہ بتائی۔ "ای ودن مجھے تم سے محبت ہے۔"

لڑکی کے چہرے پر جذبات کے باعث نرمی اور ایک طرح کی رقت پیدا ہو گئی تھی جو اس وقت آزاد کو مضحکہ خیز معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔
"آزاد کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟"
آزاد نے اپنے چہرے پر حقیقی عشق کے تمام آثار پیدا کر کے کہا۔ "میں سچ کہہ رہا ہوں۔"
مگر میں تو چاہتی تھی میری تمہاری دوستی ایسی ہو جس میں جنسی جذبات کو ذرا بھی دخل نہ ہو۔ میں چاہتی تھی میری تمہاری دوستی انقلاب پسندوں کی دوستی ہو۔ یہ تم نے کیا کیا؟"

"انقلاب پسند تو جنسی تعلقات کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک تو یہ جسمانی ضروریات ہیں۔ ہاں جذبات کے وہ زیادہ قائل نہیں۔"
"آزاد تم بڑے مادہ پرست ہو۔"
"انقلاب پسند تو مادہ پرست ہوتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے ای ودن کا ایک بار پھر بوسہ لیا۔ ای ودن اس مرتبہ اور زیادہ پگھل گئی۔ آزاد کو محسوس ہو رہا تھا کہ شائد اب تک کسی نے اس طرح اس لڑکی کو نہیں چوما، کسی نے اس کے جسم سے اب تک اتنی آزادی نہیں برتی۔ وہ جانتا تھا کہ لڑکی کا دماغ اس وقت انقلاب، مادہ پرستی، اشتراکیت، محبت اور جذبات کے معمے حل کرنے سے بالکل قاصر ہے۔ اس کا نوجوان گوشت البتہ لرز رہا ہے۔

اور موقع سے فائدہ اٹھا کے اس نے ای ودن کو آہستہ سے گود میں اٹھا لیا۔ گھنے درختوں میں اس نے فوراً ایک گوشہ ڈھونڈ لیا۔ وہاں اسے گھاس پر لٹا کے ہلکے زردی مائل جاکٹ کے بٹن کھولے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے پستانوں کو سہلایا۔ جو ہرے بھرے

درختوں کے درمیان گلابی پھول معلوم ہوتے تھے۔ اور پھر وہ ای ودن کے جسم پر اس طرح چھا گیا جیسے ہرے بھرے درختوں پر بادل۔

کچھ دیر کے بعد جب اس نے ای ودن کو سہارا دے کر گھاس پر سے اٹھایا تو اسے ایک طرح کی طمانیت ہوئی۔ یہ لڑکی معصوم نہیں تھی۔ اور وہ اس کی زندگی میں پہلا مرد نہیں تھا۔ اس سے پہلے کوئی اور کامریڈ' کوئی اور انقلاب پسند اور مادہ پرست اس لڑکی کو چوم چکا تھا' اس کے جسم سے آزادی برت چکا تھا۔ اور اس کے کنوار پنے کو بطور خراج وصول کر چکا تھا۔

واپسی میں بھی پگڈنڈی پر بوس و کنار کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن کھلی سڑک پر پہنچ کر دونوں الگ الگ چلنے لگے۔ سین کے پل پر پہنچ کر ای ودن دفعتاً ٹھہر گئی اور جھک کے دریا کے میلے پانی کو دیکھنے لگی۔

پھر اس نے رنجیدہ لہجے میں کہا۔ "آزاد! مجھے تم سے اس کی توقع نہیں تھی میں سمجھتی تھی تم میرے دوست رہو گے۔ اور یہ یہ ---- اس قسم کی کوئی بات ہماری دوستی کو خراب نہ کرے گی۔"

"پیاری۔ یہ کوئی بری بات نہیں ہے۔ اس کی تو جمہوریت روس میں عام اجازت ہے۔"

"صرف میرے شوہر کو یہ حق تھا کہ وہ میرے بوسے لیتا' مجھے لپٹاتا' اور ----"

"ان معاملات میں اگر پہلے سے تجربہ ہو تو شادی کے بعد زیادہ کام آتا ہے۔"

"آزاد تم بڑے مادہ پرست ہو۔ تمہیں مجھ سے بالکل محبت نہیں۔"

"میں ابھی ابھی اپنی محبت کا ثبوت دے چکا ہوں' اور جب موقع ہو دوبارہ اس کا ثبوت دینے کو تیار ہوں۔"

"تم میں جذبات بالکل نہیں' تمہارے دل میں محبت کرنے کی صلاحیت نہیں۔"

"ای ودن۔ اشتمالی اصول کی بنا پر محبت تو محض حیاتیاتی ضرورت کا نام ہے۔"

اس پر وہ ہنس پڑی۔ "تم بڑے مادہ پرست ہو ----" اور اس کے بعد وہ پھر مغموم ہو گئی۔ آزاد اس کی وجہ سمجھ گیا۔ اور کہنے لگا۔ "میں نے ہر ممکن احتیاط برتی ہے بچہ وغیرہ ہونے کا کوئی امکان نہیں۔"

اس پر وہ پھر ہنس پڑی۔ "نہیں میں یہ سوچ رہی تھی کہ کچھ عرصے کے بعد تم اپنے وطن یا کہیں اور چلے جاؤ گے۔۔۔۔ اور میری شادی اوالف سے ہو جائے گی۔ مگر۔۔۔"

"اوالف کون؟"

"وہی میرا ساتھی جس سے تم کلب میں ملے تھے۔"

آزاد نے دل میں کہا اچھا وہ مریل نوجوان، مگر جوڑ تو کچھ اچھا نہیں۔

"مگر۔۔۔۔ جب میں اپنے شوہر کے گلے میں بانہیں ڈالوں گی اور جب اس کے بچے میری گود میں کھیلیں گے۔ تو مجھے کبھی کبھی تم یاد آؤ گے اور وہ پگڈنڈی یاد آئے گی۔۔۔۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

یہ دیکھ کر آزاد نے اپنے چہرے پر بھی مصنوعی تاثر کے آثار پیدا کر لئے اور کہا۔ "خدا جانے کتنے سال سے کتنے ہزار آدمیوں نے اس راستے پر چل چل کر وہ پگڈنڈی بنائی کہ ہماری محبت کی یادگار بنے۔۔۔۔"

ای ودن کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ آزاد نے یہ دیکھ کر اسی غمناک لہجہ میں سلسلہ کلام جاری رکھا۔

"یہ پگڈنڈی قدرت نے اس لئے بنائی کہ ہماری محبت کی یادگار بنے۔ قدرت نے ناک بھی اس مصلحت سے بنائی کہ وہ عینک کا بوجھ سنبھال سکے۔"

اس پر وہ روتے میں بے اختیار ہنس پڑی، اور ہنستے میں بولی۔ "یہ تو تم نے چوری کی ہے۔ یہ قول والٹیر کا ہے۔"

"میں نے کب یہ دعویٰ کیا کہ میں نے چوری نہیں کی۔"

ریل میں آزاد نے آہستہ سے پوچھا "مجھ سے پہلے بھی تمہارا کوئی عاشق تھا۔"

اس نے کہا۔ "ہاں اوالف۔"

ریل میں آزاد نے اس سے پھر ملنے کو کہا۔ وہ بہانے کرتی رہی۔ یہاں تک کہ پیرس کا اسٹیشن آ گیا۔ آزاد نے فیصلہ کن لہجے میں اسے وقت اور مقام بتا دیا اور اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر بس پر بیٹھ کے چل دیا۔

مگر جب وہ مقررہ وقت پر، مقررہ مقام پر پہنچا تو ای ودن وہاں نہیں تھی۔ اس کے بعد وہ مہینہ بھر پیرس میں رہا۔ اسے کئی خطوط لکھے۔ مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ اس درمیان میں وہ ایک بار بھی کلب نہیں آئی۔ اوالف بھی کبھی کلب میں نظر نہیں آیا۔

آزاد پیرس سے روم جانے لگا تو جاتے جاتے اس نے ایک خط اور لکھا۔ اس کا جواب اسے پندرہ دن بعد روم میں ملا۔

ای ودن کے تمام خطوط کی طرح یہ خط بھی عجیب تھا۔ خط ایک فرانسیسی نظم سے شروع تھا:۔

"سب سے بڑا درد تو یہ ہے کہ اس کی وجہ معلوم نہ ہو۔
محبت کے بغیر، اور نفرت کے بغیر
میرے دل میں اس قدر درد ہے۔۔۔۔"

اس کے بعد خط کا پہلا حصہ جو ۲۴ اگست کا لکھا ہوا تھا، انگریزی میں تھا:۔

"اب ذرا سمجھ سے، میں جو کچھ کہتی ہوں سنو۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ میری ایک سہیلی اپنے شوہر کے ساتھ پیرس آ رہی ہے۔ وہ "پگڈنڈی" والی شام کو یہاں پہنچی۔ اس لئے مجھے قطعاً وقت نہیں ملا کہ میں تم سے ملنے کے لئے آ سکتی۔ جو کچھ ہوتا ہے وہ ہماری بہتری کے لئے ہوتا ہے (کیوں؟ میں ایک نوجوان فلسفی ہوں کہ نہیں؟)

واپسی کے بعد اسٹیشن پر تم ذرا رنجیدہ معلوم ہو رہے تھے۔ اس کے بعد تم اتنی جلدی بس پر چڑھ کے چلے گئے کہ مجھے بڑا ترس آیا۔ رات بھر میں سوچتی رہی مجھے نیند نہیں آئی۔ مجھے تم سے کہتے شرم معلوم ہوتی ہے مگر تمہارے خیال میں میں پریشان رہی۔ تمہارے خطوط سے میری پریشانی بڑھتی جاتی تھی کہ جس طرح مجھے تم سے محبت ہے، تم جانتے ہو کہ مجھے اوالف سے محبت نہیں۔ اس کا تجربہ تو تمہیں پگڈنڈی پر ہو گیا۔ کہیں تمہیں بھی مجھ سے محبت نہ ہو جائے۔ اور ہم دونوں کی زندگی ایک خطرناک پگڈنڈی نہ بن

جائے۔

لیکن تمہارا آخری خفگی بھرا خط دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا۔ کہ اب تو تم بہت بحال معلوم ہوتے ہو۔ اپنے اس سفر کے دوران میں تم مجھے برابر بھولتے جاؤ گے۔ تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میں بڑی پیاری، دنیا کی سب سے اچھی لڑکی نہیں۔ بڑی پیاری لڑکیاں دنیا میں اور بھی بہت ہیں۔ اس لئے۔

اب رخصت

میرا دل مجھ سے کہتا ہے کہ میں تمہارے لئے وہ ہوں جو میں نہیں ہوں۔ جو میں نہیں ہوں۔

کیا افسوس ہے! مجھے تمہاری دوستی اس قدر پسند تھی۔ لیکن وہ خطرناک پگڈنڈی مجھے بالکل پسند نہیں۔

تم بڑے مادہ پرست ہو۔

پیارے آزاد، اب میں تم سے رخصت ہوتی ہوں مجھے اپنی سہیلی کی تواضع کرنا ہے۔ خدا حافظ"

"ای وون"

خط کے آخری صفحے پر جو جگہ بچی تھی اس پر فرانسیسی میں ۲۶ اگست کی لکھی ہوئی یہ تحریر تھی:۔

"ارے رے رے

اگست کی چھبیسویں تاریخ بھی آگئی۔

مجھے ابھی تک اس خط کو ڈاک میں ڈالنے کا موقع نہیں ملا۔

تم سمجھ رہے ہو گے کہ میں تمہارے آخری خط کا بھی جواب نہ دوں گی۔

پرسوں میری شادی ہے۔

اچھا اب رخصت

رخصت؟ اس کا دارومدار تم پر ہے۔
تمہارے کلب کی ایک ممبر، السنہ قدیمہ کی طالب علم، اشتراکیت پسند، اور خطرناک پگڈنڈی کی ہیروئن —— ای وون"

○○

رقصِ ناتمام

بادل کیوں اُٹھ رہے ہیں ؟ بادل کیوں جمع ہو رہے ہیں ؟ اور جمع ہو رہے ہیں تو برستے کیوں نہیں ؟ یا کم سے کم بجلی کیوں نہیں چمکتی۔ کس قدر سیاہ بادل ہیں۔ پھر پانی کیوں نہیں برستا؟

اُس کے اوور کوٹ اور اُس کے سگار سے مقابلہ کرنے کے لیے بادل جمع ہو رہے ہیں۔ بادل سرکشی کر رہے ہیں۔ اُن کو خیال نہیں کہ وہ صحن میں کھڑا ہوا کمرے سے کسی کے نکلنے کا انتظار کر رہا ہے۔ اُس کا دماغ تھکا ہوا ہے۔ اُس کے دل و دماغ پر کہرسی چھائی ہوئی ہے۔ وہ انتظار کر رہا ہے۔ کمرے سے کوئی تو نکلے۔ مگر بادل کیوں جمع ہو رہے ہیں ؟ تاکہ وہ صحن میں ٹھہرنے نہ پائے۔ ہوا سے اُس کے سگار کی راکھ بار بار کیوں اُڑ جاتی ہے۔ اور ہوا اُس کے اوور کوٹ کو بار بار کیوں چھیڑ رہی ہے۔ کیا مکان میں بھی اُسے امن نہ ملے گا؟ نہیں، یہ سب بادلوں کی شرارت ہے۔

بالآخر کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ دفعتہً بادلوں کو بھول گیا۔ کمرے سے خود لیڈی ڈاکٹر باہر نکلی۔ وہ اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھ رہی تھی۔ اُسے غصہ سا آنے لگا۔ آخر یہ نخرے کیوں؟ اُس سے وہ کچھ کہتی کیوں نہیں۔ مگر اُس نے خود بھی کوئی سوال نہیں کیا اور اپنے دانتوں میں بائیں طرف سگار کو دبائے رہا۔ لیڈی ڈاکٹر کے منہ پر سے دستی ہٹی تو خفیف سا تبسم

نظر آیا اور اس ادھیڑ عمر کی عورت کے اس تبسم سے اُسے نفرت، سخت نفرت معلوم ہوئی۔ تبسم نے آواز کی شکل اختیار کرلی۔ لیڈی ڈاکٹر نے کسی قدر بے تکلفی کے لہجے میں اپنی زبان میں کہا۔ "مبارک لفٹنٹ"۔

اُس نے سگار کو ہٹاکر استفہاماً میم صاحب کی طرف دیکھا۔ میم صاحب نے کچھ ہنس کے کچھ مُسکرا کے چھوٹے چھوٹے جملوں میں کہا کہ بیگم صاحب کی طبیعت اچھی ہے اور لڑکی کی بھی۔

"لڑکی کی؟" اور سگار پھر ہاتھ سے دفعتاً مُنہ تک پہنچ گیا۔

"ہاں لڑکی کی .... لڑکی پیدا ہوئی ہے"۔

نرس نے اندر سے میم صاحب کو پکارا اور وہ اندر چلی گئیں۔ صحن میں وہ پھر اکیلا رہ گیا بادلوں میں بجلی چمکی۔ اُس کو اپنی بیوی کا خیال آیا کہ اُسے کتنی تکلیف ہوئی ہوگی اور اپنی خود غرضی کا کچھ احساس ہوا کہ اس اثناء میں کلب میں برابر تاش کھیلتا رہا۔

اس وقت اُس کا دماغ بہت تھکا ہوا تھا۔ جسم میں گرمی معلوم ہو رہی تھی مگر چہرے پر جو ہوا لگتی تھی۔ وہ سرد تھی۔ یہ گرمی اور یہ سردی کیوں؟ اور وہ اُس وقت اوور کوٹ کیوں پہنے تھا۔ ڈاکٹر لاکھ کہے مگر یہ جاڑوں کا موسم نہیں تھا۔ برسات میں اوور کوٹ کیوں؟ ہاں سگار...

اُس نے سگار پھینک دیا اور ایک ماما کو پکار کر اوور کوٹ اُتار کر اسے دیا۔ اب صحن میں ٹھہرنا بیکار تھا۔ وہ اپنے کمرے میں جانے کا ارادہ کرنے لگا۔ بیوی کو اور لڑکی کو صبح دیکھ لے گا اور پھر اس وقت .. .... پھر اس وقت .....

اُس کے بعد وہ اپنے کمرے کی طرف جانے لگا۔ اُس کے فوجی جوتوں سے آواز آرہی تھی اور خود بخود اس آواز کی طرف اُس کی توجہ مبذول ہو رہی تھی۔ برآمدے میں اُس کا بڑا لڑکا کھیل رہا تھا۔ اُسے بچوں سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ یہ بچہ صرف دو برس کا تھا۔ وہ اُس کے قریب ٹھہر گیا اور اُس کی طرف اس طرح دیکھا۔ جیسے کوئی بلندی سے کسی نشیب کی چیز کو دیکھتا ہے۔

لڑکے نے بھی نظر اٹھاکر کسی قدر سہم کر اپنے باپ کو دیکھا۔ وہ ان تمام بڑے

بڑے لوگوں کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ اپنی ماں کو، اپنی آیا کو، مگر اس بڑی مخلوق میں سب سے زیادہ ناقابلِ فہم اُس کا باپ تھا اور جب وہ بہت بڑے جسم کو اپنی طرف متوجہ دیکھتا تو کچھ خوف ضرور اُس کے دل میں پیدا ہوتا۔ اُسی دن یہی بڑے بڑے ہاتھ زور سے اُس کے گال پر پڑے تھے اور اُسے وہ تکلیف اچھی طرح یاد تھی۔ تھپڑ کی وجہ سے خوف اور زیادہ بڑھ گیا تھا۔ اُسے اپنے باپ سے شکایت بھی تھی مگر خوف زیادہ تھا اور اُس کے بعد جب آیا نے اُسے تسلّی دی۔ اور کھلونے دیے تو وہ اُس تھپڑ کو بھول تو گیا مگر شکایت اور خوف کا جذبہ اُس وقت اُس شکل کو دیکھ کر پھر تازہ ہو گیا۔ باپ نے اُس کے سَر پر آہستہ سے ہاتھ رکھا اور وہ سہم گیا۔

جب وہ اپنے کمرے کے قریب پہنچا تو معلوم ہوتا تھا کہ چاروں طرف سے بادل، اُس کے دماغ کے اندر سمائے جا رہے ہیں۔ دماغ کے اندر دُھند پھیلی ہوئی تھی۔ اِتنے میں بہت دُور بجلی کی ایک ذرا سی جھلک نظر آئی۔ اُس نے تسکین سی محسوس کی اور اپنے کمرے کے اندر ایک آرام کُرسی پر اُسی طرح یونیفارم پہنے لیٹ گیا اور عجیب اور منتشر خیالات کے ہجوم میں بالکل کھو گیا۔

وہ حیدر آباد کے ایک بہت پُرانے خاندان میں پیدا ہوا تھا۔ اُس کے والد ابھی تک بقیدِ حیات تھے اور خود جاگیر کا کام دیکھتے تھے۔ اُس کے ایک بڑے بھائی تھے جو سرکارِ عالی میں ایک ممتاز عہدے پر مامور تھے۔ اُس نے اپنے لیے فوجی زندگی کا انتخاب کیا تھا۔ چار سال قبل اُس کا تقرّر ہوا تھا۔ تین سال قبل اُس کی شادی ہوئی تھی۔ بڑا بچّہ دو سال کا تھا اور اب یہ لڑکی پیدا ہوئی تھی۔

اُس نے صرف ضروری حد تک تعلیم پائی تھی۔ دماغی مصروفیتوں سے اُسے کوئی خاص ذوق نہ تھا۔ ہمیشہ اُس کے دماغ پر ایک کہر سی چھائی رہتی۔ اب اُس نے شراب شروع کر دی تھی۔ اور یہ کہر اور زیادہ گہری ہو گئی تھی۔

اُس کا جسم بہت مضبوط تھا۔ البتّہ اُس کے پٹھے کچھ کمزور ہونے لگے تھے۔ کم سے کم

ڈاکٹر کا یہی بیان تھا۔ اُس کے چہرے پر جمود کا سا اثر اکثر چھایا رہتا اور اُس کا دہانہ کسی قدر ٹیڑھا تھا۔ اُس کا رنگ صاف تھا اور وضع قطع سے، چہرے اور جسم دونوں سے فوجی شان و شوکت کا اظہار ہوتا تھا۔

اسی طرح آرام کرسی پر لیٹے لیٹے اس کا دماغ اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا۔ جس طرح کوئی کشتی متلاطم موجوں میں ہچکولے کھاتی رہے اور اُس کے ملاح اُسی طرح سوتے رہیں۔ مختلف، متضاد اور مسلسل لکیروں کی طرح بے معنی خیالات اِدھر اُدھر سے جمع ہوتے، ایک دوسرے کو قطع کرتے اور پھر دوسرے خیالات میں کھو جاتے۔ ان تمام خیالات پر وہی کثیف کہر چھائی ہوئی تھی۔

کمرے میں بالکل اندھیرا تھا اور وہ اُس کمرے میں اس طرح بیٹھا تھا۔ گویا وہ خود بھی اسی تاریکی کا ایک حصہ تھا۔ روشنی کرنے کے لیے ایک چھوکری اندر داخل ہوئی۔ داخل ہوتے ہی اُس نے اس کو نہیں دیکھا تھا مگر جب روشنی ہوئی اور اُس نے اسے اس طرح آرام کرسی پر بیٹھے دیکھا تو بے اختیار ہنسنے لگی۔ اُس کی گستاخی اور بے تکلفی کی ہنسی بہت کچھ ظاہر کر رہی تھی۔ اُسے اُس ہنسی پر غصہ سا آگیا۔ مگر دفعتہً وہ لطف جو اس گستاخی سے حاصل ہوا تھا۔ غصے پر غالب آگیا اور وہ مسکرانے لگا۔

چھوکری کمرے کے باہر چلی گئی اور وہ آرام کرسی سے اٹھا۔ روشنی کمرے کی طرح اُس کے دماغ کی فضا کو بھی منوّر کر گئی۔ وہ سوچتا رہا کہ لڑکی کا نام کیا رکھا جائے۔ جب برف آ چکا تو اُس نے فیصلہ کیا کہ اُس کے والد یا خسر خود کوئی نام تجویز کر لیں گے۔

اب باہر ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی اور ہوا سے پانی کی بُو آ رہی تھی۔ ہوا کے اس جھونکے سے اُسے فرحت سی محسوس ہوئی۔ اُس کا آرڈرلی آیا۔ اُس کی مدد سے اُس نے کپڑے اُتارے وہ سستانے کے لیے آرام کرسی پر لیٹ گیا۔ اُس پر غنودگی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

صبح کو بادلوں سے ہلکی ہلکی روشنی چھن رہی تھی۔ آفتاب ابھی تک طلوع نہیں ہوا تھا۔ اس ہلکی سی روشنی میں مکان کے در و دیوار اس طرح نظر آ رہے تھے جیسے کسی طلسمی قصر کے در و دیوار ہوں۔ دماغی بوجھ اور دردِ سر ابھی تک باقی تھا۔

لفٹنٹ سکندر علی خان نے یہ رات کس قدر تکلیف سے گذاری تھی مگر اُن کی لڑکی نے اس دُنیا میں یہ پہلی رات گذاری تھی اور اب صبح ہو رہی تھی۔ یہ ایک نئی زندگی کی صبح تھی۔

کچھ دیر کے بعد وہ اپنی بیوی کے کمرے میں پہنچا۔ روشنی گُل ہو چکی تھی۔ دروازوں اور کھڑکیوں سے صبح کی سفیدی اندر آرہی تھی۔ اُس کی بیوی اُسے دیکھ کر مُسکرانے لگی اور اُس نے بھی ایک مسرت کا لرزش پیدا کر دینے والا جذبہ محسوس کیا جو اُس کے دماغ کی منجمد فضا میں اُبھرنے لگا۔ اُس نے جھک کر آہستہ سے اپنی بیوی کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ بالوں کی لٹوں سے کھیلنے لگا۔ اور اُس کے کان میں کچھ کہا۔ جس کو سُن کر وہ ہنسنے لگی۔ نرس نے کپڑا ہٹا دیا اور اُس نے بچی کو دیکھا جو ماں کے قریب سو رہی تھی۔

لیکن دفعتہً بچی جاگ کر رونے لگی۔

زندگی اس چھوٹے سے مکان میں گھبرا رہی تھی۔ یوں تو اُس کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک زندگی سے نکلی اور دوسری زندگی میں پوشیدہ رہ کے اُس نے اپنے لیے علیٰحدہ ہستی تجویز کرلی اور جب اس علیٰحدہ ہستی میں ایک علیٰحدہ شکل اور جداگانہ زندگی اختیار کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی تو اُس ننھی سی انسانی شکل میں جنم لیا۔ لیکن یہ ذی حس مادّہ جو ابھی ابھی مادّے کی اس ناقابلِ فہم دنیا میں آیا تھا۔ اپنے گھر میں بیگانگی سی محسوس کر رہا تھا۔ اُس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں ہِل رہے تھے اور وہ رو رہی تھی۔ یہ رقصِ حیات کی پہلی کیفیت تھی۔

سکندر علی خاں کی شادی اپنے ہی خاندان میں ہوئی تھی۔ اُس کی بیوی کا نام سلطانہ تھا۔ سُلطانہ کی تین بڑی بہنیں اور تھیں اور وہ گھر بھر میں ان سب سے کم چاہی جاتی تھی۔ بچپن میں ہر طرح سے وہ بہت نیک تھی مگر جب ضد آجاتی تو کسی کا کہنا نہ مانتی۔ پڑھنے لکھنے کا اُس زمانے میں چرچا شروع ہو چکا تھا مگر اُسے کبھی پڑھنے کا شوق نہ ہوا۔ اُس کی طبیعت میں اس قدر سادگی اور بات چیت میں اس قدر معصومیت اور دلکشی تھی کہ تمام ملنے جُلنے والی بیویوں کو اُس سے بہت محبت تھی۔

اُس کا جسم ابتدا سے بہت نازک تھا۔ سر کے بال سیاہ اور بہت لمبے تھے آنکھیں بہت بڑی بڑی تھیں اور اُن سے حیرانی برستی تھی۔ چہرے پر تازگی اور بچپن کی جھلک اب تک باقی تھی۔ غور و فکر کی صلاحیت اُس میں بالکل نہیں تھی۔ معصومیت کے ساتھ لاپروائی ہمیشہ اُس کی طبیعت کا جزو رہی تھی۔

جب وہ اٹھارہ برس کی تھی۔ اُس کی شادی ہوئی۔ اُس کی جسمانی حالت اس قدر نازک تھی کہ شادی اُسے راس نہ آئی۔ وہ بیس برس کی تھی۔ جب پہلا لڑکا پیدا ہوا اور وہ مرتے مرتے بچی۔ اس لڑکی کی ولادت پر اس قدر خطرہ تو پیش نہیں آیا۔ پھر بھی اُسے دوسروں سے بہت زیادہ خطرے کا سامنا کرنا پڑا۔

ازدواجی زندگی سے خالص جنسی حظ اُسے بہت کم حاصل ہو سکا۔ اس وجہ سے وہ اپنے میاں کے کرتوتوں کا حال سُنتی بھی تو ناراض تو ضرور ہوتی، اور ضرور ہوتی اور خفا ہو جاتی مگر اُسے کوئی قلبی صدمہ اس وجہ سے نہ ہوتا کہ اُسے خود جنسی ترغیب بہت کم معلوم ہوتی۔ کچھ تو جسمانی نزاکت اور کچھ طبیعت کا اثر کہ وہ ان تمام چیزوں سے بے توجہ سی تھی۔ اس کے علاوہ اُس نے جس خاندان میں آنکھیں کھولی تھیں۔ وہاں خواصوں کا رواج پُشت ہا پُشت سے تھا۔ اور وہ اُن باتوں کی عادی ہو چکی تھی۔ کپڑوں اور آرائش کا اُسے اتنا شوق تھا جتنا بچوں کو ہوتا ہے۔ وہ لاکھ خفا ہو اُس کے منانے کی ترکیب یہی تھی کہ اس کا شوہر کوئی نئی قیمتی ساڑھی یا کوئی نیا فیشن ایبل زیور یا کوئی اور ایسی ہی چیز اُسے لا دیتا اور وہ کچھ دیر رُوٹھی رہنے کے بعد مُسکرانے لگتی اور پھر کھلکھلا کے ہنس دیتی۔

بہر حال یہ دو انسانی زندگیاں تھیں جن سے اس نئی انسانی زندگی نے ترکیب پائی۔ لیکن قدرت کا عجیب دستور ہے کہ جب دو عناصر سے کوئی چیز مرکب ہو کے بنتی ہے تو اکثر یہ ہوتا ہے کہ عناصرِ ترکیب کی محض موہوم سی خاصیتیں باقی رہ جاتی ہیں اور جو چیز بنتی ہے وہ ایک بالکل نیا اور مختلف ہیولیٰ بن جاتی ہے۔

اس لڑکی نے جو ابھی ابھی پیدا ہوئی تھی۔ اپنے ماحول کی توجہ اپنی طرف بہت

پہلے سے منعطف کرلی تھی۔ ذرّوں کی دُنیا نے اس ذرّے کی ہستی کو تسلیم کر لیا تھا۔ تسبیح کے دانوں میں ایک اور نئے دانے کا اضافہ ہوا تھا۔ اس علیحدہ ہستی کا ایک علیحدہ نام بھی تجویز کیا جا چکا تھا۔ یہ نام بلقیس جہاں تھا۔

سب سے پہلے دنیا کی جس خارجی چیز نے بلاواسطہ لڑکی کی توجہ کو جذب کیا۔ وہ چراغ کی لَو تھی۔ زچہ خانے میں خدا جانے کس وجہ سے بجلی کی روشنی نہیں استعمال کی گئی تھی۔ رات کو ایک کونے میں اسٹول پر لالٹین رکھی رہتی اور یہ اس کائنات کا پہلا ہیولیٰ تھا جس نے اس اجنبی لڑکی کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ لالٹین کی لَو روشن تھی اور کمرے کا ہر حصّہ اُس کے مقابلے میں تاریک تھا۔ وہ ذرا سا حصّہ مرکز کی سی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے دماغ نے اس مرکز کو پہچان لیا۔ وہ برابر ٹکٹکی لگائے اُسے دیکھتی رہی۔ کبھی روتے روتے اسے دیکھ کر خاموش ہو جاتی۔

اس دیکھتے رہنے کا راز غالباً یہ تھا کہ وہ اُس نور کو سمجھ سکنے سے قاصر تھی۔ اُس کا قلب، اور اُس کا دماغ غبار کی طرح پریشان تھے۔ صرف دو انسانی شکلوں کا خفیف سا تصوّر بھولے ہوئے خواب کی طرح، اس غبار کی فضا میں موجود رہتا۔ کیوں کہ جب اُسے بھوک معلوم ہوتی یا وہ روتی تو یہی دو انسانی شکلیں اُسے آرام پہنچاتیں۔ لیکن وہ اُن شکلوں کو بھی بالکل سمجھ نہ سکی تھی۔ لالٹین کی لَو بالکل مختلف چیز تھی اور وہ قلب و دماغ کے دودِ پریشاں میں بھی بالکل مختلف نظر آرہی تھی۔

اُس دماغ میں جس میں ابھی تک سمجھنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی تھی اور اُس دل میں جس میں ابھی تک متاثر ہونے کی صلاحیتوں نے نشوونما نہیں پائی تھی۔ اس شعلے کا اثر وقتی طور پر پڑنے لگا۔ یہ لڑکی کا پہلا جذباتی احساس تھا۔ یہ پہلا جمالیاتی احساس تھا۔ اور یہ دُنیا کی پہلی چیز تھی۔ جس نے اس نو وارد انسانی ہستی کے احساسات لطیفہ کو چھیڑا تھا۔

غذا کی ضرورت کو ظاہر کرنے اور دودھ پینے کی صلاحیت فطرت نے خود ودیعت کر دی تھی۔ وہ مادّی اور حیوانی خواہش تھی جو خود بخود پیدا ہوتی اور جب پوری ہو جاتی تو سکون ہو جاتا، مگر چراغ کی لَو بالکل دوسری چیز تھی۔

رقصِ حیات کی دوسری کیفیت لڑکی کی ہنسی تھی۔ نرس تالیاں بجا رہی تھی۔ معلوم نہیں یہ تالیوں کی آواز تھی یا اور کوئی بات تھی کہ اس مادّے میں ہیجان پیدا ہوا اس سے پہلے لڑکی بارہا ہنس چکی تھی مگر یہ ہنسی مکمل تھی ایک آواز اُس کی حلق سے نکلی۔ یہ اس انسانی ہستی کا پہلا قہقہہ تھا۔ اُس کے ہاتھ پیر پہلے سے زیادہ حرکت کرنے لگے اور اس حرکت میں بھی مسرّت کی بیتابی تھی۔

شاید بغیر ردِ عمل کے اس رقص کی تکمیل نہ ہوتی۔ ردِّ عمل فوراً شروع ہوگیا۔ ہاتھ پیر ہلتے رہے مگر وہ خاموش ہوگئی۔ مادّہ کچھ سوچنے لگا یا شاید کوئی تکلیف پہنچی، مسرّت کی ہلکی ہلکی لہریں رُک گئیں۔ ایک لمحے تک سکون رہا۔ پھر زور کی ہوا چلی اور لڑکی رونے لگی۔ اور پھر فوراً خاموش ہوگئی۔

چلّے کے دن شام کو خاندان کی کچھ بیویاں اور کچھ اور بیگمات ملنے کے لیے آئی تھیں جب ظاہرداری کی باتیں اور غیبتیں ہوچکیں اور وہ چلی گئیں تو وہ احساس پیدا ہوا جو گھر کے لوگوں میں باہر کے لوگوں کے جانے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔

سکندر اپنے گھر پہنچا۔ اس وقت سر میں عجیب طرح کی گرانی تھی۔ چاروں طرف سر پتھر کی طرح وزنی معلوم ہو رہا تھا اور درمیان میں برف کی سی ٹھنڈک تھی۔ خدا جانے یہ کیفیت کیوں تھی۔ مگر تھی۔

آج بادل کے ٹکڑے بہت دُور دُور پر تھے اور چھوٹے چھوٹے سے تھے۔ چاند کے قریب کوئی بادل نہیں تھا اور چاندنی شفّاف تھی۔ سُلطانہ صحن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کی سیاہ ساری پر چاندنی کی موجیں بہت اچھی معلوم ہو رہی تھیں۔ معلوم نہیں اُس نے آج یہ ساری کیوں پہنی تھی۔ لیکن چاندنی میں اس سیاہ ساری کی وجہ سے اُس کا حُسن دوبالا ہوگیا تھا۔ دن کی روشنی چہرے پر کڑوی کڑوی نظریں ڈالتی ہے مگر چاندنی کے افسوں میں غضب کی عیب پوشی ہے۔ چاند کی خفیف سی زردی میں بھی ایک کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔

سکندر دوسرے پلنگ پر اپنی بیوی کے قریب بیٹھ گیا اور وہ اُس کو دیکھ کر مُسکرانے لگی۔ اُس کے چوڑے چوڑے شانے، اُس کا دہانہ، اور اُس کا بھاری فوجی جسم، جس کو وہ سمجھ

چکی تھی۔ بارہا محسوس کر چکی تھی۔ اُسے ہمیشہ عجیب و غریب سا معلوم ہوتا تھا۔ اکثر وہ اُس کو دیکھ کر مُسکراتی تھی۔ جس طرح کوئی خوبصورت ستارہ کسی بھاری بھرکم ستارے کے اطراف گردش کرتا ہو اور آنکھ بچا کے کسی اور ستارے کو اشارہ کر کے اپنے ساتھی ستارے کی جسامت دکھاتا ہو ــــ وہ بار بار اپنے آپ کو اُس کے جسم کے بھاری پن کے تصور کے مضحکہ خیز پہلو سے خوش کرتی تھی۔

میاں بیوی میں باتیں بہت کم ہوتی تھیں۔ دونوں نے خاموش طبیعت پائی تھی۔ ایک کا دماغ اپنے ناقابلِ بیان بوجھ کی وجہ سے ہمیشہ بھاری رہتا تو دوسری کے دماغ میں اطمینان، لاپروائی اور بے فکری پیدا ہو جاتی ہے۔

جس پلنگ پر وہ آ کر بیٹھا تھا، اُس پر بچہ سو رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر چاندنی کی کرنیں پڑ رہی تھیں اور اُس کے سیاہ بالوں میں چمک رہی تھیں۔ جس پلنگ پر سُلطانہ بیٹھی تھی۔ اُس پر ایک گدّے پر بچّی سو رہی تھی۔ نرس زینے پر بیٹھی ہوئی کچھ سوچ رہی تھی۔

سکندر نے اُٹھ کر اپنی بیوی کے پلنگ پر بیٹھنے کی کوشش کی۔ اُس کی بیوی نے مُسکرا کر کہا: "خدا خیر کرے" اور پھر ہنس کے کہا: "وہیں بیٹھے رہو۔ بچّی جاگ پڑے گی"

وہ پھر اُسی پلنگ پر بیٹھ گیا۔ بیوی نے مسکرا کے طنز سے پوچھا: "کیوں سنبل چڑیل کا راج ختم ہو گیا؟"

وہ اس سوال کا منتظر تھا اور ڈر رہا تھا کہ اگر رو پیٹ کے یہ سوال کیا گیا تو جواب دینا مشکل ہو جائے گا مگر اس طنز سے اور اس تبسّم سے اُس نے اطمینان سا محسوس کیا اور کہا:

"تمھارے سر کی قسم۔۔۔"

سُلطانہ نے بات کاٹ کر کہا: "خیر خدا کے لیے میرے سر کی جھوٹی قسم نہ کھاؤ۔ مجھے ابھی ان بچّوں کی پرورش کرنا ہے"

وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ لیکن فوراً یہ محسوس کر کے کہ خاموشی بھی خطرناک ہے ممکن ہے کوئی اور خیال پیدا ہو کر دفعتہً اُس کی بیوی کو بھڑکا دے اور رونے دھونے کا سلسلہ شروع ہو جائے۔ اُس نے کہا: "بیگم ریشم کی ایک نئی دوکان سکندر آباد میں کھُلی

ہے۔ کل تم بھی اماں جان کے ساتھ جا کے اپنے لیے ساڑیاں لے آؤ؛ وہ جانتا تھا کہ اس قدر رشوت بیوی کو خوش کر دینے کے لیے کافی ہے۔ اُسے بچوں کی طرح خوش کر دینے کی ضرورت تھی۔ عورتوں کی طرح خوش کر دینے کی ضرورت نہیں تھی۔

دونوں بچے سو رہے تھے اور یہ دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کے دماغ میں کوئی خیال نہیں تھا۔ پھر بھی کچھ سوچ رہے تھے۔ جس طرح دو کرّے علیحدہ علیحدہ اپنی پوری کائنات اور اُس پوری زندگی کے ساتھ جو اُن پر آباد ہو ایک دوسرے کے گرد گردش کریں۔ پھر بھی اُن کے بسنے والے ایک دوسرے سے ناواقف ہوں۔

اور دونوں بچے سو رہے تھے جو اِن دونوں کرّوں کی باہمی کشش سے ظہور میں آئے تھے۔ لیکن اب یہ ستارے علیحدہ علیحدہ شکل اختیار کر چکے تھے اور فضا اس قدر لامحدود ہے کہ معلوم نہیں۔ یہ ستارے کہاں پہنچیں گے اور کس آفتاب کے گرد چکر لگائیں گے۔

تھوڑی دیر کے بعد سلطانہ نے پوچھا "کھانا نہیں کھاؤ گے؟"

اُس کے شوہر نے کہا: "تم کھا چکیں؟"

وہ بولی: "میں تو سب کے ساتھ ہی کھا چکی"۔

اُس نے کہا: "اچھی بات ہے۔ ہمارا کھانا بھجوا دو"۔ پھر ذرا زور سے اُس نے نرس کو مخاطب کر کے کہا: "نرس دیکھو۔ کسی ماما سے کہہ دو۔ ہمارا کھانا بھجوا دے"۔ یہ کہہ کے وہ اُٹھا اور باہر چلا گیا۔

سلطانہ پلنگ پر لیٹ گئی اور چاند کی طرف دیکھنے لگی۔ چاندنی جو اب تک اُس کے چہرے پر، اُس کی سیاہ ساری پر، اُس کے بالوں پر اور صحن میں چھائی ہوئی تھی۔ اس کی جِلد سے اندر اُتر کر سرائت کر گئی اور وہ چاندنی میں ڈوب گئی۔

نرس کو خیال آیا کہ بچّی کو اندر لے جانا چاہیئے۔ وہ اُٹھ کر پلنگ کے قریب آئی۔ بچّی جاگ گئی تھی۔ اُس کے ننھے ننھے ہاتھ پاؤں آہستہ آہستہ ہل رہے تھے اور بے قابو تھے اور وہ ٹکٹکی لگائے چاند کی طرف دیکھ رہی تھی۔

چراغ کی لَو کے بعد یہ دوسری روشن حسین چیز تھی۔ جس نے بچّی کی توجّہ کو اپنی طرف

مبذول کیا۔ مگر چراغ میں اور چاند میں کس قدر فرق تھا۔ لڑکی کے حواس وادراک باوجود انتشار کے، اور باوجود اُس کہر کی سی کیفیت کے جو اس چھوٹی سی ہستی پر چھایا ہوا تھا۔ چاند میں اور چراغ کی لَو میں فرق محسوس کر سکتے تھے۔ ایک تو یہ کہ اس روشنی میں سرور تھا اور غضب کی ٹھنڈک تھی۔ بچی سمجھ نہیں سکتی تھی۔ لیکن وہ زندگی جو اس کے اندر تھی، محسوس کر رہی تھی۔

چاند کی روشنی کا احساس غالباً اُس کا پہلا روحانی احساس تھا۔ ابھی تک رُوح کے منتشر ذرّوں کو یکجائی کا ہوش نہیں آیا تھا۔ ذرّے پریشان تھے اور اس نئی زندگی کی خلا میں اِدھر اُدھر اُڑ رہے تھے۔ چاند کی روشنی اُن پر اس طرح پڑنے لگی۔ جس طرح کسی بند کمرے میں دھوپ داخل ہو اور شعاعیں جتنے حصّے پر پڑیں۔ اُس حصّے کے ذرّے دھوپ میں چمکنے لگیں۔

لیکن چاند بچّی کو بہت قریب معلوم ہو رہا تھا۔ اس قدر قریب کہ شاید اُسے مل جائے اور چاند کو حاصل کرنے کی اس خفیف سی خواہش میں اُس طفلانہ عنصر کی جھلک تھی۔ جس کی وجہ سے بچّے کھلونوں سے کھیلتے ہیں۔

جب نرس نے اس خیال سے کہ سردی زیادہ ہو گئی ہے۔ بچّی کو اُٹھا لیا تو وہ چاند سے بچھڑ کر رونے لگی۔ یہ اس قسم کا پہلا صدمہ تھا۔ اس رونے کا باعث بھوک یا کوئی جسمانی تکلیف نہ تھی۔ یہ پہلی روحانی اور قلبی تکلیف تھی ـــــ اُس قسم کی تکلیف جو محبّت میں ناکامی سے ہوتی ہے۔

لیکن ماں اُسی طرح صحن میں لیٹی سوتی رہی۔ یہاں تک کہ بادل کے ایک کالے کالے ٹکڑے نے چاند کو چھپا لیا اور پھر ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی اور وہ چونک کر اُٹھ بیٹھی۔

جس طرح بے جان مادّے میں جان پڑتی ہے۔ جس طرح جمے ہوئے، بدبودار کثیف کیچڑ میں کیڑے پیدا ہوتے ہیں اور آفرینش اور ارتقاء کے تمام مدارج طے کر کے بے جان مادّہ بڑے بڑے جانوروں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اُسی طرح وہ منتشر اور پریشان احساس اور ادراک جو اس چھوٹی سی مادّی زندگی میں تھا۔ رفتہ رفتہ ایک صورت اختیار کرنے لگا۔ دھواں

جمنے لگا۔ مٹی سے مورت تیار ہونے لگی۔ ایک بالکل نئی، بالکل ہی انوکھی مورت، اور وہ جسم جو اَب تک گوشت اور خون کا ایک بہت بڑا کیڑا تھا۔ اندر سے انسان کی شکل اختیار کرنے لگا۔

مختلف پریشان ذرّے جو مادّے کی دنیا میں منتشر تھے، یکجا ہونے لگے اور جسم کے اندر ایک آئینہ بننے لگا۔ جس میں ماحول کا عکس پڑنے لگا۔ قلب و حواس کی اس تعمیر کی وجہ یہ تھی کہ جسم کی دیواریں بھی رفتہ رفتہ اُونچی ہو رہی تھیں۔ ریشہ ریشہ آہستہ آہستہ ارتقار پذیر ہو رہا تھا۔ حرکت جو پہلے ہاتھوں اور پیروں کے بے اختیار ہلانے تک محدود تھی۔ اب منظم ہوگئی اور قابو میں آنے لگی۔ ظاہری وجوہات، حرکات کا باعث بننے لگیں۔ رونا ہنسنا زیادہ مادّی ہوگیا۔ خودغرضی بڑھنے لگی۔ اپنی ہستی کا احساس پیدا ہونے لگا اور سمجھ میں آنے لگا کہ وہ دُنیا سے الگ چیز ہے۔ ماں سے، ماں کے جسم سے محبت بڑھنے لگی اور جُدائی سے اس محبت کا احساس تیز ہونے لگا۔ ماں کے سوا نرسوں سے دلچسپی ہوگئی۔

حرکت اور زیادہ منظم ہوگئی تو جسم نے رینگنا شروع کیا۔ ہنسی بڑھ گئی، رونا بڑھ گیا کُچھ کُچھ ضد پیدا ہوئی خواہش نے صاف اور واضح شکل اختیار کرلی۔ خواہش کے پورا نہ ہونے سے صدموں کا احساس شروع ہوا۔

رفتہ رفتہ دو اور ہستیوں کو لڑکی کے حواس اور دماغ نے قبول کیا اور اُن سے مانوس ہونا گوارا کیا۔ ایک تو خود اس کا بڑا بھائی تھا۔ جو اَب تین برس کا تھا اور جو اس ننھی سی شکل کو کُچھ کُچھ سمجھتا تھا اور جب سمجھ نہیں سکتا تھا تو غیر مطمئن سا ہو جاتا تھا۔ دوسری شکل جس سے لڑکی مانوس ہوگئی تھی۔ اُس کے باپ کی تھی۔

عقیقے کے بعد جب لڑکی کے بال دوبارہ نکلے۔ تب بھی اُن میں پہلے کی سی نرمی، چمک اور ہلکا سا بھُورا پن تھا۔ یہ عجیب بات تھی کہ باپ کے بال نہایت سخت تھے۔ ماں کے بال سیاہ تھے۔ بھائی کے بال بہت سیاہ تھے۔ مگر اُس کے بال ریشم کے لچھوں کی طرح نرم اور نازک تھے۔ اور بھُورے رنگ میں ریشم کی سی چمک تھی۔ لڑکی کا رنگ بہت صاف تھا۔ اس قدر صاف کہ بہت کم ہندوستانی بچوں کا رنگ اس قدر صاف ہوتا ہے۔ اس کی صحت ابتدا سے اچھی رہی، اسی وجہ سے اُس کا چھوٹا سا جسم تروتازہ اور

شاداب تھا۔ بالوں کی وجہ سے بہت جلد اُس کی صورت کا صحیح اندازہ ہونے لگا۔ اُس کی پیشانی چوڑی تھی مگر بائیں طرف بال نیچے تک آ گئے تھے۔ آنکھیں پلکوں میں اپنی جگہ مطمئن تھیں۔ شروع ہی سے آنکھوں میں دلکشی تھی۔ جسم کی شادابی کا سب سے زیادہ حصّہ آنکھوں کو ملا تھا۔ ساری زندگی، معلوم ہوتا تھا کہ آنکھوں میں سمٹ آئی ہے۔ پورے چہرے پر تازگی، خدوخال میں تناسب تھا، ہونٹ بہت زیادہ پتلے نہ تھے۔ گال پھولے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود چہرے پر بھولپن نہ تھا اور شرارت کے خفیف ترین آثار تھے۔ چہرہ صرف تازہ، زندہ اور حساس معلوم ہوتا تھا۔ یہ ایک عجیب وغریب خصوصیت تھی جو بہت کم بچّوں میں پائی جاتی تھی۔

اور اُس کے چہرے، اس کے بالوں کے ساتھ چھوٹا سا ریشمی لباس اُس کے قد پر بہت اچھا معلوم ہوتا تھا۔

وقت گذرتا گیا اور جسم نشوونما پانے لگا۔ جس طرح درخت پانی سے سینچا جاتا ہے اور پتہ پتہ سیراب ہو جاتا ہے۔ اُسی طرح اُس جسم کی زندگی نے دنیا کے اثرات سے سیراب ہونا شروع کر دیا۔ جسم کے ریشے ریشے میں جوشِ نمو سے تازگی پیدا ہو رہی تھی۔ رگوں میں خون اس صفائی اور تازگی سے بہہ رہا تھا۔ جس طرح نہریں، کھیتوں کے بیچ، اُن کو سیراب کرنے کے لیے بہیں۔

لیکن جسم کی نشوونما سے زیادہ اہم وہ نشوونما تھی جو جسم کے اندر کی زندگی پا رہی تھی۔ ذرّہ بڑھ کر خود ایک چھوٹا سا کرّہ بن رہا تھا اور اس ارتقائی کیفیت کی وجہ سے وہ عام ذرّوں سے بالکل جدا ہوتا جا رہا تھا۔ بالکل نئی خصوصیات اُس میں پیدا ہو رہی تھیں۔ انفرادیت اس جوشِ نمو کی وجہ سے زیادہ نمایاں ہوتی گئی اور گوشت پوست کا وہ ٹکڑا جس کا نام بلقیس جہاں رکھا گیا تھا۔ اب ایک ایسی چیز بن گیا جو حقیقت میں نام کا مستحق تھا۔ نام میں جان سی پڑ گئی۔

کان جواب تک آوازیں سُنتے تھے۔ اب کُچھ کُچھ سمجھنے لگے اور سمجھنے کی وجہ سے زبان نے بھی کچھ ادا کرنا چاہا۔ مہینوں میں مہمل آوازوں سے لے کر ایک آدھ صحیح لفظ کی نوبت آئی۔ پھر یہ صلاحیت بڑھتی گئی۔ معنوں نے سماعت کی مدد سے آوازوں کو الفاظ میں ڈھالنا چاہا اور چھوٹے

سے دماغ نے کچھ بیرونی اثرات سے اور کچھ اپنی صلاحیت سے قوتِ گویائی پیدا کرنی شروع کردی۔

جسم جو اَب تک گھٹنوں کے بَل رینگتا تھا اب اُس نے اپنا وزن سنبھالنا چاہا اور ارتقاء کا وہ دوَر جس کو نسلِ انسانی طے کرچکی تھی۔ اس انسانی جسم نے پھر طے کیا اور پہلے دیوار کے سہارے پھر خود چند قدم چلنے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔

بالوں کا حُسن بڑھتا جاتا تھا۔ اس چھوٹی سی لڑکی کی دو ہی چیزیں اجنبیوں کو اپنی طرف مائل کرتی تھیں یا بال، یا چہرے کا صاف رنگ۔

اسی طرح چار سال گذر گئے اور ایک چیز جس کا پہلے بہت کم اندازہ ہوتا تھا۔ اب ظاہر ہونے لگی۔ قدرت نے اُسے احساس و ادراک کی ایک عجیب قوت عطا کی تھی۔ چار برس کے سِن سے اُس کی زندگی میں ایک بیداری سی پیدا ہونے لگی۔ اس ذہانت اور احساس کے باوجود بچپن کی شرارتیں، ضدیں اور وہ تمام باتیں جو اس سِن کے بچوں میں ہونی چاہئیں۔ اس لڑکی میں موجود تھیں۔ اُس میں اور اُس کے بھائی میں لڑائیاں ہونی شروع ہوئیں۔ ان لڑائیوں کا باعث اکثر محض رقابت ہوتی۔ مگر بھائی کو اس چھوٹی سی بچی سے بہت محبت تھی۔ کبھی کبھی وہ درگذر کر جاتا۔ مگر اکثر اس کو غصہ بھی آجاتا اور غصہ اس بات پر آتا کہ ماں اور نرس سب بچی کی طرفداری کرتے۔ بچی اُس کا کوئی کھلونا لے لیتی۔ یا توڑ ڈالتی تو اُس کو رنج ہوتا اور غصہ معلوم ہوتا مگر نرس اُسی کو سمجھاتی اور ماں اُسی پر خفا ہوتی۔ کبھی کبھی وہ تنہا پاکر اپنی بہن کو ایک آدھ تھپڑ آہستہ سے مار لیتا اور وہ زور سے رونے لگتی تو نرس اُس کی شکایت کردیتی اور ماں اُس کو مارتی۔ اُس کو بہت رنج اور بہت غصہ معلوم ہوتا اور وہ رونے لگتا۔ پھر ماں اُس کو سمجھاتی، یہاں تک کہ اُس کے ذہن نشین ہوگیا کہ بہن اُس سے چھوٹی ہے اور ناسمجھ ہے اور اُسے بہن سے محبت کرنی چاہیئے۔

پانچویں سال لڑکی کو کتابوں سے دلچسپی ہوئی جو اُس کا بھائی پڑھا کرتا تھا۔ تصویروں سے اُسے بہت دلچسپی معلوم ہوتی تھی۔ یا پھر جلدوں سے۔ بھائی کو پڑھتے دیکھ کر وہ اُسی

طرح کی آوازیں نکالنے کی کوشش کرنے لگی۔ اکثر کتابوں پر بھی اُس سے اور اُس کے بھائی سے لڑائیاں ہوتیں۔ اُسی سال اُس کی بسم اللہ ہوئی اور اُس کے بھائی کو ڈیرہ دُون بھجوادیا گیا۔

بلقیس کی ایک پھوپھی، جو ریاست کے ایک ایسے عہدہ دار سے بیاہی گئی تھیں۔ جن کا تقرّر ممالکِ محروسہ سرکارِ عالی کے ایک ضلع پر تھا، مہابلیشور جانے لگیں ان پھوپھی کے ایک لڑکی تھی جو بلقیس کی بالکل ہم عمر تھی۔ لڑکی کا نام قیصر جہاں تھا۔ مہابلیشور جانے کے بعد اُس کی پھوپھی جو پہلے سے بیمار تھیں اور تبدیل آب و ہوا کے خیال سے گئی تھیں۔ اور زیادہ بیمار ہوگئیں۔ بلقیس کے ماں اور باپ اُن کو دیکھنے کے لیے گئے اور بلقیس کو بھی ساتھ لیتے گئے۔ بلقیس اب چھ برس کی تھی۔

پلیٹ فارم پر جب ریل آئی تو وہ بہت خوش ہوئی۔ یہ پہلی مرتبہ تھی کہ وہ ریل پر سوار ہوئی تھی۔ ریل کے ڈبوں کے ہچکولے بہت زیادہ اچھے معلوم ہوئے۔ مگر سب سے زیادہ جو چیز اُسے پسند آئی۔ وہ ریل کا انجن تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ بار بار انجن کو دیکھے اور ہر بڑے اسٹیشن پر کوئی مُلازم اُسے اُتار کر انجن دکھا دیتا۔ اور جب کسی جنکشن پر زیادہ انجن اُسے نظر آتے تو وہ بہت زیادہ خوش ہوتی۔

سب اُسے کھڑکی سے جھانکنے سے روکتے رہے مگر وہ باز نہیں آئی۔ ریل کے قریب کے درخت، گڑھے اور پُل اور ٹیلے سب پیچھے کی طرف دوڑ رہے تھے۔ بیچ کا میدان گھوم رہا تھا اور بہت دُور کے درخت، جنگل اور پہاڑ ریل کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ آگے چل رہے تھے۔

یہ درخت، جنگل اور پہاڑ اُس کی کائنات سے باہر کی چیزیں معلوم ہوتے تھے اور اُن میں ایک کشش سی تھی۔ درختوں اور جنگلوں کے وحشی پن میں کوئی چیز اور بھی تھی جس سے اُس کو خوف بھی معلوم ہوتا تھا مگر وہ پیچھے مُڑ کر دیکھ لیتی تھی۔ ریل میں اُس کی ماں، اُس کا باپ، اُس کی نرس سب موجود تھے اور وہ مطمئن ہو جاتی تھی۔ پھر وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتی۔ فطرت

کی ہری بھری تروتازہ، شاداب، اور آزاد آواز اُسے اپنی طرف بُلا رہی تھی۔

مہابلیشور اُسے زیادہ پسند نہیں آیا۔ مگر وہ مکان جس میں اُس کی پھوپھی ٹھہری تھیں، اُسے اچھا معلوم ہوا۔ باہر اُس کے پھوپھا نے اُسے گود میں لینا چاہا مگر وہ اُس کو اچھے نہیں معلوم ہوئے اور وہ اُن سے ہٹ کر الگ بھاگی اور اندر آگئی۔

اُس کی پھوپھی اور اُس کی ماں میں باتیں ہو رہی تھیں۔ وہ گھبرانے لگی۔ باہر اُس کے پھوپھا اُس کے باپ سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا کرے۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ ایک پلنگ پر مُنہ کے بَل لیٹ کر پانی کے گھڑوں کی طرف اور ایک میلی میلی ماما کی طرف جو صحن میں چل پھر رہی تھی۔ دیکھنے لگی۔

جب قیصر اُس کے قریب آئی تو پہلے تو اُس کا جی چاہا کہ ہٹ جائے۔ وہ اپنے ہم سِن بچّوں سے کھیلنے کی بالکل عادی نہ تھی اور سوائے اپنے بھائی جان کے اُسے کوئی اور بچّہ اچھا نہ معلوم ہوتا تھا اور بھی کئی باتیں تھیں۔ جن کی وجہ سے قیصر اُس کو پسند نہیں آئی۔ قیصر کا رنگ صاف تھا۔ پھر بھی اُس کی صورت میلی میلی تھی۔ اُس کا چہرہ بہت گول تھا اور ہونٹ اگرچہ کہ پتلے تھے مگر کچھ عجیب طرح کے تھے۔ ان سب چیزوں کو بلقیس نے کچھ اس طرح محسوس کیا جیسے کوئی بچّہ مٹھائی پر مکھیوں کو بھنبھناتے دیکھ کر خفیف سی کراہت محسوس کرے۔

اُس نے قیصر سے باتیں تو شروع کیں مگر اس انداز سے کہ گویا وہ باتیں کر کے قیصر کی عزّت افزائی کر رہی ہے۔ قیصر اُس کے لباس اور اُس کی باتوں کی وجہ سے کچھ مرعوب ہو بھی گئی۔ اتفاق سے بلقیس کی ماں میں اور اُس کی پھوپھی میں جو باتیں ہو رہی تھیں۔ اُن کا رُخ بلقیس کی طرف پلٹا اور پھوپھی بلقیس کی تعریف کرنے لگی۔ ماں نے بلقیس کے پڑھنے لکھنے کی تعریف کی تو پھوپھی نے اُسے قریب بُلا کر پیار کیا اور قیصر کی شکایت کی جو بالکل نہیں پڑھتی تھی۔ قیصر کے دل میں حسد کی ہلکی سی جھلک پیدا ہوئی۔ مگر حسد کا یہ احساس اِتنا ہلکا تھا کہ جونہی بلقیس اُس کی ماں کے پاس سے ہٹ کر پھر پلنگ پر اُس کے قریب آکر بیٹھ گئی تو یہ احساس پھر فنا ہو گیا۔ بلقیس نے قیصر سے پھر اس طرح باتیں شروع کیں۔ گویا

اُس کی عزّت افزائی کر رہی ہے اور اس طرح ان شرائط پر آدھے گھنٹے کے اندر اندر دونوں لڑکیوں میں دوستی ہو گئی۔

دوسرے دن دوپہر کو بلقیس ایک کمرے میں پہنچی۔ کمرہ اُسے بہت پسند آیا اور اس نے اپنی پھوپھی سے اپنے لیے مانگ لیا۔ ایک بہت بڑی مسہری کمرے کے بیچ میں بچھی تھی۔ جس پر ایک بہت موٹا گدا پڑا تھا۔ ایک کھڑکی مسہری کے بالکل سرہانے کھلتی تھی۔ اس نے پہلا کام یہ کیا کہ کھڑکی کھول دی۔ مگر دھوپ کی گرمی بہت زیادہ معلوم ہوئی تو پھر فوراً بند کر لی۔ اُس کے بعد اُس نے اپنے کمرے کے سامان کا جائزہ لینا چاہا۔ بہت بڑا کالا سوٹ کیس مسہری کے نیچے رکھا تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ اس میں کیا ہوگا؟ شطرنجی جو فرش پر بچھی ہوئی تھی۔ اُسے بہت پسند آئی۔ اُس گھر میں اس قسم کی شطرنجیاں نہیں تھیں۔ ایک سِنگھار دان اندر کی طرف رکھا تھا۔ وہ کرسی پر چڑھ کر سنگھار دان تک پہنچی اور آئینے میں اپنی صورت دیکھنے لگی اور ڈھونڈھنے لگی کہ کہیں کنگھی ہو تو کنگھی کرے، مگر کنگھی نہیں ملی اور وہ نیچے اُتر آئی۔ دوسری جانب ایک قدِ آدم آئینہ دار الماری تھی۔ اُس نے الماری کو کھولنا چاہا۔ الماری نہیں کھلی تو آئینے میں اُس نے اپنی صورت دیکھی اور پھر کمرے کی ہر چیز کی طرف دیکھا۔ پھر اُسے تھکن اور نیند سی معلوم ہوئی اور وہ اُس بڑی سی مسہری پر جا کر لیٹ گئی۔ کچھ دیر تک وہ چھت کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اُسے نیند سی آ گئی۔

سال بھر بعد اُس کا نام گرلس اسکول میں لکھا دیا گیا۔ بہت جلد مدرسے کی فضا میں اُس کی زندگی بس گئی۔ پہلے تو بہت سی چیزیں جن کا مدرسے سے تعلق تھا۔ اس کے لیے ایک مستقل حقیقت بن گئیں۔ اُس موٹر کے پردے جس میں وہ مدرسے جاتی، مدرسے کے دروازے کی شکل، مدرسے کا درمیانی ہال، کلاس کا کمرہ، اُس کا اپنا ڈیسک، لڑکیوں کی باتیں، اُستانیوں کا لہجہ، یہ سب چیزیں کھانے، پینے اور نیند کی طرح روزمرہ کی حقیقتیں بن گئیں۔

پھر مدرسے کی فضا اُس پر چھانے لگی۔ اُس کا گھر مغربی فضا سے بہت کم متاثر تھا۔

اُس کی ماں تقریباً جاہل تھی۔ مدرسے کی دلکشیوں نے آرائش و زیبائش کے اُس نسوانی شوق کو جو اُس میں فطرتاً موجود تھا۔ متوجہ کرنا شروع کیا۔ مدرسے میں اکثر وہ اپنے آپ کو گھر سے بالکل مختلف پاتی۔ کبھی کبھی اُسے کسی جلسے یا کسی کھیل کے دوران میں تعجب سا ہونے لگتا کہ میں وہی ہوں۔ جو اَب سے دو تین گھنٹے پہلے ابا جان اور اماں جان سے اس طرح باتیں کررہی تھی اور اُس وقت اُسے ماں باپ بہت دُور معلوم ہوتے۔

اُس کا ذہن بھی شروع ہی سے مدرسے میں انقلابی تعلیم پانے لگا۔ وہ اُس نئی پود میں شامل تھی جو معاشرت کا نظام بدل رہی تھی۔

تعلیمی لحاظ سے اُس نے بہت جلد ترقی کی۔ مدرسے میں اُس کی خداداد ذہانت کا صحیح اندازہ ہوسکا۔ اُس کے شوق کے ساتھ ساتھ اُس کا فخر اور غرور بھی بڑھتا گیا۔ اس زمانے میں جب تعطیلات میں اُس کا بھائی ڈیرہ دون سے واپس آیا تو اُس نے ہر طرح اپنے بھائی کا مقابلہ کرنا چاہا۔ اس سلسلے میں بھائی سے ایک بہت دلچسپ لڑائی ہوئی۔

اسکول میں سات سے لے کر گیارہ سال کی عمر تک وہ بلا کسی اہم انقلاب کے پڑھتی رہی۔ اُس کے دماغ اور تخیل کی تربیت اس فضا میں ہورہی تھی۔ ہماری معاشرت ایک دورِ انقلاب سے گذر رہی ہے اور یہ دورِ انقلاب اب اس منزل پر ہے کہ لڑکیوں کی طرزِ خیال آزادی کی حد تک مغرب کی مقلّد ہے لیکن اب تک اُن پر والدین کی حکومت کا اثر باقی ہے۔

جب وہ گیارہ برس کی ہوئی تو خاندان کے اکثر بزرگوں نے پردے وغیرہ کے متعلق اصرار اور اعتراض شروع کیا اور کا ناپردہ شروع بھی ہوگیا۔ مگر ایسا پردہ جو نہ ہونے کے برابر تھا۔

اُس سال تعطیلات میں اُس کا بھائی ڈیرہ دون سے آیا۔ اُس کے بھائی کی عمر اب تیرہ سال تھی اور وہ اس مرتبہ پہلے سے بہت زیادہ سمجھدار معلوم ہوتا تھا۔ بہن کے لیے وہ بہت سی چیزیں لایا تھا۔ اُس نے بہن کے مقابلے میں ذہن بہت اچھا اور صورت

بہت خراب پائی تھی۔ اب یہ فرق اس قدر نمایاں ہوگیا تھا کہ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ دونوں بھائی بہن ہیں۔

اس مرتبہ بہن کی ہر شرارت کو وہ ٹال جاتا اور دو تین دن تک اُس کا یہ رنگ دیکھ کر بہن نے بھی کوئی ایسی شرارت نہیں کی۔ جس پر اُسے غصہ آتا۔

ایک دن ماں کے ساتھ دونوں بھائی بہن تفریح کرنے گئے تھے۔ موٹر میں پردے لگے ہوئے تھے مگر بلقیس پردوں سے باہر جھانک رہی تھی۔ اُس کا بھائی سامنے کی سیٹ پر بیٹھا تھا۔

اُس نے بلقیس سے کہا۔ "بلقیس جھانکو مت۔"

بلقیس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دوسری مرتبہ بگڑ کے اُس نے کہا۔ "بلقیس میں منع کر رہا ہوں۔ دیکھو میں پھر اچھی طرح ٹھیک کر دوں گا۔"

بہن نے ماں سے شکایت کی۔ "دیکھیے اماں جان، بھائی جان کانکو ستارہے ہیں۔"

ماں نے دونوں کو خفا ہوکر کچھ کہا۔ دونوں خاموش ہو گئے۔ بلقیس اُسی طرح غصے میں پردے سے باہر دیکھتی رہی اور اُس کا بھائی برابر، پیچھے مڑ مڑ کر اُس کی طرف دیکھتا رہا۔

پٹرول لینے کے لیے ڈرائیور نے موٹر روکی۔ ایک بگھی آہستہ آہستہ سڑک پر سے گذر رہی تھی۔ اُس میں بارہ برس کا ایک لڑکا بلقیس کو دیکھ کر مسکرایا۔ اُس کو مسکراتے دیکھ کر بلقیس بھی مسکرادی۔ بھائی نے دونوں کو مسکراتے دیکھا غصے سے اُس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ مگر اُس نے ضبط کر کے بہن سے پوچھا۔ "کیوں بلقیس تم ہنسیں کیوں؟"

بلقیس نے سادگی سے بگھی کی طرف دور سے اشارہ کر کے کہا۔ "اس بگھی میں ایک لڑکا ہم کو دیکھ کر ہنسا تو ہم بھی ہنسے۔"

مگر اُس کے بھائی کو بدستور غصہ رہا۔ اس کم سنی کے باوجود اُسے پہلی مرتبہ اس کا احساس ہوا کہ عورتیں ہمیشہ چٹان کے کنارے رہتی ہیں اور ہر لمحے اُن کے گر کر پاش پاش ہو جانے کا امکان ہے۔

۴

صحن میں آم کا ایک چھوٹا سا پیڑ تھا۔ آم کھانے کے بعد کسی ماما نے تفریحاً اُس کی گٹھلی زمین میں دفن کردی تھی۔ بہت جلد اُس میں سے پتیاں پھوٹ نکلیں۔ پھر آہستہ آہستہ نازک تنا بننے اور بڑھنے لگا۔ پتے ہوا میں ہلتے رہے اور پانی میں نکھرتے رہے۔ پورا پودا آہستہ آہستہ بڑھتا گیا یہاں تک کہ قدِ آدم سے اونچا ہوگیا اور اس کے بعد اُس میں ایک آم نکلا۔ صرف ایک آم یا تو باقی پھول جھڑ گئے تھے یا کسی نے عمداً توڑ ڈالے تھے۔ اس چھوٹے سے آم پر بہت سی نظریں پڑتی رہیں مگر کوئی ہاتھ اس تک نہیں بڑھا۔ بڑھتے بڑھتے وہ اس قدر وزنی ہوگیا کہ وہ چھوٹی سی شاخ جس میں وہ لگا ہوا تھا اُس کے بوجھ سے کچھ جھک گئی۔ آم اتنا بڑا اور اتنا خوبصورت تھا کہ سب اُس کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔

پھر گذرتے ہوئے موسم کے ساتھ اس آم میں ایک اور تبدیلی شروع ہوئی۔ ہلکی سی زردی کی لہر اُس کے کچھ حصے پر دَوڑ گئی۔ یہ شباب کی آمد تھی۔ کچھ ریشوں میں پختگی اور زردی پیدا ہو چلی۔ کچھ ریشے ابھی تک خام اور سفید تھے۔ یہ آم کے شباب کی آمد تھی۔

اس آم کی طرح آہستہ آہستہ مگر گداز کرنے والے حُسن کے ساتھ شباب کے آثار بلقیس کے جسم میں نشو ونما پا رہے تھے۔ معلوم ہو رہا تھا کہ فطرت آہستہ آہستہ خون میں بجلیاں پیس پیس کر ملا رہی ہے۔ جن کی وجہ سے زندگی میں وہ نور اور تپش پیدا ہو رہی ہے کہ وہ جلد میں مشکل سے سما رہی ہے۔

کوئی مسافر کسی مقام کو دیکھنے کی تمنا میں سفر کرے اور جب منزلِ مقصود کے قریب پہنچے تو بلندی پر، ریل سے نشیب میں اُس مقام کو سامنے پھیلا ہوا دیکھے اور ریل سُرعت سے اُسے اُس کے قریب لیے جا رہی ہو۔ مگر وہ یہی چاہے کہ منزلِ مقصود تک پہنچنے سے پہلے میں اُس کی اس زندہ تصویر کو اس زاویے سے نظر بھر کے دیکھ لوں، جیسے کوئی مستقبل کے خواب کو دیکھتا ہے۔ کچھ یہی حالت نسوانی نشو ونما کی اُس منزل کی ہے۔ جس کے فوراً بعد شباب کی منزل آجاتی ہے۔

بلقیس کا قد اپنی ماں سے کچھ بڑھ گیا تھا۔ اس کے بھورے بال اُس کی کمر تک پہنچتے تھے۔ چہرے پر ابھی تک بچپن تھا۔ مگر رخساروں، ابروؤں، لبوں اور پیشانی کے خطوط میں رفتہ رفتہ وہ لطیف کیفیت پیدا ہونے لگی تھی کہ گویا حسن کا لبریز ساغران خطوط سے چھلک جائے گا۔

چہرے کی طرح جسم بھی خون کی مستی سے مخمور اور سرشار ہوتا جارہا تھا۔ جسم کی نزاکت سے خود بخود بے ساختہ نسوانی جنبشیں پیدا ہونے لگی تھیں۔ وہ کیفیت پیدا ہونے لگی تھی جس سے نسوانی جسم کی جنبش رقصِ حیات کا ایک مکمل لمحہ بن جاتی ہے۔

برسات میں کسی دن بادل چاروں طرف سے آسمان کو گھیر لیتے ہیں۔ حدت یا آفتاب کی تمازت کا خفیف سا اثر بھی باقی نہیں رہتا۔ بادلوں سے چھن کر روشنی بھی نیم تاریک ہو جاتی ہے اور اُس کے بعد اُس چھائے ہوئے بادل سے پانی برسنے لگتا ہے۔ ہوا پتوں اور درختوں اور پرندوں کو آہستہ آہستہ چھیڑتی ہوئی چلنے لگتی ہے۔ ہر درخت پر مستی اور وجد کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ ہر پتہ جھوم کر نکھرنے لگتا ہے۔ گویا نباتی زندگی کے ہر ریشے میں بھی برستا ہوا پانی خون بن کر دوڑنے لگتا ہے۔ پرندے بھی اس خمار اور وجد کی فضا کا حصہ بن جاتے ہیں اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اس نباتی اور حیوانی سرمستی کو آہستہ آہستہ چھیڑتی ہے اور وہ کیف پیدا کر دیتی ہے جو کسی عورت کے شفاف اور حساس جسم کو مرد کے سخت ہاتھ کے نرم مس سے ہو۔

انھیں بادلوں کی طرح، اور اس چھیڑتی ہوئی ہوا اور مست کر دینے والی تازگی کی طرح شباب اُس کے جسم اور اُس کی رُوح پر چھا گیا۔ دماغ پر، اور ادراک و حواس پر وہی گھرے بادل چھائے ہوئے تھے اور اُن سے اُس کی ہستی پر آہستہ آہستہ بارش ہورہی تھی۔ اس کے جسم کے ریشے ریشے میں بارش کی تازگی سرایت کر گئی تھی۔ جسم کا ریشہ ریشہ سرشار ہو گیا تھا۔ خیالات و احساسات چھوٹے چھوٹے پرندوں کی طرح شباب کی اس تر و تازہ، شگفتہ اور شست فضا میں پرواز کرنے لگے تھے اور چہچہا رہے تھے اور جسم سے ایک بے صدا نغمہ

پیدا ہورہا تھا جس کی آواز صرف اُس کی رُوح سن سکتی تھی۔ رنگ و تازگی اور جوشِ نمو کے اس ماحول میں جذبات کی عطر بیز اور چھیڑنے والی، بیتاب کرنے والی ہوائیں چلنے لگتی تھیں۔

ایک نسوانی خصوصیت اب بڑھ گئی۔ یعنی دوشیزگی کا حجاب۔ خود بخود لرزتا ہوا ایک پردہ اُس کے اور تمام مردوں کے درمیان حائل ہوگیا اور اس پردے میں جو اختیاری نہ تھا، فطرت اور معاشرت کے اثرات سے بن گیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو کسی قدر محفوظ محسوس کرنے لگی۔ اُس نے ہر شخص کی نظروں میں ذرا سا فرق محسوس کیا اور خود اپنے آپ کو اجنبی سی معلوم ہونے لگی۔ مگر وہ بہت جلد اپنی اس نئی اجنبی کیفیت کی عادی ہوگئی۔ اس طرح جیسے نئی وضع کے کپڑے کسی کے لیے بنیں اور وہ دو ایک دن میں اُن کا عادی ہوجائے۔

اُس کی صحت ہمیشہ سے اچھی رہی تھی۔ شباب نے اُس کے جسم کو بہت گدار کر دیا تھا۔ اُس کے چہرے کے خطوط واضح ہوگئے تھے اور رخساروں میں وہ خم موجود تھا جو حُسن اور صحت سے نمایاں ہوتا ہے۔ شباب نے اُس کی آنکھوں میں رَس اور جذب پیدا کردیا تھا اور ان آنکھوں سے پورے چہرے پر ایک لطیف، نازک اور جاذب زندگی کے آثار پیدا ہوگئے تھے۔

اس طرح وہ اپنی جسمانی زندگی کے دُوسرے دَور میں داخل ہوئی۔

ایک چیز جو اَب تک طفلانہ خیالات میں چھُپی ہوئی تھی۔ اب ظاہر ہونے لگی۔ یہ اُس کا تخیّل تھا۔ چیزوں کو وہ عجیب اور نئی نئی نظروں سے دیکھتی تھی۔ کتابوں سے یہ خصوصیت بڑھنے لگی اور اُس کے طرزِ خیال کی باقاعدہ نشو و نما ہونے لگی۔ پہلے تو وہ گھبرائی کہ اکثر چیزوں کا مفہوم جو اُس کے ذہن میں پیدا ہوتا تو وہ دوسروں کے خیال کردہ مفہوم سے بالکل مختلف ہوتا۔ شروع میں اپنے آپ کو وہ کُند ذہن بھی سمجھنے لگی۔ مگر پھر رفتہ رفتہ وہ اپنی طبیعت اور تخیّل کے اس رُجحان کی عادی ہوگئی اور اس خصوصیت نے ایک باقاعدہ شکل اختیار کرنی شروع کردی۔

تمام لڑکیوں کی طرح اس نے "بلیکی" کی مطبوعہ کتابوں سے ابتدا کی۔ اس کے بعد "اینجیلا برازیل" کی کہانیاں جو اسکول کی لڑکیوں کے متعلق ہیں اُسے بہت پسند آئیں اور اُس نے لڑکیوں کی اس محبوب مصنفہ کی بہت سی کتابیں پڑھ لیں۔ اُس کے اسکول میں اُردو کا معیار یُوں بھی بہت کم تھا۔ اُردو رسالوں میں سے چند قصے کہانیاں جو اُس کی سمجھ میں آ جاتیں۔ وہ پڑھ لیتی۔

پندرہویں برس اُس کی سہیلی نے اُسے ایک جاسُوسی ناول کا اُردو ترجمہ دیا جو اُسے بہت پسند آیا۔ ماں باپ سے چُھپا کر رات کو کمرہ بند کر کے اُس نے "فسانۂ لندن" پڑھنا شروع کیا۔ فسانۂ لندن کی کچھ جلدیں اُس کے والد کے پاس تھیں مگر پوری نہیں تھیں۔ باقی جلدیں اپنی سہیلیوں سے تلاش کرا کے اُس نے منگائیں۔ اس ناول نے جا بجا اُس کے کثیف مادی احساس کو بیدار کیا۔ مگر وہ اپنے خیالات کی اس کثافت پر جھنجھلاتی اور شرماتی رہی۔ اکثر راتوں کو سوتے وقت اس قسم کے خیالات اُس کے دماغ میں جمع ہوتے۔ کچھ دیر تک وہ ان کثیف، وحشیانہ، جنسی خیالات کے سیلاب میں اپنے تخیّل کو مطلق العنان چھوڑ دیتی۔ یہاں تک کہ وہ تھک جاتی۔ ردِ عمل شروع ہو جاتا اور وہ محسوس کرتی کہ وہ گر رہی ہے۔ مگر وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتی اور اپنی خواہشات کی اس خفیف سی بے راہ روی پر اُسے گھنٹوں اپنے آپ پر غصہ آتا اور رہ رہ کر اپنے آپ کو ملامت کرتی۔

سولھویں سال وہ سینیئر کیمبرج کے امتحان میں شریک ہونے والی تھی۔ اُس کا بھائی جو اب اٹھارہ برس کا تھا۔ علی گڑھ میں پڑھ رہا تھا۔ اس مرتبہ جب وہ گھر آیا تو پہلی مرتبہ بہن بھائی میں کتابوں کی باتیں ہوئیں۔ لیکن اُس کی ذہانت کا پہلی مرتبہ بھائی کو اندازہ ہوا اور وہ اُس کی دماغی نشو ونما میں دلچسپی لینے لگا۔

جو ذہانت بلقیس کے حصے میں آئی تھی۔ اُس سے زیادہ اُس کے بھائی کو ملی تھی۔ جو برادرانہ محبت اُس کو اُس سے پہلے تھی۔ وہ اس دماغی یکجہتی اور ہمدردی کی وجہ سے بڑھ گئی۔ بلقیس اُس کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔ اُس کے بھائی کو اُس کے "فسانۂ لندن" پڑھنے

کا حال کسی نہ کسی طرح معلوم ہو گیا۔ اُس نے بلقیس کو بہت ملامت کی اور کہا۔ "خیر اخلاقی لحاظ سے تو ایسی کتابیں تمہارے لیے زہر قاتل ہی ہیں۔ لیکن ان کے پڑھنے سے تمہارا علمی اور ادبی مذاق خاک میں مل جائے گا۔"

اس دوسرے جملے کا بلقیس پر اُس کی پوری گفتگو سے زیادہ اثر ہوا۔ علی گڑھ جاتے ہوئے اُس کے بھائی نے اُسے ڈکنس اور اسکاٹ کے کچھ ناول دیے اور تاکید کی کہ اُردو میں نذیر احمد کی تمام کتابیں ضرور پڑھو۔ اس طرح کتابوں کے بدل جانے سے اُس کے دماغی ماحول میں بھی کچھ تبدیلی ہوئی۔ احساسات کا پراگندہ اور برانگیختہ کرنے والا سلسلہ رُک گیا۔ ہاں کبھی کبھی وہ اُن خالص ادبی کتابوں سے اُکتا جاتی۔ دماغ تھک جاتا اور کسی ایسی کتاب کے پڑھنے کی آرزو کرنے لگتا جس کے اثر سے خون رگوں میں زیادہ تیزی سے حرکت کرنے لگے۔

اور یہی آرزو جب زیادہ بڑھ گئی تو اس کو پورا کرنے کا ایک ذریعہ خود بخود بلقیس کے ہاتھ آگیا۔ لیکن اس مرتبہ وہ نئی چیز جو اُس نے پڑھنی شروع کی۔ رینالڈس کا کوئی ناول نہیں تھا۔ اسکول میں جو نظمیں وہ انگریزی یا اُردو میں پڑھتی تھی۔ رفتہ رفتہ اُسے بامعنی معلوم ہونے لگیں۔ پھر اُس نے محسوس کیا کہ ان نظموں میں ایک گہری، چھپی ہوئی آگ ہے۔ اور اس آگ میں اور زیادہ جلنے کے لیے اُس نے انگریزی اور اُردو شاعری کا باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا۔ نظمیں اُس کے دل میں سرایت کرنے لگیں۔ ایک چیز جس کی اُس کی ہستی کو پیاس تھی۔ حاصل ہونے لگی — اور پیاس بڑھتی گئی۔

اسی سال وہ امتحان میں کامیاب ہو گئی اور اسکول کا زمانہ ختم ہو گیا۔

۵

بلقیس محض برائے نام پردہ کرتی تھی۔ موٹر میں زیادہ سے زیادہ صرف سیلولائڈ کے پردے لگے رہتے۔ ایک دن ایک بہت بڑے مصنف کا ایک کالج میں توسیعی لکچر تھا۔ زنانے کا انتظام علیحدہ کیا گیا تھا۔ مگر واپسی پر جب وہ موٹر میں بیٹھنے لگی تو اس نے کچھ لوگوں کو

اپنی طرف دیکھتے ہوئے دیکھا۔ لڑکے ہال کے دروازے سے نکل رہے تھے اور اکثر کی نظریں اُس پر پڑ رہی تھیں۔ ہزاروں کانٹوں کی طرح وہ نگاہیں اس کو چاروں طرف سے گھیرتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔

غصّے اور شرم کے ایک احساس سے جس کو وہ مٹانا چاہتی تھی۔ اُس کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ اُس کے ساتھ جو ماما تھی۔ اُس نے ڈرائیور سے کہا "جلدی چلو"۔

اور وہ محسوس کر رہی تھی کہ سینکڑوں نگاہیں اُس کا تعاقب کر رہی ہیں۔ کچھ لوگوں کی نظروں میں محض پسندیدگی ہے۔ بعض کی آنکھوں میں خواہش ہے۔ بعض کی آنکھوں میں طلب ہے۔ بعضوں کے لبوں پر خواہش اور حقارت کا تبسم ہے۔ آپس میں وہ لوگ شاید اُس کی تعریف کر رہے ہوں گے مگر ہر زیرِ لب لفظ جو اُن کے مُنہ سے نکل رہا تھا اور جس کو وہ سُن نہیں سکتی تھی۔ اُس کے لیے ایک ذلّت تھا۔

راستے میں ہی نظریں اُسے اپنے ذہن پر چھائی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ ان نگاہوں نے ' ان نگاہوں کی ذلیل کرنے والی ناپاک آگ۔ نے اُسے چاروں طرف سے لپیٹ لیا تھا موٹر کے گدّے بھی شاید انھیں نگاہوں سے بنے تھے۔ اُن کی نرمی ان نگاہوں کی نرمی تھی۔ اُن کی ہلکی سی گرمی کا باعث اُن نگاہوں کی حرارت تھی۔

یہ نگاہیں اُسے ذلیل کر رہی تھیں۔ اُسے پسند کر کے، اُسے چاہ کے، اُسے ایک غیر مقدس دعوت دے کر اُسے ذلیل کر رہی تھیں۔ اُسے شرمندہ کر رہی تھیں۔ مگر اس کے باوجود ان میں ایک ہلکی، بہت ہلکی سی کشش تھی۔

جوں جوں وہ گھر کے قریب ہوتی جاتی۔ اس کشش کا احساس، ذلّت کے احساس پر غالب آتا جاتا۔

رات کو جب وہ سونے کے لیے لیٹی تو سوچنے لگی کہ وہ اُن سب سے بالاتر تھی جو اُسے گھور رہے تھے اور حسد کی وجہ سے اُن کی نگاہوں میں حقارت کی وہ ہلکی سی جھلک تھی۔ پھر رفتہ رفتہ اُن کی یہ حقیقت اُس پر منکشف ہونے لگی کہ یہ حقارت نہیں تھی۔ یہ خواہش تھی۔ خواہش بے اختیار ان گھورنے والوں پر چھا گئی تھی اور یوں کہ وہ اُس تک

پہنچ نہیں سکتے تھے۔ اس لیے خواہش میں غصّہ، ضد، اور مایوسی شامل تھی۔ اور ان تین چیزوں سے نگاہوں میں بیباکی پیدا ہوگئی تھی۔

اُس نے اب تک جو کچھ پڑھا تھا اُس کا ایک مِلا جُلا کثیف اثر دھوئیں کی شکلوں کی طرح پیدا ہوا۔ ان دھوئیں کی شکلوں سے اُس نے نگاہوں کا راز دریافت کرنا چاہا۔ اس دھوئیں کا احساس بڑھتا گیا۔ اس کا دماغ اور زیادہ پریشان ہوگیا۔ کچھ بال اُس کی پیشانی پر آگئے تھے۔ اُس نے انھیں ہٹایا تکیے میں اپنا مُنہ چھپا لیا اور اپنے خیالات کو دوسری طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

تھوڑی دیر تک اُس کے خیالات اپنے ماں باپ کی باتوں، اور اپنی مختلف سہیلیوں کی باتوں میں بھٹکتے رہے۔ اپنی سہیلیوں کی بعض بعض باتیں اور اُن کے بعض بعض راز یاد کر کے مُسکرائی اور پھر وہی جاذب کرنے والی نگاہیں اُسے یاد آگئیں۔

بستر کی نرمی، تکیوں کی نرمی میں اُس نے اپنے آپ کو ایک نرم، ہلکی سی آغوش میں محسوس کیا اور آغوش کا یہ احساس فوراً اُن نگاہوں سے وابستہ ہوگیا۔ اُن نگاہوں میں بھی آغوش کی کیفیت تھی — ایک مرد کی آغوش کی۔ اور وہ آغوش کا تصور کرنے لگی۔ سخت بازوؤں کی طرح اُن نگاہوں کا خیال اُسے لپیٹے ہوئے تھا اور وہ اُن محاصرہ کرنے والی نگاہوں سے آزاد ہونا چاہتی تھی مگر اُس کے اندر، اُس کے گوشت میں، اُس کے خون میں کوئی چیز ایسی تھی جو چاہتی تھی کہ یہ آغوش اور زیادہ سخت ہوجائے۔ اس قدر کہ شکنجے میں اُس کا کام تمام ہوجائے۔ اُس کا دم گھُٹ جائے۔

اُس کی سادگی اور خودداری نے تھوڑی دیر کے لیے خیالات کی اس رو کو قبول کرلیا اور وہ چٹان پر بہت اُوپر کھڑی ہو کر اپنے گِرنے کا تماشا دیکھنے لگی۔ طرح طرح کی ہوسناک شکلیں اُسے گھیرے ہوئے تھیں اور وہ اُن سب کے ساتھ مِل کر رقص کرتی ہوئی نیچے اُتر رہی تھی۔ یہاں تک کہ ہوس کے اس منظر سے اُسے ذلّت کا اس قدر سخت احساس ہونے لگا کہ اُس کی خودداری، جس نے ایک لمحے کے لیے اُسے ان خیالات میں محو ہوجانے کی اجازت دی تھی۔ پچھتانے لگی اور اُس کے بعد نیند اُس کے دماغ پر چھاگئی۔

کہیں شادی کی دعوت تھی۔ ایک رات پہلے کپڑے سل کر آئے تھے۔ ابھی تک وہ ساری بہت کم پہنتی تھی۔ کھڑا دوپٹہ اور پاجامہ جو ابھی تک کنواری مسلمان لڑکیوں کی خاص پوشاک ہے وہ بھی پہنا کرتی تھی۔ اُس نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ کپڑے پہنے اور سنگار میز کے سامنے کُرسی پر دیر تک بیٹھی رہی۔ پھر اُٹھ کے کھڑی ہو گئی۔ اطمینان اور خوشی سے مُسکرائی۔ کُرسی ہٹا کے چند قدم پیچھے ہٹی اور پھر آہستہ آہستہ آئینے میں اپنے عکس کو دیکھتی ہوئی آگے بڑھنے لگی کہ رفتہ رفتہ اُس کا پُورا جسم اور پُورا لباس آئینے کے سامنے آتا گیا۔ آئینے کے بالکل قریب پہنچ کر وہ رُک گئی۔ اطمینان سے پھر مُسکرائی، ہنسی اور کرُسی گھسیٹ کر دونوں کہنیاں میز پر ٹیک کے بیٹھ گئی۔

اور روشنی میں، اس لباس میں وہ اپنے آپ کو ہمیشہ سے زیادہ حسین معلوم ہوئی۔ پھر وہ کچھ سوچنے لگی۔ اپنے عکس میں وہ محو تھی اور یہ خیال اُسے حد سے زیادہ مسرُور کر رہا تھا کہ وہ عکس کی طرح حسین ہے۔ اُس میں بھی عکس کی سی دل فریبی ہے۔ اُسے اپنا عکس بہت پیارا معلوم ہونے لگا۔ وہ جُھکی اور آنکھیں بند کر کے آہستہ سے اپنے عکس کو چُوم لیا۔

آئینہ سرد اور بے جان تھا مگر اُس کے لبوں میں حرارت تھی۔ دفعتہً اُس کے لبوں نے بھی حرارت کی طلب محسوس کی۔ ایک خیال جو ہمیشہ اُس کے دل میں گذرتا تھا۔ اس مرتبہ پھر گذرا۔ وہ کسی کی متلاشی تھی۔ کسی خاص مرد کی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کون مرد ہے۔ مگر اُسے یقین تھا کہ وہ جب اُسے نظر آئے گا تو پہلی ہی نظر میں وہ اُسے پہچان لے گی اور وہ اُس کو پہچان لے گا۔ وہی اور صرف وہی اُس کے دل و جان پر حکومت کرے گا۔ اُس کا حُسن افسانوں کے شہزادوں کا سا ہو گا۔ اُس کے دل میں وہ آگ ہوگی جو شاعروں کی نظموں میں ہوتی ہے اور اس کے باوجود اُس میں وہ سختی اور شان ہوگی جو سیاہ پتھروں کے بنے ہوئے مقبرے میں ہوتی ہے۔ اُس مقبرے میں وہ خود قید ہو جائے گی جیسے افسانوں میں شہزادیاں قلعوں اور برجوں میں قید ہو جاتی ہیں اور وہ اُس قید سے مر کر بھی نہ نکلے گی۔ وہیں اُس کی قبر بن جائے گی جس طرح تاج محل میں ممتاز محل کی قبر ہے۔

اُس کے بعد آہستہ آہستہ محسوس لیکن نامعلوم طریقے پر اپنی ستائش، اپنے حُسن، اپنی دلفریبی کی ستائش کا ایک ہلکا سا جذبہ اُس کے قلب میں پیدا ہونے لگا۔ اپنا جسم، اپنی صورت، اپنی باہنیں، اپنی کہنیاں اُسے اچھی معلوم ہونے لگیں۔ کبھی کبھی وہ آئینے میں اپنے جسم کے مختلف حصّوں کو دیکھتی، اور ایک ہلکا سا اشتعال محسوس کرتی۔

اپنے آپ سے محبت کی وجہ ممکن ہے۔ محض یہی ہو کہ اُس کا جسم اُس کا اپنا تھا۔ وہ خود اُس کی مالک تھی مگر یہ احساس ہمیشہ ایک اور پُر لطف، پُر کیف احساس میں بدلتا رہتا وہ خود نسوانیت کے لطیف خوابوں میں تحلیل ہو جاتی۔ اپنے جسم پر اُسے اختیار نہ رہتا۔ دوسری جنس کا ایک اور شخص، لیکن صرف ایک شخص کسی نامعلوم مُلک سے آجاتا اور آئینہ میں اُس کا عکس دیکھ کر کہتا: "یہ تو میرے لیے بنائی گئی ہے۔" وہ مُسکرا کر پلٹتی: "آئینے کا عکس تو محض بے جان ہے۔ مَیں تمھارے لیے بنائی گئی ہوں۔" اور اُس کے بعد وہ اُس نوجوان کی ہستی میں جذب ہونے لگتی۔ جس طرح روشنائی جاذب میں جذب ہو جاتی ہے اور اگر اُس کا نشان باقی بھی رہتا ہے تو جاذب پر، جاذب ہی کا ایک حصّہ ہو کر۔

وہ خود اِن جنسی رُجحانات کو اچھی طرح سمجھ سکنے سے قاصر تھی۔ راستے میں اُس کی نظریں مردوں پر پڑتیں۔ اُن سے وہ منافرت سی محسوس کرتی۔ گھر میں کچھ لوگ جو اُس کے والد یا اُس کے بھائی سے ملنے آجاتے، اُن میں کسی کی کوئی بات اگر اُسے کبھی پسند بھی آتی تو تھوڑی دیر کے بعد کوئی اور بات اس قدر شدّت سے ناپسند آجاتی کہ اِسے اِن سے کراہت سی معلوم ہونے لگتی۔ وہ کھلّم کھلّا ان لوگوں کے سامنے نہیں آتی تھی۔ اکثر یہ ہوتا تھا کہ یہ اُن کو دیکھتی تھی اور وہ اُس کو نہیں دیکھ سکتے تھے مگر بہت کم یہ محض اُن کو دیکھنے کے ارادے سے دیکھتی تھی۔

اپنے تمام عزیزوں کو باقاعدہ جانچنے کا اُسے موقع ملتا تھا۔ ان سب میں وہ باہم فرق محسوس کرتی تھی۔ کوئی اُسے زیادہ پسند تھا کوئی کم۔ مگر کوئی ایسا نہ تھا جو اُس منظورِ نظر شاہزادے میں تحلیل ہو سکتا جس کا اُس کی نسوانیت کو انتظار تھا۔

اکثر وہ اس خیال سے کانپ اٹھتی تھی کہ اگر کہیں اُس کے والدین نے زبردستی اُس کی شادی کردی تو وہ کیا کرے گی؟ اُس کا کیا حشر ہوگا؟

٦

وہ اپنی ماں کے ساتھ کسی سے ملنے گئی تھی۔ واپس آنے کے بعد معلوم ہوا کہ قیصر اپنے والدین کے ساتھ آنے والی ہے اور اُس نے اس وجہ سے کہ قیصر آنے والی تھی اُس سے ایک ہلکی سی بیگانگی محسوس کی اور کچھ دیر تک وہ ایک تخت پر پاؤں لٹکائے قیصر کے متعلق سوچتی رہی۔ یہاں تک کہ اُس کی ماں نے کہا "بلقیس کیا اونگھ رہی ہو؟"

صبح کو نو بجے کے قریب یہ لوگ آئے۔ کچھ دیر تو وہ عمداً اپنے کمرے میں بیٹھی رہی۔ باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ اُس کی ماں نے کئی بار اُسے پکارا۔ ماما نے آکر دروازہ کھٹکھٹایا اُس نے ہر بار یہی جواب دیا "ابھی آتی ہوں"۔ چلا کے اپنی پھوپھی کو سلام کیا۔ پھر بھی نکلنے میں جس قدر دیر ممکن تھی، کی۔

پھوپھی نے اُس کی بلائیں لیں اور اُس نے خفیف سی کوفت اور شرم محسوس کی۔ پھر بھی وہ مسکرائی۔ قیصر سے وہ بہت سرد مہری سے ملی۔ قیصر کے برتاؤ میں بھی خفیف سی اجنبیت اور بیگانگی تھی۔ دونوں کے دلوں کے اندر بلا کسی خاص وجہ کے کوئی چیز بالکل سرد تھی۔ بلقیس کی ذہنی فضا اس قدر مختلف تھی۔ اُس کی اپنی دنیا اس قدر جداگانہ تھی کہ قیصر سے اُس نے دُوری سی محسوس کی۔

پھر بھی اس خیال سے کہ قیصر اُس کے یہاں مہمان آئی ہے اور خاطر داری اُس پر فرض ہے۔ اُس نے ظاہری اخلاق سے ہنس ہنس کے قیصر سے باتیں کیں۔ کوئی چیز تھی جو حجاب کی طرح ان دونوں لڑکیوں کے اخلاص میں مائل تھی۔ قیصر اُس کے ساتھ اس کے کمرے میں آئی۔ بلقیس نے اُسے چند خاص خاص چیزیں دکھائیں۔ اُس کی باتوں میں فخر کا ایک خفیف سا شائبہ تھا۔ جس سے قیصر نے ذلت سی محسوس کی۔

بلقیس نے محسوس کیا کہ ایک دن میں گھر کی فضا بالکل بدل گئی ہے۔ پہلے وہ خیالی دُنیا

میں بالکل اکیلی تھی۔ یہ خیالی دُنیا تصوّرات، تخیّلات اور خاص قسم کی دُنیا تھی۔ گھر کے آدمی ایک مشین کے پُرزے تھے جو روزانہ حسبِ معمول حرکت کرتے تھے اور وہ اُن کی عادی ہو گئی تھی۔ ان مہمانوں کی آمد سے اُسے معلوم ہوا کہ اس خیالی دُنیا میں جیتے جاگتے آدمیوں نے قدم رکھا ہے۔ گویا ان لوگوں کی آمد سے خیالات کی وہ پاکیزہ فضا مکدّر ہو گئی اور اُس میں عامیانہ پن پیدا ہو گیا۔ پھر بھی اس تبدیلی سے اُس نے مسرّت سی محسوس کی۔

رفتہ رفتہ وہ قیصر کی باتوں کی عادی ہونے لگی۔ وہ نفرت آمیز مغائرت رفتہ رفتہ زائل ہونے لگی اور قیصر کے لباس، اس کے کھڑے دوپٹے کی چُنٹ، اُس کی سیدھی مانگ، اُس کے سیاہ بالوں سے وہ مانوس ہونے لگی۔ قیصر کے چہرے کی گول گول ساخت کو اُس کے دماغ نے بلا کسی مغائرت کے پھر قبول کر لیا۔ قیصر کے رُخسار پر ایک ہلکی سی شکن تھی۔ اس شکن سے، اور اُس کے دہانے کی ساخت سے شباب کا جوش اُبلتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ باتوں میں اُس کے بالائی لب پر اکثر پسینہ آجاتا تھا۔

ایک دن قیصر نے اُس کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور کہا: "بہن تم کو معلوم ہے تمھارا پیام آیا ہے؟"

بلقیس کے چہرے کا رنگ دفعتہً فق ہو گیا۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ قیصر بے اختیار شرارت سے مسکرانے لگی اور بولی: "اس قدر بدحواس کیوں ہوئی جا رہی ہو؟"

بلقیس کچھ اور پوچھنا چاہتی تھی ــــــ شاید یہ کہ پیام کہاں سے آیا ہے۔ کیوں آیا ہے مگر دفعتہً ایک اضطراب کی سی کیفیت اُس کے چہرے پر نمایاں ہو گئی۔ وہ کچھ نہ پوچھ سکی۔ صرف یہ خیال اُس کی آنکھوں پر، اُس کے چہرے پر استفسار بن کر جھلک رہا تھا کہ اُسے کچھ پوچھنا ہے کچھ دریافت کرنا ہے۔

قیصر کی نگاہیں اُس کے بدلے ہوئے رنگ، اُس کے چہرے کی زردی، اس کے انداز کی اس دفعتہً تبدیلی سے ہوتی ہوئی اُس کے دل تک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

اُسے کچھ اور شبہ ہوا کہ شاید کوئی اور گہرا راز ہو۔ مگر اُس نے بہت ہمدردی سے پوچھا

"کیوں بلقیس شادی کے ذکر سے تم اس قدر چپ چپ کیوں ہوگئیں؟"

دفعتہً بلقیس نے اس طرح جیسے کوئی آخری اُمید کا سہارا ڈھونڈھتا ہے اور اُسے اس سہارے کا یقین ہوتا ہے۔ پوچھا "اچھا تم کو معلوم ہے۔ پیام منظور کرلیا گیا"

قیصر نے شوخی سے کہا "اگر منظور کرلیا گیا ہے تو مٹھائی کھلاؤگی؟"

بلقیس نے ہنس کر کہا مگر اُسے خود اپنی ہنسی جھوٹی معلوم ہوئی "اچھا تو آپ اب تک مذاق فرما رہی تھیں؟ پیام آیا ہوگا اور تمھارا آیا ہوگا۔ میرے دشمنوں کا کیوں آتا؟"

قیصر نے کہا "تمھارے سر کی قسم تمھارا پیام آیا ہے۔ کوئی انجنیئر ہیں۔ ولایت۔ پاس شدہ ہیں۔ لیاقت علی اُن کا نام ہے۔ صرف رنگ ذرا سانولا سانولا ہے۔ تو تم رنگ لے کے کیا کروگی؟ چاٹوگی؟ تین سو روپے کے نوکر ہیں۔ میرے خیال میں تو ماموں ابا کو یہ پیام فوراً منظور کرلینا چاہیے ہاں اب تمھارا دل کسی اور جگہ اٹکا ہو تو دوسری بات ہے۔"

بلقیس نے کہا "سچ سچ بتاؤ، پیام ابھی تک منظور تو نہیں کیا گیا"

قیصر ہنس کر بولی "گھبراتی کیوں ہو؟ کر ہی لیا جائے گا۔ ایسی نسبتیں کہیں روز روز ہوتی ہیں۔"

بلقیس نے آہستہ سے کہا "خدا ہی اس بلا کو کسی ترکیب سے ٹالے"

قیصر بولی "تو کیا آپ کسی اور پر عاشق ہیں؟"

بلقیس نے جھنجھلا کر کہا "قیصر تم اس قسم کی دیوانے پن کی باتیں مت کیا کرو" اُس کا لہجہ اس قدر ناگواری کا تھا کہ قیصر خاموش ہوگئی اور سوچنے لگی کہ اس کی تہ میں کیا راز ہے۔ طرح طرح کی رنگین داستانیں اُس کے دماغ میں منڈلانے لگیں۔

بلقیس کے چہرے کا رنگ بدستور فق تھا۔ وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ اُس کے قلب میں اچھا خاصا اختلاج تھا۔ آپ ہی آپ اُسے سخت، بہت سخت اُلجھن معلوم ہو رہی تھی۔ خیالوں، آرزوؤں، تمناؤں، اُمیدوں، جاگتے ہوئے خوابوں سے جو طلسمی قصر اُس نے سالہا سال کے تخیل اور کئی سال تک تعلیم پانے کے بعد بنایا تھا۔ یکلخت بیخ و بنیاد سے لرز گیا۔ ایک شدید زلزلے نے اُس کے تصورات کی آبادی کو آناً فاناً درہم برہم کردیا۔ طلسمی قصر گرنے کے

قریب تھا اور وہ قید ہو کے دوسرے قلعے میں جانے والی تھی۔

قیصر کی مستفسر نگاہیں اُس کے اندر تک پہنچ کر کوئی رنگین عشقیہ افسانہ تلاش کرنا یا تصنیف کرنا چاہتی تھیں۔ وہ اُن نگاہوں کا مطلب سمجھ گئی اور ایک عجیب و غریب حقارت آمیز مسکراہٹ اُس کے لبوں پر نمودار ہوئی۔

عام مردوں کے متعلق اُس کا تصور کسی قدر بیگانگی اور نفرت کا تھا۔ ایک تو یہ کہ وہ ہمیشہ پڑھتی آئی تھی کہ یہ لوگ معصوم لڑکیوں کو عشق اور محبت کے دلکش خواب دکھلا کر ہمیشہ کے لیے تباہ کر ڈالتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ حیوان جو مردوں کی آوازیں، اُن کی بیباکی میں، اُن کی جسمانی قوت میں، اُن کے سخت چہرے میں، اُن کی چال ڈھال وضع قطع میں اور سب سے زیادہ عورتوں سے بات چیت کرنے میں، تاک لگائے ہوئے بیٹھا نظر آتا ہے۔ اُس حیوان سے وہ ہمیشہ خائف رہتی تھی۔ ہمیشہ وہ اُس خیال سے بے چین اور لرزہ براندام ہو جاتی تھی کہ یہ وحشی حیوان اچانک اُس پر حملہ کرے گا۔ اُس کے خونخوار پنجوں سے اُس کا ریشمی لباس جابجا چاک ہو جائے گا۔ اس کے نازک گوشت میں یہ پنجے دھنس جائیں گے اور یہ حیوان اُس کا خون چوس لے گا۔

اپنی شادی اور اپنے شوہر کے متعلق ایک خاص تصور اُس کے ذہن میں موجود تھا وہ اُس کا انتظار کر رہی تھی۔ جب وقت آئے گا تو وہ خود اُس کو ہزاروں مردوں میں سے ڈھونڈ نکالے گی۔ پہلی ہی نظر میں دونوں پہچان لیں گے کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو سمجھ جائیں گے۔ ایک دوسرے کی خوشیوں کا لحاظ کریں گے۔ شادی کے بعد دونوں بالکل ایک ہو جائیں گے۔ یہاں تک کہ شاید موت بھی اُن کو چھڑا نہ سکے گی۔ وہ جانتی تھی کہ ایک اور صرف ایک مرد دنیا میں ایسا ہے جو اُس کے لیے بنا ہے اور ڈرتی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اسے نہ مل سکے۔ یہ کسی اور کی نذر کر دی جائے اور وہ اسے کبھی نہ پا سکے یا جب پائے تو بعد از وقت پائے۔

اُس نے خیال کیا: "فرض کرو۔ جس کا پیام آیا ہے وہ وہی ہو۔ وہی شخص جس کی میں

تمنا کرتی رہی ہوں۔ مگر فوراً قلب کے اندر سے کسی سچی آواز نے اسے جھٹلایا۔ ابھی شادی کی کیا جلدی ہے؟ وہ ابھی شادی کرنا نہیں چاہتی۔ وہ اپنی زندگی بدلنا نہیں چاہتی۔ وہ ابھی الف لیلہ کے اس طلسمی قصر میں خوش ہے۔ یہ قصر کیوں ڈھایا جارہا ہے۔ یہ دُنیا کیوں مٹائی جارہی ہے؟ وہ ابھی سونا چاہتی ہے۔ لوگ اُسے کیوں جگا رہے ہیں؟۔

قیصر اُس سے خفا ہو کے چلی گئی۔ وہ کچھ پڑھنے لگی۔ کتاب کی سطروں پر سے اُس کی نظریں بغیر کچھ سمجھے گذرتی چلی جاتی تھیں۔ وہ اُن کا مطلب سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ وہ اُس قدر پریشان کیوں ہے؟ اور پریشانی کی وجہ جس کا وہ اس سے قبل متعدد بار اپنے ذہن میں تجزیہ کر چکی تھی، از سرِ نو اُس کی سمجھ میں آنے لگی۔ اُس کی اس زندگی کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ اُسے زبردستی، بغیر اُس کی مرضی کے، بغیر اُس کی خواہش کے اس مکان سے نکالا جارہا ہے، اور وہ مجبور ہے۔ وہ دوسروں کے اختیار میں ہے۔ وہ اپنے دماغ کی مالک ہے، اپنے حواس کی مالک ہے۔ اپنے دل کی مالک ہے مگر خود اپنی مالک نہیں۔ اُس کے والدین کو اختیار ہے کہ اُسے جس کو چاہیں دے ڈالیں۔ وہ انسان نہیں ہے موم کی گڑیا ہے۔ وہ جسم رکھتی ہے جان رکھتی ہے۔ جسم پر اُس کا اختیار نہیں اور اُس کی جان اُس کے جسم کے اندر قید ہے۔ جن لوگوں کی اُس کے جسم پر حکومت ہے۔ اُس کی جان پر بھی حکومت ہے۔

بغاوت؟...... بغاوت کی اُس میں صلاحیت ہی بہت کم تھی۔ پھر وہ سوچنے لگی میری بغاوت میرے والدین کو اس قدر صدمہ پہنچائے گی کہ اُن کی جان لے کر رہے گی۔ میں خاندان بھر میں بدنام ہو جاؤں گی اور خاندان شہر بھر میں بدنام ہو جائے گا۔ بالآخر اُس کی آزادی، اُس کی انفرادیت، اُس کے جذبات نے ہتھیار ڈال دیے۔

یہ کون شخص تھا جو اُس کی زندگی کا، اُس کی رُوح کا، اُس کے جسم کا، اُس کے گوشت کا، اُس کے خون کا مالک بننے والا تھا۔ بلقیس سوچ رہی تھی اور دل میں دعائیں مانگ رہی تھی

کہ ابھی نسبت کی پخت و پز نہ ہو۔

وہ اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ کمرے کی ایک ایک چیز کو اُس نے دیکھنا شروع کیا اُسے یقین نہیں آیا کہ اس کمرے کی فضا جو اُس کے وجود سے بسی ہوئی تھی۔ اُس سے بالکل چھوٹ جائے گی۔ یہ سب چھوٹی چھوٹی پیاری پیاری چیزیں چھوٹ جائیں گی۔

ماں کی محبت اُس کے دل کے کسی دُور اُفتادہ گوشے میں اب تک سو رہی تھی۔ اب وہ محبت جاگ اُٹھی۔ اپنی ماں کے سفید ہوتے ہوئے بالوں سے، اس کی جھنجھلاہٹ سے یہاں تک کہ اُس کے غصے سے اُسے محبت معلوم ہونے لگی۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ کسی طرح اپنی ماں کی خیالی تصویر کو اپنے دل کے اندر اُتار لے۔ اپنے باپ سے اُسے یوں بھی محبت تھی۔ اب یہ محبت اور زیادہ بڑھ گئی۔ اُس کی صحت کی طرف سے اُسے بے اطمینانی پیدا ہونے لگی۔ شہر کے دُور دراز حصوں میں پلیگ پھیلا ہوا تھا۔ اُسے یہ اندیشہ ہونے لگا کہ کہیں اُس کے باپ کو بھی پلیگ نہ ہو جائے۔ خود بخود یہ اندیشہ پیدا ہوا۔ یہ اندیشہ اُسے فضول اور احمقانہ سا معلوم ہوتا تھا۔ پھر بھی دل میں ڈر رہی تھی۔ اپنے بھائی کو دیکھنے کو جی چاہنے لگا۔ بھائی جان کی تعطیلوں کو ابھی بہت دن باقی ہیں۔ معلوم نہیں۔ وہ اُس کو زندہ دیکھیں گے یا اُن کے آنے تک وہ ختم ہو جائے گی۔ ایک عجیب، مضحکہ خیز مظلومانہ احساس اُس کے ذہن میں یہ پیدا ہو رہا تھا کہ شادی اُس کے لیے پیامِ مرگ ہوگی۔

اُسے اپنے اس انقلاب پر حیرت ہوئی۔ پیام کا علم ہونے تک وہ بالکل دوسری چیز تھی۔ اُس کی نسوانیت زندہ تھی۔ آزاد تھی اور اب اس پیام کے علم نے اسے بالکل بدل دیا۔ اُس کی شخصیت، اُس کی خودی فنا ہونے لگی۔ وہ ایک معمولی ہندوستانی لڑکی بن گئی جس کے والدین حسبِ دستور بغیر اُس کی مرضی کے اُسے دوسری جگہ منتقل کر رہے تھے جیسے کوئی اپنے مکان کے پرانے فرنیچر کو بیچ ڈالتا ہے۔ ہاں اُس میں اور اُس پرانے ٹوٹے ہوئے پلنگ میں جو برآمدے میں پڑا ہوا ہے، کیا فرق تھا؟ وہ پلنگ بھی کسی کو دے دیا جائے گا۔ وہ بھی کسی کو دے ڈالی جائے گی۔ یا شاید یہ سب اُسی کی غلطی تھی۔ اُس نے تعلیم پا کے، اور کتابیں پڑھ پڑھ کے اور اپنی ساتھی لڑکیوں کی مثالیں دیکھ دیکھ کے اپنے آپ کو دھوکا دے رکھا ہو۔ وہ

ہندوستان کو، اپنے گھر کو، اپنی اصلیت کو بھول گئی ہو۔

قیصر کے والد کا تار آیا۔ وہ بہت سخت بیمار ہو گئے تھے۔ انھوں نے تار دے کر اپنی بیوی اور اپنی لڑکی قیصر کو بلایا تھا۔ شام کی گاڑی سے یہ لوگ روانہ ہونے لگے۔ سب پریشان تھیں۔ قیصر کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ بلقیس کو اس پر ترس آرہا تھا۔

قیصر سوار ہو رہی تھی۔ اُس کا ایک پاؤں زینے پر تھا کہ اُس نے جھک کر چپکے سے بلقیس کے کان میں کہا: "میں تم سے کہنا بھول گئی تھی۔ تمھارا پیام منظور کر لیا گیا ہے۔ نسبت پختہ ہو چکی ہے۔"

بلقیس نے نیم بے خبری میں یہ الفاظ اس طرح سُنے۔ جس طرح کوئی قیدی اپنی سزائے موت کا حکم سُنتا ہے اور سمجھ نہیں سکتا۔

لیکن وہ بغاوت کیوں نہ کرے؟ کیوں نہ وہ شادی سے انکار کر دے؟ پھر کیا ہوگا؟ امّاں جان دو تین دِن تک کھانا نہیں کھائیں گی۔ ابا جان کے دوستوں کو معلوم ہوگا تو وہ اس کا ڈھنڈورا پیٹیں گے۔ ابا جان کو بھی شاید قلق ہو۔ قلق ضرور ہوگا۔ دیکھنے میں وہ لاکھ بے پروا ہوں مگر اُن کو رنج ضرور ہوگا۔ معلوم نہیں۔ کن کن نئے ہنگاموں سے سابقہ پڑے۔ اعزّہ جو اُس کی تعلیم سے جلتے ہیں۔ اُسے ضرور بدنام کریں گے۔ خدا جانے کیا کیا قصے تراشیں گے۔ کہیں گے کہ معلوم نہیں اس کی تہ میں کیا راز ہے۔ خیر اُسے تو اُن کی بکواس کی کوئی پروا نہیں۔ مگر اُس کے باپ کا سینہ یہ طعنے سُن سُن کر چھلنی ہو جائے گا۔

یا اللہ یہ کیا زبردستی ہے۔ کیا اُس کے جسم میں روح نہیں؟ کیا اُس میں زندگی نہیں پھر روح کے ساتھ اُس کو قدرت نے دماغ کیوں دیا اور والدین نے تعلیم کیوں دلائی؟۔

اُس کا دماغ پریشان تھا۔ رات کو اُس نے عجیب عجیب خواب دیکھے۔ صبح کو جب وہ سو کر اٹھی تو اُس کے سر میں ہلکا ہلکا درد تھا۔

اُس کے جہیز کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اب وہ اُس اُلجھن کی عادی ہو چکی تھی مگر اب ایک نئی خواہش پیدا ہوئی تھی۔ وہ ایک مرتبہ اپنے منسُوب کو دیکھ لینا چاہتی تھی تاکہ کوئی مستقل رائے قائم کر سکتی لیکن اُس کی یہ خواہش شادی سے پہلے پوری نہ ہو سکی۔

شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ ایک زندگی فروخت کی جا رہی تھی۔ عجیب تر بات یہ تھی کہ بیچنے والے زندگی کے ساتھ زر کی صورت میں اُس کی قیمت بھی خود دے رہے تھے۔ اور اس قیمت یعنی جہیز کے دینے پر اُن کو ناز تھا لیکن اصل قیمت خود اُس زندگی کو ادا کرنا تھی۔

شادی کی تقریب میں عام جاہلانہ رسوم کی پابندی بہت کم کی گئی۔ تعلیم سے اگر کوئی فائدہ ہوا تو محض اتنا کہ اس خیال سے کہ لڑکی تعلیم یافتہ ہے۔ بہت سی تکلیف دِہ رسوم و قیوُد میں وہ گرفتار نہیں ہوئی۔

۷

حجلۂ عروسی بہت زیادہ آراستہ نہ تھا۔ کوٹھے پر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ جس میں ایک ہی دروازہ تھا۔ باقی تین طرف روشن دان تھے۔ بیچ میں ایک شِشدرہ رکھا ہوا تھا اور کمرے کے ایک حصے میں کونے سے لگی ہوئی مسہری بچھی تھی۔

وہ سُرخ کپڑے پہنے، تقریباً بے جان، مسہری پر پڑی ہوئی تھی۔ پُورا کمرہ عطر میں بسا ہوا تھا۔ قریب ہی وہ آیا بیٹھی تھی جو میکے سے اُس کے ساتھ آئی تھی۔

بلقیس انتظار کر رہی تھی۔ کچھ اس طرح وہ اُس آنے والے اور اپنی زندگی پر قبضہ کرنے والے اجنبی کا انتظار کر رہی تھی۔ جس طرح افریقہ کے وحشی جنگل میں مردم خوار باشندے، کسی سیاح عورت کو اپنے خونخوار دیوتاؤں پر قربان کرنے کے لیے لے جا چکے ہوں۔ آگ سلگائی جا چکی ہو اور وہ اُس کی منتظر ہو کہ کب یہ شعلے چاروں طرف سے لپیٹ کر اُسے بھُون ڈالیں گے۔

دفعتہً وہ آیا جو اُس کے ساتھ آئی تھی۔ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ کسی نے کمرے کے باہر سے

اشارہ کیا ہوگا۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ آیا کمرے کے باہر چلی گئی اور اُس نے یہ محسوس کیا کہ اُس کے بدن سے رُوح پرواز کر رہی ہے۔ اُس کے ہاتھ پیر ساکن اور بے قابُو تھے۔ سارا خُون دماغ میں اور دل میں اُمنڈ آیا تھا۔ کنپٹی کی رگوں میں خُون کا دباؤ معلوم ہو رہا تھا اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

قدموں کی چاپ معلوم ہوئی اور اُس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ دل دھڑکتے دھڑکتے سینے سے باہر نکل آئے گا۔ کنپٹی کی رگیں پھٹ جائیں گی۔ عجیب قسم کا خوف و ہراس اُس پر طاری ہونے لگا اور وہ سب کچھ بھُول گئی۔ گویا کوئی بہت ہی خوفناک خواب اُسے نظر آ رہا ہے۔ وہ جانتی ہے کہ یہ خواب ہے مگر جاگ نہیں سکتی۔ اُٹھنا چاہتی ہے مگر اُٹھ نہیں سکتی ..... اور اُس کا پُورا جسم، جسم کے اندر کی رگیں اُس کے اعصاب سب مفلُوج تھے۔ صرف حواس پوری تیزی سے کام کر رہے تھے۔

متضاد، وحشت ناک احساسات سے وہ کانپ رہی تھی۔ اجنبی جھک کر اُس کے چہرے کو، اُس کے رُخساروں کو، اُس کے لبوں کو وحشیوں کی طرح چوُم رہا تھا۔ اس طرح جیسے کوئی وحشی درندہ، کسی حسین اور خوبصورت جانور کا خون پیتا ہے۔

اور اجنبی عاشقانہ لفظوں میں اُسے مخاطب کر رہا تھا۔ اُسے اپنے "دل کی ملکہ" اپنی "پیاری" اور خدا جانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔

اُس نے ہمت کر کے آنکھیں کھولیں اور اپنے شوہر کو دیکھنا چاہا۔ پہلی مرتبہ دیکھنا چاہا اُسے جو کچھ نظر آیا۔ وہ محض یہ تھا کہ انسانی چہرے کا گوشت لوہے کی طرح سخت تھا۔ چہرے پر جذبات نے بہیمیت پیدا کر دی تھی۔ آنکھیں شکاری کی خوفناک شکار کرنے والی آنکھیں تھیں اور اُس کا پُورا جسم، مجبور کرنے والا، مار ڈالنے والا، فنا کر دینے والا جانور تھا۔ جس کے پنجوں میں وہ بے بس تھی۔

اس طرح اُس گُناہِ عظیم کا، جس کو دُنیا کے ہر قانون نے جُرمِ سنگین قرار دیا ہے۔ اُس کے والدین کی مرضی سے، بغیر اُس کی رضامندی کے، اُس کے ساتھ قانوناً ارتکاب کیا گیا۔

بالآخر وہ اجنبی مرد جو اُس کا شوہر، اُس کی آئندہ زندگی کا شریک، اس کے جسم کا

مالک اُس کے جذبات کا حاکم تھا سو گیا وہ بدستور جاگ رہی تھی۔ یہی وہ شخص تھا؟ کیا یہی وہ شخص تھا۔ جس کے لیے وہ زندگی بھر طرح طرح کے خوش آئند خواب دیکھتی رہی تھی؟ مگر یہ وہ نہیں تھا۔ یہ تو غاصب ہے۔ اُس جگہ کا غاصب ہے۔ اُس کی زندگی کا شریک کوئی اور شخص ہونے والا تھا۔ کوئی ایسا شخص، جو اگر اُس کے جسم کا مالک ہوتا تو یہ بھی اُسی طرح اُس کے جسم کی مالک ہوتی، اُس کے جسم سے اس کے جسم کو، اور اُس کی رُوح سے اس کی رُوح کو محبت ہوتی۔ دونوں کے جسم کا خون ایک ہو جاتا۔ وہ اُس کے جسم کی طرح اس کی رُوح کا بھی مالک ہوتا۔

اُس نے اُس کی طرف دیکھنا چاہا مگر دوشیزگی کی جھجک نے جو اَب تک اُس کی آنکھوں میں اور اُس کے نازک پاکیزہ احساسات میں باقی تھی۔ اُس کی نگاہوں کو روک لیا پھر اُس نے اس مرد کے چہرے کو اچھی طرح دیکھنا اور سمجھنا چاہا۔ اُس کے بال بہت سیاہ تھے اور پیشانی پر اُلٹ آئے تھے۔ پیشانی چوڑی تھی۔ لبوں میں اور بُشرے پر سختی تھی۔ اس قدر سختی کہ جس سے بلقیس کو خفیف سی کدورت، خفیف سی نفرت اور خفیف سا خوف معلوم ہوا۔

وہ اپنے گھر آئی ہے۔ چوتھی میں اپنے میکے آئی ہے۔ مگر وہ محسوس کر رہی ہے کہ اُس کا جسم ایک کثافت میں لپٹا ہوا ہے۔ کیا اُس مرد کے آغوش کی کثافت اُس کے جسم سے، اُس کی جلد سے لپٹ گئی ہے۔ یہ خالص شرم نہیں۔ اس میں کچھ تکلیف بھی شامل ہے۔ نسوانی تکلیف۔ چونکہ اُس کی نسوانیت ذلیل ہو چکی ہے۔ شبِ عروسی کو ایک درندے کے ہاتھوں نیچا دیکھ چکی ہے، اور اُس کی ذلت سے سب واقف ہیں۔ اس لیے وہ آنکھیں چار نہیں کر سکتی۔

اُس نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ لیکن اگر اُس نے گناہ کیا بھی ہوتا تو اُس کی نظریں اس طرح نہ جھکتیں۔ اُس میں مقابلے کی طاقت ہوتی۔ بدنصیبی تو یہ تھی کہ اُس کے ساتھ گناہ کیا گیا تھا۔ اُس کی نسوانیت کو "جائز" طور پر ذلیل کیا گیا تھا۔

اور وہ اجنبی مرد بھی اُس کے ساتھ آیا تھا۔ وہ بھی اس گھر میں موجود تھا۔ رات کو پھر وہ اُس کے جسم پر حکومت کرے گا۔ اُس کے ماں باپ اُس کو اس طرح اُس اجنبی مرد کے پاس بھیجیں گے جیسے کوئی نائکہ اپنی لڑکی کو کسی دولت مند کی خواب گاہ میں بھیجتی ہے۔

○○

بے کار دن، بے کار راتیں

ایک بیکار تو وہ ہوتے ہیں جن کی آنتیں بیکار ہوتی ہیں، اور آنتیں اس لیے بیکار ہوتی ہیں کہ کھانا نہیں ملتا، اور کھانا اس لیے نہیں ملتا کہ ان کا تعلق اس طبقے سے ہوتا ہے جس کو کھانے کے لیے محنت کرنا اور کمانا پڑتا ہے، اور محنت اس لیے نہیں کرتے کہ یا کاہل ہوتے ہیں اور نہیں کرنا چاہتے، یا کرنا چاہتے ہیں اور کام نہیں ملتا۔ میری بیکاری اس قسم کی نہیں۔ میری آنتیں بیکار نہیں۔ میرا دماغ بیکار ہے، میرا ضمیر بیکار ہے۔ اور وہ اس لیے کہ سات پشتوں سے میرے اجداد نے کبھی کمانے کے لیے محنت نہیں کی۔ انھیں ایک بڑی اچھی ترکیب سوجھی تھی۔ محنت دوسرے کریں اور کھائیں وہ خود۔ میرے اجداد نے قانون بنائے کہ وہ جو اُن کے لیے محنت کرتے ہیں خود کھانے سے محروم رہیں، اخلاق ایجاد کیے۔ جنھوں نے ضمیر کو بے ہوش کر دیا۔ اور رفتہ رفتہ میرے آباو اجداد کے پاس اتنا روپیہ آ گیا کہ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کریں۔ میرے مکان کا جتنا رقبہ ہے اُتنے ہی رقبے میں سو دھیڑوں کی جھونپڑیاں ہیں، اور جھونپڑیوں کی مجموعی آبادی پانچ سو کے قریب ہے جن میں سے ہر سال کوئی سانپ کاٹے سے مرتا ہے۔ بیس پچیس ہیضہ یا طاعون کے نذر ہو جاتے ہیں۔ دس بارہ ٹائیفائڈ سے مرتے ہیں اور دس بارہ ان جڑی بوٹیوں اور طرح طرح کے علاجوں سے جو ٹائیفائڈ سے اچھے ہونے کے لیے کیے جاتے ہیں۔ یہ ڈھیڑ اُبلے ہوئے چاول یا جوار کی روٹی کے ساتھ مرچیں کھاتے ہیں۔ اب جنگ کے زمانے میں تو

دن میں دو مرتبہ لیکن اس سے پہلے دو دن میں ایک مرتبہ ہم لوگ چار پانچ کو دس کا کھانا جنگ سے پہلے کھاتے تھے۔ اب جب سے حضور وائسرائے بہادر نے خود چاول کھانا چھوڑ دیا ہے، ہم نے بھی چاولوں کا استعمال بہت کم کر دیا ہے، صرف دعوتوں اور تقریبوں میں چاول کھاتے ہیں۔ جب دس دس سیر پلاؤ پکتا ہے۔

میرے لیے بیکاری کا سوال بڑا اہم ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وقت کس طرح کاٹا جائے۔ میرے اجداد کو اتنی زحمت نہ اٹھانا پڑتی تھی۔ وہ صبح کو افیون کھانے کے وقت تک شطرنج کھیلتے رہتے۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے چار پانچ بجے تک قیلولہ کرتے، پھر شطرنج اور گنجفہ میں منہمک ہو جاتے۔ ملاقاتی یا اہلِ غرض آتے تو ان سے چاپلوسی کی باتیں سنتے رہتے اور خوش ہوتے جاتے۔ رات کا کھانا کھا کے، بچّوں کو سوتا اور بیوی کو کوستا چھوڑ کے رنڈیوں کا گانا سننے چلے جاتے۔ دو تین بجے رات کو واپس آتے اور دوسرے دن پھر وہی ......

میری بیکاری کا مسئلہ بالکل مختلف ہے۔ میں نے تعلیم پائی ہے اس لیے میں صبح سے شام تک شطرنج یا گنجفہ نہیں کھیل سکتا۔ لوگ کیا کہیں گے۔ اور اپنے جدِ مرحوم کی طرح دن بھر لنگی باندھے خواصوں کے ہجوم میں بیٹھنا میرے بس کی بات نہیں۔ زمانہ بدل گیا ہے۔ کبھی کبھی شادی بیاہ میں، یا کبھی اپنے کسی مقطعے پر رنڈیوں کا گانا سن لوں تو بہت ہے، مگر ایک مرتبہ بھی میں محبوب کی مہندی میں دیکھ لیا جاؤں تو لوگ کیا کہیں گے۔ اب لوگ اسی بات کو معیوب سمجھتے ہیں۔ مجھے پڑھنے کا بالکل شوق نہیں۔ رائڈر ہیگرڈ اور .. .... دیکھیے اس کا نام بھی بھول گیا۔ بہرحال سراغ رسانی کے ناول پڑھ لیتا ہوں۔ مگر جب سے تیرتھ رام فیروز پوری کے ترجموں پر نظر پڑی، میں نے انگریزی میں یہ ناول بھی پڑھنے چھوڑ دیے۔

ایک زمانے میں سوچا کیا کہ سیاسیات میں حصّہ لوں۔ لیکن اگر کبھی جیل خانے بھیج دیے گئے تو یہ سمجھیے یک نہ شد دو شد۔ یوں میرے بہت سے دوست اور جان پہچان کے نواب ہیں، حیدرآباد میں بھی اور حیدرآباد کے باہر بھی۔ لیکن یہ اپنی اپنی محبت ......

بس جناب گذشتہ سال اسی بیکاری سے تنگ آ کے میں راجہ باجپائے کے ساتھ بمبئی پہنچا۔ مجھے راجہ باجپائے کی طبیعت بہت پسند ہے۔ کیا دوست آدمی ہے۔ سیر چشم، مہمان نواز، سچّا راجہ۔ بس اس کی ایک عادت مجھے سخت ناپسند ہے، کھنکھارنے اور تھوکنے کی۔ آپ سے اچھی خاصی طرح باتیں کرتا ہوگا ،ایک دم سے برآمدے جا پہنچے گا اور باہر گملوں میں جہاں کہیں موقع ملے گا گلا صاف کرکے، کھنکھار کے تھوک آئے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جھوٹ بولنے میں راجہ کا جواب کم ہے۔ لیکن راجہ صرف دو ہی موقعوں پر جھوٹ بولتا ہے۔ جب دوکاندار اپنے بلوں کی ادائیگی کا تقاضا کریں، تب راجہ ایسی میٹھی میٹھی باتیں کرکے ٹالتا ہے، ایسے اچھے اچھے وعدے کرتا ہے کہ حیرت معلوم ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ راجہ کے یہاں کھانے پر کسی سچ مچ کے والیِ ریاست کی دعوت ہو۔ لیکن نوکروں کی کوٹھریوں کے پاس یا صحن میں یا کسی دور دراز برآمدے میں دو چار تقاضا کرنے والے دوکاندار ضرور موجود ہوں گے جن کو راجہ نے "ابھی" چک دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اور یہ 'ابھی'، آج سے کل میں، دنوں سے مہینوں میں، مہینوں سے برسوں میں بدلتا رہتا ہے، اور عجیب بات ہے کہ قرض دینے والوں اور دکانداروں کی آس نہیں ٹوٹنے پاتی۔ راجہ صاحب کے اور بھی کئی سنہری اصول ہیں۔ مثلاً گریٹ ایسٹرن ہوٹل کا بل تین ہزار ہو تو وہ تو ادا کریں یا نہ کریں مگر ہوٹل کے منیجر اور نوکروں کو سینکڑوں روپے انعام ضرور دیں گے۔

دوسرا موقعہ جب راجہ صاحب جھوٹ بولتے تھے، مبالغے کا ہوتا تھا۔ سابق وائسرائے لارڈ ولنگڈن نے مجھ سے کلکتہ کی کرسمس پارٹی میں کہا۔" راجہ صاحب ..."! اور پھر بڑے آدمیوں سے بے تکلفی کی ایک داستان سُنائی جاتی۔ راجہ صاحب یوں تو اعلیٰ سوسائٹی میں مقبول تھے ہی، مگر مبالغہ ان کی گفتگو اور ان کی شخصیت کی جان تھا۔ باقی رہ گیا قرض تو راجہ صاحب کی جاگیر کی آمدنی قریب قریب چار ہزار روپیہ ماہانہ تھی، چاہتے تو اچھی طرح رہ سکتے تھے مگر ان کا ماہانہ خرچ آٹھ ہزار سے زیادہ تھا ....

جنوری کا پہلا ہفتہ تھا، اور پونا کے مقابل بمبئی میں گرمی پلیٹ فارم پر اترتے ہی معلوم ہوئی۔ کچھ اچھی صورتیں تھیں۔ اور جب ہم راجہ صاحب کے آبائی مکان پہنچے جو ہارکنس روڈ پر

تھا تو ملابارہل سے سمندر اُبلتا ہوا، نیلا اور بڑا خوبصورت معلوم ہوا چارمنزل کی ایک ہری عمارت سمندر کے کنارے گھوم سی گئی۔

بھولا بھائی ڈیسائی کے یہاں پارٹی میں سندھ کے ایک مسلمان لیڈر نے اپنے ساتھی سے کہا: "کل ہی رات کو جناح صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے کہا مسلم لیگ کے پیچھے ابھی تک نظر ہے اور خیال کی طاقت نہیں ہے۔ جناح صاحب نے کہا قرآنِ پاک میں سب کچھ ہے۔ میں نے کہا تو پھر اسی سے نظریے خیال اور طاقت کو اخذ کیجیے۔ قرآن ہی کی بنیاد پر جدید سیاسی نظامات سے منطبق کرکے کوئی ایسا اساس بنائیے۔ جناح صاحب نے کہا۔ اقبال نے اس کی کوشش کی ہے ... ... میں نے کہا اقبال کے تصورات کے پیچھے بھی معاشی نظام کی طاقت نہیں ... ..."

اتنے میں مسز سروجنی نائیڈو آئیں اور سب اُٹھ کھڑے ہوئے اور سندھ کے لیڈر صاحب ان سے گاندھی جی کی صحت کے متعلق گفت گو کرنے لگے۔

خان بہادر نواب علی امداد خاں ریاست بُرہان پور میں پرائم منسٹر رہ چکے تھے، اور ابھی دو مہینے ہوئے تھے کہ انھیں بھی اپنا اصطبل جمانے کا خبط سمایا تھا۔ جنگ کے زمانے میں ٹھیکہ داروں نے امیر ہوتے ہوتے انھیں بھی بہت امیر کردیا تھا اور ایسے ہی کسی الزام کی بنا پر پولیٹیکل ایجنٹ نے انھیں نکلوایا تھا۔ وہ اس وقت میرے میزبان راجہ باجپائے کے پاس گھوڑوں کی خرید کے متعلق گفت گو کرنے آئے تھے۔ راجہ صاحب ابھی غسل خانے میں نہارہے تھے، کھنکھنار رہے تھے، تھوک رہے تھے۔ علی امداد خاں کے جانے سے کچھ ہی دیر پہلے مہتاب جنگ آئے، سراپا تبسم، سراپا سوسائٹی کے محبوب، ریاستوں کے مشیر، علی امداد خاں سے بڑے تپاک سے ملے، مگر ان کے جاتے ہی ان پر تبصرہ شروع کیا۔ "اگر علی امداد خاں اچھی طرح چلتے تو کسی بڑی ریاست کے وزیر اعظم ہو جاتے۔ مگر دیکھیے"۔

اور پھر راجہ صاحب سے مخاطب ہو کے مہتاب جنگ نے کہا: "ریاستوں سے تو بھئی اب میرا دل بھر گیا ہے۔ اب کشمیر، حیدر آباد، بھوپال کہیں جانے کو طبیعت نہیں چاہتی۔ میں بھی جب

تک کوچ خزاں میں دیوان رہا۔ میرا اصول رہا کہ مہاراجہ اور مہارانی سے انتہا درجے کی ذاتی وفاداری ... ... راجہ یہ وفاداری ریاست کی خدمت کی جان ہے، مگر پھر حالات بدل گئے۔ موجودہ حضور سکریٹری کا بدلا جانا ضروری ہے۔ میرے خیال میں تو حضور سکریٹری کی خدمت ہی تمام رجواڑوں میں سرے سے ختم کردی جانی چاہیے۔ اب دیکھیے علی امداد خاں کا کیا ہوا۔ ان سے اور ——— خان بہادر رفیق سے رقابت تھی۔ دونوں کی پارٹیاں ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرتی رہیں۔ اب علی امداد خاں کو تو آپ جانتے ہی ہیں: مرحوم سر علی امام کھلم کھلا کہا کرتے کہ یہ نوجوان بڑا ہونہار ہے مگر قابلِ اعتماد نہیں۔ خان بہادر رفیق اُدھر حضور سکریٹری کی خوشامد کر رہے تھے، اور ان سے اندر ہی اندر یہ طے کر رہے تھے کہ خود پرائم منسٹر ہو گئے تو حضور سکریٹری کو ہوم منسٹر بنادیں گے۔ اب رہ گیا پولیٹیکل ایجنٹ شروع شروع تو وہ علی امداد ہی کا طرف دار تھا، مگر پھر حالات بدل گئے ......"

اِتنے میں لنچ کا وقت آ ہی گیا، اور نواب مہتاب جنگ نے ٹمگلٹ کا گلاس بڑے پر رکھ دیا۔

شام کو میجر نذیر کے ساتھ سی سی آئی گیا، جہاں ایک بڑا سا گول میدان دیکھا، کچھ لوگ دیکھے جو تاش کھیل رہے تھے ... ... میرے آبا و اجداد کی طرح ......؛ ایک نہانے کا حوض دیکھا جس کی تہ میں پچی کاری کا کام دیکھا، اور صرف ایک خوبصورت عورت دیکھی۔ میرین ڈرائیو پر ٹہلتے ٹہلتے، اور کئی کئی منزلوں کے گھروندے فلاں نِواس اور فلاں نِواس دیکھتے دیکھتے میجر نذیر کو ریویرا کی یاد آئی۔ امجد نے آلڈس ہکسلے اور بیورلی نکلس کا ذکر کیا، جن کے نام میں نے سُنے ہیں مگر ان کی کوئی کتاب کبھی نہیں پڑھی۔

دوسرے دن اولگا کو ٹیلیفون کیا۔ اولگا کی ایک اور دوست تھی، سیلون کی رہنے والی، سیاہ فام حُسن کا نمونہ، کالی گھٹا مگر خوبصورت اور اس سے نذیر کی دوستی تھی نذیر برابر اپنے کپڑوں کی طرف متوجہ تھا، اور نذیر کی خاطر مجھے اولگا سے اس لنکا کی بیٹی کا پتہ پوچھنا پڑا۔ وہ کسی اور لڑکی کا ذکر سن کر چونکی تو میں نے وجہ بتائی "میرے ایک دوست ہیں میجر نذیر وہ

اس لڑکی کو جانتے ہیں" . . . . . . اس پر اولگا نے چھوٹتے ہی کہا: "تو ایسا کیوں نہ کرو، شام کو چھ بجے آجاؤ، اور اپنے ساتھ اپنے دوست کو بھی لیتے آؤ، ڈرنکس کے لیے میں کرشنا کو بھی بُلوا لوں گی . . . ."

جب میں نے ٹیلیفون کا ریسیور رکھا تو نذیر نے پتلون کی کریز ٹھیک کرتے ہوئے کہا "کرشنا . . . . . . ہاں کرشنا ہی اس سنگھالیز لڑکی کا نام تھا۔ دیکھو بھ مجھے یاد ہی نہ آتا تھا . . ."

نذیر میرے مقابل بدرجہا خوبصورت ہے، اس لیے جلن کے مارے میں نے راجہ باجپائی کو بھی ساتھ لیا۔ تاکہ اولگا کو نذیر سے بات چیت کرنے کا موقعہ زیادہ نہ ملے۔ اور راجہ باجپائی کو میں نے اولگا کا حال سُنایا، اس کا باپ بیجاپور میں سول سرجن تھا اور اڈوانی اس زمانے میں اس کا اسسٹنٹ تھا، اڈوانی کی صورت دیکھی ہے؟ دانت چوتھائی انچ ہونٹوں سے باہر نکلے ہوئے۔ خیر وہ اولگا پر عاشق ہوا تو ایک بات بھی تھی، مگر اولگا کو اس میں کیا خاص بات نظر آئی ہوگی؟ پھر ہزار میں ایک مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی ہندوستان میں رہے ہوئے انگریز افسر کی لڑکی ہندوستانی سے شادی کرے۔ خیر راجہ تم اس سے مل کر خوش ہوگے۔ کہہ رہی تھی ذرا بیمار ہے۔ اُسے پلیورسی ہوگئی ہے۔ کرنے کو تو اس نے اڈوانی سے شادی کرلی، اب گھٹ رہی ہوگی۔

چھ بجے کے ذرا بعد، عمداً ذرا دیر سے ہم تینوں وارڈن روڈ پہنچے۔ اولگا نے ہمیں اوپر اپنی خواب گاہ میں بُلا بھیجا، چوڑے بستر پر ہلکا سا پلش اوڑھے ہوئے، وہ نیم دراز تھی۔ میں بھی نہیں سمجھتا تھا کہ وہ اتنی بیمار ہوگی کہ اُتر کے نیچے بھی نہ آسکے گی۔ اس نے معافی چاہی اور کہا ڈاکٹر نے اسے چلنے پھرنے کی اجازت نہیں دی۔

وہ دو سال پہلے کے مقابل اب دُبلی معلوم ہو رہی تھی، مریضہ مگر بڑی ہی دلکش اس کے اوسط ہموار دانت، اس کے مڑے ہوئے ترشے ہوئے ہونٹ، اس کے خدوخال کی دلکشی ـــــ واپسی پر نذیر اور باجپائی دونوں نے اس کے حُسن کا اعتراف کیا۔

نذیر کی سنگھالی، کالی چنگاری کرشنا بید کی آرام کرسی پر نیم دراز آنکھیں آدھی کھُلی آدھی

بند۔ نذیر کی طرف دیکھ دیکھ کر مُسکرا رہی تھی۔ مجھ سے وہ بالکل غافل ہے۔ راجہ صاحب وہسکی اور سوڈا کے سوا اور ہر چیز سے قطعی بے پروا ہیں۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ اودلگا اور کسی طرف متوجہ نہ ہونے پائے اور اس سلسلے میں ایک مصنوعی احساس برتری —— یعنی اصلی احساس کمتری —— کا شکار ہوں۔

اتنے میں اودلگا کا شوہر آتا ہے، کم رُو، کم نظر، کم سواد۔ حُسن اور بدشکلی کے قبضے ہیں۔ اور یہاں معاشی توجیہہ نہیں کی جا سکتی۔ یہ تو نفسیات کی غلطی ہے۔ اور دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ اودلگا بھگت رہی ہے، اپنے ماحول کو بھگت رہی ہے۔ یہ زندگی جس کا اس نے غلطی سے انتخاب کیا، اور اس کا غلط انتخاب جس نے اُسے فریش کر دیا۔ یہ دونوں اس کا خون چوس رہے ہیں۔ ڈاکٹر اڈوانی نے آ کے تعارف کے بغیر اپنے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور پھر اودلگا نے میرا تعارف کرایا اور مَیں نے نذیر اور باجپائی کا۔ ڈاکٹر اڈوانی اپنی بیوی کے قریب لیٹ گیا۔ مہمانوں سے اخلاق کی کچھ باتیں کیں۔ اُٹھا اور بہانہ کیا کہ کسی مریض کو دیکھنے جانا ہے، وارڈروب سے کپڑے نکالے، اور نیچے کے کمرے میں جا کے غالباً روز کی عادت کے مطابق سنگترے کی پھانکوں کا آملٹ چائے کے ساتھ کھانے لگا۔

ہم لوگ بھی تھوڑی دیر کے بعد اٹھے، مگر پھر بھی جانے کو جی نہیں چاہتا، کھڑے کھڑے باتیں کرتے رہے۔ کرسمس کا درخت معنوی طور پر مُرجھایا ہوا معلوم ہوتا تھا، کمرے پر ایک طرح کی مونث تنہائی طاری تھی۔ صرف کرشنا کی آنکھوں کی سفیدی، اس کی جلد کی سیاہی کے بحرِ ذخار میں چھوٹے چھوٹے جزیروں کی طرح چمک رہی تھی۔ اور آہستہ آہستہ ہمارے دِلوں نے ارادہ کر ہی لیا، اور دروازے کی طرف ہمارے قدم واپس ہوئے۔ تنہا خاتون، تنہا کمرے میں تنہا رہ گئی۔ کرشنا کی آنکھوں کی چمک کے باوجود۔

پھر ہم تاج گئے۔ جہاں ہندوستانی وہسکی کے ساتھ بُھنی ہوئی مونگ پھلیاں ملتی ہیں، اور نیچی کھڑکیاں سمندر کی طرف کھُلتی ہیں۔ جہاں ہز مجسٹی کے بحری بیڑے کے کچھ جہاز ابھی تک ہندوستان کے ساحل کی پاسبانی کر رہے ہیں، دروازے کے قریب وسطِ یورپ کی ایک یہودن ایک گورے چٹے ہندوستانی سے باتیں کر رہی ہے۔ ایک موٹا تازہ، گوآ کا رہنے والا موسیقی کا

بادشاہ پیانو بجا رہا ہے، طوفانی انداز میں اور حاضرین اگرچہ کہ زیادہ تر انگریز ہیں، تالیاں بجا رہے ہیں۔ ہز مجسٹی کی بحری فوج کے افسر بہرحال بہ آوازِ بلند گا گا کے اپنی خوشنودی کا اظہار کر رہے ہیں۔ ہندوستانی وہسکی میرے سر پر چڑھتی چلی جا رہی ہے، لیکن ابھی پیانو خلا میں تیرنے نہیں پایا کہ راجہ باجپائے کھنکھارتے ہیں، اور تھوکنے کے لیے بار بار کے باہر پھولوں کا اسٹال کتابوں کے اسٹال کے اس پار سیڑھیوں کی طرف چلے جاتے ہیں، اور بحری افسروں کے گیت کے شور سے الگ اور واضح نذیر کی آواز آتی ہے اب چلنا چاہیے۔

کئی دن بعد کا ذکر ہے، شام کو وہ آئی جس کا نام میں نہیں بتا سکتا۔ سرسری سی ملاقات کے لیے۔ بلند بالا، خوبصورت، اور اس کے ہلکے سانولے چہرے پر نمک ہی نمک ہے۔ چہرے پر نمک ہے۔ اور معلوم ہوتا تھا کوئی چیز شکن در شکن ٹوٹ رہی ہے۔ اس کے باوجود اس کے سرخ لبوں، اس کی رس بھری کالی کالی آنکھوں اور اس کے چہرے کے اس شکن در شکن "نمک" میں کوئی بے آہنگی، بیگانگی نہ تھی۔ وہ یقیناً خوبصورت تھی۔

اسے پرنام کر کے میں ہٹ گیا۔ اور وہ راجہ باجپائے سے باتیں کرتی رہی۔

پھر شام اور گہری ہوگئی تو میری طبیعت بیٹھے بیٹھے اور زیادہ گھبرانے لگی۔ مجھے نواب مہتاب جنگ کی علالت کی اطلاع ملی تھی، خیال کیا کہ انھیں دیکھ آؤں۔ شام گہری ہو رہی تھی اور آفتاب کے نیزے ٹوٹتے جا رہے تھے۔ مہتاب جنگ سیٹھ ہارون یعقوب کے یہاں مہمان تھا، جو آجکل اپنے جوہو والے مکان میں نہیں بلکہ کوینز روڈ والے فلیٹ میں مقیم تھے، جس کے سامنے سے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد بی بی اینڈ سی آئی کی گاڑیاں کھڑ کھڑ کرتی گذر جاتیں۔ اور سڑک پر ہر لمحہ بیسیوں موٹروں کے ہارن برقی مکھیوں کی طرح بھنبھناتے۔

مہتاب جنگ بستر پر رضائی اوڑھے پڑے تھے۔ رضائی سر سے لپٹی ہوئی تھی، اور ان کا چہرہ رضائی سے باہر نکلا ہوا بڑا اچھا، بھولا بھالا معلوم ہو رہا تھا۔ ابھی ابھی انھوں نے ڈپتھیریا کا انجکشن لیا تھا۔ کہنے لگے سیٹھ ہارون یعقوب کا بیان ہے کہ "اگر بمبئی میں حلق میں ذرا تکلیف ہو یا حلق میں سمیت پیدا ہو جائے تو ڈپتھیریا کا بڑا اندیشہ رہتا ہے"۔

میں نے پوچھا کہ سیٹھ صاحب کہاں ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ مالابار ہل کی طرف گئے ہیں۔ میں سمجھ گیا امجد کے پاس گئے ہوں گے۔ امجد کے ساتھ مل کے وہ گوداوری کے علاقے میں آہنی سامان بنانے کا ایک کارخانہ کھولنے کی تجویزوں میں غرق تھے۔

نواب مہتاب جنگ کہنے لگے: "میری عمر ایسی زیادہ نہیں۔" (ان کی عمر صرف باون سال کی ہے) "میں نہ بیکار بیٹھ سکتا ہوں، اور نہ اب کسی ریاست میں کام کرنے کی ہمت ہے۔ میرا بھی ارادہ ہے کہ کوئی کاروبار شروع کروں، مگر کون سا کاروبار شروع کروں۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ یار اس دربارداری نے کہیں کا نہ رکھا۔"

سیٹھ ہارون یعقوب کا یہ فلیٹ بڑا آراستہ پیراستہ تھا۔ تمام فرنیچر آرمی اینڈ نیوی کا بنوایا ہوا۔ سلیقہ ذرا کم ہی کم تھا، مگر شانِ امارت میں کوئی کمی نہ تھی۔ سیٹھ ہارون یعقوب کا تمدن بھی کچھ اسی قسم کا تھا، مثلاً یہ کہ اُردو اُن کی مادری زبان تھی، لیکن اُردو میں ان کا ہر جملہ "اُجُون" سے شروع ہوتا اور "آئے لاہے، جائے لاہے، کھائے لاہے" پر ختم ہوتا۔

سیٹھ صاحب کے فلیٹ سے نیچے جو سیڑھیاں اُترتی تھیں، وہ اس مکان کو دیکھتے ہوئے بڑی گندی سی تھیں۔ یہ یقین کرنا بڑا مشکل معلوم ہوتا تھا کہ جو بلڈنگ باہر سے اتنی شاندار ہے اس کی سیڑھیاں اندر سے اتنی گندی ہوں گی۔ یا جس مکان کی سیڑھیاں اتنی گندی ہیں اس میں سیٹھ صاحب کا فلیٹ اندر سے اتنے شاندار سامان سے آراستہ ملے گا......

ان گندی سیڑھیوں پر ایک کلرک، بالکل کھدّر پوش، ایک اور کلرک کی اُجلی اُجلی سی کھدّر پوش بیوی سے باتیں کر رہا تھا ــــ ذرا لگاوٹ کی۔

پونے آٹھ کے قریب سی سی آئی پہنچا۔ خواجہ انور جُو، کشمیر کے قالینوں کے بادشاہ خورشید مقدس جی سے باتیں کر رہے تھے۔ جس میز پر وہ بیٹھے ہوئے تھے اس کے قریب سے ایک اور جوڑا گذرا اور انور جُو نے مجھ سے ان کا تعارف کرایا۔ رحیم بھائی یہ پہلوان قسم کے بوہرے تھے، مسز زرنگار رحیم بھائی یہ ان کی ذرا بھونڈی سی شکل کی بی بی جی تھیں، اور پھر وہ دونوں آگے بڑھ گئے۔ آج شام کو سی سی آئی میں کتنی بہت سی عورتیں تھیں، زیادہ تر دُبلی، زیادہ تر پیلی پیلی، زیادہ تر بدشکل۔ چھ قابلِ برداشت لڑکیاں سُرخ سُرخ ہونٹوں میں

سفید سفید دانت چمکاتی ایک ہی میز کے اطراف بیٹھی تھیں۔ ایک میز اور چھ لڑکیاں جن اوراس قدر افراط سے اس شام کو ضائع ہو رہا تھا۔

طے یہ ہوا کہ ہم یعنی مَیں، انور جوُ اور خورشید مقدس جی تاج محل میں کھانا کھائیں۔ خورشید مقدس جی کے پاس کیا اچھی کیڈلک ہے، اور ان کی کیڈی لک میں سوار ہوتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ یا تو میں احساسِ کمتری کا شکار ہوں، یا خورشید مقدس جی کو کچھ تو احساسِ برتری ہے، اور وہ ہم لوگوں کو جو ان کے اتنے نو دولیتے اور ان کے برابر امیر نہیں، حشرات الارض سے کچھ ہی برتر سمجھتے ہیں۔ تاج محل میں کچھ دیر اوپر برآمدے میں بیٹھ کے دیسی وہسکی پیتے رہے، اور سمندر کی ہوا کھاتے رہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد سرپرستی کے انداز میں خورشید مقدس جی انور جوُ سے پوُچھتے۔ "پھر کیا ہوا انور اعظم"۔ "پھر کیا ہوا انور دی گریٹ"۔ خورشید مقدس جی دراصل انور جوُ کے والد کے دوست تھے۔ وہ ان کی سرپرستی مسکرا کے اور بڑی معصومیت سے شانے ہلا کے سہہ لیتا۔

کھانا ایسا بُرا نہیں تھا۔ تاج محل ہوٹل ناحق کھانے کے معاملے میں اس قدر بدنام ہے۔ خورشید مقدس جی نے کانٹا سنبھال کے پلیٹ پر رکھا اور عینک سیدھی کی۔ میں نے ان کی عینک کی سیدھ میں تفتیش کی، تو ان کی طرح میری بھی نظر اسی پر رُکی۔ وہی سانولی سلونی خاتون جو آج سہ پہر کو راجہ باجپائے سے ملنے آئی تھی۔ دراز قد، اس کے چہرے کا شکن در شکن نمک، اب مسطح ہو چکا تھا، جیسے سمندر سے موجیں مفقود ہو جائیں۔ اس کے ساتھ کوئی اور تھا، ایک امریکن افسر۔ یقیناً اس میں بڑی دلکشی تھی، گجراتی عورتیں عموماً دلکش ہوتی ہیں۔ مگر اُن میں یہ سب کی ملکہ معلوم ہوتی تھی۔ مجھے اپنی جانب دیکھتا دیکھ کر وہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ مسکرائی اور خورشید مقدس جی کی عینکوں کی طاقتور دُوربین خوردبین بن کر میرا جائزہ لینے لگی "آپ اسے جانتے ہیں؟"

"ہاں بہت معمولی طور پر۔ ایک آدھ مرتبہ ملاقات ہوئی تھی"۔

"کون ہے . . . . ؟" خورشید مقدس جی نے بیتابی سے پوچھا۔

خورشید مقدس جی جواب کا انتظار کرتے رہے . . مجھے اب اپنے احساسِ کمتری، ان

کے احساسِ برتری کا بدلہ لینا تھا۔ میں انور جُو سے کشمیر کے حالات پر پوچھنے لگا۔

کھانے کے بعد خورشید مقدس جی نے کہا کہ معشوقہ کا ہمیشہ اعلیٰ "طبقے" سے تعلق ہونا چاہیے جب تک اچھے طبقے کی لڑکی نہ ہو عشق بازی میں کوئی لطف نہیں اور اچھے طبقے کی لڑکیاں وہی ہیں جو کلبوں، خصوصاً ولنگڈن کلب میں خورشید مقدس جی کو ملتی ہیں۔

آہستہ آہستہ لی کر کو چکھتے ہوئے خورشید مقدس جی نے کہا: "اس معاملے میں کوئی شہر بمبئی کی برابری نہیں کرسکتا۔" اور پھر گلاس آہستہ سے میز پر رکھ کے انور جُو کو مخاطب کر کے، اور میری ہستی کو قریب قریب فراموش کر کے انھوں نے کہا: "اب تو جنگ کی وجہ سے عاشقی بھی قریب قریب محال ہوگئی ہے۔ ورنہ میں نے میرین ڈرائیو میں ایک فلیٹ لے رکھا ہے۔ گھر پر لڑکیوں کو بلواؤں تو جوتے پڑیں گے۔ اس کے علاوہ اب میری لڑکی کی عمر اٹھارہ سال کی ہو رہی ہے۔ خیر تو وہ میرین ڈرائیو کا فلیٹ زبردستی لے لیا گیا۔ اب اس میں رائل نیوی کے دو افسر ہیں۔ شہدے، خوب ٹھاٹھ کرتے ہوں گے۔"

اس زمانے میں ۵۵۵ سگریٹ بالکل عنقا تھے۔ خورشید جی نے اپنی جیب سے چاندی کا سگریٹ کیس نکالا جس پر زمانۂ ماقبل جنگ کی مملکتِ آسٹریا کا نقشہ تھا۔ اور اس میں ۵۵۵ بھرے ہوئے تھے۔ بے نیازی سے انھوں نے سگریٹ میری طرف بڑھائے پھر اس کا انتظار کرنے لگے کہ انور جُو ان کا سگریٹ جلائے اور پھر ایک کش لے کر انھوں نے کہا۔

"بمبئی کی بات ہندوستان کے کسی شہر میں نہیں آتی۔"

میں نے محض مخالفت کرنے کے لیے کہا: "سیٹھ صاحب ہم تو لاہور کے قائل ہیں۔ دیکھیے نا گذشتہ جنگ کے بعد یورپ میں ایک نئی طرح کی لڑکی وجود میں آئی، جو بڑے ہلکے پھلکے کپڑے پہنتی تھی، اور مردوں کے دوش بدوش ہر کام میں حصہ لیتی تھی۔ اب تو وہ اور بھی زیادہ سادہ اور مرد کی ہم جولی سی ہوگئی ہے۔ سلیک پہنتی ہے، کوٹ پہنتی ہے۔ کبھی کبھی ٹائی بھی لگاتی ہے۔ سائیکلوں پر چڑھی چڑھی پھرتی ہے۔ ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے موٹر چلاتی ہے۔ اسی نئی طرح کی لڑکی کو فلیپر کہتے ہیں۔ ہندوستان کے کسی اور شہر میں اب تک فلیپر نے نشوونما نہیں پائی۔ مگر لاہور کی لڑکی فلیپر بن چکی ہے۔ فراک نما قمیص اور سفید شلوار پہنے، دوپٹے کو آرائش کے

لیے گلے میں ڈالے وہ مال پر، انار کلی میں، لارنس گارڈن میں کھٹ کھٹ کرتی پھرتی ہے۔ اس میں کوئی جھوٹی زنانہ نزاکت نہیں۔ وہ ٹینس کھیلتی ہے، اسکواش کھیلتی ہے۔ سیکلوں پر ماری ماری پھرتی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ کہ اُسے ذرا آزادی بھی حاصل ہے یہ بات بمبئی میں ......"

"اجی کیا باتیں کرتے ہو" عرب ڈاربی کے جیتنے والے بوہرہ تاجر خورشید مقدس جی نے میز پر گھونسہ مار کے بات کاٹتے ہوئے بے صبری سے کہا۔ "لاہور۔ لاہور کیا۔ ہم بھی لاہور دیکھ آئے ہیں۔ لاہور میں کیا ہے۔"

انور جو نے بڑی معصومیت سے شانے ہلائے۔ وہ بھی شاید کسی زمانے میں لاہور کے حُسن کا زخم خوردہ رہ چکا تھا اور کہا۔ "نہیں سیٹھ صاحب اس معاملے میں تو ہم بھی لاہور کے قائل ہیں۔"

سیٹھ صاحب نے بالآخر اس بحث کو رفع دفع کر دینے کے لیے کہا۔ "خیر ہو گا، اپنا اپنا تجربہ ہے۔ مگر ہم کو تو بمبئی کی لڑکیوں کے برابر کہیں کی لڑکیاں پسند نہیں۔ اور بھئی بمبئی میں میں نے جتنا مزا اُڑایا ہے اتنا تم دونوں نے مل کے لاہور میں نہ اُڑایا ہو گا۔ اور تو اور میں تو یورپ بھی ہو آیا ہوں۔ آسٹریا میں وی آنا گیا تھا۔ وہاں کی لڑکیاں اہا ہاہا۔ وی آنا کے قریب ایک فیکٹری ہے۔ وہاں کی مزدور لڑکیاں سولہ سولہ سترہ سترہ سال کی، سنتروں کی جیسی۔ سب دیکھا ہے لیکن بمبئی کی بات کسی شہر میں نہیں آتی کیونکہ یہاں تو اچھے طبقے کی لڑکیاں نہیں ملتیں۔ اور جب تک لڑکیوں کا "طبقہ" اچھا نہ ہو بھلا عاشقی میں کیا لُطف۔"

رات زیادہ ہو رہی تھی، اور قریب کے میزوں سے یکے بعد دیگرے بہت سے جوڑے اُٹھ چکے تھے۔ خورشید مقدس جی نے اٹھتے ہوئے کہا: "ایکٹریسیں مجھے اسی لیے سخت ناپسند ہیں۔ سب روپیے کے درپے ہوتی ہیں۔ اُن میں وہ 'طبقہ' کی خوبی نہیں ہوتی۔ ضرورت اس کی ہے کہ محبوبہ ہمیشہ اعلیٰ طبقے کی ہو۔ مگر اس کے لیے بہت روپیے کی ضرورت ہے۔"

میں صرف جاسوسی ناول پڑھتا ہوں۔ میرے پاس جاسوسی ناولوں کا ذخیرہ ختم ہوگیا ہے۔ اس لیے میں پہلے تو فورٹ کی کتابوں کی دوکانوں کا چکر لگاتا ہوں، پھر اسٹیشن جاتا ہوں جہاں وہیلر کے بک اسٹال پر مزے مزے کے جاسوسی ناول اکثر مل جاتے ہیں۔ اسٹیشن پر دو سانولی سی اینگلو انڈین لڑکیاں میرے قریب سے ہو کر گذرتی ہیں، اور میری طرف دیکھتی تک نہیں، کاش ان دونوں میں سے کوئی ایک میری ہو سکتی۔ ایک پستہ قد موٹی سی عورت مرچ کے رنگ کی ساڑی پہنے، ہونٹوں پر گہری موٹی سرخی لگائے اپنا بیگ گھماتی ہوئی کسی کا انتظار کر رہی ہے، اور بار بار گھڑی دیکھتی ہے۔ میں اس کی طرف گھور کے دیکھتا ہوں، اس کے دانت نظر آرہے ہیں، اور اس کے لبوں پر جو مسکراہٹ ہے وہ شرمیلی سی ہے، سرد ہے، اور کسی قسم کا وعدہ نہیں کرتی۔

شام کو میں دادر جانے کے ارادے سے نکلتا ہوں۔ بس کے انتظار میں کھڑا ہوں اوپر جو نظر اٹھا کے دیکھتا ہوں تو جھروکوں، اور چبوتروں سے راجہ باجپائے کے تمام نوکر کھڑے ادھر ہی دیکھ رہے ہیں، بوائے، بٹلر، باورچی۔ بس جہاں ٹھہرتی ہے وہاں اسکول جانے والی مرہٹہ لڑکیوں کا ایک بڑا ہجوم ہے، صحت مند، جوان، سانولی جل پریوں کا ایک طوفان سا ہے جو امنڈ رہا ہے۔ اتنی سب یہاں کیسے آگئیں اور بس میں ان کو جگہ کیسے ملے گی۔ اچھا یہ برلا ہاؤس میں گاندھی جی کے درشن کرنے آئی ہوں گی۔ راجہ باجپائے کے نوکر مجھے ان لڑکیوں کی طرف گھورتا دیکھ کر مسکرا رہے ہیں اور میں ان لڑکیوں کی طرف سے منھ موڑ کے کھڑا ہو جاتا ہوں، اور سمندر کے جھاگ کے کنارے کنارے امنڈتے ہوئے کوؤں کو دیکھتا ہوں۔

بس آتی ہے، اور سرکس کی بازی گروں کی طرح اسکول کی لڑکیوں کا یہ امنڈتا ہوا سیلاب بس کی اوپر کی منزل پر چڑھ جاتا ہے، اوپر کی منزل کھلی ہوئی ہے، چھت غائب ہے اور ہلکی ہلکی خوشگوار دھوپ بڑی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ میں بھی انھیں لڑکیوں کے ریلے میں بس کی اوپر کی منزل تک پہنچ جاتا ہوں، اور بیٹھنے کے لیے جگہ ڈھونڈھ رہا ہوں، ادھر دیکھتا ہوں تو اُدھر راجہ باجپائے کے نوکر ابھی تک میری طرف دیکھ کے مسکرا رہے ہیں، دوسری طرف گردن پھیرتا ہوں تو کوئی میرا نام لے کر پکارتا ہے، اور اس ہجوم میں کوئی میری آستین پکڑ کے اپنے

پاس بٹھا لیتا ہے۔ یہ میجر نذیر ہے۔ اس کی آنکھیں شرارت سے چمک رہی ہیں۔

ایک عورت جو ان لڑکیوں کی بڑی استانی ہے، بار بار ان سے مرہٹی میں کچھ نہ کچھ کہہ رہی ہے، ایک ادھیڑ عمر کا مرد جو بڑی اُجلی دھوتی، اور سفید کھدّر کا کُرتا پہنے ہے اس کا بھی ان لڑکیوں اور ان کے مدرسے سے ضرور کچھ نہ کچھ تعلق ہے، بڑی اُستانی کو رِجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔

نذیر شرارت سے مُسکرانے لگتا ہے اور پوچھتا ہے" کدھر کا ارادہ ہے؟"

"دادر کا!"

"کیوں؟"

"بس ایسے ہی سُنا ہے وہاں کوئی ریستوراں ہے جہاں تمام فلم اسٹار جمع ہوتے ہیں۔ اس ریستوراں کو ڈھونڈھنے جا رہا ہوں۔"

"کیا وقت خراب کر رہے ہو۔ ابھی جتنی ایکٹرسوں سے ملنا چاہو۔ راجہ باجپائے سے کہو وہ تمھیں ملا دے گا۔"

"نہیں۔ اس خیال سے نہیں۔ یوُں ہی ذرا ان کی زندگی دیکھنے جا رہا ہوں۔"

نذیر نے کہا:" اچھا زندگی دیکھنے کا شوق کب سے شروع ہوا؟"

"اور تم کہاں جا رہے ہو؟"

"سینما۔"

"ہرگز نہیں۔"

"اچھا ہاربر بار جا رہا ہوں۔ بس۔"

میں چرنی روڈ پر اتر جاتا ہوں۔ اسٹیشن کا پلیٹ فارم بہت غلیظ ہے، اور چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں کے سوا ہندوستان میں اسٹیشنوں کے پلیٹ فارم، کہاں غلیظ نہیں ہوتے۔ ایک عجب طرح کی مرکّب بدبُو مسافروں کے ہجوم، فرش اور دیوار و در سے آرہی ہے۔ مکھیوں کے ہجوم ہر چکنائی کے دھبّے پر بھنبھنا رہے ہیں۔ اور اتنے میں بی بی اینڈ سی آئی کی کھڑکھڑاتی ہوئی لوکل بھی آہی جاتی ہے۔

اس لوکل ٹرین میں سیکنڈ کلاس کا ڈبّہ کھچا کھچ بھرا ہے۔ مگر ایک مسلمان تاجر، سیاہ فراک کوٹ پہنے، زری کی دستاری باندھے، تن و توش ضرورت سے بہت زیادہ فربہ داڑھی گالوں پر چھدری چھدری مگر ٹھوڑی کے نیچے کافی بڑی، ٹائمز آف انڈیا ہاتھ میں دبوچے، کھڑے ہوئے مسافروں کے زمرے سے نکل کے ایک سیٹ کی طرف بڑھتا ہے اور گھس کے بیٹھ جاتا ہے، جو مسافر اس بنچ پر پہلے سے بیٹھے تھے جن میں ویک آئی کی ایک ادھیڑ افسر بھی تھی، اس کی طرف گھور کے دیکھتے ہیں، مگر سب اس کی اس کامل باطمینان بدتمیزی سے مرعوب ہیں۔

دادر غلیظ مقام ہے۔ آج اسٹیشن سے ذرا آگے ہی سڑکوں کی روشوں پر میلہ لگا تھا۔ مرہٹنیں جن کے رنگ ہلکے زیتونی سے لے کر گہرے سُرمئی تک مختلف انواع کے تھے مگر سب کے سب نمکین، دھوتی پہنے ترکاری بیچنے والوں، کنجڑوں اور خوانچہ فروشوں سے سودا چکا رہی تھیں۔ ہر جگہ مرہٹی بولی جاتی تھی اور سیواجی پارک قریب تھا میں میلے کا تماشا دیکھتا ہوا سیواجی پارک کی طرف ہولیا۔ جہاں وہی سبز رنگ کا ریستوراں ہے۔ راستہ میں کئی لوگوں سے پتہ پوچھا۔ ایک صاحب پتلون پر نیم آستین قمیص پہنے چلے جارہے تھے۔ کہنے لگے "نہ میں کبھی ہندوستانی فلم دیکھتا ہوں نہ ہندوستانی فلمی ستاروں کے نام مجھے معلوم ہیں نہ میں اس سبز ریستوران سے واقف ہوں جہاں یہ سب جمع ہوتے ہیں۔ میں انشورنس ایجنٹ ہوں۔ اگر جیب میں کچھ ٹکے ہوں تو اپنی زندگی کا بیمہ کرا لیجیے"۔

ایک جگہ موڑ پر ایک پان سگریٹ کی دوکان نظر آئی اور پان سگریٹ لینے میں ٹھہر گیا۔ پان والے سے مَیں نے پوچھا: "بھیّا یہاں کوئی ایسا ریستوراں ہے جس کے دروازے اور دیواریں ہری ہیں اور جہاں فلموں میں کام کرنے والے لوگ آتے ہیں؟"

پان بیچنے والے لٹھ مار الہ آبادی بھیّا نے کہا: "ہاں جرا اُدھر سامنے کی طرف چلے جاؤ۔ وہ کیا ایرانی ہوٹل ہے۔ بس وہیں یہ سینما والے جمع ہوتے ہیں"۔

اور فی الحقیقت بالکل قریب وہی ایرانی ریستوران تھا۔ بظاہر اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی، بالکل ایسا ہی تھا جیسے بمبئی کے اور ہزاروں ایرانی ریستوراں، دیواروں پر

آئینے اور آئینوں کے حاشیوں پر موٹے رنگ کے دھبوں سے نقش و نگار۔ میزوں کے اطراف چھوٹی چھوٹی کرسیاں۔ میزوں کے تختے سنگِ مرمر کے، اور ان پر ہزاروں مکھیاں وہی کھانا کھلانے والے چھوکرے، دو ہاتھوں پر تین تین چار چار رکابیاں سنبھالے ہوئے ان چھوکروں کے ہاتھوں میں میلے کپڑے جن سے وہ ہر نئے گاہک کے آنے پر میز کا سنگِ مرمر صاف کرتے ہیں۔ وہی ٹماٹو کی چٹنی اور سیاہ مرچ اور نمک۔

یہ شام کا وقت تھا، اور گاہک قریب قریب مفقود تھے۔ ہوٹل کا منیجر بڑے اطمینان اور غرور سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے "سالا چھوکرا لوگ" پر حکمرانی کر رہا تھا۔ اس کا سفید ڈک کا پتلون بالکل شفاف تھا۔ اور سفید قمیص صرف گردن کے قریب پسینے کی وجہ سے ذرا ملگجی ہو گئی تھی۔ منیجر کے قریب کیپ سٹن سگریٹوں کا ڈبہ ہاتھ میں لیے ایک اور نوجوان بیٹھا تھا جس کے آگے بہت سے اخبارات پڑے ہوئے تھے۔ میں سوچنے لگا۔ یہ صاحب فلم اسٹار تو نہیں؟ اخباروں سے یہ صاحب غالباً بہت دیر پہلے فارغ ہو چکے تھے اور اب یکے بعد دیگرے کیپ سٹن کے ڈبے سے سگریٹیں نکالتے اور ان کو دھواں بنا کر اُڑانے میں مصروف تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک آدھ منٹ کے لیے کوئی اخبار اٹھا لیتے اور اسے پھر اپنی جگہ رکھ دیتے۔ اور کبھی کبھی منیجر صاحب سے ایک آدھ بات کر لیتے مگر وہ اور منیجر صاحب دونوں خوشگوار خاموشی کا لطف اُٹھا رہے تھے۔

ایک مکعب گوشے میں، یعنی لکڑی کے کابک میں ایک جوڑے کے ہنسنے اور بات کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے کہا یہ ضرور فلم اسٹار ہوں گے، اور یہ کیپ سٹن اور اخبار والا تو فلم اسٹار تو کیا، فلموں کے منشی یا مصنف قسم کا کوئی انسان ہوگا، اور میں غور سے پھر اس جوڑے کی ہنسی اور باتوں کی آواز سننے لگا جو اس لکڑی کے ڈبے میں چوں چوں کر رہا تھا۔ محض ان دونوں کی صورت دیکھنے کے لیے میں نے چائے کی ایک پیالی اور دو سڑی گلی پیسٹریاں ختم کرنے میں آدھا گھنٹہ لگا دیا۔ منیجر نے میری طرف ایک نظرِ خوش گذرے ڈالی اور پھر مجھ نووارد کو بالکل بے ضرر، بے خطر سمجھ کے اپنے ساتھی نوجوان سے باتیں کرنے لگا۔

اور اتنے میں وہ لکڑی کی کابک والا جوڑا باہر نکلا۔ مرد ڈک کے پتلون اور جالی دار رنگین بُش شرٹ میں، اور عورت چہرے پر، ناخونوں پر، ہونٹوں پر سُرخی جمائے، گندمی رنگ مگر جوان اور اچھی خاصی قبول صورت۔ منیجر کی طرف دیکھ کے وہ مُسکرائی، اور منیجر نے اس کی مُسکراہٹ کا اس طرح جواب دیا کہ گویا وہ اس سے بہت زمانے سے، بہت اچھی طرح واقف ہے مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں ۔۔۔۔۔

مَیں سوچنے لگا معلوم نہیں یہ لڑکی فلم اسٹار ہے، فلم اسٹار بننے والی ہے۔ یا اکسٹرا۔ اپنے اس کے ساتھ جو سرطان صورت آدمی ہے وہ تو کوئی اعلیٰ فلم اسٹار نہیں معلوم ہوتا۔ ممکن ہے تصویر کش ہو، مصنّف ہو۔ بھئی یہ اتنی دُور کا سفر بیکار ہی ہوا۔ ایک فلم اسٹار بھی نظر نہ آیا....

باہر نکل کے میں پھر پان والے بھیّا کی دوکان پر پہنچا۔ اس نے ایک پان بنا کے میرے حوالے کیا۔ میں نے کہا "بھیّا وہاں فلم اسٹار تو فلم اسٹار فلم کے چوہے بھی نہیں"۔ بھیّا کہنے لگا کہ "نہیں۔ موتی لال اور چودھری اکثر وہاں آتے ہیں۔ قریب قریب روز۔" اور اتنے میں سامنے ہی ایک بڑی سی موٹر ٹھہری، اس میں سے ایک صاحب گلابی رنگ کا زرق برق بُش شرٹ پہنے اُترے۔ پان والے نے کہا "دیکھو چودھری یہی ہیں"۔

میں جلدی سے آگے بڑھا اور چودھری صاحب نے سر سے پاؤں تک مجھے ذرا چڑھ کے استفہامیہ نظر سے دیکھا مگر جب میں نے اپنا تعارف کرایا، اور یہ بتایا کہ میں مالا بار ہل پر راجہ باجپائے کا مہمان ہوں تو بڑی مشکل سے صبر کر کے انھوں نے کہا "بڑی خوشی ہوئی ارشاد"۔ چودھری صاحب کے دانت پان کی شدّت سے بہت میلے ہو رہے تھے۔ بہر حال انھوں نے بڑی نوازش کی اور فرمایا "ہر روز وہ صبح وشام اس ریستوراں کو آتے ہیں" اور مجھے دعوت دی کہ میں یہیں آ کے ان سے ملوں۔ میں نے اپنا ٹیلیفون نمبر بتانا چاہا تو انھوں نے کہا "ابھی نہیں صاحب۔ یہاں کسے اتنی فرصت ہے کہ آپ کو ٹیلیفون کرتا پھرے آنا ہو آ جایئے ورنہ خدا حافظ"

یہ کہہ کے انھوں نے سر پر ہاتھ رکھا اور ریستوراں کے اندر جا پہنچے، جہاں کا منیجر میری طرف ناپسندیدگی اور غور سے دیکھ رہا تھا۔

بس فلم کے ستاروں کے درشن کی حد تک اس روز مجھے صرف اسی قدر کامیابی ہوئی لیکن اسی طرح میں ان کی زندگی دیکھنا چاہتا تھا۔ بھلا اس میں کیا لطف کہ ایک پارٹی دے کے راجہ باجپائے آسمانِ سیمیں کے دو درجن ستاروں کو بلا بھیجیں۔ پھر ایک گندی سی بس میں، جس میں گنجائش سے زیادہ بھیڑ میں بوری بندر پہنچا، اور وہاں سے میرین ڈرائیو جانے کے لیے وکٹوریا لی شام کے وقت بمبئی کی سڑکوں پر وکٹوریا میں سفر ایک خاص کیفیت رکھتا ہے۔ دو رویہ کئی کئی منزلوں کے درمیان، شام کی مہلک فضا میں، اور بہت سے جانداروں، کئی طرح کی مرکب حرکت کے ساتھ ساتھ انسان کو اپنے مقید اور مجبور ہونے کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اور یہ اس وقت تک باقی رہتا ہے جب تک چرچ گیٹ کے قریب سمندر کی پہلی جھلک نظر نہیں آجاتی۔ لیکن سمندر پر نظر پڑتے ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو رویہ عمارتیں انسان کو قید نہیں کر سکتیں، نہ بے کیف شام اسے اسیر کر سکتی ہے، اس میں تفریح اور آزادی کی اتنی ہی وسعت ہے، جتنی بے کنار سمندر میں۔

وکٹوریا والے کو پیسے دے کے میں اترا ہی تھا کہ راجہ ہریش چندر نظر آئے۔ یہ راجہ باجپائے کے رشتے کے بھائی ہیں، عمر میں ان کے آدھے ہیں۔ اور ابھی ابھی ان کی شادی ہوئی ہے، ان کی رانی بھی ساتھ تھیں۔

اُن کی رانی کا چاکلیٹ کا سا رنگ تھا، سر کے بال چکنے اور بنے ہوئے، اور ہونٹ پتلے اور دونوں سروں پر ایک قدرتی طنز کے انداز میں جھکے ہوئے، بچاری بہت دُبلی پتلی تھیں، اور سینہ اس عنفوانِ شباب کے عالم میں اندر کی طرف دھنسا ہوا۔

"ارے تم ...... ؟"

رانی نے اپنے پتلے طنزیہ لبوں سے متبسم ہو کے، ہاتھ جوڑ کے ہنستے کہا۔ راجہ ہریش چندر پر تنی ہوئی شیروانی بہت زیب دے رہی تھی، اور میرین ڈرائیو کی روش پر سے گزرنے والی گجراتی لڑکیوں کی آنکھیں کبھی کبھی لمحے بھر کے لیے ان کی شیروانی سے اٹک جاتیں، پھر ان کے چہرے کی طرف ایک لحظہ کے لیے اُٹھتیں، پھر سر سے قدم تک ان کا جائزہ لے کے دوسرے لمحے ان کو بھول کے اپنا راستہ لیتیں۔

ہیر شیین ڈائری میں ٹھنڈی کافی پی کے اِدھر اُدھر کی مہمل چیزوں کے متعلق باتیں کرتے رہے۔

رانی صاحبہ بھی کبھی کبھی کچھ کہتیں، ہنستیں، پھر سمندر کی طرف دیکھ کے سوچ میں کھو جاتیں، اور ان کے ماتھے کی بندی مدھم پڑ جاتی۔

ریس کورس پر حُسن ہی حُسن ہوا میں اُڑتے ہوئے ساڑھی کے پلوؤں میں حُسن، سر سے ڈھلکتے ہوئے آنچلوں میں حُسن، سڈول جسموں کے اطراف لپٹی ہوئی ساڑیوں کی شکنوں میں حُسن۔ رنگوں میں حُسن، چہروں میں حُسن، کٹی ہوئی لہراتی ہوئی زلفوں میں حُسن، نیلی، شربتی کالی آنکھوں میں حُسن، چمکتے ہموار دانتوں میں حُسن، ہاتھوں کے ہلانے، زبان کے ہلانے میں ہونٹوں کی جنبش، قدموں کی رفتار میں حُسن۔ میں گھوڑ دوڑ کیا خاک دیکھوں۔

راجہ صاحب ہزاروں کی شرطیں کھیل رہے ہیں۔ کبھی کبھی میرے جیب سے بٹوہ نکال کے اس میں سے روپے نکال کے لے جاتے ہیں، اور پھر کچھ زیادہ روپیہ لاکے مجھے دے دیتے ہیں۔ بھئی میزبان ہو تو راجہ باجپائے کا سا ہو۔ ہر چیز کی، ہر بات کی فکر۔ راجہ باجپائے گھوڑ دوڑ میں مجھے ڈھونڈھ نکالیں گے۔ مگر میں ان کو نہیں ڈھونڈھ سکتا۔ فیشن ایبل انسانوں کے اس ہجوم میں وہ پارہ ہیں، سیماب ہیں۔ ابھی یہاں، ابھی وہاں ان کا ڈھونڈھنا ناممکن ہے۔ نذیر کہہ رہا ہے۔ وہ کیا راجہ صاحب کھڑے اس سنیما ایکٹرس سے باتیں کر رہے ہیں۔ اور ایکٹرس سر سے بار بار ساڑی کا آنچل گرا کے ہنس ہنس کے بجلیاں گرا رہی ہے۔ جوان ہے، شاداب ہے، اس کا جسم ذرا بھاری ہے، اور جب ہنستی ہے تو اس کی بوٹی بوٹی پڑی تھرکتی ہے۔ اور ایک لکھنوی جوان بڑے ہی بڑھیا سوٹ میں کچھ دور کھڑا اپنے ساتھی سے کہہ رہا ہے: "دیکھ رہے ہو۔ مار ڈالا ظالم نے۔ ہائے ملتھے پہ بندی، بوٹا سا قد۔"

ایرانی لڑکیوں کی فصل کی فصل کھڑی ادھر دیکھ رہی ہے، جہاں گھوڑے پھرائے جا رہے ہیں۔ اور ابھی ابھی مہاراجہ بردوان ڈیڑھ میل والی دوڑ جیت چکے ہیں۔ ان ایرانی لڑکیوں کے ساتھ سب سے زیادہ سیاہ پوش ایک معمّر خاتون ہے۔ اس کی بے عیب فارسی میری سمجھ میں نہیں آتی۔ مگر اس کی انگریزی بھی بے عیب ہے۔ اُس سے گفتگو کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ پہلے تو یہ کہ کس گھوڑے پر شرط لگائی جائے۔ یہ مجھے کیا معلوم البتہ راجہ باجپائے نے میری کتاب

پر کچھ نشانات بنا دیے۔ معمّر ایرانی خاتون ان نشانات کو نقل کر لیتی ہے۔ اور پھر اپنی ساتھ والی ایک لڑکی سے کچھ کہتی ہے۔ یہ لڑکی بھی سیاہ پوش ہے، مگر اس کی سیاہ آنکھوں کی چمک غمی کی نہیں اس میں رس ہی رس، کشش ہی کشش ہے۔ اس لڑکی کے بائیں ہاتھ کی تیسری اُنگلی میں شادی کی انگوٹھی ہے۔ قبضے کی مُہر۔ پھر بھی اس کی آنکھیں کسی کی ملکیت نہیں بن سکتیں، ان میں شیراز کی شراب ہے۔ جو جام سے چھلکی جاتی ہے، اُن میں آبِ رکنا بادکی، زندہ رُود کی شفاف چمک ہے۔ میری ٹوٹی پھوٹی فارسی پر وہ شائستگی سے مُسکراتی ہے، اور پھر ہمت افزائی کے لیے فارسی ہی میں جواب دیتی ہے۔ جملے میں دو ایک لفظ میری سمجھ میں آجاتے ہیں۔ اور پھر معمّر خاتون اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگتی ہے۔ معمّر خاتون کا شوہر تیس سال تک بمبئی میں درآمد برآمد کا کاروبار کر کے خدا کے پاس جا پہنچا۔ اسی لیے یہ ایرانی خاندان سیاہ پوش تھا۔ لیکن بھلا کہیں گھوڑ دوڑ سے مفر ممکن ہے۔ اسی جمگھٹ میں ایک اور زیادہ کمسن لڑکی ہے۔ جس کی آنکھیں غزالی ہیں۔ بالکل ہرنوں کی سی آنکھیں، مگر اس کی ٹھوڑی بھی غزالوں کی سی ہے اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اُسے خوبصورت قرار دوں یا بدشکل۔

ایک پارسی لڑکی آ کے ان سب سے باتیں کرنے لگی۔ اس کا قد بلند اور نازک تھا۔ وہ ہری ساڑی پہنے تھی اور بڑی حسین معلوم ہوتی تھی۔ ایک سنہرے بالوں والی ہندو لڑکی قریب سے ہو کر نکلی، جس کے چہرے پر غازے یا سُرخی کا خفیف سا دھبہ بھی نہ تھا، اور اسی لیے اس کے چہرے سے بڑی غیر معمولی قدرتی ملاحت ٹپکتی تھی۔

میں نے خورشید مقدس جی کی دعوت پر ان کے ساتھ چائے پی۔ انگریزی میں وہ سیٹھ ہارون یعقوب سے کہہ رہے تھے: "اجی سر ایوب خاں کی اندھیری والی کوٹھی میں ایک پارٹی کا انتظام کیوں نہ کریں۔ مگر ذرا بے تکلف لوگوں کو بلائیں گے۔ راجہ باجپائے کو بلائیں گے اور اپنے اِن حیدر آبادی دوست کو ......" اور یہ کہہ کے بڑی سرپرستی کے انداز میں انھوں نے میری طرف اشارہ کیا۔ "اور انور جو کو، نواب اور بیگم مہتاب جنگ کو ... اب مہتاب جنگ کیسے ہیں؟"

"اب تو اچھے ہیں!" سیٹھ صاحب نے انگریزی ہی میں جواب دیا۔

"اس میں موتی لال کو بھی بلا ہی لیں گے۔ بیگم پارہ اور پروتیما داس گپتا کو بھی بلالو۔
ہارون تم کو معلوم ہے میں سینما کی ایکٹرسوں سے نہیں ملتا۔ مگر یہ لڑکیاں اچھے طبقے کی ہیں۔ لیکن ممتاز جہاں کو نہیں بلائیں گے۔ وہ سب سے زیادہ خوبصورت ہے۔ میں نے مانا، مگر لڑکی کم سے کم متوسط طبقے کی تو ہو۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ میرا اسٹیوارڈ چلا گیا ہے، اس کی وجہ سے تمام بٹلر بے قابو ہو رہے ہیں۔ نوکروں میں کوئی انتظام باقی نہیں رہا۔ سب سے زیادہ ضرورت تو ایک اسٹیوارڈ کی ہے۔۔۔۔" اور مجھ سے مخاطب ہو کے خورشید مقدس جی نے پھر اسی سرپرستی کے انداز میں کہا "مہاراجہ کارومنڈل کو میں نے آج بے تکلفی سے کاک ٹیل پینے کے لیے ولنگڈن بلایا ہے۔ تم بھی آجاؤ نا، بلکہ یہیں سے میرے ساتھ چلے چلو۔"

چائے پی چکنے کے بعد میں ادھر اُدھر پھر کے دیکھنے لگا۔ ایک پنجابی لڑکی، بھاری بھرا ہوا جسم، موٹے دعوت دیتے ہوئے سرخ سرخ ہونٹ، ایک بڑے کم رو نیاز مند سے شوہر کے ساتھ ساتھ تیز تیز چلی جا رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف گھور کے دیکھا تو بُرا مانے بغیر سوالیہ انداز میں اس کی آنکھوں نے پوچھا "کیوں۔ کیا اس سے پہلے آپ سے ملاقات کا شرف کبھی حاصل ہوا ہے؟"

نواب علی امداد خاں بھی تھے۔ گھوڑ دوڑ اور شرطوں میں بہت منہمک۔ ان کے ساتھ ساتھ ان کی نوجوان بیگم صاحبہ۔ ترو تازہ چہرے اور سرخ ہونٹوں میں چمکتے ہوئے سفید دانت مسکراہٹ مگر وہ دوسری خواتین کے ہجوم ہی میں زیادہ تر شامل رہتیں۔ نواب امداد علی خاں البتہ بڑے اہتمام سے ہر دوڑ میں ہر گھوڑے کی خصوصیات، اس کے جاکی کے ماضی اور حال کے کارناموں، ہر گھوڑے کے وزن، اس کی تربیت کرنے والے کے ہنر، اس گھوڑے کے مالک کے اصطبل اور ایسی بہت سی تفصیلوں کو اچھی طرح جانچنے کے بعد گھوڑے کا انتخاب کرتے، کبھی "ون" نہ کھیلتے، ہمیشہ "پلیس" کھیلتے اور اس پر بھی کبھی سو روپیہ سے زیادہ کی شرط نہ لگاتے۔ اور اس طرح قریب قریب ہر دوڑ میں جیتتے۔ تھوڑا ہی جیتتے مگر ضرور جیتتے۔ یہ سبق انھوں نے بہت کھو کھے سیکھا تھا، اور اب اپنے اصطبل کو وہ بڑے سائنسی انداز سے چلا اور بڑھا رہے تھے۔

اس شام کو میں خورشید مقدس جی اور انور جو کے ساتھ ولنگڈن میں بیٹھا وسکی پی رہا تھا اور ثقیل ثقیل سنبوسے کھا رہا تھا۔ باہر میزوں کے اطراف ہلکا سا اندھیرا تھا، اور اندر آرکسٹرا ناچ کی موسیقی بجا رہا تھا، اور اندر زرق برق ساڑیوں، یا مٹین کالے اور سیاہ فراکوں میں عورتیں مُسکراتی ہوئی، سانسیں پھولی ہوئی مردوں کے ساتھ ناچ رہی تھیں۔ ایک ٹھنگنا سا کالا آدمی، معمر، یقیناً پنشن یافتہ، ایک جوان یعنی ایک تیس سال کی لڑکی کے ساتھ ناچ کے فرش کی طرف جا رہا تھا۔ یہ لڑکی اس کی کون ہوگی۔ لڑکی؟ شلوار پہنے تھی یعنی بمبئی میں ریس کورس کا فینسی ڈریس۔ اس کی بیٹی؟ نہیں اس نے تو اس لڑکی کو چمٹا کے ناچنا شروع کیا۔ لڑکی کا قد اس سے آٹھ انچ زیادہ بلند ہے، اور عمر میں وہ اس سے تیس سال چھوٹی ہے۔ یقیناً یہ اس کی محبوبہ ہے۔ کوئی لڑکی جو محض ولنگڈن کلب میں ہفتے کی شام کی بہار دیکھنے اس کے ساتھ آئی ہے، شاید وہ ماہیم یا دادر کی طرف کسی اسکول میں پڑھاتی ہے یا کسی ہسپتال میں نرس ہے یا اس کا باپ نچلے متوسط طبقے کا آدمی ہوگا۔ اور ممکن ہے وہ اس ٹھِنگنے سے بوڑھے کالے آدمی کا ماتحت، منشی ہو۔

مَیں نے خورشید مقدس جی سے پوچھا تو وہ انگریزی میں کہنے لگے۔ "تم ان لوگوں کو نہیں جانتے۔ یہ بھڈکے اور مسز بھڈکے ہیں۔ بھڈکے سب سے پہلا ہندوستانی تھا جو بی بی سی آئی ریلوے میں چیف کمرشل منیجر کے عہدے تک پہنچا، اور یہ اس کی دوسری بیوی ہے۔ یہ بھی بڑے اچھے خاندان کی ہے، اس کا باپ پولیس کا ڈپٹی کمشنر تھا۔ اور تم نے بورگاؤں کر کا نام سُنا ہوگا نا جو سیپرس اور مائنرس میں تھا جسے وِکٹوریا کراس ملی، بچارا اندھا ہو گیا۔ یہ اس کی بہن ہے ......"

میں نے کہا۔ "مگر یہ تو عمر میں بہت چھوٹی ہے، پھر ذرا اس کی صورت دیکھیے اور اس بوڑھے کو دیکھیے۔ حور کے پہلو میں لنگور ......"

"اجی ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔" خورشید مقدس جی نے کہا۔ "مگر وہ اچھے طبقے کی تو ہے۔ اصلی چیز یہ ہے لڑکی اچھے طبقے کی ہو خواہ وہ بیوی بنے یا معشوقہ ... ... اچھا ذرا معاف کرنا۔ اُدھر مسز کرسٹ جی بیٹھی ہے۔ میں ذرا ایک ناچ ناچ کے آتا ہوں۔

کہو تو تم کو بھی کسی اچھی لڑکی سے ملادوں ۔۔۔۔۔ اس سے ملتے ہو؟"

یہ کہہ کے خورشید مقدس جی نے ایک پارسی عورت کی طرف اشارہ کیا۔ جس کی ساڑی کا بارڈر اس کے چہرے سے زیادہ حسین تھا، ایک امریکن ملاح افسر کے بازو پر لٹکی ہوئی وہ ناچ کے فرش کی طرف چلی جارہی تھی۔

"نہیں معاف کیجیے۔ میں انور جُو سے باتیں کرتا رہوں گا۔"

"ہا۔ ہا۔ ہا" خورشید مقدس جی اپنی دانست میں اپنے بے مثل مذاق پر خوش ہو کے آہستہ آہستہ ہنسے اور پھر مسٹر اور مسز کرسٹ جی کے میز کی طرف جا نکلے۔

باہر جہاں ہم بیٹھے ہوئے تھے سبزہ بڑا خوبصورت تھا، اور لان پر میز ہی میز تھے میں نے انور جُو سے باتیں کرتے کرتے اِدھر اُدھر گردن گھما کے دیکھا۔ عورتیں بڑے خوش وضع لباسوں میں تھیں۔ بمبئی کی تجارت اس کی تہذیب پر اتنی چھائی ہوئی ہے، کہ عورت اور مرد کے رشتے میں بھی تجارت کا ذرا تعلق سا ہے، اور لکھ پتی تاجر، اور کارخانوں کے مالک جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو ایک ایسی بین الاقوامیت لیے ہوئے جس کی تہہ میں گجرات اور بمبئی ہے۔ بمبئی کی تہذیب رسم سورت میں کمپنی بہادر کے کارخانوں اور سالسٹ اور لسبین کی ہے۔ پارسی ہندو اور مسلمان، گجراتی اور مرہٹے، خوجے، بوہرے اور میمن، اِتنے تمدّن، اتنے آئین و رسوم۔ اور یہ سب اس تجارتی بین الاقوامیت میں گم ہو جاتے ہیں، جس کا نام بمبئی ہے۔

ناچ کے بعد خورشید مقدس جی، مسز کرسٹ جی کے ساتھ مسٹر کرسٹ جی کو بھی اپنے ہی میز پر لے آئے۔ مسز کرسٹ جی چھوٹی سی تھی، ذرا پھیلی ہوئی، دانتوں کے درمیان ذرا ذرا سی جگہ خالی، اور عمر کی دوپہر کا آغاز تھا۔ مسٹر کرسٹ جی بڑے نیاز مند قسم کے لوگ تھے۔ بات کم کرتے، ٹھہر ٹھہر کے کرتے، اور بات کرنے سے پہلے سوچ لیتے کہ کوئی حماقت کی بات تو نہیں کر رہے ہیں، پھر بھی زیادہ تر باتیں ایسی ہی کرتے جن میں اگر حماقت کو زیادہ دخل نہیں تھا تو عقل مندی بھی زیادہ نہیں ہوتی تھی۔

سنبھل سنبھل کے، ٹھہر ٹھہر کے انھوں نے انور جُو سے اس کا پیشہ دریافت کیا۔ اور

پھر اپنے گھر کے عجائبات کا ذکر کرنے لگے۔ ان کے دادا نے سورت میں کمپنی بہادر کے ساتھ ساتھ ترقی کی تھی۔ اور ان کے والد کو سَر کا خطاب ملا تھا۔ اگر دانشمندی سے اتنے زیادہ معذور نہ ہوتے تو موجودہ کرسٹ جی کو بھی سَر کا خطاب کب کا مل گیا ہوتا۔ انھوں نے انور جُو کو اپنے گھر کے عجائبات دکھانے کے لیے گھر چل کے وسکی پینے کی دعوت دی اور ساتھ ہی ساتھ خورشید مقدس جی کو اور مجھے بھی مدعو کیا ہے۔ خورشید مقدس جی نے گجراتی گفتگو کا مطلب ہمیں سمجھایا۔ اور اب سوا آٹھ ہو رہے تھے، گھر کی طرف جانا تو تھا ہی۔ کلب کے باہر اپنی نیلی بیوک کے دروازے کے پاس خورشید مقدس جی بڑے شاہانہ انداز سے کھڑے ہو گئے، ایک بیرے پر گھوم کے دروازہ کھولا۔ مسز کرسٹ جی پیچھے کی نشست پر بیٹھنے لگی تو انھوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، وہ ٹھہر گئی اور مسز کرسٹ جی بڑی ہی روادار شائستگی سے مُسکرائے۔ مسز کرسٹ جی سامنے کی نشست پر بیٹھ گئی اور خورشید مقدس جی نے اسٹیرنگ وہیل سنبھالا۔ ہم سب پیچھے بیٹھے اور وارڈن روڈ ہوتے ہوئے ہارکنس روڈ کی طرف چلے، جہاں کرسٹ جی کا سو سال پُرانا مکان تھا۔

تی تائیو کی ایک آرامیدہ زہرہ تھی، جس کے متعلق رک رک کے، ٹھہر ٹھہر کے مسٹر کرسٹ جی نے ہم سب کو یقین دلایا کہ یہ اصلی ہے، اور اس کے دادا اسے بولونیا سے خرید کے لائے تھے۔ پھر مسٹر کرسٹ جی نے ہم سب کی صورتیں دیکھیں، خورشید مقدس جی ایک صوفے کی آڑ میں مسز کرسٹ جی کا ہاتھ مروڑ رہے تھے، اور ہم لوگوں کو تو یہ معلوم ہو رہا تھا کہ تصویر کا رنگ و روغن ذرا نیا نیا سا ہے، اور یہ اصل نہیں بالکل حال حال کی نقل ہے۔ لیکن یوں بھی مجھے تصویروں کی زیادہ پہچان بھی نہیں ... ...

بہرحال ایک چیز ضرور دلچسپ تھی، سنگِ مرمر کے میز پر کمرے کے ایک سرے پر ایک منقش چوبی پردے کے آگے، انیسویں صدی کی بنی ہوئی ایک بڑی سی گھڑی رکھی تھی، اس کے متعلق بہت تامل اور انکسار سے کرسٹ جی نے کہا کہ یہ ایک فرانسیسی کمپنی نے ترکی کے کسی سلطان کے لیے بنوائی تھی۔ اوپر ایک سنہرا ہلال تھا، اور ڈائل پر فرانسیسی عبارت ترکی نما حروف میں لکھی ہوئی تھی۔ اور بھی کئی چھوٹی

چھوٹی چیزیں بڑی دلچسپ تھیں۔ برک آبریک چینی گُل دان، جے پور کے سنگِ مرمر کے کھلونے، پُرانی تصویریں، فرنیچر لوئی چہاردھم کے زمانے کی نقل تھا۔ اور کرسٹ جی نے انکسار سے دونوں ہاتھ مل کے، اور پھر ایک ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈال کے کہا۔ یہ سب سامان میرے دادا پہلے کرسٹ جی کا فراہم کیا ہوا ہے۔ جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں سورت میں ... ... پھر ان کا لہجہ انکسار، خاکساری اور مصنوعی شرمیلے پن سے اس قدر مدّھم ہوگیا کہ باقی الفاظ صاف سُنائی نہیں دیے۔ صوفے کے پیچھے خورشید مقدس جی نے مسز کرسٹ جی کا ہاتھ پھر مروڑا اور مسز کرسٹ جی آہستہ سے اپنا ہاتھ چھُڑا کے ہٹ آئی۔

خورشید مقدس جی نے کہا "دیکھو میں آبان (یہ مسز کرسٹ جی کا نام تھا) سے کہہ رہا تھا۔ تمھارا نام کرسٹ، اصل میں خورشید ہے۔ یہ کرسٹ خورشید کا انگریزی تلفّظ ہے نا؟ سورت میں ایسٹ کمپنی کے زمانے میں تمھارے دادا نے یہ تلفّظ بنا لیا ہوگا۔ تو دیکھو مینو (یہ مسٹر کرسٹ جی کا نام تھا) ہم بھی خورشید تم بھی خورشید۔ اور خورشید پارسیوں کے لیے مقدس ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ ہمارے باپ دادا بھی کسی زمانے میں پارسی ہوں۔

اتنے میں بٹلر وہسکی کی بوتل، اور سوڈا بنانے کا شیشہ لایا۔ دوسرا بٹلر اس عجائبات سے بھرے ہوئے ڈرائنگ روم سے مناسبت رکھنے والی ایک چینی کی کشتی میں کٹ گلاس کے خوش وضع کام کے گلاس لایا۔ اور مسز کرسٹ جی میزبانی کے فرائض انجام دینے لگیں۔ سب کے لیے انھوں نے ایک ایک گلاس میں "بڑا" پیگ انڈیلا۔ اور بٹلر ہم لوگوں کے سامنے گشت کرنے لگا۔

کٹ گلاس پر بجلی کا قمقمہ کئی جگہ سے چمک رہا تھا۔ کرسٹ جی نے اپنے گلاس سے ایک چھوٹے سے آٹھ انچ کے مجسّمے کی طرف اشارہ کیا۔ اور ہم سب اس مجسّمے کے اطراف جمع ہو گئے۔ یہ کرسٹ جی کے سورت والے پَردادا کا چھوٹا سا سنگِ مرمر کا مجسمہ تھا۔ قدیم پارسی لباس اور ٹوپی، مکمّل، اتنی خوبصورتی اور نزاکت سے بنا ہوا کہ شال کے کشمیری نقش و نگار بھی سنگِ مرمر کے اس چھوٹے سے مجسّمے پر ترشے ہوئے تھے۔

مسٹر کرسٹ جی ذرا ذرا احمق ضرور ہے، مگر وہ غرور اور تصنع اور اکڑ جو خورشید مقدس جی ایسے نو دولیتوں میں ہے۔ اُس میں نہیں اور بہرحال اس میں خورشید مقدس جی سے بہت زیادہ ہے۔ کیوں کہ جب وہ اپنے دادا کا مجسمہ دکھا رہا تھا تو خورشید مقدس جی وسکی کے ہلکے ہلکے سرور میں کسی سے مخاطب ہوئے بغیر آپ ہی آپ آہستہ آہستہ ہنس رہے تھے "ہا۔ہا۔ہا" اور ان کی ہنسی یقیناً کرسٹ جی کو ناگوار گذر رہی تھی۔

مسز کرسٹ جی بات چیت کی حد تک بہت سُلجھی ہوئی تھی، بڑی شائستہ مگر مجھے تو وہ بڑی غیر دلکش معلوم ہو رہی تھی۔ معلوم نہیں خورشید مقدس جی کو اُس میں "اعلیٰ طبقے" کے سوا اور کون سی کشِش نظر آتی تھی۔

وسکی کے نشے میں مَیں اپنی فیلٹ ہیٹ وہیں مسٹر کرسٹ جی کے ہیٹ اسٹینڈ پر بھول آیا اور واپسی پر اپنے میزبان راجہ باجپائے سے جو کھلنے پر ابھی تک میرا انتظار کر تھے، مَیں نے کہا۔" راجہ کرسٹ جی بیوقوف ضرور ہے، مگر اچھا بیوقوف۔ یعنی اس سے دوبارہ ملنے کو طبیعت چاہتی ہے۔"

"اور مسز کرسٹ جی؟ خورشید مقدس جی تو اُس پر بہت مرتا ہے۔۔۔۔"

سُوپ پیتے ہوئے مَیں نے مُنہ بنایا۔ اور راجہ باجپائے اپنے دانتوں میں خلال کرنے لگے

وہ ڈبہ جس میں بیٹھا ہوا مَیں جوگیشوری جا رہا تھا بی بی اینڈ سی آئی کا اچھا خاصا سیکنڈ کلاس کا ڈبہ تھا۔ اخبار کے پیچھے ایک شخص کا ہاتھ پھر اس کا مُنہ نظر آیا۔ ہاتھ اور مُنہ دونوں پر جذام کے داغ تھے۔ مرض کا پھیلنا ضروری ہے۔ پانچ انگریز افسر تھے سب کے سب کپتان۔ ان کے ساتھ تین پارسی لڑکیاں تھیں۔ آٹھوں کے ساتھ نہانے کے جوڑے تھے۔ آج اتوار کا دن تھا اور یہ سب کے سب جوہو جا رہے ہوں گے۔ ایک غنڈہ جذامی کے پاس آکے بیٹھ گیا اور تینوں پارسی لڑکیوں کی طرف گھورنے لگا۔ پارسی لڑکیوں نے مُنھ پھیر لیا اور اپنے ساتھی انگریز کپتانوں سے باتیں کرنے لگیں۔

جوگیشوری کے اسٹیشن پر مَیں اُترا، اور مسافروں کے ہجوم سے ذرا الگ مَیں نے دیکھا کہ چالیس سال کا ایک لنگڑا جس کے دونوں پاؤں سوکھے اور مڑے ہوئے ہیں، بارہ برس کے ایک لڑکے کی پیٹھ پر سوار ہے۔ معلوم نہیں یہ لڑکے کا باپ ہے، ماموں ہے، چچا ہے، کون ہے۔ بوجھ اٹھائے ہوئے بارہ برس کے لڑکے پر ابھی سے بڑھاپے کے آثار ہیں، اس کے ماتھے پر جھرّیاں پڑنی شروع ہو گئی ہیں۔ آنکھیں زرد اور مردہ سی ہیں اور ان کے اطراف سیاہی ہے۔ پیرِ تسمہ پا کا شِکنجہ اس کے کاندھوں پر کسا ہوا تھا۔

باوجود اس کے کہ میں بیکار ہوں اور ایسی باتوں پر غور نہیں کیا کرتا۔ پھر بھی اس عجیب منظر کو دیکھ کے میں ٹھٹک سا گیا۔ ایک دن اس بارہ برس کے لڑکے کو دفعتاً یہ معلوم ہو جائے گا کہ وہ اس پیرِ تسمہ پا کے بوجھ سے آزاد ہو سکتا ہے۔ وہ اس کو چھوڑ کے کہیں بھاگ جائے گا۔ اور یہ لنگڑا چوہے کی طرح سِسک سِسک کے، رینگ رینگ کے مرے گا۔

پنچ محل تک وکٹوریا کا کرایہ دو روپیہ ہوا۔ جنگ سے پہلے وِکٹوریا والا بارہ آنے لیتا تھا۔ پنچ محل کی دیواریں دس دس فیٹ اُونچی ہیں، اور چور آنا چاہے تو نقب لگا کے آئے۔ دس فیٹ اُونچی دیوار پر گھاس اُگی ہوئی ہے۔

ایک ملاح لڑکا جو کوکب کا بھائی نِکلا، وکٹوریہ والے کی آواز سن کے پھاٹک کے قریب دیکھنے آیا کہ کون ہے۔ اس ملاح لڑکے کو کمیشن مل کے شاید ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے تھے۔ اس کی سفید وردی صاف شفاف چمک رہی تھی۔ مسٹر حسین نے "آہا" کہہ کے خیر مقدم کیا۔ میں ابھی کوکب سے کہہ رہا تھا کہ اور سب نے تو آج آنے کا قطعی وعدہ کیا تھا۔ صرف آپ کے آنے کا کچھ ٹھیک نہیں تھا۔

عورتوں کا انبار کا انبار تھا۔ ایک ناریل کے درخت کے نیچے دو عورتیں ایک سوزنی پر دراز تھیں، ایک پارسی عورت ان کے قریب بیٹھی ہوئی کچے ناریل کا پانی آہستہ آہستہ پی رہی تھی۔ دو منزلے مکان کے سائے میں ایک قالین بچھا ہوا تھا جس پر ایک تیس سال کی لڑکی اپنی دونوں ہتھیلیوں کو تکیہ بنائے لیٹی آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ملاح لڑکا اس کے قریب

جا کے بیٹھ گیا۔ تین کرسیوں پر مسٹر حسین کے ساتھ، دو اور آدمی بیٹھے تھے۔ انھوں نے ایک کا تعارف رستم بھائی کہہ کے کرایا، اور پھر مسز رستم بھائی کی طرف اشارہ کر کے تعارف کرایا، وہ کچا ناریل کھاتے کھاتے مسکرائی۔ رستم بھائی کے ساتھ دوسرا آدمی جو تھا، اس کو میں نے فوراً پہچان لیا۔ یہ وہی پستہ قد کم رُو آدمی تھا، کسی ریلوے کا وظیفہ یاب چیف کمرشل منیجر جس کو میں نے کل شام ولنگڈن کلب میں دیکھا۔ اور پھر جیسے ہی مسٹر حسین نے تعارف کراتے ہوئے مسٹر اور مسز بھڈ کے کہا۔ مجھے دفعتاً خیال آ گیا کہ یہ تیس سال کی عورت جو مکان کے سائے میں تالین پر لیٹی ہوئی اپنی دونوں ہتھیلیوں کا تکیہ بنائے آسمان کی چوندھیا دینے والی روشنی کی طرف دیکھ رہی ہے، مسز بھڈ کے ہے، جو اپنے شوہر کے ساتھ شلوار پہنے ہوئے کل ولنگڈن کلب میں ناچ رہی تھی اور میں نے خورشید مقدس جی سے کہا تھا "حور کے پہلو میں لنگور ....."

کوکب نے اٹھ کے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ اور مسٹر حسین نے مذاق میں کہا "اور اگر آپ ان سے واقف نہیں تو میں ان سے آپ کا تعارف کراتا ہوں۔ یہ میری بیوی کوکب ہیں ....." میں ہنسا۔ کوکب ہنسی۔ اس نے ایک کچا ناریل مجھے بھی دیا اور کہا "میں ان سے اس زمانے سے واقف ہوں، جب میں آپ سے ملی بھی نہ تھی، اور آپ سے شادی کرنے کا خیال میرے ذہن میں آنے بھی نہ پایا تھا۔"

ایک ہلکا سا تاریک سایہ، کڑی دوپہر میں ہلکے سفید ابر کے سائے کی طرح چھا کر مسٹر حسین کے چہرے پر سے گذر گیا۔ مسٹر رستم بھائی ہان کاؤ اور نانکنگ کے قصے سنا رہے تھے، جہاں ریشم کی تجارت میں انھوں نے عمر کا بڑا حصہ گزارا تھا۔

کوکب روپہلی اشرفیوں کا بلاؤز اور سادی جارجٹ کی سفید ساڑی پہنے تھی۔ اس کے چوڑے، گورے، حسین چہرے پر شباب کی تازگی تھی اور اس کی آنکھوں سے جھوٹ اور ریا کی جھلک مٹتی جا رہی تھی۔ کیسی غلطی، کیسی بڑی غلطی اس نے کی تھی۔ وہ صابن کے جھاگ اور بلبلوں کے پیچھے دوڑتی رہی، اور اس کی آنکھوں پر پٹی کس کے، زندگی اُسے دھکا دے کے بازو سے نکل گئی۔

میرے دل میں بھی کانٹا ٹوٹ گیا تھا اور کسک باقی رہ گئی تھی۔

تعارفوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا۔ وہ دو عورتیں جو مسز رستم بھائی کے قریب بیٹھی ہوئی تھیں، مسز سنگھ، اور مس چند تھیں۔ ان میں سے مس چند کم سواد، کم رنگ، کم رُو رستم بھائی کی باتیں غور سے سن رہی تھی۔

اور رستم بھائی یانگ چاؤ کی خوبصورت جھیل کا حال سنا رہے تھے، جس کا مقابلہ مسٹر بھڈے کے لن یوٹانگ کے ناولوں کے بیانات سے کر رہے تھے۔

مسٹر حسین مجھ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے، اور پھر جب ہم رستم بھائی کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ یانگ چاؤ کی جھیل میں کشتی رانی چھوڑ کے جاپان سے ہندوستان ریشم بھجوا رہے تھے۔ ان کی باتوں میں بڑی انسانیت، متانت اور شرافت تھی۔ اور مسٹر رستم بھائی مجھے پسند آئے۔ ان میں بڑی ہی شائستگی تھی جو نہ ہندوستان کی تھی نہ بمبئی کی جو انھوں نے غالباً چین میں سیکھی تھی۔ کچھ اسی طرف کی شائستہ سنجیدگی۔

مسز رستم بھائی کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ کبھی چین نہیں گئیں۔ مسٹر بھڈے چین تو نہیں انگلستان میں البتہ کئی سال رہے تھے اور کہتے تھے کہ ایک زمانے میں وہ فی بین سوسائٹی کے ممبر بھی تھے۔

مجھ سے نہیں رہا گیا۔ تھوڑے ہی دن ہوئے میں نے روس کے متعلق ایک موٹی تازی کتاب پڑھی تھی۔ جو راجہ صاحب نے مجھے بڑی تاکید سے پڑھنے کے لیے دی تھی۔ اسی کی بنا پر رستم بھائی اور مسز بھڈے کے سامنے میں نے دعویٰ کر دیا کہ میں بھی ذرا روس تک ہو آیا ہوں۔ میں بالشویکوں کے طرزِ حکومت کی تعریف کر رہا تھا۔ اور کوکب حیرت سے میرے سفید جھوٹ سُن رہی تھی۔ اُسے اچھی طرح معلوم تھا میں نے کبھی ہندوستان سے باہر قدم نہیں رکھا۔ مگر میں تھا کہ ماسکو اور کیف، اور وسط ایشیا کی داستانیں سناتا ہی جا رہا تھا۔ اور مسٹر بھڈے کے مُنھ کھولے ہوئے سُن رہے تھے۔ مسٹر رستم بھائی بے اعتباری سے ایک دو بار مُسکرائے۔ مگر زبان سے اخلاقاً کچھ نہیں کہا۔ مَیں نے اپنا سفر لینن گراڈ سے شروع کیا، ماسکو پہنچا، کیف پہنچا اور پھر سمرقند اور مرد آ کر دم لیا۔ جہاں پہاڑ تھے وہاں دریا بسا دیے،

جہاں دریا تھے، وہاں ریگستان پھیلا دیے۔ اور مسٹر حسین نے انگریزی میں تو نہیں اُردو میں آہستہ سے کہا۔

"جہاندیدہ بسیار گوید دروغ"

میں ان کے اس شعر کو اَن سُنا کر کے مسٹر بھنڈ کے کو سوویٹ روس کی خاندانی زندگی، اور جنسی عیاشی کے حیرت ناک قصے سُنانا جا رہا تھا۔ اور کوکب میزبان کی بیوی کی حیثیت سے ہنسی ضبط کر کے کچے ناریل سب کو دیتی جا رہی تھی۔

اتنے میں مہمانوں کے دو اور جوڑے آئے۔ دو نوجوان بُش شرٹ پہنے ذرا زنگارنگ قسموں کی، ان کے ساتھ دو نوجوان خواتین تھیں۔ ان میں سے ایک یقیناً خوبصورت تھی مگر اسے حمل کا کوئی چھٹا ساتواں مہینہ ہوگا۔ دوسری کے ہونٹ موٹے موٹے تھے، مگر بڑی اعلےٰ درجے کی بنارسی ساڑی پہنے تھی۔

اب باہر بیٹھنے کی جگہ ذرا کم تھی۔ کوکب سب خواتین کو اپنے ساتھ سمیٹ کے مکان کے اندر لے گئی۔ اس کے جانے کے بعد پنچ محل کے صحن میں خلا ہی خلا تھا۔

خواتین کے جاتے ہی گفتگو کا رُخ بدل گیا۔ جو دو نوجوان ابھی ابھی آئے تھے ان میں سے ایک صاحب آغا خانی تھے، اور میزبان کے اس اعتراض کا جواب دے رہے تھے کہ جن ہیروں میں آغا خاں تولے جانے والے ہیں۔ ان کے لیے غریبوں نے بھی چار آنے مہینہ چندہ دیا ہے۔ اور مسٹر بھنڈ کے مہاراجہ بھینسواڑ کے دیوان کا ذکر کر رہے تھے کہ وہ ہر ماہ شراب اتنے روپیوں کی پی جاتے ہیں کہ اس سے ایک چھوٹا موٹا ہسپتال کھولا جا سکتا ہے، اور بھینسواڑ کے لوگوں کو تو چبینہ میسّر نہیں، اور یہاں مہاراجہ کے گھوڑے ہیں کہ۔۔۔۔

اتنے میں مسٹر حسین دونوں نووارد نوجوانوں کو کوئی جنسی لطیفہ سنانے لگے، جس پر دونوں قہقہہ مار کے ہنسے۔ ان نوجوانوں میں سے دوسرا مسٹر خان مدراسی تھا۔ مگر اُردو اس صفائی سے بولتا تھا جیسے کوئی یو۔ پی کا رہنے والا بولے۔ کہنے لگا۔ وسیم کے نام سے اُردو میں مختصر افسانے لکھ لیتا ہوں۔ جو اکثر "گلشن" دہلی میں شائع ہوتے ہیں۔ وہ سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی سے مل چکا تھا، اور ان کے مدّاحوں میں سے تھا۔

پھر اس موضوع پر گفتگو ہونے لگی کہ جنگ کی وجہ سے بمبئی میں مکان اور فلیٹ نہیں ملتے۔ "پگڑی" دن بدن بڑھتی ہی جارہی ہے۔ سینکڑوں کی جگہ ہزاروں کی پگڑی دو، تب کہیں جاکے کوئی فلیٹ لو۔ سب نے اس رائے سے اتفاق کیا کہ جنگ کے بعد بھی مکان اور فلیٹ ملنے کی تکلیف بہت دن باقی رہے گی۔ اور اس کے بعد کپڑوں کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ اصلی ریشم کے متعلق جس کی پہچان یہ ہے کہ جب دھویا جائے تو پیلا پڑ جائے، شارک اسکن کے متعلق جو لکڑی کو کوٹ کے بنایا جاتا ہے۔ شارک اسکن سے مسٹر خان کو بڑی دلچسپی تھی۔ اور انھوں نے پچیس روپے فی گز تک شارک اسکن خریدا تھا۔ اپنی کرسی انھوں نے مسٹر رستم بھائی کے قریب کرلی اور غور سے شارک اسکن کے ملنے کے امکانات پر غور کرنے لگے۔ یہ گفتگو ناقابلِ برداشت ہوتی جارہی تھی۔ کوکب کے بغیر خلا ہی خلا تھا۔ میں نے ناریل کے اونچے درخت کی پھننگی کی طرف دیکھا اور شارک اسکن کے متعلق گفتگو کی عام سطح سے بلند ہونے کی کوشش کی، یہاں تک کہ میزبان کی خاتون نے سیڑھیوں پر سے چلّا کے کہا: "چائے تیار ہے"۔

چائے اچھی تھی، بہرحال دیر ہو رہی تھی، چائے پینے سے سر کا درد جاتا رہا۔ کئی طرح کے کیک تھے، پیسٹریاں تھیں۔ اور کھانے کے دوران میں مَیں زیادہ تر مسٹر خان سے باتیں کرتا رہا۔ کبھی شارک اسکن کے متعلق اور کبھی ان کے اپنے افسانوں کے متعلق۔ ڈرائنگ روم بڑا اچھا سجا ہوا تھا۔ برآمدے سے نمکین، مسطح، کالی زمین پر ناریل کے درختوں کے جھنڈ بڑے خوبصورت معلوم ہو رہے تھے۔ کسی نے بمبئی کا تلابہ عدن سے جا ملایا تھا۔ واپسی میں مسٹر رستم بھائی، مسٹر ہیڈ کے (جو روس کے مزید حالات سننا چاہتے تھے) اور مسٹر خان نے میرا ٹیلیفون نمبر مانگا اور میں نے راجہ باجپائے کا ٹیلیفون نمبر بتادیا۔ سب کے جانے کے بعد مسٹر حسین نے مجھے روک لیا۔ میں، ملاح لڑکا، کوکب اور مسٹر حسین باہر صحن میں بید کی کرسیوں پر بیٹھے۔ میں نے مسٹر رستم بھائی کی تعریف کی۔ مسز رستم بھائی بھی بڑی شائستہ عورت معلوم ہوتی تھی۔ میں نے بے خیالی میں کہا۔ "مگر دونوں کی عمروں میں بڑا فرق ہے"۔

"دونوں کی عمروں میں بڑا فرق ہے، پھر بھی دونوں ایک دوسرے سے بہت خوش ہیں"۔

کوکب نے یہ کہا۔ اور اس کی آنکھ میں ایک چنگاری سی بجھتی ہوئی معلوم ہوئی۔ مسٹر حسین کے چہرے پر سفید بادل کا ٹکڑا ایک لمحہ کے لیے سایہ ڈال کے غائب ہوگیا۔ اور ان کی کنپٹی کے کھچڑی کھچڑی بال ان کی پھیکی مسکراہٹ کی دھوپ میں چمکنے لگے۔

راجہ باجپائے مجھ سے بہت دنوں سے کہہ رہے تھے کہ یونی ورسٹی کا نو وکیشن ہال میں ایک بین الاقوامی نمائش ہے۔ اس کا دیکھنا اس لیے ضروری ہے کہ پچاس فی صدی دعوتوں میں اُس کا ذکر ہوتا ہے۔ راجہ باجپائے نے کہا۔" چلو اُسے دیکھ آئیں، ورنہ دعوتوں میں جب نمائش کے متعلق گفتگو ہوتی ہے تو مجھے جاہلوں کی طرح خاموش بیٹھے رہنا پڑتا ہے۔ میں بڑا جاہل اور اَن پڑھ محسوس کرتا ہوں۔"

لیکن راجہ باجپائے اس روز نمائش دیکھنے گئے جب میری دعوت مسٹر اور مسز حسین کے یہاں تھی۔ میں ان کے ساتھ نہ جا سکا۔ وہ واپس آئے تو اپنے تمام مہمانوں سے کھانے پر بار بار نمائش کا ذکر کرتے، اور اب میری اپنے آپ کو اَن پڑھ اور جاہل محسوس کرنے کی باری تھی۔ میں نے خیال کیا کہ چلو اس نمائش کو دیکھ ہی آئیں کچھ دیر نیپین سی روڈ پر بس کا انتظار کیا۔ پھر ارادہ کیا کہ ذرا اوپر چڑھ کے والکیشر روڈ سے دوسری بس کا انتظار کیوں نہ کروں۔ بس اسٹینڈ پر چار پانچ منٹ تو میں اکیلا کھڑا رہا۔ اتنے میں ایک پینتیس سال کی پارسی عورت آئی۔ سوکھے ہوئے ہونٹ جن پر اس نے سُرخی نہیں لگائی تھی، اچھی خاصی مگر ایسی زیادہ خوبصورت بھی نہیں۔ کوئی پینتیس سال کی عمر ہوگی۔ میں نے بس کے متعلق گفتگو شروع کی، اور اس نے جواب دیا۔ پھر وہ ذرا اور کھُلی۔ اس نے بتایا کہ پُونا میں بچّوں کو پڑھایا کرتی تھی۔ اب نیپین روڈ پر ایک بڑے پارسی گھرانے میں لڑکیوں کو سکھانے پر نوکر ہے۔ بس آج بیس منٹ دیر سے آئی اور اس اثنا میں وہ کبھی باتیں کرتی، کبھی خاموش ہو جاتی۔ یہاں تک کہ دو ایک پارسی بوڑھیاں آئیں اور صاحب جی کہہ کے وہ ان سے باتوں میں لگ گئی۔ بس آئی۔ مَیں نے غلطی یہ کی کہ اسی کی سیٹ پر اس کے پاس نہیں بیٹھا۔ دوسری بنچ پر بیٹھا۔ اس سے رُخ بدل گیا۔ معاملہ بگڑ گیا۔ ہم جب فلورا فونٹین کے قریب پہنچے تو پھر اجنبی بن چکے تھے۔ اور بس میں معلوم نہیں کس

ترکیب سے ایک کملے کیڑے کا بچّہ میرے کوٹ کی سیدھی آستین پر چڑھ گیا۔ ایک لالہ صاحب جو میرے پاس بیٹھے تھے انھیں یہ بہت ناگوار گذرا اور انھوں نے مجھے چھوٹے سے دشمن کی خبر دی۔ میں نے کمل کیڑے کو جھٹکا تو وہ نشست پر گرا، اور لالہ جی کپڑے جھٹک کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے کیڑے کو نیچے پھینک دیا۔ مگر لالہ جی نے دوبارہ بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ "نہیں جی ہم اِدھر اُترنے مانگتا"۔

کانووکیشن ہال میں نمائش تھی۔ بین الاقوامی نمائش سے مجھے کیا خاک دلچسپی ہوتی میں تو ان لڑکیوں کو دیکھنے آیا تھا جو نمائش دیکھنے آئی تھیں۔ تین چھوٹی سی مرہٹہ لڑکیاں ایک لانبی اور ذرا ویران ویران صورت کی، دوسری متوسط قد کی مگر بہت کالی۔ تیسری پستہ قد اور خوش رو آئیں، اور دربان ان سے حجّت کرنے لگا کہ اپنی کتابیں یہیں چھوڑتی جاؤ۔ شاید اسکول کی لڑکیاں تھیں، ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے صورتِ حال سمجھائی کہ یہ نمائش کا قاعدہ ہے۔ لانبی لڑکی شکریے کے طور پر مسکرائی۔ نمائش کے اس حصّے میں جہاں وسط ہند کی آثارِ قدیمہ کی کھدائیوں کی تصویریں تھیں، ہندوستان کے متعلق، اور بعض بہت غیر متعلق کتابیں تھیں۔ ہوائی ڈاک کے لفافے اور ٹکٹ تھے، مغل راجپوت اسکول اور رابندر ناتھ ٹیگور کی جدید تصویریں تھیں، جیرارڈ کے بنائے ہوئے نقشے اور چھوٹے چھوٹے تانبے اور پتھر کے مجسّمے تھے، میں ایک اسٹال سے دوسرے اسٹال کی جانب تینوں مرہٹہ لڑکیوں کے پیچھے پیچھے پھرتا رہا۔ اس تعاقب میں ایک پارسی پروفیسر خلل انداز ہوا جس نے زبردستی مجھے مخاطب کر کے ویریر ایلون کا ذکر چھیڑ دیا۔ ویریر ایلون نے ایک گونڈ عورت سے شادی کی تھی، یہ اس پارسی پروفیسر کو بہت ناگوار تھا۔ پارسی پروفیسر سے چھٹکارا حاصل کر کے میں پھر ان تینوں مرہٹہ لڑکیوں کے پیچھے پیچھے ایک اسٹال سے دوسرے اسٹال کی جانب پھرنے لگا۔ میں نے پستہ قد اور خوش رُو مرہٹہ لڑکی سے موقع دیکھ کے ہندی کے لسانی نقشے کے متعلق محض بات کرنے کے لیے پوچھا۔ وہ کہنے لگی یہ حروف کا ارتقا ظاہر کرتا ہے، اور میں اس کے لبوں کی حرکت دیکھتا رہا۔ دوسرے اسٹال پر میں نے پھر موقع دیکھ کر اس لڑکی کو چارلس جیرارڈ کے اس نقشے کا مطلب سمجھانا چاہا جس میں آرٹ کی تاریخ کا خلاصہ تھا۔ وہ مسکرا کے آگے بڑھ

گئے۔ میں ایک اسٹال کے بعد دوسرے اسٹال کو ان تینوں کے ساتھ پھرتا رہا۔ یہاں تک کہ کچھ اور مغل تصویریں نظر آئیں جن کے نام درج نہیں تھے۔ میں نے پستہ قد خوش رُو مرہٹہ لڑکی سے موقع پا کے پوچھا کہ آپ کے پاس جو فہرست ہے اس میں شاید ان تصویروں کے نام ہوں۔ اس نے ورق اُلٹے پلٹے اور کہنے لگی نہیں فہرست میں بھی نام نہیں۔ پھر کہنے لگی میں نے فہرست اس لیے خریدی تھی کہ اس سے مدد ملے گی مگر یہ تو بالکل بیکار ہے۔ یہ کہہ کے وہ ہنسی اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ نمائش کے باہر چل دی۔ میں نے اپنے دل میں کہا۔ تین تین لڑکیوں کا تعاقب کتنی حماقت ہے۔ یہ اکیلی ہوتی یا ان تینوں میں سے کوئی لڑکی اکیلی ہوتی تو شاید رسم وراہ کی صورت نکل سکتی۔ مجبوراً دل کو تسلی دینے کے لیے چینی نمائش میں چینی جیڈ اور جیڈ کا بنا ہوا ایک گل دان دیکھتا رہا۔ ایک چینی نمائش دیکھنے والوں کو نیم موسیقانہ لہجے میں گلدان کے تاریخی اسرار و رموز سمجھا رہا تھا۔

کاؤس جی جہانگیر ہال جاتے میں تینوں مرہٹہ لڑکیاں پھر دکھائی دیں۔ مگر اب ان کا تعاقب مجھے تضیعِ اوقات معلوم ہوا۔ کاؤس جی جہانگیر ہال کے دروازے پر پارسی لڑکیاں مسکرا مسکرا کے نمائش کا مرقع بیچنے کے لیے بڑھیں۔ میں نے بڑی لاچاری سے منھ بنا کے اپنی جیبوں کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ "نہیں"۔ وہ ہٹ گئیں، اور ان میں سے ایک دوسری سے مخاطب ہو کے کوئی نیا امریکن گیت گنگنانے لگی۔ ثقافتی نمائش میں ایک شمال یا وسط یورپ کی لڑکی دیہاتی کپڑے پہنے ہوئے ایک داڑھی والے پول سے باتیں کر رہی تھی۔ کچھ دُور پر ناروے کا پہلا قنصل جنرل اسی پارسی پروفیسر سے، جس کو ویریرا الیون کی شادی پر اعتراض تھا، باتیں کر رہا تھا۔ "ہاں برگن کے لوگ بڑے خوبصورت ہوتے ہیں .. ... ہاں بے شک بے شک بڑے مہمان نواز مگر اوسلو کے لوگ نہیں۔ نہیں۔ جب سے جنگ شروع ہوئی۔ میں ہی ... ... ہاں آپ ٹھیک کہتے ہیں ... . میں ہی، میں ہندوستان میں ناروے کا پہلا قنصل جنرل ہوں"۔

بعض عجیب عجیب "مجموعے" تھے۔ ایک پکا کانگریس والا یا شاید کمیونسٹ قسم کا نوجوان ایک بڑی خوبصورت سیاہ بالوں والی اینگلو انڈین لڑکی کے ساتھ پھر رہا تھا۔ ناروے کے اسٹال پر اس نے اپنی ساتھی حسینہ سے کہا: "چلو، یہاں سے چلیں۔ ناروے میں بڑی سردی ہے"۔

ناروے کا قنصل جنرل ان دونوں کی طرف دیکھ کے ذرا مُسکرایا اور پھر پارسی پروفیسر سے باتیں کرنے لگا۔ اس کانگریس والے کھدر پوش اور سیاہ بالوں والی اینگلو انڈین لڑکی کے ساتھ مثلث کی تکمیل کے لیے ایک اور نیم سفید سے چمڑے کا نوجوان تھا جو ممکن ہے کہ برّ اعظم یورپ کا یہودی ہو یا شاید بمبئی ہی کا کوئی اینگلو انڈین نوجوان ہو۔ وہ اس لڑکی کی بچی کھچی توجہ اپنی طرف منعطف کرنے میں کوشاں تھا۔

پھر ٹینس کے دو ریکٹ تھے۔ ٹینس کی ریکٹوں کے ساتھ دونوں نوجوان لڑکیوں کی کمریں بھی ذرا ذرا لچک جاتیں۔

پھر جب پریاں رخصت ہونے لگیں تو ایک ادھیڑ عمر عورت نے جو بڑی بیش قیمت بنارسی ساڑی پہنے تھی مجھ سے پوچھا کہ چین کہاں ہے۔ میں نے کہا۔ ہندوستان اور چین کے اسٹال تو کانووکیشن ہال میں ہیں۔ پھر اُس نے مجھ سے کہا کہ سویڈن کا اسٹال کہاں ہے۔ میں اشارے سے بتانے لگا تو اس نے کہا: "میں سمجھی نہیں"۔ مجبوراً میں اسے سویڈن کے اسٹال تک لے گیا۔ اسے پہنچا کے میں واپس آنے لگا تو وہ کہنے لگی: "یہاں تو کچھ بھی نہیں"۔ کنگ ہاکون اور اس کا ولی عہد دونوں تصویروں سے اس کی طرف دیکھتے ہی رہ گئے۔ میں نمائش کے باہر جانے لگا تو وہ کہنے لگی: "میں اور سب اسٹال دیکھ چکی ہوں۔ اگر آپ کہیں جانا چاہتے ہیں تو میں آپ کو پہنچا دوں"۔ جو گاڑی اس کے سامنے کھڑی تھی ۱۹۳۸ء کے ماڈل کی رولس رائس تھی۔ مگر اس ادھیڑ عمر کی عورت کے پاؤڈر اور رنگ سے لپے ہوئے چہرے، اور اس کے لباس میں سینٹ کی تیز مصنوعی خوشبو سے مجھے کچھ ایسی گھن معلوم ہوئی کہ میں نے شکریہ ادا کیا اور اپنی جان چھڑا کے بھاگا۔

میرین ڈرائیو پر ایک میلا سا لگا ہوا تھا۔ گجراتی، مرہٹے، پٹھان، خوجے، میمن، بوہرے، پنجابی، عرب، یہودی، انگریز، مرد عورتیں بچے، غریب، خوش حال، امیر اور سمندر، سمندر، سمندر۔

میں نے طے کیا کہ میرا جی بھر گیا ہے۔ اب کل راجہ باجپائے سے اجازت لے کے حیدر آباد واپس جاؤں گا۔ بیکاری کیسی عجیب زنجیر ہے، ایک شہر سے دوسرے شہر کو بھاگو مگر وہ ساتھ ساتھ ہے۔ تمام بیکاریوں سے زیادہ مہلک ذہنی بیکاری ...

سال بھر کے بعد حیدر آباد میں پھر اسی ذہنی بیکاری سے اُکتا کے مَیں بمبئی آیا۔ اب ہنگامے ہو رہے تھے۔ کانگریس نے آئی۔ ان۔ اے کے لیے ہنگامہ کیا۔ کمیونسٹ پارٹی کا دفتر لُوٹا گیا، اور ان کا چھاپہ خانہ توڑا گیا۔ مسلم لیگ نے رشید ڈے منایا۔ ہندوستانی بحریے نے بغاوت کی۔ اور مجھے یقین ہوگیا کہ اب شاید میری اور میرے جیسوں کی ذہنی اور عملی بیکاری ختم ہو۔ لیکن پھر ہندو مسلم فساد شروع ہوا۔ غنڈے کے چھرے پیٹھوں، گردنوں، آنکھوں میں بھونکے جانے لگے، موٹروں سے مشین گن نے بھائیوں پر گولیاں چلائیں، اور مَیں کھاتا پیتا، مزے اُڑاتا بیکار پھر مطمئن ہوگیا کہ اس ملک میں کچھ نہیں ہوگا۔ شاید یہ آزادی کے قابل ہی نہیں۔ اور پھر اپنی بیکاری کا لُطف اٹھانے کے لیے اور اس کو بُھلانے کے لیے مَیں نے حیدر آباد سے بمبئی، بمبئی سے "پُونا"، پُونا سے دہلی، لاہور، مسوری، دارجلنگ کا چکّر شروع کیا اور اگر ہو سکا تو ان گرمیوں میں مَیں امریکہ کا اک چکّر لگا آؤں گا۔ راجہ باجپائے تو پختہ ارادہ کر چکے ہیں۔

OO

قاتلِ کبیر

اپنے کچے مکان کے دروازے کا قفل کھولنے سے پہلے کبیر نے کتے کے پلے کی طرف دیکھا جو اب بھی اسی جگہ تھا' جہاں صبح کچہری جانے سے پہلے' اس نے اس کتے کے پلے پر اپنی چھڑی سے زور کا وار کیا۔ چھڑی کی نوک پر لوہا لگا ہوا تھا۔ کبیر کو یقیں تھا کہ کتے کا پلا مرگیا ہوگا لیکن اگر مرگیا ہوتا تو میونسپلٹی والے اسے اٹھا لے جاتے۔ وہ ابھی تک----- شام کے پانچ بجے تو وہ عدالت کے برخواست ہونے کے بعد گھر روانہ ہوا تھا----- وہیں کیسے پڑا ہوتا۔ کبیر نے موری کے قریب آ کے کتے کے پلے کو دیکھا جس کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں اور منہ کھلا ہوا تھا' اور ایک کالا سا چیونٹا اس کی ناک کے نتھنے سے نکلا اور اس کے سفید جسم پر رینگنے لگا۔ جس پر بڑے بڑے کالے کالے دھبے تھے۔ "ارے خدا----- ہے بھگوان یہ تو مرگیا" کبیر نے اپنے آپ سے کہا۔ اسم بامسمی۔ کبیر خدا کو دونوں ناموں سے یاد کرتا تھا۔

دفعتاً" کبیر نے محسوس کیا کہ ساری عمر میں پہلی مرتبہ' اب جبکہ اس کی عمر پچاس سے اوپر ہونے آئی تھی وہ قتل کا مرتکب ہوا ہے۔ کتے کے پلے ہی کا سہی لیکن

قتل ------ یہ سامنے جو سفید جسم پڑا تھا جس کی کھال اجلی تھی اور جس پر کالے کالے دھبے تھے۔ آج صبح اس میں جان تھی۔ اس نے کتے کے پلے کے لمبوترے جبڑے کی طرف دیکھا جو انسان کے جبڑے سے اس قدر مختلف تھا۔ اور آج کل تو لوگ انسان کے بچوں کو نیزوں اور سنگینوں سے چھید رہے تھے، کڑاہی میں تل رہے تھے۔

میونسپلٹی کا صبح والا چھکڑا کتے کے پلے کو اٹھا نہیں لے گیا نہ سہی، شام والا چھکڑا اٹھا لے جائے گا۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ کبیر کا عدالت والا کوٹ میلا میلا سا تھا۔ اس کا پاجامہ صاف تھا لیکن بڑے موٹے جھوٹے سفید کھادی کے کپڑے کا۔ وکیل درجہ سوم کا یونیفارم، اور اس یونیفارم میں وہ گزشتہ اٹھائیس سال سے معمولی مجسٹریٹوں کو سرکار سرکار کہہ کر مقدمے لڑتا رہا اور زیادہ تر ہارتا رہا۔ کبھی اسے اتنا نصیب نہ ہوا کہ کچھ بچا سکے۔ کبھی زیادہ فیس مل گئی تو پراٹھے پوریاں کھالیں۔ کبھی چبینہ پر گزر ہو گیا۔ شروع شروع میں وہ امید کرتا رہا کہ ایک دن اس کی آمدنی اتنی ہو جائے گی کہ وہ شادی بیاہ کر کے گھر بسا پائے گا مگر اس کی نوبت نہ آئی۔ محلے والوں کے بچے اسے بہت پسند تھے۔ سررشتہ دار صاحب کا لڑکا ندیم، ہری رام پنت کا چھوٹا سا لڑکا گنپت، یہ کبھی کبھی بن بلائے مہمانوں کی طرح اس کے کچے مکان کے دروازے پر لٹکتا ہوا ٹاٹ کا پھٹا پردہ اٹھا کر اندر آجاتے اور وہ انہیں ریوڑیاں، گڑ، میٹھے چنے اور جو کچھ ہوتا چینی مٹی کے مرتبان سے نکال کے کھانے کے لئے دے دیتا۔

نہ سررشتہ دار صاحب اور نہ ہری رام پنت کو پتہ تھا کہ کبیر کا مذہب کیا ہے؟ وہ ایک گاؤں "خان پور" سے آیا تھا جو شہر سے اکیس میل دور تھا۔ بہت تحقیق کے بعد سررشتہ دار صاحب کو پولیس کے ایک انسپکٹر نے بتایا کہ اس کا باپ خان پور میں ایک بنئے کے یہاں چوکیداری کرتا تھا اور اس نے ایک نیچ ذات لڑکی اپنے گھر ڈال لی تھی جس سے یہ پیدا ہوا تھا۔ باپ نے اس کا نام شیخ سعید رکھا تھا۔ ماں اس ڈر کے مارے کہ کوئی چڑیل اس کو کھا نہ جائے اسے ڈونگر کہا کرتی تھی لیکن یہ جب خان پور سے ایک انگریز صاحب کے پاس نوکر ہو کے شہر آیا، جو خان پور مرغابیوں کا شکار کھیلنے گئے تھے۔ اور جب ذرا پڑھ لکھ کے اس نے کبیر کے دوہوں پر سر دھننا سیکھا تو اس نے اپنا نام شیخ سعید اور ڈونگر سے بدل کر کبیر رکھ لیا۔ صاحب کے زیر سایہ اس نے اردو مڈل تک تعلیم پائی۔ وکالت

درجہ سوم کا امتحان پاس کیا اور پھر صاحب کی ملازمت چھوڑ دی۔

اس کے ہمسایوں نے کبھی اس کو کسی سے لڑتے بھڑتے نہ دیکھا تھا۔ وہ بات ہی بہت کم کرتا تھا۔ صبح کے دس بجے تک مؤکلوں سے سر مغزنی کرتا تھا اور پھر عدالت کو چلا جاتا تھا۔ جہاں سے پانچ بجے واپس آ کے کھانا کھاتا' بشرطیکہ گھر میں پکانے کے لئے جوار یا گیہوں کا آٹا کچھ ہوتا۔ اور پھر شام تک یا لیٹ کے ستاتا' یا پھر کبیر اور اردو کے صوفیانہ شاعروں کے کلام گا گا کے پڑھتا۔ اور پھر لالٹین جلا کے وکالت ناموں' مثلوں' عرضی دعوؤں اور مانگے تانگے کی قانون کی کتابوں میں غرق ہو جاتا۔ کبھی کبھی شام کو سر رشتہ دار صاحب اسے گھر سے باہر دیکھ کے بلا لیتے "اجی او وکیل صاحب! اجی او کبیر صاحب" اور وہ بڑے انکسار سے سر رشتہ دار صاحب کو سلام کر کے ان کے گھر کے باہر کے چبوترے پر جو سب سے زیادہ شکستہ مونڈھا ہوتا اس پر بیٹھ کے دونوں ہاتھ باندھ لیتا۔ ندیم اس کی گود میں اچک کے بیٹھ جاتا اور وہ خود بڑی شائستگی سے سر رشتہ دار صاحب کے سوالات کا جواب دیتا "سرکار! یہ وکالت پیشہ ہی ایسا ہے کہ جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ کیا عرض کروں۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ جو سوکھی روٹی کھاتا ہوں وہ بھی حلال کی نہیں' حرام کی ہے۔"

کبیر کا ایسا نیک' شریف' مرنجاں مرنج' صوفی منش آدمی' یکلخت قاتل کیسے ہو گیا؟

اس کی کئی وجہیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ دشمن کا قبضہ اس شہر پر ہو چکا تھا جس کے نواح میں کچے گھروں کا وہ محلّہ بھی تھا جس میں وہ رہتا تھا۔ اور جس میں اس نے دیکھا کہ سر رشتہ دار صاحب اور ہری رام پنت ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے ہیں۔ ندیم اور گنپت کو اس کے دیکھتے دیکھتے نیزوں اور سنگینوں نے چھید دیا تھا۔ اور اب کوئی بچہ پھٹے ٹاٹ کا پردہ اٹھا کے اسے دیکھ کر کھلکھلا کر نہ ہنستا۔ جنونی ہجوم نعرے بلند کرتے آتے۔ سر رشتہ دار اور ہری رام پنت اور محلے کے اور بہت سے باسیوں کے گھر خالی پڑے تھے۔ سامان سب لٹ چکا تھا۔ وہ اپنے مکان میں اسی طرح رہتا' حالانکہ مؤکلوں نے دو مہینے سے اس کے گھر کا رخ نہ کیا تھا۔ مشتعل مجمعے اس کے گھر میں کچھ ہوتا تو لوٹتے۔ وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ رہ گیا وہ خود' تو اسے دیکھ کے کوئی کہتا "پاگل ہے" کوئی کہتا "جوگی ہے" اس کے مذہب ہی کا کچھ ٹھیک پتہ نہ تھا۔ اس کے خون سے کون اپنا برچھا یا اپنی تلوار ناپاک کرتا۔

یہاں تک کہ طوفان گزر گیا۔ یکے بعد دیگرے ہری رام پنت اور سررشتہ دار صاحب اور دوسرے محلے والے پھر سے اپنے اپنے گھروں میں آ بسے۔ لیکن کچھ عورتیں غائب ہو چکی تھیں۔ کچھ بچے چھد چکے تھے اور محلے پر ایک سوگوار سی کیفیت طاری تھی اور کبیر کو وہ بچے بار بار یاد آتے تھے جو اس کے دروازے کا ٹاٹ کا پھٹا ہوا پردہ اٹھا کے جھانکتے تھے اور کلکاری مار کے ہنستے تھے۔

ایک وجہ اور تھی۔ اسے ہمیشہ سے کتوں سے نفرت رہی تھی۔ خان پور میں ایک دن وہ اپنے باپ کو جوار کی روٹی، مونگ پھلی کی چٹنی اور لوٹا بھر پانی دینے کے لئے بنئے کی دکان پر گیا اور جب اس کا باپ کھا چکا، پانی پی چکا اور ڈکار لے کر پیٹ پر ہاتھ پھیر چکا تو کبیر نے خالی برتن اٹھائے اور گھر کی راہ لی۔ پولیس پٹیل رانا کے مکان کے سامنے سے دو کتے کبیر پر جھپٹے۔ اس زمانے میں وہ مشکل سے دس برس کا ہو گا۔ اور وہ چیختا اور ہانپتا ہوا بھاگا۔ اسے یقین تھا کہ یہ کتے رانا کے بیٹے نائک نے اس پر چھوڑے ہیں۔ مگر اس وقت اسے اپنی جان کی فکر تھی اور کتے بھونکتے جاتے تھے اور اسے دوڑا رہے تھے۔ ڈاک خانے کے سامنے رام سنگھ نے دو بڑے بڑے پتھر مار کر کتوں کو بھگا دیا اور روتا اور تھرتھر کانپتا ہوا کبیر زمین پر گر پڑا اور مٹی کے برتن چکنا چور ہو گئے۔

اس کے بعد سے کبیر کی کبھی کتوں سے نہیں بنی۔ جس گلی میں وہ کسی کتے کو کھڑا بیٹھا، یہاں تک کہ آنکھ موندے لیٹا دیکھتا۔ وہ گلی کے اس پار سے اس پار پہنچ جاتا اور کتے کی طرف بڑی سہمی ہوئی نظر سے دیکھتا جاتا۔ کچے گھروندوں کے محلے کے اس پار کھیت تھے جن میں پگڈنڈیاں تھیں۔ لاکھ دیمک خوردہ سہی لیکن وہاں ہوا بڑی فرحت بخش تھی۔ پھر بھی کبھی کبیر کی ہمت نہیں ہوئی کہ اندھیرے منہ ان کھیتوں میں سیر کرنے نکل جائے کیونکہ جا بجا چوڑے چوڑے کانوں والے، کالے، چتکبرے، مٹیالے اور زرد کتے اس کی صورت دیکھتے ہی بھونکنے لگتے۔

اور پھر ایک دن یہ ہوا کہ اس نے دو چھوٹے چھوٹے اجنبیوں کو ٹاٹ کے اس پھٹے ہوئے پردے سے جھانکتے دیکھا، جس سے پہلے ندیم اور گنپت جھانکا کرتے تھے۔ یہ دونوں زرد رنگ کے بہت ہی چھوٹے چھوٹے کتے کے پلے تھے۔ کبیر اس وقت صحن میں بیٹھا دانت مانجھ رہا تھا۔ ان کتوں کے بچوں کو انسان کے مردہ بچوں کی طرح جھانکتے دیکھ کر

اس کی ریڑھ کی ہڈی پر سردی کی سی ایک لہر دوڑ گئی۔ بلا کسی ارادے کے ' بلا کچھ سوچے سمجھے اس نے ایک پتھر اٹھایا اور دونوں اجنبی کتوں کے پلے بھاگ گئے۔ وہ پھر بیٹھ کے دانت مانجھنے لگا۔

اس روز شام کو جب وہ کچہری سے گھر واپس آیا تو بڑا تھکا ہوا تھا۔ مقدمے یوں بھی بہت کم ملتے تھے اور کوئی تیس چالیس روپے سے زیادہ فیس کا نہیں۔ لیکن آج تو وہ مقدمہ ہار کے آیا تھا' حالانکہ اسے یقین تھا کہ اس کا موکل حق پر تھا۔ گھر آ کے اس نے جوار کی روٹی تھوپی۔ بھنڈیاں جو وہ کچہری سے آتے آتے خرید کے رومال میں باندھ لایا تھا' سرخ مرچ اور زیرہ ڈال کے تلیں اور کھانا حلق سے اتار کے زور سے ڈکار لی۔ منہ دھویا اور نظیر کا صوفیانہ کلام جھوم جھوم کے پڑھنے لگا۔ لیکن آج اس کے دل پر ایک بوجھ سا تھا۔ بان کے پلنگ پر تکیہ دہرا کر کے اس نے سرہانے رکھا اور کمر سیدھی کرنے لیٹ گیا۔

اس نے آنکھیں موند لی تھیں' لیکن سویا نہیں تھا۔ اس وقت سونے سے سر میں درد ہو جایا کرتا تھا۔ وہ ادھر ادھر کی باتیں سوچ رہا تھا۔ اس کی زندگی اب بھی ویسی ہی گزر رہی تھی جیسے اٹھائیس برس سے گزرتی آئی تھی لیکن اب تھکن زیادہ تھی۔ اتنی کہ برداشت نہیں ہو پاتی تھی۔

وہ دفعتاً" چونک پڑا۔ چیں چیں کی آواز آ رہی تھی اور بہت قریب سے آ رہی تھی۔ اس نے اپنی چارپائی کے نیچے جھانک کر دیکھا۔ ایک بیمار' کمزور سا کتے کا پلا چارپائی کے ایک پائے سے لگا ہوا بیٹھا تھا۔ اس کا جسم سفید تھا اور اس سفیدی پر کہیں کہیں بڑے بڑے کالے کالے دھبے تھے۔ یہ وہی کتے کا پلا تھا' جس کا اس قصے کے شروع میں آپ سے تعارف ہو چکا ہے۔ اس کو اپنی چارپائی کے نیچے اس آرام سے بیٹھا دیکھ کر کبیر اپنا سفید خشخشی بالوں والا سر کھجانے لگا۔ پہلے تو اس نے چاہا کہ لات مار کے اس کتے کے پلے کو بھگا دے۔ قریب میں کسی کتیا نے جھولی بھر بچے دیئے ہوں گے' اور یہ دشمن زادے اب اس کے سارے گھر کو غلیظ کر رہے تھے لیکن وہ اس قدر تھکا ہوا تھا کہ چارپائی سے اٹھنے کو اس کا جی نہ چاہا اور وہ کروٹ بدل کر دیوار کی طرف دیکھنے لگا' جس پر کچی اینٹوں پر چونے کی ہلکی سی تہ جگہ جگہ سے کھردری ہو گئی تھی۔ اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

پھر ہلکی سی اور ذرا مسلسل چیں چیں کی آواز آئی- اس مرتبہ اس آواز میں بیماری اور بیچارگی کا کرب تھا- کبیر نے آنکھیں کھولیں- یہ سفید کتے کا پلا بڑا کمزور اور بیمار سا معلوم ہوتا تھا- بلا ارادہ کبیر اٹھ بیٹھا- ایک لمحے کے تذبذب کے بعد اس نے پتیلی سے بچی کھچی ارہر کی دال نکالی جو اس نے صبح کو اپنے ناشتے کے لئے پکائی تھی اور باقی پانچ بجے بھنڈی کے ساتھ نہیں کھائی تھی' رات کے لئے اٹھا رکھی تھی- ڈوئی بھر دال اس نے مٹی کے ایک چھوٹے سے پیالے میں انڈیلی اور اس سفید کتے کے پلے کے آگے بڑھا دی- کتے کے پلے کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا- اس نے دم ہلائی اور پھر پچھلے دھڑ کے بل بیٹھ گیا- جھنجلا کے اپنے پیر کے انگوٹھے سے کبیر نے کتے کے پلے کا منہ جھکا کے دال تک پہنچایا- اس نے دال کو سونگھا' منہ ادھر ادھر جھٹکا- اب تک وہ شاید صرف کتیا کے دودھ کا عادی تھا- کبیر نے پیر کے انگوٹھے سے اس کا منہ دال کی طرف اور زیادہ جھکایا اور اس مرتبہ اس سفید کتے کے پلے نے لپ لپ دال کو چاٹنا شروع کیا اور تھوڑی دیر میں سارا برتن چاٹ گیا- خوش ہو کے کبیر نے اسی مٹی کے برتن میں اپنے پیتل کے لوٹے سے تھوڑا سا پانی ڈالا- کتے کے بچے نے ایک دو گھونٹ پانی کے پئے- اور دم ہلانے لگا- کبیر نے پاؤں کے انگوٹھے سے اس کا سر پانی تک پہنچانے کی کوشش کی- اس مرتبہ کتے کے پلے نے اپنے آگے کے دونوں پنجے مٹی کے برتن میں جما دیئے اور پانی الٹ دیا- اس پر کبیر کا دبا ہوا غصہ جاگ اٹھا- اس نے زور سے کتے کے پلے پر ایک لات جمائی جو کمرے کے دروازے کے اس پار جا گرا اور بڑی تکلیف سے "چیں' چیں' چیں" چلانے اور بلبلانے لگا- اس کی اس تکلیف' اس طرح بلبلانے سے کبیر نے پہلی بار ایک خوشی' ایک نامعلوم اطمینان' سرور' ایک طرح کی اندرونی تکمیل کی لہر محسوس کی- وہ آگے بڑھا کہ کتے کے پلے کو ایک اور لات رسید کرے اور اسے آنگن کے دروازے کے باہر پھینک دے لیکن جب وہ کتے کے پلے کے قریب پہنچا تو اس کی چیں چیں بند ہو چکی تھی- اس کی جگہ ایک طرح سے وہ رو رہا تھا جیسے چھوٹے بچے روتے ہیں- بڑی فریاد کے لہجے میں- اس پر کبیر کا دل پسیجا اور اس نے اپنے پاؤں کے تلوے کو کتے کے پلے کے سفید داغدار جسم پر آہستہ آہستہ پھیرنا شروع کیا- کتے کا پلا پھر دم ہلانے لگا اور زبان نکال کر اس نے کبیر کے پیر کے تلوے کو چاٹ لیا- اس پر کراہت کے عالم میں کبیر نے کتے کے پلے کے ایک اور لات

رسید کی۔ وہ صحن کی دیوار کے قریب جا کے گرا۔ اور پھر زور زور سے پیں پیں کرنے لگا۔ کبیر نے اسے آنگن سے باہر پھینکنے کی کوشش نہیں کی اور واپس آ کے اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔

گرمیوں کی رات تھی۔ پھر بھی تین چار بار کتے کے پلے کے پیں پیں کرنے کی آواز آئی۔ کبیر اٹھا اور صحن کی دیوار کے پاس سے کان پکڑ کے کتے کے پلے کو اٹھایا، جس نے منہ سے آواز تک نہیں نکالی، اور اسے دروازے کے باہر موری میں آہستہ سے پھینک کے دروازے کا کواڑ بند کر لیا اور سو گیا۔

صبح صبح دودھ والے نے درواہ کھٹکھٹایا۔ کبیر نے دروازہ کھولا۔ دودھ لیا، چائے بنائی اور پینے لگا۔ اپنے جوتے کے قریب اس نے پھر ایک نرم جسم کا لمس محسوس کیا۔ وہی سفید کتے کا پلا اس کا جوتا چاٹ رہا تھا اور دم ہلا رہا تھا۔ اس مٹی کے برتن میں اس نے تھوڑی سی چائے انڈیلی، تھوڑا سا دودھ اور ڈالا اور پیر کے پنجے سے کتے کے پلے کا منہ برتن کے قریب کر دیا۔ ایک منٹ میں کتے کا پلا ساری چائے سپٹر سپٹر پی گیا اور برتن چاٹنے لگا۔ پھر دونوں پیروں کو سیدھا کر کے، نچلے دھڑ پر بیٹھ کر بڑی نحیف اور کمزور آواز میں وہ ذرا بھونکا۔

"ابے کتے کے پلے بھونکتا بھی ہے؟" یہ کہہ کر کبیر نے پھر زور سے لات جمائی اور کتے کا پلا اپلوں کے ڈھیر کی طرف پیں پیں چیختا ہوا بھاگا اور اپلوں کے ڈھیر اور دیوار کے درمیان ذرا سی جگہ پا کے اس میں سرک کے مردہ اور نحیف آواز میں مسلسل پیں پیں کرنے لگا۔

اپنے پاؤں کے تلوے سے کبیر نے اس کا سر سہلانے کی کوشش کی لیکن وہ باہر نہیں نکلا نہ اس نے دم ہلائی۔ کبیر نے اپنی چھڑی اٹھائی جس کے سرے پر لوہا چڑھا ہوا تھا اور لوہے والا سرا کتے کے پلے کی ہڈیوں میں چبھویا۔ کتے کے پلے نے پھر بھونڈی درد ناک آواز میں پیں پیں شروع کی اور اپلوں کے ڈھیر سے باہر نکلنے کے لئے مڑا۔ کبیر پر اس وقت دفعتاً جنون سا چڑھا اور اس نے اپنی لوہے کی نوک والی چھڑی کی ایک بھرپور مار سے کتے کے پلے کو اچھال کے ٹاٹ کے پردے کے اس پار، گھر سے باہر گلی میں پھینک دیا۔ پھر سن لائٹ سوپ سے اچھی طرح مل مل کر اپنے ہاتھ اور پیر دھوئے اور چھڑی کی

ہانڈی کو چولھے پر چڑھا دیا اور مئوکلوں کا انتظار کرنے لگا۔

اور اس روز شام کو جب وہ کچہری سے واپس آیا تو اس نے اس سفید کتے کے پلے کو وہیں سڑک پر پڑا دیکھا۔ اس کا سفید جسم جس پر بڑے بڑے کالے کالے دھبے تھے اکڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی سی، کھلی ہوئی تھیں۔ منہ کھلا ہوا تھا اور ایک کالا چیونٹا اس کے سفید جسم پر رینگ رہا تھا۔

رات بھر اپنے اس پہلے قتل کے کرب کے عالم میں وہ سو نہیں سکا۔ اس نے آج پہلی مرتبہ ایک جان لی تھی۔ جان کا بنانا اس کے اختیار میں نہیں تھا لیکن جان لینا اس کے اختیار میں تھا۔ وہ جو دن رات کبیر کے دوہے پڑھا کرتا تھا جس نے اپنی زندگی کبیر کے نام کے پیچھے وقف کر دی تھی، آج اسے اپنے اندر ایک نشاط انگیز ظالمانہ جذبے، ایک ابلیسی طاقت کا احساس ہوا۔ اسے اپنے آپ سے نفرت بھی معلوم ہونے لگی اور ساتھ ہی ساتھ ایک ناقابل بیان اطمینان، ایک طرح کا نشاط بھی۔

اسی شام کو میونسپلٹی کا چھکڑا سفید کتے کے پلے کی لاش کو اٹھا لے گیا تھا۔ اور یوں بھی اس محلے میں شاید ہی اس کتے کے پلے کے وجود کا علم یا اس سے کوئی دلچسپی ہو، سررشتہ دار یا ہری رام پنت یا راموگولی یا دوسرے جان پہچان والوں کے خواب و خیال میں بھی نہ آ سکتا تھا کہ اس کتے کے پلے کا قاتل کبیر ہو سکتا ہے۔ اور یوں انہوں نے انسانوں کے قتل کے ایسے ایسے منظر دیکھے تھے کہ اب انسان ہو یا حیوان کسی کی جان کی کوئی وقعت باقی نہیں رہی تھی۔ پھر بھی ہفتوں بعد تک کبیر اپنے کسی ہمسائے سے آنکھیں چار کر کے بات نہ کر سکا۔ اس کی گردن خود بخود جھکی جھکی سی رہتی۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے سینے پر کوئی خاص بار نہیں تھا بلکہ کتے کے پلے کی لاش پر رینگتا ہوا چیونٹا جب اسے یاد آ جاتا تو اس کے خون میں انبساط اور اطمینان کی ایک نشہ آمیز لہر دوڑ جاتی۔

کئی مہینے گزر گئے اور کسی کتے کے پلے نے کبیر کے گھر کے دروازے کے ٹاٹ کے پردے سے جھانک کر اندر نہیں دیکھا لیکن راموگولی کے مویشیوں کے قریب ایک زرد رنگ کی غلاظت بھری کتیا جس کی پسلیاں تک صاف صاف گنی جا سکتی تھیں۔ کروٹ چاروں پاؤں پھیلے گھنٹوں پڑی رہتی۔ کبیر جو کتوں کو دیکھ کر سڑک کی دوسری طرف تانگھ جاتا تھا، بے خوف و خطر اس کتیا کے قریب سے ہو کر نکل جاتا اور وہ زیادہ سے زیادہ مریل

انداز میں سر اٹھا کر دیکھ لیتی۔ کتیا کا پیٹ پھولتا جا رہا تھا اور پھر کچھ دنوں کے لئے وہ غائب ہو گئی۔

ایک دن کچہری سے واپس آتے ہوئے کبیر نے دیکھا کہ سڑک سے ذرا ہٹ کر ایک کھڈ میں وہی کتیا جھول بھر بچے لئے بیٹھی ہے۔ طرح طرح کے کتے کے پلے ایک سفید' بالکل سفید' ایک بالکل کالا' دو چتکبرے' ایک زرد اور یہ کتے کے پلے اس کے چاروں طرف رینگ رہے ہیں۔ کبیر کو قریب دیکھ کر کتیا ذرا بزدلی سے بھونکی۔ اور پھر دم ہلانے لگی۔ معلوم نہیں کبیر میں اتنی ہمت کہاں سے آ گئی کہ وہ کتیا کے قریب گیا اور وہ ایک دم سے اٹھ کے بھاگ گئی۔ دفعتا" کبیر نے ان کتے کے پلوں کو تھپکنے کی خواہش محسوس کی۔ مگر ابھی تو یہ بہت چھوٹے تھے۔ بڑی مشکل سے رینگ سکتے تھے۔ پھر بھی اس نے اپنی چھڑی بغل میں دبائی اور ایک ہاتھ میں آہستہ سے بالکل سفید روئی کے گالے کے سے کتے کے پلے کو اٹھایا اور دوسرے ہاتھ سے کالے پلے کو' راستے میں رامو گولی سر پر دودھ کا مٹکا لئے جا رہا تھا۔ اس نے کہا "نمستے وکیل صاحب۔ اچھے پلے ہیں' انہیں پالو گے؟"

کبیر نے یوں محسوس کیا جیسے وہ چوری کرتے میں پکڑا گیا ہو۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور جلدی جلدی دونوں پلوں کو لئے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

OO

رومتہ الکُبریٰ کی ایک شام

پُل کے نیچے مٹیالی ٹائبر بہہ رہی تھی۔ اُس پُل کے ستون دریا کی سطح سے نیچے، اور سڑک کی سطح سے اُونچے، سان پیترو کے عالیشان گنبد کے سنتریوں کی طرح ادب سے دُور کھڑے تھے۔ عقیل نے پیچھے مُڑ کے دیکھا۔ پیالتا سان پیترو کے عظیم لشان، باشوکت ستونی نیم دائرے نظروں سے چھُپ چکے تھے۔ لیکن میکیل آنجلو کی صناعی کا وہ شاہکار، کلیسائے سان پیترو (سینٹ پیٹر) کا گنبد، اب بھی دے تی کانو (دے ٹی کن) کے شہریار کی طرح آسمان کی بلندیوں کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ بائیں طرف تے دے رے (ٹائبر) کے کنارے سانت آنجیلو کا مُدوّر قلعہ تھا۔ جس کے سامنے سانت آنجیلو کا پُل تھا۔ پُل پر دونوں طرف چھ چھ قدِ آدم مجسّمے تھے، اور ہر دو مجسموں کے درمیان ایک قندیل عقیل کو یہ سوچ کر تعجب ہوا کہ اُس سے پہلے اُس نے غور نہیں کیا تھا کہ ہر دو مجسموں کے درمیان ایک قندیل ہے سانت آنجیلو کے قلعے یا ـــــ دراصل ـــــ مقبرے پر اس تیرفیٹ اُونچے اور دو سو اُنیس فیٹ قطر کے دائرے پر ایک برنجی فرشتہ اپنے پَر تول رہا تھا۔ یہ فرشتہ صدیوں بعد یہاں آیا۔ کیوں کہ قلعہ تو ہیڈرین نے بنایا تھا اور ہیڈرین سے لے کر کارا کالا تک کئی شہنشاہ اس دائرے میں دفن ہوئے۔

عقیل سوچنے لگا۔ اس برنجی فرشتے کو شاید گرمی نہیں ہوتی۔ آج ستمبر کی ۲۰ تاریخ تھی۔

لیکن آفتاب میں اس قدر تمازت تھی کہ معاذاللہ۔ سارا دن اُس نے ہر ہر زاویے سے کلیسائے سان پترو کو دیکھنے میں گذارا تھا۔ رافائیلو کا دیواری نقش، میکیل آنجیلو کی بنائی ہوئی چیزیں، مرمر کے ستون، زینے، چبوترے، دیواریں، کلیسا کے اندرونی نقوش، ہر طرح کا رنگ، ہر قسم کی تراش، کتنا جوش، کتنا جذبہ، کتنا تقدس، کتنے دنوں کی محنت، کتنی راتوں کی سوچ بچار، کتنے دماغوں کی اُپج، کتنی نظروں کی خوبی، کتنے قلوب کی پاکیزگی اس کلیسا کی تعمیر میں مضمر تھی۔ عبادت گاہ کا اثر زائر اور عبادت گذار پر ہوتا ہے۔ عبادت گاہ عبادت گذار پر چھا نہ جائے تو اُس کی تعمیر مکمل کیونکر کہلائے۔ عبادت گاہ، اپنے ستونوں، اپنے سقف و بام اپنی دیواروں کی کاریگری کی مدد سے تشہیر مذہب کرتی ہے۔ جو جذبہ انسان کو یہ عبادت گاہیں بنانے پر مجبور کرتا ہے، وہ اُس پر بھی مجبور کرتا ہے کہ بقول اقبال سنگ و خشت کی آبیاری، خونِ جگر سے کی جائے۔ جامع مسجد دلی ہو یا مسجدِ قرطبہ، سان پیترو ہو یا سینٹ پال کا کلیسا، مندر ہوں یا گردوارے۔ سب کی آبیاری۔ اسی خونِ جگر سے ہوتی ہے، جس سے سِل دل بن جاتی ہے۔ یہ سب سوچتا ہوا اور 'پولتے دتوریا مانویل' پر سے دریا کے مٹیالے پانی کو دیکھتا ہوا وہ اور آگے بڑھا۔ پُل کے آگے ہی ایک نئی عمارت بن رہی تھی۔ مزدور کام کر رہے تھے۔ ایک اور عمارت کے سائے میں عقیل ذرا ٹھہرا اور اُس نے کلائی کی گھڑی کی طرف دیکھا۔ چار بجنے میں صرف پانچ منٹ باقی تھے۔ چار بجے اُسے پروفیسر کا دل کانتی سے پیاتسا دے نت سیا کے قریب ایک کافی گھر میں ملنا تھا۔ وہ پہنچ تو سکتا تھا۔ لیکن تمازت اس قدر تھی کہ اب اُس سے چلا نہ جا سکتا تھا۔ اتنے میں ایک گھوڑا گاڑی کو خالی دیکھ کے اُس نے پوچھا "کوانتو پر پیاتسا دے نت سیا؟" (پیاتسا دے نت سیا تک جانے کا کیا کرایہ لوگے) یہ پیاتسا دے نت سیا وہی ہے۔ جہاں سے مسولینی کی گرجدار آواز — اور اطالوی زبان میں مردانہ پن تو آ سکتا ہے۔ لیکن گرجدار آواز کے لیے یہ ذرا ناموزوں ہی معلوم ہوتی ہے ... بار بار سیاہ قمیص والوں کی سینکڑوں صفوں کو مخاطب کیا کرتی تھی۔ جہاں سے ابی سینیا کے قتل کا فرمان جاری ہوا تھا۔ وہ ابی سینیا جس کی لاش کی زہرناکی کو اب یورپ کے گرگس بھول رہے تھے۔ اب ہسپانیہ میں دایاں ہاتھ، بائیں ہاتھ کو کاٹنے کے لیے لگاتار

منزہیں لگا رہا تھا اور پیاتسا دے نت سیا سے اطالوی آمر کی گرجدار آواز بار بار دائیں ہاتھ کوشہ دے رہی تھی۔

گاڑی والے نے اُوپر سے نیچے تک اس بیرونِ ملک کے ایشیائی کو دیکھا اور کہا "چنکو لیرے" (پانچ لیرے)۔ عقیل نے کہا "ترے (تین) بالآخر چار پر وہ تیار ہوگیا مجبوری تھی۔ اب بھی یہ سواری بہت مہنگی تھی۔ لیکن کوئی اور گاڑی نظر بھی نہیں آرہی تھی۔

گھوڑے گاڑی پیاتسا دے نت سیا پہنچی ہی تھی اور عقیل ابھی وتوریوامانوئیل کی یادگار کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ آلۂ مکبرالصوت گونجنے لگا: "رومانی (اہل روما) آج ۳۰ ستمبر کو آپ کا دوچے، بے نی تو مسولینی، جرمنی کے فیوہرر (قائد) سے ملاقات کے بعد رُوما واپس پہنچے گا۔ اس کا اس جوش و خروش اور شان و شوکت سے خیر مقدم کیجیے۔ جیسا قدیم روما میں فتح مند قیصروں کا کیا جاتا تھا۔ اس تیسری سلطنتِ روما کے آگسٹس کا خیر مقدم کیجیے"۔

مسولینی کے شہر کی شرکل کی جو کمان پیاتسا دے نت سیا کے آگے دیا ناتسیو نالے کے ختم پر بنی تھی۔ آلۂ مکبرالصوت کی آواز سے ہل گئی۔

آج ۳۰ ستمبر ۱۹۳۸ء کی شام کے چار بجے تھے۔

گاڑی سے اُتر کے عقیل نے کوچوان کو چار لیرے دیے اور کانے دی کا دور میں وہ پروفیسر کاول کانتی کو ڈھونڈھنے لگا۔

"ہم میں سے بہت کم نے مقابلے کی ہمت کی"۔ پروفیسر کاول کانتی نے کافی ختم کر کے پیالی رکھتے ہوئے ہوئے کہا۔ "بہت کم نے۔ معاشی دشواریاں، جلاوطنی کا ڈر"۔ انھوں نے اپنی آواز دھیمی کردی۔ حالانکہ وہ انگریزی میں باتیں کر رہے تھے۔ "بالآخر کروچے نے بھی ہتھیار ڈال دیے"۔

"ہاں یہ سب سے بڑی ٹریجڈی تھی"۔ عقیل نے کہا۔

• کروچے نے اپنی اظہاریت میں سلطنت کے دخل در معقولات کے حق کو تسلیم کرلیا۔ اور کروچے کو اطالیہ میں رہنے کی اجازت مل گئی اور بھی بہت سے لوگ یہیں رہے۔

ہیں ماریو پراٹس۔ میکیل آنجلو گوئیدی۔ کئی صناع، کئی سنگتراش، کئی ادیب۔ ہم میں سے کئی فاشسطت ہوگئے۔"

"جی ہاں۔ دانن تسیو نے تو شہر فیومے میں ہتھیار ہی سنبھال لیے تھے"، عقیل نے کہا۔

"میں دانن تسیو کو زیادہ الزام نہیں دیتا۔ اُس زمانے تک فاشسطیت شہنشاہیت نہیں بنی تھی۔ حبِ وطن اور ایک طرح کی ــــ مستی ــــ رومانیت نے دانن تسیو کو اکسایا تھا۔ بڑا ہی عجیب وغریب آدمی تھا۔ لیکن ان لوگوں سے کہیں بادشاہی یا سپہ سالاری ہوسکتی ہے۔ ذرا بائرن کو یونان کا بادشاہ تصور کرو۔"

عقیل ہنسا۔ لمحہ بھر بعد اُس نے کہا۔ "لیکن سینورے چیکو سلاوکیا اور پولینڈ کی صدارت میسرک اور پیدریوسکی نے کی ہی۔"

"میرے عزیز لڑکے تم تو جمہوریتوں کا ذکر لے بیٹھے۔ وہاں یہ صاحب دماغ لوگ حکومت کر سکتے ہیں۔"

"کیوں کیا لینن صاحبِ دماغ نہیں تھا؟"

پروفیسر کاول کانتی نے چونک کے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر اپنی چھوٹی سی سفید فرانسیسی وضع کی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ "آہستہ آہستہ ... اگر تم یہ نہیں چاہتے ہو، کہ تمھارا یہ سفر بہت جلد ختم کر دیا جائے۔"

"معاف کیجیے۔" عقیل نے یہ محسوس کر کے کہا کہ آس پاس کے میزوں پر دوسرے لوگ ان کی گفتگو ممکن ہے سمجھ رہے ہوں۔

"اُس کی وجہ میں تمھیں سمجھا دوں؟" پروفیسر نے چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے دلچسپی اور تمسخر کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "گارتسونے۔" اور کافی گھر کا ایک ادھیڑ عمر کا ملازم جلدی سے میز کے قریب آیا۔ پروفیسر نے اُس سے اس کا وطن پوچھا۔ اُس نے کہا "فیومے" پروفیسر نے عقیل سے کہا "دانن تسیو، ہمارے شاعرِ اعظم کی فتح سے پہلے یہ شہر اور اُس کی رعایا ہنگری تھی۔" پھر اُس نے ملازم سے پوچھا۔ "تمھاری زبان کیا ہے۔" اُس نے کہا "ہنگری۔" "تمھارے

عزیزو اقارب کہاں ہیں ؟" اُس نے بوداپسٹ اور سیگید کے نام گنوا دیے اور آخر پروفیسر نے مُسکرا کے ذرا مصنوعی سخت لہجے میں پوچھا "اب تمھارا سیاسی عقیدہ کیا ہے ؟"

کافی گھر کے ملازم نے جلدی سے گھبرا کے دُہرایا "سیامو توتی اتالیانی، توتی فاشستلی توتی پر مسولینی" (ہم سب اطالوی ہیں، سب فاشسطت ہیں ۔ سب مسولینی کے ہیں)۔

"براوو" (شاباش) پروفیسر نے ہنس کے اُس سے کہا اور اُسے بِل ادا کر کے انعام دیا۔ "دیکھ لیا تم نے ہمارے طوطوں کو ان کا سبق کتنی اچھی طرح یاد ہے ۔ لینن کا ذکر سرحد پار جا کے کرنا۔ اب اگر فرصت ہو تو چلو ذرا پے لے تی نو کی پہاڑی تک ٹہل آئیں ۔ یا شاید تم مصروف ہو ۔"

"نہیں سینورے ۔"

ایک لمحہ کے لیے پروفیسر و توریو امانویل کی یادگار کے سامنے ٹھہرا ۔ "دیکھو یہ فن ہم نے یونانیوں سے سیکھا ہے ۔ تعمیر کا فن، اونچے ستون اور قوسیں، نیم دائرے اور دائرے، عموداً اونچائیاں اور اُفقی طور پر دائرے ۔ خطوطِ راست اور دائرے ایک دوسرے کے مصلح ہیں ان سے فنِ تعمیر میں عظمت پیدا ہوتی ہے ۔"

اس عمارت کی بنیاد کے سامنے ہی دو چشمے ہیں ۔ یہ اُن دو سمندروں کے رمز ہیں ۔ جو اطالیہ کے ساحلوں کو دھوتے ہیں ـــــ یٹرے نین اور اڈریاٹک ۔ پھر ایک بڑا سا زینہ ہے اس شاندار زینے کے قدموں میں مرمریں مجسموں کے دو مجموعے ہیں ۔ جن پر جا بجا سُنہری کام ہے ۔ مجسموں کا ایک مجموعہ "عمل" کا مظہر ہے اور دوسرا "غور و فکر" کا ۔ پھر زینے چڑھئے ۔ آپ کو دونوں طرف دو بڑے بڑے شیر ملیں گے جو اپنے طاقتور جسموں پر "فتح" کا مجسمہ سنبھالے ہوئے ہیں ۔ پہلے شاندار چبوترے پر "قربان گاہِ وطن" یا "تقدس گاہِ وطن" نقش ہے ۔ جس کی درمیانی شکل 'روما' ہے اس شکل کے نیچے ہی، گذشتہ جنگِ عظیم کے اُس "نامعلوم سپاہی" کے لیے جگہ تلاش کی گئی ہے ۔ جو ہر مُلک میں کسی ایسی ہی شاندار جگہ دفن ہے ۔ جس کی پرستش اتنی ہی ہوتی ہے جیسے کسی مقدس بزرگ کی ہو ۔ جس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ

نامعلوم ہے۔ وہ جنگ کا سب سے بڑا رومانی ہیرو ہے۔ وہ ہر سپاہی ہے۔ وہ ایک رمز ہے۔ وہ جنگ کے دیوتا کی بھینٹ ہے۔ وہ جنگ کا دیوتا ہے۔

لیکن اطالوی اتحاد کی اس یادگار عمارت میں یہ نامعلوم سپاہی بہت بعد آیا۔ پہلے تو اس نقش کے پاس صرف "فتح"، "اتحاد"، قربانی" اور "حق" کے مجسمے ایک مرمریں مجموعے میں نظر آتے تھے۔ اس مجموعہ کے درمیان شان و شوکتِ شاہانہ کے ساتھ، اور دوسرے رمزی مجسموں سے ممتاز شاہ وتوریو ایمانوئیل ثانی کا مجسمہ ہے۔ چار برنجی، زرکار، مجسمے نقیبوں کی طرح اس شاہی مجسمے کی دربانی کر رہے ہیں اور وہ چار مجسمے ہیں: سیاست، فلسفہ، انقلاب — اور جنگ۔

"جب یہ یادگار بنی ہے": پروفیسر کاول کانتی نے اپنے کوٹ کی جیبوں میں دونوں ہاتھ ڈال کے کہا۔" تب انگلستان، اور شاید یورپ بھر کے ادیب اور علماء ہمارے ہمدرد تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اطالیہ کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں مل کے ایک مُلک بن جائیں۔ مگر اب — دیکھو وہ ایک مجسمہ جنگ کا بھی ہے، جو پورے اطالیہ کے اتحاد کے نمائندے بادشاہ کے مجسمے کا دربان ہے — نوجوان آدمی، یورپ بھر کی رفتار تیز ہے — اور آگے بڑھ کے سڑک پر یکلخت ایک موڑ ہے۔"

"مجھے بھی یہی اندیشہ ہے"۔ عقیل نے کہا۔

" اور اس موڑ کے بعد ایک خندق ہے۔ ایک بار اس خندق میں گرنے کے بعد مجھے ڈر ہے کہ شاید ہی یورپ اس سے باہر نکل سکے۔"

"آپ کا کیا خیال ہے۔ اس مُلاقات میں ہٹلر اور مسولینی میں کیا طے پایا ہوگا؟"

"بھئی سیاست میں کون پیشین گوئی کر سکتا ہے"۔ پروفیسر نے اس یادگار عمارت کو پیچھے چھوڑ کر، ویادل امپیرو، (شہنشاہی سڑک) کا رُخ کیا۔" لیکن میرے خیال میں آسٹریا کا مسئلہ زیرِ بحث ہوگا۔"

"آسٹریا کا؟" عقیل نے بیکانکی طور پر دُہرایا۔

اور وہ اپنے قیامِ آسٹریا کے زمانے کا تصور کرنے لگا۔ اب سے دو ہی مہینے پہلے وہ

شہر جس کی حلقہ دار سڑک کے کنارے یورپ کی چند حسین ترین عمارتیں اب بھی ہاپسبرگ شان و شوکت کو یاد دلاتی ہیں۔ دی آنا۔ وہ شہر جہاں ڈینیوب کی نیلاہٹ پہچانی گئی۔ اور نغمہ بن گئی۔ وہ شہر جو پیرس کے بعد اب بھی یورپ کا حسین ترین شہر ہے۔ جہاں اب بھی گلی کوچوں سے کلاسیکی نغمے سنائی دیتے ہیں۔ وہ شہر جو اب ایک ایسے چھوٹے سے ملک کا دارالخلافہ ہے جو اس دارالخلافے کو بھی معاشی طور پر برداشت نہیں کر سکتا اور اُسے اپنے دی آنا کے دوست یاد آ گئے۔ زیادہ تر نازی تھے اور راتوں کو یہودیوں کو ٹھوکنے کے لیے نکلتے تھے۔ جس دن وہ دی آنا چھوڑ رہا تھا۔ اُس دن اُسے معلوم ہوا کہ اُس کے کلب میں کچھ اشتراکی بھی ہیں۔

"لیکن مسولینی برنیر کے درے پر ہٹلر کی فوجوں کو ہرگز گوارا نہ کرے گا۔" عقیل نے کہا۔

"آہستہ، آہستہ۔" پروفیسر کاول کانتی نے پھر اُسے سمجھایا۔ پھر کہا: "میرے خیال میں تو یورپ میں حلقہ ہائے اثر کی تقسیم ہو جائے گی ہمیں جنوبی یورپ ملے گا اور جرمنوں کو شمالی یورپ، ایک سانولی سلطنتِ روما، ایک گوری شمالی وحشیوں کی سلطنت ...." پروفیسر کا چہرہ طنز سے ذرا ٹیڑھا ہوا۔

"اور آلپس کے پہاڑ سرحد کا کام دیں گے؟" عقیل نے ہنس کے پوچھا۔

"ہاں۔ آلپس کار پیتھین، قاف۔ یہ دونوں سلطنتوں کی سرحد ہوگی؟" پروفیسر نے اُسی تمسخر کے لہجے میں کہا۔

"اور البرز، قراقرم، اور ہمالیہ۔ سینورے؟" عقیل نے کہا۔

"میرے عزیز نوجوان، اس قدر رجائیت بھی اچھی نہیں ـــــ اور نہ تمھارے لیے اس قدر قنوطیت، ایشیا کے دوسرے سرے پر جاپان بھی تو ہے۔ وہ بھی تو ہمارا دوست ہے۔ آخر اس کا بھی تو کچھ کہنے کو جی چاہے گا۔ اُس کا بھی تو کچھ حق ہے۔"

"درست۔ سینورے۔"

اب قدیم رومۃ الکبریٰ کے ویرانوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ سڑک کے ساتھ ساتھ

سیدھے ہاتھ کی طرف رُومی فورم تھا۔ فورم کی ایک دیوار پر تین بڑے بڑے نقشے تھے۔ جن کی طرف پروفیسر نے اشارہ کیا۔

عقیل نے دیکھا۔ پہلے نقشے میں صرف رُوم کا چھوٹا سا شہر اور گرد و نواح کا کچھ علاقہ تھا۔ دوسرے نقشے میں قدیم سلطنتِ روما اپنے پُورے عروج پر تھی۔ پورا شمالی افریقہ، ہسپانیہ، فرانس، انگلستان، جنوبی جرمنی، بلقان، رومانیہ، ایشیائے کوچک، عراق، شام، فلسطین۔ اس عظیم الشان سلطنت کے درمیان بحیرۂ رُوم ایک جھیل معلوم ہوتا تھا۔ تیسرے نقشے میں مسولینی کی تیسری سلطنتِ روما تھی۔ اطالیہ، سسلی، طرابلس، شمالی لینڈ، اطالوی افریقہ۔ اور حبش۔

"یہ ہے ہماری تیسری مقدّس سلطنتِ روما"۔ پروفیسر نے اشارہ کیا اور آگے بڑھ گیا۔ دائیں طرف قدیم رومی سلطنت کے شہنشاہوں کے قصور و محلات کے ویرانے ہی ویرانے تھے۔ ٹوٹی ہوئی دیواریں۔ فصیلیں، مجسّمے، دروازوں کی دروں کی قطاریں۔ ایسی دیواریں جن کی چھتیں غائب تھیں۔ کہیں کہیں پتھروں کے ڈھیر، معلوم ہوتا تھا کہ کسی شریر لڑکے نے کھلونے بکھیر دیے ہیں۔ کسی زلزلے نے ان پتھر کی یادگاروں کو قبرستان بنا ڈالا ہے۔ فورم رومانم میں انھیں پتھروں، ستونوں، دروں کے سوا کچھ نہ تھا۔ دائیں طرف اور پیچھے پیلیٹن کی پہاڑی تھی اور قدیم رومی مکانات کی چار منزلیں، ٹوٹی ہوئی منزلیں، نیچے دیوداسیوں کی منزل۔ اُس سے اُوپر کی منزل کے کنارے اب ایک روش سی بن گئی تھی اور "نیا راستہ" کہلاتی تھی۔ سب سے اوپر کی منزل میں کالی گولا کا قصر تھا اور خار نیرو کے باغات۔ سبزی، درخت اور روشوں ہی سے آثارِ صنادید کو عام انسان کی نظر برداشت کر لیتی ہے۔ اسی لیے تو قبروں پر پھولوں کے درخت لگائے جاتے ہیں۔ اسی لیے محکمۂ آثارِ قدیمہ باغبانی کا خاص طور پر اہتمام کرتا ہے۔

"وہ کالی گولا کا قصر ہے۔ ٹائبریس کا جانشین، مورخ شہنشاہ کلاڈیس کا پیشرو۔ اس کے قصر میں ایک نگار خانہ تھا۔" پروفیسر نے کہا۔ "رنڈی خانہ کہہ لو... ... وہاں کبھی کبھی شہنشاہ کی بہنیں بیٹھا کرتی تھیں۔ شہنشاہ کا چچا ایسے جلسوں کا مہتمم خاص ہوتا اور شہنشاہ اُن کا سرپرست۔ یہاں تک کہ عوام نے، جنھوں نے اُسے تخت پر بٹھایا تھا۔ اُس کا شمار دیوتاؤں میں کیا تھا اُسے تہ تیغ کیا۔ اُس کے مجسّمے توڑے۔ اب انقلابوں میں وہ بات نہیں

رہی۔ ہمارے دوچے کے انقلاب کو دیکھو" پروفیسر نے آواز دھیمی کر کے کہا" ہمارے دوچے نے رُوما کو کسی بڑی فوج کے سردار کی حیثیت سے فتح نہیں کیا۔ ریل کے ایک آرام دہ ڈبے میں وہ بڑے اسٹیشن پہنچا۔ بادشاہ نے اسے طلب کیا۔ بادشاہ نے اُسے وزیرِاعظم بنایا، اِل دُوچے بنایا۔ اب اُس نے بادشاہ کو حبش کا شہنشاہ بنا دیا ہے۔ رہ گئے عوام — نہ فاشسٹی انقلاب اُن کا تھا، نہ کوئی اور انقلاب اُن کا ہوگا۔"

سامنے قدیم رومی قیصروں کا بنایا ہوا ایمفی تھیٹر تھا جو کولے زیم کہلاتا تھا۔ نیرو نے یہاں ایک تالاب بنوایا تھا۔ قیصر وسپاسیئن نے اس تالاب کو سُکھا کے ایمفی تھیٹر بنوایا۔ متعدد قیصروں نے اس میں اضافے کیے۔ اس کی چار منزلیں ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ایک طرف کی اُوپر کی ڈیڑھ منزل پے در پے زلزلوں کی نذر ہوگئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے اس چہار منزلہ بلند مُدوّر عمارت کی ایک قاش تراش لی ہے۔ اس ایمفی تھیٹر میں تین درجے تھے — تین سماجی طبقوں کی مناسبت سے۔ جُملہ پچاس ہزار آدمی اس ایمفی تھیٹر میں تماشا دیکھ سکتے تھے۔ نیچے ارینہ میں وحشی درندے ایک دوسرے سے یا آدمیوں سے لڑتے۔ آدمی مختلف قسم کے اسلحہ سے مسلح ایک دوسرے کو مارتے اور قتل کرتے اور پچاس ہزار کا پورا مجمع کھڑا ہو کے تالیاں بجاتا۔ اکثر نہتّے مُجرم وحشی درندوں کے سامنے پھینک دیے جاتے اور جب درندے اُنھیں چیرتے تو شاید ہی کسی شہری کو غش آتا ہو۔ چھ مقدّس عیسائی بزرگ اسی ایمفی تھیٹر میں وحشی درندوں کا شکار ہوئے۔ جب کوئی قیصر رعایا کو خوش کرنا چاہتا تو ایمفی تھیٹر میں تماشے کراتا۔ رومتہ الکبریٰ کی بنیاد کی ہزار سالہ یادگار کے موقع پر قیصر فلپ نے سو دن تک یہ تماشے کرائے، سو دن تک جانور آدمی کا، آدمی جانوروں کا، جانور، جانوروں کا، اور آدمی آدمیوں کا شکار کرتے رہے۔

کچھ دُور آگے بڑھ کے وِیا لابی کانا میں پروفیسر کاوِل کانتی کا مکان تھا۔ اگلے روز عقیل کو کھانے پر مدعو کر کے وہ تو اپنے گھر کی طرف چل دیے اور عقیل اپنے پانسیون جانے کے ارادے سے وِیا کے دور کی طرف پلٹا۔

راستے میں کلیسائے سان پیترو ان وِنکولی، میں میکیل آنجلو کا بنایا ہوا حضرتِ

موسیٰ کا مجسمہ دیکھنے ٹھہر گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس مجسّمے کا شکوہ، اس کا جلال ہی دیکھنے والے کو ختم کردے گا۔ داڑھی کے مرمریں بال کئی سانپوں کی طرح بَل کھاتے ہوئے ناف تک پہنچتے تھے۔ آنکھوں میں پیغمبرانہ جلال تھا۔ میکیل آنجلو کے تمام مجسموں کی طرح اعصاب میں مردانہ حُسن تھا، سَر کے بال اُلجھے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا ہزاروں سال پہلے کی عبرانی شاعری نے سنگین لباس پہن لیا ہے۔ یہ مجسّمہ تھا یا عبرانیت مجسّم تھی۔ عقیل کو محسوس ہوا کہ اس ایک مجسّمے کو دیکھ کر توریت سمجھ میں آتی ہے۔ یہودی دوستوں کی خودداری اور اُن کا ذہنی پس منظر سمجھ میں آتا ہے۔

کلیسا سے باہر نِکلا تو وہ بہت تھک چکا تھا۔ اس کا پانسیون شہر کے تقریباً دوسرے سِرے پر دیا پور پر تھا۔ لیکن پورا ویا کے دوُر خالی پڑا تھا۔ دُور دُور کسی سواری کا نام نہ تھا۔ اُس نے سوچا کہ استاتسیو نے ترمی نی (ٹرمی نس اسٹیشن) تک چلے چلو، وہاں کوئی گاڑی مل ہی جائے گی۔ راستے بھر خلا سی تھی، لیکن جب وہ اسٹیشن کے سامنے پہنچا تو دیکھا کہ اسٹیشن کے سامنے کا بڑا چوراہا، اور قریب کے سب راستے فوجوں، سیاہ پوشوں کے مجمع سے بھرے ہوئے ہیں اور خلقت مکانوں کی کھڑکیوں، چھجّوں سے اُبلی پڑتی ہے۔ سب دوکانیں لوگوں سے بھری ہیں اور سڑکوں کا جو حصّہ فوجوں اور وردی پوشوں سے خالی ہے اُس میں مجمع ہی مجمع ہے۔

اُسے معلوم نہیں تھا کہ مسولینی کی ٹرین کب روما پہنچے گی۔ نہ اُس نے معلوم کرنے کی کوشش کی۔ اسٹیشن کے سامنے ہی ویادے ترمے میں ایک چھوٹا سا ریستوران تھا۔ جہاں وہ اکثر کافی یا کوئی سرد چیز یا کبھی کبھی کیانتی کا ایک آدھ گلاس پیا کرتا تھا۔ اس ریستوران میں وہ داخل ہوا تو ویٹر نے اُسے پہلی منزل پر کھڑکی کے قریب ایک میز پر لا بٹھایا۔

"یہاں سے سینیورے اچھی طرح دیکھ سکیں گے۔"

"کیا؟" عقیل نے اُس کی طرف ذرا تعجّب سے دیکھ کے پوچھا۔

"دوچے کو۔ اب وہ آیا ہی چاہتا ہے۔ سینیورے بہت خوش قسمت ہیں کہ اُنھیں ایسی اچھی جگہ مِل گئی۔ یہ جگہ ایک سینیورا نے محفوظ کرائی تھی۔ مگر وہ پھر اُٹھ کے کہیں چلی گئی۔ کیا لاؤں سینیورے؟ کوئی کاک ٹیل؟"

"نہیں گرمی بہت ہے۔ صرف کیانتی"۔

"سی سینیورے"۔ اور ویٹر دوسرے میز پر احکامات حاصل کرنے چل دیا۔

مائیکرو فون برابر اعلان کر رہا تھا۔ اب دُوچے کی گاڑی آئی۔ اب آئی۔ اب آئی۔ آخر آہی گئی۔ فوجوں نے سلامی دی۔ بینڈ بجے۔ فوجی دستے ویا نا تسیونالے کی طرف بڑھے۔ جہاں سڑک پر کاغذ کی ایک بڑی کمان کھڑی تھی۔ جس کی شکل M کی سی تھی۔ مجمع کا شور بڑھتا گیا۔ بڑھتا گیا۔ رومتہ الکبریٰ میں قیصر واپس آ رہا تھا۔ میدانِ جنگ کی فتح نہ سہی۔ سیاسی امورِ خارجہ کی فتح کے بعد۔ مجمع کا جوش و خروش بڑھتا جا رہا تھا۔ "دوچے زندہ باد۔ دُوچے زندہ باد، مسولینی زندہ باد"۔ مجمع کو بھلا کیا معلوم تھا کہ یہ سیاسی فتح اطالیہ کی پہلی سیاسی شکست تھی۔ دُوچے ہٹلر کو آسٹریا کا مالک بنا آیا تھا۔ جرمن فوجیں چند ہی مہینوں میں برنیر کے درّے پر آموجود ہوں گی اور اطالوی فاشسٹ، جرمن نانسی کا دوست، کمتر حلیف بنے گا۔ چاکر بنے گا، غلام بنے گا۔ اُس مجمع کو یہ سب معلوم نہیں تھا۔

بالآخر عقیل نے اسے دیکھا۔ رومتہ الکبریٰ کے اس نئے قیصر کو۔ موٹر بہت آہستہ آہستہ گذر رہی تھی۔ اُس نے رومتہ الکبریٰ کے قیصر کے اِس بُل ڈاگ جیسے چہرے کو دیکھا۔ اور خود بخود یہ سوچ کے مسکرانے لگا کہ یہ بُل ڈاگ ایڈاچیانو جیسی حسین عورت کا باپ کیونکر ہو سکتا ہے۔ اُسے دل میں یہ محسوس کر کے بڑا اطمینان ہوا کہ اس آمر کو اس شان و شوکت سے شہر میں داخل ہوتے دیکھ کر رومتہ الکبریٰ میں اس قیصر کے خیر مقدم کی شان کو دیکھ کر وہ ایک لمحہ کے لیے بھی مرعوب نہیں ہوا۔ بہت دنوں سے اُس نے خدا کا شکر نہیں ادا کیا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے بھی جاہ و جلال کے اس منظر سے اُس کی خودی کمزور نہ ہو سکی۔ وہ اشتراکیوں کا ہمدرد، اس بھیڑیے سے مرعوب نہ ہوا۔ اُس سے وہ غلطی سرزد نہ ہوئی جو مشرق کے سب سے بڑے شاعر سے کمزوری کے لمحے میں سرزد ہوئی تھی۔

فوج، بینڈ، سیاہ پوش فاشسٹوں کے پرے سب بہت جلد قیصر کے ساتھ ہی

نظروں سے غائب ہو گئے۔ باجوں کی آواز بند ہو گئی۔ مجمع ابھی تک باقی تھا۔ اب مجمع میں حرکت پیدا ہوئی۔ دو طرح کی حرکت۔ ایک حصّہ تو اپنے اپنے گھروں کو چل دیا اور دُوسرا وہیں سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے لگا۔ بالکل ایشیائیوں یا کتوں کی طرح۔ اِدھر سے اُدھر، سڑک کے اس سرے سے اُس سرے تک، اس طرف سے اُس طرف تک، اس سڑک سے اُس سڑک کو جانے کا کوئی مطلب نہیں۔ آہستہ آہستہ اُٹھتے ہوئے قدم۔ بیکار حرکت، بے معنی حرکت، سینکڑوں جسم جو بے مطلب گھوم رہے ہیں جیسے برسات کے کیڑے۔ جن کا وجود محض قدرت کے ذوقِ تکرار کا رہینِ منّت ہے۔

عقیل بھی تھوڑی دیر کے لیے اسی بیکار ہجوم میں شامل ہو گیا۔ یہ ہجوم جو اکثر اطالوی شہروں اور تمام ایشیائی ملکوں میں ملتا ہے کہ اس ملک میں آبادی زیادہ اور کام کم ہے۔ خاندانوں کے خاندان تھے۔ ایک ایک دو دو کی ٹولیاں تھیں۔ عورتیں کم تھیں مگر اب شام کے دُھندلکے میں ان کے بالوں اور آنکھوں کی سیاہی غضب ڈھاتی معلوم ہوتی تھی اور اس مجمع میں جو بیک وقت جامد بھی تھا اور سیّال بھی، بہتے بہتے عقیل ایک پھُولوں کی دکان پر جا نکلا۔

دوکان کیا تھی۔ لکڑی کا ایک ڈربہ سا تھا۔ سڑک کے کنارے اور پیدل چلنے کی روش پر ایک بُڑھیا شال جیسی چادر اوڑھے ہوئے بیٹھی ہوئی پھُول بیچ رہی تھی۔ اُس کے قریب ایک لڑکی کھڑی تھی۔ سایہ میلا اور پھٹا ہوا۔ لڑکی کی عمر کوئی پندرہ سال کی ہوگی۔ ایک متوسط قد، دبیز جسم کا اطالوی، نیچے کا ہونٹ پھیلا ہوا، سر پر ٹوپی تنی ہوئی۔ اس لڑکی کے متعلق بات چیت کر رہا تھا۔ عقیل اُن کی گفتگو سُننے لگا۔ یہ شخص کسی چھوٹے سے ریستوران کا، کسی ایسے ریستوران کا جو گلی در گلی، کسی متعفن جگہ ہوگا، مالک تھا، اس لڑکی کو وہ نوکر رکھنا چاہتا تھا۔ بار بار اُس کی آنکھوں میں شہوانی چمک پیدا ہوتی اور وہ اُس لڑکی کے پھٹے ہوئے سائے میں اُس کا ایک آدھ انچ شفاف، سفید، عریاں جسم دیکھتا اور پھر بڑھیا سے مخاطب ہو جاتا۔ بالآخر پچاس لیرے ماہوار پر بڑھیا رضا مند ہو گئی۔ لڑکی کی محنت بک گئی اور محنت کے ساتھ سب کچھ بِک جاتا ہے۔ جسم، گوشت پوست ——— اور بالآخر رُوح۔

رات تاریک ہوتی جارہی تھی۔ عقیل نے اپنے پانسیون (قیام گاہ) کا رُخ کیا۔ ڈایو کلیشن کے حمام کو دیکھ کر اُسے اُس نامور شہنشاہ کے واقعات یاد آئے۔ جس نے روما الکبریٰ کی عظمت کو پھر سے بحال کیا۔ جس نے شہنشاہی میں اور تین آدمیوں کو اپنا شریک بنایا۔ آخر میں اپنی خوشی اور خواہش سے تخت و تاج سے دست بردار ہو کے اڈریاٹک کے ساحل پر باغبانی کرنے لگا۔ جب اُس کے ایک شریک نے پھر سے اُسے قرمزی لبادہ شہنشاہی کی دعوت دی تو اُس نے کہا۔ اگر تم میرے باغ کی ترکاریاں دیکھو گے جو میں نے اپنے ہاتھ سے اُگائی ہیں تو تمھیں معلوم ہوگا کہ میں دوبارہ شہنشاہ بننا کیوں نہیں چاہتا اور اس عجیب وغریب شہنشاہ نے جو اپنے قرمزی لبادے کو تج چکا تھا۔ اپنے بڑھاپے میں، اپنے جانشینوں اور دوستوں کے ہاتھوں اپنی بیوی اور بیٹی کو ذلیل، تباہ اور قتل ہوتے دیکھا۔ اور کچھ کر نہ سکا۔

راستہ بھر روما الکبریٰ کے انحطاط کے مناظر عقیل کے سامنے آتے رہے۔ اہم تاریخی واقعات نہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتیں۔ لیکن ایسی باتیں جن سے اس تمدّن کی گہری انسانی یا شیطانی خصوصیات واضح ہوتی تھیں۔ جیسے نارسین کی بہو بیٹیوں کی اسیری کے وقت شہنشاہ گے لی ریس کا شریفانہ سلوک۔ جیسے زنا اور زنا بالجبر کے متعلق قسطنطین اعظم کے سخت امتناعی احکامات۔ سلطنتِ روما کا ابتلائے عظیم۔ شکست خوردہ وزی گاتھ جو ایک دن اس سلطنت کے بڑے حصّوں کے مالک بننے والے تھے۔ شہنشاہ ویلینس کے زمانے میں تاریخی ضرورتوں سے کچھ ایسے مجبور ہو گئے تھے کہ اپنی بیویاں اور بیٹیاں، رُومیوں کی نذر کردیں۔ اس طرح اپنے ہتھیار بچالیے۔ وہ ہتھیار جس کی مدد سے انھوں نے اور دوسرے وحشی قبائل نے چند سو سال کے اندر اس سلطنت کو تہس نہس کر دیا۔ یا کلاڈین کا وہ مشہور و معروف قصیدہ جو شہنشاہ آنوریس کی شادی کے موقع پر پڑھا گیا۔ شہنشاہ کی ملکہ یعنی اُس کی خالہ زاد بہن ماریا کو اپنے شوہر کے عشق کی نہ اُمید تھی نہ خوف۔ کیوں کہ شہنشاہ کی عمر شادی کے وقت صرف چودہ سال کی تھی۔ شادی کے دس سال بعد ملکہ ماریا نے وفات پائی۔ لیکن وفات کے وقت بھی وہ کنواری ہی تھی کیونکہ شہنشاہ شوہر کی طبیعت شاید بہت سرد، یا اُس کا جسم۔ ...

بالآخر شمالی وحشیوں کا سیلاب جو سلطنت کو آہستہ آہستہ چبا رہا تھا۔ رومۃ الکبریٰ کی طرف بڑھا۔ الیبرک گاتھ نے شہنشاہی فوجوں کے ساتھ تربیت حاصل کی تھی۔ اُسی نے اس شہر کو، سلطنت کی ملکہ، دُنیا کے دارالخلافے کو فتح کیا۔ رومۃ الکبریٰ اپنی تعمیر کے گیارہ سو ترسٹھویں سال میں فاتح سے مفتوح، حاکم سے محکوم، ظالم سے مظلوم بنا۔ اُس کے بعد سے پھر کبھی اُسے وہ مرتبہ حاصل نہ ہوا۔ پھر فاتح آتے ہی گئے۔ اس کی دیواریں گراتے ہی رہے۔ اُس کی دولت لُوٹتے ہی رہے، اس کے سپاہیوں اور شہریوں کو قتل کرتے رہے۔ اس کی کنواریوں کی عصمت لُوٹتے رہے ......

اِتنے میں عقیل اُس فصیل کے پاس پہنچا جواب بھی قرونِ وسطیٰ کے روما کی سرحدیں بناتی ہے۔ اس فصیل کو دیکھ کے اُسے یاد آیا۔ کس شہر میں ہزاروں کنواریوں کی عصمت نہیں لٹی، کس کی فصیلیں نہیں ٹوٹیں۔ روما، قسطنطنیہ، دہلی اور اقبال کا یہ مصرعہ بے اختیار اس کی زبان پر آگیا۔

سوادِ رومۃ الکبریٰ میں دلّی یاد آتی ہے

پانسیون (قیام گاہ) کا انتظام، اور اس کی ملکیت دو ضعیف العُمر بہنوں کے ہاتھ میں تھی۔ رات کے کھانے پر ان میں سے بڑی نے اُسے کریم کا سوپ کھانے سے روکا۔ تم صرف بیس لیرے روزانہ دیتے ہو اور کریم کا سوپ مہنگا ہے۔ دوسری بوڑھی بہن نے پہلی کی طرف ذرا ملامت کی نظروں سے دیکھا۔" لیکن ہمارے مہمان کی حیثیت سے تم یہ کھاؤ۔ تم بہت دُور دراز ملک کے رہنے والے ہو۔"

عقیل نے مُسکرا کے کہا۔" کریم کے سوپ کی قیمت میرے بل میں بڑھا دیجئے گا۔"

میز پر اُس کے ساتھ جرمنی کے پناہ گزین یہودیوں کا ایک جوڑا تھا اور دو چار اطالوی طالب علم تھے۔

اُس نے مسولینی کی سواری کا حال بیان کیا۔ قیصر کی آمد آمد اور اُس کے استقبال کا حال اور اُس نے ان اطالوی طالب علموں کو دیکھا۔ آئندہ جنگ ہوئی تو یہ بھلا کیا لڑیں گے۔

قدیم روما کا زمانہ گذر ہی گیا۔ وہ قوم ہی دوسری تھی، نسل ہی دوسری تھی۔ اب حبش پر زہر برسانا دوسری بات ہے اور بڑی حکومتوں سے لڑنا اور چیز۔

اتنے میں بڑھیا نے کہا۔ "تین آدمی گذرے ہیں۔ مذہب، موسیقی اور سیاست میں تین آدمی گذرے ہیں۔"

دوسری بڑھیا نے اپنے سر کے سفید گھنے بال ہلاتے ہوئے کہا: "ہاں، تین آدمی۔"

پہلی بڑھیا نے تشریح کی۔ "مذہب میں یسوع مسیح، موسیقی میں بیت ہوون اور سیاست میں مسولینی۔"

مسولینی کا نام یسوع کے مقدس نام اور بیت ہوون کے نام کے ساتھ سُن کر جرمن یہودی جوڑا، آپس میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور جلدی جلدی سوپ پینے لگا۔

دوسری بڑھیا نے عقیل سے پوچھا۔ "تم ایشیائی ہو، تمھاری کیا رائے ہے؟"

"میں کیا رائے دے سکتا ہوں۔ میں اطالیہ میں بہت تھوڑے دن رہا ہوں ..."

ایک اطالوی طالب علم ادالفو نے کہا۔ "شاید ان کے خیال میں گاندھی سب سے بڑا آدمی ہے۔"؛

پہلی بڑھیا نے جلدی سے اُس کا جواب دیا۔ "نہیں ...... نہیں ...... کوئی ہمارے دُوچے کے برابر نہیں۔ مسولینی صرف ایک ہے۔ کوئی اُس جیسا نہیں۔ بس وہی ایک ہے۔"

"لیکن بادشاہ بہت سے ہیں۔" دوسری بڑھیا نے موجودہ شاہ وکٹوریو امانوئیل کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ـــــ چھوٹی سی تصویر جو مسولینی کی بڑی تصویر کے نیچے لگی ہوئی تھی۔

کھانے کے بعد پھر اُس کا جی گھبرایا۔ بس میں بیٹھ کے وہ پھر ریونا تسیونالے واپس پہنچا۔ یہ روما کی سب سے مشہور اور پُرانی سڑک ہے اور اسٹیشن کے قریب پیاتساوے

نت سیاتک جاتی ہے۔ کافے گراند اتالی سے موسیقی کی آواز آئی اور وہ وہیں ایک میز پر جابیٹھا۔ قریب ہی ایک میز پر چار پانچ سیاہ بالوں والے اطالوی ایک سنہرے بالوں والی، نیلی آنکھوں والی عورت کو پھانسنے کی کوشش کر رہے تھے جو اُن سے سویدستانی لہجے میں جرمن میں باتیں کر رہی تھی۔ کافے میں عورتوں کا آرکسٹرا جدید ترین امریکی گیت بجا رہا تھا۔ یہ اُس مُلک میں جس نے وردی، مسکانی، روزینی کو جنم دیا۔ ایک لڑکی امریکی سُروں میں، لیکن اطالوی زبان میں مائیکروفون کے پاس گا رہی تھی۔

بارہ بجے، چھ سات سال کی ایک چھوٹی سی لڑکی نے پیانو پر اطالوی قومی نغمے کا ساز بجایا اور تمام حاضرین اُٹھ کے کھڑے ہو گئے۔

رومۃ الکبریٰ کے عظیم الشان عجائب خانوں میں تمام مجسمے خاموش تھے۔ تعظیماً نہیں۔ حیرت وحسرت سے کہ مستقبل اُن کے بس کا نہیں تھا۔ کاپے لے سِس تی نے میں میکیل آنجلو کا بنایا ہوا خدا، آدم کو اپنی انگشتِ مقدس سے جنم دے رہا تھا۔ سانپ درخت سے لپٹا ہوا تھا اور حوّا جنّت سے نکالی جا رہی تھی۔ قصرِ وے تی کانو میں بورجیا کا کمرہ زہر سے بسا ہوا تھا۔ رفائیلو کے کمروں میں اُس کے ہاتھ کے بنائے ہوئے انسانی جسم قدرت سے کہہ رہے تھے۔ دیکھ انسانی حُسن اس کو کہتے ہیں۔" کاپے لے سِس تی نے" میں میکیل آنجلو کا عظیم الشان "آخری فیصلہ" انسانی عضلات سے تخیّل کو مرعوب کر رہا تھا اور چھت پر درزیں آ گئی تھیں۔ دیواروں کی زندگی تصویروں سے کم ہوتی ہے۔

اور سب مجسمے خاموش تھے "نیل" جس سے بیسیوں بچے لپٹے ہوئے تھے اور ان سب سے بڑا "اپالو بل دے دے رے" سُورج کا دیوتا، انسان کا سورج، دیوتاؤں کا سُورج اور "لاکون"۔ ہزاروں نقلیں دیکھ ڈالیے، مگر اصل میں ایک ایسی بات نظر آتی ہے جس کی نقل ناممکن ہے۔ اس عذاب کا حُسن۔ حُسنِ عذاب۔ عقیل محسوس کرنے لگا کہ لاکون کے چہرے کا جو انداز ہے۔ وہ ایک ایسے عذاب کا اثر ہے جو سر جھکا کے قبول کر دیا گیا۔ اور اُسے وہ مجمع یاد آ گیا جو اسٹیشن کے سامنے اپنے قیصر کے استقبال کے لیے اکٹھا ہوا تھا اور پھر اس سڑک

ے اس سڑک پر اِدھر سے اُدھر، بے مطلب بے معنی آوارہ گردی کرنے لگا۔ کیا لیننگ کو اپنے نظریے کی ادا کے لیے کوئی اور مثال نہ مل سکتی تھی؟

پھر ایک سال گذرا، دو سال گذرے، جہنم میں آگ بھڑکتی ہی رہی، اور جوُن، اس صدی کے سب سے منحوس مہینے جوُن ۱۹۴۰ء میں وہ سلطنت جس نے یورپ کو سب سے پہلے آزادی اور انقلاب کا سبق دیا۔ لوہے اور آگ کے کھلونوں سے جل کر راکھ ہوگئی۔

اور تب اُس قیصر نے، جسے عقیل نے ۳۰ر ستمبر ۱۹۳۲ء کو رومتہ الکبریٰ میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ اس خاکستر سے بھرے کھنڈر پر یورش کی۔ پھر پیاتسا دے نت سیاسے ریڈیو فون گونجے، اطلاع ملی کہ قیصر نے کوچ کیا ہے اور اپنے پیچھے سارے پُل جلا دیے ہیں۔

پُل تو جل گئے، لیکن کوچ کی رفتار بہت سُست رہی۔ اُس کے بعد کا قصّہ تو آپ سب کو معلوم ہے۔ حبش مرا نہیں تھا، جی اُٹھا۔ طرابلس پہلے جرمن صوبہ بنا، پھر جرمنوں کے ہاتھ سے بھی نکل گیا۔

پھر صقلیہ کی بھی باری آئی۔ قرطاجنہ کی طرف سے فوجیں بڑھیں۔ اب رومتہ الکبریٰ میں کوئی سیپونہ بچا تھا۔

پُل تو جل ہی چکے تھے۔ پسپائی ہوئی تو ساری فاشسٹی، سیاہ پوش فوج غائب! کچھ ٹائبر میں ڈوب گئی، کچھ آرنو میں ڈوبی۔ کچھ پو میں ڈوبے گی۔ چیانو کو گولی مار دی گئی، اور مسولینی کی خوبصورت لڑکی، ایڈا، بیوہ اور اپنے باپ اور زمانے کی ستائی ہوئی معلوم نہیں کہاں پناہ گزین ہے۔ اب اُس کی تصویریں مصوّر ہفتہ وار رسالوں کے اوّلین صفحوں پر بہت کم نظر آتی ہیں اور عقیل اب بھی سوچتا ہے کہ وہ بُل ڈاگ کی لڑکی ایسی خوبصورت کیوں ہے۔

جوُن کا مہینہ پھر آیا۔ جوُن ۱۹۴۴ء۔ رومتہ الکبریٰ، اُس عارضی جرمن صوبے کا دارالخلافہ جسے اطالیہ کہتے تھے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پیاتسا وے نت سیاسے بلند ہونے والی اُس آواز سے محروم ہو چکا ہے، جس نے کوچ سے پہلے پُل جلا دیے تھے۔ جو کہتی تھی کہ امن کی بنیاد بعض قوموں کی بلندی، بعض کی پستی، بعض کی حاکمی اور

بعض کی محکومی پر ہے۔

"اب کس کی حاکمی اور کس کی محکومی پر؟" جرمن قبضے کے زمانے میں فاشسسٹ ایک دوسرے سے پوچھتے ہوں گے۔

ممکن ہے اس خاک سے ایک نیا رومۃ الکبریٰ پیدا ہو، ایک نیا تمدن پیدا ہو۔ جس میں بلندی اور پستی کے بجائے تمام انسانوں کی برابری کا تخیل پرورش پائے کیونکہ رومۃ الکبریٰ لازوال ہے، لافانی ہے ..... قسطنطنیہ کی طرح، بغداد کی طرح، دہلی کی طرح، پیکن کی طرح۔

○○

کوکب

"اجی پنجاب کی سیاسیات کے متعلق تو مرزا غالب پہلے ہی لکھ گئے ہیں۔ کیا کیا خضر نے سکندر سے، اب کسے رہنما کرے کوئی۔ یہی کہ خضر نے سکندر کی بنائی ہوئی پارٹی کے ساتھ کیا کیا..... چلئے چائے پی لیجئے، چھوڑیئے اس قصے کو۔"

چھت پر چوہوں نے بھاگ دوڑ مچا رکھی تھی۔ کشمیری چھتوں میں جو خلا ہوتا ہے اس میں چوہے جاڑوں بھر آرام کرتے ہیں، اور بہار آتے ہی کود پھاند شروع کر دیتے ہیں۔ یہ مکان ذرا پرانا تھا، مگر "کوٹھی" کی وضع کا تھا، اور اس کی سیاہ دیواروں پر چنار نما بیل کے پنجے چھت تک لپٹے ہوئے تھے۔

ڈرائنگ روم میں عبید صاحب کبھی صوفوں پر نہیں بیٹھتے تھے۔ ایک کونے میں ان کی خاص آرام کرسی پڑی ہوئی تھی، جس پر ایک موٹا پل اور، اس پر سے ایک موٹا وزنی اونی کوٹ پہنے ہوئے وہ بیٹھے مابعدالطبیعات کی کتابیں پڑھتے رہتے۔ ایک جلد کے بعد دوسری جلد، ایک مصنف کے بعد دوسرا مصنف، اور ملنے والوں کو اکثر اقبال کا یہ شعر اپنا حسب حال بتا کے سناتے۔

بلند بال تھا لیکن نہ تھا جسور و غیور
حکیم سر محبت سے بے نصیب رہا

لیکن مابعدالطبیعات کا چسکہ کسی طرح نہ چھوٹتا۔ ان کے ڈرائنگ روم کا نقشہ بھی ذرا عجیب تھا۔ ایک اونی دری بچھی تھی۔ آتش دان کے اوپر خاندان والوں کی تصویریں آویزاں تھیں۔ ایک صوفہ دیوار سے ملحق تھا۔ اس سے دور کچھ بے جوڑ سی گہری گدے دار کرسیاں ذرا ذرا فاصلے پر رکھی تھیں۔ بیچ میں کیرم کا تختہ تھا اور ایک اسٹول پر ریڈیو رکھا تھا جس پر کشمیر کے اردو اخباروں خصوصاً "ہمدرد" کا انبار تھا۔

میں عبید صاحب کے ساتھ ساتھ ان کے کھانے کے کمرے میں پہنچا۔ ایک گول سے میز پر سفید کپڑا بچھا تھا۔ بیگم عبید اور ان کی لڑکی عائشہ بیٹھی تھیں۔

عبید صاحب کے یہاں کی چائے ہمیشہ "شاندار ہوتی ہے۔" دو تین طرح کی پنیر' بسکٹ' نان خطائیاں' باقر خانیاں۔ بیگم عبید اونی ٹی کوزی ہٹا کے میرے لئے چائے انڈیل رہی تھیں کہ ایک اور لڑکی جس کو میں نے اس سے پہلے کبھی ان کے یہاں نہیں دیکھا تھا۔ ہاتھ میں ایک پلیٹ میں تلے ہوئے آلو لے کر آئی اور "سلام علیکم" کہہ کے اس نے پلیٹ میز پر رکھ دی۔ خود عائشہ اور بیگم عبید کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ عبید صاحب نے مختصر طور پر کہا "میری بھتیجی۔"

میں نے غیر ارادی طور پر ان دونوں لڑکیوں کا جائزہ لیا۔ عبید صاحب کی لڑکی کو میں اس وقت سے دیکھتا رہا ہوں جب وہ گھٹنوں کے بل رینگتی تھی۔ اب ماشاء اللہ بڑی ہو گئی ہے۔ اب بھی بڑی شرمیلی ہے' مگر ہنستی اور مسکراتی اکثر ہے' بات کم کرتی ہے۔ اس کے چہرے پر ایک طرح کی غنچوں جیسی تازگی اور کھلکھلاہٹ ہے۔ اور رنگ بہت صاف ہے۔ ذرا نازک نازک سی ہے۔ وہ چھاپے دار "ریشم" کا سوٹ پہنے اور اس پر سے سفید قیمتی رنگ شال اوڑھے بیٹھی تھی۔ اس کے برعکس یہ دوسری لڑکی چھینٹ کا قمیض' سفید شلوار اور معمولی سا دوپٹہ اوڑھے سر جھکائے بیچ میں بیٹھی تھی۔ ایک منٹ کیلئے اس نے میری کنپٹی اور سر کے نیم سفید بالوں کی طرف دیکھا' اور پھر اپنی چائے کی پیالی میں محو ہو گئی۔

بیگم عبید نے کہا "کوکب' یہ پنیر ادھر حنیف صاحب کی طرف بڑھا دو' حنیف

صاحب آپ تو کچھ بھی نہیں کھا رہے ہیں۔"

اب مجھے معلوم ہوا کہ عبید صاحب کی اس "میری بھتیجی" کا نام کوکب تھا۔

عائشہ نے مجھ سے کہا "حنیف چچا' یہ لیجئے۔ یہ امرت سر کی باقرخانیاں ہیں۔ یوں نہیں' یہ تو چائے میں بھگو کے کھانے کی ہیں۔"

میں نے اور کچھ کھانے سے انکار کیا۔ گلمرگ کا پانی مجھے کبھی راس نہیں آتا۔ اور اس مرتبہ شروع بہار کی سردی بھی راس نہیں آتی تھی۔ اور گلمرگ سے ننگ مرگ تک جو ٹٹو ملا تھا وہ ایسا شریر تھا کہ دو مرتبہ تو میں گرتے گرتے بچا۔ اگر عبید صاحب زبردستی مجھے اپنے ساتھ کھینچ نہ لاتے تو میں تو سیدھا اپنے ہوٹل جاتا۔

میرے انکار پر عبید صاحب نے کہا "اجی ان بنگالیوں کو باقرخانیوں کی کیا قدر۔ یہ تو مچھلی اور بھات کھانے والے ہیں۔ کسی دن ٹراوٹ مچھلی پکا کے ان کی دعوت کرو۔"

بیگم عبید نے کہا "وہاں ٹیڈوز میں کھانا تو بڑا بدمزہ ملتا ہو گا۔"

"کچھ نہ پوچھئے" میں نے کہا۔ اور جب انہوں نے کہا "اور چائے لیجئے گا" تو میں نے اپنی چائے کی پیالی عائشہ کی طرف بڑھا دی۔

چائے پی چکنے کے بعد میں تو عبید صاحب کے ساتھ ان کے ڈرائنگ روم میں آ بیٹھا۔ اور عبید صاحب---- جیسا کہ ان کی عادت ہے----- سگریٹ کیس میری طرف بڑھائے بغیر خود ہی ایک قینچی چھاپ نکال کے پینے لگے۔ بیگم عبید صوفے پر جا بیٹھیں۔

"ہاں...." انہوں نے ہنس کے کہا۔ "جاوید نامے میں غالب' قرۃالعین طاہرہ' حلاج اور ابلیس کا عجیب جوڑ ہے۔ اور قرۃالعین طاہرہ کی وہ غزل۔ مجھے اگر کسی چیز سے نفرت ہے تو الفاظ کی جھنکار سے 'اب آپ ہی بتایئے۔ صفحہ بہ صفحہ 'لا بہ لا' پردہ بہ پردہ' تو بہ تو۔ بس یہ الا بلا ہی ہے۔ آپ نے خالی بوتل کا قصہ نہیں سنا۔ مجھ سے ایک صاحب نے پوچھا کہ آپ نے خالی بوتل کا قصہ نہیں سنا میں نے کہا "نہیں" انہوں نے کہا "اچھا ہی ہوا اس میں کچھ بھی نہیں۔ بس یہ بھی خالی بوتل ہے۔"

میں نے کہا "لیکن غالب کی وہ قاعدہ آسمان بگردانیم والی غزل بڑی زور دار ہے' اس میں بڑا جوش و خروش...."

"نہیں جی وہ تو غالب نے بڑی عیاشی کے کیف میں لکھی ہے' اس کے اصلی مزے مزے کے شعر تو اقبال گول ہی کر گئے- ہاں وہ کیا شعر ہے..... پہلا مصرعہ یاد نہیں- دوسرا یہ ہے: گہے بوسہ زباں در وہاں بگردانیم-" مسکرا کے عبید صاحب نے اپنی بیگم کی طرف دیکھا جو اس گفتگو سے بے خبر دونوں لڑکیوں کی طرف دیکھ رہی تھیں' جو کھڑکی کے نیچے کھڑی کہیں باہر جانے کی اجازت مانگ رہی تھیں- "مگر سات بجے تک آ جانا-" اور بیگم عبید نے عبید صاحب سے کہا: "لڑکیاں شجاع کے یہاں جا رہی ہیں-" اور پھر سویٹر بننے میں محو ہو گئیں-

عبید صاحب ان کی طرف خیال کئے بغیر اس غزل کے دوسرے شعر یاد کرنے کی، کوشش کرنے لگے- میں نے ان دونوں لڑکیوں کوکب اور عائشہ کو آہستہ سے باہر کا پھاٹک کھول کے بند کرتے دیکھا- عائشہ کا ملائم' ملیح' سفید چہرہ اور کوکب کا اس سے ذرا زیادہ سخت' لمبوترا سا چہرہ اور ہلکی نیلی سی آنکھیں اور پھر عبید صاحب کی طرف متوجہ ہو کے سوچنے لگا کہ جوں جوں عبید صاحب کی عمر میں اضافہ ہو رہا ہے ان کی صورت ڈاکٹر اقبال سے ملتی جاتی ہے-

عبید صاحب کہنے لگے "ہاں غالب نے کسی بوڑھی دلالہ کو بھی یاد کیا ہے' ایک شعر یہ بھی ہے-

ندیم و مطرب و ساقی ز انجمن دانیم
بکار و بار زنے کارواں بگردانیم

اور خلوت کا نقشہ تو بڑا ہی بے باک ہے' یہ کہہ کے انہوں نے اپنی بیگم صاحبہ کی طرف دیکھا- "سنا تم نے بیگم....؟" مگر وہ اسی تندہی سے سویٹر بننے میں مصروف تھیں-

"ہاں صاحب وہ وصل والا شعر بھی یاد آ گیا-"

نہیم شرم بیک سوی و باہم آویزیم
بشوخی کہ رخ اختراں بگردانیم"

بیگم عبید نے دفعتاً پلٹ کے مجھ سے پوچھا "وہ کب آئیں گی؟"

میں نے کہا "کلکتہ سے انجمن کا خط آیا تھا- وہ یہاں دو ایک ہفتے میں پہنچ جائیں

ئی- ذرا لڑکے کا امتحان ہو لے۔"

"قاسم اب کس کلاس میں ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

میں نے کہا "اس سال وہ میٹرک کا امتحان دے رہا ہے۔"

○

اس کے دو ہفتے بعد کا ذکر ہے۔ میں اور انجمن نیڈوز ہوٹل کے پیچھے والے بلاک میں، اپنے کمرے کے آگے کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ عبید صاحب نے قطعی وعدہ تو نہیں کیا تھا مگر کہا تھا کہ "اگر ہو سکا تو ہم آ جائیں گے۔"

عبید صاحب نے آتے ہی کہا "بنگالیوں کو ذوق سلیم چھو کر بھی نہیں نکلا ہے۔ اب دیکھئے نا مسٹر مسز حنیف یہاں ہوٹل میں پڑے سڑ رہے ہیں۔ ارے بھائی کشمیر آئے تھے تو نسیم باغ میں ڈیرے ڈال کے رہتے۔ کیوں یہ ڈیرے ڈالنے کی کیسی کہی۔ یا کم سے کم کسی ہاؤس بوٹ میں رہتے۔"

بیگم عبید نے انجمن سے کہا "نہیں آپ ہاؤس بوٹ میں تو ہرگز نہ رہیئے گا۔ میں نے کتنی مرتبہ ان ہانجیوں کو جہلم کے پانی میں رکابیاں دھوتے دیکھا ہے۔ یہ تو زبردستی اپنی صحت خراب کر لینا ہے۔"

انجمن نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اور اس کے بعد کوکب اور عائشہ سے باتیں کرنے لگیں۔ عائشہ مخملی نیلا سوٹ پہنے، اور اس پر ہلکا سفید دوپٹہ اوڑھے تھی، مگر آج بھی کوکب کے کپڑے معمولی ہی سے تھے۔ سادے، اجلے، سلیقے کے مگر معمولی۔

عبید صاحب کی باتیں سنتے سنتے میں نے انجمن سے کوکب کو باتیں کرتے سنا۔ "جی میری پیدائش ایران کی ہے۔ میری والدہ ایرانی تھیں۔"

یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ میں نے عبید صاحب سے پوچھا۔ وہ کہنے لگے۔ "ہاں ہمارے بڑے بھائی صاحب ایران میں دس پندرہ سال رہے۔ وہیں انہوں نے شادی بھی کر لی تھی۔ یہ ان کی لڑکی ہے۔ پیدا تو یہ ایران میں ہوئی تھی۔ فارسی خوب بولتی ہے۔ مگر آپ کے ہندوستانی لہجے پر ہنسے گی۔"

کوکب نے کہا۔ "خیر ہندوستانی اگر فارسی اچھی طرح نہ بولیں تو ایک بات بھی

ہے۔ مجھے تو افغانوں کے فارسی لہجے پر بڑی ہنسی آتی ہے۔ ان کا محاورہ بھی ذرا الگ ہے۔ آپ ان دو افغانی بہنوں سے ملے ہوں گے نا جو سری نگر کلب بڑی پابندی سے جاتی ہیں.....؟"

عبید صاحب نے ہنس کے کہا "اجی وہی دو موٹی بھدی جوان سی بھینسیں ہیں نا؟ وہ ٹامیوں کے چکر میں ہر روز شام کو سری نگر کلب میں برج کھیلتی ملیں گی۔"

"ہاں جی" کوکب ہنسی۔ میں نے دیکھا اس کے دانت ذرا بڑے بڑے سے مگر ہموار تھے' اور اس کا نیچے کا ہونٹ پھیلا ہوا تھا۔ عائشہ بھی بڑی ملائمت اور سادگی سے ہنسی۔

"چچا جان' ہم لوگ کہیں گے' من شب نہ خوابیدم۔ مگر یہ افغانی عورتیں کہتی ہیں' من شوخو نہ کردوم۔"

عائشہ ہنسی۔ بیگم عبید اور انجمن فارسی سے بالکل بے پروا اپنی باتوں میں آہستہ آہستہ مصروف' پان بنا رہی تھیں۔

قینچی چھاپ کا دھواں منہ سے چھوڑ کے عبید صاحب ہنسے۔ "شوخو نہ کردم۔ شب خواب نہ کردم..... خوب"

جب قاسم آیا۔ تو میں نے دیکھا کہ عائشہ تو اسی طرح بالکل قدرتی طور پر بیٹھی رہی۔ میں نے آج تک اس کو کسی نوجوان کی پہلی جھلک سے "متاثر" ہوتے نہیں دیکھا۔ اور ابھی اس کی عمر بھی تو بہت کم ہے۔ مشکل سے سولہ سال کی ہو گی۔ مگر میں نے دیکھا کہ قاسم کو دیکھ کے کوکب کی نظریں ایک خفیف ترین لمحے کیلئے اٹھیں' جھجکیں' سنبھلیں۔ اور پھر اس کے وجود کو فراموش کر کے دوسری معمولی سی چیزوں کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ قاسم بھی شرمایا سا بیٹھا رہا۔ وہ خود ابھی سولہ سال کا تھا۔

میں نے کوکب سے پوچھا۔ "ایران تمہیں کچھ کچھ یاد ہے؟"

"بس یوں ہی ذرا ذرا سا یاد ہے۔ میں چھوٹی سی تھی۔ اب تو ایران بہت بدل گیا ہو گا۔ مگر فارسی زبان نہیں بھولی۔ بچپن میں سیکھی تھی نا۔"

اتنے میں بوائے چائے لے کر آیا۔

"میں جب ہندوستان آئی" کوکب اب مجھ سے کھل کے باتیں کر رہی تھی۔ "تو مجھے یاد ہے میں نے سن رکھا تھا کہ یہاں کے لوگ بڑے کالے ہوتے ہیں۔ ایران میں

لوگ ذرا گورے ہوتے ہیں ناجی۔ میں سمجھتی تھی کہ ہمارے چچا اور سب لوگ بالکل جبشیوں کے ایسے کالے ہوں گے۔ مگر یہ بھی سب اچھے خاصے سفید رنگ کے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ سانولے ادھر مدراس وغیرہ کے لوگ البتہ ذرا کالے ہوتے ہیں۔"

عائشہ انجمن کو شلوار قمیص کا ارتقاء سمجھا رہی تھی۔ "دیکھئے قمیص اب اچھا خاصا لمبا ہوتا جا رہا ہے۔ بالکل فراک کی نقل بن رہا ہے۔ اور اب پنجاب میں سوٹ پہننے کا رواج کم ہو رہا ہے۔ اب تو لوگ زیادہ تر سفید شلوار پہنتے ہیں اور اس کے اوپر رنگین قمیص.... مگر آپ کے کلکتے میں تو...."

"کلکتے میں کیا' ہندوستان بھر میں ہر جگہ ساڑی ہی ساڑی ہے۔" انجمن نے مہمانوں کی خاطر کرنے کے بعد جواب دیا۔

"ہاں اور کیا" بیگم عبید بولیں۔ "وہاں تو شلوار قمیص ابھی فینسی ڈریس کا ایسا ہو گا۔"

عائشہ نے کہا۔ "واہ امی پنجاب سے دہلی' دہلی سے بمبئی تک اب ہمارا لباس پھیلتا جا رہا ہے۔"

پھر نیڈوز ہوٹل سے ڈل گیٹ کی طرف' اور ادھر سے کرن سنگھ بولوار کی طرف ہم ٹہلنے نکل گئے۔ لالوں کی فصل ختم ہو چکی تھی۔ مگر چنار کے پتے ہرے ہرے بڑے خوبصورت معلوم ہو رہے تھے اور بہت سے جنگلی پودے سفید سفید کلیوں سے ڈھکے کھڑے تھے۔ انگریز تو کافی تھے' مگر ہندوستانی سیاح ابھی ذرا کم ہی آئے تھے۔ زیادہ تر مشرق اور جنوب کے لوگ آئے تھے۔ پنجابی تو زیادہ تر اگست اور ستمبر میں آتے ہیں۔ جھیل پر ہلکی سرمئی کہر چھائی ہوئی تھی۔ اور شام کے دھندلکے میں پیر پنجال نظروں سے قریب قریب اوجھل سا تھا۔ "جناب کو ہم چار چنار لے جائے گا۔" شکارے والوں سے پیچھا چھڑانا مشکل تھا۔

عبید صاحب کر کیگارڈ کے الہیاتی تصورات مجھے سمجھا رہے تھے' لیکن میرے ذہن میں جھیل پر ہلکی' خنک دھند کے سوا اور کوئی تصور نہیں تھا۔ یہی دھند حلق میں پہنچ کے کھٹکتی ہے۔ اور زکام کی آمد آمد کی خبر دیتی ہے۔ آگے آگے بیگم عبید اور انجمن باتیں کرتی جا رہی تھیں۔ ان سے بھی دس قدم آگے یہ دونوں لڑکیاں آئشہ اور کوکب چل

رہی تھیں۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد مجھ سے انجمن نے کہا۔ "تم نے دیکھا بیگم عبید کے پاس سفید تیندوے کے سمور کا وہ کیپ کتنا خوبصورت تھا۔ کل ہی میں سبحانہ کے یہاں ویسا ایک فرکوٹ بنواؤں گی۔ عائشہ کا وہ فاکس کا فرکوٹ بھی کتنا اچھا تھا.... مگر میں کہتی ہوں، تم نے خیال کیا کوکب بچاری وہی لاہور والا اونی اوور کوٹ پہنے تھی۔ بیچاری لڑکی.... دیکھو بیگم عبید عائشہ کو کیسے اچھے کپڑے پہناتی ہیں۔ معلوم نہیں کوکب کا دل کیا کہتا ہو گا...... مگر کیا اس کے والد زندہ ہیں؟"

"مجھے معلوم نہیں۔"

○

چند ہفتوں کے بعد عبید صاحب کی دعوت پر ہم سب شالامار گئے۔ عبید صاحب کی عادت تھی کہ وہ درمیانی روش یعنی شاہراہ کے قریب ہی قالین بچھا کے متمکن ہو جاتے، اور بیگم عبید سماوار گرم کرنے لگتیں اور لڑکیاں ادھر ادھر چکر لگانے نکل جاتیں۔ اس مرتبہ میں عبید صاحب اور سب کو درمیانی روش سے دور ایک طرف ہٹا لے گیا۔ جدھر لوگ بہت کم تھے۔ عبید صاحب لاکھ کہتے رہے کہ "نہیں جی یہاں سے بیٹھے بیٹھے سب راہگیروں پر نظر پڑتی ہے، بہت سے ملنے جلنے والوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔" میں نے کہا۔ "آج ہماری خاطر اس محاذ سے ذرا ہٹ آیئے۔ آج گوشہ عافیت سہی۔"

قالین بچھا کے ہم سب تو رمی کھیلنے میں مصروف ہو گئے۔ یہ کشمیر کی بڑی خاص بیماری ہے۔ اور آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ لوگ باغوں میں آ کے رمی کیوں کھیلتے ہیں۔ لیکن سب کھیل رہے تھے میں بھی کھیلنے لگا۔ اور میں نے آہستہ سے کوکب کو انجمن سے پوچھتے سنا۔ "قاسم کو آپ ساتھ نہیں لائیں۔"

"وہ عجیب لڑکا ہے۔ بس پہاڑوں پر پھرتا رہتا ہے۔ پہل گام گیا ہے اور کہہ رہا تھا کہ میں برف کے پل دیکھنے اور آگے تک جاؤں گا۔ میں تو جانے نہیں دے رہی تھی۔ مگر انہوں نے اسے اجازت دے دی۔"

بیگم عبید نے کہا۔ "نہیں اس زمانے میں برف کے پل خطرناک نہیں ہوتے۔"

عبید صاحب اپنا پتہ اٹھا کے کہنے لگے۔ "یہ تم سے کس نے کہہ دیا۔ یہی زمانہ تو پلوں کے پگھلنے کا ہے۔ مگر وہ پہل گام سے آگے چندن واڑی تک چلا جائے تو کیا ہرج ہے۔"

چائے کے بعد باغ میں ہم سب لوگ ادھر ادھر پھرتے رہے۔ میں تو عبید صاحب کے ساتھ ہی ساتھ رہا جو آج بھی کرکیگارڈ سے الجھے ہوئے تھے۔ اور جب کرکیگارڈ سے اکتا جاتے تو ایک آدھ لطیفہ چھوڑ دیتے۔ عائشہ انجمن کے ساتھ ساتھ رہی، مگر کوکب ذرا الگ الگ۔

واپس آ کے انجمن نے مجھ سے کہا۔ "عائشہ مجھے بڑی پیاری لگتی ہے۔ ابھی قاسم کو پڑھ لکھ کے نوکر ہونے میں بہت دن لگیں گے ورنہ میں تو اس کی شادی قاسم ہی سے کرنے کو کہتی۔ مگر یہ کوکب مجھے ذرا اچھی نہیں لگتی۔"

میں نے پوچھا "کیوں اس نے کیا قصور کیا ہے۔"

کہنے لگیں "مجھے اس کے لچھن ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ اس دن تم نے نہیں دیکھا۔ قاسم کو اس طرح دیکھ رہی تھی گویا نظروں ہی نظروں میں کھا جائے گی۔ آج صاحبزادی مجھ سے پوچھ رہی تھیں قاسم کیوں نہیں آیا۔ آخر آپ کو کیا مطلب؟ اور وہ یوں عمر میں قاسم سے دو تین سال بڑی ہو گی۔"

میں نے جھنجلا کے کہا "معلوم نہیں تم اپنے لڑکے کو کتنا خوبصورت سمجھتی ہو کہ ساری دنیا کی لڑکیاں اسی پر مرتی ہیں۔ اس نے یوں ہی معصومیت سے اسے پوچھ لیا ہو گا تو اس میں کیا ہرج ہے؟"

○

مگر چند روز بعد میں نے دیکھا کہ عبید صاحب کا کوئی طالب علم ان سے ملنے آیا تھا، حسین سا لڑکا تھا، بھورے بال، ہلکا ہلکا سا ناک نقشہ۔ جب وہ باہر جانے لگا تو میں نے دیکھا کہ کوکب اسے دروازے کے پاس کھڑی گھور رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں دوشیزگی کی ایک ایسی وحشیانہ چمک میں نے دیکھی، جس کو بھولنا مشکل ہے۔ ڈرائنگ روم میں عائشہ اور بیگم عبید بڑے اطمینان سے کیرم کھیل رہی تھیں اور بیگم عبید ہارتی جا رہی تھیں۔

○

کوکب اس زمانے میں اکثر مجھ سے اسی بے تکلفی سے باتیں کرتی، جیسے عائشہ ہمیشہ سے کرتی آئی تھی، عبید صاحب کے گھر میں میری حیثیت بیگانے کی نہیں تھی۔ مجھے یہ دونوں لڑکیاں بڑی معصوم معصوم سی، اچھی اچھی معلوم ہوتیں۔ اور جہاں تک عبید صاحب کا تعلق ہے، وہ اپنے گھر میں بہت مقبول تھے، بال بچے ان سے خوش تھے اور وہ بال بچوں سے مگر تفصیلات میں جانے سے وہ ہمیشہ گھبراتے تھے۔ اور سب کچھ انہوں نے بیگم عبید پر چھوڑ رکھا تھا۔ میرے خیال میں بیگم عبید بڑی فرشتہ سیرت بی بی تھیں۔ انجمن بھی ان کو بہت پسند کرتی تھی۔ اور اکثر ان کی طبیعت کی تعریف کیا کرتی تھی۔ سوائے کپڑوں کے فرق کے میں نے کبھی عائشہ اور کوکب میں، یا ان کی رہائش وغیرہ کے طریقے میں کوئی فرق نہیں محسوس کیا، اور کپڑوں کے فرق کی حد تک نہ مجھے اور نہ انجمن کو یہ معلوم تھا کہ کوکب کے اخراجات کی ذمہ داری کس پر ہے، عبید صاحب پر یا کوکب کے والد پر۔ مجھ کو اور انجمن کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کے والد زندہ بھی ہیں یا نہیں۔ عبید صاحب فلسفی آدمی تھے، وہ اپنے گھریلو معاملات میں کسی اور کی کرید یا پوچھ گچھ کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اسلئے ہم لوگوں نے کبھی کچھ نہیں پوچھا۔

○

اس کے بعد کی چھٹیوں میں میں پھر بجائے دار جلنگ جانے کے کشمیر گیا۔ مئی کا زمانہ تھا اور حکومت کے دفاتر امروز و فردا میں جموں سے کشمیر منتقل ہونے والے تھے۔ عبید صاحب آ گئے تھے۔ اور ہار ون کے قریب ایک چھوٹی سی کوٹھی کرائے پر لے کر ٹھہرے تھے۔ سری نگر سے ہار ون تک پہنچنا بجائے خود ایک مصیبت ہے۔ سوائے موٹر کے اور ہر سواری تکلیف دہ ہے۔ میں نے ہمت یہ کی کہ شالامار تک شکارے میں گیا۔ وہاں سے شکار چھوڑ کر سوچا کہ پیدل ہی چند میل کی تکلیف سہی۔ میں جب پہنچا تو عبید صاحب چائے پر بیٹھ ہی رہے تھے۔ عبید صاحب کے یہاں کی چائے مجھے ہمیشہ سے بہت پسند ہے، سادہ اور صحت بخش، اس کے ساتھ دو طرح کی پنیر، مسکہ روٹی، ایک آدھ تلی ہوئی چیز، بسکٹ، بیگم عبید نے بہت خاطر مدارات کی، پوچھا انجمن کیوں نہیں آئیں۔ میں نے کہا انہیں دار جلنگ ہی بہت پسند ہے۔ لیکن عائشہ اور کوکب کہیں نظر نہ آئیں۔ میں

نے پوچھا کہ کیا لڑکیاں ساتھ نہیں آئی ہیں۔ تو بیگم عبید نے کہا ابھی سری نگر سے واپس نہیں آئیں۔ روز لڑکیاں تانگے پر کانونٹ آیا جایا کرتی تھیں۔

تھوڑی دیر کے بعد کرنل درانی سے ملاقات ہوئی۔ ان کے نام سے میں بخوبی واقف تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ یہ عبید صاحب کے بھانجے داماد ہیں مگر اس سے پہلے ان سے ملاقات کی نوبت نہیں آئی۔ پینتالیس سال کے قریب کے' ذرا دبیز سی صورت کے' مگر بڑے ہی ذہین آدمی تھے۔ ان کی بیوی کا بھی میں ذکر سن چکا تھا۔ جو جمیلہ سید کے نام سے ایک زمانے میں بہت مشہور تھیں۔ کرنل درانی کی گفتگو میں ہارون تک آنے کی زحمت اور واپسی کی ساری تکلیف محو ہو گئی۔ درانی صاحب بڑے ہی دلچسپ آدمی ہیں۔ انگریزی اور اردو دونوں بہت شگفتہ لکھتے ہیں۔ گورنمنٹ آف انڈیا میں اب تو بڑے اچھے عہدے پر ممتاز ہیں کوئی ڈیڑھ دو ہزار تنخواہ ہو گی۔ مگر جنگ سے پہلے تک دو تین سو پر گزر کرتے رہے۔ اسی قلیل تنخواہ میں باوجود اس ذہانت اور استعداد کے ساری جوانی گزر گئی۔ جنگ کے زمانے میں جب اطلاعات و نشریات کے محکموں کی توسیع ہوئی تو یہ بڑھتے بڑھتے چوٹی پر پہنچ گئے۔

گفتگو بڑی دلچسپ تھی۔ کیونکہ کرنل صاحب کی گفتگو کا انداز ہمیشہ آخری تصفیہ کا سا تھا۔ ان کی گفتگو میں وہ شوخی اور ظرافت نہ تھی جس سے عبید صاحب کی گفتگو مالا مال تھی۔ ہندوستان میں برطانوی کابینہ کا مشن اپنی سرگرمیوں میں مصروف تھا۔ کرنل صاحب کہنے لگے۔ "انجام جو کچھ ہو گا ہمیں معلوم ہی ہے۔ بڑے پیمانے پر ایک اور برلا نفیلڈ تجارتی پیمان ہو گا۔ مجھے تو مسلم لیگ کا مستقبل قطعاً" محفوظ نہیں معلوم ہوتا۔"

پھر خانہ جنگی کا ذکر آیا۔ کرنل صاحب کہنے لگے "خانہ جنگی میں بھی آپ لوگ کبھی نہ جیتیں گے۔ پہلے تو میں یہ عرض کرتا ہوں کہ آپ صاحبین جو یہ کہتے ہیں کہ آپ ایمان کے زور پر جیت جائیں گے' یہ دو وجہ سے غلط ہے۔ ایک تو یہ کہ ایمان محض آپ لوگوں کی میراث نہیں اور آپ ہی کا ایمان ذرا کمزور ہے۔ دوسرے یہ کہ لڑائیاں ایمان کی نہیں بلکہ فولاد کی وجہ سے جیتی جاتی ہیں....."

پھر میں نے یہ دیکھ کر کہ شام کا وقت قریب آ رہا ہے' اجازت چاہی۔ عائشہ اور کوکب ابھی تک نہیں آئی تھیں۔ عبید صاحب' بیگم عبید اور کرنل درانی بھی ساتھ

تفریحاً" چلنے چلنے پر تیار ہو گئے۔ ٹہلتے ٹہلتے ہم لوگ شالامار تک پہنچے۔ راستہ غلاظت سے اٹا ہوا تھا۔ ہوا میں بڑی ٹھنڈک تھی اور راستے میں کئی لاریاں گرد اڑاتی ہوئی گزر گئیں۔ اور عین اس وقت جب میں عبید صاحب وغیرہ سے رخصت ہو رہا تھا۔ سری نگر کی طرف سے دونوں لڑکیاں تانگے میں آتی نظر آئیں۔ عبید صاحب کہنے لگے "دیکھئے یہ تقدیر کے قائل ہونے کا مقام ہے۔ اب آپ اس سردی میں شکارے میں مت جایئے۔ اسے تو رخصت کیجئے لڑکیاں ہمارے ساتھ ہارون پیدل چلیں گی۔ آپ اسی تانگے پر سری نگر واپس جایئے۔"

عائشہ نے بڑی سادگی سے سلام کر کے پوچھا کہ "آپ کب آئے؟" کوکب نے آنکھیں ملا کے بات بھی نہیں کی۔ اس کی نظریں سڑک پر جھاڑو دیتی ہوئی جھیل کی طرف جم گئیں۔ اور پیر پنجال کی سفیدی کے مقابل اس کے سفید دانت چمکنے لگے۔ اور میں نے پہلی نظر میں پہچان لیا کہ اس ایک سال میں عائشہ تو بالکل جیسی کی ویسی ہی رہی تھی۔ مگر اندر ہی اندر کسی چیز نے کوکب کو بالکل بدل دیا تھا۔

مجھے دوبارہ ہارون جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ مگر عبید صاحب بھی مسافت سے گھبرا کے رام منشی باغ میں منتقل ہو گئے۔ ان سے سری نگر کلب میں روز ملاقات ہوتی اور ہفتے میں ایک آدھ مرتبہ میں ان کے یہاں بھی چلا جاتا۔ اس مرتبہ میں نے ایک عجیب بات یہ دیکھی کہ کوکب بہت کم نظر آتی۔ اس زمانے میں عبید صاحب کا ایک اور بھانجا اشفاق بھی وہیں ٹھہرا تھا۔ جو کشمیری خدوخال کا خوبصورت سا لڑکا تھا۔ وہ اور عائشہ، بیگم عبید اور میں اور کرنل درانی گھنٹوں باتیں کرتے مگر میں دیکھتا کہ کوکب بہت کم نیچے اترتی۔ کئی مرتبہ سیڑھیوں پر اس سے مڈبھیڑ ہوئی اور وہ یوں ہی بلا بات چیت کئے، ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اور معمولی سا سلام کر کے نظریں نیچی کئے دوسری طرف چل دی۔ میں نے دو ایک مرتبہ پوچھا بھی کہ تم کہاں رہتی ہو نظر ہی نہیں آتیں۔ اس نے رسمی سا جواب دیا کہ محض اتفاق کی بات ہے۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ میں ساڑھے تین بجے پہنچا۔ اتوار کا دن تھا اور مجھے خیال ہوا کہ اگر عبید صاحب وغیرہ آج نشاط یا شالامار جا رہے ہوں تو انہیں کے ساتھ چلا چلوں۔ میں جب پہنچا تو وہ روانہ ہو چکے تھے۔ ان کے ڈرائنگ روم میں ریڈیو پر کچھ مغموم سا

انگریزی گانا آ رہا تھا۔ اور ریڈیو کے قریب کوکب سادہ سا قمیص شلوار پہنے، سفید دوپٹہ اوڑھے بیٹھی تھی اور اس کے سر کے بال کھلے ہوئے تھے۔ کمرے کے دوسرے سرے پر اشفاق بیٹھا ہوا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اشفاق تو کھڑبڑا کے اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر کوکب اسی متانت سے بیٹھی رہی۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی اور اتنی ملاقاتوں کے بعد آج اس نے ذرا کھل کے کہا "چچا جان وغیرہ تو باغوں کو چلے گئے۔"

میں نے کہا "تم لوگ نہیں گئے۔"

اشفاق کہنے لگا "مجھے تو آج شام کو کلب میں چائے کی دعوت تھی۔"

کوکب بولی۔ "میں نہا رہی تھی، مجھے نہا کے نکلنے میں دیر ہو گئی۔ چچی جان وغیرہ نے انتظار کیا۔ میرا تو بہرحال یوں بھی باغوں سے جی گھبرا گیا ہے۔"

میں واپس ہونے لگا تو کوکب نے روکا۔ اور کہا "حنیف چچا چائے تو پی لیجئے، میں ابھی بنواتی ہوں۔"

میرے اس طرح بے وقت آ جانے سے اشفاق کی طبیعت شائد کسی قدر متعفن ہو گئی تھی۔ مگر وہ بڑے اخلاق سے مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ کوکب جب چائے کیلئے بوائے سے کہہ کے واپس آئی تو اپنے ساتھ اون لیتی آئی۔ سویٹر آدھے سے زیادہ بنا جا چکا تھا۔ میں نے ایک لمحے کیلئے دیکھا کہ اس کی آنکھیں اشفاق کی گرسنہ نظروں سے چار ہوئیں۔ صرف ایک لمحے کے لئے، چند منٹ کے بعد پھر دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ اور پھر کوکب کی نظریں ہمیشہ کیلئے اس کی طرف سے پلٹ گئیں۔ کاش میں اس طرح بے وقت نہ آ جاتا۔ اشفاق کو کمیشن مل ہی چکا تھا جس کے مستقل ہو جانے کا امکان ہے۔ نظریں چار ہو کے ممکن ہے دونوں کی زندگی سدھر جاتی۔ اور کوکب کو ایسا اچھا دولہا شاید ہی مل سکتا۔ لیکن آخری مرتبہ جب کوکب کی نظریں اشفاق کی گرسنہ نظروں سے بچ کے ہٹ گئیں تو میں نے اس کے چہرے پر ردعمل پڑھ لیا۔ کوکب کو اشفاق کے گورے نازک ناک نقشے میں کسی چیز کی کمی نظر آتی تھی۔ شاید چالاک مردانگی کی اور یہ اس کے باوجود کہ اشفاق اس وقت بھی یونیفارم پہنے تھا۔ اور تب میں نے اپنے دل میں کہا نہیں کوکب کی خاموشی کا راز اس سے زیادہ گہرا ہے۔

جون میں میں نے اور عبید صاحب کے پورے خاندان نے پہل گام کا سفر کیا۔ ابھی

پہل گام کی وادی کے دونوں سروں پر پہاڑ برف کے بوسیدہ تاج پہنے ہوئے تھے اور ہر روز ان کے تاجوں کی عظمت کم ہوتی جاتی۔ لڈر کے سنگم پر پانی ہزاروں پتھروں سے اسی طرح الجھ رہا تھا۔ وہی شور تھا' وہی کف تھا' دیواروں کے سائے میں بڑی ٹھنڈک تھی۔ لکڑی کے چھوٹے چھوٹے خوبصورت پل لڈر کے کف دار دھاروں پر بڑے اچھے معلوم ہوتے تھے۔ اور ایک بڑی خوبصورت سکھ عورت' نیلی نیلی بڑی بڑی آنکھیں' سرخ' بھبکتی ہوئی ساڑی پہنے اپنے میلے کچیلے سکھ ملازم کے کاندھے پر ہاتھ رکھے بڑی رازداری سے باتیں کر رہی تھی۔ عبید صاحب وزیر ہوٹل کے برآمدے میں بڑا موٹا سا لبادہ اور کنٹوپ پہنے لطیفے سنا رہے تھے۔ میں کٹہرے سے لگا کھڑا تھا اور قریب ہی کرنل درانی ایک وہسکی کے بعد دوسری چڑھاتے چلے جا رہے تھے۔ نیچے عائشہ بیگم عبید کے ساتھ لڈر کی ایک شاخ کے کنارے کھڑی تھی۔ اتنے میں لڈر کے اس پار چیلوں اور دیواروں کے جنگل سے میں نے بیگم شجاع کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کوکب کو آتے دیکھا۔ بیگم شجاع کا قد اونچا نہیں تھا ان کے شوہر کے قد کی طرح ٹھگنا ہی سا تھا۔ اور وہ ذرا پھول بہت گئی تھیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ان سے اور کوکب سے اتنی دوستی ہے۔ ندی کے کنارے ہی کنارے دونوں کسی چیز کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

بیگم عبید نے پکار کے پوچھا "ملی؟"

"نہیں ملی" لڈر کے مجموعی شور اور پتھروں میں سر پٹکنے کی آواز سے اونچی بیگم شجاع کی آواز سنائی دی۔

"کیوں کیا ہوا؟ کیا چیز گم ہو گئی؟" کرنل درانی نے پوچھا۔ جو وہسکی کے دوران میں اب بھنگی کالونی کا ذکر کر رہے تھے۔ جہاں مہاتما گاندھی' برطانوی کابینہ کے وفد کی آمد کے دوران میں قیام فرما تھے۔

عبید صاحب نے کہا "جی اس کی' تسنیم کی (بیگم شجاع کی) انگوٹھی کہیں گر گئی ہے۔"

"لڈر میں بہہ بھی گئی ہو گی۔" میں نے رائے دی۔ مگر بیگم شجاع اور کوکب اسی تندہی سے انگوٹھی ڈھونڈھ رہی تھیں اوپر گوجروں کے جھونپڑوں سے دو تین ذرا کالے کالے سے چھوکرے بھی انعام کی لالچ میں اس تلاش میں شریک ہو گئے تھے لیکن بیگم

شجاع نے کوکب سے اپنے شک کا اظہار کیا کہ انگوٹھی ملے گی بھی تو یہ لوگ چرا لیں گے۔
عبید صاحب نے کہا "اس کی بیچاری کی شادی کی انگوٹھی ہے۔ اس لئے وہ پریشان ہے۔ ورنہ قیمت تو سو روپے بھی نہ ہو گی۔"

انگوٹھی نہیں ملی اور دوسرے روز ہم سب چندن واڑی گئے۔ کوکب ہم سب سے آگے بیگم شجاع کے ساتھ ساتھ اپنا ٹٹو آگے ہی آگے دوڑاتی رہی۔ معلوم ہوتا تھا اسے بیگم شجاع کے سوا اور کسی سے کوئی مطلب نہیں۔ برف کا ایک پل لڈر پر بیچ بیچ کے پل کی طرح قائم تھا لیکن بیچ میں ایک بہت بڑا شگاف پڑ چکا تھا اور ٹٹو والوں کی رائے تھی کہ یہ دو ایک دن میں بیٹھ جائے گا۔ لیکن راستے میں اور جتنے برف کے پل تھے سب کی برف ابھی پکی تھی۔ ایک جگہ البتہ برف ذرا تڑک گئی تھی۔ اور وہاں جب کرنل درانی نے پاؤں رکھنا چاہا تو ٹٹو والا چیخنے لگا۔ عبید صاحب نے ہنس کے کہا "درانی تم برف کے اندر ہی اندر کوئی دو سو فیٹ نیچے اتر جاؤ گے۔"

پگڈنڈی جب نیچے اتر کے لڈر کے صنوبر پوش نیلے پانی کے قریب پہنچ جاتی تو سردی کا ایک بڑا ہی خوشگوار جھونکا تھکے ہوئے اعضا پر مسیحائی اثر کر جاتا۔ عبید صاحب مجھ پر برابر چوٹ کر رہے تھے کہ تم جرمن بھی بنگالی لہجے میں بولتے ہو۔ اور میں جرمن رومانی شاعری کے اقتباسات برابر سناتا جا رہا تھا۔ جن میں پہاڑوں، چشموں، آبشاروں، مسافروں اور نوجوان لڑکیوں کا ذکر ہے۔ درانی صاحب جو جرمن نہیں جانتے تھے، اطمینان سے ٹٹو پر بیٹھے بیٹھے چرچل سگار چبا رہے تھے۔ اور عائشہ بھی اپنے ٹٹو کو آگے بڑھا کے بیگم شجاع اور کوکب سے جا ملی تھی۔ اور بیگم عبید چندن واڑی اور امرناتھ تک ریل بننے کے امکانات پر غور کر رہی تھیں۔ غرض خنکی، حسن فطرت، صنوبر کی چھاؤں، اور لڈر کے دھارے کے زیر اثر سب کے حواس غیر معمولی سمتوں میں سفر کر رہے تھے۔ صرف عبید صاحب فلسفیانہ سکون کو ظرافت کا رنگ دے رہے تھے۔ اتنے میں عائشہ اور آگے بڑھ گئی۔ لیکن بیگم شجاع اور کوکب دونوں گھوڑوں سے اتر کے ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈال کے ایک چٹان پر بیٹھ گئیں۔ اور جب ہم لوگوں کا قافلہ ان کے قریب سے گزرا تو انہوں نے رومال ہلا ہلا کے آگے بڑھ جانے کا اشارہ کیا۔ میں اب عبید صاحب کو نطشے کی نظم "آوارہ گرد" سنا رہا تھا۔ اور درانی صاحب کیلئے اس کا ترجمہ بھی کرتا جاتا

تھا۔ ایک طائر اپنے معشوق طائر کے غم اور فراق کی داستان آوارہ گرد کو سنانا چاہتا ہے مگر آوارہ گرد نہیں ٹھہرتا اور آگے بڑھتا جاتا ہے۔ طائر اسے بد دعا دیتا ہے کہ اب تو ہمیشہ بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ اور کبھی نہ رکے گا۔ اس پر آوارہ گرد مسافر گر پڑتا ہے۔ اور طائر افسوس کرتا ہے کہ کیوں کیا میرے محبت کے راگ نے تیرا کام تمام کر دیا تو بچارا بچارا مسافر۔

برف کو روندتے ہوئے جب چندواڑی پہنچے تو سیدھے ہاتھ کی جانب جو برف پوش چوٹی ہے اس کے نیچے نالے میں برف ہی برف جما ہوا تھا۔ قریب ہی دستر خوان بچھا۔

گوشت گلا نہیں تھا۔ بیگم شجاع نے کہا "کبھی کبھی سری نگر میں ایسا خراب گوشت ملتا ہے جو گلنے کا نام نہیں لیتا۔"

بیگم عبید نے کہا "کبھی کبھی چوہے بھی ہوتے ہیں۔"

اس جملے پر ایک منٹ کیلئے ایک ناخوشگوار سا سناٹا چھا گیا۔ بیگم عبید نے تشریح کی چندن واڑی میں جو بے شمار لکڑی کے ڈربے کھڑے ہیں جن میں جاتری ہر سال ٹھہرتے ہیں۔ ان میں چوہے ہوتے ہیں۔ اس پر سب قہقہہ مار کے ہنسے۔ بیگم شجاع نے کہا "میں سمجھی آپ یہ کہہ رہی تھیں کہ سالن میں کبھی کبھی چوہے ہوتے ہیں۔"

عبید صاحب نے کہا "یہ تو ہماری بیگم کی خاص عادت ہے۔ ذکر کسی بات کا ہو رہا ہو یہ کوئی اور بات ایسی کہہ جاتی ہیں جو پہلے کے ذکر پر بالکل منطبق ہو جاتی ہے حالانکہ غیر متعلق ہوتی ہے۔ اب بھلا یہاں چوہوں کے ذکر کا کیا موقع تھا۔ میں بھی یہی سمجھا کہ سالن میں چوہے پک جاتے ہیں۔"

برف پر بیگم شجاع اور کوکب تھوڑی دیر تک چلنے کی کوشش کر کے واپس آ گئیں۔ اس کے بعد عبید صاحب اور بیگم عبید کو ستاتا چھوڑ کے میں اور کرنل درانی صاحب سامنے کی برف پوش چوٹی تک پہنچنے کے ارادے سے پھر سے کیلوں والے جوتے کو مضبوط باندھ کے اور سرے پر لوہا لگی ہوئی چھڑیاں سنبھال کے روانہ ہوئے۔ نہ مجھے برف پوش چوٹیوں تک پہنچنے کا کوئی تجربہ تھا نہ کرنل صاحب کو۔ ہم کو اوپر جاتے دیکھ کے ہاتووں نے چیخ و پکار شروع کی۔ چڑھائی یقیناً خطرناک ہو گی' اس لئے ہم واپس ہوئے۔ اور واپسی میں اسی برف پر سے آئے جو نالے کے سرے پر تھی' جس پر بیگم شجاع اور کوکب تھوڑی دیر

پہلے گزری تھیں۔ کرنل صاحب کی عقابی آنکھوں نے کوئی چیز دیکھی۔ وہ جھکے اور مٹھی بھر برف کے ساتھ ایک چمکتی ہوئی چیز تھی۔ یہ سونے کی انگوٹھی تھی۔ وہیں سے پکار کے انہوں نے کہا "تسنیم کیا یہ تمہاری انگوٹھی ہے؟"

بیگم شجاع دوڑی دوڑی آئیں۔ بے شک انہیں کی انگوٹھی تھی۔ مگر وہ تو ہزاروں فٹ نیچے پہل گام میں گم ہوئی تھی۔ وہ یہاں کیسے آ گئی؟ میں نے کوکب کے چہرے کی طرف دیکھا جو برف کی طرح سفید تھا۔ میں سوچنے لگا اس نے یہ انگوٹھی آخر کیوں چرائی ہو گی؟ کس مقصد کے لئے؟ لیکن میں کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا اور غنیمت ہے کہ بیگم شجاع یا کسی اور کا ذہن کوکب کی طرف منتقل نہیں ہوا۔ بیگم شجاع نے کہا۔ "شاید میں نے ہی یہ انگوٹھی اتار کے اپنے پرس میں رکھ لی ہو گی اور بھول گئی ہوں گی۔ یہاں گر گئی ہو گی ورنہ یہاں کیسے آ جاتی؟"

اس کے بعد کوکب ذرا کھوئی کھوئی سی اور پریشان سی رہی۔ رات کو چندن واڑی میں بے حد سردی تھی۔ ہم لوگ بلانکٹوں اور لحافوں میں ٹھٹھر رہے تھے۔ میں رات بھر سوچتا رہا کہ کوکب ہی نے ضرور وہ انگوٹھی چھپائی تھی۔ مگر آخر کیوں؟

دوسرے دن بہرحال ہَوا کی تازگی، خنکی اور شگفتگی کا اور سب کے ساتھ کوکب پر بھی اثر ہوا۔ آفتاب بڑے مزے میں چمک رہا تھا اور دور دور کسی ابر کے ٹکڑے کا پتہ نہ تھا۔ نرم نرم شعاعیں برف پر جگمگا رہی تھیں اور چیلوں پر بڑے غضب کا نکھار تھا۔ صبح کو ناشتے کا دسترخوان کھلی ہوئی گھانس پر بچھا اور عبید صاحب نے کسی کھوئے ہوئے زیور کے متعلق ایک پنجابی گیت کے الفاظ دہرائے۔ زیور پر موریا چکور کی تصویر تھی۔ مجھے گیت کے صرف دو مصرعے یاد ہیں:۔

مور بولے، وے ہاں چکور بولے وے
جموں والا راجہ بولی ہور بولے وے

یعنی جموں کا مہاراجہ لڑکی سے جو اپنا زیور ڈھونڈھ رہی ہے کچھ اور ہی طرح کی باتیں کرتا ہے۔ بیگم شجاع نے کہا "اس گیت کو یوں بھی گاتے ہیں کہ "پٹیالے والا راجہ بولی ہور بولے وے۔"

مجھ سے عائشہ نے کہا "حنیف چچا آپ کو معلوم ہے، ہماری تسنیم بھابھی بہت اچھا

گاتی ہیں۔" اس پر تسنیم سے گانے کی فرمائشیں ہونے لگیں۔ اس وقت تو چائے پیتے ہیں ادھر ادھر کی باتیں نکل آئیں اور وہ کچھ گا نہ سکیں۔ لیکن جب واپسی میں ہم لوگ پہل گام کی طرف چلے تو قافلہ دو حصوں میں بٹ گیا۔ آگے آگے کرنل صاحب، بیگم عبید، عبید صاحب اور ان کے ساتھ میں تھا۔ ہم سے تقریباً پچاس قدم پیچھے بیگم شجاع اور ان کے ساتھ دونوں لڑکیاں تھیں۔ ہم اس حصے سے گزرے جہاں پگڈنڈی اتر کے قریب قریب خنک ندی کی سطح کے برابر ہو جاتی ہے۔ اور جب ہم دوبارہ ذرا بلندی پر پہنچے تو پیچھے سے تینوں نوجوان عورتوں کے گیت کی آواز آئی۔ یہ وہی گیت تھا۔ "جموں والا مہاراجہ بولی ہور بولے وے۔" اور اس کے بعد گیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پھولوں کے گیت مالیوں کے گیت، گرمی کے گیت، دہی کے گیت، لسی کے گیت۔

جب بیگم شجاع اور دونوں لڑکیاں پنجابی گیتوں کو چھوڑ کے اردو غزلیں شروع کرتیں تو ہم لوگ پکار کے کہتے "نہیں گیت ہی گیت" یہاں تک کہ پہل گام کے آگے کا وہ گاؤں آیا، جہاں ایک کھڑکی سے ایک بڑی خوبصورت میلی کچیلی لڑکی جھانکتی ہے اور راہگیروں کو اشارے کیا کرتی ہے۔ دراصل وہ وصل یا محبت کی نہیں، بلکہ محض ایک آدھ پیسہ کی جویا ہے۔ اس لئے اس لڑکی کے متعلق جن مصنفوں نے جو جو خیالی افسانے لکھے ہیں، وہ سب غلط ہیں، مجھ سے ہاتو نے بار بار قسم کھا کے کہا کہ یہ کشمیری لڑکی بدکار نہیں۔

○

پہل گام سے واپسی کے ہفتہ بھر بعد قریشی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ چیچک کے داغ، مگر سینہ بڑا ابھرا ہوا اور طاقت اتنی کہ اپنے دونوں ہاتھوں اور سینے کے شکنجے میں کس کے مضبوط سے مضبوط عورت کی پسلیاں توڑ دیں۔ جنگلات کے ٹھیکیدار۔ ان کو یا دیواروں سے عشق تھا یا عورتوں سے۔ دیواروں سے ان کو پیسہ ملتا تھا اور اسے عورتوں پر خرچ کرتے تھے۔ سری نگر کی ہر سیاح یا مقامی عورت جس کا کسی فیشن ایبل گھرانے سے تعلق ہو اس کی زندگی کی تمام تفصیلات سے یہ آگاہ رہتے۔ انہیں سب معلوم تھا کہ فلاں دن فلاں سیٹھ کی بیوی کس جگہ ناچنے کیلئے گئی اور فلاں نواب کے یہاں فلاں دعوت میں

جتنی عورتیں آئی تھیں ان کا ماضی' حال اور مستقبل کیا اور کیسا ہے۔ قصہ مختصر ان قریشی صاحب نے مجھ سے تذکرۃً پوچھا "آپ کے عبید صاحب کی یہ بھتیجی ہے ناجی کو کب؟"

"ہاں کیا ہوا؟"

"یہ کس قسم کی لڑکی ہے؟"

"اچھی خاصی لڑکی ہے' کیوں؟"

"کچھ نہیں' بس ایسے ہی پوچھا جی۔ بات دراصل یہ ہے ناجی کہ مجھے اس پر ذرا شک ہے؟"

"نہیں قریشی صاحب میرے خیال میں تو بڑی اچھی لڑکی ہے۔ کیوں کیا آپ نے کوئی بات سنی۔"

قریشی صاحب کی چھوٹی چھوٹی چالاک آنکھیں مسکرائیں۔ پھر انہوں نے سینہ تان کے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ "آپ شجاع صاحب سے واقف ہیں ناجی؟"

شجاع سے میں کئی مرتبہ ملا تھا۔ ذرا چھوٹا سا موٹا سا آدمی۔ عمر کوئی چالیس سال کے قریب۔

"ہاں' جانتا تو ضرور ہوں۔"

"شجاع ہماری پارٹی کا آدمی ہے۔ ایسے دیکھنے میں وہ زیادہ خوبصورت بھی نہیں ہے مگر جی اس سے بچ کے کسی لڑکی کا نکلنا بہت مشکل ہے۔ اور بدمعاشی میں وہ کچھ نہیں جانتا' خاندان' غیر خاندان سب برابر ہیں۔ غرض وہ بڑا چلتا ہوا بڑا چار سو بیس ہے...."

پھر مسکرا کے قریشی صاحب نے کہا۔ "پرسوں میں شجاع کے یہاں گیا ہوا تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ بیگم شجاع آج کل گلمرگ میں ہے۔ خیر جناب یہ لڑکی کو کب پرسوں شجاع کے گھر آئی۔ اور مجھے دیکھ کر ذرا ٹھٹک گئی۔ پوچھنے لگی تسنیم ہیں یا نہیں ہیں۔ مگر مجھے تو یقین ہے اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ تسنیم گلمرگ میں ہے۔ شجاع نے اس سے کہا کہ تسنیم تو نہیں ہے۔ آپ اندر چل کے بیٹھئے میں ابھی آتا ہوں۔ بس جناب اس کے بعد شجاع نے مجھے جلدی سے ٹالا۔ میں نے ذرا مخول بھی کیا مگر وہ ٹال گیا۔ میں ادھر چلا آیا۔ میرے خیال میں تو ضرور کچھ بھید ہے۔ شجاع ان معاملات میں بڑا منچلا ہے۔ ابھی وہ کسی لڑکی کے لئے جان پر کھیل جائے...."

میں نے کہا "یہ تو شک ہی شک ہے۔"

قریشی صاحب نے کہا "ہم ایسا کچا کام کبھی نہیں کرتے۔ میں نے وہیں چھپ کے انتظار کرنا شروع کیا۔ پورے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد وہ لڑکی شجاع کے مکان سے نکلی۔ اب آپ بتائیے جب بیگم شجاع وہاں نہیں تھی تو وہ کیا کر رہی تھی۔"

عبید صاحب میرے دوست تھے اسلئے میں نے قریشی صاحب کے سامنے انگوٹھی کا ذکر نہیں کیا۔ مگر اب میری سمجھ میں کچھ کچھ آیا۔ شاید شادی کی انگوٹھی اس نے اس لئے چرائی ہو گی کہ وہ اپنی سہیلی بیگم شجاع کا اپنے دوست شجاع سے تعلق ذہنی طور پر منقطع کرنا چاہتی تھی۔ شاید ذہنی طور پر وہ خود اپنی سہیلی بیگم شجاع کی جگہ لینا چاہتی تھی۔ مگر کون جانے۔ قریشی صاحب کا نظریہ معلوم نہیں کس حد تک صحیح ہے۔ ممکن ہے جیسا کہ بیگم شجاع نے خیال ظاہر کیا۔ انگوٹھی خود اسی کی پرس میں رہ گئی ہو۔

چند روز بعد میں کشمیر سے چلا آیا۔ اور ان واقعات کو قریب قریب بھول گیا۔

○

اس مرتبہ سردیوں میں گورنمنٹ بنگال نے مجھے دامودر پراجیکٹ کے سلسلے میں ایک کام کیلئے گورنمنٹ آف انڈیا سے گفت و شنید کرنے دہلی بھیجا۔ کرنل درانی نے بڑا اصرار کیا تھا کہ اگر میں دہلی آؤں تو انہیں کے یہاں ٹھہروں۔ میں نے انہیں تار دیا۔ وہ خود دفتر میں تھے ان کی گاڑی اسٹیشن آئی۔

اس وقت شام کے پانچ بجے ہوں گے۔ دہلی کا خوشگوار دسمبر تھا۔ اور درختوں کے سائے بڑے طویل تھے۔ میر درد روڈ پر کرنل صاحب کو سرکار سے بڑا اچھا مکان رہنے کیلئے ملا تھا۔ برآمدے میں بڑی اچھی بید کی کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ اور صحن میں ایک بہت بڑے سبز لان پر پانی رل رل بہہ رہا تھا۔ میرے اترتے ہی ایک بٹلر نے سامان اتار کر مہمان خانے میں پہنچا دیا۔ اور میں نصف گھنٹے کے اندر نہا دھو کر کپڑے بدل کے تیار ہو گیا۔ بٹلر چائے کیلئے بلانے آیا۔

اس سے پہلے میں نے مسز درانی (سابقہ جمیلہ سید) کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ان کی ذہانت کے قصے افسانوں کے طور پر البتہ سنے تھے۔ وہ نیلے رنگ کی ساڑی پہنے ڈرائنگ

روم میں آتش دان کے پاس بیٹھی تھیں۔ اب ان کی عمر بھی چالیس کے بہت قریب ہو گی۔ چہرے کے نقش و نگار بھدے ہو چکے تھے' اور جسم بہت گول گول' فربہ سا ہو گیا تھا۔ مجھے دیکھ کے وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ مسکرائیں اور کہنے لگیں "بڑی عجیب بات یہ ہے کہ میں اتنی بار سری نگر گئی۔ مگر کچھ اتفاق ہوا کہ جس زمانے میں میں گئی' آپ وہاں نہیں تھے۔ یوں اکثر عبید ماموں آپ کا ذکر کیا کرتے تھے۔"

انہوں نے چائے بنا کے میری طرف بڑھائی اور کہنے لگیں "درانی آتے ہی ہوں گے۔"

میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ آتش دان میں آگ بڑے مزے لے لے کے جل رہی تھی۔ کوئلہ کی آج کل دہلی میں ذرا قلت ہے۔ اسلئے شعلے چھ انچ سے زیادہ بلند نہ ہوتے۔ آتش دان سے زاویہ قائمہ بناتا ہوا ایک کوچ تھا جس پر مسز درانی نیم دراز تھیں۔ تھوڑی دور پر صوفے تھے۔ دو ایرانی بلیاں بڑی تمیز سے اپنی مالکہ کے پیروں کے پاس بیٹھی تھیں۔ بیگم درانی ان بلیوں کی تعریف کرنے لگیں۔ "مجھے ہمیشہ سے بلیوں سے نفرت سی رہی ہے لیکن ان بلیوں نے مجھے قائل کر دیا۔ ایسی مہذب بلیاں شاید ہی دہلی میں کہیں اور ہوں۔ گدوں پر سوتی ہیں' ان کیلئے کموڈ موجود ہیں۔ گھر میں کہیں غلاظت نہیں کرتیں' سوائے اپنے پیالوں کے کسی اور برتن سے کھانا نہیں کھاتیں......"

آتش دان کے اوپر خاندان کے افراد کی تصویریں تھیں۔ میں انہیں دیکھ رہا تھا کہ عائشہ کی تصویر دیکھ کے میں نے پوچھا "آج کل عبید صاحب اور عائشہ وغیرہ سب کانپور میں ہیں؟"

"جی ہاں آج کل وہ لوگ کانپور میں ہیں۔"

"اور کوکب؟"

"کوکب کو انہوں نے لاہور میں بورڈنگ میں شریک کرا دیا ہے۔"

میں کچھ دیر کیلئے خاموش ہو گیا۔

ادھر ادھر کی باتوں میں بیگم درانی کہنے لگیں۔ "مسلمان لڑکی کا بھی ہندوستان میں کچھ عجیب حال ہوتا ہے۔ تعلیم تو ہوتی بہت کم ہے جو وہ دماغی طور پر اپنے شوہر کا ساتھ دے سکے۔ صورت البتہ کچھ دنوں تک کام آتی ہے۔ نہیں یوں دیکھا جائے تو اگر اچھی

صورت ہو تو شادی شدہ زندگی کے ابتدائی مرحلے میں بڑی مدد ملتی ہے.....“

میں خود ان کی صورت دیکھتا رہا جس سے خوبصورتی کے آثار ایک ایک کر کے رخصت ہو چکے تھے۔ وہ برابر کہے جا رہی تھیں۔ ”ہماری ممانی جان یعنی عبید ماموں کی بیوی میں کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی کہ وہ خوبصورتی کا زمانہ گزر جانے کے بعد عبید ماموں سے کسی طرح کی ذہنی یک جہتی باقی رکھ سکیں۔ ان کی اور عبید ماموں کی زندگی ایسی ہی ہے جیسے عام طور پر ہندوستانی مسلمان گھرانوں کی ہوتی ہے۔ یعنی لحاظ زیادہ محبت معمولی۔ اس گھر کی ساری رونق عائشہ کی وجہ سے ہے۔“

”مجھے بھی عائشہ کی طبیعت بہت پسند ہے“ میں نے کہا۔

”بڑی پیاری لڑکی ہے“ بیگم درانی کہنے لگیں۔ ”سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں ایک غیر معمولی قدرتی ظرافت اور رواداری ہے۔ یہ بات کوکب میں نہیں۔“

”کوکب مجھے گزشتہ سال ذرا خاموش معلوم ہوئی۔“

”دیکھئے نا۔ وہ بھی جوان لڑکی ہے۔ اس کے بھی حوصلے ہیں۔ اب وہ دیکھتی ہے کہ عائشہ اچھے سے اچھے کپڑے پہنتی ہے۔ کیا اس کا دل نہ چاہتا ہو گا۔ میرے خیال میں تو اس سال عبید ماموں نے بہت اچھا کیا کہ اسے بورڈنگ ہاؤس میں شریک کرا دیا۔ میرے خیال میں اپنے قریبی عزیزوں کے بچوں کو بھی اپنے گھر میں نہ رکھنا چاہئے۔ دیکھئے عبید ماموں لاکھ بھی کوشش کریں، عائشہ اور کوکب کو برابر تو نہیں رکھ سکتے۔“

”مگر میرے خیال میں تو بیگم عبید کی بڑی اچھی طبیعت ہے اور وہ کوکب کو بڑی اچھی طرح رکھتی تھیں۔“

”اب آپ تو باہر سے ان کو دیکھتے ہیں نا۔ گھر کا حال آپ کو کیا معلوم۔ اگر گھر کے اندر ایک جوان لڑکی باغی ہو جائے تو اس کا سنبھالنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔“

اتنے میں درانی صاحب دفتر سے آ گئے اور آتے ہی انہوں نے پوچھا۔ ”کیوں میری جان حنیف صاحب کو کسی طرح کی تکلیف تو نہیں ہونے پائی۔“

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ اور بیگم درانی نے اپنے میاں سے..... کہا ”میری جان کوکب کا ذکر تھا۔ میں کہہ رہی تھی کہ اس میں عبید ماموں اور ان کی بیوی کا بھی قصور ہے۔ پرائی لڑکی کو اپنی اولاد کے ساتھ رکھنا بڑی ذمہ داری ہے۔“

"میری جان' ہو گا۔ مجھے خاندانی جھگڑوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"میری جان' آپ ذرا ہاتھ منہ دھو کے آدمی بنئے۔ حنیف صاحب عبید ماموں کے پرانے دوست ہیں۔ مجھے ان سے باتیں کرنے دیجئے۔ حنیف صاحب ہمارے بڑے ماموں جو تھے نا یعنی کوکب کے والد ان کی حیثیت خاندان میں کالی بھیڑ کی سی تھی۔ ان کی یہاں شادی ہو چکی تھی مگر ایران گئے تو وہاں ایک شادی اور کر لی۔ مگر نہ ہندوستانی بیوی کو ایرانی بیوی کی خبر تھی نہ ایرانی بیوی کو ہندوستانی بیوی کی۔"

"میری جان ایسا تو اکثر ہوا کرتا ہے۔" کرنل درانی نے اپنی بیوی سے کہا۔

"میری جان ہوا کرتا ہو گا" بیگم درانی نے اپنے میاں کو خاموش کرنے کیلئے کہا۔ "حنیف صاحب جب ہمارے بڑے ماموں اپنی ایرانی بیوی کو اور ان بچوں کو جن میں کوکب بھی شامل تھی لے کے ہندوستان آئے تب بھانڈا پھوٹا۔ ایرانی بیوی ایران واپس چلی گئی اور کچھ دن بعد مر گئی۔ بڑے ماموں کی نوکری جاتی رہی۔ ان کا خود بھی انتقال ہو گیا اور یہ بچے قضا و قدر کے رحم پر رہ گئے۔ اب آپ بتائیے عائشہ کو اپنے سے اچھے اچھے کپڑے پہنتے دیکھ کر کے کیا کوکب کا دل نہ کہتا ہو گا کہ آج اگر ہمارے ماں باپ زندہ ہوتے تو ہمیں بھی یہی پہناتے۔"

"میں نے دیکھا کہ وہاں کوکب کی بیگم شجاع سے بڑی دوستی تھی۔" میں نے ذرا مصلحت سے اس واقع کا ذکر یوں چھیڑا۔

"جوان لڑکی تھی' محبت کی تلاش میں ذرا بھٹک گئی۔ مگر لاہور میں بورڈنگ ہاؤس میں رہ کے سنبھل جائے گی۔"

کرنل درانی منہ پونچھتے ہوئے پھر آئے اور پوچھنے لگے۔ "حنیف صاحب کیا پئیں گے' وہسکی گیملٹ؟"

"میری جان اب آپ حنیف صاحب سے باتیں کیجئے۔ میں ابھی ذرا بچے کو دیکھ کے آتی ہوں۔ حنیف صاحب جب سے ہمارے خاندان کے جھگڑے سنتے سنتے تھک گئے ہوں گے۔" "میری جان وہ میرا نیا وہسکی کا گلاس آپ کی بلی نے گرا کے توڑ دیا۔"

"میری جان' میری بلی اپنے برتن کے سوا کسی کے گلاس ولاس میں منہ نہیں ڈالتی۔"

○○

نفرت کیوں تھی

اب آپ ہی بتائیے نا، کسی لڑکی کو آپ نے کبھی دیکھا نہ ہو۔ یہی نہیں بلکہ اس کے نام اس کے وجود تک سے بے خبر رہے ہوں۔ پہلے آپ کو اس کے مرنے کی اطلاع ملے۔ خیر آپ افسوس کریں گے۔ ہر نوجوان مرد یا عورت کی بے وقت موت پر افسوس ہوتا ہے۔ اور آپ کو اس کے مرنے کے کچھ دن بعد یہ معلوم ہو کہ وہ آپ سے نفرت کرتی تھی تو بتائیے آپ کیا کریں گے۔

کچھ عجیب واقعہ ہے، مرنا مجھے چاہئے تھا۔ ۲۷ دسمبر کو میں کراچی سے بمبئی جا رہا تھا۔ پاکستان میں ابھی تک ایک بھی ایر ٹریننگ سنٹر قائم نہیں ہوا تھا اور وزارت مواصلات تمام تر الزام مجھ پر عائد کر رہی تھی۔ میں اسی لئے بمبئی جا رہا تھا کہ جو سامان بہت ضروری ہے وہ تو فراہم کر لیا جائے۔ رات کو میں بہت دیر جاگتا رہا، صبح کو بہت سویرے اٹھا۔ کلفٹن سے ایر انڈیا کے دفتر تک راستہ معلوم ہوتا تھا کبھی ختم نہیں ہو گا۔ مسلح پولیس تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی سڑکوں پر پہرہ دیتی پھر رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کراچی میں امن رہا۔ مکان عجیب ہیبت ناک سنسان خاموشی کے عالم میں کھڑے کھڑے سو رہے

تھے۔ روشنی کم کم تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ مسلح پولیس کا ڈر نہ ہو تو کوئی دم میں سینکڑوں قزاق ان بھائیں بھائیں کرتے ہوئے مکانوں سے نکل پڑیں گے۔ چوڑی سڑکیں ویران تھیں۔ اور یہ غور کرنے کا ذرا بھی موقع نہ تھا کہ کراچی کی تعمیر کس سلیقے سے ہوئی۔ یہ نہیں کہ عمارتیں گاجر مولی کی طرح اگ آئی ہوں جیسے لاہور میں یا حیدر آباد میں۔

ایر انڈیا کے دفتر میں ایک صاحب صوفے پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ ایک یہودی ہنگروی اپنے مخاطب سے جرمنی میں بڑی احتیاط سے ہندوستانی سیاسیات پر باتیں کر رہا تھا اور اس کا مخاطب پراسرار طریقے پر اس یہودی ہنگروی سے یہ بھید چھپا رہا تھا کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان۔ سامنے ایر انڈیا کے دفتر کا نائٹ شفٹ کرنے والا کلرک ترازو پر مسافروں کو' ان کے سامان کو تولتا جاتا تھا۔ اور کلرک کی تھکن' رات کی تھکن' کاغذات کی تھکن برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ سندھی ہندوؤں کا ایک چھوٹا سا گروہ اپنے وطن کو خیرباد کہہ رہا تھا۔ میمن تاجر جو اپنا روپیہ کراچی نہیں لا سکتے تھے' کراچی آ کے کسی نہ کسی طرح دوکانیں خرید چکے تھے۔ اور سوچ رہے تھے کہ اب مال اور روپیہ کسی طرح منگوانا ہے۔

دونوں جوانوں کے ساتھ جن میں سے ایک خوش پوش تھا' دوسرا چوڑی دار پاجامے پر چسٹر پہنے تھا ایک لڑکی تھی جس کے بال برومائیڈ سے رنگے ہوئے' ادرک کے رنگ کے تھے۔ یہودی ہنگروی کے مخاطب نے گفتگو کا سلسلہ ختم کر کے کہا۔ "کیا خوبصورت لڑکی ہے۔" خوبصورت دبلی پتلی لڑکی دونوں بدتمیز نوجوانوں کے ساتھ ایر انڈیا والا مشہور نقشہ دیوار پر دیکھ رہی تھی جس میں شملہ میں گورنمنٹ آرام کرتی ہے۔ خیبر پر اہل قبائل گولیوں سے ایک دوسرے پر مشق ناز کرتے ہیں۔ مدراس میں برہنہ تن بابو ٹائپ رائٹر پر انگلیاں مارتا ہے۔ کراچی میں اونٹ گاڑی چلتی ہے۔ خوبصورت لڑکی اسی بدتمیزی سے چیونگم چباتی رہی۔ یو۔ پی کی بے تکلف اردو میں اس نے خوش پوش بدتمیز نوجوان سے کچھ پوچھا۔ چسٹر پوش نوجوان نے بدتمیزی سے کچھ جواب دیا۔ یہودی ہنگروی کے مخاطب نے بے تعلقی سے پائپ جلایا اور بس کے روانہ ہونے کا وقت آیا۔ اور اسی بس میں میں نے مس دارو والا کو دیکھا جو اس دن کے حادثہ میں جل کر خاک ہو گئی۔ کیا خوبصورت لڑکی تھی۔ میں ہر دوسرے تیسرے ہفتے ایر انڈیا سے سفر کرتا ہوں۔ ایسی ہوسٹس شاید ہی کوئی اور ہو۔ وہ اس کی طنز آمیز مسکراہٹ جو سوائے انگریز یہودنوں اور

پارسنوں کے کسی اور کو نصیب نہیں۔ وہ اس کے ماتھے پر چمکتا ہوا تارہ جس کو وہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد سے پیشانی پر ہمیشہ لگاتی تھی۔ چند انگریز ہوا بازوں' اور "سر راہے" قسم کے اعلیٰ انگریز افسروں کے سوا وہ کسی کا زیادہ نوٹس ہی نہیں لیتی تھی۔ یوں البتہ مسافروں کی خاطر کرنے میں اور ہر ہوسٹس کی طرح وہ بھی مشین بن جاتی تھی۔ اور پشاور کے ایک سردار نے کراچی میں ایر انڈیا کی "کتاب الرائے" پر لکھ دیا تھا کہ "مس دارو والا جیسی کچھ اور بلبلیں فراہم کر دی جائیں تو راستہ بہت اچھا کٹے گا" سردار صاحب کے اس ارشاد کے نیچے بمبئی کے کسی مہذب تاجر نے لکھا تھا۔ "یہ شخص بیہودہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کی رائے مت پڑھئے گا۔" آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ ہوائی جہاز کی کمپنیاں کتاب الرائے کیوں رکھتی ہیں۔

تاریکی میں بس چلی۔ محبت کے بغیر' نفرت کے بغیر' ایک میکانکی سپردگی کے ساتھ۔ ڈرگ روڈ ایر پورٹ پہنچی۔ جہاں حیدر آباد سندھ کی طرح روشنی کا تانا بانا بلاوجہ آسمان سے باتیں نہیں کرتا۔ مگر قطار در قطار روشنیاں جگمگاتی ہیں۔ ڈرگ روڈ ایر پورٹ بھی کیا حسین چیز ہے کوئی مجھ جیسے ہوا باز کے دل سے پوچھے۔ اور خصوصاً جنگ کے زمانے میں ــــ کہاں کہاں اترنا پڑا۔ کتنی مرتبہ بال بال بچا یہ روشنی کی خوبصورت قطاریں اور ۱۵ اگست کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ جب میں نے رات کے نو بجے اپنے ہوائی جہاز کی کھڑکی سے کراچی کی روشنیوں کو دیکھا تھا اور پہلی مرتبہ اپنے آپ کو کراچی کی ریت اور سمندر پر سے آتی ہوئی ہوا میں آزاد محسوس کیا تھا۔

چاروں طرف بڑی بڑی ہوائی کمپنیوں کے سائن بورڈ تھے' ان کے چھوٹے چھوٹے دفتر تھے۔ اور مسافر جمع ہو رہے تھے۔ معلوم نہیں کہاں کہاں جانے کیلئے۔ کس کس طرف کے ہوائی جہازوں میں۔ پان امریکن' بی او اے سی۔ ایر انڈیا' اورینٹ' انڈین ایرویز' ٹی ڈبلیو اے۔

ناشتہ کرنے میں بیٹھا ہی تھا۔ اور اطمینان سے اپنے آملیٹ سے توجہ ہٹا کے چیونگم چباتی ہوئی بد تمیز حسینہ کی طرف دیکھ رہا تھا جو اپنے خوش پوش نوجوان ساتھی سے' جو غالباً اس کا شوہر تھا' جلد کراچی واپس آنے کا وعدہ لے رہی تھی۔ بے تعلق ہو کر میں نے پھر اپنے آملیٹ سے چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ کہ اتنے میں مائیکرو فون پر آواز گونجی۔

"مسٹر اوسی، مسٹر اوسی۔ آپ کیلئے ضروری ٹیلی فون آیا ہے۔ ایر انڈیا کے کاؤنٹر پر۔"

میرے لئے اور ٹیلی فون اور کراچی میں اور اس وقت۔ ان میں سے کوئی ایک چیز ناممکن تو نہیں تھی مگر سب چیزوں کا یکجا ہو جانا ناممکن معلوم ہو رہا تھا۔

اور ٹیلی فون پر جو آواز آ رہی تھی۔ "بی اے ٹو ایچ۔ ام کیمونی کیشنز اسپکنگ۔ کون اوسی صاحب ہیں؟ دیکھئے ایچ۔ ام نے کہا ہے۔"

"کس نے۔"

"ایچ۔ ام نے۔ آپ آج بمبئی نہ جائیں۔ آپ سے وہ کچھ ضروری باتیں اور کرنا چاہتے ہیں۔ آج دس بجے آپ دفتر میں ان سے مل لیں اچھا ہوا آپ مل گئے اوسی صاحب۔"

"بھئی یہ وقت بھی کوئی ٹیلی فون کرنے کا ہے۔ مجھ سے شام کو کہہ دیا ہوتا۔"

"رات کو مجھے حکم ملا۔ آپ کے پاس ٹیلی فون نہیں۔ میں نے کہا عین اڑتے وقت آپ کو پکڑ لائیں گے۔ کیئے پھنسے کہ نہیں پھنسے۔"

اتنی اچھی صبح کاذب تھی۔ ہر طرف دھند ہی دھند تھی۔ زندگی اور موت کی طرح غیر متعین اور نامعلوم۔ صبح صادق تک معلوم نہیں۔ یہ باقی رہے گی یا غائب ہو جائے گی۔ کسی غیر مرئی جانور کی طرح۔ اس ٹھنڈی نازک ریشمی صبح کو سندھ کا ڈیلٹا' اور کچھ کاران اور کاٹھیا واڑ کے میدان کتنے خوبصورت معلوم ہوتے' ایچ۔ ایم کو آج ہی مجھے روکنے کی سوجھی۔ بہرحال میں اپنے سامان کو واپس منگوانے کیلئے چلا۔ لکڑی کے میزوں کا ایک مسلسل چوکور حلقہ تھا۔ پولیس کے عہدہ دار نے ہر ایک کو اپنے اپنے سامان کے پاس کھڑے ہونے کیلئے کہا۔ جو سندھی ہندو تاجر سونا باہر لئے جا رہے تھے ذرا دیر کے لئے ان کے دل کی دھڑکن تیز ہوئی۔ پولیس کے عہدہ دار نے تجربہ کار کھلاڑی کی طرح سب کی نفسیات کا اندازہ لگایا۔ اور سامان کھولے بغیر سب کو اطمینان سے جانے کی بشارت دی۔ میں اپنا سامان اٹھوا کے الٹی طرف چلا۔

اور مائیکرو فون چیختا رہا۔ "مسٹر اوسی، مسٹر اوسی" اور پھر یہ —— "بمبئی جانے والے مسافر دروازے سے ہو کر متعلقہ افسر کے ساتھ ایر کرافٹ نمبر فلاں کی طرف

جائیں" کچھ دور ایر انڈیا کے خوبصورت ڈگلس کے پر ہوا میں پھڑپھڑا رہے تھے۔ دروازے پر متعلقہ افسر مسافروں کے ناموں پر نشان لگا رہا تھا۔ اور مسافر عجیب و غریب لباس پہنے ہوئے سندھی، کچھی، میمن، بوہرے، خوجے، پنجابی تاجر جن کا ہوائی جہاز پر محض اسلئے مقام تھا کہ ہندوستان اور مغربی پاکستان کے درمیان ریلیں یا تو چل نہیں رہی تھیں یا اگر چل رہی تھیں تو ان میں جان محفوظ نہیں تھے۔ ایک ریلے کی شکل میں آگے بڑھے۔ اور میں اپنے چھوٹے سے چرمی سوٹ کیس کو ہاتھ میں لئے کھڑا دیکھتا رہا۔ ہوائی جہاز کے قریب متعلقہ افسر نے پھر میرا نام بار بار لیا۔ "مسٹر اویسی، مسٹر اویسی۔"

میں انجان کھڑا دور سے دیکھتا رہا۔ ٹیک آف ہی کے وقت مجھے ذرا سا شبہ ہوا کہ اس ڈگلس ایر کرافٹ کے دونوں انجن ٹھیک نہیں۔ اور دیکھنے میں یہ جہاز اتنا خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ ایسا دلربا، جیسے شبنم میں نہائی ہوئی حسینہ۔

اور پھر چند لمحوں کے اندر فضا میں یہ جہاز شعلہ بداماں ہوا، پھٹ کر پارہ پارہ ہو گیا۔ ایک مسافر باقی نہیں بچا۔

سوائے میرے جو ٹیکسی والے سے حجت کر رہا تھا کہ تم کرایہ کم نہیں کرو گے تو میں بس پر واپس جاؤں گا۔ ایر پورٹ سے میں نکل چکا تھا۔ گھر پہنچ کر مجھے اس حادثے کی اطلاع ملی۔ اس خوبصورت ہوائی تیتری کی تباہی کی۔ دونوں انجن خراب تھے۔ اور موسم بھی بہت خراب تھا۔ وہ دھند ہوا کی دلدل، اس کا راز کسی کو معلوم نہیں۔ حادثے کے اسباب کی جانچ تو خیر حکومت کرے گی لیکن حادثہ خود کتنا مہیب تھا۔ آنا" فانا" سینکڑوں گیلن پیٹرول کا جل اٹھنا۔ ہوا میں ہوائی جہاز کا انار کی طرح پھٹنا۔ مسافروں کی لاشیں، جلی بھنی ہوئی۔ ایسی کہ ان کا پہچاننا مشکل ہو گا۔ مس دارو والا، اس کا حسن اور اس کا پراسرار تبسم۔ سندھی تاجر، میمن تاجر اور چونگ گم چبانے والی بدتمیز حسینہ کا بدتمیز خوش پوش شوہر اور معلوم نہیں کون کون جن کے ناموں کی فہرست میں نے بلا زیادہ دھیان دیئے۔ ایر انڈیا کے دفتر کے سامنے بس پر سنی تھی۔

☆ ☆☆

اب آپ ہی بتایئے کہ میری ایسی جان کو جسے موت تک، حادثہ تک بے ضرر اور

بے کار سمجھ کر چھوڑ دے یکلخت ایسی اہمیت حاصل ہو جائے کہ ایک لڑکی جس سے میں کبھی واقف نہیں تھا۔ جسے میں نے کبھی دیکھا نہیں تھا' جس کے وجود تک سے میں آگاہ نہیں تھا۔ میری اس جان سے نفرت کرنے لگے۔ اور مجھے اس نفرت کا علم اس کے مرنے کے بعد ہو۔ بتایئے میں کیا کروں۔

میں اس مہینے کے شروع میں جب کراچی واپس پہنچا تو معلوم ہوا اس لیبر والی جگہ پر محفوظ علی کا تقرر ہوا ہے۔ میں نے خیال کیا کہ شام کو جا کے اسے مبارک باد کیوں نہ دے آؤں۔ یوں ٹرام کا سفر مجھے اتنا کھلتا ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ لیکن سولجر بازار تک وکٹوریا میں جانا پیسہ پھینکنا تھا۔ اور پیسہ پھینکنا ہی ہے تو محفوظ علی کے تقرر کی خوشی میں اس کو اور اس کی بیوی کو سینما کیوں نہ لے جاؤں؟

مجھے ہمیشہ سے یہ جوڑا عجیب معلوم ہوتا تھا۔ میں نے محفوظ علی کے ایسے خوشرو نوجوان بہت کم دیکھے ہیں۔ اپنی عمر سے پانچ سال کم معلوم ہوتا ہے۔ سرخ و سفید رنگ' ورزشی جسم چھ فیٹ کے قریب قد' وہ چاہتا تو دنیا کی کون عورت ایسی تھی جس سے وہ شادی نہیں کر سکتا تھا۔ پنجاب کا جسم یو پی کا تمدن اور اس کی بیوی۔ معلوم نہیں کون سی خزاں تھی جو اس نوخیز کلی کو بلا کسی وجہ کے کمہلا گئی تھی۔ رنگت اس کی بھی اتنی ہی صاف تھی' اور چہرے کی اداسی' ہونٹوں کی خشکی' اور آنکھوں کی ویرانی کہہ رہی تھی کچھ ہی دن پہلے ہم بھی بہت حسین تھے۔ بہت نازک تھے۔ دونوں میں محبت بھی تھی۔ کم سے کم ہم سب کو یعنی محفوظ علی کے تمام گہرے دوستوں کو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ دونوں میں محبت ہے۔ مگر پھر کیا بات تھی جو بھابھی کو سکھائے دے رہی تھی۔ کسی قسم کا رشک؟ کوئی شبہ؟ یا محض گھریلو زندگی کی سادگی؟

ٹرام کھڑکھڑاتی ہوئی سامنے سے گزری' سڑک پر شروع شام کی چہل پہل تھی۔ لیکن بند روڈ کراچی کی اتنی نہیں۔ چائے خانوں سے لاہور ریڈیو کے گیت بلند ہوئے۔ دہلی کے مہاجرین' بمبئی کے مہاجرین' سندھی' وکٹوریا والے' سب ملے جلے۔ میں نے ہزارویں بار محفوظ علی سے کہا "بھئی تمہیں فلیٹ بہت اچھا ملا ہے۔" اس نے ہزارویں بار کہا "ہاں بہت اچھا ہے۔" اور پھر کشمیر کے متعلق بحث کرنے لگا۔ "یہ اچھی زبردستی ہے چت بھی میری پٹ بھی میری اچھا ہے ہندوستان یو۔ این۔ او میں اپیل کرتا ہے۔ کرنے

دو۔ ہم بھی دیکھ لیں گے۔ مگر چودھری صاحب تو برما گئے ہوئے ہیں.....''

سندھی میٹھے سنبوسے۔ کچھ اور چیز۔ بھابی نے میری طرف بڑھائی کہا ''یہ بھی سندھ کی مٹھائی ہے۔ اس کا نام مجھے یاد نہیں۔''

مجھ سے نہیں رہا گیا۔ میں نے کہا۔ ''آج آپ ہمیشہ سے زیادہ اداس ہیں بات کیا ہے؟''

میاں بیوی دونوں ہنسے۔ مسز محفوظ علی نے کہا۔ ''ہمیشہ سے زیادہ اداس؟ کیا میں ہمیشہ اداس رہتی ہوں؟''

محفوظ علی پھر اس دوسری ناطورہ نازنین کشمیر کا ذکر تازہ کرنے ہی والے تھے۔ یقیناً وہ خوبصورت وادی انہیں اپنی بیوی' اپنی جان سے زیادہ عزیز تھی۔

مسز محفوظ علی نے کہا۔ ''البتہ عائشہ کی بے وقت موت کا ذرا خیال آجاتا ہے تو طبیعت الجھنے لگتی ہے۔''

''کون عائشہ؟'' میں نے پوچھا۔ یوں میں ان کے کسی عزیزی کو نہیں جانتا تھا۔

''میری پھوپھی زاد بہن۔ گزشتہ ہفتہ اس کا دفعتاً'' انتقال ہو گیا۔ حرکت قلب بند ہونے سے۔ کوئی بیس سال کی عمر ہو گی۔''

میں نے بھی افسوس کا اظہار کیا۔ ہر ایک کی جواں مرگی باعث افسوس ہے۔ لیکن یہ اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ تھی کہ میں نے عائشہ کا نام سنا تھا' اور اب' جبکہ وہ مرچکی تھی:۔

☆☆☆

چھ مہینے کے بعد ناہید پھر مجھ سے ملنے آئی تھی۔ اس ویران ہوٹل میں جہاں سے میں کھڑکھڑاتی ہوئی ریلوں کے آنے جانے کا سماں دیکھا کرتا تھا اور حیرت کرتا تھا کہ پاکستان میں کوئلہ کی کمی پر بھی ریلیں اس طرح چل رہی ہیں۔

چھ مہینے سے ناہید سے میں نہیں ملا تھا۔ اور محض مقناطیسی قوت آزمانے کیلئے میں نے اسے ایک چٹھی لکھی تھی کہ ''الوداعی ملاقات کیلئے آجانا ہو تو آجاؤ۔'' چھ مہینے پہلے ۱۵ اگست سے کافی پہلے مقررہ ہفتہ وار ملاقات کیلئے مجھے ظفر علی مینشن سے۔ فلیٹی کے

ہوٹل جانا تھا- شام کو بیڑی کا تار جل گیا- تمام بلب جل گئے- اور میں ٹیکسی لے کے فلیٹی نہیں گیا- مجھے ناہید کے منہ کی بو نہیں پسند تھی- اس سے بہت زیادہ اس کا حد سے زیادہ نخرہ' ہر ملاقات کو مجھ پر اور میری آنے والی سات پشتوں پر احسان سمجھنا ناگوار تھا- ناہید دوسرے دن مجھ سے ملنے ظفر علی مینشن آئی- میں نے ملنے سے انکار کر دیا- اور لکھ دیا کہ جب تک مجھے آپ سے محبت تھی- آپ نخرے کرتی رہیں- اب مجھے خندہ ہائے بے جا کا دماغ نہیں- اس کے بعد چھ مہینے گزر گئے- میں نے ادھر دو تین معاشقوں کی کوششیں کیں- مگر کام اتنا بڑھ گیا تھا کہ عاشقی کی بھی فرصت کم تھی اور میں نے محض مقناطیس کی کشش آزمانے کیلئے ناہید کو ایک چٹھی لکھ دی تھی کہ "میں نے سنا تم بھی کراچی آگئی ہو- میں سلیور نسٹ میں ہوں- الوداعی ملاقات کیلئے آنا ہو تو آ جاؤ-"

وہ آئی اور میرے تمام خطوط واپس کرنے کیلئے اپنے ساتھ لیتی آئی- اس کے ہاتھ میرے ہاتھوں میں الجھ گئے- خطوط میں نے اسی کے پاس رہنے دیئے اور جب اسے ذرا اطمینان ہوا کہ یہ ملاقات آخری نہیں تو اس نے وہی اپنے نخروں اور شکایتوں کا دفتر باز کیا- جس کی وجہ سے مجھے اس سے نفرت سی ہو گئی تھی اور چھ مہینے میں نہ اس سے ملا تھا اور نہ اسے خط لکھنے کی زحمت گوارا کی تھی-

"اوسی' اوسی- سب تمہاری برائیاں کرتے ہیں- کوئی تمہاری تعریف نہیں کرتا- بلاوجہ کوئی کسی کی برائی نہیں کرتا- یقیناً تم میں خرابی ہوئی جبھی تو سب تمہاری برائی کرتے ہیں" وہ برابر بکتی رہی- میں سوچتا رہا کہ اس قسم کی ملاقات سے فائدہ کیا- چھ مہینے کے بعد ملے ہیں تو محبت کی باتیں ہوتیں- اس کے علاوہ مجھے ہمیشہ سے اس کی فکر ہی نہیں رہی کہ لوگ مجھ سے خوش ہیں یا ناخوش- میری تعریف کرتے ہیں یا برائی-

"آخر کس کس نے تم سے میری برائی کی ہے؟" میں نے محض ناہید کو چکارنے کے لئے سوال کیا-

"مثلاً مسز محفوظ علی جب تمہارا ذکر آ جاتا ہے تو بڑی حقارت اور بڑے طنز سے مسکراتی ہیں-" ناہید نے کہا-

"بھابھی؟ نہیں جی- اچھا میں ان سے پوچھوں؟"

"نہیں کہیں ایسا غضب نہ کرنا-" ناہید نے کہا-

میں نے پھر ناہید کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کے چمکارنے کیلئے کہا۔ "دراصل وہ تمہیں دیکھ کے طنز سے مسکراتی ہوں گی۔ انہیں میری اور تمہاری دوستی پر شبہ ہو گیا ہے۔"

ناہید نے زور سے سانس کھینچ کر' دیدے پھیلا کے کہا۔ "قسم کھاؤ۔ تم نے کسی سے ذکر تو نہیں کیا؟"

"نہیں"

"قسم کھاؤ"

"قسم سے نہیں" میں نے کہا۔

"کس کی قسم؟"

"کسی کی سہی۔ میری' تمہاری۔ جس کی کہو اس کی قسم کھاؤں۔ ہاں اور بتاؤں اور کون میری برائی کر رہا تھا!"

"عائشہ۔" ناہید نے کہا۔

"کون عائشہ؟" مجھے اس جوانا مرگ عائشہ کا خیال بھی نہیں آیا۔

"وہی عائشہ جو مر گئی۔" ناہید نے کہا۔

"مسز محفوظ علی کی رشتے کی بہن؟ مگر میں نے تو کبھی اس کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی۔"

"وہ کہتی تھی مجھے اگر کسی سے نفرت ہے تو اویسی صاحب سے۔ دیکھا نفرت کے ساتھ تمہاری عزت بھی کرتی تھی۔ جب ہی تو تمہیں اویسی صاحب کہتی تھی۔ خالی اویسی نہیں کہتی تھی ایسا قابل نفرت آدمی میں نے اور کوئی نہیں دیکھا....." اور ناہید کی زبان گندے سانپ کی زبان کی طرح چلی ہی جا رہی تھی..... اسی لئے تو اس سے مل کر ہمیشہ اگر جسمانی راحت ہوتی تھی تو روحانی اذیت بھی۔

"مگر میں نے تو کبھی اس عائشہ کی صورت بھی نہیں دیکھی۔" میں نے کہا۔

"اس نے ممکن ہے تمہاری صورت دیکھی ہو" ناہید نے طنز سے کہا۔

"کہاں؟"

"یہ مجھے کیا معلوم؟"

"آخر اس عائشہ کو مجھ سے شکایت کیا تھی؟"

"سنا! تم اپنے دوستوں میں بیٹھ کر ڈینگیں مارتے ہو کہ کوئی لڑکی تم سے بچ کے نکل نہیں سکتی۔ تم ہر لڑکی کو پھسلا سکتے ہو۔ وہ مجھ سے یہ کہتی تھی۔"

میں نے اپنے حافظے پر زور دیا۔ بے شک اب سے سال بھر پہلے لاہور کے کاسمو پولیٹن کلب میں بریگیڈیر تمیا کی ایک پارٹی میں جن کے پانچ چھ گلاسوں کے بعد سوشیلا سے میں نے اس قسم کی کوئی بات کہی تھی۔ لیکن اپنے متعلق نہیں۔ میں نے اپنا ایک عام نظریہ بیان کیا تھا کہ عورت میں فطری اثر پذیری اور انفعالیت ہے۔ اور اگر مرد میں جرأت ہو، اور اسے مواقع بہت ملیں تو کوئی عورت اس سے بچ کے نہیں جا سکتی۔

ناہید سے میں نے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ اور سوشیلا مجھے یاد آ گئی۔ "سوشیلا بھوشن۔" ناہید نے کہا۔ "وہ فسادوں کے زمانے میں گجرات میں تھی۔ خدا کرے بچ کے ہندوستان پہنچ گئی ہو۔ ورنہ مغربی پنجاب کے کسی گاؤں میں گرفتار گوبر کے اپلے تھوپ رہی ہو گی۔"

اس ملاقات کے بعد میں نے طے کیا کہ اب ناہید کو چھ ماہ تک دور رکھنے کی ضرورت نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نخروں اور "جفا کاری" کی قسم کی گفتگو کی وجہ سے، وہ بڑی بورنگ تھی۔ مگر کسی نہ کسی سے دوستی کا سلسلہ رہنا چاہئے اور وہ کراچی آ ہی گئی تھی۔ لیکن یہ مجھے کھٹکتا رہا کہ عائشہ جو مر گئی، جس کو میں نے کبھی نہیں دیکھا، جس نے ممکن ہے مجھے کبھی نہ دیکھا ہو، جس کے وجود کا علم مجھے اس کے مرنے کے بعد ہوا، مجھ سے بلا کسی خاص وجہ کے نفرت کرتی تھی۔ محض ایک طائرانہ حماقت کی ڈینگ یا نظریے کی وجہ سے۔

☆☆☆

اور میری کھوج بڑھتی گئی۔ اس اجنبی لڑکی کی اجنبی نفرت۔ اس کی تہ میں کون سی نفسیاتی پیچیدگی تھی۔ کیا اس نفرت کی تہ میں کوئی کشش تھی؟ نفرت کی کشش۔ ایک اجنبی مرد کے عالمگیر دعوے کے خلاف ایک دوشیزہ کا اپنی کمزوری کا احساس؟ یا اپنے عزم اور اپنی طاقت کا احساس؟ کیا نفرت اور محبت ایک ہی سکے کے دو پہلو ہیں جن کا تعلق انسان کے عصبی نظام سے ہے؟ مثلاً میں آج تک تصفیہ نہیں کر سکا کہ بلقیس اور ناہید سے مجھے

محبت زیادہ رہی ہے یا نفرت۔

نفسیات کا وہ کون سا لاسلکی نظام تھا' وہ کون سی لاشعوری لہریں تھیں' جن پر اس نفرت کا تانا بانا تیار ہوا تھا؟ اس مردہ لڑکی سے میری دلچسپی بڑھنے لگی جو جب زندہ تھی مجھ سے نفرت کرتی تھی' اور اس کے وجود سے مجھے اس وقت آگاہی ہوئی جب اس کا وجود باقی نہیں رہا۔

☆☆☆

میں ایک بار پھر محفوظ علی کے پاس گیا۔ ان کی بیوی سے میں نے پوچھا۔ "بھابی آپ کی رشتہ کی بہن وہ لڑکی تھی نا' عائشہ۔ وہی جس کا کچھ عرصہ ہوا انتقال ہو گیا۔ آپ نے کہا تھا حرکت قلب بند ہونے سے اس کا انتقال ہوا۔" میں نے تمہید کا سلسلہ باندھا۔

"ہاں۔" اداس' اداس مسز محفوظ علی نے جواب دیا۔

"مگر اس عمر میں تو بہت کم قلب کا عارضہ ہو سکتا ہے۔ اس کی عمر بیس ایک سال کی تھی نا؟"

"ہاں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" اور پھر مسز محفوظ علی نے ہندوستانی اسلام کی تاویل پیش کی۔ "وقت آ گیا تھا۔ آئے وقت کو کون ٹال سکتا ہے۔"

"لیکن اس کی موت کس طرح واقع ہوئی؟" میں نے پوچھا۔

وہ کہنے لگیں۔ "وہ صحن میں سیڑھیوں پر بیٹھی اپنی اماں سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کی ماں پلنگ پر بیٹھی تھیں۔ گرمیوں کے دن تھے وہ کہنے لگی معلوم نہیں میری طبیعت اندر ہی اندر سے کیسی ہو رہی ہے۔ اٹھی شاید اسلئے کہ پلنگ پر آ کے لیٹ رہے لیکن دو قدم چل کے بے ہوش ہو کے گری۔ پھوپھی نے دوڑ کے اسے اٹھایا۔ مگر روح پرواز کر چکی تھی۔"

یہ کیسی موت تھی کیا یہ خود کشی تھی؟ کیا خود کشی کا کوئی امکان ہو سکتا تھا؟ اور اس کی وجہ؟ اس عمر میں اور خود کشی حرکت قلب بند ہونے سے زیادہ مہمل اور خود کشی کی وجہ؟ صرف ایک کسی سے محبت۔ وہ جملہ جو محبت سے ہار کے دوشیزہ اپنے آپ کو حوالہ کر دینے سے پہلے اپنے چالاک عشق سے کہتی ہے "اب خود کشی کے سوا تم میرے لئے کوئی

راستہ باقی نہ چھوڑو گے۔" لیکن یہ خودکشی کا تصور محض ایک مفروضہ تھا۔ غالباً بالکل غلط۔ میں نے اس کے متعلق اور بہت کھوج لگانے کی کوشش کی۔ ایک ایک سے پوچھا۔ محفوظ علی سے، ان کی بیوی سے، ناہید سے کوئی راز، کوئی معمہ حل نہ ہو سکا۔ وہ کیوں مری کس طرح مری؟ اور جب وہ زندہ تھی تو کیا اسے کسی سے محبت تھی تو کس سے محبت تھی! اور یہ کہ مجھ اجنبی نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ مجھ سے اس کو کیوں نفرت تھی؟

اور سب سے بڑھ کر زندگی اور اسباب و علل کے اندھے سلسلے پر غور کیجئے کہ میں جو عمر بھر جھوٹی محبت کرتا رہا، ہونے والے حادثے اور آنے والی موت سے بچ گیا اور وہ جو سچی نفرت کرتی تھی مرگئی۔

○○

زرّیں تاج

جیپ بہرحال دغا دینے پر تلی ہوئی تھی۔ ہر دس دس گز پر رک رک جاتی۔ بچارا موٹا ڈرائیور محنت کرتے کرتے ہانپتے ہانپتے عاجز آچکا تھا۔ ارشد نے حسین چاندنی رات کی طرف دیکھا۔ یہ خوبصورت سڑک، اس پر بکھری ہوئی چاندنی، کناروں پر یہ اونچے اونچے درخت۔ کتنی محنت سے یہ سڑک تیار ہوئی تھی۔ اور آج جنگ کا پہلا دن تھا۔ بھلا جنگ کو اور جیپ کی اس مسلسل سکرات کو چاندنی رات اور ان حسین درختوں اور اس دوشیزہ سڑک سے ذرا بھی واسطہ تھا۔

موٹا ڈرائیور شیخ احمد بڑے کمالات کا آئینہ تھا۔ ایک چھوٹی سی گلی ڈرینج کے سلسلے میں کئی فٹ کھدی ہوئی تھی۔ اور کنارے سے موٹر تو کجا آدمی بھی بڑی مشکل سے جا سکتا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کے ارشد سے پوچھا تھا۔ "سرکار گلی بالکل کھدی ہوئی ہے۔ پھر کیا حکم ہوتا ہے۔ گاڑی کو لے چلوں۔" آج انجن کے پیچھے اس کے ہانپ ہانپ جانے پر ارشد کو ترس آرہا تھا اور غصہ بھی۔ دور پر کوئی ریل گاڑی کھڑ کھڑ کرتی گزر جاتی۔ لیکن ہر طرف سناٹا تھا۔ دور دور کسی آدمی کا سراغ نہیں، کوئی گھر نہیں۔ مذاق تو نہیں تھا۔ آج

جنگ کا پہلا دن تھا۔ سب جگہ بلیک آؤٹ تھی۔ لیکن چاند نے اپنا ٹھنڈا سا چراغ آسمان پر جلا رکھا تھا اور سوئی ہوئی زمین پر انسان یا سنہرے خواب دیکھ رہے تھے یا ایک دوسرے کو تباہ کرنے میں اسی روشنی سے مدد لے رہے تھے۔ یہ عجیب طرح کی ٹھنڈی روشنی ہے' چاند کی روشنی جس سے دو طرح کے جنون کی قندیلیں جلتی ہیں۔ جنگ کے جنون کی اور عشق کے جنون کی۔

اتنے میں اوپر سے گھرگھڑاہٹ کی آواز آئی۔ ارشد نے اپنے دل میں کہا امجد بھائی نے آج دعوت کیلئے کیا اچھا دن چنا تھا.... چاندنی میں سڑک کے کنارے کے حسین درخت جیپ کو چھپا نہیں سکتے تھے اور اگر کہیں یہ بدشکل سا کپڑا اوپر سے ہوا باز کو نظر آگیا تو..... موت آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ اس نے شیخ احمد کو جلدی سے چھپ جانے کیلئے کہا۔ وہیں کہیں جھاڑیوں میں' اور خود تیزی سے سڑک کے کنارے کنارے چاندنی سے بچتا ہوا قد آور درختوں کے سائے میں پناہ لیتا وہ لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگا۔ اب دور پر..... چشم زدن میں نزدیک ایک تیز نیلا سا ستارہ دکھائی دیا' اور پھر سڑک کے بالکل قریب تقریباً پانچ سو فٹ اوپر اس تیزی سے ہوائی جہاز اڑتا چلا گیا گویا اس کی ٹوپی کو گراتا ہوا گزر گیا۔ اس کے دل کی دھڑکن ایک منٹ کیلئے رک گئی۔ جسم نے تھرتھری سی لی۔ جیپ کے قریب ہی ایک شعلہ سا بلند ہوا۔ ایک سرخ سا گولہ زمین پر پھٹا اور شعلہ بلند ہوا' سرخ شعلہ۔ "سرخ پیاز" اس نے اپنے دل میں کہا۔ ہوائی جہاز نے جیپ کو مشین گن نہیں کیا تھا۔ اسے بعد میں معلوم ہوا کہ ہوائی بیڑے شہریا اس کے اطراف کسی طرح کی بمباری وغیرہ کی سخت مخالفت تھی۔ اب ہوائی جہاز بہت دور جا چکا تھا۔ شہر کی طرف۔ اس نے پلٹ کے شیخ احمد کو پکارا۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ الٹے پاؤں وہ جیپ کی طرف واپس ہوا۔ شیخ احمد جھاڑیوں سے نکل کے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس نے پھر انجن کا رخ کیا۔ اور اس خوف کے باوجود اس کی ہمت پر ارشد کو تعجب ہوا۔ "میں پیدل چلتا ہوں۔ تم گاڑی کو یہیں چھوڑ دو۔ چلے چلو۔"

"آپ جائیے سرکار۔ میں تو اس گاڑی کا نوکر ہوں اس کو لے کر ہی آؤں گا۔"

اسے پھر تعجب ہوا۔ ہوائی جہاز کی گڑگڑاہٹ پھر معلوم ہوئی۔ دیکھ بھال کی اڑان کے بعد اب وہ دوسری طرف سے واپس جا رہا تھا۔ بہت دور پر۔ اور اب بہت اوپر۔ نیلا

ستارہ گھڑگھڑاہٹ کی طرح مدھم ہوا پھر غائب ہو گیا۔ دونوں نے پھر بیمار جیپ کی طرف دیکھا اور ارشد نے گیبرڈین کے پتلون کی جیبوں میں ہاتھوں کو گرم رکھنے کے ارادے سے گھسیٹر کے سیٹی بجانے کی کوشش کی۔ مگر فارسی اشعار تھے کہ بادلوں کی طرح امنڈتے یاد آتے چلے جاتے تھے۔ اس نے حسین رات کی طرف دیکھا۔ معشوقوں کی طرح، عجمی شاعری کے معشوقوں کی طرح، دل ربا اور خونریز معشوقوں کے رخ زیبا جیسا چاند، ان کی آنکھوں کی طرح چمکتے ستارے۔ ان کی زلفوں کی طرح سیاہ درختوں اور چٹانوں کے سائے۔ ان کی پلکوں کی طرح سڑک کے کنارے کے صف بستہ درخت۔ ان کی حنائی انگلیوں اور سرخ ہونٹوں کی طرح سرخ سرخ---- اور اسے جنگ پھر یاد آگئی اور وہ ہوائی جہاز جو ابھی ابھی گزرا تھا---- دور پر ایک موٹر گزری۔ اس وقت اور اس رات اس کے سوا کسی اور بے وقوف کی شامت آئی تھی۔ جہاں سے موٹر گزری وہاں چوراہہ ضرور ہو گا۔ چوراہہ ضرور تھا۔

اس رات کو معشوق کی حنا آلودہ ہتھیلی اور سرخ ہونٹوں کی طرح سرخ خونریز کوئی مرئی چیز نہیں تھی۔ ٹینکوں اور توپ خانے کی گھن گرج ابھی سینکڑوں میل دور تھی، تیزی سے ہوا پر صرف موت کے آہنی فرشتے آ سکتے تھے اور ان کو دیکھ کر سائرن کی وہ تیز، خون کو منجمند کر دینے والی آواز۔ ایک مسلسل فریاد، ایک مسلسل کراہ وہ جو نعرے لگاتے ہیں، وہ جو دوسروں کی رہنمائی کرتے ہیں، وہ جو دوسروں کی رہنمائی میں چلتے ہیں ذرا دیکھ بھی لیں کہ جنگ کیسی ہوتی ہے۔

کیا ہو گا؟ آج صبح سے اس کے ذہن نے تصفیہ کر لیا تھا کہ وہ اس کا جواب نہ دے گا۔ ایک اور چوراہہ پر آج دوپہر کو ایک طرف سے تیز، بہت تیز ایک فوجی لاری آ رہی تھی، ایک آدمی آر پار جانے والی سڑک سے تیزی سے سائیکل پر چلا آ رہا تھا۔ ارشد نے بڑی حماقت سے اپنے حق میں پشین گوئی کی۔ "اگر اس فوجی لاری سے یہ سائیکل ٹکرائی تو میں بھی اس جنگ میں ختم ہو جاؤں گا۔" لیکن سائیکل نہیں ٹکرائی۔ فوجی لاری سائیکل کو اور سائیکل فوجی لاری کو جل دے کر نکل گئے۔ آنکھ مچولی میں تھوڑی دیر کے لئے زندگی موت سے جیت گئی۔

آدمی نہ آدم زاد۔ اور ابھی رات کے دس ہی بجے تھے۔ شہر سے صرف سات میل

دور۔ جیسے طلسم ہوشربا کا کوئی شاہزادہ کسی طلسمی جنگل میں چلا جا رہا ہے۔ حشرات الارض کی ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔ جھینگروں کی' سانپوں کی' اور دور دور کتوں کی۔ ابھی بہت دور تک کوئی مکان نہیں تھا۔ ایک فیکٹری کے چراغ بہت فاصلے پر نظر آ رہے تھے۔ لیکن باہر سے چاندنی کفن کی طرح اسے بھی لپیٹے تھی۔

اور دفعتاً" چاندنی اسے بڑی ہی دلکش معلوم ہوئی' خواب کی طرح' عشق حقیقی کی طرح' ذرا ذرا سے سلجھے ہوئے جنوں یعنی جنون ذی فنوں کی طرح۔ اور اسے سڑک پر اپنے جوتوں کی چاپ کچھ عجیب معلوم ہوئی جیسے کوئی اس زندگی میں نہیں کسی اور زندگی میں چل رہا ہے' جیسے وقت کی طنابیں گر گئی ہیں۔ جیسے وہ ماضی میں یا مستقبل میں چل رہا ہے اور حال معدوم ہے۔ جیسے وہ مردہ ہے.....

اور اگر کہیں یہ سچ ہو۔ وہ ہوائی جہاز جو اس قدر نیچے سے گزرا تھا۔ فرض کرو کہ اس نے "سرخ پیاز" نہیں گرایا تھا۔ وہ ایک بم تھا۔ جیپ' شیخ احمد اور وہ خود سب مر چکے ہیں۔ فنا ہو چکے ہیں۔ وہ اس سڑک پر چلا جا رہا ہے کہ اس زندگی اور اس زندگی میں تسلسل ہے۔ یا یہ محض اسی کی یاد اسی کا سلسلہ ہے....

اور معلوم نہیں یہ کون ہے جو اس کے ساتھ چلا آ رہا ہے۔ برفانی قطب جنوبی کے سیاحوں کا زائد ساتھی۔ ٹی ایس ایلیٹ والا "یہ تیسرا کون ہے۔" یہ کون ہے جو اس کے ساتھ چلا جا رہا ہے۔ وجود سے عدم' عدم سے وجود کی طرف۔ جیسے ماضی اور حال اور مستقبل کی سرحدیں مٹ گئی ہوں' جیسے۔

یہ قدموں کی چاپ' یہ جوتوں کی چاپ۔ یہ اس کی اپنی رفتار کی نشانی ہے۔ وہ اپنے گھر جا رہا ہے' پیدل۔ کیونکہ جیپ خراب ہو گئی ہے اور بیچارہ شیخ احمد اب بھی اس کے انجن سے گتھا ہوا ہے۔ مگر یہ چاندنی رات اس قدر دلکش' اور حسین اور یہ سڑک' یہ چاندنی رات میں نہائی ہوئی دوشیزہ۔ یہ درختوں کے سائے' یہ کالی کالی زلفیں.....

اور وہ جس کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی' وہ دوسرا ساتھی' چاندنی رات میں اس ویران حسین سڑک پر اس کا ہم سفر' اس کی ہم سفر..... اس نے چاند کی طرف دیکھا اور پھر اپنی حسین ساتھی کی طرف۔

"تم نے مجھے نہیں پہچانا۔ میں زریں تاج ہوں۔"

اس نے بیسیوں زندہ عورتوں سے عشق کیا تھا' ہوس آرائی کی تھی' تفریح کی تھی' کشش محسوس کی تھی۔ کبھی ہوس کا خاتمہ عشق پر ہوتا' کبھی عشق کا ہوس پر۔ اور ہمیشہ اس کا باعث یہ ہوتا کہ دونوں لاکھ کوشش کرتے۔ "دوئی" فنا نہ ہوتی۔ دونوں ایک معاشی عمرانی نظام کی پیداوار ہوتے' اور یہ نظام ان کے راستے میں سنگلاخ مزاحمتیں' کانٹوں کی جھاڑیاں' دیوہیکل چٹانیں حائل کرتا جاتا۔ جن سے ہوس عشق بن جاتی اور کبھی یہ مزاحمتیں غائب ہو جاتیں تو عشق ہوس ہو جاتا۔ اور پھر ہوس کے بعد تھکن اور پھر عذر واماندگی اے حسرت دل...... اور پھر یہی سلسلہ۔

ایک دن اس نے اکتا کے کہا تھا اب میں کسی ایسی عورت سے محبت کروں گا جسے مرے صدیاں ہو چکی ہوں گی۔ ایک دن انسان ماضی میں سفر کر سکے گا۔ اس دن اس کے ساتھ بھی یہی مسائل پیدا ہوں گے لیکن ابھی تو یہ ممکن نہیں۔

زریں تاج کو مرے سو سال کے قریب ہونے کو آئے ہیں۔ اور اس شاعرہ کا کلام پڑھ کے جس نے باپ کو دیکھنے سے پہلے اس کی تعریف اور اشتیاق میں دنیا کی دو حسین ترین نظمیں لکھی ہیں۔ اس نے زریں تاج کو مخاطب کر کے کہا۔

"ان تمام عورتوں میں جو مر چکی ہیں مجھے سب سے زیادہ تم سے محبت ہوئی ہے۔ اگر کبھی حال ماضی کی طرف جا سکا یا میری روح تمہاری روح کے جمال کا دیدار کر سکی۔ اگر یہ بھی نہ ہو تب بھی دوران محض میں' مرور خالص میں..... میں تم سے مخاطب ہوں گا اور تم سے اپنی اس محبت کا اظہار کروں گا جو عشق سے' ہوس سے' خواہش سے' ادراک سے' جواب سے ماورا ہے۔"

آج اس چاندنی میں لٹی ہوئی حسین' ویران تنہا سڑک پر ایک اجنبی ساحرہ کی طرح وہ اس کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ اس پل صراط پر۔ زندگی سے موت کی طرف..... صدیوں کے آر پار۔ اور پھر اس نے زریں تاج کی طرف دیکھا۔ اس نے نقاب الٹ دیا تھا' یوں اس کا لباس سیاہ تھا' خلجی عورتوں کی طرح' ایسا لباس جیسا کہ شاید اس نے محمد علی بار فروش کے ساتھ کجاوے میں پہنا ہو گا۔ اور اس کا چہرہ چاندنی میں جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا یہ موت کی' کافور کی چمک تھی۔ ایک حسین آسیب الفت کے چہرے کی چمک۔ جیسے ملکہ کو کاچین کی مہکی ہوئی لاش کا مارکو پولو کے نام یہ پیغام۔

"یہ کہہ دینا کہ میں نے محبت کی اور مر گئی- اب میں محبت ہوں اور زندہ ہوں- اور چونکہ زندہ ہوں بھول گئی- اور چونکہ محبت کرتی ہوں معاف کر دوں گی-"

تب ارشد نے اس طرح جیسے کوئی سلسلہ خیال سے چونک پڑتا ہے- جیسے کوئی خواب میں خواب سے بیدار ہوتا ہے' جیسے کسی نے ابھی ابھی آنکھ کھولی ہو' کہا- "تم ملکہ کوکا چین ہو- تم زریں تاج ہو-"

اور اس کی ہم راہ حسینہ ہنسی- "کوکا چین نہیں وہ چینی تھی- وہ تو صرف عجم بیاہ کر آئی تھی- میں زریں تاج ہوں میں عجم کی نسوانیت ہوں جو صدیوں میں ایک آدھ مرتبہ انگڑائی لے کر اٹھتی ہے' اور مردوں کو ششدر کر دیتی ہے- وہ پہلے مجھے دیکھ کر عش عش کرتے ہیں- پھر محبت کرتے ہیں' جس کے معنی زیادہ تر یہ ہوتے ہیں کہ بڑی سے بری قیمت دے کر وہ میرا جسم حاصل کرنا چاہتے ہیں- شہنشاہ مجھے موتیوں میں تولنا چاہتا ہے- فن کار خون جگر میں اور مزدور مجھے دیکھے بغیر چپکے سے گزر جاتا ہے- اور اگر وہ محبت میں کامیاب نہیں ہوتے تو پھر مجھے مار ڈالنا چاہتے ہیں' اپنی رقیب سمجھ کر- اور جب میں مر جاتی ہوں تو سینکڑوں برس میری پرستش کرتے ہیں' اب تم نے مجھے پہچانا-"

پھر سائرن کی خوفناک ہسٹریائی چیخ نے فضا میں لہرانا شروع کیا- رات نے ایک جھرجھری لی' چاندنی کانپ گئی' سب درختوں اور ان کے سایوں کو فالج مار گیا- دور پھر ایک ہوائی جہاز کی گڑگڑاہٹ سنائی دی- پھر ایک نیلا ستارہ چمکا- پھر کتے بھونکے' جھینگروں کے گانے میں خلل نہیں آیا- اور ارشد نے سیدھے ہاتھ کی طرف دیکھا- زریں تاج برابر اس کے ساتھ چلی جا رہی تھی- موت اور حیات کی درمیانی شاہراہ پر' پل صراط پر' چاندنی کے برزخ میں-

دور پر ہوائی جہاز نے پھر "سرخ پیاز" پھینکے' زمین سے ٹکرا کے پھر سرخ شعلے اٹھے- پھر ہوائی جہاز نے شہر کے اطراف ایک چکر لگایا-

اور وہ چاندنی سے زیادہ خوبصورت تھی' چاندنی سے زیادہ حسین' ایرانی شاعری کی روح کی طرح جمیل' اس کے لب لعلین چاندنی رات میں چمک رہے تھے- سینکڑوں میل دور ٹینکوں سے سچ مچ کا خون بہہ رہا ہو گا' اور سچ مچ کے پناہ گزیں غنڈوں کے ہاتھ لٹ رہے ہوں گے اور سچ مچ کی عورتیں اپنی عزت--- زمانہ امن کا تصور--- بچانے کیلئے

کنوؤں اور باولیوں میں گر رہی ہوں گی۔ مگر یہاں تو ابھی تک صرف ہوائی جہاز کی گڑگڑاہٹ سنائی دیتی تھی۔ پل صراط کے اس پار تک' جس پر سے گزرتے ہوئے زریں تاج نے پوچھا۔ "اپنی کہانی سناؤں؟"

اب ہوائی جہاز جا چکا تھا۔ اب پھر رات کے پرانے محرم راز کتے' سانپ اور جھینگر باقی رہ گئے تھے اور انسان کھڑکیوں کے شیشوں پر سیاہ کاغذ لگائے حشرات الارض کی طرح چھپے ہوئے تھے۔

اور چاندنی رات میں زریں تاج حد سے زیادہ حسین معلوم ہو رہی تھی۔ اپنے آپ سے ارشد نے اس طرح کہا گویا اسے زریں تاج کے ساتھ ہونے کا یقین نہیں آیا۔ "میں نے دیکھے بغیر تجھ سے محبت کی کاش مرنے سے پہلے ایک بار تجھے دیکھ لیتا۔"

مگر وہ تو اس کے ساتھ پل صراط پر چل رہی تھی۔ چاندنی رات میں۔ اور وہ مسکرائی۔ چاندنی رات میں چاند چمکا اور موتی بکھر گئے۔

اور ارشد نے اس کی طرف نظر بھر کے دیکھا گویا وہ پہلی مرتبہ چاند کو دیکھ رہا تھا۔ اسے نہیں دیکھا مگر کتنی بار دیکھا ہے۔

تب زریں تاج کا کالا طلسمی حوروں کا سا لباس چاندنی رات میں یک لخت چمکا جیسے سڑک پر پڑا ہوا شیشے کا ایک ٹکڑا چمکا اور اس نے اپنا قصہ سنانا شروع کیا۔

(۲)

میرا نام سیرا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ میں یونان سے ایران آئی۔ لیکن میرے خون کے ایک ایک قطرے میں عجمیت ہے۔ مجھے ایرانیوں نے شیریں کہا اور مجھ میں ایرانی نسوانیت کی مٹھاس بھر دی۔

میں رومی نژاد تھی' عیسائی تھی' مجھے کسی افسانہ نگار نے ماریس شہنشاہ کی بیٹی قرار دیا۔ کسی نے مہین بانو کی' لیکن میں ایرانیت میں اس قدر کھو گئی کہ نہ مجھے اور نہ کسی اور کو میرے اجنبی ہونے کا احساس تھا۔ مجھے ایران نے شیریں بنایا اور میں نے ایران کو اس کا سب سے پیارا افسانہ عشق دیا۔

خسرو نے رومیوں سے ہزارہا عورتیں چھینیں' ہزاروں کو بیوہ کیا۔ اس کے سپاہیوں

نے ہزاروں کو بے آبرو کیا۔ یہ اس زمانے کا دستور تھا۔ تمہارے ملک میں اب تک یہی ہوتا ہے۔ میں تاریخ سے گھبراتی ہوں جو اپنے آپ کو نہیں دہراتی مگر اپنی سیہ کاریوں کو ضرور دہراتی ہے۔ اس لئے نظامی گنجوی کے ساتھ ساتھ چلو۔

میں مہین بانو کی تربیت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہوں۔ مجھے شہسواری آتی ہے' شکار کھیلنا آتا ہے' راویوں سے کہانیاں اور نظمیں سننا آتا ہے۔ میں مکالات عشق میں ماہر ہوں' اور اپنی سہیلیوں میں اس طرح دمکتی ہوں جیسے تاروں میں چاند۔ خسرو' جس کو اس کے مردانہ حسن کی وجہ سے سب پرویز کہتے ہیں' میرے حسن جمال کی تعریف سنتا ہے' مجھ پر نادیدہ عاشق ہو جاتا ہے۔ اور مجھے ڈھونڈنے شیرویہ کو بھیجتا ہے۔ گویا شہزادہ "دل" ہے جو "نظر" کو میری تلاش میں روانہ کرتا ہے۔

اور میں شکار کھیل رہی ہوں' اپنے تیر مژگاں سے ہرنوں کا شکار اور اپنی ہرنوں جیسی آنکھوں سے دلوں کا شکار۔ میری سہیلیاں میرے ساتھ ہیں' جنہیں مہین بانو نے میری دلجوئی' میرا دل بہلانے اور میری نگرانی کے لئے مقرر کیا ہے۔ شیرویہ آتا ہے۔ دل کا چالاک وزیر خسرو کا چالاک وزیر اور پتھر پر اس کی تصویر بنا دیتا ہے۔ میں مبہوت رہ جاتی ہوں۔ سہیلیاں کہتی ہیں۔ "شیریں' شیریں تو خواب دیکھ رہی ہے' یہ طلسمات کا جنگل ہے۔" اور ہم سب وہاں سے آگے چلتے ہیں کسی اور جنگل میں جو زلفوں کی طرح تاریک ہے' جس میں صبا تک اچھی طرح شانہ نہیں کرتی اور یہاں مژگاں کو پھر ہرنوں کی نئی ڈار' نئے 'بسملوں' نئے مقتولوں کی تلاش ہوتی ہے۔ مگر وہ چالاک وزیر شیرویہ' بزرگ مہر کا خسر پھر آتا ہے' پھر پتھر پر ایک تصویر بناتا ہے۔ میں پھر محو ہو جاتی ہوں۔ گویا میں خواب میں چل پھر رہی ہوں۔ سہیلیاں پھر تاڑ جاتی ہیں کہ اس نقش کا رنگ گہرا ہو رہا ہے مجھے پھر وہاں سے لے چلتی ہیں۔ ایک اور صحرا اور زلفیں اور ہرنوں جیسی آنکھیں' مژگاں کے اور سوفار ابروؤں کی اور کمانیں۔ لیکن شیرویہ پھر آ پہنچتا ہے اور ایک چٹان پر پھر خسرو کی تیسری تصویر بنتا ہے۔ اب میرا دل اپنے قابو میں نہیں رہتا مجھے فارسی شاعری کی ایک روایت کو جنم دینا ہے۔

عشق اول در دل معشوق پیدا میشود

مجھے اس شہریار سے دل و جان سے محبت ہو جاتی ہے جس کی یہ تصویر تھی۔ اس مرتبہ مہین بانو کی سکھائی ہوئی سیلیاں مجھے بہلا نہیں سکتیں، جل نہیں دے سکتیں۔ وہ پتھر کا نقش میرے دل پر مرتسم ہو چکا ہے۔ میں چپکے سے ان کو چھوڑ کے نکل پڑتی ہوں۔ میں شہسوار ہوں۔ یہ صفت میں نے تاتاری معشوقوں سے لی اور ایرانی نازنینوں کو عطا کر دی۔ راستے میں چشمہ ملتا ہے۔ چشمہ آب حیواں، چشمہ نرگس، چشمہ آب حیات، چشمہ تسلسل حیات۔ یہاں میں گھوڑے پر سے اتر پڑتی ہوں۔ اپنے کپڑے اتارتی ہوں۔ میں شاعروں کا سراپا بن جاتی ہوں۔ میری سیاہ زلفوں میں راتوں کی تاریکی اور سانپوں کا رنگ ہے۔ اور یہ زلف حبل المتین بھی ہے۔ میری آنکھیں نرگس ہیں، میری پیشانی چاند، میرے ہونٹ عقیق و لعل، میرے دانت موتی، میرے شانے آئینے اور پھر نازپستاں، موئے کمر، ساق سیمیں۔ میں جب ٹھہر جاتی ہوں سرو ہوں اور جب چلتی ہوں قیامت۔ یہ کیا غضب ہے کہ تمہارے شاعروں نے میرا سراپا تو یاد رکھا مگر مجھے بھول گئے۔

اور داستانوں کے شہزادوں کی طرح خسرو پرویز بھی اس چشمے پر آنکلتا ہے۔ بہرام کو شکست دینے کے بعد ہمارے افسانے میں کوئی مقام نہیں، کوئی موسم نہیں، کوئی دیار نہیں۔ زمین زمین ہے اور آسمان آسمان ہے۔ خسرو چشمے میں پہلے میرا عکس دیکھتا ہے، پھر میری جانسوز عریانی دیکھتا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ مجھ تک پہنچ سکے۔ میں اپنا تن ڈھانک کے، اپنے بادپا ہوا پر سوار ہو کے اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہوں۔ مگر اسے اپنی نظروں سے گھائل کر کے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے.....

اور وہ شیرویہ کو مہین بانو کے پاس بھیجتا ہے۔ اس کی دال نہیں گلتی۔ مہین بانو مجھے سمجھاتی ہے کہ جو آسانی سے حاصل اور آسانی سے فنا ہو گیا وہ ہوس ہے۔ اور وہ جو مشکل سے حاصل ہوا اور کبھی فنا ہوا، کبھی فنا نہیں ہوا عشق ہے۔ اور وہ جو بڑی مشکل سے حاصل ہوا اور کبھی فنا نہیں ہو گا عرفان ہے۔ اور وہ مجھے سمجھاتی ہے کہ ایرانی خواتین میں سے وہ جن کا صدیوں میں ایک آدھ بار بروز ہوتا ہے آسانی سے اپنے آپ کو اپنے عاشق کے حوالے نہیں کرتیں۔ عشق کی بجلی ٹھوکروں سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے "جفا" کی ضرورت ہے، جس کے بغیر "وفا" پیدا نہیں ہوتی۔ میں یہ سب سنتی ہوں، یہ سب مان لیتی ہوں کیونکہ مجھے تمہاری عجمی شاعری کی روایتوں کی تخلیق کرنی ہے۔ خسرو مجھ تک پہنچنا

چاہتا ہے۔ اور میں اسے پہنچنے نہیں دیتی۔ شیرویہ آتا ہے۔ اور ناکام واپس جاتا ہے۔ اب مہین بانو مرچکی ہے۔ اس کی جگہ میں اپنی اقلیم کی ملکہ ہوں۔ خسرو پرویز دیار عشق کا شہریار ہے۔ میں دیار حسن کی ملکہ ہوں۔ زاری، زر، زور کوئی طاقت مجھے آسانی سے حاصل نہیں کرسکتی۔

اور جب وہ مجھے پا نہیں سکتا تو شکر سے دل بہلانے لگتا ہے۔ تم جانتے ہو یہ شکر کون ہے۔ یہ عورت کا جسم ہے اور میں جو شیریں ہوں عورت کی روح ہوں۔ ایرانی عورت کی۔ شکر حرم میں داخل ہو سکتی ہے۔ میں یا ملکہ عالم ہو کے رہ سکتی ہوں یا پھر بجھا دی جاتی ہوں۔ خسرو شکر سے دل بہلاتا ہے۔ مگر شکر بھی اسے آسانی سے نہیں ملتی۔ وہ خسرو پرویز کو شراب کے نشے میں بدمست کر دیتی ہے اور ایک بدہیئت کنیز کو اپنی جگہ اس کے پاس بھیج دیتی ہے۔ جسم جسم سب برابر ہیں۔ یہاں تک کہ جب نشہ اترتا ہے تو خسرو پرویز کو غصہ آتا ہے۔ جسم جسم کا فرق اس پر ظاہر ہوتا ہے۔ وہی سراپا والی بات۔ اور شکر اسے مل جاتی ہے۔ لیکن میں جو شیریں ہوں۔ عجمی نسوانیت کی روح اس سے اب بھی دور ہوں، بہت دور۔ وہ اگر اپنے ملک کا بادشاہ ہے تو میں اپنے دیار کی ملکہ، اور زاری، زر، زور کسی کی مجھ تک پہنچ نہیں۔ زاری البتہ کبھی کبھی میرے کنگرہ بام سے ٹکرا جاتی ہے۔ مگر میرے سکون و اطمینان میں فرق نہیں آتا۔ میں شیریں ہوں۔ عجمیت کی روح کو کوئی خرید نہیں سکتا۔

نظامی نے بڑی بڑی غلطیاں کی ہیں۔ دربار کی پلی ہوئی شاعری سے اور توقع ہی کیا ہے۔ فرہاد کا قصہ بیچ کا نہیں بعد کا ہے، میں اسے بعد میں بیان کروں گی۔ اب خسرو پرویز میرے دیار میں آنا چاہتا ہے، دیار جمال میں۔ اس کی سپاہ، میرے دارالسلطنت میرے قلعے کے اطراف حیران کھڑی ہے۔ وہ خندق کے پاس کھڑا ہے، منت و زاری کر رہا ہے۔ میں ایک جھروکے میں نمودار ہوتی ہوں۔ وہ اندر آنے کی اجازت چاہتا ہے اور یہ اجازت اسے نہیں ملتی۔ وہ حجت کرتا ہے اور میں اس کی ہر حجت کا جواب دیتی ہوں۔ وہ وفا جتاتا ہے۔ میں اسے شکر کے عشق کا طعنہ دیتی ہوں۔ وہ مجھے جفا پر ملامت کرتا ہے، میں اسے جفا کے معنی سمجھاتی ہوں۔ اور اسی طرح سوال و جواب ہوتے رہتے ہیں۔ آنکھوں کے جھروکوں سے حواس خمسہ سے۔ کھیتوں کی بجلی سے۔ اور میں اسے اندر آنے کی اجازت

دیتی ہوں تو وہ مجھے مسحور کرنے کیلئے اپنی واردات دل باربد کی زبانی سنواتا ہے، میں نکیسا کی زبانی اس کا جواب سنواتی ہوں۔ روح کی فصیل میں جگہ جگہ شگاف ہیں، جن میں اس کا امڈتا ہوا لشکر داخل ہو چکا ہے۔ مگر قلب میں کوئی چیز محفوظ ہے۔ ایک زمہریر ہے جسے کوئی گرما نہیں سکتا، پگھلا نہیں سکتا کیونکہ میرا جوہر ایسا تھا کہ اسے کوئی خرید نہیں سکتا۔ خسرو پرویز نے مجھے خرید لیا، میری جنس خرید لی، میرا حسن خرید لیا، میری ہوس خرید لی۔ میری نسوانیت خرید لی۔ مگر اب بھی قلب میں ایک مقام ایسا تھا جہاں وہ پہنچ نہ سکتا تھا۔ "ہزار افسانہ" کے چالیس دروازوں والے قصر کی طرح میں نے ان میں سے انتالیس دروازوں کی کنجیاں اس کے حوالے کر دیں اور چالیسویں دروازنے کی کنجی اس کے حوالے کرنا میرے بس کی بات نہ تھی، حالانکہ اس کی محبت، اس کا جسم، اس کی وجاہت جس نے اسے پرویز کا خطاب دلوایا مجھے بہت عزیز تھی۔

یہ چالیسویں کنجی کسی اور کے قبضے میں چلی گئی۔ میں نے نہیں دی۔ خود بخود چلی گئی۔ کیونکہ ان معاملات پر کسی کا اختیار نہیں اور جس شخص کے پاس یہ کنجی گئی اس کا نام فرہاد تھا۔ وہ ایک مہندس تھا۔۔۔ اس کا ترجمہ اپنے زمانے کی زبان میں چیف انجینئر نہ کرنا۔۔۔ اس زمانے میں دو ہی طبقے تھے۔ ایک امیر اور دوسرا غریب۔ اور مہندس مزدور تھا۔ میں تم سے کیا کہوں۔ میرا فرہاد نظامی کا فرہاد نہیں تھا۔ وہ شیرویہ کی ضد تھا۔ وہ مزدک کا مظہر جمال تھا۔ اس کے اعصاب پتھر توڑتے توڑتے فولاد کی طرح مضبوط ہو گئے تھے اور اس کے چہرے پر عشق کے درد کے ساتھ بھوک کا جلال تھا۔ لیکن پرویز سونے سے اس کی بھوک نہ بجھا سکا۔ وہ اس کے عشق ہی کا ایک حصہ تھی۔

بقیہ قصہ تو تم کو معلوم ہے۔ میری زبانی میرے رنج و درد کی کہانی سن کر تم کیا کرو گے۔ جب دیکھا کہ اس کے عشق سے بدنامی ہو رہی ہے، اور جب دیکھا کہ میں اپنا دل ہار چکی ہوں، تو وہ شہنشاہ جس کے لشکریوں نے لاکھوں کا خون بہایا تھا اپنے آپ میں اتنی جرات نہ پیدا کر سکا کہ اس مزدور کو قتل کر سکتا۔ شیرویہ کا بھی یہی مشورہ تھا۔ شیر کے ساتھ ایک روباہ ہوا کرتی ہے جس کا مشورہ ہمیشہ یہی ہوا کرتا ہے کہ جو گڑ سے مر سکتا ہے اسے زہر دینے کی ضرورت نہیں۔

اور اس طرح جیسے مدن سینا نے اپنے عاشق سے وعدہ کیا تھا، خسرو نے میری طرف

سے وعدہ کرلیا کہ اگر اس نے بے ستون کو کھود دیا تاکہ جوئے شیر پہاڑ کے اس طرف آ سکے تو میں اس کے حوالے کردی جاؤں گی۔ وہ شہنشاہ جس کے حرم میں سینکڑوں عورتیں تھیں اور سینکڑوں عورتیں آسکتی تھیں۔ اس قسم کے لین دین کو عار نہ سمجھا تھا۔ اس کے علاوہ یہ کام ناممکن بھی تو تھا۔

اور فرہاد، وہ "گرسنہ مزدور طرب رقیب" اپنے تیشے سے پہاڑ کاٹتا رہا۔ وہ پتھر پر میرا نقش بناتا۔ جیسے شیرویہ نے مجھے رجھانے کیلئے میری دوشیزگی کے زمانے میں تین بار چٹانوں پر پرویز کا نقش بنایا تھا۔ فرہاد ہربار میرا نقش بنا کے مایوس ہو جاتا۔ میرے حسن میں ایک بات تھی جو وہ بار بار ان نقوش میں پیدا کرنا چاہتا اور بار بار ہار جاتا۔ وہ پھر سے اس مجسمے کے ٹکڑے کردیتا اور پھر نئی تصویر کھودتا اور اس طرح پورا پہاڑ کٹ گیا۔

اور تب میرا شہریار شوہر بہت پریشان ہوا۔ اس نے پھر شیرویہ کو بلایا، شطرنج کے موجد کے نانا جان کو اور روباہ نے پھر روباہی کی ایک چال چلی۔ میرے مرنے کی افواہ فرہاد کو پہنچائی اور اس کم ہمت مزدور، کم ہمت مہندس نے اسی تیشے سے اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالا، جس سے اس نے میرے مجسمے بنائے تھے، بے ستون کو کھودا تھا، مجھے پا لیا تھا۔ تمہارے اس ہندوستانی شاعر نے بہت خوب لکھا تھا۔ میری روح سن کر پھڑک اٹھی۔ وہ مزدور، اپنی بے بسی کی رسوم و قیود کا کس قدر پابند تھا۔ مرجانے کیلئے اسے اسی تیشہ کی ضرورت ہوئی۔ وہ اپنے دل کی حرکت روک کے مرسکتا تھا۔ یا بے موت کے اس طرح مر سکتا تھا کہ اس کی زندگی کے ہر ہر لمحے میں موت کا مزہ ہوتا۔ وہ سقراط کی طرح ہلاک کا جام تلچھٹ تک مزے لے لے کر پی سکتا تھا۔ یہ رومیو کی سی موت کتنی بے معنی تھی۔

اور اب زریں تاج یعنی شیریں یعنی عجمی نسوانیت کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک پیدا ہوئی اور اس نے کہا، کبھی کبھی مجھے اس کا بھی خیال آتا ہے کہ وہ اسی تیشے سے خسرو پرویز کی سلطنت الٹ سکتا تھا مگر افسوس اس کا تیشہ درفش کاویانی نہ بن سکا۔

سائرن کی دلدوز چیخ پھر ہوا میں ذرا دیر کیلئے گونج کے خاموش ہوگئی۔

(۳)

اور پھر زریں تاج نے کہا۔

میرا نام مہرالنساء تھا۔ میں ایرانی تھی اور میرا ریشہ ریشہ ایرانی تھا۔ ماں باپ کے ساتھ میں ہندوستان آئی' مغلوں کے دربار میں میرے خاندان کو جگہ ملی اور وہ افسانہ تو تم کو معلوم ہی ہے کہ پائین باغ میں شہزادہ سلیم دو کبوتر میرے دونوں ہاتھوں میں تھام کے کسی کام سے گیا۔ ایک کبوتر پھڑپھڑا کر اڑ گیا۔ اس نے واپس آ کے مجھ سے ناراض ہو کے پوچھا' کیسے اڑ گیا تو میں نے دوسرا کبوتر بھی چھوڑ دیا' اور کہا "ایسے اڑ گیا۔" کہتے ہیں میری یہ ادا شہزادے کے دل میں کھب گئی اور مجھ پر دل و جان سے عاشق ہو گیا۔ جیسے وہ اس سے پہلے دل و جان سے انار کلی پر عاشق ہو گیا تھا' اور اس سے پہلے....

لیکن مجھے معلوم نہ تھا عشق و محبت کیا چیز ہوتی ہے۔ ابھی میں دوشیزہ تھی۔ میری ایرانیت ابھی خوابیدہ تھی۔ شہنشاہ اکبر البتہ جانتا تھا کہ محبت ذرا خطرناک سی چیز ہوتی ہے۔ اب اس کیلئے دو صورتیں تھیں کہ یا تو وہ مجھے انار کلی کی طرح دیوار میں چنوا دے یا کسی اور سے میری شادی کرا دے۔

میں ایسی حسین اور ایسی معصوم تھی کہ شہنشاہ نے مجھے قتل نہیں کیا۔ ایسا اکثر ہوا ہے کہ کسی نہ کسی شہنشاہ نے کسی نہ کسی زریں تاج کو قتل کرا دیا ہو۔ لیکن میں خوش قسمت تھی۔ میری شادی ایک بڑے ہی حسین مرد' بڑے ہی بہادر آدمی سے کرا دی گئی۔ اس کی شجاعت کی وجہ سے اسے شیر افگن کا خطاب دیا گیا اور اپنے شوہر کے آغوش میں میں نے پہلی بار محبت کرنا سیکھا۔

وہ بہادر تھا' جری تھا' اس کے قویٰ مضبوط تھے' اس کا سینہ چوڑا چکلا تھا۔ اور میں اس کے ساتھ خوش تھی۔ مجھے اس سے ایسی محبت ہوئی جو کسی اور سے کبھی نہیں ہوئی' نہ ہو سکتی تھی۔

مگر بادشاہ مرتے ہیں اور ان کی جگہ ان کے بیٹے بادشاہ ہوتے ہیں اور اپنا انتقام لیتے ہیں۔ مگر میرے جری اور بہادر شوہر نے تو جہانگیر کو کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا' کبھی اس کی مخالفت نہیں کی تھی۔ وہ اس کے باپ کا وفادار تھا اور اس کے مرنے کے بعد اس کا وفادار رہا۔

اس پر بغاوت کا الزام نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ سرکشی کا الزام نہ لگ سکتا تھا۔ اسلئے اسے ایک دن جب کہ وہ شکار کھیلنے گیا تھا دھوکے سے قتل کرا دیا گیا۔ وہی فرہاد والی بات۔

وہ جو شیر افگن تھا' شیروں کا شکار کھیلتا تھا' شاہانہ روباہی کا شکار ہو گیا۔

اور میں حرم میں لائی گئی۔ مہینوں اور برسوں میں حرم میں داخل ہونے سے انکار کرتی رہی۔ مگر شہنشاہ کو تو بھولے پن سے مہرالنساء کا دوسرے کبوتر کو اڑا دینا یاد تھا۔ اسلئے جوں جوں میرا انکار بڑھتا گیا میری قیمت بڑھتی گئی۔

عورت کے خون میں قدرت نے کچھ عجیب کمزوری دی ہے۔ جو جتنا زیادہ تعاقب کرتا ہے' اپنے صیاد سے دور بھاگنے میں اس کی قوت ارادی اتنی ہی کمزور ہوتی جاتی ہے۔ جتنے عرصے تک یہ تعاقب جاری رہتا ہے اسی کی مناسبت سے اس کی مزاحمت گھٹتی جاتی ہے اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقتول محبوب کے قاتل کو پہلے برداشت اور پھر پیار کرنے لگتی ہے۔ اس وجہ سے بھی بہت سی عورتیں جو تمہارے اس براعظم میں آج کل اغواء کی جاتی ہیں' اپنے ظالم عاشقوں کے چنگل سے چھوٹ کے آنا نہیں چاہتیں۔ کچھ اسی طرح کی کمزوری مجھ پر بھی حاوی ہوتی گئی اور میں نے ہاں کہہ دیا۔ اور میں کئی میں سے ایک' کئی بیگموں میں سے ایک ہو کے رہ گئی۔ اور مجھے نور محل کے نام سے سرفراز کیا گیا' ایسی محلات کئی تھیں۔

محبت' یعنی اس قسم کی محبت جیسی مجھے شیر افگن سے تھی' اب میرے دل میں مر چکی تھی۔ بالکل مٹ چکی تھی اس کی جگہ ایک عجیب طنزیہ محبت تھی۔ مقید طائر کی محبت صیاد کے ساتھ۔ گھوڑے کی محبت اپنے آقا کے ساتھ۔ اور اس طنزیہ محبت میں میں نے گردوپیش کا جائزہ لینا چاہا تو اپنے آقا اور شہنشاہ اور نئے شوہر کو موم کا بنا ہوا پایا جس کے ہاتھ میں آہنی گرز دے دیا گیا ہو اور جس نے ہزارہا شیر افگنوں اور ابوالفضلوں کے قتل کی تلافی مافات کے طور پر ایک طلائی زنجیر کھلونے کی طرح آویزاں کر رکھی تھی اور اسے زنجیر عدل کا خوش نما نام دیا تھا۔

سلطنت اس نے شراب کے ایک جام کے عوض میرے حوالے کر دی تھی۔ میں نے بہت سے امراء کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ میں نے اس کی کوشش کی کہ جہانگیر کے بعد میرا نام چلے۔

ادھر حسن و جمال کے محاذ پر میں نے بہت سی نفاستیں ایجاد کیں۔ عرق گلاب سے غسل کرنے کے اصول دریافت کئے' خوشبوؤں' پیشوازوں' زیوروں میں نئی نئی ایجادیں

کیں- میرے تاج میں ہیرے جگمگاتے تھے- انہیں میں سے ایک ہیرا جہانگیر بھی تھا-

اور عین اس زمانے میں جو میرے عروج کا زمانہ تھا ایک درویش نے میرے شہنشاہ شوہر کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا- شیخ احمد سرہندی کے متعلق میں نے جہانگیر کو بہت سمجھایا- ان لوگوں میں ایک بڑی آرزو یہ ہوتی ہے کہ بادشاہوں سے اونچے سمجھے جائیں- میں نے شہنشاہ سے کہا اسی تیری سلطنت میں برہمن کھتریوں سے افضل سمجھے جاتے ہیں- درویشوں کا عجیب عالم ہوتا ہے' اگر تو انہیں قتل کرا دے تو دنیا قیامت تک تجھ پر نفرین بھیجتی رہے گی اور ان کو شہید تصور کر کے ان کے مزار کی زیارت کو آیا کرے گی- اس کو اپنے حال پر چھوڑ- تجھے ہندوستان کی شہنشاہی میسر ہے اسے دل کی شہنشاہی کرنے دے' وہ تیرا کیا بگاڑ رہا ہے؟

لیکن ایک پیالی کے عوض سلطنت میرے ہاتھ بیچ چکنے پر بھی جہانگیر کو طاقت کا گھمنڈ تھا- وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اور سر ہندوستان میں اس کا اتنا بلند ہو یا اس کے آگے نہ جھکے- آخر یہ وہی جہانگیر تو تھا جس نے ابوالفضل کو اور میرے شیر افگن خان کو قتل کرایا تھا- اس نے دربار کیا اور کھڑکی اتنی نیچی بنائی کی سر جھکا کے آنا پڑتا- شیخ احمد سرہندی بیٹھ کے اس طرح آئے کہ پہلے ان کے پیر دربار میں داخل ہوں اور جو سر خدا کے آگے جھکا ہے کسی اور کے سامنے نہ جھکے-

شیخ احمد سرہندی کے بہت سے مرید تھے' ان میں مہابت خاں بھی تھا- اور ہم لوگ کشمیر میں تھے کہ اس نے ہمارے لئے جال تیار کیا-

وہاں ڈل جھیل کے کنارے فواروں کے نیچے چراغاں تھا' جہاں پناہ کو میں جام بھر بھر کے دیتی جاتی تھی- کھلی ہوئی فضا میں' آسمان کے نیچے راجپوت رقاصہ مارواڑی ناچ ناچ رہی تھی- تھوڑی ہی دور پر پہاڑ برف کے تاج پہنے کھڑے تھے- جو چنار جہاں پناہ نے نصب کئے تھے' ابھی چھوٹے چھوٹے تھے لیکن بید مجنوں کے جھنڈ جھیل کے کنارے کنارے بڑے حسین معلوم ہوتے تھے- ہمیں معلوم ہوتا تھا کہ پورا ہندوستان ہمارے قدموں پر لوٹ رہا تھا اور پیر پنجال کے برف پوش پہاڑوں کے اس پار مہابت خاں ہمارا راستہ روکنے کی تیاری کر رہا تھا-

اور اس نانہجار نے اس طرح جہاں پناہ کا اور میرا راستہ روکا جیسے کوئی شطرنج میں

شہ دیتا ہے' لیکن ادب سے شاہ شطرنج کو پیٹتا نہیں۔ شیخ احمد سرہندی کی درویشی آخر رنگ لائی۔ میں نے بھی اس ناہنجار مہابت خاں کو بہت سمجھایا مگر جہاں پناہ اس کے چنگل میں تھے' سارا ہندوستان انہیں بچانا چاہتا تھا اور نہیں بچا سکتا تھا۔ اور مہابت خاں اگرچہ صیاد تھا اس کی مجال نہیں تھی کہ اپنے آقا پر ہاتھ اٹھا سکے۔ میں اب وہ مہرالنساء نہیں تھی جس نے دونوں ہاتھوں سے کبوتر اڑا دیئے تھے۔ میں نے ہندوستان کی سیاسی شطرنج کے سب مہرے چل کے بادشاہ کو بچا لیا۔

اور اسی طرح کشمیر سے واپسی میں جہاں پناہ شکار کیلئے ایک پہاڑ کے دامن میں ٹھہرے۔ میں ابھی تک اسی طرح انکے دل پر' ہندوستان پر حکومت کر رہی تھی۔ اب بھی میں شراب کا جام بھر بھر کے دیتی جاتی تھی کہ ایک شکاری پہاڑ سے نیچے گرا۔ اور ہڈی پسلی چور چور ہو گئی۔ جہاں پناہ کی طبیعت اسی وقت سے خراب ہو گئی۔ میرے ہاتھ سے انہوں نے شراب کا جام پھر لیا مگر اب یہ نشاط کا جام نہیں تھا علاج کا جام تھا مجھے حیرت تھی یہ وہی آدمی ہے جس نے ابوالفضل کو قتل کرایا' شیر افگن کو شکار کرا دیا۔ جس نے زندہ عورتوں کی کھالیں کھچوا دیں' جس نے مردوں کو دیواروں میں زندہ چنوا دیا۔ اس وقت ایک معمولی سے قدرتی واقعہ سے اتنا متاثر تھا۔

اور پھر کوئی طاقت جہانگیر کو سنبھال نہ سکی۔ اس کی نبض ڈوبتی ہی گئی' اس کے ساتھ میرے اقبال کا سورج ڈوبتا گیا۔ سلطنت سوتیلے بیٹے کے ہاتھ آئی۔ مہرالنساء تو کبھی کی مر چکی تھی' اب نور جہاں بیوہ ہو کر جیتے جی مر گئی۔ وہ جو گلاب کے عرق میں غسل کیا کرتی تھی' جس نے مہابت خاں کا کفر توڑا تھا۔ یہاں تک کہ راوی کے کنارے لاہور کے قریب آرام کرنے کا وقت آگیا۔

چاندنی اسی طرح درختوں کے سبز رنگوں کو گہرا کر کے فضا میں ٹھنڈی آگ بکھیر رہی تھی۔

زریں تاج خاموش ہو گئی۔

(۴)

پھر زریں تاج نے کہا۔

میرا نام زریں تاج تھا میں قزوین میں پیدا ہوئی۔ میں اتنی ذہین تھی کہ اس مرد سے جو میرے باپ میں تھا عورت سے صدہا سال کی رقابت سلب ہو گئی اور اس نے مجھے بہت اعلیٰ تعلیم دلائی۔ جیسی ہونہار لڑکوں کو دلائی جاتی ہے۔ حدیث، تفسیر، فقہ، الہیات میں نے مردوں کی طرح سیکھا اور مردوں سے زیادہ بہتر میں مناظرہ کر سکتی ہوں۔

جب میں پڑھ لکھ چکی تو میری شادی میرے چچا زاد بھائی ملا محمد سے کر دی گئی۔ عربوں میں ابن عم سے عشق مشہور ہے، مجھے اپنے ابن عم سے ہمیشہ سے چڑ تھی۔ ملا محمد کو بھی علم و فضل کا بڑا دعویٰ تھا مگر میں اسے چٹکیوں میں اڑاتی تھی۔ میں خود علوم میں اس قدر کامل تھی کہ مجھے کامل تر مرد کی تلاش تھی۔ ایسے مرد کی جو میرے ذہن کی گردن موڑ سکے۔

پھر جب میں نے محمد علی باب کے حالات سنے تو اسے ایک خفیہ خط لکھا۔ وہ بہت سن رسیدہ تھا اور میں جواں سال تھی۔ لیکن میں اس کے روحانی جمال سے بن دیکھے اس کی طرف کھنچی جاتی تھی۔ ایک طاقت تھی جو اندر ہی اندر مجھ سے کہہ رہی تھی تیری منزل وہی ہے۔ جب باب کا جواب مجھے ملا تو میں بے دیکھے اس پر ایمان لے آئی۔ کچھ روز میں نے اپنی بابیت کو پوشیدہ رکھا اور پوشیدہ طور پر اسے خط لکھتی رہی۔ جب اس کا جواب آتا تو بصیرت کی آنکھ کھل سی جاتی اور جو عورت مجھ میں تھی وہ کہتی تجھے تیرا مقام مل گیا۔

یہاں تک کہ جب باب نے دیکھا کہ علم مناظرہ، اور جوش بحث میں بڑے بڑے فاضل میرے مقابل ٹھہر نہ سکیں گے تو اس نے مجھے کھلم کھلا تبلیغ کا حکم دے دیا۔ وہ جو آفتاب بصیرت تھا اس نے مجھے قرۃ العین (آنکھ کی پتلی) کا خطاب دیا۔ دوسرے بابی بھی مجھ سے بحث کرتے کرتے عاجز آ جاتے۔ انہوں۔ نے باب سے میری شکایت لکھ بھیجی۔ اس پر باب نے طاہرہ کا لقب دیا۔ اس لقب کو میں نے اپنا تخلص بنا لیا۔

میں نے اپنے شوہر کو بابیت کے نور سے منور کرنا چاہا۔ وہ میرے خیالات کیا بدل سکتا۔ لیکن میں بھی اس کے دل میں چراغ نور نہ جلا سکی۔ دراصل یہ مرد کے ذہن اور عورت کے ذہن کی ٹکر تھی۔ ایک عورت جو صدیوں کے بعد پھر ابھری تھی، ایک ایسے مرد سے بیاہی گئی تھی جس کی ذہانت صدیوں کے استعمال سے فرسودہ ہو گئی تھی۔ پھر میرا

شوہر شیر افگن نہیں تھا جسے میں ہمیشہ کیلئے دل سے چاہتی وہ خسرو پرویز تھا۔ وہی فاتحانہ ملکیت کا دعویٰ۔ اس لئے کہ نکاح کے چند کلمے پڑھا کے میں اسے سونپ دی گئی تھی۔ میری نس نس میں بغاوت جاگ اٹھی۔ میرے لہو کی بوند بوند میں محمد علی باب کا جگایا ہوا جادو تھا۔ میری آنکھوں نے کبھی باب کو نہیں دیکھا۔ میں کبھی اس سے نہیں ملی۔ لیکن وہ ہر وقت حاضر اور موجود تھا۔ اور اس کی موجودگی سے' اس دائمی حضور سے میرے شوہر ملا محمد کی ہستی میری نظروں میں صفر سے کم رہ گئی۔

آخر میرے شوہر نے اپنے والد اور میرے والد سے شکایت کی۔ انہوں نے مجھ پر بہت دباؤ ڈالنا چاہا میں نے کسی کی ایک نہ سنی۔ اپنے باپ سے میں نے کہا کہ میں طاہرہ ہوں۔ باب نے مجھے طاہرہ کا لقب دیا ہے میرا شوہر حق سے منہ چھپاتا ہے اور اس لئے وہ خبیث و مردود ہو گیا ہے۔ طاہرہ کا کسی خبیث سے جنسی تعلق باقی نہیں رہتا اور جنسی تعلق کا باقی نہ رہنا طلاق کے برابر ہے۔ پھر اپنے والد کو قائل کرنے کیلئے میں نے بحث شروع کر دی کہ کیا مکہ کی جو عورتیں ایمان لے آئی تھیں مگران کے شوہر بدستور کافر رہے تھے انہیں رسول اللہ نے بلا طلاق دوسروں کے نکاح میں نہیں دے دیا تھا؟

اس درمیان میں میں باب سے دور تھی۔ میری آنکھیں کبھی رو در رو اس کے جمال کا مشاہدہ نہ کر سکیں۔ میری روح اسے ڈھونڈھتی تھی کہ اسے اپنا حال سنائے اور جب میری روح اس مرد کامل کیلئے تڑپ رہی تھی۔ عقل نسوانی' مردانہ وجدان کی برق کی متلاشی تھی۔ میں نے اپنے ذہن پر فکر سخن کے دروازے کھلتے دیکھے۔ وہ مجھ سے دور تھا اور میری روح اس کیلئے بے تاب تھی۔ وہ کہیں مجھے مل جاتا تو میں کس کس طرح سے اسے حال دل سناتی۔

گر بہ تو افتدم نظر چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو
شرح دہم غم ترا نکتہ بہ نکتہ مو بہ مو

تمہارے اقبال نے اس شعر کو پسند نہیں کیا۔ غالب کی عیاشی کو بھی اس نے اپنے جاوید نامے سے نکال باہر کیا۔ لیکن باب کا تصور میری نظروں میں معشوق کا تھا۔ معشوق حقیقی کے مظہر کا اور ساتھ ہی ساتھ مکمل مرد کا جس کی روح کائنات کو آغوش میں لئے ہوئے تھی۔

دود دہان تنگ تو' عارض عنبریں خلط
غنچہ بہ غنچہ گل بہ گل لالہ بہ لالہ بو بہ بو

یہ زمانہ میرے لئے عجیب و غریب جذب و احساس کا زمانہ تھا۔ یہ عشق کا زمانہ تھا۔ نشاط و فنا کی لہریں یکے بعد دیگرے پیدا ہوتیں' کبھی مجھے بقائے دوام بخشتیں' کبھی لحہ لحہ نئی موت نئی لذت مرگ عطا کرتیں۔

اس نے مجھے طاہرہ کا خطاب دیا تھا۔ یہی میرا تخلص تھا۔ اور میں نے آبشار گرتے دیکھے۔ الفاظ کے آبشار۔ اور پھر جو میں نے آنکھ کھولی تو ان آبشاروں کی لگام میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے قرآن مجید سے شوکت لی اور متبنی کے ترنم کو قاآنی کے ترنم میں حل کر دیا۔ ایران کی خاک سے ایک ہزار شاعر اٹھے تھے۔ میں پہلی شاعرہ تھی جو ان ایک ہزار شاعروں سے الگ کھڑی تھی اور میری انگلیوں کے درمیان سے یہ عظیم الشان آبشار گر رہا تھا۔

چہ شود کہ آتش حیرتے بزنی بہ قلہ طور دل
فصککتہ' ود ککتہ' متدکدکا متزلزلا

یہ آبشار الفاظ ہی کا نہیں تھا' ایک جہاں سوز عشق کی آگ تھی' سیال آگ جو اس آبشار سے گرتی چلی جا رہی تھی' جس کی تہ میں نیستی کے نہنگ منہ پھاڑے ہوئے تیار تھے کہ مجھے اور دوسروں کو نگل جائیں۔ میں نے اپنی طرح دوسروں کو ان نہنگوں کے خروش لاسننے کی دعوت دی۔

اب آبشار کے گرجتے ہوئے تخت پر وہ جلوہ افروز تھا۔ محمد علی باب۔ اس کے چہرے کا قدس' ظہور حق کی بشارت دیتا تھا جس کسی نے اس کا راستہ اختیار کیا وہ تو محنت اور ابتلا سے بچ گیا لیکن جس نے اس سے سرتابی کی تو گویا وہ داور محشر کی طرح تخت قیامت پر متمکن تھا' قہار و جبار۔ کامل مرد' مجھ کو اور میرے ساتھ ساری کائنات کو سرتابی کے جرم میں فنا کرنے والا قہار اور جبار ہی نہیں تھا اس میں رحم و لطف شہنشاہی کی تمام صفتیں بھی تھیں۔

کیسے از نہ کرد اطاعتم نہ گرفت حبل ولایتم

کنمش بعید زسا حتم و ہمش بہ قہر ببا ولا

منم آں ظہور مہیمنی، منم آں نیت بے منی
منم آں سفینہ ایمنی ولقد ظہرت مجلجلا

شہدائے طلعت نارمن، بدوید سوے دیار من
سرو جاں کنید نثار من کہ منم شہنشاہ کربلا

اور باشوکت، باعظمت گرجدار آبشار تھا کہ بلندیوں سے گرتا ہی جاتا تھا۔ عرش سے فرش تک جلال سے جمال تک۔ اس کی ہمہ گیر ہستی سے میرے حساس ذہن تک۔

طیر العماء تکفکفت، ورق البہاء تصفصفت
دیک الیضاء تذورقت منجملا" متجللا

اس سیلاب، اس آبشار میں میرا شوہر ملا محمد قزوینی حسن و خاشاک کی طرح بہہ گیا۔ میں اب بڑے انہماک سے بابیت کی تبلیغ کرنے لگی تھی۔ جب قزوین میں مزاحمتیں بہت بڑھ گئیں تو میں کربلا چلی گئی۔ تقریروں میں جوش اور سرور کے عالم میں میں اکثر چہرے سے نقاب الٹ دیتی۔ اور وہ جو مجھ سے بڑی بڑی عالمانہ بحثیں کرتے ہوتے میرے ذہن کے تمام حربوں کے بعد حسن کے اس حربے سے اتنے مسحور ہو جاتے کہ بحث کرنا بھول جاتے۔ یہ وہی زلیخا اور زنان مصروالی ترکیب تھی۔ آخر میں عورت تھی، عورت کا آخری حربہ کیوں نہ استعمال کرتی۔

بدرالنساء کی مصیبت کے مصنف نے اتنا غلط نہیں لکھا کہ میں آہستہ آہستہ پردہ توڑ رہی تھی۔ براؤن سے صبح ازل نے محض میری مروت میں کہہ دیا ہو گا کہ میں پردے کی پابند تھی۔ لیکن میرا کام تو تمام پابندیاں توڑنا تھا۔ فرہاد کی پابندیاں، شیریں کی پابندیاں یعنی تخلیق جمال کی پابندیاں، اور موضوع جمال کی پابندیاں۔ میں نے باب کی روحانیت کے ساتھ مزدک کی تعلیم کو حل کر دیا۔ میں اپنے ہی محاذ پر لڑتی رہی۔ باغی عورت کے محاذ پر۔ ابھی تک تو وہ جماعت نہیں بنی تھی اور قوام السلطنت نے نہ وزارت کی تھی نہ نکالے گئے تھے۔ لوگ جمال الدین افغانی کا نام ڈر ڈر کے لیتے تھے۔ میری طرح وہ بھی ایک متعصب کافر باغی تھا۔ دونوں سے ناصرالدین شاہ قاچار کی ملی تھی۔ اور دونوں کا کام

بادشاہوں، پرویزوں، جہانگیروں نے تمام کیا۔ وہ مردوں کی جمہوریت کے محاذ پر لڑا، میں روحانی جمہوریت اور عورت کی آزادی کے محاذ پر لڑتی رہی۔ میں مزدک کی ہم خیال تھی کہ کیوں عورت ایک ہی مرد کی پابند بنا دی جائے ممکن ہے کہ اس کا مرد ملا محمد قزوینی جیسا خشک نوجوان ہو۔ نقاب کے شگاف کو میں نے اور زیادہ چاک کر دیا، تاکہ عورت کی صورت---- اور اس کے داغ اچھی طرح پہچانے جا سکیں۔

جب میں کربلا سے نکالی گئی تو بغداد پہنچی---- وہاں سے نکالی گئی تو کرمان شاہ اور ہمدان ہوتی ہوئی پھر قزوین واپس آ گئی۔ اب باب کا جمال میری ہستی میں اس قدر بس چکا تھا اور اپنے شوہر سے میری نفرت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ میں نے بابیوں کو فتویٰ دے دیا کہ وہ میرے شوہر ملا محمد اور اس کے باپ ملا تقی کو قتل کر دیں۔

اور اس طرح جیسے تمہارے ملک میں ہوتا ہے ذرا سا اشارہ پاتے ہی انہوں نے میرے خسر کو نہ صرف قتل کیا بلکہ ناک کان کاٹ کے اس کی لاش کو مسخ کر دیا۔ اب سارا قزوین میرا اور تمام بابیوں کا جانی دشمن تھا۔ لوگ مجھے قتل کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ میں نے چھپ چھپا کے خراسان کا رخ کیا۔ جہاں شاہ ایران کے خلاف بغاوت عروج پر تھی۔

راستے میں مجھے محمد علی بار فروشی ملا۔ محمد علی باب میرے لئے مرد کی روح اور وجدان تھا۔ محمد علی بار فروشی مرد کا ذہن اور جسم۔ اور تم نے بہت سے قصے سنے ہوں گے۔ کیونکہ آوارگی کے قصے عورت کی زندگی میں شروع ہوتے ہیں اور مرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتے۔

سبز درختوں کے گہرے سائے میں زریں تاج قدم سے قدم ملائے ارشد کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ اپنی داستان سناتی ہوئی۔ نقاب الٹی ہوئی تھی، اس کا چہرہ چاند کی روشنی میں چاند سے زیادہ بے جان اور ٹھنڈا معلوم ہو رہا تھا۔ ارشد نے اس سے پوچھا۔ "تمہارے اور محمد علی بار فروشی کے درمیان کیا واقعہ پیش آیا۔ کیا سچ مچ اس کے جسم سے تمہارے جسم کو محبت تھی۔ تم جو غائبانہ طور پر تمام عمر محمد علی باب کی روح کی شیدا رہیں۔

وہ مسکرائی، چاند کی سی ٹھنڈی مسکراہٹ جس سے پتہ نہیں چلتا کہ اس کرے پر زندگی کے آثار ہیں یا نہیں، اور کہنے لگی۔ "خدا جانے جب تم نے کسی عورت کے متعلق ایسا کوئی الزام سنا ہے تو کیا تم کبھی یقین سے کہہ سکتے ہو کہ یہ الزام صحیح ہے یا غلط۔ صرف

ملزم عورت اور ملزم مرد جانتے ہیں کہ یہ کتنا صحیح ہے اور کتنا غلط۔ اور کبھی کبھی جو واقعہ پیش آچکا ہے غلط معلوم ہوتا ہے اور جو پیش نہیں آیا ہے صحیح معلوم ہوتا ہے۔"

قصہ مختصر یہ کہ میں اس سے بارہا ملی۔ خلوت کی ملاقاتیں۔ باب میرے لئے محض روح تھا۔ ملا محمد محض جسم، محض ہوس۔ محمد علی بار فروشی ان دونوں کے درمیان تھا۔ ذی روح جسم، جسم کے اندر جان۔ میں اس سے بے حجاب ملتی رہی۔ اگر کوئی ان ملاقاتوں کو ناجائز کہتا ہے، فاسقانہ قرار دیتا ہے، قرار دے لے۔ مجھے ایسے مرد کے جسم کی ضرورت تھی جو میری ٹکر کا ہو۔ جس سے مل کے میں اپنے آپ کو اس سے بدتر نہ سمجھوں۔ اس کے علاوہ میں عورت تھی۔ عورت کے جسم میں مجھے مرد کے جسم کی ضرورت تھی۔ میں نے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔

یہاں تک کہ قزاقوں نے قافلہ لوٹا اور ہم ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ میں گرفتار ہو کے تہران آئی۔ یہاں میں افواہ اور افسانہ بن گئی۔ شیریں کی طرح، نور جہاں کی طرح۔ لوگوں نے مجھ اسیر زنداں کو تہران کی گلیوں میں دیکھا۔ ہارون الرشید کی طرح۔ میری شہرت سن کے ناصرالدین شاہ قاچار جہانگیر بن گیا۔ گویا میں نے روحانیت کا دوسرا کبوتر بھی نورجہاں کی طرح بڑے بھولے پن سے اڑا دیا تھا۔ لیکن میں جو کبھی نورجہاں تھی نورجہاں کی زندگی سے سبق لے چکی تھی۔ میرا شیر افگن محمد علی بار فروشی مجھ سے چھن چکا تھا۔ مگر میں شراب کے ایک پیالے کے عوض کسی شہنشاہ کی سلطنت خریدنا نہ چاہتی تھی۔ جمال الدین افغانی کی طرح اپنے سوتیلے رفیق کی طرح میری زندگی کا مقصد بھی شہنشاہوں کے تختے الٹنا تھا۔ فرہاد کے تیشے کو زمین کی گہرائی میں دفن کرنا تھا۔ ناصرالدین شاہ نے جب مجھے اپنی خاص الخاص ملکہ 'اپنی نورجہاں بنانا چاہا تو میں ہنسی۔ ایک شعر جو میں نے بڑی عقیدت سے انکسار و عجز کے عالم میں باب کیلئے لکھا تھا' اب استغنا و طنز کے عالم میں شہنشاہ کو لکھ بھیجا۔

تو و ملک و جاہ سکندری' من و رسم و راہ قلندری
اگر آں خوش است تو درخوری' و گرایں بداست مرا سزا

اور ظاہر ہے کہ اس جرات انکار کی سزا مجھے کیسے نہ ملتی۔ میں بڑی بے دردی سے قتل کی گئی۔ اپنی موت کا مزا اور اس کی تفصیل مجھے یاد نہیں۔ باغ میں گانت سے میرا گلا گھونٹ

دیا گیا۔ مجھے کنویں میں دھکیل دیا گیا اور کنویں کو پتھروں سے پاٹ دیا گیا۔ یا میری زلفیں چاروں طرف سے کاٹ ڈالی گئیں اور باقی بالوں کو خچر کی دم میں باندھ کے گھسیٹتے ہوئے مجھے دار القضا لے گئے۔ غرض ہم ایرانی بھی تم ہندوستانیوں سے کم وحشی نہیں۔

(۵)

پھر زور سے سائرن بجا۔ اور دفعتاً" رک گیا۔ یہ وہ ہوائی جہاز تھا جو چوری سے لڑائی کا سامان لایا کرتا تھا۔ چند منٹ بعد پھر سائرن کی دلدوز چیخ سنائی دی اور سکرات کی طرح اکھڑے ہوئے سانس کی طرح سنائی دیتی رہی۔ دو ہوائی جہاز دیکھ بھال کی اڑان کرنے کے لئے دور پر دو سبز اور سرخ نقطوں کی طرح پرواز کر رہے تھے۔ قریب ہی گھڑ گھڑاہٹ کی آواز آئی۔ سڑک پر یہ اس کی اپنی جیپ تھی۔ شیخ احمد اسے اسٹارٹ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

زریں تاج مسکرائی' چاند کی پھیکی موہوم مسکراہٹ۔ چاند میں پانی نہیں ہوتا اس لئے زندگی نہیں ہوتی۔ زریں تاج ایک خاص تمدن کی پیداوار تھی اگرچہ کہ وہ اس سے آگے رہی۔ اب اس جیپوں کی دنیا میں اس کا کیا کام تھا۔ وہ جو اعلیٰ ترین فارسی شعر لکھتی تھی اب گویا ایک اس کا چستانی سرالاپ رہی تھی۔ تم اونچی سڑک پر جاؤ۔ میں نیچی سڑک سے جاؤں گی۔ دوراہہ آ چکا تھا۔

وہ تو ماضی کی طرف چلی گئی۔ چاندنی میں غائب ہو گئی۔ اور ارشد نے جیپ میں بیٹھ کے محسوس کیا کہ اس کیلئے مستقبل ابھی بہت بہت دور تھا۔

○○

زُون

"ہوشیار، ہوشیار، خبردار خبردار۔"

مال سے لدے ہوئے ٹٹوؤں، اور گھاس کی پاپوش پہنے ہوئے ہاتوؤں کے میرِ کارواں کا چلّانا اور بھی قیامت ہوگیا۔ پہلے تو بلندی سے برف کا ایک ٹکڑا گرا تھا۔ جس میں ممکن ہے کوئی پتھر ملفوف ہو۔ مگر اس کشمیری میر کارواں کی آواز پورے درّے میں بادل کی کڑک کی طرح گونج گئی۔ فرنگی سیّاح، جو اپنے تین ٹٹوؤں اور اسکارڈ کے رہنے والے تین دراز قد، خوبصورت، لمبے وردی نما لباس میں لپٹے ہوئے نوکروں کے ساتھ اس کارواں سے پیچھے کوئی ایک ہزار فٹ اوپر تھا۔ محسوس کرنے لگا کہ اب برف اور پتھروں کی قیامت ہی آ جائے گی۔ اپنے سامنے ہی اس نے دیکھا کہ چند سکنڈ کے اندر کشمیری کی صدائے بازگشت کے ساتھ برف کا ایک بہت بڑا تودہ جو اوپر کسی آہٹ یا آفتاب کی تیز کرن کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ مع اس چٹان کے گرا جو اُس میں مہینوں سے استراحت کر رہی تھی اور ایک ہی سکنڈ کے دوسرے حصے میں اس چٹان نے دوسری چٹانوں کو زلزلہ بر اندام کر دیا اور یہ چٹانیں ایک دوسرے کو گراتی، سخت اور ہیبت ناک شور مچاتی ہوئی، کھائی میں جا گریں۔

دو تین منٹ میں برف کا یہ زلزلہ ختم بھی ہوگیا۔ آسمان پر سے بادل بھی چھٹ چکا تھا۔ لیکن اُس کو بھی اسی وقت برسنا ضروری تھا۔ برف پر انسان اور جانور سب کے قدم

پھسل رہے تھے۔ ایوالانش کے چند ہی منٹ بعد برف کی نقاب جو فرنگی سیاح اور اس کارواں کے درمیان حائل تھی۔ پھر دور ہو گئی تھی۔ پہاڑ پر پھر وہی ہیبت ناک سناٹا تھا۔ فرنگی سیاح کے اعصاب تو زیادہ متزلزل نہ ہوئے تھے مگر اسکاردو کے ٹٹو والے اور نوکر ذرا حواس باختہ نظر آرہے تھے۔ راستہ چٹانوں سے اٹ گیا تھا اور ان کے پیشِ نظر یہ معمہ تھا کہ صاحب اور ٹٹو کیسے ان چٹانوں کو پھاندتے ہوئے گذریں گے اور وہ ہیں بھی تو بے حد خطرناک۔ کوئی اپنی جگہ سے ذرا ہلی اور پھر اولانش اور خاتمہ۔ فرنگی سیاح نے دیکھا تو تیس چالیس ٹٹوؤں کے قافلے میں سے صرف دو یا تین ٹٹو غائب تھے، دو ٹٹو والے بھی برف اور پتھروں کے اس ہولناک ایوالانش کی نذر ہو گئے تھے۔

اس بلندی سے، جیسے کھلونے دکھائی دیتے ہوں۔ ٹٹوؤں اور آدمیوں کی ملی جلی کچلی ہوئی لاشیں کہیں کہیں برف اور پتھروں کے ملبے سے باہر نکلی ہوئی تھیں اور قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے ـــــ فرنگی سیاح مسکرائے بغیر نہ رہ سکا ـــــ ایک کاشانی قالین ٹٹو پر بندھے ہوئے بوجھ سے نکل کر معلوم نہیں کس طرح برف پر گر گیا۔ شکنیں تو بہت تھیں مگر وہ ڈھلوان پر بچھا ہوا سا معلوم ہوتا تھا۔ گویا وہ موت کے فرشتے کی نشست تھی۔

ابھی پاؤ گھنٹہ پہلے مطلع بالکل صاف تھا اور دھوپ زوجی لا کے برف کو جگمگا رہی تھی۔ گیارہ ہزار فٹ کی بلندی پر فرنگی سیاح ـــــ میک نار، حیدر آباد کے ایک کالج کا پرنسپل، جو کئی مہینے کی چھٹی لے کر اپنے دوست سر فرانسس ینگ ہز بنڈ کی طرح دکے ۲، کا دریائے سندھ کا ساحل سے نظارہ کرنے گیا تھا۔ جہاں سے یہ دنیا کی دوسری اونچی چوٹی سر سے پیر تک برف میں ڈھکی ہوئی، آسمان تک پہنچنے کا ایک ڈھلوان سا زینہ معلوم ہوتی ہے۔ آج ۱۵ اپریل ۱۹۰۰ء کو اس نے زوجی لا کی گیارہ ہزار فٹ کی بلندی سے اس ملک کی طرف دیکھا ہے جسے ہندوستان کہتے ہیں۔ زوجی لا ہی اصل ہندوستان کی حدِ فاصل ہے کیوں کہ یہ ہمالہ کی عین قطار کا سب سے پایاب، سب سے نیچا زینہ ہے۔ اس طرف کے صوبے لداخ اور بالتستان سب وسط ایشیا میں ہیں۔ زبان الگ، تمدن الگ۔ اس فرنگی سیاح کو افسوس سا ہوا۔ کاش راس کماری تک پورا ہندوستان اسے وہاں سے نظر آجاتا مگر گنگا بل اور تا جواس

گلیشیر کی بلندیاں، اوران کے پیچھے پہاڑوں کی چوٹیاں۔ اُس کی نگاہوں سے اُس حقیر منظر کو چھپائے ہوئے تھیں جس کی عکاسی کے باعث وہ کپلنگ کی عظمت کا ابھی سے بہت قائل تھا۔

فاتح کی تمکنت کے ساتھ اس کالج کے پرنسپل نے سامنے سونامرگ اور تاجواس کو دیکھا۔ جن کے مرغزاروں اور ٹیلوں پر ابھی تک برف کی چادر چڑھی ہوئی تھی۔ تاجواس گلیشیر کی طرف سے گنگابل کی جانب اُس نے ایک غلیظ ابر کو پرواز کرتے دیکھا۔ ہوا کے ایک تیز اور کپکپی پیدا کردینے والے جھونکے نے اُسے خبر دی کہ زوجی لا بھی محفوظ نہ رہے گا اور اسی غلیظ ابر کا ایک ٹکڑا اس درے پر برس ہی گیا۔

دراصل میں اس سامنے سے گذرتے ہوئے کاروان کے نگراں کار یا میر کارواں ممدو سے میک نائر کی ملاقات ہوئی تھی۔ ممدو نے اُسے بتایا تھا کہ یہ قافلہ اُس مال سے لدا ہوا ہے جو سرینگر کے مشہور ملک التجار شاہِ قالین غضنفر جُو نے روسی، چینی، ترکستان، تبت اور لداخ سے منگایا ہے۔ اس میں یارقند ری نمدے ہیں، سمرقند، مرو، مشہد اور کاشان کے بُنے ہوئے ہیں، سُغدانی ریشم ہے۔ دس ہزار فیٹ کی بلندی پر رہنے والے ریچھوں، برفانی چیتوں، لداخ کے بارہ سنگھوں، پامیر کے پہاڑی جانوروں کی کھالیں ہیں۔ اپریل کے مہینے میں بھی بھلا کوئی زوجی لا کو پار کرتا ہے؛ مگر مجبوری یہ ہے کہ اپریل ہی کے زمانے میں کشمیر میں فرنگی سیاح آنے لگتے ہیں۔ پچھلے سال کا پرانا مال انھیں پسند نہیں آتا۔ پھر ان کھالوں کے کوٹ بنتے ہیں اور میموں کے لیے کلکتہ بھیجے جاتے ہیں۔ جہاں اُس ملک التجار کی ایک بڑی دوکان ہے۔ ملک التجار غضنفر جُو کی دوسری بڑی دوکان بمبئی میں ہے مگر وہاں زیادہ تر تبت اور لداخ کے نیم بیش بہا جواہرات، چینی بُت، تبت کے نوادرات اور وسط ایشیا کے تحائف اور قالین ہی بکتے ہیں۔

ایوالانش کے گر چکنے کے بعد میک نائر ملک التجار غضنفر جُو کے خادم ممدو کی مجبوری سمجھ گیا۔ اپریل میں اُسے تو برف اور پہاڑیوں کی خطرناک کشش کھینچ لائی تھی۔ وہ خود اسکاٹ لینڈ کے تراساخس کا رہنے والا تھا مگر ممدو اور ہزار ہا کے مال سے ڈھکے ہوئے

کارواں کا اُس خطرناک درّے سے شروع اپریل میں گذرنا ضروری تھا۔ ابھی تک میک نائر نے کارل مارکس کو پڑھا نہیں تھا۔ لیکن مسکرا کے اُس نے محسوس کیا کہ یہ مال سے لدے ہوئے قافلے ان خطرناک درّوں سے ہمیشہ انسانوں اور جانوروں کی جانوں کی قربانیاں کرتے ہوئے گذرتے رہیں گے۔ ہمیشہ کاشان، مرو اور بدخشاں کے کاریگر ملک التجاروں کے لیے قالین اور ریشم بُنتے رہیں گے اور جو چیز وہ اپنی محنت سے بنا کے ایک سکّہ میں بیچیں گے۔ وہ سری نگر میں دس سکوں میں، کلکتہ میں بیس سکوں میں اور لندن میں سو سکوں میں بکتی رہے گی۔

اسکار دو کے ملازمین کی ہوشیاری سے خطرناک حصّہ پار ہو چکا تھا۔ برف پرادلاش کا بچھایا ہوا کاشانی قالین بھی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ سامنے بال تال کے جھونپڑے تھے۔ وہ اب پھر سامنے کے کاروان والوں کے قریب پہنچ چکا تھا اور ممدو کا واویلا سن سکتا تھا۔ جو اُس سے مخاطب ہو کے بٹلروں کی انگریزی میں کہنے لگا "غضنفر جو مجھے زندہ نہ چھوڑے گا۔ کوئی پچاس ہزار کی مالیت کا سامان اُن دونوں ٹٹوؤں پر تھا۔ اُسے کب یقین آئے گا کہ ایولانش میں دو ٹٹو دب گئے۔ صاحب آپ گواہ ہیں"۔

اور مسٹر میک نائر نے مجھ سے بیان کیا کہ انھیں سچ مچ اس واقعے کی گواہی دینی پڑی کچھ ہی سال پہلے چنار باغ کے پیچھے ایک انگریزی ہوٹل کھلا تھا۔ جس کا نام نیڈوز تھا۔ میک نائر اُس میں اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے، مری کی بیئر ذائقہ لے کر پی رہے تھے جس کے یا کسی اور قسم کے الکحل کے لیے وہ عرصے سے ترس رہے تھے۔ اخباروں کا ایک پلندہ اُن کے ہاتھ میں تھا مگر اخباروں میں کچھ نہ تھا۔ ان چند مہینوں میں کچھ پیش نہ آیا تھا۔ وی آنا کے شاہی قصروں میں والتس، باب عالی میں سکون، سلطنت برطانیہ کا وقار، فرانس کے فیشنوں کی نقل کرنے والے زار سے بدرجہا زیادہ۔ پیرس کی جرمن تسخیر کو تیس سال ہونے کو آئے تھے اور قیصر ولیم نے بسمارک کو تو کئی برس ہوئے نکال ہی باہر کیا تھا۔ نئی صدی کو شروع ہوئے ساڑھے تین مہینے ہوئے تھے۔ امن تھا، سرمایہ تھا، حکومت تھی۔ زلزلے آتے تھے تو صرف پہاڑوں میں۔ میرے اُستاد مسٹر میک نائر کو ابھی بہت کچھ دیکھنا تھا۔ جب ممدو انھیں بلانے آیا تو بیئر تو بہرحال انھوں نے ختم کی، مگر اخبار ختم نہ کر سکنے کا انھیں

افسوس تھا۔ ملک التجار غضنفر جُو نے بلاوے کو دعوت کی شکل دی تھی۔ اور مسٹر میک نائر اس زرّین موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہتے تھے کہ جنّتِ ارضی کے اس گندے شہر کے ایک گندے محلّے میں وہ ایک شریف اور امیر کشمیری مسلمان کا گھر اندر سے دیکھیں اور کشمیری کھانے کا ذائقہ چکھیں۔

چھٹے پُل کے قریب غضنفر جُو کا سہ منزلہ مکان تھا۔ اس محل کا دروازہ ایک بڑی ہی غلیظ گلی میں تھا۔ جس کے بیچوں بیچ ایک گندی موری اور زیادہ تعفن پھیلاتی ہوئی گلی کے سرے پر جہلم میں جا گرتی تھی۔ مکانوں کے کمرے چوبی دست کاری کے اعلیٰ ترین نمونے کے سہارے کھڑے تھے۔ دیواروں پر رنگین دائروں اور نیم دائروں اور قوسوں کے گورکھ دھندوں میں رنگ بھرا ہوا تھا۔ یہی گورکھ دھندے جالیوں میں تھے۔ غرناطہ سے بغداد تک، بغداد سے ڈھاکے تک یہی عربی دائرے اور نیم دائرے اور قوسیں اور محرابیں —— اور مسٹر میک نائر مُسکرائے۔

شاہِ قالین ملک التجار غضنفر جُو پشمینے کے ایک جُبّے میں ملبوس تھے، ترشی ہوئی لبیں، مٹھی بھر گھنی سیاہ داڑھی۔ مگر معلوم ہوتا تھا کہ شاید گذشتہ نومبر سے ابھی تک نہیں نہائے۔ میک نائر کاشانی، ایرانی اور کشمیری قالینوں کی بہار دیکھتا رہا۔ اُسے گاؤ تکیہ کے سامنے اعزاز کی جگہ پر بیٹھایا گیا۔ خود غضنفر جُو سامنے صاحب کی تعظیم کے لیے ہاتھ باندھ کے بیٹھا۔ کپلنگ کے ہم وطن نے بلا کسی حیرت کے اس ایشیائی کو دیکھا جو اُس کے جیسے بیسیوں کو ملازم رکھ سکتا تھا اور مُسکرایا۔ گواہیاں ہوئیں۔ کھانا ہوا جو اسکارڈو اور لیہہ اور وادی سندھ کے دیہات کے کھانے کے بعد نعمت معلوم ہو رہا تھا اور اب اس قسم کے کھانے کا وہ اس قدر عادی ہو چکا تھا کہ اُسے غلیظ ہاتھوں سے بنائے ہوئے اس کھانے سے ذرا بھی کراہت نہیں معلوم ہوئی۔

دفعتہً معلوم ہوا کہ ایک چھوٹی موٹی سی قیامت برپا ہو گئی۔ اس مکان سے ملی ہوئی نان بائی کی دوکان تھی۔ دو چھوٹی چھوٹی منزلیں، جو کُل چار کمروں پر مشتمل تھیں۔ جن میں سے نیچے کے دو کمرے نان بائی کے باورچی خانے اور دوکان کا کام دیتے تھے۔ غضنفر جُو اور

اس کے ساتھ تماشا دیکھنے کے لیے میک نائر بیچ در بیچ زینے سے جلدی جلدی نیچے اُترے، سامنے ایک بھیڑ تھی۔ ایک عورت شدّتِ کرب سے چلّا رہی تھی۔ کچھ آدمی آپس میں مار پیٹ کر رہے تھے۔ ایک دوسرے پر چیخ رہے تھے۔ بھیڑ میں ہر شخص جوش و خروش کے عالم میں تھا ـــ میرے اُستاد مسٹر میک نائر مسکرائے ـــ یہ ایشیائی! بہت جلد واقعہ اُن کی سمجھ میں آگیا۔

جو عورت چیخ رہی تھی ـــ نانبائی کی بیوی تھی۔ اُس کے چہرے اور بالوں پر ابھی تک تیز بدبودار دیسی تیزاب بہہ رہا تھا۔ اُس کی ایک آنکھ حلقے سے باہر نکل آئی تھی۔ جسم کے ریشوں اور خلیہ کو ہمیشہ کے لیے تباہ کرنے والا سیّال ابھی صرف کالے کیچڑ کا بدنما دھبّہ معلوم ہو رہا تھا۔ دوسری رخسار پر صرف چھینٹے ہی پڑے تھے۔ اور ایک آنکھ بالکل بچ گئی تھی۔ باوجود اس عورت کے ہولناک چیخوں کے، اور کرب اور درد سے بگڑی ہوئی صورت کے، جو حصّہ اب بھی صاف تھا اُس کا رنگ ایسا صبیح، ایسا پاکیزہ تھا کہ اپنے دوست فرانسس ینگ ہز بند کی طرح مسٹر میک نائر کو بھی کشمیری حُسن کا از سرِ نو قائل ہونا ہی پڑا۔ تیزاب ابھی تک متناسب خد و خال کو تباہ نہ کر سکا تھا۔ ناک معلوم ہوتا تھا، کسی یونانی فن کار نے جڑی ہے جو آنکھ بچی تھی۔ وہ لمبی اور ترچھی تھی اور اُس کے دیدے میں استوائی راتوں کی سی سیاہی تھی۔

جس شخص کے ہاتھ میں تیزاب کا پیالہ تھا اور اب گر کر چکنا چُور ہو چکا تھا اور جسے سب مار رہے تھے۔ برابر کشمیری میں چیخ رہا تھا اور جب غضنفر جُو نیچے اُترے تو وہ اُن کی طرف ہاتھ پھیلا پھیلا کے اشارے کرنے لگا۔

مسٹر میک نائر باقی سب سمجھ گئے۔ ممدو نے بھی اُنھیں سمجھنے میں مدد دی۔" یہ شخص جسے سب پیٹ رہے تھے؛ سات سال سے نانبائی کی جورو پر عاشق ہے۔ صاحب کشمیری نانبائی کی عورتیں بڑی حسین ہوتی ہیں۔ اسی کو دیکھ لیجیے۔ یہ بھی مہترانیوں اور مانجھیوں کی عورتوں کی طرح ذرا چاندی کی چمک دیکھ کے پھسل جاتی ہیں۔ خود نہ بھی پھسلیں تو ان کے مرد پھسل جاتے ہیں۔ انھیں تین ذاتوں نے ہم کشمیریوں کو بدنام کیا ہے۔ صاحب۔ صاحب

میں آپ کے کان میں کہتا ہوں۔ یہ نانبائی کی جورو ہمارے خواجہ ملک التجار کے پاس آتی جاتی تھی اور اُس کا مرد خود آکے روپے وصول کرتا تھا۔ یقین نہ ہو تو امدو سے پوچھ لیجیے۔ مسٹر نائٹ مسکرایا۔ اُس نے بھی نانبائی سے تو نہیں، مانجھیوں سے جب کبھی "جو نابی لوگ" کی فرمائش کی تھی، تو نوٹوں کے عوض اکثر پوری ہوئی تھی ـــــ ممدو اب بھی اُسے آہستہ آہستہ اصل قصہ سمجھا رہا تھا۔ "مگر صاحب یہ دراصل یوں آوارہ نہیں۔ یعنی اُس کا شوہر کسی کے پاس نہ بھیجے تو نہیں جاتی۔ بتائیے یہ اچھی بات ہے یا بُری؟ اور یہ کم بخت سات سال سے برابر اُس سے عاشقی جتاتا رہتا۔ جب نانبائی نہ ہوتا تو اُس سے آکے کہتا تجھے مار ڈالوں گا۔ کبھی کہتا خود مر جاؤں گا۔ نانبائی نے اسے کئی مرتبہ ٹھوکا پیٹا بھی۔ مگر بڑا بے حیا ہے صاحب۔ آج نانبائی ملک التجار کے دروازے کے اندر نان کے بچے ہوئے خوان واپس لے جانے کے لیے آیا تھا کہ یہ آ پہنچا اور اُس کی عورت سے پوچھا۔ بول تو میری ہوتی ہے یا نہیں؟ اُس نے گالیاں دیں۔ تو صاحب اس نے یہ بھرا ہوا تیزاب کا پیالہ اُس کے مُنہ پر انڈیل دیا کہ اگر تیری حسین صورت میری نہیں ہو سکتی تو میں اس صورت کو مٹا دوں گا۔"

پھر ممدو نے آہستہ سے اُسی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں صاحب سے کہا: "دیکھیے صاحب وہ پسرِ خوک بار بار ہمارے خواجہ ملک التجار کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہا ہے کہ یہ کم بخت" خواجہ صاحب ملک التجار کے پاس تو جاتی تھی اور میں جو اس کی چاہ میں ایڑیاں رگڑتا تھا، میرے ساتھ ایسا سلوک کرتی تھی۔ اس نے میرے دل کو توڑا میں نے اس کی صورت کو مٹایا۔

پھر ممدو، غضنفر جُو کو سمجھانے لگا کہ خواجہ صاحب آپ یہاں سے ٹل جایئے۔ کیوں ان کمینوں کے مُنہ لگتے ہیں۔ غضنفر جُو اپنے اسکاچ مہمان سے ہزارہا معافیاں چاہتے ہوئے اُنھیں اوپر لے آئے۔ جہاں ایک چار سال کے بچّے نے چائے کے جالیدار سماور کو ایک ہمدانی ریشمی قالین پر اُلٹ دیا تھا۔ جس کی وجہ سے کڑھے ہوئے فارسی شعر ـــــ جو کسی زاویے سے سفید اور چمکتے ہوئے نظر آتے اور کسی زاویے سے مدھم ـــــ داغ دار ہو گئے تھے۔ باہر ایک حسین عورت کا چہرہ تیزاب سے جھلس گیا۔ یہاں اندر ایک ہمدانی قالین جس کی قیمت ہزار روپیہ سے کم نہ ہوگی۔ ایک بچّے کی شوخی کی وجہ سے تباہ ہو گیا تھا۔

باہر مجمع شور مچارہا تھا۔ اور سَر پھٹوّل ہو رہی تھی۔ اندر قالین پر لڑکا ہنس رہا تھا۔ اور مُلازم سہما ہوا کھڑا تھا اور جانتا تھا کہ اب اس مہمان کے رُخصت ہوتے ہی میری نوکری ختم۔ اگر بچّے کو روکتا اور روکنے میں وہ رونے لگ جاتا، تب بھی نوکری ختم تھی۔ یہ زندگی بھی کیسا تاگا ہے جس کے دونوں سِرے جلتے ہیں۔ لیکن قالین بدلا گیا۔ سماور میں دوسری چائے آئی اور غضنفر جُو نے ادب سے اپنے صاحبزادے کو اپنے انگریز مہمان کے روبرو پیش کر کے اُس کا نام بتایا۔ "سکندر جُو!" ساتھ ہی صاحب سے اُنھوں نے دو اہم معاملوں میں رائے طلب کی۔ ایک تو یہ کہ اُنھوں نے سُنا تھا کہ ایک مشہور مُسلمان مصلح سیّد احمد خاں نے علی گڑھ میں ایک مدرسہ کھول رکھا ہے۔ جہاں انگریزی تعلیم دی جاتی تھی۔ مگر سُنا جاتا تھا۔ وہاں لڑکے نیچری ہو جاتے ہیں۔ کیا میں اپنے لڑکے کو بڑا ہونے پر وہاں بھیجوں؛ دوسرا سوال یہ تھا کہ بمبئی اور کلکتہ میں میری دوکانیں ہیں، کیا میں لندن میں بھی ایک دوکان کھول دوں؛ اور تھوک سامان یہاں سے براہِ راست بھیجوں؛ اس آخری تجویز کی مسٹر میک نائر نے بہت تائید کی۔ مُسکرائے اور دل میں کہا۔ اچھا ہے۔ اس ایشیائی کو مہاجنوں سے مہاجنی کرنے دو۔ ظاہر ہے۔ جن قافلوں کو قراقرم اور زوجی لا پر انسانوں کی بھینٹ چڑھانا پڑے۔ ان کی آخری منزل محض سرینگر یا بمبئی کیسے ہو سکتی ہے۔

اس اثنا میں قالین فروشوں کا بادشاہ اپنے چہار سالہ صاحبزادے سکندر جُو کو بہت نرمی اور تمکنت سے آہستہ آہستہ روک رہا تھا کہ وہ اپنے محبُوب مشغلے کی ضِد میں کہیں یہ دُوسرا سماور بھی اس نئے قالین پر اُلٹ نہ دے اور انھوں نے اُسے کشمیری میں آہستہ سے سمجھایا۔ "صاحب لوگوں کے سامنے بدتمیزی نہیں کرتے۔ قرینے سے بیٹھو" اور سکندر جُو نے ذرا تعجب سے اجنبی کی طرف دیکھا۔

۲

سکندر جُو سے مجھے سب سے پہلے میرے اُستاد مسٹر میک نائر ہی نے ملایا اور کہاں پیرس میں گاروبیاں پر۔ یہ ۱۹۲۶ء کا ذِکر ہے۔ مسٹر میک نائر اب وظیفہ پر سبکدوش ہو کے اپنے محبُوب وطن تراساخس میں جا بسے تھے۔ فرانس میں وہ اپنے عزیز دوست مسٹر

رابرٹ گریوز سے ملنے اکثر آتے تھے۔ تعارف سے پہلے انھوں نے پلیٹ فارم سے سکندر جُو کو جنیوا جانے والی گاڑی کے ایک دوسرے درجے کے ڈبے میں سر جھکائے بیٹھے دیکھا اور مجھ سے پھر اُس واقعہ کی طرف اشارہ کیا جو ۱۹۰۷ء میں سری نگر میں پیش آیا تھا۔ یہ بتایا کہ غضنفر جُو نے اُن کے مشورے کے بعد جو دوکان لندن میں کھولی تھی۔ وہ لاکھوں روپے کے منافع کے بعد اب بند ہوگئی تھی۔ اور غالباً سکندر جُو نے اُس کا سامان کسی اور کو بیچ دیا ہوگا۔ بہرحال انھوں نے مجھے سکندر جُو سے ملایا جس کے والد سے مرتے دم تک اُن کے دوستانہ تعلقات رہے تھے۔ اب رہا یہ واقعہ کہ اُس دن سکندر جُو اس قدر مغموم کیوں تھا۔ وہ جینیوا کیوں جا رہا تھا۔ اس کی زندگی کے ایک ایسے باب سے تعلق رکھتا ہے جو سکندر جُو کی اجازت سے میں نے اپنے ناول "دو پہر کے دانت" میں بیان کیا ہے اور جس کا اس قصے سے کوئی تعلق نہیں۔

کشمیر جانا، اور وہ بھی حیدر آباد سے، کارے دارد۔ یہاں جُون میں چھٹیاں ختم ہوتی ہیں۔ جُون کی جھلستی گرمی میں تین دن ریل میں گذار ئیے۔ اور کشمیر کی تین مہینے کی محنت اکارت ہیں یہی سُنتا تھا اور بار بار سکندر جُو کے دعوت ناموں کو ٹالتا رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۲ء میں مَیں ہمت کر کے نکل کھڑا ہوا۔

اپریل ہی کا مہینہ تھا اور اتوار کا دن اور کوئی تین بجے ہوں گے۔ ظاہر ہے یہ وقت شالامار یا نشاط کے سوا اور کہاں گزارا جاسکتا۔ بہار اس سال جلدی آگئی تھی اور ابھی سے چنار کے پتے چوڑے چکلے، اور گہرے سبز رنگ کے ہوچکے تھے۔ خود رو پھولوں کی بہار قریب الختم تھی۔ سُرخ سُرخ پھُول جنھیں لالہ کہہ لیجیے یا گوکنار اب بھی ہزاروں کی تعداد میں بام پور کے راستے میں سَر ہلا رہے تھے مگر سری نگر میں کم ہی نظر آتے تھے۔ جہانگیر کا پُورا سامانِ طرب قدرت پھر سنوار رہی تھی اور کشمیر گورنمنٹ نے اتوار کو نہریں بنانے کا انتظام کیا تھا۔ سکندر جُو نے شالامار کے اُس چبوترے پر قالین بچھوایا۔ جہاں نہر تین چادروں میں بٹ کے گرتی ہیں اور آج بھی مُغل صناعی کی گواہی دیتی ہے۔ اُس کا ملازم سماور گرم کر رہا تھا۔ پیچھے مہادیو کی تیرہ ہزار فیٹ اُونچی چوٹی پر برف کا تاج گل کے دو پلّی ٹوپی بن کے رہ گیا۔

تھا۔ سامنے البتہ پیر پنجال کی شمالی سمت کا برف آفتاب کی کرنوں کی دست بُرد سے مقابلتاً محفوظ ہر مسافر سے کہہ رہا تھا کہ میری پیری برحق ہے۔ شاید ہی کوئی گرمی کا موسم خضاب لگا سکے۔ شالامار میں ابھی سے جمگھٹ تھا۔ گنجے سر والے مرد کثیف لیکن کامدار چوغے پہنے ہوئے شرفا، اُن کی مستورات کچھ صاف بُرقعوں میں مُنہ چھپائے، کچھ غلیظ بُرقعوں سے مُنہ نکالے، کچھ پنجابی شلواریں، کہیں کہیں پورے نوگز کی مدراسی ساڑی اور سلیکس میں کبھی کبھی کوئی انگریز عورت، کسی نوجوان فوجی افسر کے ساتھ۔ اس عورت کو کوئی جاڑوں اور افسروں کے کال کے زمانے کا ہندوستانی دوست مل جاتا اور بچنا ناممکن ہوتا تو کہتی "کتنا مجمع ہے۔ اسی لیے مَیں اتوار کو یہاں نہیں آتی"۔ کوئی انگریز دوست ملتا تو کہتی "مَیں کبھی اتوار کو ان باغوں میں نہیں آتی۔ کیسا وحشتناک مجمع ہے —— ہندوستانیوں کا"۔ لیکن سب سے زیادہ آفریں تو غریب، نادار، بھوکے کشمیری مزدوروں اور مسکینوں پر کھانے کو کچھ نہیں، مگر قدرت کی قدر تو ہر ذی رُوح کا پیدائشی حق ہے۔ میلوں سے پیدل آئے۔ سماور سے چائے پی۔ باغ میں چند گھنٹے گزارے، اور پھر وہی گندی کوٹھڑی جس میں نہ ہوا کا گذر نہ روشنی کا۔ اور چاروں طرف چلدی بیماریاں۔

اسی طبقے کی ایک عورت بڑے میلے بُرقعے سے مُنہ نکالے۔ چبوترے کے نیچے آئی۔ سماور میں پانی بھرا۔ اُس کی عمر یہی چالیس سال کی ہوگی۔ جتنے بال کھُلی ہوئی نقاب سے نظر آتے تھے۔ اُن میں کہیں کہیں چاندی کے تار بھی تھے۔ مَیں نے دیکھا کہ سماور میں پانی بھرتے ہوئے اور اُس کے بعد بھی اُس کی نگاہیں برابر سکندر جُو کی طرف لگی رہیں۔ سکندر جُو کی نظر بھی اُس پر ایک بار پڑی اور مجھے محسوس ہوا کہ ناممکن ہے۔ نگاہوں کی یہ برقی کشش بے بنیاد ہو۔

"سکندر دیکھو وہ عورت تمھیں گھور رہی تھی"۔ مَیں نے کہا۔ اب وہ سامنے کے قطعے پر پہنچ چکی تھی۔ جہاں اُس کے دو میلے کچیلے بچے، اُس کے بلسے بے ڈھنگے بُرقعے سے اُلجھ رہے تھے۔

ایک لمحے کے لیے سکندر جُو کے چہرے پر کوئی اندرونی چراغ چمکا۔ مَیں نے اُس کی

آنکھوں میں اُس کی لَو دیکھی۔ پھر عشرت سرا کے فانوس کی طرح جو ہر رات ایک نیا برہنہ جسم دیکھتے دیکھتے تھک گیا ہو، بجھ گیا۔ مَیں نے اس مرتبہ غور سے سکندر جُو کے چہرے کے نقوش کا مطالعہ کیا۔ لمبا سُتواں چہرہ، لمبی ناک، چھوٹی چھوٹی تیز آنکھیں، پتلے مگر ہوس پرست ہونٹ، ہموار صاف دانت، سَر پر بال زیادہ گھنے نہ تھے۔ نشست میں بھی اُس کے جسم میں درخت کی سی راست قدمی چھیالیس سال کی عُمر میں بھی وہ یقیناً عورتوں کو رِجھا سکتا تھا۔ لیکن یہ عورت جو ابھی سماور میں پانی لینے آئی تھی۔ کوئی "سرراہے" قسم کی نظر ڈال کے نہیں گئی تھی۔ اور بہت جلد مجھے سکندر جُو نے اُس کا اور اپنا قصّہ سُنایا۔

اب اگر یہ قصّہ آپ کو سکندر جُو کے الفاظ میں سُنایا جائے تو آپ جناب شباب نانبائی شانبائی، مکان شکان کی بہتات سے تھک جائیں گے۔ جو قصّہ میں نے سُنا وہ یہ تھا۔

یہ عورت اُس نانبائی کی لڑکی تھی۔ جس کی عورت پر اُس کے نامراد عاشق نے تیزاب پھینکا تھا۔ تیزاب کی غارتگری کے بعد غضنفر جُو کی سرپرستی تو فوراً ختم ہوگئی کشمیر میں ہزارہا، ماجھی نانبائی اور مہتر ہیں جن کے گھروں میں بھی عورتیں ہیں۔ لیکن نانبائی کی محبت میں کوئی فرق نہ آیا اور تیزاب کے واقعے کے کوئی دو سال بعد ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ تیزاب اور رشک اور ناکامیِ محبت نے جتنا حسن تیزاب بن کر اُس کی ماں کی صورت سے چُرایا تھا۔ اُسے مع سُود در سُود کے قدرت نے اس ننھی سی لڑکی کو دیا اور جب نانبائی کی جورُو نے اُس لڑکی کو مالکہ، یعنی سکندر جُو کی ماں کی قدموں میں لا کے ڈالا تو وہ اپنے دو سال پہلے کا سارا جلاپا بھول کے کشمیری زبان میں بے اختیار چلّا اُٹھی۔ "زون"۔

"یہ زون شون کوئی عام نام نہیں ہے"۔ مجھے سمجھاتے ہوئے سکندر جُو نے کہا۔ "کشمیری میں چاند کو زُون کہتے ہیں"۔

وہ جُوں جُوں بڑھتی گئی۔ اُس کا حُسن بڑھتا گیا۔ جیسے چاند کا حُسن بڑھتا ہے۔ مگر چودہ سال کی عُمر میں اُس کے حسن نے چاند کی پیروی نہیں کی۔ پندرہواں، سولہواں، سترہواں ہر سال اُس کے حسن میں اضافہ ہی کرتا گیا۔ ایک نانبائی کے لونڈے سے اُس

کی شادی بھی ہوئی۔ اُس کے ایک بچّہ بھی ہوا جو چھ مہینے دودھ پی کے مر گیا، مگر اُس کا حُسن نکھرتا ہی گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ سکندر جوؔ علی گڑھ میں پڑھ رہا تھا۔ اُس نے بی۔ اے بھی پاس کر لیا۔ اور ال۔ ال۔ بی کی تیاری کرنے لگا۔ وہ جوان تھا۔ پاک دامن بھی نہ تھا۔ کیوں کہ علی گڑھ، دہلی، اور سری نگر میں معلوم نہیں۔ کتنی اینگلو انڈین اور انگریز لڑکیوں پر وہ ہزاروں روپے پھُونک چکا تھا۔ باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اور جس نے چار سال کی عمر میں ایک ہزار کے قالین پر کشمیری جائے سے گُل بُوٹے بنانے سیکھے ہوں۔ اُس کی طالب علمی کتنے ٹھاٹھ سے نہ گذری ہوگی۔

مگر زُون کے حُسن نے، معلوم نہیں کیوں، اُسے اب تک مشتعل نہیں کیا تھا۔ ممکن ہے اُس کے لاشعور پر یہ روک ہو کہ اُس کے والد نانبائیوں کی بہت زیادہ سرپرستی کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ سستے اور ہلکے "شکاروں" کو اس کی مشکل پسندی گوارا ہی نہ کرتی تھی۔ بی۔ اے اور ال۔ ال۔ بی کی اور میانی گرما کی چھٹیوں میں جب اُس کا دوست ابوالحسن آیا۔ تب اُسے احساس ہوا کہ کوئی زُون پر اِس قدر فریفتہ بھی ہو سکتا ہے۔ اسی زمانے میں اُس نے امدؔ کوچبان سے زُون کی ماں پر تیزاب پھینکے جانے کا قصہ دوبارہ سُنا اور اس مرتبہ اس قصّے میں اُسے زندگی کی مقناطیسی کشش کے ایسے معنی سمجھ میں آئے جو اب تک اُس کے تجربے سے باہر تھے۔

ابوالحسن اپنی کوششوں میں ناکام رہا۔ لیکن اُس کی دست درازیوں کا یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ زُون کے میاں کو شک ہو گیا اور اس کے بعد سے وہ اپنی چاندی بیوی کو اس قدر مارنے لگا کہ اُس کے مُکھڑے پر بھی نیلے روپ میں کبھی چندرماں کی بڑھیا آ کے چرخہ کاتنے لگتی۔ اُس کے ہاتھوں پیروں پر ہلدی تھوپنے کی نوبت آتی۔ یہاں تک کہ نانبائی نے اپنے داماد کو گھر سے نکال دیا۔

بدنامی اور غضنفر جوؔ کی ناراض، لیکن مہمان نوازی کی وجہ سے خاموش نظر کی ملامت کے ڈر سے تعطیلات سے مہینہ بھر پہلے ہی ابوالحسن بہانہ کر کے اپنے وطن میرٹھ واپس

چلا گیا۔

اب تک سکندر جوُ کو موافق ہوا سے سابقہ پڑا تھا۔ اینگلو انڈین لڑکی ہو تو مِلے، اِدھر اُدھر کی سیر کرائی۔ باپ سے چھپا کے سو دو سو کی ایک آدھ انگوٹھی دوکان سے لے کے اُس کی نذر کی۔ لیکن اتنے گراں سودے کی نوبت کم ہی آتی۔ ڈانس، دعوتوں اور معمولی تحفوں ہی سے کام چل جاتا۔

زوُن کو تو پہلے اُس نے امدو کے ہاتھ پیغام بھیجا۔ بیس روپے رات بھر کے لیے جس پھُنکنی سے وہ آگ پھُونک رہی تھی۔ وہی اُس نے امدو کے رسید کی۔ اس واقعہ سے سکندر جوُ کی دلچسپی اور بڑھ گئی۔

اُس نے دوسری ترکیبیں سوچیں۔ بڈھا نانبائی جو اپنی عورت کو غضنفر جوُ کے ہاتھ بیچ چکا تھا۔ اب شاید نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اور اُس کی بیٹی کے مُنہ پر بھی تیزاب چھڑکے، اور پھر اُسے حمیت فروشی کا طعنہ دے۔ وہ تو پہلے مجرم ہی کے چھُری بھونک چکا تھا اور سرکار نے اُسے معمولی سی سزا دینی بھی ضروری نہ سمجھی تھی۔ اِتنا اثر تھا ملک التجار کا۔ لیکن اب اُس نے نفع و نقصان کے اعتبار سے آخری اور اٹل تصفیہ یہ کر لیا تھا کہ انسانی گوشت کے مقابلے میں روٹیوں ہی کی تجارت اچھی ہے۔ اس لیے امدو نے سکندر جوُ کو صاف سمجھا دیا کہ بڈّھے کی طرف سے تو آپ ہاتھ دھو رکھیے۔

پھر اُس نے شہروں کی تمام ترکیبیں آزمائیں۔ اچھے سے اچھے سُوٹ پہن کے، مکان کے سامنے گندی گلی میں ٹہلا کرتا۔ اُس کی دوکان کے سامنے سے اُس کو گھُورتا ہوا گذر جاتا۔ وہ کبھی مُنہ پھیر لیتی۔ کبھی آنکھیں چار ہوتیں اور جب وہ آنکھ مارتا تو زوُن مُنہ چڑا دیتی۔ اُس کے سُرخ سُرخ خون سے لبریز ہونٹوں سے مُنہ چڑاتے میں اُس کے دانتوں کی جھلک کا نظارہ اُسے اور بھی تڑپا دیتا۔

زوُن اکثر آ کے گھر کا کام کاج کر جایا کرتی تھی۔ خصوصاً جب غضنفر جوُ کے یہاں کوئی بڑی دعوت ہوتی۔ ہندوستان کے ہر حصے میں امیروں کے زیرِ سایہ جو غربا رہتے ہیں۔ وہ اسے اپنا حق اور اپنی عزت سمجھتے ہیں۔ اور سکندر جوُ ہمیشہ موقع کی تلاش میں رہتا لیکن وہ ظالم ہمیشہ عین وقت پر کترا کے کہیں نہ کہیں نکل جاتی۔ کبھی اکیلی نہ ملتی۔

اُس کے علی گڑھ واپس جانے سے ایک دن پہلے وہ اسی طرح آئی تھی۔ وہ چکردار گھُرڈرا زینہ، جس پر سے چڑھ کے بیس بائیس سال پہلے مسٹر میک نائر نے قالینوں اور گاؤ تکیوں کے بہترین فرش کو نقشِ حیرت بن کے دیکھا تھا۔ ایسا تھا۔ جس پر سے ایک ہی آدمی آنِ واحد میں چڑھ یا اُتر سکتا۔ بالائی منزل پر وہ مشہور و معروف ڈرائینگ روم تھا۔ بیچ کی منزل میں سکندر جُو کے کمرے کا ایک دروازہ اس زینہ پر بھی کھُلتا تھا۔ اُس نے اپنی ماں کو زوُن سے کہتے سُنا کہ اوپر سے جا کے پھُولوں کی چنگیر اُٹھالا۔ جلدی سے وہ بھی اُس کے پیچھے ہولیا، لیکن اس قدر پیچھے کہ زوُن اُس کو نہ دیکھ سکے۔ اس زینے پر چڑھا۔ اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور ایک پَٹ کی آڑ میں کھڑا ہوگیا۔ وہ چنگیر لے کے نیچے اُتری تو سکندر نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اُس کے مُنہ سے چیخ نکلنے کے آثار دیکھ کے اُس نے دوسرے ہاتھ سے اُس کا مُنہ دبایا اور اُسے کمرے کے اندر کھینچ کے دروازہ بھیڑ لیا۔ مگر وہ تڑپ کے اُس کے بازوؤں کے شکنجے سے نکل گئی۔ یہ جھپٹ کے بند دروازے کے سامنے کھڑا ہوگیا اُس کا راستہ روکنے۔

وہ فیصلہ نہ کر سکی کہ چلّائے یا پہلے سکندر جُو سے بات کرے۔ غصہ اور کپکپاہٹ سے اُس کا حُسن سو دُبے زیادہ نکھر آیا تھا۔ بالوں کی ایک لٹ بائیں رُخسار پر بکھر گئی تھی۔ بالآخر اُس نے دانت کٹکٹا کے پوچھا: "تم چاہتے کیا ہو؟"

"مَیں تجھ کو چاہتا ہوں۔" سکندر جُو نے کہا۔

"تو مَیں کیا کروں؟" اُس نے سکندر جُو کو دروازے کے سامنے سے دھکیلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ابھی وہ صرف سترہ سال کی تھی۔ لیکن اُس کے جسم میں جنگلی بلّی کی سی لچک اور طاقت تھی۔ اُس نے اپنی اُنگلیوں کے میلے ناخن سکندر جُو کے بازوؤں میں گڑو دیے۔

"آج رات کو بارہ بجے آ۔ میں تیرا انتظار کروں گا۔"

"ابے چل بے ہیجڑے لونڈے۔" اور اُس نے اس زور سے سکندر جُو کے ہاتھ میں کاٹا کہ وہ بلبلا اُٹھا۔ اُس نے محسوس کیا کہ اب اُس کے دل میں بھی ایک ہی خواہش باقی ہے اور وہ یہ کہ اس چکردار زینے پر زوُن کو اس طرح دھکیلے کہ اُس کا سر پاش پاش ہوجائے

وہی تباہی کا زوجی لا والا۔ تیزاب والا عمل۔

اس کشمکش میں دروازہ کھلا۔ دروازے کے سامنے سکندر جُو کی ماں کھڑی تھی۔ بیوی ساری عُمر چار دیواری میں جلتی رہی تھی۔ اُس کے سَر کے بال وقت سے دس سال پہلے سفید ہوگئے تھے۔ کیا ماں کے لیے بھی کوئی راحت نہیں تھی۔ بیٹا تو علی گڑھ سے پڑھ کے آیا تھا۔ کیا وہ بھی باپ کی طرح ......

وہ صرف یہ دیکھ سکا کہ اُس کی ماں کی آنکھوں سے آنسُو بہہ رہے ہیں۔ اُس کی زبان نے کبھی اپنے میاں سے شکایت نہ کی تھی، آج اُس کی آنکھیں اپنے بیٹے کی خوشامد کر رہی تھیں۔ اور بالآخر بڑھیا کی زبان بھی ضبط نہ کر سکی "سُن زُون، جب سکندر چھٹیوں میں گھر آیا کرے تو تُو یہاں نہ آیا کر۔"

"یہ اچھی زبردستی ہے۔" ...... سوا اس کے سکندر جُو کا دل اُسے کچھ اور ملامت نہ کر سکا۔ اُس نے شام کو امدو سے یہ واقعہ بیان کیا۔ دوسرے دن جب وہ علی گڑھ جانے کے لیے گاڑی پر بیٹھا اور گاڑی نانبائی کی دوکان کے سامنے سے گذری تو زُون کھلکھلا کے، حلق سے ایک خشک سی آواز نکال کے ہنسی۔

سکندر جُو نے مجھ سے قسم کھا کے بیان کیا کہ اس واقعے سے پہلے اور اس کے بعد سب ملا کر سینکڑوں عورتوں کے پیچھے اُس نے وقت اور روپیہ تباہ کیا۔ لیکن کسی اور کے پیچھے کبھی اُس نے اپنا دل تباہ نہیں کیا۔ علی گڑھ میں سال بھر اکارت گیا۔ سردیوں کی چھٹیوں میں زُون کے عشق کی ہیبت سے اُس نے گھر کا رُخ نہ کیا۔ کلکتہ گیا اور وہاں جتنا وہ ناچ گھروں تماشا گاہوں کو جاتا، اُتنا ہی اُس کا دل گھبراتا۔ جب زُون کا خیال آتا تو اکثر ایک ٹھنڈی سی گہری سانس کی فکر میں پھیپھڑے رُک سے جاتے۔ یہ کیا بیماری تھی؟ خدا کی لعنت تھی۔ شاید یہی وہ چیز ہے جس کو عشق کہتے ہیں۔ جس میں انسان کسی اور کا اس طرح پابند اور غلام ہو جاتا ہے۔ وہ ذہین تو نہیں تھا مگر اس سے پہلے کبھی فیل نہ ہوا تھا۔ ال۔ ال۔ بی کے پہلے سال میں فیل ہوا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں گھر جانا ضروری تھا۔ گیا۔

امدو سے کسی طرح اُس کا حال نہ دیکھا گیا۔ یہ کوچبان بچپن میں اُسے گودوں کھلا چکا

تھا۔ اُس کی اپنی بیوی تو بِلا اولاد چھوڑے ہوئے کب کی مرکھپ گئی تھی۔ اب صرف دو چیزیں امدو کو پیاری تھیں۔ ایک تو ملک التجار کی گاڑی کا سفید ٹٹو، دوسرے ملک التجار کا بیٹا سکندر۔ دونوں کو اُس کی نگاہوں نے ایک ایک انچ بڑھتے، پروان چڑھتے، نکھرتے دیکھا تھا۔ اُس گھوڑے کے بعد یہ انسان ہی بڈّھے کوچبان کو سب سے زیادہ عزیز تھا۔

وہ بار بار جا کے زوّن سے سکندر کی بیتابی، بیقراری کا ذکر کرتا۔ وہ بار بار بڈّھے کوچبان کی ہنسی اُڑاتی اور اُس کے نوجوان مالک زادے کو کہتی۔ اگر وہ ہیجڑا نہ ہوتا تو بدمعاش ضرور ہوتا۔ امدو نے اور طرح طرح کی لڑکیاں سکندر کو دکھائیں۔ طرح طرح سے چاہا کہ اُس کی توجہ کو پلٹائے۔ پھر تھک ہار کے زوّن کی خوشامد کرتا رہا۔

آخر اُس کی باتوں کا جادو چل ہی گیا۔ زوّن نے اُس سے کہا۔ "میں تیری بات نہیں مانتی۔ وہ ابھی لونڈا ہے"۔

"اری وہ تجھ سے آٹھ نو سال بڑا ہے اور پورا ہندوستان پھر چکا ہے"۔

"مَیں تو جب جانوں، وہ خود مجھ سے کہے کہ مجھ پر مرتا ہے"۔

"کہہ تو چکا ہے"۔

"کمرے میں زبردستی بند کر کے؟ نہیں مَیں تو جب جانوں جب میری دوکان پر آ کر ناک گھِسے"۔

بالآخر خوش خوش امدو نے گاڑی میں سفید ٹٹو جوتا۔ اُسے معلوم تھا کہ بوڑھا نانبائی کِس وقت نان لے کے پانچویں میل تک خریداروں کو پہنچانے جاتا ہے۔ اُس کے جا چکنے کے بعد گاڑی میں سکندر بیٹھا اور امدو نے نانبائی کی دوکان کے سامنے لگام روک لی۔

امدو نے پوچھا۔ "میاں نانبائی کی دوکان کی کونسی مٹھائی تمھیں پسند ہے؟"

سکندر نے جواب دیا۔ "مَیں تو اُس پر مرتا ہوں جو چاند (زوّن) کے رنگ کی ہے"۔

اُس نے کہا۔ "نانبائی کی مٹھائی تو بہت مہنگی ہوتی ہے"۔

سکندر نے جواب دیا۔ "مَیں دو سو روپے کے کپڑے دوں گا اور چار سو نقد"۔

تب کوچوان نے گاڑی بڑھائی۔

دوسری شام کو سکندر نے دیکھا کہ کوچبان مکان کے سب سے اوپر کے کمرے میں جو ڈرائینگ روم سے ملحق تھا۔ لیکن جہاں وسط ایشیائی قالینوں کے بجائے ٹوٹے پھوٹے سامان کا گودام تھا۔ دیوار توڑنے کا سامان لے کے جارہا ہے۔ رات کو اُس نے نقب لگائی اور سکندر جُو اپنی والدہ کے صندوقچے سے وہ کڑے نکال لایا جو اُس کی ہونے والی بیوی کے لیے بنائے گئے تھے اور جس سے شادی کئی سال سے ہر سال ٹل رہی تھی۔ چار سو روپیہ اُس نے مُنیم سے منگوائے۔ رات کے اندھیرے میں، اُوپری منزل کی اس نقب سے کوئی بیس پچیس فٹ نیچے وہ رسّی کی مدد سے اترا۔ رسّی کی رگڑ سے اُس کے ہاتھ چھِل گئے تھے اور کئی جگہ سے خون نکل آیا تھا۔ کوچبان کے کہنے کے مطابق ایک تنگ کھڑکی کھُلی ہوئی تھی۔ اس کھڑکی کے راستے اُس نے اپنے جسم کو بمشکل ایک ایسے کمرے میں داخل کیا۔ جہاں گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ چاروں طرف ٹٹول کے اُس نے اپنا راستہ تلاش کرنا چاہا۔ کمرے کے ایک سرے پر گھاس کا ایک بچھونا سا تھا۔ اس پر پشمینے کے کھُردرے فرش کو اُس کے ہاتھوں نے محسوس کیا۔ سکندر جُو کا دل بلّیوں اُچھل رہا تھا۔ معلوم نہیں اس پشمینے پر سوتا ہوا جسم کس کا تھا؟ یہ کس کا کمرہ تھا؟

دفعتہً اُس نے کافی بلند آواز میں زون کا لہجہ سُنا "کون ہے؟" اُس کے پیروں کے نیچے زمین نکل گئی۔ بازو کے کمرے میں بوڑھا نابابائی سو رہا ہوگا۔ "تو یہاں کیوں آیا۔ میں چیخ کر اپنے باپ کو بُلاتی ہوں۔"

سکندر جُو اُس کے قدموں پر گر پڑا۔ اُس کے نازک ہاتھوں کو اپنی چھِلی ہوئی ہتھیلیوں سے مس کر کے اُسے بتایا کہ کس مصیبت سے وہ یہاں تک پہنچا۔ پھر ان ہی کانپتی ہوئی، چھِلی ہوئی ہتھیلیوں سے سونے کے کڑے اُسے پہنائے۔ اُس کے ہاتھوں میں گِن گِن کے چار بڑے بڑے نوٹ جو سو سو ہی کے ہو سکتے تھے، رکھے، جن کو اُس نے اپنے تکیے کے سرہانے رکھ دیا اور بالآخر وہ کھِلکھِلا کے ہنس پڑی۔

رات پُوری گذرنے بھی نہیں پائی تھی کہ صبح کے اُجیالے کے ڈر سے کوچبان نے حسبِ وعدہ

سیٹی بجائی۔ رسّی پکڑ کے وہ پھر اوپر چڑھا۔ وفادار امدو نے دیوار کی نقب بند کی اور نشان کی جگہ گھیری چھتوں کی گھاس کا ایک انبار سا ڈال دیا۔

اپنی والدہ کے قدموں پر گر کے سکندر جُو نے کرتوں کا قصہ بیان کیا اور وہ ممتا کی ماری بھی سمجھ گئی کہ شاید ہر نسل میں یہی ہوتا آیا ہے، یہی ہوتا رہے گا۔

ہر دوسری تیسری رات کو سکندر جُو اسی طرح جایا کرتا۔ نقب لگتی۔ صبح ہونے سے پہلے وہ واپس آتا۔ نقب بند کی جاتی۔ پھر یہ راز کھلنے لگا اور سکندر جُو اور زون کی عاشقی کا قصہ عام ہونے لگا۔ غضنفر جُو خود کو نہ روک سکے تھے۔ اب اپنے بیٹے کو اس راستے سے روکنا چاہتے تھے۔ انھوں نے زون کے مرد کو بُلا بھیجا۔ اُس کے ساتھ زون کو رخصت کر کے بارہ موے بھجوا دیا اور اُس کے مرد کو تحصیل کے چپراسیوں میں بھرتی کروا دیا۔

"سُنا ہے دو تین سال ہوئے اُس کا خاوند مر مرا گیا۔ بوڑھا نانبائی شانبائی کب کا مر چکا ہے۔ میں تو اب تیسرے پُل پر رہتا ہوں چھٹے پُل والا مکان کرایہ پر ہے۔ یہ بڑی غربت سے رہتی ہوگی شاید" سکندر جُو نے قصہ ختم کرتے ہوئے کہا۔ لندن کی دوکان ختم ہو چکی تھی اور جنگ کی وجہ سے یارقندی کارواں نہیں آرہے تھے۔ لیکن سکندر جُو اب بھی لکھ پتی تھے۔ بمبئی اور کلکتہ کی دوکانیں چل رہی تھیں۔ اگر وہ چاہتے تو بیس روپیہ میں ایک بیوہ اور دو یتیموں کا خرچ چل سکتا۔ لیکن زوجی لا کا اور یلانش، تیزاب کی بوتل اور زون کا چالیسواں سال بچوڑی ہوئی ہڈی کے لیے کس دسترخوان پر جگہ ہے۔

وہ پھر سمادر دھونے نہر پر آئی۔ پھر اُس نے سکندر جُو کو دیکھا۔ میں نے غور کیا تو دیکھا کہ ابھی حُسن کے آثار اُس کے چہرے سے بالکل غائب نہیں ہوئے ہیں۔ جیسے دارا شکوہ کی دلبری بے تاہری کی سب سے عبرتناک یادگار یعنی پری محل کا کھنڈر، جہاں منظر اور بھوتوں اور جنگلی پھولوں کے سوا کچھ نہیں یا جیسے پچیسویں تاریخ کا چاند —!

○○

رائیگاں تبسّم

ہندوستان کے ایک مشہور قومی لیڈر لندن آئے۔ کانگریس اور مُسلم لیگ دونوں سے ان کی اَن بن تھی۔ بین الاقوامی اور قومی اشتراکیت، اشتمالیت اور فاشسطیت سے یہ یکساں بیزار تھے۔ آزاد ان سے پہلی بار لندن کے ایک بڑے ہوٹل میں ایک دعوت میں مِلا۔ اُس کے بعد کئی بار اُس کو اِن بزرگِ قوم اور بزرگِ ملّت سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ آزاد پر بہت مہربان تھے اور اپنے طرابلس الغرب اور طرابلس الشرق کے سفرنامے آزاد کو سُنایا کرتے تھے۔ دُنیائے اسلام کی تمام نامور ہستیوں سے ان لیڈر صاحب کی ملاقات تھی۔ یارہ چکی تھی۔

ایک بار انھوں نے آزاد کو بہت سی نصیحتیں کیں۔ سمجھایا کہ ہندوستانی نوجوان بالعموم اور مُسلمان نوجوان بالخصوص جب انگلستان آتے ہیں تو طرح طرح کی خرابیوں میں مُبتلا ہوجاتے ہیں۔ اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ اور جب ہندوستان واپس ہوتے ہیں تو اپنے اہلِ وطن کا وقت ضائع کرتے ہیں۔

لیکن ان لیڈر صاحب کی ایک صفت سے آزاد کو بڑی طمانیت ہوتی تھی۔ اُن کا وعظ مسدسِ حالی کی طرح روکھا پھیکا نہ ہوتا تھا۔ کبھی کبھی وہ آزاد اور دوسرے نوجوانوں کو عبرت دلانے کی خاطر اپنی جوانی اور اُس زمانے کے ہائیڈ پارک کے حالات کا بھی ذکر کرتے تھے۔

آخر میں ہدایت کرتے تھے۔ "محبت کرنا ہے تو کرو۔ کیوں کہ محبت بڑی اچھی چیز ہے مگر اچھی لڑکیوں سے محبت کرو اور اصلی محبت کرو۔ سفلی محبت میں ہرگز مت پھنسو۔"

کالج میں ایک لڑکی آزاد کی ہم جماعت تھی۔ اُس کی شکل صورت تو معمولی ہی سی تھی۔ معمولی سے کچھ کم۔ اُس کے والدین نے اُس کا نام بھی کچھ عجیب سا رکھا تھا ـــــ گریزلڈا، لیکن محبت کسی نہ کسی بہانے کی متلاشی ہوتی ہے۔ آزاد ایک زمانے سے لیڈر صاحب کی نصیحت کے بعد، کسی اچھی لڑکی سے محبت کرنے اور اصلی محبت کرنے، اور سچی محبت کرنے کا متلاشی تھا۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ اُس نے اس بات پر غور کیا کہ اُس نے اب تک غور نہیں کیا تھا کہ گریزل ڈا کے بال ترشے ہوئے نہیں ہیں۔ بلکہ پیچھے بندھے ہوئے ہیں۔ بالوں کا رنگ ہلکا سنہرا تھا۔ اُس نے ہندوستان میں لمبے لمبے کالے بال تو دیکھے تھے مگر سنہرے بال ہمیشہ ترشے ہوئے ہی دیکھے تھے۔ کاکل عنبریں کی بہاریں تو اُس نے بہت دیکھی تھیں اب وہ کاکل عصفریں یا کاکل زریں کی بہار دیکھنے کو تڑپ رہا تھا۔

اُس نے اُس لڑکی سے دوستی بڑھانے کی بڑی کوشش کی۔ لیکن وہ اینگلو کیتھولک تھی اور مذہب کی بڑی پابند۔ ملتی تو بہت اخلاق سے تھی۔ لیکن اس کا ذرا بھی موقع نہ دیتی کہ آزاد محبت کا ایک آدھ جُملہ زبان پر لاسکے۔ آزاد نے جتنی ترکیبیں یاد تھیں۔ سب آزمائیں۔ اُس کو چائے پر بلایا تو اُس نے معافی چاہ لی۔ ہندوستانی کھانا کھانے کو ایک ہندوستانی ریسٹوران میں بُلایا تو اُس نے پہلے تو وعدہ کرلیا۔ پھر عین وقت پر اُس کی چِٹھی آئی۔ جس میں اُس نے بہت بہت معافی چاہی تھی۔ اور کسی ضروری کام کے باعث معذوری ظاہر کی تھی۔ اسی طرح سنیما، تھیٹر، میوزموں اور نمائشوں میں ساتھ چلنے کی تمام تر دعوتوں کو وہ برابر مسترد کرتی رہی۔

اور آزاد کی بے تابی بڑھتی جارہی تھی کہ کسی طرح اُس کی زلفِ عصفریں کی قربت نصیب ہو۔ لیکن خلوت میں قربت نصیب ہونے کی کوئی صورت ہی نظر نہ آتی تھی۔

ایک روز لیڈر صاحب اخبارات کے نمائندوں کو بیان دے رہے تھے کہ میاں آزاد جا پہنچے۔ نمائندوں کے رُخصت ہوجانے کے بعد میاں آزاد نے لیڈر صاحب سے کہا کہ

میں ایک ضروری کام سے آپ کے پاس آیا ہوں۔"

"ضروری کام"! لیڈر صاحب ذرا چکرائے۔ اس لونڈے کا مجھ سے کیا ضروری کام ہوسکتا ہے۔

پھر انھوں نے باآواز بلند پوچھا: "لارڈ ـــــ کے نام سفارشی چِٹّھی چاہتے ہو؟"

"جی نہیں۔"

"شاید سیاسیات ہند پر کوئی مضمون لکھ رہے ہو اور میری مدد چاہتے ہو۔ مگر مجھے زیادہ فرصت نہیں۔ اخبارات میں میں نے جو بیانات دیے ہیں۔ اُن سے میری رائے تمھیں معلوم ہوسکتی ہے۔"

"جی نہیں۔ سیاسیات سے مجھے زیادہ تعلّق نہیں۔ میرا مضمون تو آپ جانتے ہیں، جغرافیہ ہے۔"

"جغرافیہ؟"

"جی ہاں۔"

پھر لیڈر صاحب نے کہا: "شاید تمھیں روپے پیسے کی ضرورت ہے مگر میں خود آجکل"۔۔۔۔۔

آزاد نے کہا: "جی نہیں، اللہ کا دیا، باپ کا کمایا ہوا بہت موجود ہے۔"

لیڈر صاحب خاموش ہوگئے اور اب انھیں یاد آیا کہ انھوں نے سرے سے آزاد کو بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔

آزاد نے ذرا ہمّت کرکے کہا: "میں آپ سے ایک ضروری معاملے میں مشورہ کرنے آیا ہوں۔"

"ضرور ضرور، میں حاضر ہوں۔"

"آپ کی نصیحت کے مطابق، میں سچے عِشق میں مُبتلا ہوگیا ہوں"۔۔۔۔۔ اور اس کے بعد آزاد نے اپنی ہلکے سُنہرے بالوں والی، متوسط طبقے والی، عجیب نام والی، مذہب کی پکّی، اور عِشق سے بے پروا معشوقہ سے عِشق کی کہانی اور اپنی نامرادی کی داستان سُنائی۔

شروع شروع تو لیڈر صاحب کے چہرے سے ذرا خفگی کے آثار پیدا ہوئے۔ یہ پہلی مرتبہ تھی کہ کوئی فرد غیر قومی معاملات میں اُن سے مشورہ لینے آیا تھا۔ انھوں نے اپنی ہتک بھی

محسوس کی کہ ایک بدتمیز نوجوان ایک لڑکی کو پھانسنے کے متعلق اُن کی قیمتی رائے دریافت کررہا ہے اور قیمتی وقت ضائع کررہا ہے۔

لیکن وہ حلم اور بُردباری اور ضبط اور موقع شناسی جو قومی لیڈر کا حصّہ ہے۔ رفتہ رفتہ اُن پر حاوی ہوتی گئی اور وہ دلچسپی سے آزاد کی حکایت سُننے لگے اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچے کہ آزاد قوم کا ایک فرد ہے، اور ایک فرد کی مدد کرنا قوم کی مدد کرنا ہے چنانچہ انھیں اقبالؔ کا یہ مصرع بھی یاد آگیا۔ ع

قوم کیا جسم ہے، افراد ہیں اعضائے قوم

آخر میں انھوں نے اپنی قیمتی رائے یوں ظاہر فرمائی "تم کو دراصل محبت نہیں محبت کا شک ہے۔ پہلے اپنا شک رفع کرلو۔ اگر اُس لڑکی کے ____ بقول تمھارے ____ کاکلِ عصفریں کو بندھا دیکھ کر تمھیں محبت کا شک ہوتا ہے تو ممکن ہے کہ کاکلِ عصفریں کو کھُلا اور پھیلا دیکھنے سے یہ شک یقین سے بدل جائے گا۔ پس ضرورت ہے کہ اس کا موقع تلاش کرو۔ موقع یوں ہاتھ آتا ہے کہ تمھارے کالج کے کلب کے آرائش کے کمرے میں جب وہ جائے تو موقع دیکھ کے تم جھانکو۔ وہ جب اپنے بالوں میں کنگھی کرے گی تو ضرور بالوں کو کھولے گی تو اُس کی زلفِ عصفریں تمھیں پھیلی ہوئی نظر آئے گی۔ اُس کے بعد محبت کا شک یقین سے بدل جائے گا۔ اُس کے بعد سچّی محبت پر قائم رہو۔ وہ اگر مسلمان ہونے پر تیّار نہ ہو تو تم اینگلو کیتھولک عیسائی بن جاؤ۔ ضرور تمھیں کامیابی ہوگی اور اگر کامیابی نہ بھی ہوئی۔ پھر بھی کیا، عشق اور ناکامی تو دراصل ایک ہیں۔ اچھا اب خدا حافظ!"

اس تجربہ کار لیڈر کی اس زرّیں نصیحت کا آزاد پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ اُس نے جُھک کر لیڈر صاحب کا ہاتھ چُوم لیا۔

آزاد اپنا اوور کوٹ پہن کے دروازہ کھول ہی رہا تھا کہ لیڈر صاحب نے کہا "ہاں ایک بات یاد رکھنا۔ وہ بھی جوان ہے اور تم بھی جوان۔ اگر کبھی شیطان غالب ہو تو کوئی احتیاطی تدبیر ضرور کرنا۔ ورنہ اگر وہ لڑکی معصوم ہے تو تم اُس کی زندگی خراب کروگے اور اگر وہ معصوم نہیں ہے تو تمھاری زندگی خراب ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ کیوں کہ.....

اچھا اب جاؤ۔"

آزاد لیڈر صاحب کا بہت بہت شکریہ ادا کرتا ہوا۔ اور دل میں بہت خوش ٹیوب اسٹیشن پہنچا۔ اُس کے تخیل میں گریزل ڈا کی ایسی تصویر تھی جیسے تی تیان نے میگڈالین کی کھینچی ہے۔ صاف شفاف بھرے ہوئے سینے پر بکھرے ہوئے سنہرے بال۔

تی تیان کے اس شاہکار کو زندہ دیکھنے کی خوشی میں آزاد اِدھر سے اُدھر پلیٹ فارم پر ٹہل رہا تھا۔ آلڈوچ کو ایک ہی گاڑی آتی تھی۔ وہی ہوبرن کو واپس جاتی اور وہاں سے پھر واپس آتی۔ کئی منٹ تک وہ ٹہلتا رہا۔ پلیٹ فارم پر اس کے سوا صرف ایک لڑکی تھی جس کے بال تو ترشے ہوئے تھے مگر وہ آزاد کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

آزاد نے اُس کی طرف دیکھا تو وہ اور زیادہ مسکرائی۔

دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ معمولی متوسط طبقے کی لڑکی ہوگی۔ کسی دفتر میں ٹائپسٹ ہوگی یا اسی قسم کا کوئی اور کام کرتی ہوگی۔ کپڑے ذرا سلیقے سے پہنے ہوئے تھی اور آزاد نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ اس سے پہلے کسی نہ کسی ہندوستانی سے اس لڑکی کی دوستی رہ چکی ہے۔ اُس کے واپس چلے جانے کے بعد اُسے پھر کسی اور ہندوستانی کی تلاش ہے۔

کیوں کہ آزاد کو دیکھ کر وہ برابر بہت ہی ہمت افزا طریقے پر مسکرا رہی تھی اور ٹہلتے ٹہلتے وہ آزاد کے پاس سے ہو کر اسی طرح مسکراتی ہوئی گذری۔

اگر آزاد مسکرا دیتا تو کافی تھا۔ مگر وہ تو تی تیان کی تصویر کی طرح گریزل ڈا کے سینے پر بکھرے ہوئے سنہرے بالوں کا اور سچی اور اصلی محبت کا خواب دیکھ رہا تھا۔

پلیٹ فارم پر کچھ لوگ آ گئے اور پھر وہ چھوٹی سی ریل بھی آ گئی جو آلڈوچ اور ہوبرن کے زمین دوز اسٹیشنوں کے درمیان چکر لگایا کرتی ہے۔

آزاد اور وہ مسکراتی ہوئی لڑکی ایک ہی ڈبے میں بیٹھے۔ آزاد اخبار پھیلائے ہوئے بجائے کچھ پڑھنے کے تی تیان کی بنائی خیالی تصویر دیکھ رہا تھا اور اُس نے اخبار اُٹھا کر دیکھا تو لڑکی کی بیکار مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی تھی۔

اب بھی اگر وہ ہوبرن کے اسٹیشن پر اُس سے بات چیت کرتا۔ تو وہ اُس کی

ہو سکتی تھی۔

مگر گریزل ڈا اور اصلی محبت اور تی تیان اور گھنے سنہرے بال۔

اسٹیشن سے نکل کر وہ لڑکی سڑک کے مجمع میں مل جل کر نظر سے غائب ہو گئی۔

اُس کے غائب ہو جانے کے بعد آزاد کو کسی قدر افسوس ہوا۔

لیڈر صاحب کی نصیحت کے مطابق آزاد نے چھپ کر گریزل ڈا کے کاکلِ عصفرین کی بہار دیکھی۔ مگر بہار کچھ ایسی زیادہ نہ تھی اور تی تیان کی میگڈالن سے اُسے کوئی نسبت نہ تھی اور چوں کہ عشق کا یہ قلعہ آسانی سے سَر نہ ہو سکتا تھا۔ اس لیے آزاد نے اُسے زیادہ دَرد سری کے قابل نہ سمجھا اور کچھ دِنوں کے بعد گریزل ڈا کی بد صورتی اس پر اور واضح ہو گئی اور اصلی اور سچی محبت ختم ہو گئی۔

تب تو آزاد کو اپنی حماقت سے ٹیوب اسٹیشن والی مسکراتی ہوئی لڑکی کے کھو دینے کا اور بھی افسوس ہونے لگا۔

○○

زن زلل

رات بڑی گرم تھی، اور چاندنی کے نور میں بھی ایک طرح کا حبس تھا۔ کسی طرح کی ہوا چلتی خواہ گرم ہی سہی تو یہ حال نہ ہوتا، لیکن بحیرۂ احمر کے دونوں طرف کا ریگستان خاموش تھا۔ نہ سموم ہی چل رہی تھی نہ ریگستانی رات کی خنک ہوا۔

مہ پیکر نے پوری شام سوئیمنگ پول میں گذاری تھی۔ مگر کوئی رات بھر تو نہانے کے لباس میں سوئیمنگ پول میں نہیں گزار سکتا۔ بڑی ہی سُریلی آواز میں دونوں دل پھینک قبول صورت اطالوی نوجوانوں سے "ادیو" کہہ کے وہ کپڑے بدلنے اپنے کیبن چلی گئی۔

اس گرمی، اس حبس اور اس پسینے میں بھی ولی ہوشیار خاں کا رات کا کھانے کا لباس ویسا ہی مکمّل تھا کہیں شکن تک نہیں، نہ چہرے پر، نہ سفید شارک اسکن کے کوٹ پر اور نہ سیاہ پتلون پر، ہر کریز تلوار کی طرح تیز اور مکمّل تھی، اور پسینہ وہ بڑی احتیاط سے اپنی چمکتی ہوئی پیشانی یا پتلے پتلے ہونٹوں یا سڈول ٹھڈی سے پوچھنے کے لیے تین انگلیوں سے پکڑ کے ریشمی رومال کھینچتا اور پھر اُسی سلیقے سے رکھ دیتا۔

سوئیمنگ پول میں مہ پیکر حد سے زیادہ حسین معلوم ہوتی تھی۔ سُرمئی رنگ کا سوئیمنگ کوسٹیوم، جو اُس کی سفید شفاف رنگت پر سمندری شفق میں اتنا دلکش معلوم ہو رہا تھا۔ اُس کے جسم کا ہر ہر خط ایسا حسین اور ایسا مدوّر تھا۔ آہستہ سے سگریٹ کا کش لے کے

ولی ہوشیار خاں نے سوچا کہ اِن دونوں نظر باز، دل پھینک اطالویوں کو حق نہیں پہنچتا نہ اتنی زیادہ نظر بازی کا، نہ اتنی شولری کا، مگر ہر نئی چیز دلچسپ معلوم ہوتی ہے اور ان اطالویوں کی جذباتیت، ان کے چمکتے ہوئے دانت ان کی زبان کی روانی سے مہ پیکر مسحور سی تھی۔

ولی ہوشیار خاں اپنے آپ کو فن کار سمجھتا تھا۔ فن کار، حسن کار آرٹسٹ، ایسا آرٹسٹ جس نے کچھ اپنے ہاتھوں سے تخلیق نہیں کیا۔ یعنی وہ سنگ تراش تھا، نہ مصور، نہ شاعر، نہ ادیب، لیکن اپنے ذہن میں وہ بہت کچھ تخلیق کرتا تھا، کروچے کی اظہاریت کا زندہ مظہر اصلی فن وہ ہے جو فن کار کے ذہن میں وجود میں آتا ہے، شعر یا نغمہ یا تصویر تو اس کی نامکمل سی نقل ہے اور میکیاولی اور سیزر بورجیا بھی تو کروچے ہی کے ہمعصر تھے، کون کہہ سکتا ہے کہ وہ آرٹسٹ نہیں تھے۔ ان دونوں اطالویوں کے مقابلے میں اپنے آپ کو اطالوی میکیاولی اور سیزر بورجیا سے تشبیہہ دیتے ہیں وہ اپنے تخیل پر مسکرایا۔ وہ بھی تو آرٹسٹ تھا۔ ساز باز اور جوڑ توڑ میں بساط شطرنج خواہ سیاست کی ہو خواہ عشق بازی کی۔ اپنے آپ پر مزید تبصرہ کر کے اس نے اپنی جیب سے طلائی سگریٹ کیس نکالا۔ اور طنزاً دونوں اطالویوں کی طرف بڑھایا۔ جنھوں نے "گراتسیے" کہہ کہہ کے ہاتھ بڑھائے اور اپنے اپنے کیبنوں کو کپڑے بدلنے چلے گئے۔

مہ پیکر آئی اور ڈک کے کٹہرے کے پاس کھڑی ہوگئی۔ مسکرا کے اس نے ولی ہوشیار خاں کی طرف دیکھا اور اپنے طلائی بیگ سے چھوٹا سا سگریٹ کیس نکالا۔ ولی ہوشیار خاں نے لائٹر سلگایا۔ شعلہ کو ہوا سے بچانے کی ضرورت نہیں تھی کیوں کہ ہوا کا پتہ ہی نہیں تھا۔ یوں ہی شیریں، پُر وقار مسکراہٹ سے مہ پیکر نے شعلے کا خیر مقدم کیا۔

"ولی ــــ بڑی گرمی ہے۔" شیریں مسکراہٹ نے کہا۔ دانت لبوں کی گہری اعلےٰ درجے کی سُرخی میں چمک رہے تھے۔

"بڑی گرمی ہے۔" بڑی شائستگی سے چھوٹی چھوٹی کالی مونچھوں نے مسکرا کے جواب دیا۔

"چاند نہ ہوتا تو یہ رات دُنیا کی بدترین رات ہوتی۔" کٹہرے کی طرف جھک کے مہ پیکر نے کہا۔

"کوئی رات بدترین نہیں ہوسکتی، جب آپ موجود ہوں" ولی ہوشیار خاں نے کہا۔

"یہی مجھ سے وہ اطالوی کہہ رہا تھا، مرد بالکل ایک طرح کے کمپلی منٹ کیوں دیتے ہیں، انھیں کوئی نئی بات کیوں نہیں سوجھتی" دونوں حسین ترکمانی رخساروں کی ہڈیاں، اور ان کے اوپر نیلی سمندری رنگ کی آنکھیں مذاق اڑانے لگیں۔

"اطالوی کو یہ تو معلوم نہیں ہوگا کہ مہ پیکر کے معنی کیا ہیں۔ چاند جیسا جسم۔ میں نے آپ ہی کے جملے کی تشریح کی ..... "

"بنال سی بات — ولی" وہ پھر ہنسی اڑا کے مسکرائی —"بنال سی بات"

مہ پیکر ہلکا آسمانی رنگ کا فراک پہنے تھی۔ ساڑیاں بمبئی کا ساحل دور ہونے کے بعد ہی مفقود ہوگئی تھیں۔ اور اس اطالوی جہاز پر جہاں دوسرے درجے کی تصویریں دیواروں پر آرائش تھیں، اور آرکسٹرا پہلے درجے کے راگ سناتا تھا ——— تو بالکل نہیں۔ وہ زیادہ تر سوئیمنگ کوسٹوم پہنے رہتی۔ اور صرف رات کے کھانے کے وقت ہلکا سا ریشمی فراک — بحیرۂ قلزم ابھی ایک دن ایک رات دور تھا۔

شاطر نے مسکرا کر ترکمانی رخساروں کی طرف دیکھا، جو جہاز پر چاند کی ہلکی سی روشنی میں جگمگا رہے تھے۔

"میں آپ کو ایک نئی بات سناؤں۔ ایسی بات جو آپ نے اس سے پہلے نہیں سنی ہوگی"

"اور ولی وہ کیا بات ہے؟"

"چاند کی کہانی"

وہ کھلکھلا کے ہنسی "وہی کہانی جو بچوں کو سنائی جاتی ہے"

وہ ہنس کر کہنے لگا "نہیں وہ کہانی جو حسین عورتوں کو سنائی جاتی ہے پہلی کہانی جو مہذب انسانوں نے چاند کے متعلق لکھی"

"یہ تو دلچسپ سی ہوگی" ٹھنڈی سانس لے کے وہ کہنے لگی۔ اس نے چاند کی طرف

حسرت سے دیکھا، ریگستانوں کا، بحیرۂ قلزم کا چاند۔"

"یہ کہانی بابل کے چاند کی ہے۔" مہ پیکر کے قریب کٹہرے پر ہاتھ رکھ کے ولی نے اپنا بے رونق سگریٹ سمندر میں پھینک دیا۔ اس کا جھاگ اس گرم رات کو بھی بے کیف نہیں معلوم ہوتا تھا۔

"اب سے کئی ہزار سال پہلے بابل میں ایک شہر تھانی پور تھا۔ انسانوں سے پہلے اس شہر میں دیوتاؤں کی آبادی تھی۔ اسی شہر میں میٹھے پانی کا ایک کنواں تھا۔ اور وہاں ایک نہر تھی۔ نن بردو۔ جس کا پانی چمکیلا تھا" اور وہاں ایک نوجوان رہتا تھا۔ جو این ال تھا۔ سورج کا دیوتا تھا۔ اور وہاں ایک دوشیزہ رہتی تھی جس کا نام نن لِل تھا اور اس دوشیزہ کی ماں کا نام نن شے بارگونو تھا۔

اور نن شے بارگونو اپنی لڑکی نن لِل کو سمجھاتی تھی۔

صاف نہر میں نہ نہانا، اے عورت شفاف نہر میں نہ نہانا۔

نن لل صاف نہر میں نہ نہانا۔ اے دوشیزہ شفاف نہر میں نہ نہانا۔

اے نن لِل نہرِ ننِ بردو کے کناروں پر نہ چڑھنا۔

چمکتی آنکھوں والا، جگمگاتی آنکھوں والا سورج آقا تجھے دیکھ لے گا۔ پہاڑوں والا آقا این لِل تجھے دیکھ لے گا۔

اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں سے وہ تجھے دیکھ لے گا۔ وہ چرواہا وہ قسمتوں کا مقدر کرنے والا۔ وہ کہیں تجھے اپنی آغوش میں نہ لے لے، کہیں وہ تجھے پیار نہ کرے۔"

مہ پیکر نے پھر اپنے سگریٹ کیس سے ایک اور مائی ڈارلنگ نکالا۔ اور بجائے مسکراہٹ کے اس کے چہرے پر ایسا غیر معمولی حسن تھا جو شدید ترین چاندنی ہی میں ممکن معلوم ہو سکتا ہے۔ جب کہ چاندنی کی کرنوں میں خد و خال تحلیل ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

"سنائے جاؤ ...... ولی سنائے جاؤ۔ قصہ دلچسپ ہے" مہ پیکر نے ولی سے کہا۔

لائٹر کا شعلہ اسی طرح بلا روک ٹوک جل رہا تھا۔

اور پھر ولی ہوشیار خاں نے شائستگی سے مسکرا کے کہانی سنانی شروع کی۔ "لیکن نن لِل جوان تھی۔ ضدی تھی، اور خود سر تھی۔ اس نے اپنی ماں کی نصیحت نہیں مانی۔

وہ پاکیزہ دوشیزہ اسی نہر پر نہانے گئی۔ نہر کے کنارے، نہرِ نن بر ڈو کے کنارے پر نن لِل چڑھ گئی۔

پھر وہی ہوا جس کا اُس کی ماں نِن شے بار گونو کو اندیشہ تھا۔ این لِل نے اپنی چمکتی ہوئی آنکھ سے اُسے دیکھ لیا۔۔۔۔۔"

دونوں اطالوی جو کپڑے بدل کے کھانا کھانے جا رہے تھے، جہاز کے عرشے پر سے گذرتے ہوئے مہ پیکر کی طرف دیکھ کر سر خم کر کے مُسکرائے۔ لیکن مہ پیکر اس کہانی میں اس قدر محو تھی کہ اس نے نہیں دیکھا لیکن ولی ہوشیار خاں کی چمکتی ہوئی آنکھ نے یہ دیکھ لیا۔ بڑے اطمینان سے مہ پیکر کا یہ انہماک محسوس کر کے اس نے پھر سے کہنا شروع کیا۔

"این لِل کی چمکتی ہوئی آنکھ نے اُسے دیکھ لیا۔ این لِل نے اُس سے وصال کی درخواست کی اور جب وہ راضی نہیں ہوئی تو زبردستی اس سے ہم وصل ہوا۔ اور اس کے شکم میں ایک بچہ رہ گیا سِین، یہ چاند کا دیوتا بنا۔"

مہ پیکر نے گہری سانس لی، اور مُسکرائی۔ جلدی سے ولی ہوشیار خاں نے کہا۔ لیکن این لِل کو اس گناہ کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ وہ جب شہر واپس آیا اور شہر کے بڑے میدان میں پھر رہا تھا تو اُسے گرفتار کر کے دیوتاؤں کے سامنے پیش کیا گیا۔ سات دیوتا جو سب سے زیادہ طاقتور تھے انھوں نے بالاتفاق شہر بدر کیا اس الزام میں کہ اس نے ایسے سخت گناہ کا ارتکاب کیا تھا جس کی سخت ممانعت تھی۔

سورج کے نوجوان دیوتا این لِل نے اس حکم کی تعمیل میں شہر چھوڑا۔ اور جہنم کے علاقوں کا رُخ کیا مگر نن لِل بھی اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئی۔ لیکن این لِل اب اس کا ساتھ نہیں دینا چاہتا تھا۔ دوسری طرف وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ جس طرح اس نے اس معصوم لڑکی کی عصمت لُوٹی اور کوئی بھی یہی سلوک اس کے ساتھ کرے، چلتے چلتے پہلا آدمی جو اسے ملا وہ شہر کے دروازے کا دربان تھا۔

دربان سے این لِل نے کہا اے دروازے والے، اے قفل والے، اے کنجی والے، اے مقدس قفل والے تیری ملکہ نِن لِل اِدھر آ رہی ہے، اگر وہ تجھ سے پُوچھے کہ میں کہاں ہوں

تو اسے کچھ نہ بتانا۔ تاکید کرکے این لِل نے دربان سے کہا کہ اے دروازے والے، اے قفل والے، اے مقدس زنجیر والے، تیری ملکہ نِن لِل اِدھر آ رہی ہے، وہ لڑکی جو اتنی حسین، اِتنی خوبصورت ہے، اے دربان دیکھ اُسے اپنی آغوش میں نہ لینا۔ اسے پیار نہ کرنا۔ کیوں کہ اس حسین اور دلکش نِن لِل پر تیرے آقا نِن لِل نے عنایت کی ہے، اپنی جگمگاتی آنکھوں سے اُسے دیکھ لیا ہے۔

این لِل نے خود دَربان کا بھیس بدل لیا۔ اور جب نِن لِل وہاں پہنچی تو این لِل ہی کو دربان سمجھی۔ اس نے کہا این لِل تیرا آقا ہے اور چوں کہ میرے پیٹ میں این لِل کا بچّہ ہے، جو سین ہوگا، چاند کا دیوتا بنے گا، این لِل تیرا آقا ہے اور میں تیری ملکہ ہوں۔ مجھے راستہ دے۔

این لِل نے جو دربان کے بھیس میں تھا کہا کہ اے ملکہ تیرے شکم میں میرے آقا سورج دیوتا این لِل کا لڑکا ہے، سین ہے، چاند کا دیوتا، اسے لے کے تو جہنم کیسے جائے گی۔ اسے لے کے تو تجھے اوپر آسمانوں پر جانا چاہیئے۔ اگر تو جہنم کو جانا چاہتی ہے تو میرا لڑکا لے کر جا۔

اس طرح دربان کے بھیس میں اُس نے نِن لِل کے شکم میں ایک اور لڑکا چھوڑا جس کو بابل والے میس لام ٹائے ٹیا کہتے ہیں اور جہنم کا دیوتا مانتے ہیں۔

این لِل نے جہنم کے علاقوں کی طرف پھر اپنا سفر شروع کیا۔ اور نِن لِل اس کے تعاقب میں روانہ ہوئی۔ یہاں تک کہ وہ ندی آئی جس کے پار جہنم واقع ہے اور اس ندی پر ایک کشتی تھی، اور اس کشتی میں ایک ملّاح تھا، دربان کی طرح این لِل نے اس کا بھی بھیس بدلا۔ اور اس مرتبہ پھر نن لل کے بطن میں جہنم کے ایک اور دیوتا نے جنم پایا جس کا نام کسی کو معلوم نہیں ...."

یہاں تک کہانی کہہ کے ولی ہوشیار خاں نے آہستہ سے سگریٹ نکالا اور مہ پیکر نے ذرا شائستہ سی بے صبری سے پوچھا۔

"ہاں ولی پھر کیا ہوا۔ بالآخر این لِل نے نِن لِل کو اپنی بیوی بنایا یا نہیں

بنایا۔"

اپنا سگریٹ جلا کے اور لائٹر کا شعلہ گل کر کے ولی ہوشیار خاں نے آہستہ سے جواب دیا۔" یہاں کہانی ختم ہوتی ہے۔ این لِل اور نِن لِل کی شان میں ایک بھجن پر۔ زندگی کے اور بہت سے واقعات کی طرح یہ داستان بھی نا تمام ہی رہ گئی ۔ ۔ ۔ ۔"

تکان اور افسردگی کے عالم میں ماہ پیکر نے بحیرۂ قلزم کے تیز، پُر نور گرم چاند کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سمندر کی موج جھلکنے لگی۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ اپنی خوبصورت انگلیاں اٹھا کے ایک ہلکی سی جمائی کو روکا۔ گھڑی کے ہندسے نیم تاریکی میں چمکنے لگے۔ بلیوں کی آنکھیں۔ اور اس نے کہا۔

"چلیں۔ کھانے کا وقت گذرا جا رہا ہے۔ ۔ ۔ ۔"

ممُوشکا

تعطیلات کی وجہ سے اُن دنوں آزاد بجائے کالج کے سینٹ جوزف انٹرنیشنل کلب چائے پینے شام کو جایا کرتا تھا۔ جون ۱۹۳۶ء کی ایک شام کو جب کہ لندن کا مطلع بہت صاف تھا اور انگلستان کا موسم گرما اپنی پوری بہار پر تھا۔ وہ حسبِ معمول کلب پہنچا اور چاروں طرف نظر دوڑائی کہ اُس کی جان پہچان کے لوگ کہاں بیٹھے ہیں۔ ایک لمحہ تک وہ یہ سوچا کیا کہ کن دوستوں کے ساتھ کس میز پر چائے پیے۔

چاروں طرف سے باتوں کی آوازیں آرہی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ ہنسی کی آوازیں۔ انگریزی، جرمن، فرانسیسی اور ہندوستانی جملے ملے جلے سُنائی دے رہے تھے۔ اگرچہ کہ ہندوستانیوں کی اکثریت، حسب معمول آج بھی ضرورت سے زیادہ تھی۔ پھر بھی دوسری اقوام کے لوگ اتنے کافی تھے کہ کلب کی شام بین الاقوامی معلوم ہوتی تھی۔

جب وہ چاروں طرف نظر دوڑا رہا تھا اور اُس کی نظر سنہرے بالوں یا ہلکے زرد رنگ کے بالوں میں بار بار اٹک رہی تھی۔ اُس نے دیکھا کہ کمرے کے ایک کونے میں بالکل تنہا۔ ایک نہایت درجہ خوبصورت لڑکی بیٹھی ہوئی ہے۔ اس لڑکی کے بال راکھ کی رنگت کے تھے، مانگ سر کے بیچوں بیچ تھی جو یورپ میں کم نظر آتی ہے۔ بال دونوں طرف رخساروں پر بار بار گرتے تھے اور جب وہ سر کو جنبش دیتی تو اس حرکت سے ایک عجیب

شانِ دلربائی پیدا ہوتی۔ اُس کا چہرہ اور جسم سانچے میں ڈھلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ نازک اور چھریرا سا جسم۔ اُس کے ہاتھ میں کلب کی لائبریری کی سبز جلد کی وہ مشہور و معروف کتاب تھی۔ جو اس قسم کے مواقع پر وہ کئی لڑکیوں کے ہاتھ میں دیکھ چکا تھا ـــــ گالزوردی کی "فور سایٹ ساگا"۔

اگر اس سے کوئی شرط باندھتا تو وہ بالکل تیار تھا کہ یہ لڑکی ہرگز انگریز نہیں ہو سکتی۔ جس قسم کی دلکشی اس لڑکی کے چہرے، اُس کے بالوں کی تراش اور اُس کے سادے مگر باسلیقہ لباس میں تھی۔ انگلستان کی لڑکیوں میں بہت کم نظر آتی ہے۔ مگر وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا کہ یہ لڑکی یورپ کے کس مُلک کی رہنے والی ہے۔

اُس نے دیکھا کہ اُس کے سوا اور بہت سی نظریں، خصوصیت سے ہندوستانیوں اور جرمنی کے پناہ گزین یہودیوں کی اس لڑکی پر پڑ رہی ہیں۔ لڑکی خود بھی غالباً تنہائی کو محسوس کر رہی تھی۔ کلب میں یقیناً وہ نئی تھی اور شاید ہی کوئی شخص اُس کی جان پہچان کا ہو۔ لیکن آزاد نے زیادہ مناسب نہیں سمجھا کہ جا کے اپنا تعارف کرائے ـــــ انگلستان بھر میں شاید یہی ایک کلب ایسا تھا جہاں اس بدعت کی خاص طور پر اجازت تھی۔ پھر بھی اُس کی سمجھ میں کوئی ایسی تدبیر نہ آئی کہ وہ فوراً جا کے اُس لڑکی سے گفتگو شروع کر دے۔

وہ ایک میز پر اپنے پُرانے دوستوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ بار بار وہ اُس لڑکی کی طرف دیکھتا تھا۔ اس عرصے میں کچھ لوگوں نے اُس لڑکی کے پاس پہنچ کے باتیں کرنا شروع کر دیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اُن کے ساتھ کمرے کے باہر چلی گئی۔ غالباً پنگ پانگ کھیلنے۔ اس کمرے کے نیچے پنگ پانگ کا کمرہ تھا۔

آزاد اپنی میز پر باتوں میں کچھ اس قدر گھر گیا کہ جلد اُٹھ نہ سکا۔ بہرحال تھوڑی دیر کے بعد کسی نہ کسی طرح بہانہ کر کے وہ اُٹھا اور پنگ پانگ کے کمرے میں پہنچا۔ وہاں وہ لڑکی موجود تھی۔

اُس کے آس پاس جو لوگ بیٹھے تھے۔ اُنھیں اُس نے سگریٹ پیش کی۔ اور اسی بہانے لڑکی کو بھی پیش کیا۔ اُس نے شکریہ ادا کر کے انکار کر دیا۔ مگر اِتنا سا بہانہ گفتگو کا

موقعہ پیدا کرنے کے لیے کافی تھا۔ اُس نے لڑکی سے اُس کا وطن پوچھا۔ اُس نے کہا۔ "سوئٹزر لینڈ۔"

آزاد نے پھر پوچھا: "سوئٹزر لینڈ کا کون سا حصہ؟"

لڑکی نے انگریزی تلفظ میں نام کو دُہرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "زیوریچ۔"

آزاد نے کہا: "مَیں تسیورک جا چکا ہوں" ___ "تسیورک" کہتے ہوئے اُس نے پوری طرح جرمن تلفظ ادا کرنے کی کوشش کی۔

لڑکی نے بے رُخی سے جواب دیا: "مگر بڑا غیر دلچسپ مقام ہے۔"

ایک ہندوستانی جو پاس بیٹھا تھا۔ لڑکی کے اس جواب پر اور آزاد کے سوالات کے سلسلے پر مسکرایا۔ آزاد نے پھر "فارسایٹ ساگا" کے متعلق گفتگو شروع کی اور خلافِ اُمید اس نتیجے پر پہنچا کہ اس لڑکی کو ادبیات سے کچھ زیادہ ذوق نہیں۔

"یہاں آپ کیا مضمون پڑھ رہی ہیں؟"

"صوتیات۔"

اُس نے نام پوچھا۔ لڑکی نے نہیں بتایا۔ بڑے اصرار پر اُس نے مذاق میں اپنا نام صوتیاتی حروف میں اس خیال سے لکھا کہ آزاد نہیں پڑھ سکے گا۔ لیکن باوجودیکہ آزاد کا مضمون جغرافیہ تھا۔ شروع شروع میں تفریحاً اس نے صوتیات کے درسوں میں کچھ دِنوں تک شرکت کی تھی۔ تاکہ اُس کا انگریزی تلفظ ٹھیک ہو سکے۔ بہرحال وہ مسکرایا اور اُس نے فوراً نام پڑھ لیا: "شولتزے۔"

اس خلافِ توقع ناکامی پر لڑکی کو مایوسی سی ہوئی۔ اسی اثنا میں اس کی باری آئی اور وہ اُٹھ کر پنگ پانگ کھیلنے لگی۔

آزاد پھر نشست کے کمرے میں واپس آیا اور ایک جرمن لڑکی سے جو بڑی پکی نازی تھی اور ہٹلر کی بڑی حامی۔ کچھ دیر تک بحث کرتا رہا۔ ایک اور جرمن لڑکا اُس کے ساتھ تھا۔ جرمن لڑکی نے آزاد سے اُس کا تعارف کرایا۔ یہ بالکل نووارد تھا اور انگریزی بڑی مشکل سے بولتا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد فرائے لاین شولتزے پنگ پانگ کے کمرے سے واپس آئی۔ ایک اور ہندوستانی اُس سے بہت ہنس ہنس کے باتیں کر رہا تھا اور اُس نے شولتزے کو اپنے حلقے میں شامل کرنے کے لیے ان جرمن دوستوں سے اس کا تعارف کرا دیا۔ بہت جلد سیاسیات پر بحث ہونے لگی۔ آس پاس کے تمام مُلکوں کی طرح سوئٹزرلینڈ کو بھی جرمن کی پان جرنیت کی حکمتِ عملی سے اندیشہ تھا۔ جرمن سوئٹزرلینڈ کی متوطن ہونے کی وجہ سے شولتزے بھی ہٹلر کی پالیسی کی مخالف تھی۔ بحث میں دونوں جرمن ایک طرف ہو گئے اور آزاد اور شولتزے ایک طرف۔

شام کے کھانے پر آزاد کو ایک اور دوست سے ملنا تھا۔ اُسے مجبوراً ان سب کو چھوڑ کر اٹھنا پڑا۔ جاتے وقت اُس نے سب سے ہاتھ ملایا اور شولتزے کا ہاتھ کسی قدر سرگرمی سے دبایا۔ شولتزے نے اپنا ہاتھ بے رُخی سے چھڑا لیا۔

تیسرے روز کلب کا سہ ماہی ناچ تھا۔

کلب کی تقریباً سب ہی لڑکیاں آزاد کی جان پہچان کی تھیں اور بعض سے دوستی تھی۔ جن میں سے ہر ایک کے ساتھ کم سے کم ایک بار ناچنا ضروری تھا۔ پھر بھی وہ بار بار شولتزے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شولتزے ہلکے سبز رنگ کا سادہ سا لباس پہنے تھی۔ اُس کے سَر پر گہرا سبز ربن تھا جو اُس کی بیچ سر میں نکلی ہوئی مانگ کے دو ٹکڑے کر رہا تھا۔ وہ اُس مجمع میں سب سے زیادہ بھلی معلوم ہو رہی تھی۔

ایک پارسی لڑکا درباری ناچ کے ہال میں آیا۔ شولتزے فوراً ہی بے اختیار ہو کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ دونوں نے ناچنا شروع کیا۔ اور آزاد بہت کچھ سمجھ گیا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ لڑکی درباری کو چاہتی ہے مگر آزاد کو کسی قدر تعجب بھی ہوا۔ درباری میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ ایمان کی پوچھیے تو وہ خود درباری سے کہیں زیادہ خوبصورت تھا۔ مگر معلوم نہیں کہ عورتوں کا معیار کیا ہوتا ہے۔

اُس نے یہ طے کر لیا کہ اُس لڑکی کا باقاعدہ تعاقب کرنا۔ اُس کے پیچھے وقت ضائع کرنا تقریباً بیکار ہوگا۔ بہر حال مذاق مذاق میں اُس نے ذرا دوستی بڑھانے کا ارادہ کیا۔

کچھ نہ سہی۔ تفریح ہی سہی۔

چنانچہ جب "اکسکیوزمی" (معاف کیجیے) ناچ کی باری آئی تو اسے اچھا موقع ملا۔ اس ناچ میں جو شخص چاہے کسی ناچتے ہوئے جوڑے کو روک کے، ساتھی کو چھین سکتا ہے۔ اُس نے اس ناچ میں تین بار شولتزے کو درباری سے چھینا اور تینوں بار مختلف لوگوں نے اُس کو اُس سے چھین لیا۔

اُس کے بعد اُس نے باقاعدہ طور پر شولتزے کو ایک پورے ناچ کے لیے مدعو کیا۔ وہ اُس کے ساتھ ناچی۔ مگر دوبارہ جب اُس نے پھر دعوت دی تو اُس نے انکار کر دیا۔ درباری کے ساتھ وہ برابر ناچ رہی تھی۔ آزاد نے خیال کیا کہ یہ معاملہ کچھ یونہی ہے۔ زیادہ کامیابی کی توقع نہیں۔ اس جھنجھٹ میں نہ پڑنا ہی اچھا ہے۔

اس لیے اُس رات وہ دوسری بڑی جماعتوں کے ساتھ ناچتا اور لطف اُٹھاتا رہا۔

تین چار دن کے بعد شام کے وقت آزاد اپنی ایک دوست کے ساتھ شیفٹس بری ایوے نیو میں گذر رہا تھا۔ اُس نے شولتزے اور درباری کو ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سامنے سے آتے دیکھا۔ آزاد مسکرایا تو جواباً وہ دونوں بھی مسکرائے۔

آزاد نے کسی قدر کوفت ضرور محسوس کی۔

ہفتہ بھر تک اُسے کلب جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ایک شام کو وہ وہاں گیا تو شولتزے ملاقات کے کمرے کے دروازے کے پاس کھڑی ہوئی بظاہر کسی کا انتظار کر رہی تھی۔ آزاد نے سلام کرنے کو اپنی ٹوپی اُٹھائی اور شولتزے نے ہلکی سی مسکراہٹ سے جواب دیا۔

آزاد کو ذرا شرارت سوجھی۔ اُس کے پاس ٹھہر کے وہ بولا "چھوٹے بچوں کو اس طرح دوسروں کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔ جب آپ بڑی ہو جائیں۔ تب آپ کا اختیار ہے۔"

مذاق کچھ مہمل ہی سا تھا مگر شولتزے کو ہنسی سی آگئی "میں بالکل بچہ بھی نہیں ہوں میری عمر اُنیس سال کی ہے۔"

حالانکہ وہ سترہ سال سے زیادہ کی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ آزاد نے کہا: "میں تو سمجھا تھا کہ آپ کی عمر چودہ سال سے زیادہ نہیں۔"

اس پر وہ ہنسی تو آزاد نے تسخیر کی آخری کوشش کرتے ہوئے کہا: "کاؤنٹ، گارڈن، یس کل شام "رگولیتو" ہے۔ اگر آپ کو فرصت ہو تو . . . ."

"نہیں۔ مجھے بالکل فرصت نہیں . . . . لیکن دعوت کا بہت بہت شکریہ۔"

آزاد بچارا اپنا سامنہ لے کے رہ گیا۔ تعظیماً اس نے پھر ٹوپی اٹھائی اور کلوک روم کی طرف چل دیا۔

اس کے کچھ دن بعد تعطیلات گذارنے آزاد انگلستان سے باہر چلا گیا۔

دوسرا تعلیمی سال شروع ہوا تو وہ واپس آیا۔ لیکن شولتسے اپنے وطن واپس جا چکی تھی۔ آزاد اسے بھول گیا۔ ۱۹۳۷ء کا موسم گرما آیا۔ آزاد پھر یورپ کے سفر کو نکلا۔

جرمن میون شن (میونک) کو بڑا خوبصورت شہر سمجھتے ہیں۔ آزاد اس شہر کی خوبصورتی کا تو کبھی بھی زیادہ قائل نہیں رہا۔ لیکن ہر شہر کی خوبصورتی کا لطف اسے جبھی آتا تھا کہ کوئی حسین ہم نشین ساتھ ہو۔

تین دن تک وہ شہر میون شن (جس کو انگریز میونک کہتے ہیں اور حیدرآباد کے اردو اخبارات میونخ) کی سڑکوں اور گلیوں کی خاک چھانتا رہا۔ تین راتوں تک وہ اس شہر کے قہوہ خانوں اور رقص گاہوں کے چکر کاٹتا رہا۔ یوں تو کئی لڑکیاں اسے دیکھ کے مسکرائیں لیکن کسی نہ کسی بات کی وجہ سے کوئی اسے بہت زیادہ پسند نہ آئی۔ وہ خود کئی لڑکیوں کو دیکھ کے مسکرایا۔ مگر کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ اس سے پہلے جب وہ یہاں آیا تھا تو اتفاق سے اسے ایک بڑی اچھی لڑکی مل گئی تھی۔ مگر وہ لڑکی اب شرقی پروشیا میں کونگس برگ میں تھی۔ اس کی بڑی بہن یہاں تھی مگر آزاد کو وہ زیادہ پسند نہ آئی۔

وہ تقریباً ناامید سا ہو گیا۔ اور یہ سوچ کے کہ کسی اور شہر میں قسمت آزمائی کرنی چاہیے اس نے نیورن برگ جانے کی ٹھانی۔ نازی پارٹی کے ایک محبوب شہر میں مطلب حاصل نہ ہوا تو

دوسرے محبوب شہر میں سہی۔

وہ اسٹیشن کے قریب گوئٹے اشتراسا میں ایک چھوٹے سے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا یہاں سے وہ اس ارادے سے اسٹیشن کی طرف چلا کہ گاڑیوں کے آنے جانے کا وقت معلوم کرے اور یہ طے کرے کہ کس گاڑی سے نیورن برگ جانا چاہیے۔

راستے میں سڑک کی دوسری طرف اُس نے ایک لڑکی کی جھلک دیکھی جو کھانے پینے کی چیزوں کی ایک چھوٹی سی دوکان میں داخل ہو رہی تھی۔ وہ ذرا ٹھٹھک سا گیا۔ وہ اُس لڑکی کی ذرا سی جھلک ہی دیکھ سکا تھا۔ اُس کی مانگ بیچ سر میں نکلی ہوئی تھی اور سر پر چوڑا سیاہ ربن تھا۔

آزاد سڑک کی دوسری طرف پہنچ کے دروازے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ دروازے سے اُس نے جھانک کے دیکھا۔ لڑکی کے بال، اُس کے شانے، اُس کی پُشت شولتزے سے بہت مشابہ تھی۔ اِتنے میں سودا خرید کے وہ لڑکی پلٹی تو شولتزے ہی تھی۔

آزاد کو دیکھ کر وہ بھی ٹھٹھک گئی۔ "تم؟"

آزاد نے بھی تقریباً ساتھ ہی کہا۔ "تم؟" .... پھر اُس نے پوچھا۔ "تم یہاں کہاں؟"

"مگر تم یہاں کہاں ... ... یہاں کیا کر رہے ہو ... ... کب یہاں آئے؟"

آزاد صرف آخری فقرے کا جواب دے سکا۔ "تین روز ہوئے .. ... مگر تم یہاں کہاں ... ... خوب مُلاقات ہوئی۔ مجھے دُور سے دیکھ کے شبہ ہوا کہ ہو نہ ہو یہ فرائے لاین شولتزے ہے۔ میں ٹھہر گیا ..... "...

"اگر لندن میں اس طرح ملاقات ہوئی ہوتی تو تعجب نہ ہوتا۔ مگر یہاں.. ... تمھیں دیکھ کے میں بالکل بھول گئی کہ لندن میں ہوں یا میون شن میں۔"

"مگر تم یہاں کیسے؟"

"میں یہاں تعلیم پا رہی ہوں، اداکاری کی۔"

"کیا؟"

"اداکاری کی۔ میرا ارادہ اِسٹیج پر جانے کا ہے۔".. ... وہ ہنسی۔ "کچھ دنوں بعد

جب تم دوبارہ جرمنی آؤ گے تو میرا نام روشنی میں بڑے بڑے حرفوں پر لکھا ہوا تھیٹروں کے دروازوں پر نظر آئے گا۔"

یہ دیکھ کر کہ وہ لندن کے مقابلے میں کہیں زیادہ کھُل کے باتیں کر رہی ہے۔ آزاد نے اُسے اُسی وقت کھانے پر مدعو کیا۔ وہ انکار نہیں کر سکی۔ اُس کے دونوں ہاتھوں میں چھوٹے بڑے پارسل تھے۔ انھیں دکھا کے کہنے لگی "ان میں سے ایک میں آلو ہیں۔ دوسرے میں کپڑے ہیں۔ مجھے پانچ سات منٹ کی مہلت دو، میں یہ سب سامان گھر پر رکھ آؤں۔"

دونوں ساتھ ساتھ اُس کے گھر کی طرف پلٹے جو زیادہ دُور نہیں تھا۔ وہ کہنے لگی "تیسری منزل پر رہتی ہوں۔ کمرا چھوٹا اور گندا سا ہے، مگر سستا ہے، میری ماں مجھے خرچ کے لیے صرف تین مارک فی ہفتہ دے سکتی ہے۔ بہت کافی ہے۔ انھیں آلوؤں کے قتلے دوپہر کے کھانے کے لیے تلنے والی تھی۔"

"تمھاری ماں یہیں تمھارے ساتھ ہے؟"

"نہیں۔ وہ تو سوئٹزرلینڈ ہی میں ہیں۔ تسیورک میں۔"

"مگر انگلستان میں تو تم صوتیات پڑھ رہی تھیں؟"

"تاکہ میں انگلستان میں بھی ایکٹنگ کر سکوں۔ انگریزی جاننے سے اچھی طرح انگریزی بولنا زیادہ ضروری ہے۔" پھر وہ پلیٹ کے آزاد سے پوچھنے لگی "میرا انگریزی لہجہ بگڑ تو نہیں گیا تقریباً سال بھر کے بعد آج پھر مجھے انگریزی بولنے کا موقع ملا ہے۔"

"نہیں۔ کیا کہنے۔ مجھے خود تمھارے انگریزی لہجے پر رشک آتا ہے۔"

"یہ تو کوئی تعریف کی بات نہیں۔" اُس نے رُوکھے پن سے کہا۔ "تمھارا انگریزی لہجہ تو کچھ زیادہ اچھا نہیں۔"

یہ رُوکھاپن آزاد کو بہت اچھا معلوم ہوا۔ وہ ہنسا۔ اِتنے میں شولتزے چلتے چلتے رُک گئی۔ ایک کہن سال مکان سامنے تھا۔ جس کی بے رونقی اُس کے باغ کی رونق کے باوجود آنکھوں کو بُری معلوم ہوتی تھی۔

باغ کا لکڑی کا دروازہ کھول کے شولتزے نے کہا: "تم یہیں ٹھہرو۔" اور اس کے بعد درختوں میں ہوتی ہوئی مکان میں داخل ہو گئی۔

آزاد اپنے دل میں اس خداداد اتفاق پر غور کر رہا تھا۔ اگر کسی اور لڑکی سے اس طرح اتفاقاً ملاقات ہو گئی ہوتی تو شاید اُسے کوئی خاص خوشی نہ ہوتی۔ مگر شولتزے اُن چند، اُن خاص لڑکیوں میں سے تھی جو اُس کے لیے حد درجہ کشش رکھتی تھیں۔

شولتزے واپس آ گئی تو آزاد نے پوچھا "کھانا کہاں کھائیں؟" — راٹ ہاوز (ٹاؤن ہال) کے قریب ایک پُرانا مشہور ریستوران تھا۔ جو شولتزے کو بہت پسند تھا۔ شولتزے نے آزاد سے اُس کا ذکر کیا۔ وہ اب بہت کھُل کے اور بڑی بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھی۔

"مجھے تو بالکل کل کی بات معلوم ہو رہی ہے کہ لندن میں تم سے ملاقات ہوئی تھی"۔

"میں نے تمھیں کاونٹ گارڈن میں رِگولیتو دیکھنے کی دعوت دی تھی اور تم نے انکار کر دیا تھا۔ جس سے مجھے بڑی مایوسی ہوئی تھی۔" یہ کہہ کر آزاد ہنسا۔

"اور میں نے صوتیاتی حرفوں میں اپنا نام لکھا تھا۔ تم نے پڑھ لیا۔ جس سے مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔"

اس کے بعد وہ اپنے یہاں کے قیام کا ذکر کرنے لگی۔ اُس نے اپنے دوستوں کا ذکر کیا۔ ایک افغان سے اُس کی دوستی ہو گئی تھی۔ جس کا نام علی تھا۔ وہ غالباً وہاں انجنیرنگ کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ کہنے لگی کہ اُس نے علی کا تعارف ایک ہندو دوست سے کرایا، اور دونوں میں بالکل نہیں بنی۔

ریستوران میں جب وہ آزاد کے مقابل میز پر بیٹھ کے مُسکرائی تو بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ اُس کے ہاتھ کہنیوں تک عُریاں، اُس کے چہرے کو تھامے ہوئے تھے۔ دونوں طرف اُس کے رُخساروں کو اُس کے بال مس کر رہے تھے۔

وہ علی کا قصّہ بیان کرنے لگی۔ ایک رقص گاہ میں علی نے اُسے پہلی بار دیکھا۔ مہینے بھر تک اُس کا پیچھا کرتا رہا۔ طرح طرح سے اُس سے ملنے کی کوشش کرتا رہا۔ آخر ایک بار ایک

اور رقص گاہ میں یہ اُسے پھر ملی۔ اُس نے آ کے ناچنے کے لیے کہا۔ علی کا قد ساٹ فٹ تھا۔ مشرق کے لوگوں میں ایک خاص کشش ہوتی ہے۔ شولتسزے کہنے لگی۔ اُسے مشرق والوں سے معلوم نہیں کیوں اس قدر لگاؤ تھا۔ علی کی اس سے بہت گہری دوستی ہو گئی۔

آزاد نے سوال کیا۔ "اور اب؟"

"اب میں علی سے زیادہ نہیں ملتی۔ کام بہت ہے۔ میں اس قدر مصروف رہتی ہوں کہ عشق بازی کے لیے وقت نہیں ملتا۔" یہ کہہ کے وہ ہنسی۔

آزاد اُس کے حسین چہرے، اُس کے سانچے میں ڈھلے ہوئے شانوں اور بازوؤں کو دیکھ کر مبہوت ہو رہا تھا۔ بالآخر اُس نے کہا "جس طریقے سے تم بال بناتی ہو۔ مجھے بہت پسند ہے۔"

اُس نے جواب دیا۔ "اکثر لوگوں کو تعجب ہوتا ہے کہ میں کس طرح اس ربن سے بالوں کو سنبھال لیتی ہوں۔"

آزاد نے کہا۔ "تمھیں معلوم بھی ہے کہ تم بہت خوبصورت ہو؟"

کہنے لگی۔ "اکثر لڑکیاں جو خوبصورت ہوتی ہیں۔ اُن کو یہ معلوم ہو جاتا ہے۔ مگر مجھے بہت دیر کے بعد یہ معلوم ہوا۔"

"یعنی؟"

"اپنے متعلق میرا یہ نظریہ تھا کہ میری صورت معمولی ہے۔ میں سچ کہتی ہوں، مجھے اب بھی اپنی صورت پسند نہیں۔ لیکن اب سے چار برس پہلے میں کچھ سو رہی تھی۔ کچھ جاگ رہی تھی۔ میں نے اپنی ماں کو یہ کہتے ہوئے سُنا معلوم نہیں۔ میری بچی کا کیا حشر ہوگا۔ تیوورک میں تو کوئی اس سے شادی نہیں کرے گا۔"

"مگر کیوں؟" آزاد نے حیرت اور دلچسپی سے پوچھا۔

شولتسزے کا چہرہ دھوئے ہوئے کپڑے کی طرح سفید تھا۔ ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ اُس نے کہا۔ "خیر۔ تمھارے 'کیوں' کا تو میں جواب نہیں دے سکتی۔ جب میں نے یہ الفاظ سُنے تو مجھے بھی حیرت معلوم ہوئی۔ میں اُس وقت سولہ برس کی تھی۔ میں اُٹھ کے خود ہی پوچھنا

چاہتی تھی۔ کیوں، مگر اس سے قبل ہی مَیں نے اپنی خالہ کی آواز سُنی۔ میری خالہ نے کہا تسیورک میں نہ سہی، کہیں اور سہی، لندن میں، پیرس میں، برلن میں، کہیں نہ کہیں اُسے بَر مل ہی جائے گا۔ اُس کی ایسی خوبصورت لڑکیاں مَیں نے بہت کم دیکھی ہیں۔ اس طرح مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ بعض لوگ مجھے خوبصورت بھی سمجھتے ہیں!"

اُس نے بَر نہ ملنے کے متعلق جو کچھ کہا تھا۔ وہ آزاد کو ایک عجیب پُراسرار سی شے معلوم ہوا۔ لیکن اخلاقاً اُس نے اُس کے متعلق کچھ اور پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ اُس نے شولتسرے سے کہا کہ وہ لندن میں اُس سے ملنے کا کس قدر مشتاق تھا۔ شولتسرے نے کوئی خاص ہمت افزا جواب نہیں دیا اور نہ اور لڑکیوں کی طرح خوش ہو کر مُسکرائی۔

آزاد نے پھر پوچھا "اب کیا پروگرام ہے"۔

شولتسرے نے کہا "کھانے کے بعد ہوف گارتن اور انگلشر گارتن"۔

ہوف گارتن جاتے ہوئے ایک جگہ سڑک پر بڑی بھیڑ تھی۔ آزاد نے سڑک کے اُس پار پہنچنا چاہا۔ تو وہ بولی "جرمنی میں تم اتنے دِنوں سے ہو اور یہ نہیں معلوم کہ جب سُرخ روشنی مخالف ہو تو سڑک کے پار نہیں جا سکتے"۔

آزاد ٹھہر گیا۔ جب روشنی موافق ہوئی تو سڑک پار کرتے ہوئے وہ اپنا ایک قصہ بیان کرنے لگی "ایک بار مَیں سڑک کی دوسری طرف جانے لگی تو پولیس مین نے روک کر کہا کہ یہ قاعدے کی خلاف ورزی ہے۔ ایک مارک جرمانہ دینا ہوگا۔ مَیں نے کہا۔ میرے پاس ایک مارک نہیں ہے۔ میں کہاں سے دوں۔ اُس نے کہا۔ تمھیں دینا ہوگا۔ میں نے کہا۔ میں جرمن نہیں۔ غیر مُلکی ہوں۔ اُسے یقین نہیں آیا۔ تم جانتے ہو۔ جرمن میری مادری زبان ہے۔ اُسے یقین نہیں آیا۔ آخر بہت حُجّت کے بعد اُس نے میرا وطن پوچھا۔ مَیں نے کہا۔ سوئٹزرلینڈ۔ تسیورک، خیر اُو پر سے نیچے تک مجھے دیکھ کے اُس نے مجھے جانے کی اجازت دی اور کہا۔ آئندہ سے احتیاط برتوں"۔

اِتنے میں وہ نازتی میموریل کے قریب پہنچے جو ہٹلر کے با اختیار ہونے کی نشانیوں میں کافی امتیاز رکھتا ہے۔ ایک عقاب حسبِ معمول اپنے پنجے میں پھولوں کا ہار لیے ہوئے پَر

تول رہا ہے۔ جس میں جرمن سواستکا بنا ہوا ہے۔ ہر جرمن کا فرض ہے کہ اس کے سامنے سے گذرتے ہوئے نازی سلام کرے یعنی کاندھے کے برابر ہاتھ اٹھائے۔

آزاد نے بھی ہاتھ اُٹھایا۔ جرمن سنتری جو پاس کھڑا ہوا تھا۔ ایک غیر مُلکی۔ بہت زیادہ غیر مُلکی ــــ اجنبی کو اس طرح جرمن سلام کرتے دیکھ کر اظہارِ شکریہ کے طور پر فوجی قسم کی حرکت کر کے پھر تن کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دُور آگے بڑھ کے شولسٹرے نے آہستہ سے کہا: "تمھیں شرم نہیں آتی"۔

آزاد نے جواب دیا: "میں جرمنی کی موجودہ سیاسیات کا لاکھ مخالف سہی مگر اخلاقاً جرمنوں کے مُلک میں اُن کا قومی سلام کرنا گناہ نہیں"۔

شُولسٹرے کہنے لگی: "یہودی اگر یہ سلام کریں تو سخت جرم ہے۔ خیر غنیمت ہے تم یہودی نہیں"۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد کہنے لگی: "میں سوئٹزرلینڈ کی رہنے والی ہوں۔ میں نے کبھی اس طرح ہاتھ اُٹھا کے سلام کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی"۔

دونوں ہوف گارتن پہنچے اور ایک چکّر لگا کے "گمنام سپاہی کی قبر" کو دیکھا۔ یہاں سے نکل کے جدید عجائب خانے "جرمنی کے جدید ذخیرۂ فنون" کی نمائش میں پہنچے۔ یہ نازی جرمنی کے فنونِ لطیفہ کی نمائش تھی اور یورپ کی جدید تحریکوں کی بالکل مخالف۔ یہودی یا "یہودی اثر" کی پست تصاویر کی نمائش علیٰحدہ تھی۔ بہرحال گھنٹہ بھر تک دونوں تصویروں کو دیکھتے رہے۔

اب کوئی تین بج رہے تھے۔ دونوں وہاں سے انگلشر گارتن کو روانہ ہوئے۔ انگلشر گارتن میں انگلستان کے پارکوں کی نقل کی گئی ہے۔ کھُلے ہوئے سبزے کے قطعے بہت ہیں۔ اور باغ ذرا قدرتی معلوم ہوتا ہے۔ انگریزی وضع کے باغات ایک زمانے میں یورپ میں بہت مقبول تھے۔ چنانچہ جنیوا میں دریائے رون کے کنارے جھیل کے ختم پر ایک خوبصورت "ژاردال آنگلیز" (انگریزی باغ) ہے۔ میون شن کا انگلشر گارتن اس شہر کا سب سے بڑا پارک ہے۔

پارک میں ٹہلتے ٹہلتے شولسٹرے نے کہا: "میون شن میں اب جرمنوں کو بھی ہندوستانیوں

سے نسلی تعصب پیدا ہو گیا ہے۔ بہت سی جرمن لڑکیاں کسی ایشیائی کے ساتھ اِدھر اُدھر پھرنا پسند نہیں کرتیں۔ مجھے علی کے ساتھ دیکھ کے کئی نے نام رکھے۔"

آزاد نے کہا۔ "مجھے جرمنی کے دوسرے شہروں میں تو اس کا سابقہ نہیں پڑا۔ ہاں میونخ کے متعلق میں نے بھی سُنا تھا۔"

شولتزے کہنے لگی۔ "ہاں یہ نازی پارٹی کا سرچشمہ اور مرکز رہ چکا ہے۔"

تھوڑی دیر کے بعد آزاد نے شولتزے کی طرف پلٹ کے دفعتہً پوچھا۔ "تمھارا پہلا نام کیا ہے؟"

وہ بولی۔ "میرے پہلے نام بہت سے ہیں۔"

آزاد نے کہا۔ "آخر بتاؤ تو سہی۔"

کہنے لگی۔ "عموماً میرے دوست مجھے آیا کہتے ہیں۔"

"آیا؟"

"ہاں آیا ... ... اور اس کے علاوہ میرا ایک نام اور ہے جو میری ماں کا رکھا ہوا ہے۔ صرف میری ماں مجھے اس نام سے پکارتی ہیں اور اُن کے سوا دُنیا بھر میں صرف ایک اور شخص۔"

"آخر بتاؤ تو سہی کیا نام ہے؟"

"مموشکا۔ مگر میں تمھیں قطعی طور پر منع کرتی ہوں کہ ہرگز ہرگز مجھے اس نام سے مخاطب نہ کرنا۔"

"خیر تم نے نام تو بتا دیا ہے۔ اب اگر میں مموشکا کہہ کے مخاطب کروں تو کیا کرلو گی۔"

"تمھیں چھوڑ کے چلی جاؤں گی۔"

آزاد نے مناتے ہوئے کہا۔ "خیر آیا سہی۔"

تھوڑی دیر کے بعد آزاد نے پھر یہی سلسلہ چھیڑا۔ "مموشکا تو روسی نام ہے۔ تمھارا نام کیسے رکھا گیا؟"

"میری ماں کو یہی عرف پسند تھا۔" اس کے بعد اُس نے فوراً کوئی اور ذکر چھیڑ دیا۔

باغ ہی میں ایک قہوہ خانہ تھا۔ جہاں ایک بینڈ زور دار کرخت آواز سے فوجی ترانے بجا رہا تھا۔ وہاں دونوں نے کافی پی اور اس کرخت فوجی موسیقی کو سنتے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔

اب آفتاب بہت ڈھل چکا تھا اور لوگ کافی تعداد میں نظر آتے تھے۔ آزاد اور شولتسزے نے پھر ٹہلنا شروع کیا۔ درختوں کے ایک گھنے جھنڈ میں موقعہ پاکر آزاد نے اُس کی کمر پر ہاتھ رکھا تو اُس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ دونوں جب گھنے سایہ دار راستوں پر ٹہلتے تو آزاد اس کی کمر میں ہاتھ حمائل کیے رہتا۔ جب کھلی ہوئی شاہراہوں پر آتے تو وہ اپنا ہاتھ ہٹا لیتا۔ کیوں کہ باغ میں مجمع بڑھتا ہی جاتا تھا۔ ایک انگریز عورت ایک جرمن دوست کے ساتھ قریب سے گذری اور اپنی دانست میں آہستہ سے کہا۔ مگر آزاد نے سُن لیا۔" دیکھو وہ لڑکا ہندوستانی ہے "۔

دونوں پارک سے نکل کر پرنتس ری گین ٹن اشترا سا پر آئے ہی تھے کہ آہستہ آہستہ پانی برسنے لگا۔ دونوں نے ہوف گارتن میں پناہ لی۔ سایہ بان میں کچھ دیر تک بیٹھے رہے۔ اُس کے بعد آزاد نے کہا۔" اس طرح بیٹھے رہنے سے کیا فائدہ۔ چلو آئس کریم یا کوئی اور چیز کھائیں"۔ اس درمیان میں زور شور سے موسلا دھار پانی برس رہا تھا۔

دونوں کو ایک خوبصورت سے کافی خانے میں اچھا سا میز مل گیا۔ سِوا اُس میز کے باقی تمام میزوں پر لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور آپس میں زور شور سے باتیں کر رہے تھے۔ عورتیں بار بار سر اُٹھا کر برستے پانی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ جس کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔

آزاد نے مشغلتہ" اُس کا ہاتھ دیکھنا شروع کیا۔ یورپ میں ہندوستانی طالب علم اکثر اس حربہ کو استعمال کرتے ہیں اور کہا کہ" تم کو تین مردوں سے یکے بعد دیگرے محبت ہوگی"۔

اُس نے کہا۔" ناممکن"۔

آزاد نے کہا۔" ہاں۔ ایک مرتبہ اُنیس سال کی عمر میں، دوبارہ چوبیس سال کی عمر میں اور آخری بار تیس یا پینتیس کے درمیان"۔

شولتسزے نے بہر حال تھوڑی دیر کے بعد اقبال کیا کہ ہاں اُسے ایک مرد سے

محبت ہو چکی ہے۔"
آزاد نے کہا۔" میں جانتا ہوں کس سے۔"
شُولتسرے بولی۔" شاید۔ بتاؤ کس سے؟"
"کسی سوئٹزر لینڈ والے سے نہیں۔"
"نہیں۔"
"افغان دوست علی سے؟"
"ارے نہیں۔ اُس سے دوستی ضرور ہے۔ مگر اور کچھ نہیں۔"
"کسی ہندوستانی سے؟"
"ہاں۔"
"مَیں اُسے جانتا ہوں۔"
"شاید۔"
"مَیں سمجھ گیا۔" آزاد نے کہا۔" بڑا خوبصورت آدمی ہے۔"
اس پر شُولتسرے نے بے اختیار ہو کے بڑے اشتیاق سے کہا۔" ہاں۔"
آزاد پر ایک ناامیدی کی سی لہر دوڑ گئی۔
"اُس کا نام درباری ہے؟"
"ہاں۔ تمھارا دوست ہے؟"
"نہیں۔ مگر ملاقات ہے۔ اچھی خاصی ملاقات ہے۔"
آزاد نے دیکھا کہ شولتسرے کا چہرہ جذبات کی سُرخی سے چمک رہا ہے۔
آزاد نے سوال کیا۔" اُس کا ارادہ تمھارے ساتھ شادی کرنے کا ہے؟"
"اگر اُس کے بس میں ہوتا تو میرے ساتھ ضرور شادی کرتا۔"
"واہیات۔ اُس کے بس میں کیوں نہیں؟"
"کیوں کہ اُس کی نسبت ہندوستان میں یورپ آنے سے پہلے ہو چکی ہے۔"
"تو کیا وہ اُس نسبت کو توڑ نہیں سکتا؟"

"نسبت اُس کے چچا کی لڑکی سے ہے۔ اُس کے چچا ہی نے اُسے تعلیم دلائی اور یورپ بھیجا۔ وہ خود یتیم ہے۔ وہ نسبت کو توڑے تو اُس کی پوری زندگی تباہ ہو جائے۔"

"تمھیں اُس سے بہت محبّت تھی ؟"

"اور شاید اب بھی ہے۔"

آزاد نے خلوص کے لہجے میں کہا۔ "مجھے اُس کی قسمت پر رشک آتا ہے اور اُس کی حماقت پر غصہ۔"

شولتزے نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔ "وہ مجبور ہے ... ہم دونوں کے لیے یہی بہتر ہے کہ ایک دوسرے کو بھول جائیں۔"

اس کے بعد وہ منٹ بھر کے لیے خاموش ہو گئی۔ اُس کی آنکھیں بہت دور سمندر پار لندن کا کوئی منظر دیکھ رہی تھیں۔ اُس کے بعد وہ کہنے لگی۔ "میں نے اُسے وہ چیز دی۔ جس سے زیادہ کوئی عورت اور کوئی چیز نہیں دے سکتی۔ میں نے اُسے اپنی دوشیزگی دی۔ اُس کے بعد جب انجام کے ڈر سے میں رونے لگی تو مجھے تسکین دیتے دیتے وہ خود بھی رونے لگا۔ کیوں کہ وہ مجھے جواب میں کچھ نہیں دے سکتا تھا۔ میں جانتی تھی۔ پھر بھی محبّت کسی معاوضے کو طلب نہیں کرتی ... ... بہرحال میرا ڈر بیکار تھا۔ کیوں کہ مجھے کچھ نہیں ہوا۔ مجھے بچّے کا ڈر تھا .. ..." اور اس کے بعد وہ ہنسنے لگی۔ "کتنا زمانہ گذر گیا۔ سال بھر سے زیادہ۔ وہ ایک بار نیسویرک مجھ سے ملنے آیا تھا۔ میری ماں نے مجھے ملنے نہیں دیا۔ میں نے اپنی ماں سے تمام واقعات کا ذکر کر دیا تھا —— میری ماں نے مجھے اُس سے ملنے نہیں دیا۔ کیوں کہ یہ غلطی وہ خود کر چکی تھی۔ یہ غلطی وہ خود کر چکی تھی۔"

شولتزے کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ مگر وہ پھر ہنسنے لگی۔ آزاد کو اُس وقت اُس کی ہنسی کچھ عجب غیر قدرتی سی معلوم ہوئی۔ مگر وہ خاموش تھا کہ جذباتی طوفان کی یہ رَو نکل جائے تو وہ پھر کچھ کہے۔ اِدھر باہر پانی اُسی شدت سے برس رہا تھا۔ آزاد نے آہستہ آہستہ اُس کے ہاتھ کو تھپ تھپایا۔ تو وہ آنسو پونچھ کے مسکرائی۔

"معاف کرنا۔ اس وقت میں بالکل ضبط نہ کر سکی۔"

آزاد نے یہی مناسب خیال کیا کہ بجائے سنجیدگی سے تسکین دے کے ذرا مذاق کرے اُس نے اپنا اندازِ گفتگو بدل کے کہنا شروع کیا کہ یہ محض طفلانہ عشق تھا۔ وہ سوئٹزرلینڈ میں پلی اور بڑی ہوئی تھی اور وہاں اُس نے کسی دوسرے نسل کے اجنبی کو نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے اس سانولے سلونے ہندوستان کا جادو اس پر چل گیا۔ ابھی اُس کی عمر ہی کیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آگے چل کے کیا ہوتا ہے۔

شوُلتسزے بار بار ان اعتراضات کا جواب دیتی رہی اور کہتی رہی کہ پھر دوبارہ اس قسم کی محبّت میں مبتلا ہونا اُس کے لیے ناممکن ہے۔

اس کے بعد دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ بالآخر پانی کا زور کم ہوا۔ اب شام ہوگئی تھی۔ پانی رُک جانے کے بعد دونوں نے میکسی می لین اشتراسا پر آہستہ آہستہ ٹہلتے ہوئے اِزار کا پُل پار کیا۔ پھر وہاں سے آرلیانز پلاتس روانہ ہوئے۔ جہاں ایک ریستوران میں شام کا کھانا کھایا اور بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔

آزاد اُسے گھر پہنچانے ٹرام پر اُس کے ساتھ گیا۔ جس جگہ وہ ٹرام سے اُترے۔ اُس کے سامنے ہی سے وہ گلی شروع ہوتی تھی جس میں شولتسزے رہتی تھی۔ ٹرام سے اُتر کر شوُلتسزے اُس سے رُخصت ہونے لگی تو آزاد نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور اُسی طرح اُس سے پھر کل ملنے کا وعدہ لینے لگا۔

چند قدم کے فاصلے پر ایک جرمن افسر یونیفارم پہنے اپنی موٹر گاڑی دُرست کر رہا تھا اُس نے پہلے تو اِن دونوں کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔ اگر کوئی انگریز ہوتا تو کنکھیوں سے دیکھ کر خاموش ہو جاتا مگر انگریزوں اور جرمنوں میں یہی تو فرق ہے۔ اُس نے زور سے ذرا گرجدار آواز میں شوُلتسزے سے کہا۔ "یہ مت بھولو کہ تم جرمن ہو۔"

معلوم ہوتا تھا کہ اِس جُملہ سے شولتسزے کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اُس نے آزاد کا ہاتھ اور زور سے دبایا اور غصّے سے چیخ کر کہا۔ "خدا کا شُکر ہے، میں جرمن نہیں، میں سوئٹزرلینڈ کی رہنے والی ہوں۔ اور میرے ساتھی کے متعلق اگر تمھارا یہ خیال ہے کہ وہ یہودی ہے تو غلط ہے۔ وہ یہودی نہیں، ہندوستانی ہے۔ جہاں کے لوگ اپنے آپ کو تم جرمنوں سے پہلے آریائی

کہتے تھے اور تم جرمنوں کی طرح غلط کہتے تھے۔"

اس پر اُس جرمن نے جھلّائے ہوئے لہجے میں کہا: "معاف کرنا فراؤلائن"۔ آزاد کی طرف پلٹ کر بھی اُس نے معافی چاہی اور آزاد نے جرمن ہی میں اُسے جواب دیا۔ جس کے بعد وہ پھر اپنی گاڑی ٹھیک کرنے میں مصروف ہوگیا۔

لیکن اس چھوٹے سے واقعے سے شولتسزے بہت برافروختہ ہوگئی تھی۔ یا تو وہ اس سے یہیں رخصت ہونا چاہتی تھی یا اب اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر وہ گلی کی طرف اپنے مکان کی سمت چلنے لگی۔ راستے میں یہ سمجھ کر کہ آزاد پر اُس جرمن کے الفاظ کا کچھ اثر ہوا ہوگا۔ اُس سے پھر اُس جرمن کی بُرائی کرنے لگی۔ لیکن آزاد پر اس قسم کے واقعات کا کیا اثر ہوتا۔ وہ ہنس رہا تھا۔

مکان کے باغیچے کے دروازے کے سامنے وہ رک گئی۔ قریب، سڑک کے لمپ سے دھندلی سی روشنی آرہی تھی۔ اُس نے کہا: "اچھا کل پھر اسی وقت تم یہاں آجانا۔ میں کیسینو چلنے کے لیے کپڑے پہن کے تیار ہوں گی"۔ یہ کہہ کے اُس نے آزاد کا ہاتھ آہستہ سے دبایا۔

آزاد سمجھ گیا کہ یہ مہربانی اُس جرمن کے جملے کی تلافیٔ مافات کے لیے ہے۔ اگر تلافیٔ مافات ہی سہی تو پھر اچھی طرح کیوں نہ ہو۔ اُس نے شولتسزے کو قریب کھینچ کر آہستہ سے پہلے اُس کے بالوں کو بوسہ دیا۔ بیچ سر میں مانگ تھی اور سیاہ فیتہ سر کے بیچوں بیچ میں بندھا ہوا تھا۔ اُس نے محسوس کیا کہ یہ بال جو اُس کے رُخساروں کو چھُو رہے تھے۔ اُسے کہیں بہائے لیے جارہے ہیں۔ پھر اُس نے شولتسزے کے لبوں کا بوسہ لیا۔ اس لڑکی نے ـــــ اس خوبصورت اور عجیب و غریب لڑکی نے جسے کسی اور سے محبت تھی ـــــ ذرا بھی مزاحمت نہیں کی۔ اُس کے دونوں ہونٹ ایک دوسرے سے جُدا تھے اور آزاد کے ہونٹوں نے اس بوسہ میں وہ لذت محسوس کی جو نہ اُسے اس سے پہلے کبھی حاصل ہوئی۔ نہ اس کے بعد۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ناممکن کی حدود میں اتفاق سے داخل ہوگیا۔

اپنے آپ کو آزاد کی گرفت سے چھڑا کے وہ فوراً پیچھے ہٹی۔ اُس نے کوئی وجہ نہیں بتائی۔ یہ بھی نہیں کہا کہ یہ راستہ ہے۔ یہاں اس قسم کا اختلاط نہیں اچھا۔ اُس نے کچھ بھی نہیں کہا۔

"اچھا۔ خُدا حافظ پھر کل ملیں گے۔"

یہ کہہ کے اُس نے باغیچے کا دروازہ کھولا اور کسی عجیب راز کی طرح درختوں کی تاریکی میں غائب ہو گئی۔

مگر آزاد کا ابھی تک یہ حال تھا کہ گویا کسی نے جادو کر دیا ہو۔ اب تک بیسیوں عورتوں کو وہ فتح کر چکا تھا۔ شکستیں دے چکا تھا۔ اُس نے خود بھی شکستیں کھائی تھیں۔ مگر یہاں تو شکست فتح کا سوال ہی نہیں تھا۔ یہ تو ایک جادو تھا۔ جس کا کوئی توڑ نہیں۔ وہ دو تین منٹ تک اسی طرح کھڑا رہا۔ دو تین راہگیروں کے قدموں کی چاپ نے اسے چونکا دیا اور وہ خود بھی چلنے لگا۔ بلا یہ طے کیے ہوئے کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور اسی طرح شونلترے کی شخصیت کے طلسم، اُس کے بوسے کے لطف، اُس کے پستانوں کے حسن سے بالکل مبہوت وہ برابر چلتا رہا۔ ایک گلی سے دوسری گلی میں، ایک سڑک سے دوسری سڑک پر۔ یہاں تک کہ ایک چوراہے پر اُس نے دیکھا کہ کچھ درختوں کے درمیان ایک بنچ ہے۔ اس بنچ پر وہ بیٹھ گیا۔

وہ بیٹھا رہا اور اُس بوسے کی لطافت کی تازہ یاد اُس کے دل و دماغ کو، اُس کے سارے جسم کو فرحت پہنچا رہی تھی۔ ایسی فرحت جو سرور کے قریب قریب پہنچا دے۔ ہلکی ٹھنڈی ہوا بھی آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اس سے بھی فرحت محسوس ہو رہی تھی۔ مگر دوسری طرح کی فرحت وہ فرحت جو تازگی پہنچاتی ہے۔

وہ رات کو ایک بجے کے قریب گھر پہنچا۔

دوسرا دن گذر گیا اور شام آئی۔ دن کو پانی برسا تھا اور سڑکیں ابھی تک نم تھیں آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے اور روشنی کی کمی کی وجہ سے ساڑھے سات بجے ہی

لیمپ روشن ہو گئے تھے۔ نو بجے کے قریب آزاد، شولتسزے کو لینے اُس کے گھر پہنچا۔ گھنٹی بجائی۔ دروازہ کھُلا۔ اندر سے مکان خالی خالی اور وحشتناک سا معلوم ہوتا تھا۔ مکان کا زینہ چوڑا سا تھا اور اُس پر کسی طرح کا فرش وغیرہ نہ تھا۔ کھرا کھرا کچھ عجیب طرح کا معلوم ہوتا تھا شولتسزے اُسے زینے پر ہی ملی۔ وہ نیچے اُتر رہی تھی۔

وہ شام کا لباس پہنے تھی اور اس لباس سے اُس کے حُسن کو چار چاند لگ گئے تھے۔ لباس زیادہ قیمتی نہیں تھا۔ مگر آزاد کو بہت خوش وضع معلوم ہوا۔ گون کے اُوپر کا حصّہ کوٹ کی طرح تھا اور بُوٹے دار سفید ریشمی کپڑے کا تھا۔ نیچے کا حصہ سیاہ ریشم کا۔ آج شام کو پہلی بار آزاد نے اُسے لبوں پر سُرخی لگائے دیکھا۔ سُرخی ہلکی سی تھی۔ مگر اُس کے لبوں کے قدرتی حُسن کو اُس کی بھی ضرورت نہ تھی۔ اس لباس میں اور اس قدر خفیف سے بناؤ سنگار کی وجہ سے وہ اُس قدر حسین معلوم ہو رہی تھی کہ آزاد بے اختیار ہو کر ٹھہر گیا اور اُس کے حُسن کی تعریف کرنے لگا۔ شُولتسزے مذاق سمجھ کر مُسکرائی۔

راستے میں لوگ پلٹ پلٹ کر ان دونوں کی طرف دیکھ رہے تھے اور آزاد کو شولتسزے کے ساتھ چلنے پر فخر سا معلوم ہو رہا تھا۔ اس سے قبل بھی انگلستان میں اُسے دو تین مرتبہ اس قسم کا احساس ہوا تھا۔ جب کوئی نہایت خوبصورت لڑکی اُس کے ساتھ تھی۔

دونوں کسینو پہنچے۔ ناچ شروع ہو چکا تھا۔ لیکن دونوں نے پہلے کھانا کھایا اور باتیں کرتے رہے۔ میز ایک کونے میں تھا اور آزاد نے یہ دیکھ کر کہ آس پاس کے میزوں والے لوگ دُور ناچنے میں مصروف ہیں۔ آہستہ سے اُس کا ہاتھ دبانا چاہا مگر اُس نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔

آزاد نے مذاق میں ٹھنڈی سانس بھر کے کہا: "جیسی تمھاری مرضی مُوشکا۔"

اس پر اُس نے ذرا بگڑ کے کہا: "مہربانی کر کے مجھے مُوشکا نہ کہا کرو۔"

"پھر کیا؟ فرائے لائن شُولتسزے کہا کروں؟"

"فرائے لائن شُولتسزے یا آیا جو جی چاہے کہو۔ مگر مُوشکا ہرگز ہرگز نہیں۔"

اُس کے بعد چار پانچ مرتبہ وہ ناچے۔ پھر کیبرے ہوا۔ وہ دیکھتے رہے۔ پھر دو ایک بار ناچے۔ اُس کے بعد شُولتسزے نے کہا: "مَیں ذرا تھک گئی ہوں۔"

آزاد نے سگریٹ سلگایا۔ اُسے دیا۔ دیا سلائی جلائی۔ پھر خود سگریٹ لیا اور ایک لمبا کش بھر کے کہا۔

"بڑا افسوس ہے کہ مَیں ناولسٹ نہیں۔ ورنہ تمھارے متعلق ایک ناول لکھتا۔"

"خیر کسی اور سے لکھوا لینا۔"

"لیکن اس کے لیے مجھے تمھاری زندگی کے سب حالات معلوم نہیں۔ تمھاری نفسیات سے مجھے البتہ بڑی دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔ تم نے اپنے عشق کا قصّہ تو مجھے سُنایا لیکن اور واقعات مجھے معلوم نہیں۔"

"اور واقعات کچھ ایسے زیادہ نہیں۔ مَیں تسیورک میں پیدا ہوئی۔ دس سال تک وہیں پڑھتی رہی۔ پھر ایک مہینے کے لیے وینس بھیجی گئی ...۔..."

آزاد نے لارڈ بائرن کا مصرعہ دُہرایا۔ "میں وینس میں آہوں کے پُل پر کھڑا تھا..."

"ہاں مَیں نے آہوں کا پُل بھی دیکھا اور گنڈولوں پر وینس کی بحری شاہراہوں کی سَیر بھی کی۔"

"خیر۔ اس کے بعد؟"

"اس کے بعد پھر تسیورک واپس آئی اور چار سال گذارے۔ پھر دو مہینے تک اپنے وطن کے دوسرے شہروں کی سَیر کرتی رہی۔ واپس آ کے انگریزی سیکھتی رہی۔ جب اُنیس سال کی ہوئی تو انگریزی اچھی طرح سیکھنے کے لیے انگلستان گئی۔ درباری سے ملی۔ پھر تسیورک واپس آئی۔ میری ضد پر میری بیچاری ماں نے مجھے یہاں بھیجنے کا انتظام کیا۔ اور اب میں یہاں ہوں۔"

"مگر تمھارے والد؟ کیا وہ ...۔..."؟

"مر گئے یا زندہ ہیں۔ یہ مجھے معلوم نہیں۔"

"تمھارے والد کیا کرتے تھے؟ کون تھے؟"

"میرا کوئی باپ تھا ہی نہیں۔"

آزاد دم بخود ہو کر خاموش ہو گیا۔ شولتزے نے اپنے خوبصورت ہونٹوں کو پہلے

دبا یا اور پھر کہنے لگی "میں فطرت کی اولاد ہوں۔ ...۔ یعنی یعنی ..."... وہ تلخی سے مسکرائی "حرام کی اولاد۔"

آزاد اُسی طرح خاموش رہا۔ اسی لیے شاید موُشکا کی ماں نے کہا تھا کہ تسیورک کے شریف طبقے میں اُسے بَر نہیں ملے گا۔

"میری ماں، میرے اور درباری کے عشق کی وجہ سے بہت پریشان ہو گئی تھی معلوم ہے کیوں؟ اس لیے کہ تاریخ وہی سبق بار بار دُہراتی رہے تو اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ تاریخ کا پہلا سبق سُنو گے؟"

آزاد نے آہستہ سے سَر کے اشارے سے کہا "ہاں"

"اب سے کوئی اکیس سال پہلے کا ذِکر ہے۔ میری ماں تسیورک میں میری خالہ کے ساتھ پڑھتی تھی۔ میری ماں کی عُمر انیس سال کی تھی۔"

"اُنیس سال کی؟"

"ہاں۔ اُنیس سال کی۔ میری طرح کی۔ ... اچھا تم تو تسیورک گئے ہو؛ تمھیں جھیل یاد ہے؟ اور جھیل کے کنارے کے اُونچے اُونچے درخت؟ یہ درخت چاندنی راتوں کو بہت پیارے معلوم ہوتے ہیں اور جھیل کا پانی چمکتا ہے۔ جھیل کے کنارے، اِن اُونچے اونچے درختوں کے نیچے ایک چاندنی رات کو میری ماں کی ایک اجنبی سے ملاقات ہوئی۔"...

"ایک اجنبی سے؟"

"ہاں ایک اجنبی سے، میری ہی طرح ...... مگر اُس زمانے میں احتیاطی ذرائع کا زیادہ رواج نہیں تھا۔ جب رومان نے میری ماں کو تاکا تو مَیں پیدا ہوئی۔ جب میری باری آئی تو مَیں محفوظ رہی۔ خدا سائنس کو سلامت رکھے۔"

"وہ اجنبی کون تھا؟"

"ایک روسی۔ یوکرین کا رہنے والا۔ موم شوف اُس کا نام تھا۔ اسی مناسبت سے میری ماں مجھے موُشکا کہتی ہے۔"

"پھر کیا ہوا؟"

تسیورک میں دو تین ہفتے گذار کے وہ واپس چلا گیا۔ پھر نہ کبھی اُس نے خط لکھا۔ نہ کبھی میری ماں سے ملا۔ معلوم نہیں زندہ ہے یا انقلاب کے زمانے میں مارا گیا۔ وہ دراصل رُوسی جاسوس تھا اور اُس زمانے میں ـــــ جنگِ عظیم کا زمانہ تھا ـــــ اِدھر سے اُدھر مارا مارا پھرتا تھا۔"

" پھر تمھاری ماں کا کیا حشر ہوا؟"

" ہوتا کیا۔ میں پیدا ہوئی۔ میری خالہ کے سوا سب نے ملنا جلنا کم کر دیا۔ میری ماں کو نانا کی جائداد کا کوئی حصّہ نہیں ملا۔ میری خالہ نے اُسے ایک بڑے ہوٹل کی منتظمہ بنا کے نوکر رکھا دیا۔ اُس کے بعد سے ہم لوگ متوسط درجے کی زندگی گذار رہے ہیں۔"

" مگر تمھاری ماں پر اس کا بڑا بُرا اثر پڑا ہوگا؟"

" ہاں شاید۔ مگر وہ مجھے بہت چاہتی رہی۔ مجھ سے اُسے تسکین ملتی رہی۔ کبھی کبھی البتہ اُسے دورہ سا آجاتا اور وہ میری دُشمن ہو جاتی۔ یہ سمجھتی کہ میں ہی اس کی مصیبتوں کا باعث ہوں۔ لیکن اب ایسے دَورے بہت کم آتے ہیں۔"

اس کے بعد شولتزے دفعتہً اُٹھ کے کھڑی ہو گئی اور پوچھا۔ "اور ناچوگے؟"

" ضرور۔"

دو تین بار ناچنے کے بعد شولتزے کی تلخی بالکل جاتی رہی اور وہ ہنس ہنس کے باتیں کرنے لگی۔ آزاد نے اظہارِ محبّت شروع کیا۔ طرح طرح سے اُسے اپنی محبّت کا یقین دلاتا رہا۔ مگر وہ مُسکراتی رہی اور کہتی رہی۔ "میں مجبُور ہوں۔ محبّت اپنے ہاتھ کی بات نہیں۔"

ساڑھے بارہ بجے دونوں کیسینو سے نِکلے۔ اُس کے گھر کے دروازے پر آزاد نے پھر اُس کے بوسے لیے۔ پھر وہی سرور محسوس کیا۔ پھر اُس کے نیم دائروں جیسے پستانوں پر ہاتھ پھیرا۔ پھر وہ ہٹ کر الگ ہو گئی۔

لیکن دُور سے سڑک کے لیمپ کی روشنی آزاد کے چہرے پر کچھ اس طرح پڑی یا شولتزے کو کچھ ایسا معلوم ہوا کہ وہ آپے سے باہر ہو کے چیخ اُٹھی۔ "تم درباری ۔ ۔ ۔ ۔ ابھی تم بالکل ہی درباری کے ایسے معلوم ہو رہے تھے۔ میں قسم کھا کے کہہ سکتی ہوں۔ بالکل

درباری کے ایسے "..... ... پھر مایوسی سے کہنے لگی۔" مگر تم تو کوئی اور ہو۔ کوئی اور ہو۔"

مگر پھر وہ بُت کی طرح بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ اُس نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں بند کیں۔ پھر کھولیں۔ پھر بند کیں اور بالآخر اُسی طرح آنکھیں بند کیے ہوئے اُس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ کسی اندھے کی طرح اُس نے اپنے ہاتھ سے آزاد کا شانہ ٹٹولا۔ اُس کے چہرے پر، اُس کے بالوں پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرا۔ اُس کی آنکھیں اُسی طرح بند تھیں۔ آزاد پر سرور کے ساتھ خوف کی ہلکی سی لہر بھی دوڑ رہی تھی۔

پھر آنکھیں کھول کے اُس نے کہا۔" اگر میں آنکھیں بند کرلوں تو کوئی فرق نہیں معلوم ہوسکتا۔ تم اُس کے ہم وطن ہو۔ کم سے کم یہ چیز تو تم میں اور اُس میں مشترک ہے۔"

اس کے بعد اُس نے ایک ہاتھ سے باغیچے کا دروازہ کھولا۔ دوسرے ہاتھ میں آزاد کا ہاتھ لے کے درختوں میں ہوتی ہوئی مکان تک پہنچی۔ مکان کا دروازہ کھولا۔ زینوں پر تاریکی تھی۔ وہ اُسی طرح آزاد کا ہاتھ پکڑے ہوئے زینوں پر چڑھنے لگی۔ پہلی منزل کی کھڑکی سے کچھ روشنی آئی پھر اندھیرا، پھر دوسری منزل، پھر اندھیرا۔ تیسری منزل۔ وہ اپنے کمرے کے دروازے پر ٹھہر گئی۔ آزاد کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ کنجی نکالی۔ دروازہ کھولا۔ پھر آزاد کا ہاتھ پکڑ کے اندر لے آئی۔ کمرے میں اُس نے روشنی نہیں کی۔ دروازہ بند کیا۔ وہ خود کمرے کے جغرافیے سے اچھی طرح واقف تھی۔ دروازہ بند کرکے وہ آزاد کے پاس آئی۔ اپنے دونوں ہاتھ آزاد کے گلے میں ڈال کر اُس نے اس محبت سے، اس جوش سے بوسہ لیا کہ آزاد کو محسوس ہوا کہ وہ اُس کے جسم میں پیوست ہوئی جارہی ہے۔

آزاد سمجھ گیا۔ آج کی رات اُسے درباری بننا ہے۔ اس میں اُسے ایک طرح کی ذلت بھی معلوم ہورہی تھی۔ مگر ساتھ ہی ساتھ شولتزے کی عجیب و غریب ہستی اس سے اس قدر قریب تھی کہ اُس کی نفسیات کا طلسم اس پر بھی حاوی ہورہا تھا۔ اُس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ وہ جانتا تھا کہ روشنی کی طرح اُس کی آواز بھی شولتزے کے تخیّل کی تیار کی ہوئی مسرت کو توڑ دے گی۔

اُسے شولتزے کے قریب آنے کی آواز سُنائی دی۔ پھر اُس نے تنفس کی گرمی محسوس کی۔ پھر شولتزے نے اُس سے کہا: "پیارے درباری میں تمھاری مموشکا ہوں۔" پھر وہ آزاد سے لپٹ گئی۔

اُس کے بعد جو وقت آزاد نے گذارا۔ اُس میں وہ جسمانی لطف اُسے حاصل ہوا۔ جو بقولِ خود اس کے اُس نے نہ اس سے پہلے کبھی محسوس کیا۔ نہ اس کے بعد۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ شکاری نہیں شکار ہے۔ اس کے باوجود اُسے ذرا سی کوفت ابھی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ مموشکا کا یہ سانچے میں ڈھلا ہوا جسم، یہ بھرے بھرے شانے، یہ گالوں کو بوسہ دینے والے بال، یہ سر کے بیچ نکلی ہوئی مانگ، یہ تلخی اور طنز کے خوگر ہونٹ، اُس کے جسم کی سپردگی اور حرکت، یہ سب چیزیں اس کے نہیں کسی اور کے لیے تھیں۔ وہ محبت جس کا وہ طالب تھا ایک عجیب طنز کی صورت میں اُسے اب مل رہی تھی۔ چند گھنٹوں سے زیادہ جسمانی لطف اور ذہنی کوفت کی اس کشمکش کو برداشت نہ کر سکا۔ عجیب بات تھی۔ اُسے خود شبہ ہوتا تھا۔ اُس نے نہیں کسی اور نے شولتزے نہیں مموشکا کے ساتھ رات گذاری تھی اور وہ اب بھی وہی رسمی ملاقاتی، وہی رسمی دوست تھا جسے بابِ غنچے کے دروازے کے باہر ہی سے واپس چلا جانا چاہیے تھا۔

چنانچہ جب وہ اپنے آپ کو شولتزے کی پیاری پیاری باہوں سے چھڑا کے بستر سے اُٹھا تو شاید وہ بھی سمجھ گئی۔ اُس نے کچھ نہیں کہا۔ آزاد نے آہستہ سے اپنے کپڑے پہنے۔ اُن کا پہننا بھی مصیبت ہوگیا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ روشنی کا بٹن دبائے تو شولتزے کا سارا خیالی طلسم خاک میں مل جائے گا اور وہ اُسے اس طرح کی ذہنی اذیت نہیں دینا چاہتا تھا۔ جوں توں کر کے اُس نے کپڑے پہنے اور آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھول کے زینے اُترنے لگا۔ جیسے کوئی کسی کے خواب میں آئے اور چلا جائے۔

دوسرے دن صبح کو گیارہ بجے کے قریب پھر وارفتگی اور جنون کے عالم میں شولتزے سے ملنے پہنچا۔ مکان کی خادمہ نے کہا: "فرائے لائن آج صبح کو اپنی ماں کے پاس تسیورک چلی گئیں اور یہ خط دے گئی ہیں۔"

آزاد نے لفافہ چاک کر کے پڑھنا شروع کیا:

"۱۰ راگست ۱۹۳۷ء۔

"... ... ...

اگر مَیں یہی سوچتی رہتی کہ تمھیں کیا لکھ کے مخاطب کروں تو شاید یہ خط کبھی نہ لکھ سکتی۔ مجھے توقع ہے کہ القاب کے حصّے کو خالی دیکھ کے تمھیں زیادہ افسوس نہ ہوگا۔ ذاتی طور پر تم خط کے القاب کو خط کے باقی حصّے سے زیادہ اہم سمجھتے ہو تو بہتر یہی ہے کہ تم اس خط کو نہ پڑھو۔

مَیں صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ مَیں اپنے وطن تسیورک دو تین ہفتے کے لیے جا رہی ہوں تعطیلات گذارنے۔ مَیں جانے ہی والی تھی۔ کل رات کے بعد مَیں نے فوراً جانا مناسب سمجھا۔ کیوں کہ ... ...

کیوں کہ طرح طرح کی پیچیدگیوں کے امکانات ہیں۔ تم جانتے ہو، مجھے تم سے محبّت نہیں ہو سکتی۔ مگر میں ایکٹرس ہوں۔ ایکٹرس بننا چاہتی ہوں۔ مَیں نے تمھیں کل رات زبردستی ایکٹر بنایا۔ تمھارا بہت بہت شکریہ۔

لیکن یہ صرف ایک بار ممکن ہے۔ ایک بار سے زیادہ نہیں۔ اس طرح کا خواب صرف ایک بار نظر آسکتا ہے۔ پھر نہیں۔

اگر تم مجھے ناشکرا یا بے رحم سمجھو تو مَیں بُرا نہیں مانتی۔ بے رحم سمجھا جانا اِتنا بُرا نہیں، جتنا آگ سے کھیلنا۔ آخر تم دیکھو گے کہ ہم دونوں کے لیے یہی مناسب ہے۔

بظاہر یہ ناشکری نہیں۔ دراصل میں دیانت سے کام لینا چاہتی ہوں دیانت سے ——— جس کا مقصد احتیاط ہے۔ مجھ سے زیادہ تمھارے لیے۔

سمجھے؟

مجھ سے خط و کتابت کرنے کی تمھیں اجازت ہے۔ لیکن ملنے کی نہیں۔ جب میں میبون شن واپس آؤں گی تو تم یہاں سے جا چکے ہو گے۔ میں بہرحال تم سے نہیں ملوں گی۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ تم آج ہی وی آنا چلے جاؤ۔ وسطی یورپ کی حسین سے حسین لڑکیوں میں تمھارا دل بہل جائے گا۔

اور جب خط لکھنا تو یاد رہے کہ محبت کے سوا دنیا میں اور بہت سی چیزیں ہیں۔ جن کا ذکر خطوں میں زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔

خیر طلب

تمھاری

آیا شنولتزے"

اور بستی نہیں یہ.....

۱

۹ را پریل ۱۹۴۴ء کو جرنلسٹ الف خاں (مدیر روزنامہ "ٹائمز آف مدراس" عمر ۳۲ سال، قد بلند، رنگ سُرخ و سفید، سیاسی رجحان سرکار پرستی، تنخواہ ایک ہزار) اور اس کے دوست جرنلسٹ بے خاں (مدیر روزنامہ "بمبئی ہیرالڈ ٹریبیون" عمر ۳۵ سال، قد اوسط، رنگ گندمی، آبائی وطن ہندوستان، وطنِ مطلوبہ پاکستان، تنخواہ سات سو باسٹھ روپیہ چھ آنہ تین پائی علاوہ قسطِ انشورنس) میں یہ عہد نامہ ہوا۔

(۱) ہم دونوں کناٹ پلیس اور جدید دلی کا علیحدہ علیحدہ مطالعہ کریں گے اور اپنے تجربات یکجا شائع کریں گے۔

(۲) چودہ روز کے قیام میں ہم زیادہ تر شاہراہوں، ہوٹلوں اور "بیرونی" زاویوں سے نئی دلی کا اس لیے مطالعہ کر رہے ہیں کہ ہم عمرانی اور اخلاقی زندگی کی تصویر اس طرح کھینچیں کہ ہر ہر لفظ صداقت پر مبنی ہو۔

(۳) ہمیں یقین ہے کہ جب ہمارا یہ مشترک بیان شائع ہوگا تو لوگ اسے محض افسانہ یا قصہ نہ سمجھیں گے۔ فقط

الف خاں۔ ساکن مدراس

بے خاں۔ ساکن بمبئی

۲

۹ر اپریل۔ بے خاں۔

آج اتوار ہے۔ دوکانیں بند ہیں۔ سبزے کے اُس دائرے پر گھومتا رہا۔ جس کے بغیر کناٹ پلیس میں یہ بات پیدا نہ ہوتی۔ یورپ کے اس تمدّن میں اور کچھ ہو نہ ہو۔ طبعی زندگی بسر کرنے کا سلیقہ تو ضرور ہے۔ یہ تین چار پنجابی لڑکیاں۔ ہندوستان بھر میں شاید پنجاب ہی میں عورتوں کا حُسن مریضانہ نہیں۔ ورنہ میں نے تو کشمیر میں پیاری سے پیاری عورتوں پر بھی موت کی زردی دیکھی ہے۔

میں مدوّر سبزے سے گذر کر اُس مستطیل سبزے پر آگیا جو رائل سینما اور نے وی کے ریستوران تک پہنچا تا ہے۔ اس مستطیل سبزے پر کچھ بنچیں تھیں، کچھ میمیں اور اُن کے بچے، کچھ نرسیں اور بچوّں کی چھوٹی گاڑیاں، کچھ توند، کچھ داڑھیاں، کچھ دھوتیاں، دو شیروانیاں، تین شلواریں، ایک میواتن، چار میواتی، ایک حوض، کچھ پانی ہوا جو نہ گرم تھی نہ سرد، کچھ دھوپ جو ناگوار نہیں تھی، کچھ چھاؤں جو خوشگوار تھی۔

نے وی کو انگریز افسروں اور مملکت سانڈو گھانس[۱] کے سپاہیوں سے بھرا ہوا تھا۔ مَیں نے کھڑکی کے پاس ایک جگہ سنبھالی تاکہ داخلی اور خارجی دونوں مناظر نظر میں رہیں۔ مِلک شیک کا ایک گلاس منگوایا۔ اُس مرکّب نے میرے میز پر تین چوتھائی گھنٹے کی عمر پائی، ادھیڑ میمیں افسروں کے ساتھ کھا پی کے چل دیں۔ پھر نئے لوگ آئے۔ گئے اور لوگ آئے اور بالآخر پیانو بجانے والے نے بھی ہار مان کے پیانو بند کیا پھر آخر کار ——

چار ہندوستانی لڑکیاں آئیں۔ تین ساریوں میں اور ایک شلوار پہنے۔ ان میں سے دو اچھی تھیں۔ شلوار والی خصوصیت سے بہت پیاری معلوم ہو رہی تھی۔ لباس کی خوبی اور قرمزی رنگ کے لپ اسٹک کی جادوگری۔

چند منٹ کے بعد مَیں نے اسی شلوار پوش کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔ میرے قریب

---

[۱] اس نام کی حد تک دونوں جرنلسٹ مسٹر کرشن چندر کے بہت ممنون ہیں۔

ہی ایک میز پر کچھ سانڈو گھانس کے فوجی افسر بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک بہت کم عمر معلوم ہوتا تھا۔ زعفرانی بال تھے، بھرے بھرے ہونٹ۔ مگر لڑکی کی نگاہیں مایوس واپس آئیں۔ یہ نوجوان افسر اپنے ساتھیوں کے ساتھ باتوں میں بہت مشغول تھا۔ ظاہر ہے اُس نے جگرؔ کا یہ شعر کاہے کو پڑھا ہوگا ؎

کوئی گناہ نہیں شوقِ دید ذوقِ نظر
جُز ایں کہ فرصتِ نظارگی کو طُول نہ ہو

میرے شوقِ دید اور ذوقِ نظر کی اُس ہندوستانی حسینہ کے میز پر کوئی خاص قدر نہیں ہوئی۔ یہ چاروں لڑکیاں جو غالباً کسی کالج کی چشم و چراغ تھیں۔ باتیں کرتے کرتے اِدھر اُدھر نظروں کے بان چلانے کی کوشش کرتیں مگر مجھے غیر دلچسپ سمجھ کے کسی نے کوئی ہمت افزائی نہ فرمائی۔

آج طے پایا کہ ہم دونوں الگ الگ اپنے روزانہ کے سوانح نہیں لکھیں گے۔ میرے اور الف خاں کے بیان ایک ساتھ ایڈٹ ہوں گے اور اُس میں ہم دونوں کا ذکر صیغۂ غائب میں ہوگا۔

۳

۱۰ر اپریل

سہ پہر میں ایک خان بہادر کے یہاں بے خاں کی مولوی بنی اُمیّہ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ بے خاں کو معلوم تھا کہ محکمۂ ــــــ میں جس جگہ کے لیے وہ کوشش کر رہا تھا۔ اُس جگہ کے لیے بنی اُمیّہ صاحب کے داماد بھی کوشاں تھے۔ مولوی بنی اُمیّہ صاحب کا مختصر تعارف ضروری ہے۔ بلند بالا، دراز ریش، مشیّن آدمی ہیں۔ ایک "عصری" (بمعنی صاحبِ طرزِ جدید) شاعر ہیں، نیش تخلص کرتے ہیں۔

کہنے لگے "آپ یہاں بے خاں صاحب؟ آپ سے تو اپالو بندر یا جوہو پر ملاقات ہونی چاہیے تھی۔ ہاں شاید اُسی انٹرویو کے سلسلے میں آئے ہوں گے۔ ابھی کس چکر میں ہیں آپ؟"

بے خاں نے کہا: "کیا کروں اپنے اخبار کے ڈائرکٹروں سے نہیں بنتی۔"

"تو پھر بُرا نہ مانئے تو ایک بات کہوں آخ"۔ بنی اُمیّہ صاحب نے کہا: "میں جانتا ہوں آپ ہیں حساس دل کے۔ ایسا آدمی یہاں خوش نہیں رہ سکتا۔ یہاں اعلیٰ سرکاری ملازمت میں بہت سے قصے ہیں۔ وہاں تو آپ کو صرف ہندو مُسلم سوال کا سامنا ہے۔ یہاں آخ بہت سے سِلسلے در سلسلے ہیں۔ آئی سی ایس اور غیر آئی سی ایس کا مسئلہ۔ پھر ہندو مُسلم مسئلہ۔ مسلمانوں میں شیعہ سُنّی مسئلہ۔ پھر صوبجاتی طرفداریاں ..... غرض۔ آخ۔ آپ کا ایسا آدمی یہاں خوش رہنے کا نہیں۔"

بے خاں نے کہا: "صاحب مجھے اپنے کام سے کام۔ بہر حال اب تو درخواست دے چُکا۔"

"ہاں ہاں۔ اس میں حرج ہی کیا ہے؟" بنی اُمیّہ صاحب نے کھنکھار کے کہا: "میں نے تو محض ازراہِ ہمدردی ـــــ آخ ـــــ کہا تھا۔ دیکھیے آج گرمی کس غضب کی ہے۔"

"جی ہاں۔ آج گرمی تو بہت ہے۔"

"جی ہاں۔ آخ۔" بنی اُمیّہ صاحب نے پھر کھنکارنا شروع کیا: "دلّی کا موسم بڑا خراب ہوتا ہے۔ اس مرتبہ تو مارچ میں خوب بارش ہوگئی۔ ورنہ مارچ ہی سے گرم ہوائیں چلنے لگتی ہیں۔ دیکھیے نا، ریگستان کِس قدر قریب ہے یہاں سے۔ اپریل میں یہی ہوائیں لُو بن جاتی ہے۔ یہ خالص اس طرف کی چیز ہے، بمبئی میں تو لوگ لُو کا نام بھی نہ جانتے ہوں گے۔ مگر قیامت تو مئی اور جُون میں آتی ہے۔ ریگستان کی ریت سے خاک کا بادل سا آسمان پر چھا جاتا ہے۔ پھر صاحب آخ۔ بگولے اُٹھتے ہیں۔ آندھیاں آتی ہیں۔ خیر صاحب یہ بھی برداشت کرلی جائیں مگر رات کو آسمان سے خاک برستی ہے۔"

"خاک برستی ہے؟" بے خاں نے ذرا بدحواس ہوکر پوچھا۔

"ہاہاہا۔ آپ تو پریشان ہوگئے۔" اور بنی اُمیّہ صاحب کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں: "خاک کی ہلکی ہلکی پھوار برستی ہے۔ باہر سوئیے تو مٹّی میں اَٹ جائیے۔ اندر سوئیے تو ایسی ہوا نکلتی ہے جیسے جہنّم کے جھونکے۔ خاک کی وجہ سے حلق خُشک ہوجاتا ہے۔"

پھراپنی تقریر کا اثر دیکھ کے بنی اُمیّہ صاحب نے اس کا سلسلہ جاری رکھا" اور برسات میں اس غضب کی اوس پڑتی ہے کہ خدا کی پناہ ۔ مئی کی لُو برداشت ہو جاتی ہے مگر یہ سڑی گرمی کسی طرح سہی نہیں جاتی ۔ یہ سلسلہ ستمبر تک جاری رہتا ہے۔ ستمبر کا مہینہ بڑا خراب ہوتا ہے۔ دلی والے اسے ستمبر نہیں ستمگر کہتے ہیں ۔ دیکھیے۔ آخ۔ کیا بات پیدا کی ہے"۔

بے خاں نے جواب دیا" کیا کہنے دلّی والوں کے"۔ پھر بنی اُمیّہ صاحب کو چھیڑنے کے لیے کہا" صاحب اسی لیے تو میں دلّی آنا چاہتا ہوں"۔

بچاروں کی صورت اُتر سی گئی ۔ ایک بار" آخ" فرمایا۔ پھر خان بہادر صاحب سے گفتگو کرنے لگے۔

" مجھ سے ڈاکٹر یاور کہہ رہے تھے کہ سعید کو کئی ماہ سے روز حرارت ہو جاتی ہے۔ جلد اُن کی شادی ہو جانی چاہیے ۔ ورنہ آثار اچھے نہیں اور میں تو کہتا ہوں ۔ میاں سعید شادی نہ بھی ہو تو کوئی اور صورت سہی" الف خاں نے کہا۔

" میرے دوست ہو کر آپ یہ تجویز کر رہے ہیں۔ سبحان اللہ" سعید نے جواب دیا۔

" تو پھر شادی ہی کر ڈالو ۔ کیوں نہیں کر لیتے"۔

" ہیں کچھ مجبوریاں۔ جب تک مستقل ملازمت کی صورت نہ نکلے" ۔ ۔ ۔ ۔ سعید نے جواب دیا۔

چہرے پر زردی چھائی ہوئی۔ سینہ اندر کو دھنسا ہوا۔ شکل وصورت اچھی خاصی تھی۔ مگر آنکھیں اب اندر کی طرف گھسی جا رہی تھیں۔ گال پچکے ہوئے تھے۔ یہ ہندوستان کا متوسط طبقہ۔ حیاتین ڈب اور و کی کمی۔ اگر پھیپھڑے تھکنے لگیں تو پہاڑوں کی ہوا اُن کو نئی زندگی بخش سکتی ہے۔ مگر کیا عارضی ملازمت ایسی 'تفریح' کی اجازت دے سکتی ہے؟ اور ملازمت نہ ہو تو اس مہاجنی دَور میں پیٹ کیسے بھرے۔ جس میں بھائی بھائی کو

نہیں پوچھتا۔ اس مہاجنی دور میں شادی بھی تو چاندی کے سکّوں کا کھیل ہے۔ لڑکے کی تنخواہ کتنی ہے؟ اُس کا مستقبل کیسا ہے؟ عمر کا خیال کیے بغیر روشن خیال باپ روپے کی بھٹّی میں اپنی لڑکی جھونک دے۔ لڑکی کو ممکن ہے کچھ عذر ہو۔ مگر پھر وہ خود بھی تو یہ سوچتی ہے کہ اچھی سے اچھی ساڑیاں پہننے کو ملیں گی، مکان ہوگا۔ موٹر ہوگی۔ اُس کی سہیلیاں دیکھ دیکھ کر جلیں گی۔ رہ گئی جنس۔ تو دیکھا جائے گا۔

سرولا کے ریستوران میں سعید ہی کے ساتھ الف خاں نے کھانا کھایا۔ ایک میز پر مملکتِ سانڈو گھانس کے ایک افسر کے ساتھ ایک بنگالی نازنین عشوہ گری کے ہندوستانی کرتبوں کا مظاہرہ کررہی تھی۔ ایک ہندوستانی صاحبزادے کے ساتھ تین اینگلو انڈین لڑکیاں تھیں۔ الف خاں نے غالب کی تمنّا کا ذرا ہٹ کے اظہار کیا۔ "یا اللہ ایسے ایسے خوش نصیب لوگ بھی دُنیا میں ہیں جنھیں تین تین ہتھکڑیاں نصیب ہیں اور ہمیں ایک بھی نصیب نہیں۔" کھانے کے بعد سبزے پر پڑی ہوئی بنچ پر بیٹھ کر سگریٹ جلا کے سعید نے پھر اپنی شادی کا تذکرہ چھیڑا۔

"دہلی میں تو اور بھی ہمّت نہیں پڑتی۔ کچھ عجیب حال ہے الف خاں صاحب یہاں کی عورتوں کا۔"

"کیوں، شرفا کے خاندان تو محفوظ ہوں گے۔" الف خاں نے کہا۔

"اس میں کیا شک ہے کہ ہزاروں خاندان محفوظ ہوں گے۔" سعید نے کہا۔ "مگر بہت سے ہندو مُسلم سفید پوش ایسے بھی ہیں کہ جب اُن کے گھروں کا حال سُنتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ غدر کے مارے ہوئے دہلی کے پُرانے شرفاء اب تک پنپ نہیں سکے۔ خاندان کے خاندان جوہریوں کے یہاں رہن ہیں۔"

"یعنی؟"

"یعنی یہ کہ جن مکانوں میں وہ رہتے ہیں۔ وہ اُن جوہریوں کے پاس گروی ہیں۔ ان کے لڑکوں کو یہ سیٹھ تعلیم دلاتے ہیں اور اُن کی عورتیں اور لڑکیاں ان کے تصرّف میں ہیں۔"

"ناممکن۔" الف خاں نے تعجب سے کہا۔

"نئی دہلی میں ایک قسم اُن عورتوں کی ہے۔ جن کے میاں اُن کو اپنے وطن یعنی باہر کے قصبات سے ساتھ لائے ہیں۔ وہ ابھی دہلی کی زندگی کی عادی نہیں ہوئی ہیں۔ میاں کی تنخواہ ڈیڑھ سو یا دو سو ہوتی ہے۔ یہ تنخواہ تو نئی دلی میں کوئی چیز ہی نہیں ہوتی۔ چھوٹے چھوٹے سرکاری مکانوں میں یہ لوگ رہتے ہیں۔ جب میاں دفتر کو جاتے ہیں تو یہ عورتیں جن کی نظریں نئی دہلی کی چمک سے خیرہ ہیں۔ خرید و فروخت کرتی پھرتی ہیں اور کبھی کبھی اُن کی اپنی خرید و فروخت بھی ہو جاتی ہے۔"

"نہیں بھئی"۔ الف خاں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"میں آپ سے جھوٹ نہیں کہہ رہا ہوں۔ ہم آپ ایک دوکان پر ٹھہرے تھے، یاد ہوگا؟ سامانِ آرائش کی دوکان۔ اُس کے مالک جن سے میں باتیں کر رہا تھا۔ میرے دوست ہیں۔ میں ایک روز اُن کی دوکان میں تھا کہ ایک دیوی جی آئیں۔ کوئی پینتیس سال کی عمر، خوب پینٹ کیے ہوئے۔ دوکان کے مالک صاحب مجھ سے معافی مانگ کے اُن کی طرف مخاطب ہوئے۔ اُن کے جانے کے بعد کہنے لگے۔ یہ فلاں صاحب کی بیوی ہیں جو فرم میں کلرک ہیں، چار سو تنخواہ ہے۔ مگر وہ صاحب آخر کیسے خاندان کے ہیں؟ میں نے کہا کیوں؟ تو کہنے لگے "یہ اُن کی دیوی ہر ماہ سینکڑوں کا سامان خریدتی ہیں اور اُن کا بل عجیب عجیب مشتبہ قسم کے لوگ آ کے ادا کرتے ہیں۔"

ہوٹل پہنچ کے الف خاں نے بے خاں سے آج کی گفتگو دہرائی اور پھرتی اس ایلیٹ کا یہ مصرع پڑھا :۔

"پھر میں قرطاجنہ آیا۔"

اُس کی تشریح میں بے خاں نے سینٹ آگسٹن کا پورا فقرہ دہرایا "پھر میں قرطاجنہ آیا۔ جہاں چاروں طرف سے میرے کانوں میں ناپاک عشق بازیوں کی کڑھائی سے گیت کی آواز آئی۔"

پھر بے خاں نے سوچنا شروع کیا۔ "قرطاجنہ کو ایک بار رومیوں نے تباہ کر دیا تو پھر اُس کے کھنڈروں پر اُس شان کا کوئی اور شہر نہ بن سکا۔ اُس کی خاک سے کوئی مینی بال

پیدا نہ ہوسکا۔ لیکن دلی ہزاروں بار مٹی اور ہزاروں بار اُس نے نیا جنم لیا۔ اس نے رام راج دیکھا۔ ایبک اور بلبن کی شوکت سے جگمگائی۔ اسے تاتاریوں نے تاراج کیا۔ اسے محمد تغلق نے چھوڑنا چاہا اور نہ چھوڑ سکا۔ اسے مغلوں نے گلزارِ ارم بنایا۔ یہ شہر۔ یہ لافانی شہر۔ ہندوستان کے دو زرخیز صوبوں کے سنگم پر ہے۔ ان صوبوں کے کھیتوں پر شاہانِ سلف کے دبدبے کا دارومدار تھا۔ راجپوتانے کا ریگستان اور اس ریگستان کی پہاڑیاں اس شہر کا قدم چومتی ہیں۔ ورنہ اُس ریگستان کی بہادر قومیں کیونکر شاہانِ دلی کی مطیع رہ سکتیں۔ انگریز کو بھی کلکتہ چھوڑ کر یہیں آنا پڑا۔ ایک اور نئی دلی بسی۔ بارکوں جیسی، یک منزلہ دلی، مگر نئی اُجلی اور سُتھری۔ اس نئی دلی میں بھی ایسی عمارتیں ہیں جن کی زیارت کے لیے، ممکن ہے آج سے ہزار سال بعد سیاح اسی طرح جایا کریں گے۔ جیسے آج وہ لال قلعے یا قطب مینار کو دیکھنے جاتے ہیں۔ کہیں پڑوس ہی میں دس ہزار سال بعد کی نئی دلی ہوگی۔ یہ ناپاک عشق بازیاں کیا حقیقت رکھتی ہیں۔ قوم کو زندہ رہنا ہے تو یہ خود مٹ جائیں گی۔ یا پھر یہ قوم مٹ جائے گی۔ اور کوئی اس سے زیادہ صحت مند قوم اس کی جگہ لے گی۔ اس شہر نے قزلباشوں کے ہاتھوں مردوں کا خون بہتا دیکھا ہے اور عورتوں کی عصمت لٹتی دیکھی ہے۔ کیا اُس کے مقابلے میں عصرِ حاضر کی کڑھائی کا گیت کوئی معنی رکھتا ہے۔ دلی لازوال ہے۔ روما الکبریٰ اور استانبول اور ایتھنز کی طرح وہ لافانی ہے۔

۴

۱۱، اپریل

الف خاں کا بیٹھے بیٹھے جی گھبرایا۔ "بمبئی میں تو دلی کے متعلق اس عہد نامے سے باز آیا جو میں نے بے خاں سے کیا ہے۔ اگر نشست مل گئی تو میں تو لاہور جاؤں گا۔" دلی میں شلواروں کی بہار دیکھ کے وہ اس قدر گرویدہ ہو چکا تھا کہ اب لاہور میں ایک آدھ ہفتہ گذارے بغیر اُسے اپنی زندگی بے مصرف معلوم ہونے لگی۔ شاہ حاتم کا یہ شعر گنگناتے ہوئے اُس نے اسٹیشن جانے کی نیت سے تانگہ ڈھونڈھنا شروع کیا۔

چھین لیتے ہیں مرے دل کو نگاہوں کے بیچ
حسن رہزن ہے یہ پنجاب کی راہوں کے بیچ

راستے ہی میں ایک چھاپے خانے کے پاس سائیکل پر اُسے ایک ایسی خوبصورت پنجابی لڑکی نظر آئی کہ تانگے کی تلاش میں اُس نے اپنی رفتار تیز تر کردی۔ بکنگ آفس پر بڑا ہجوم تھا۔ اس ہجوم میں اُس نے پینتیس سال کے ایک خوش رو نوجوان کو دیکھا کہ سکنڈ کلاس کا ایک ٹکٹ لیے ہوئے طرح طرح سے بکنگ کلرک کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر اُن بابو جی کو بھی یہی تو موقع ملتا تھا کہ وہ بلند تر سماجی طبقوں کے لوگوں سے جی بھر کے خوشامد کرالیں اور خود جس قدر چاہیں استغنا ظاہر کریں۔ ابھی ابھی بکنگ کلرک ایک بوڑھے انگریز نائٹ کو ٹکا سا جواب دے چکا تھا کہ کل فرنٹیئر میل سے راولپنڈی جانے کی جگہ ملنا بالکل ناممکن ہے اور جب انگریز نائٹ نے کہا: "بہرحال میں تو کل جارہا ہوں" اور یہ کہہ کر بڑی ہی طیش ناک نظر بابو جی پر ڈالی تو انھوں نے مسکراکر گویا اپنے دل میں کہا۔ "تمھارے اچھوں کو بھی جگہ نہیں مل سکتی"۔ الف خاں نے سیکنڈ کلاس والے خوش رو نوجوان کو بھی اپنی طرح اس منظر کا لطف اٹھاتے دیکھا تو پوچھا: "کیا آپ لاہور جا رہے ہیں؟"

"نہیں جی"۔ اُس نے جواب دیا: "سترہ تاریخ کو میری بیوی لدھیانے جارہی ہے۔ اس نے کہا تھا کہ ۷ا کو جگہ مل جائے گی۔ میں ٹکٹ خرید لایا۔ اب دیکھیے پلٹ کر بھی میری طرف نہیں دیکھ رہا ہے"۔

"آپ کا وطن لدھیانہ ہے؟" الف خاں نے پوچھا۔

"نہیں جی۔ میں تو لہور کا رہنے والا ہوں"۔

الف خاں نے اس نوجوان کے فیشن ایبل اسکن کے سوٹ اور تیلی ٹائی کی طرف ذرا غور سے دیکھا: "شاید آپ یہاں گورنمنٹ آف انڈیا میں ملازم ہیں؟"

"نہیں جی"۔ نوجوان کی بھوری آنکھیں چمکیں: "میں آل انڈیا لدھیانہ بنک کا یو۔پی کا نمائندہ ہوں۔ کاروبار کے سلسلے میں دہلی آیا جایا کرتا ہوں۔ ورنہ میرا ہیڈ آفس تو لکھنؤ ہے اور آپ؟"

"جی۔ میں ناگپور میں سنتروں کی تجارت کرتا ہوں" الف خاں نے جواب دیا۔ "وہاں میرے تیس سنتروں کے باغ ہیں۔ ہر باغ کا اوسط فصل میں ڈھائی ہزار سنترہ ہے۔"

"اچھا اچھا" خوشرو نوجوان نے سرپرستی کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کا نام؟"

"جی میرا نام ہے ڈِم ٹِم کر" الف خاں نے جواب دیا۔ "اور آپ کا اسم شریف؟"

"میرا نام ہے کپور"

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر مسٹر کپور" فرضی سنترہ فروش نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "آپ تو لاہور سے بخوبی واقف ہیں۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر میں ایک ہفتہ یا ڈیڑھ ہفتہ کے لیے اس زمانے میں لاہور جاؤں تو کیا وہاں وقت دلچسپی سے گذر سکے گا؟"

"اس زمانے میں تو ذرا گرمی ہوگی" مسٹر کپور نے کہا۔

"دہلی سے زیادہ؟"

"نہیں بس ایسی ہی"

"میں ذرا لاہور کے —— یعنی انار کلی اور مال کی مشہور تفریح کرنے والیوں کا نظارہ کرنے جانا چاہتا ہوں —— مگر آپ اس قسم کی صاف صاف گفتگو سے بُرا تو نہیں مانتے؟"

"نہیں جی۔ اس میں بُرا ماننے کی کیا بات ہے" مسٹر کپور نے الف خاں کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا۔ "کیا نام بتایا تھا آپ نے اپنا؟ ٹم ٹم ... ... ؟"

"ڈِم ٹم کر" الف خاں نے اصلاح دیتے ہوئے کہا۔

"مسٹر ڈم ٹم کر۔ تب تو آپ ضرور لاہور جائیں۔ آپ دیکھیں گے کہ لاہور والے مغربیوں سے بھی زیادہ مغربی ہیں۔ انار کلی تو آج کل کھدی پڑی ہے۔ اندر پائپ ڈالا جا رہا ہے۔ لیکن اس کی کسر یوں نکل سکتی ہے کہ آپ علی الصباح لارنس باغ جائیں۔ تیسرے پہر کو مال کا نظارہ دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔"

"ہمارے ناگپور کے مقابل پنجاب میں حُسن بہت ہوتا ہے" الف خاں نے سنترہ فروش بن کر کہا۔

"شمال میں رنگ بھی تو صاف ہوتا ہے" مسٹر کپور نے کہا۔ "لیکن پنجاب میں رنگ

کے ساتھ سلیقہ بھی ہے۔"

الف خاں نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا: "جی ہاں ملک ملک کی قسمت ہے۔ کہیں کی عورتیں اچھی تو کہیں کے سنترے اچھے۔"

اتنے میں بکنگ کلرک کپور کی طرف مخاطب ہوا۔

بکنگ کے بعد الف خاں نے اس سے پوچھا: "لاہور میں سب سے زیادہ آزادی کس طبقے میں ہے؟"

"اجی سب میں، امیر غریب ہندو مسلمان سکھ سب میں۔ سب ہنسی خوشی زندگی بسر کرتے ہیں۔ باغوں میں ان کی بہار دیکھو۔ راتوں کو ناچ میں ان کو دیکھو۔ کبھی کلکتہ بمبئی گئے ہو؟"

الف خاں نے انکسار کے ساتھ کہا: "جی ہاں۔"

"کلکتہ بمبئی کے مقابلے میں تو میں لہور ہی کو پسند کروں گا۔ اتنا سفیر ہندوستانی ہے مگر لوگ یورپین لوگوں سے بھی زیادہ یورپین۔ میری رائے میں تم ضرور جاؤ مسٹر ٹم ٹم ...."

"ڈم ٹم کر۔" الف خاں نے کہا۔

"اچھا نمستے۔"

"نمستے۔" الف خاں نے جواب دیا۔ بکنگ کلرک نے اس کی طرف استفہامی نظروں سے دیکھا۔ "بھئی آج، کل، پرسوں لاہور کے لیے سیٹ بک ہو سکتی ہے؟"

"کونسی کلاس؟"

"سیکنڈ۔"

"فرنٹیر میل میں ۲۰ سے پہلے نہیں۔ ایکسپریس میں ۱۸ سے پہلے نہیں۔"

"اجی ۱۲ کو تو مجھے یہاں سے جانا ہے۔ میں لاہور کے اسٹیشن تک جا کے کیا کروں گا۔ بہر حال شکریہ۔"

اور الف خاں نے ارادہ کیا کہ خیرے خاں کے ساتھ کا معاہدہ پورا ہی کر لیں۔ لاہور کی سیر اس سال نہ سہی۔ دلی ہی سہی۔

کناٹ پلیس میں ایک چھوٹے سے کافی ہاؤس میں باہر کی شیشے کی دیوار سے الف خاں نے دیکھا کہ ایک میز پر ایک صاحب اور اُن کے ساتھ تین چار لڑکیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ کوئی ساڑھے چار کا عمل ہوگا۔ الف خاں نے کہا "یہیں چائے کیوں نہ پی جائے" اندر داخل ہو کے اُس میز کے قریب ہی ایک میز پر اُس نے ڈیرہ جما دیا۔ ایک موٹے سے ویٹر کو چائے لانے کے لیے کہا اور اپنے ہمسایوں کا جائزہ لینے لگا۔

ایک نوجوان چار عورتوں میں گھرا بیٹھا تھا۔ ایک کوئی ادھیڑ عمر کی موٹی سی عورت تھی ایک دس گیارہ برس کی بچّی تھی۔ الف خاں نے پہلے نوجوان کو جانچا جو گہرے رنگ کا پتلون اور قمیص پہنے ہوئے تھا۔ رنگ اس قدر صاف تھا کہ اس پر یورپین ہونے کا بھی گمان ہو سکتا تھا۔ لیکن اس کا اپنا اُردو کا لہجہ اور اُس کے ہم نشینوں کی شلوار پوشی سے یہ ظاہر تھا کہ یہ سب کے سب پنجاب کے ہیں۔ اب عرصے سے دلّی میں مقیم ہیں۔ نوجوان کے ہونٹ پتلے اور سُرخ تھے۔ بال گھونگھر والے تھے اور اس میں کوئی شک ہی نہیں کہ وہ بہت وجیہہ تھا۔ سیدھے ہاتھ پر اُس کے اور ادھیڑ عورت کے درمیان ایک لڑکی تھی۔ چھریرا جسم، چہرے کا رنگ سانولے اور صاف کے درمیان کچھ نیم گلابی سا۔ اس رنگ کی ہیئت ترکیبی الف خاں کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اُس کی آنکھیں بے نور تھیں اور چہرے سے اس کمسنی ہی میں معلوم نہیں شباب کی تازگی کہاں رُخصت ہو گئی تھی۔ نوجوان کے سیدھے ہاتھ پر ایک اور لڑکی بیٹھی تھی۔ لیکن اُس کی پُشت الف خاں کی طرف تھی۔ اس لیے وہ اُس کی صورت نہیں دیکھ سکتا تھا مگر اُس لڑکی کا جسم بھرا بھرا تھا اور گردن اور ہاتھوں کی جھلک سے اُس نے یہ اندازہ بھی لگا لیا کہ اُس کا رنگ بےحد گورا تھا۔

الف خاں اپنے ہمسایوں کی باتیں سُننے لگا۔

نوجوان، اُس گوری، بھرے بھرے جسم والی لڑکی سے کہہ رہا تھا "سرکار اب کے تو بہت دن بعد آپ کے دیدار ہوئے ہیں"

دُبلی مریض قِسم کی لڑکی کو اُس نے کہتے سُنا "اور سُنا آپ نے ... حسینہ کس مشکل سے آج باہر پھرنے کو تیار ..."...

اُس کے بعد کی گفتگو اُس نے نہیں سُنی۔ پھر نوجوان کی آواز اُسے سنائی دی "کہیں سیر کو تو چلئے ..."

اور پھر ہنسی میں آوازوں کا مطلب وہ صاف نہیں سمجھ سکا۔ پھر نوجوان کسی بات پر ہنسا "اب شام ہو رہی ہے، آپ کو پہچانے گا کون؟"

اس پر دبیز عورت بول اٹھی "اور جو کہیں ان کے ابّا نے دیکھ لیا۔ حسینہ کے ابّا اور اماں میری تو چوٹی ہی کاٹ لیں گے۔"

اُس کے بعد کی گفتگو الف خاں نے نہیں سُنی۔ دو ایک منٹ کے بعد وہ لوگ اُٹھے اب الف خاں نے حسینہ کی صورت کو پہلی مرتبہ دیکھا اور مبہوت سا ہو گیا۔ نہایت گورا رنگ ہلکی نیلی آنکھیں، گھنے سیاہ بال، بھرے ہوئے سُرخ ہونٹ جن کی سُرخی غالباً مصنوعی نہ تھی۔ صحت مند سُرخ سُرخ گال۔ پورا جسم متناسب، شانے بھرے ہوئے، قد بلند۔

بس ایک نظر اور یہ سب باہر جا چکے تھے۔

اُس نے فوراً اپنے موٹے ویٹر کو بُلوایا اور پوچھا "یہ کون لوگ تھے؟ یہ خوبصورت لڑکی کون تھی؟"

ویٹر نے کہا "حضور یہ لڑکی تو پہلی مرتبہ آئی ہے مگر اُس کی ساتھ والی دُبلی لڑکی تو روز یہاں آیا کرتی ہے۔ وہ گول مارکٹ کے پاس رہتی ہے۔"

"کسی طرح اس لڑکی کا پتہ لگاؤ، مگر میرے خیال میں مشکل ہے۔"

"حضور یہ نہ کہیئے۔" موٹے ویٹر نے کہا "آپ کہیئے تو آسمان سے تارے توڑ لاؤں۔ میں ابھی چھوکرے کو گول مارکٹ بھیج کر اُس کا پتہ لگاتا ہوں۔ حضور کی اتنی خدمت نہ ہو سکی تو ہماری زندگی کا کیا مطلب ہے۔"

الف خاں نے اپنا کارڈ نکال کے اُسے دیا۔ "وہ آئے تو اسے یہ کارڈ دینا۔ وہ کچھ پوچھے تو باتوں باتوں میں کہہ دینا کہ ہزار روپیہ تنخواہ ہے۔" یہ کہہ کے اُس نے موٹے ویٹر کو آٹھ آنے دیے اور کامیابی کی صورت میں بہت زیادہ انعام دینے کا وعدہ کیا۔

۵

۱۲ر اپریل

کشمیری گیٹ میں الف خاں اپنے ہوٹل سے کچھ آگے ہی تانگے سے اُتر گیا۔ دو منزلہ مکان کے مثلث نما چھجے میں سفید ساری پہنے ایک چھریرے بدن کی ملیح صورت لڑکی، چھجے پر کہنی اور پنجے پر ٹھڈی ٹیکے کھڑی تھی۔ ماتھے پر ہلکی سی بندی تھی۔ سڑک پر وہ الف خاں کی طرف دیکھنے لگی۔ آنکھیں چار ہوئیں۔ الف خاں نے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ اُسے بے اختیار ہنسی آگئی۔

اور آگے بڑھا۔ ایک سہ منزلہ مکان تھا۔ تیسری منزل سے سب سڑک کھڑکیاں کھلتی تھیں۔ سڑک کے فٹ پاتھ پر میلے کپڑوں کا ایک ڈھیر تھا اور ایک دھوبی اُنھیں یکجا کر رہا تھا۔ الف خاں نے اوپر نظر اُٹھا کے دیکھا۔ ایک آیا کھڑکی کے کنارے بیٹھی نیچے کپڑے پھینکتی جاتی تھی۔ ایک پندرہ سولہ برس کی خوبصورت لڑکی جس کا تنا ہوا سینہ اُس کے ریشمی لانبے کُرتے سے بغاوت کر رہا تھا، جس کے بالوں کی لٹیں، بائیں کان کے آگے بار بار گرتی تھیں اور پھر سنبھل سنبھل جاتی تھیں، جس کا نارنجی رنگ کا چُنا ہوا دوپٹہ اپنی جگہ سے ہٹ کے اُس کے قدم چُوم رہا تھا۔ حساب لکھتی جاتی تھی اور نوٹ بُک کھلی ہوئی کھڑکی کے پٹ سے لگی ہوئی تھی۔

الف خاں ایک منٹ اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کے بعد آنکھیں چار ہوئیں۔ اُس نے بہت ادب سے جھک کر اُس لڑکی کو سلام کیا۔ تیسری منزل سے ہنسی کی ہلکی سی آواز آئی۔ لیکن سلام کر کے اُس نے سر اُٹھایا تو وہ لڑکی غائب ہو چکی تھی اور آیا دیدے نکال کر اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس نے اپنی راہ لی مگر بوڑھی آیا کو اُس نے دھوبی سے یہ کہتے ہوئے سُنا "مُوا کیا دلیر مردوا ہے۔"

سیڈرک سن اسٹون ـــــ اُس کے ایک دوست نے جو مُملکتِ سانڈو گھانس کا رہنے والا تھا اور اب اُسی مُلک کے ایک جنرل کا اے۔ڈی۔سی بن کر ہندوستان آیا تھا۔

اُسے نیوی کو میں چائے پر بُلایا تھا۔

کیپٹن سن اسٹون کے ساتھ ایک ہندوستانی عورت تھی۔ جس کا تعارف اُس نے مسز کپور کہہ کے کرایا۔ آسمانی جالی دار ساری پہنے تھی۔ اُسی رنگ کے دستانے جرابیں اور جوتے۔ سیاہ بال پیچھے فرانسیسی انداز سے کٹے اور جمے ہوئے۔ لبوں پر مدھم سُرخ رنگ کا فرانسیسی لپ اسٹک۔ دانت شفاف اور چمکتے ہوئے۔ اوپر کا داہنی طرف کا ایک دانت ذرا چھوٹا تھا۔ جس کی وجہ سے اُس کی ہنسی میں دلکشی پیدا ہو جاتی تھی۔

ایک بار سن اسٹون کی زبان سے "ڈارلنگ" نکل گیا۔ وہ اُس افشائے راز پر الف خاں کی طرف دیکھ کے آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرایا۔ مسز کپور کی آنکھیں بے اختیار الف خاں کی طرف اٹھیں اور وہاں کسی نسلی تعصب کی جھلک نہ پا کے مطمئن ہوگئیں۔

پھر باتیں کرتے کرتے مسز کپور نے ۱۷ اپریل کو اپنے لدھیانہ جانے کا ذکر کیا۔ اس پر الف کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ "تو آپ ہی کے میاں مسٹر کپور آل انڈیا لدھیانہ بنک کے یو۔ پی میں نمائندہ ہیں؟"

مسز کپور کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ سن اسٹون بھی اپنے دل میں سوچنے لگا۔ یہ بیوقوف الف اس قسم کا غیر محتاط سوال نہ پوچھتا تو اچھا تھا۔ مسز کپور نے پوچھا۔ "کیوں؟ کیا آپ اُن سے واقف ہیں؟"

حالت کی اس نزاکت کو دیکھ کے الف خاں نے ہنس کر کہا۔ "میں تو نہیں واقف مگر میرے ایک دوست مسٹر ڈم ٹم کرسے جو ناگپور میں سنتروں کے بڑے تھوک فروش تاجر ہیں۔ آپ کے شوہر کی شاید دہلی اسٹیشن پر ملاقات ہوئی۔ وہ آپ کے لیے نشست محفوظ کرا رہے تھے۔ میرے سنترہ فروش دوست نے مجھ سے ان کا ذکر کیا تھا۔"

مسز کپور نے اطمینان کا سانس لے کے کہا۔ "جی میرے شوہر اُسی روز لکھنؤ چلے گئے۔"

پھر الف خاں نے سن اسٹون سے رمزی طور پر یوں بات کرنی شروع کی کہ مسز کپور کی فہم سے اُس کے جملے بہت بالا تھے۔ "سیڈرک، میرے دوست ڈم ٹم کرسے تم ضرور ملو۔

یہ وہی ٹی۔ اس۔ ایلیٹ والے مسٹر یوجے ٹی ڈس تاجر سمرنا ہیں۔ لندن تک محصول اور کرایہ معاف۔ یعنی آپ کا ناچیز خادم فلی باس فونیقی "۔

" اوہ۔ شٹ اپ۔ یو روگ "۔ مس اسٹون نے ہنس کر اور مسز کپور پر ایک محبت کی نظر ڈال کے کہا۔

رات کو وہ کناٹ سرکس کے اُس کافی ہاؤس کو گیا۔ موٹے ویٹر نے رپورٹ کی کہ حسینہ اور اُس کی دُبلی سہیلی آج وہاں نہیں آئی تھی "۔ ہجور۔ وہ دُبلی مُردار لڑکی تو روز آتی تھی۔ آج وہ بھی نہیں آئی "۔ اور چار آنے اُس نے اور اینٹھ لیے۔

۶

۱۳، اپریل

بے خاں صبح کو ہوٹل سے نکل کر تانگوں کے اڈّے پر پہنچا۔ صرف ایک تانگہ کھڑا تھا۔ ایک چھوٹا سا لڑکا اُس میں بیٹھا تھا۔ تانگے والے نے کہا " بابوجی آیئے "۔ بے خاں بیٹھ گیا۔ مگر تانگہ والا اطمینان سے دُکان پر لسی پیتا رہا۔ بڑا ہی خوش پوش تانگے والا تھا۔ خاکی رنگ کا قمیص، صاف دھوتی، سر پر کالی کشتی نما ٹوپی۔ مگر اُس کے ساتھ جو چھوکرا تھا بڑا غلیظ تھا۔ بے خاں نے ناک پر رومال رکھ کے تانگے والے سے کہا " بھئی اسے یہیں اُتار دو "۔ تانگے والے نے کہا " بابوجی اسے تانگہ چلانا سکھا رہا ہوں "۔ اس پر بے خاں نے کہا " یہ تمہارا بھائی ہے؟ " تانگے والے نے جواب دیا " نہیں بابوجی۔ مگر بھائی ہی سمجھئے۔ ہمارے گاؤں کا ہے "۔ بے خاں نے پوچھا " یہ اتنا غلیظ کیوں ہے؟ اسے نہانے دُھلانے اور صاف رہنے کی نصیحت نہیں کرتے؟ " بے خاں کی ناک پر رومال دیکھ کے تانگے والے نے مجبوراً چھوکرے کو نیچے اُتارا اور خود لگام سنبھالی۔

کچھ دُور چل کے بے خاں نے پوچھا " تم اپنا تانگہ کِدھر کھڑا کرتے ہو؟ "
وہ کہنے لگا " بابوجی میں تو نئی دلّی کا ہوں۔ کبھی ہارڈنگ ایونیو میں، کبھی سکندرہ روڈ پر "۔

بے خاں نے کہا: "بھئی ہم نے سُنا ہے۔ بعض کالجوں کی لڑکیاں خوب اِدھر اُدھر سیر کے لیے آتی ہیں"۔

تانگے والے نے جواب دیا: "اب بابو جی سے کیا چھپاؤں۔ بابو جی یہ آپ میرے جسم پر صاف کپڑے جو دیکھ رہے ہیں۔ یہ اُسی نوکری کا طفیل ہے۔ میں تو آپ ہی جیسے بابوؤں کی خدمت کر کے ذرا آرام سے رہتا ہوں۔ پیٹ کے لیے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ کالج کی تین چار ایسی لڑکیوں کو جانتا ہوں۔ جو خود ہی آپ ایسے بابو لوگوں کی تلاش میں رہتی ہیں"۔

"مگر تم کو اُن کے متعلق معلوم کیسے ہوا؟"

"بابو جی۔ وہاں کی آیاؤں کی طرح ہم بھی وہاں کی لڑکیوں کے نوکر ہیں۔ انعام مل جاتا ہے۔ کبھی کبھار کوئی لڑکی خود پوچھ لیتی ہے کہ بھئی کوئی اچھا خوبصورت لڑکا ہو تو اُسے ہمارا پتہ بتانا۔ نہیں تو زیادہ تر تو یہ ہوتا ہے کہ آپ ایسے بابو جی فرمائش کر دیتے ہیں اور ہم آیاؤں سے کہتے ہیں۔ آیائیں جانتی ہیں کہ ایسی بات کس لڑکی سے کہنا چاہیے"۔

"بھئی کیا ہمارے لیے کوئی انتظام نہیں کر سکتے؟"

"اس وقت کیسے ہو سکتا ہے۔ اب تو وہ سب کالج میں ہوں گی۔ البتہ پانچ چھ بجے کہیئے تو میں سرکار کے لیے انتظام کر دوں"۔

"اچھا میں چھ بجے نے وی کو کے سامنے انتظار کروں گا۔ مگر دھوکا دے کے اِدھر اُدھر کی لڑکی نہ لے آنا"۔

"بابو جی! آپ تو انگریزی پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ آپ انگریزی میں بات چیت کر لیجیے گا۔ اسکول میں جو پڑھتی ہے۔ پوچھ لیجیے گا۔ بابو جی انعام دیں تو میں غریب نوکر آدمی کبھی دھوکا نہیں دوں گا"۔

"میں تمھیں پانچ روپے انعام دوں گا اُسی وقت۔ یاد رکھو۔ ٹھیک چھ بجے نے وی کو کے سامنے مگر وہ کون ہے؟"

"بابو جی! وہ میرٹھ کی طرف کی ہے۔ کھتری ہے"۔

"خوبصورت ہے؟" بے خاں نے پوچھا۔

"بابوجی، رنگ تو بہت گورا چٹا ہے۔ اونچی پوری ہے۔ اب ناک نقشہ جیسا بھگوان نے بنایا ہے۔ ویسا ہے۔ کچھ آپ کو شادی نہیں کرنا ہے۔"

"کتنے روپے لے گی؟"

"اگر اُس نے آپ کو پسند کر لیا تو پھر کچھ بھی نہیں لے گی؟"

"پھر یہ لڑکیاں آخر اس طرح آتی کیوں ہیں؟"

"بابوجی۔ ان کو ایک طرحوں کا اِسک ہو جاتا ہے۔"

بارہ بجے الف خاں امپیریل ہوٹل میں سیڈرک سن اسٹون سے ملنے گیا۔ جس نے اُسے بیئر اور لنچ کے لیے بُلایا تھا۔ ہوٹل پہنچ کے اُسے سن اسٹون کا پیغام ملا کہ ایک ضروری کام سے اُسے ہیڈ کوارٹر جانا پڑا ہے۔ لیکن الف وہیں اُس کا انتظار کرے۔

دھوپ کی سختی اچھی خاصی تھی۔ پھر بھی اُس نے بیئر منگوائی اور مملکتِ ساؤتھ ایسٹ ایشیا (؟) کے افسروں پر ایک نظر ڈالی۔ جن میں سے اکثر بیئر پی رہے تھے اور وِنڈل وِلکی کی "ایک دُنیا" پڑھ رہے تھے۔ اتنے میں ایک معمّر ہندوستانی آیا۔ گندمی رنگ، مگر اب بھی بہت خوبصورت۔ پام بیچ کا نفیس سُوٹ پہنے اور ایک بھڑکیلی سی ٹائی لگائے ہوئے سر کے بال جن میں سفیدی غالب تھی۔ بہت آراستگی سے سجے ہوئے تھے۔ پہلی ہی نظر میں اُس کا حُسنِ ذوق، اُس کا تموّل اور اُس کی خوش قسمتی عیاں تھی۔

وہ بیٹھنے کے لیے کوئی اچھا سا میز ڈھونڈھ رہا تھا کہ بیئر کے ہلکے ہلکے سرور میں الف خاں نے مُسکرا کے اس سے کہا۔ "آپ بھی میری طرح اکیلے ہیں۔ اسی میز پر آجایئے۔"

مردِ معمّر نے مُسکرا کے شکریہ ادا کیا۔ الف خاں نے اُٹھ کے اُس سے ہاتھ ملایا اور اپنا تعارف کرایا۔ "الف خاں اڈیٹر ٹائمز آف مدراس" اور دیکھا کہ یہ شخص اس گرمی میں بھی نفیس بند کالر پہنے ہے۔

اُس نے اپنا کارڈ دیا۔ "اس۔ ان۔ دیوہ" کارڈ پر لکھنؤ کی ایک بڑی فیشن ایبل سڑک کا پتہ

بھی چھپا ہوا تھا۔ الف خاں نے اُس کے لیے بیئر منگوائی۔ پھر باتیں ہونے لگیں۔ جنگ کب ختم ہوگی؟ بادن بادن اور چیکوسلاویکیا کے صحت بخش پانی کے چشموں، اور نہر سویز کی چاندنی راتوں کا ذکر۔ بالآخر گلمرگ کا تذکرہ چھڑا ہی تھا کہ ایک پینتالیس سال کی انگریز عورت، دُبلی، سوکھی، مگر خوب بناؤ سنگھار کیے ایک نوجوان لڑکی کو ساتھ لیے ہوئے آئی۔ اور دیو کھڑا ہوگیا۔ الف خاں نے ایک نظر میں دیکھ لیا کہ لڑکی کی عمر کوئی بیس اکیس سال ہوگی۔ رنگ انگریزوں سے ذرا مدھم۔ بال راکھ کے رنگ کی، ہاتھوں پر روئیں اور دیو نے تعارف کرایا۔ "میری بیوی اور میری بیٹی۔ اور یہ ٹائمز آف مدراس کے ایڈیٹر مسٹر الف خاں ہیں۔"

مسٹر دیو کی انگریز بیوی نے کہا۔ "یقیناً اس سے پہلے بھی میں مسٹر الف خاں سے مل چکی ہوں۔"

"گلمرگ میں دو سال پہلے ... ... مسز حامد کی پارٹی میں۔" الف خاں نے ہنس کے جواب دیا۔

"ہاں۔ بے شک۔" مسز دیو نے ہنس کے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "کہیئے کیسے ہیں؟"

مسٹر دیو پر اپنی مستورات کا اس اجنبی سے تعارف کرا کے ایک لمحے کے لیے سنجیدگی کا سایہ سا پڑ گیا۔ "خوب۔ بہت خوب۔ آپ تو پرانے مُلاقاتی نِکلے۔ میں اُس سال گلمرگ نہیں گیا تھا۔"

"میں لیموں کا عرق پیوں گی ڈارلنگ۔" مسز دیو نے اپنے شوہر سے کہا۔ "اور شیلا تم؟ دکانوں پر پھرتے پھرتے ہم دونوں پسینہ پسینہ ہوگئے۔ شُو۔" اُس نے مُنہ سے گرمی کے احساس کے طور پر سانس نکالتے ہوئے اور اخلاقاً الف خاں کی طرف مُسکرا کے دیکھ کے کہا۔

الف خاں نے کہا۔ "مسز دیو کو اس سال ابھی سے گلمرگ چلے جانا چاہیے۔"

شیلا مُسکرائی۔ اُس کے لبوں سے جن پر گہری سُرخی لگی ہوئی تھی۔ اُس کے ہموار سفید دانت چمکے۔ ایک لمحے کے لیے اُس کی آنکھوں نے اب پہلی مرتبہ اجنبی کا سر سے پاؤں تک

جائزہ لیا۔ الف خاں اُن کی بھوری آنکھوں میں اُس کی رائے نہ پڑھ سکا۔

مسز دیو نے کہا۔ "گذشتہ سال تو شیلا ہمارے ساتھ کشمیر گئی تھی، مگر گلمرگ نہیں۔ اس نے پہلگام کے راستے سونامرگ تک ٹریکنگ کی تھی اپنے والد کے ساتھ۔"

الف خاں نے کہا۔ "پہلگام سے سونامرگ تک تو ٹریکنگ بڑی ہی دلچسپ ہوگی اور خطرناک بھی۔"

شیلا کے دانت پھر چمکے۔ "اوہ مجھے ٹریکنگ سے عشق ہے۔"

مسٹر دیو نے کہا۔ "ہاں ایک حد تک خطرناک تو ضرور ہے۔ لیکن میری یہ نوجوان لڑکی پہاڑوں پر بکری کی طرح چڑھتی ہے۔ مَیں نے البتہ اس سفر میں محسوس کیا کہ قلب پر ذرا بار پڑتا ہے۔"

الف خاں نے پھر شیلا سے پوچھا۔ "اور آپ نے کوکو ہوئی کا گلیشیر بھی خوب اچھی طرح دیکھا۔"

"اوہ مجھے کوکو ہوئی سے عشق ہے۔" اُس نے جواب دیا۔

الف خاں نے مسز دیو سے سوال کیا۔ "اور ان گرمیوں میں آپ کا کہاں جانے کا ارادہ ہے۔"

"نینی تال۔ لکھنؤ سے قریب ترین پہاڑ وہی ہے۔ آپ کبھی لکھنؤ گئے ہیں۔" مسز دیو نے کہا۔

"ریل پر گذرا ہوں۔ مگر کبھی اُترا نہیں۔" الف خاں نے جواب دیا۔

مسٹر دیو نے کہا۔ "بڑا خوبصورت شہر ہے۔"

"اوہ آپ ان کی باتوں پر یقین نہ کیجیے۔ بڑا ہی گندہ مقام ہے۔ بالکل گندہ ... ... نئی دلی اُس سے بہت زیادہ صاف ہے۔ لیکن آپ اب تک لکھنؤ نہیں گئے تو کبھی آیئے اور خود دیکھیے ... ... ہمارے ہی یہاں ٹھہریئے گا۔" الف خاں نے مسز دیو کے لہجے میں لندن کے کاکنی (عامیانہ) لہجہ کی خفیف سی جھلک محسوس کی اور سوچنے لگا کہ یہ دیو کی لینڈ لیڈی کی بیٹی ہوگی یا ٹائپسٹ۔ یا یہ ممکن ہے کہ ہمیرا سمتھ کے ناچ گھر میں ان دونوں کی پہلی

ملاقات ہوئی ہو۔ اُس نے مسز دیو کی دعوت کا شکریہ ادا کر کے کہا۔ "ضرور۔ مگر مجھے اخبار کے کام سے فرصت بہت کم ہوتی ہے۔"

مسٹر دیو کی بھویں اِس درمیان میں ذرا تن گئی تھیں۔ مگر پھر یہ سوچ کر کہ اگر اِس اجنبی کو عاشقی کرنا ہی ہے تو میری بیٹی سے کرے گا، بیوی سے نہیں، وہ دل ہی دل میں ذرا نرم پڑے اور الف خاں سے پوچھا۔ "دلی میں آپ کب تک ہیں؟"

"بائیس تک۔"

"غالباً آپ کے بہت ملاقاتی یہاں ہوں گے؟" مسز دیو نے لیمو کا گلاس ختم کر کے کہا۔

"بہت تھوڑے۔ بس دو چار۔" الف خاں نے جواب دیا۔

"تب تو آپ کا دل بہت گھبراتا ہو گا۔ آپ یہاں ہم لوگوں سے ملنے آجایا کیجیے۔" مسز دیو نے کہا اور پھر اپنے شوہر کی طرف مُڑ کے تائید کے لیے پوچھا۔ "کیوں ڈارلنگ؟" جس نے بیئر کا گلاس ختم کر کے اُسے میز پر آہستہ آہستہ بجانا شروع کیا تھا۔ مسٹر دیو نے اخلاقاً تائید کی۔ "ہاں۔ ہاں۔ بیشک۔"

"کل ہی ہمارے فلیٹ میں، یہیں، اوپر، ایک چھوٹی سی پارٹی ہے۔ آپ کو کچھ کام نہ ہو تو آئیے۔ زیادہ تر کاروباری لوگ ہیں۔" پھر اپنے شوہر کو اطمینان دلانے کے لیے ــــ "شیلا اپنے والد کے دوستوں میں ذرا اپنے آپ کو ہر چیز سے باہر باہر محسوس کرے گی۔ زیادہ نوجوانوں کو ہم بُلا نہیں سکے۔"

مسٹر، مسز اور مس دیو جانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ الف خاں نے شکریہ کے ساتھ اُن کی چائے کی دعوت قبول کی۔ مس شیلا دیو نے اپنی ماں کے بعد جب "گڈ بائی" کہتے ہوئے ہاتھ بڑھایا تو ایک ہلکی سی سرد مسکراہٹ میں اُس کے خوبصورت دانت پھر سُرخ ہونٹوں میں چمکے۔ الف خاں نے اُس کی بھوری آنکھوں کو جھانک کے دیکھا۔ وہ بالکل غیر جانبدار تھیں۔

شام کے پانچ بجے سے بے خاں کے اعصاب پر انتظار کا بھوت سوار ہوا۔ نے دی کو

کے پیانو بجانے والے نے جس کے بال خنجر کے رنگ کے اور گھنگھریالے تھے، ایک حسین امریکی لڑکی کا دو تین امریکن افسروں سے تعارف کرایا۔ امریکن لڑکی کے رخساروں، لبوں اور ٹھوڑی پر اور اُس کی آنکھوں میں ایک طرح کی نرمی تھی۔ یہی اُس کے حُسن کا راز تھا۔ کیوں کہ یہ نرمی خود تنا سب حُسن اور نزاکت کا مجموعہ تھی ... ... کئی مرتبہ بے خاں سے اُس کی آنکھیں چار ہوئیں مگر اُس کی آنکھوں نے بے خاں کی ملتجی نظروں کی طرف کوئی اِلتفات بھی نہ کیا! اسی امریکن لڑکی اور اُس کے حواریوں کی سیدھ میں ہال کے کونے میں ایک بھدا سکھ جوڑا آئس کریم کھا رہا تھا۔ اس جوڑے کے ساتھ ایک اور نوجوان تھا اور ایک خوبصورت لڑکی۔ سر کے بال کالے جمے بھی ہوئے تھے اور کٹے بھی، تنگ پیلے رنگ کا بلاؤز اُس کے جسم پر بہت پھب رہا تھا۔ جب وہ اُٹھی تو بے خاں نے دیکھا کہ وہ پارسی وضع کی ساری پہنے ہے اور اُس کا جسم جو ضرورت سے زیادہ گُداز تھا۔ اُس کے چہرے کے حُسن کا ساتھ نہیں دے سکا۔

ساڑھے پانچ سے پونے چھ تک وہ نے وی کو کے سامنے کے سبزہ زار پر ٹہلتا رہا۔ بوندیں آئیں اور اُس نے سینما کے سائبان کے نیچے پناہ لی۔

پھر چھ بجے۔

مگر تانگے والے — یعنی اُس تانگے والے کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ کھڑا اُس کا انتظار کرتا رہا۔ یہاں تک کہ سوا چھ ہو گئے اور اُس نے محسوس کیا کہ چوکیدار، اخبار بیچنے والے سب اُسے دیکھ رہے ہیں۔

بہت سے تانگے گذرے۔ لیکن وہ تانگہ نہیں آیا۔ تانگے والے نے شاید دھوکا دیا۔ اگر اُسے پیشگی انعام دیا جاتا تو شاید بھاگ جاتا۔ یہ بھی عجیب قوم ہے۔ پیشگی دو تو مشکل، نہ دو تو مشکل۔

ساڑھے چھ بجے کے قریب تک انتظار کر کے وہ اُکتا گیا تھا اور اُسے اپنے اُوپر غصہ آرہا تھا کہ ناحق اس بدمعاش کی باتوں میں آگیا۔ اِتنے میں اُس نے دیکھا کہ ایک لڑکی خوب لمبی چوڑی، پہاڑ کی پہاڑ سفید شلوار اور دوپٹہ پہنے، ہاتھوں میں کتابیں لیے چلی آرہی ہے۔ نظر بھر کے اُس نے بے خاں کی طرف دیکھا مگر ٹھہری نہیں۔ سامنے سے گذر گئی اور بے خاں سمجھ

گیاکہ وہی کھتری لڑکی ہے ۔ بدنامی کے خیال سے دُور کہیں تانگے سے اُتری ہے۔ معلوم نہیں کیوں اُس نے اس لڑکی کا تعاقب نہیں کیا۔ چند قدم اور آگے بڑھ کے اُس لڑکی نے بے خاں کو ایک بار پلٹ کے دیکھا بے خاں نے بھی اُس کی طرف نظر بھر کے دیکھا اور پھر اُس نے محسوس کیا کہ نہ وہ لڑکی رُکے گی اور نہ وہ اُسے روکے گا۔ سڑک کے موڑ پر وہ لڑکی نظر سے غائب ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد تانگے والے نے آکر اپنا انعام مانگا۔

۷

۱۴ر اپریل

امپیریل ہوٹل میں مسٹر اور مسز دیو نے جو چائے کی دعوت کی تھی۔ اُس میں عموماً کارخانوں کے امیر مالک اور اسی قسم کے لوگ تھے۔ کچھ اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ کے ممبر تھے جو ابھی تک دلی ہی میں تھے۔ نوجوان کم تھے اور جو تھے بھی وہ اپنی بیویوں کے ساتھ آئے تھے۔ اس لیے الف خاں کو شیلا کے قریب رہنے کا موقعہ زیادہ ملا۔ اُسی کے میز پر وہ آکر بیٹھا تھا۔ اُسی کے شفاف ہاتھوں کی بنائی ہوئی چائے اُس نے پی۔ اُسی کی خاطرداری کے وہ مزے لیتا رہا۔ اور اُسے چھیڑتا رہا۔ ہمیشہ سے اُس کا اصول تھا کہ چھیڑ سے بڑھ کے نوجوان لڑکی اور کسی چیز سے خوش نہیں ہوتی۔ خواہ وہ چھیڑ جسمانی ہو یا زبانی۔ باتوں باتوں میں اُس نے پتہ چلا لیا کہ شیلا کو کسی "خاص" نوجوان سے اُنس نہیں۔ اس لیے میدان صاف ہے۔ مسز دیو کے کردار اور طبقے سے اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اُس کی تعلیم چاہے جتنی اچھی ہوئی ہو۔ تربیت وہی نیم مغربی ہے۔ بہرحال حالات بہت اُمید افزا تھے۔ چنانچہ جب دوسرے مہمانوں کے اُٹھ جانے کے بعد الف خاں نے شیلا سے قطب صاحب کی سیر کو چلنے کے لیے کہا تو وہ بڑی خوشی سے تیار ہو گئی۔ اپنی ماں سے نہ صرف اجازت لی بلکہ موٹر بھی مانگ لی۔

جلدی جلدی اوپر اپنے کمرے کو جا کے وہ کپڑے بدل کے آئی۔ ساریہ اُتار کے اُس نے قمیص اور شلوار کا بڑا خوبصورت سوٹ پہن لیا تھا اور اونچی ایڑی کے سفید جوتے، ماتھے پر ٹیکہ لگا کے اور بالکل ہندوستانی چال چلتی ہوئی جب وہ پھر نیچے آئی تو وہ اپنی ماں سے زیادہ اپنے باپ کی بیٹی معلوم ہو رہی تھی۔

الف خاں نے کہا: "شیل۔ تمھارے حُسن کی کوئی انتہا بھی ہے ؟ اس لباس میں تو سارا شہر تم پر فدا ہو جائے گا۔"

"خوشامد کرنے والے نوجوان آدمی۔" وہ ذرا خوش ہو کے مُسکرائی۔ "ہم کسی شہر کو نہیں بلکہ ایک پُرانی عمارت کو دیکھنے جا رہے ہیں۔"

"قطبُ الدین ایبک کا بنایا ہوا مینار تمھیں جھک کے سلام کرے گا۔"

"شکریہ۔" اُس نے ہنس کے کہا۔ وینٹی کیس سے آئینہ نکال کے اُس نے پھر ایک مرتبہ اپنے چہرے کا جائزہ لیا۔ رومال سے لبوں کے گوشوں پر سُرخی کو ٹھیک کیا اور کہا: "چلو خوشامدی۔"

مینار کی سیڑھیوں پر جب ہاتھ کے نیم دائرے نے کمر کو لپیٹ لیا تو وہ کچھ نہیں بولی اور التمش کے مقبرے کے پاس شام کے گہرے ہوتے ہوئے دُھندلکے میں جب الف خاں نے اس کے ہونٹوں کو بوسہ کے لیے ڈھونڈھا تو صرف ہنس کے اتنا کہہ سکی: "تم بہت شرارت کر رہے ہو۔ کل ہی تو تم سے پہلی مرتبہ ملاقات ...." اور راکھ کے رنگ کے بال لہرا کے خاموش ہو گئے۔

اُس نے دو ایک منٹ کے بعد کہا: "چلو اب چلیں۔ پپا نے مجھے جلدی آنے کو کہا تھا۔"

واپسی میں، موٹر میں اوّل اوّل اُس نے الف خاں کو زیادہ دست درازی نہیں کرنے دی۔ سامنے کے چھوٹے سے آئینے میں الف خاں نے ڈرائیور کی شکل دیکھی جو گویا کہہ رہا تھا۔ "میاں میرا خیال کرنے کی ضرورت نہیں۔ میری آنکھیں تو ایسے ہزاروں منظر دیکھ چکی ہیں۔ بس صاحب بخشش نہ بھولیے گا۔"

الف خاں ڈرائیور کے عکس کی زبانی یہ سُن کر مُسکرایا اور ڈرائیور نے بھی سر ہلا دیا۔ اس پر الف خاں نے شیلا کی کمر میں ہاتھ ڈال کے، اُسے اپنی طرف گھسیٹ کے اُس کا ایک طویل بوسہ لیا۔ جب شہر کی روشنیاں بالکل قریب آگئیں تو شیلا نے اپنے آپ کو اُس کے ہاتھوں کی مضبوط گرفت سے آزاد کر کے ہانپتے ہوئے کہا: "تم شیطان۔ تم بالکل پاگل ہو۔"

الف خاں نے پوچھا: "پھر تم سے کب ملاقات ہوگی؟"

"کل تو میں تم سے ہرگز نہ ملوں گی"۔ شیلا نے جواب دیا۔ "تم بڑے FRESH بڑے CHEEKY ہو۔ یہ تمھاری سزا ہے۔"

الف خاں نے ہنس کے کہا: "میں نے تمھارے ساتھ جو زیادتی کی ہے۔ وہ ہی تم بھی کرلو۔ مگر مجھ سے خفا نہ ہو۔"

"ہاں ایسی سزا تو تمھیں ضرور پسند آئے گی"۔ شیلا نے موٹر کا' اندر کا روشنی کا کھٹکا کھولتے ہوئے کہا: "دیکھو، میں کیسی خوفناک معلوم ہو رہی ہوں"۔ اُس نے حلق سے ایک دبی ہوئی مصنوعی، دلفریب چیخ نکال کے کہا: "ذرا میرا چہرہ تو دیکھو۔ جیسے کوئی شہر ابھی ابھی تاراج ہوا ہو"۔ اُس نے وینٹی کیس سے لپ اِسٹک نکال کے لبوں کی سُرخی پھر ٹھیک کی۔ ناک پر تھوڑا سا غازہ تھوپا اور "تم شیطان ہو" کہہ کے لپ اسٹک اور آئینہ اور غازہ کا پف تینوں پھر یکے بعد دیگرے وینٹی کیس میں رکھ دیے۔

"تو پھر کل؟" الف خاں نے سوال دُہرایا۔

"نہیں کل ہم لوگ جہنم کو جا رہے ہیں؟" شیلا نے کہا۔

"اس راشننگ کے زمانے میں؟" الف خاں نے معصومیت سے پوچھا۔

"شٹ اپ"۔ اُس نے ہنستے ہوئے موٹر کے گدّے کا سہارا لے کے کہا: "تم بالکل ناممکن ہو۔"

"تو پھر کل؟"

"کل تو مَیں ہرگز نہ ملوں گی"۔

"پرسوں؟"

"نہیں"۔

"پھر کب؟"

"کبھی، کبھی نہیں"۔

"ڈارلنگ خدا کے لیے ایسی سخت سزا تو نہ دو۔ پرسوں ضرور۔ پرسوں کس وقت میں

تم سے ملوں۔ شام کو نے وی کو میں ساتھ چائے کیوں نہ پئیں۔"

"اور اگر میں انکار کر دوں"۔ شیلا نے شرارت سے آنکھیں چمکا کے کہا۔

"تو میں ابھی تمھاری موٹر کا دروازہ کھول کے کُودتا ہوں"۔

"تو میں انکار کرتی ہوں"۔

"پلیز۔ شیلا"۔ اُس نے دروازہ کھولنے کا بہانہ کرتے ہوئے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"تم پھر بھی مرو گے نہیں، تم اتنے بے حیا ہو"۔

الف خاں نے ہنس کے کہا۔ "تو ڈارلنگ پھر پرسوں نے وی کو میں کتنے بجے؟"

ہوٹل قریب آچکا تھا۔ شیلا نے کہا۔ "سوا چھ"۔

الف خاں نے جلدی سے شیلا کا ہاتھ چُوما۔ اتنے میں آہستہ سے موٹر امپیریل ہوٹل کے پھاٹک میں مُڑی اور پورٹیکو میں رُک گئی۔ "شب بخیر شیطان"۔ کہہ کے شیلا اُتر پڑی اور شوفر سے کہا کہ صاحب کو کشمیری گیٹ اُن کے ہوٹل میں .... چھوڑ آئے۔

"نہیں اس زمانے میں پٹرول اتنا کہاں ملتا ہے"۔ اُس نے شیلا سے کہا: "یہ مجھے کناٹ پلیس پہنچا دے۔ وہاں سے میں تانگہ پر چلا جاؤں گا۔ لیکن پرسوں سوا چھ بجے"۔

"سوا چھ بجے"۔ شیلا نے شرارت سے کہا۔

"شب بخیر"۔

وہ اندر چلی گئی۔

کناٹ پلیس میں ڈرائیور کو پانچ روپیہ انعام دے کر الف خاں نے مسٹر دیو کی موٹر سے اُتر کر کافی ہاؤس کا رُخ کیا۔

ویٹر نے اُس کے قریب آکے جُھک کے اُس کے کان میں کہا: "حضور۔ آپ کا کارڈ اُن لوگوں کو دے دیا"۔

"وہ کب آئی تھیں؟" الف خاں نے پوچھا۔

"۔۔ چار بجے"۔

"کون کون تھیں"۔

"وہ گوری لڑکی جس پر سرکار آ سِک ہو گئے۔ اور اُس کے ساتھ والی دُبلی لڑکی بھی"

"کیا ہوا پورا قصہ سُناؤ"۔

"کارڈ تو میں نے گوری والی کو دیا۔ پہلے تو دونوں نے میری طرف ایسے دیدے گھُما کر دیکھا کہ مَیں ڈر گیا۔ کہیں یہ مالک سے رپورٹ نہ کر دیں اور میں بے ناحق کے نِکالا جاؤں۔ پھر دُبلی لڑکی نے وہ کارڈ دوسری کو دیا۔ پھر دونوں پڑھ کر ہنسنے لگیں اور آپس میں انگریزی میں نہ جانے کیا کہنے لگیں۔ آخر دُبلی لڑکی نے کہا"۔ اچھا بیرا ہم اس کا جواب کل دیں گے"۔

الف خاں نے ویٹر کو آٹھ آنے انعام دیا اور کافی ختم کر کے باہر چلا گیا۔

۸

۱۵ اپریل

الف خاں نے "دہلی سن" میں شادی کا ایک اشتہار دیکھا"۔ ضرورت ہے رشتہ کی۔ مسلمان کم سن حسین تعلیم یافتہ لڑکی کے لیے جو گورنمنٹ آف انڈیا کے ایک اعلیٰ عہدہ دار کی لڑکی ہے"۔ دہلی سن" پوسٹ بکس نمبر ۶۸۲۹" الف خاں نے اُسی وقت اس پتہ پر خط لکھ دیا اور ان اعلیٰ عہدہ دار صاحب سے دریافت کیا کہ وہ اپنی موجودگی میں اُس کو اپنی صاحبزادی سے ملنے کی اجازت دیں گے۔

صُبح کو بے خاں پنڈت اندر سہائے سیفی کاشمیری سے ملنے گیا۔ چھوٹا سا قد، گورا رنگ، وضع قطع، رفتار و گفتار سب ہندو مُسلم اتحاد کی یادگار، زبان فصیح و شیریں۔

بے خاں نے سیفی صاحب سے ترقی پسند ادب پر گفتگو چھیڑی۔ جس کے وہ بالعموم اور نظمِ مُعرّیٰ کے بالخصوص مخالف ہیں۔ پھر جنسیات کا ذکر چھڑا تو کہنے لگے۔ ادب میں آزادیٔ تخیّل، عصمتِ تخیّل کے بغیر کیسے ممکن ہے؟ سیفی صاحب نے اپنی ایک نوٹ بک نکالی۔ جس میں طرح طرح کے اندراجات تھے۔ کتابوں کے خلاصے، اخباروں کے تراشے۔ ان میں

سے ایک تراشے پر بے خاں کی نظر پڑی۔ یہ بڑا دلچسپ معلوم ہوا۔

یہ ہندوستان ٹائمز کے شادی کے کالم کا ایک تراشا تھا: "ایک ہندو اور ایک مسلمان لڑکی، دونوں تعلیم یافتہ اور خوبصورت، بین الفرقہ جاتی شادی کرنا چاہتی ہیں۔"

ساتھ ہی سیفی صاحب نے ایک اور تراشا دکھایا۔ یو۔ پی کے ایک مسلمان کا مضمون تھا۔ جو ہندوستان ٹائمز میں دو چار روز بعد چھپا تھا۔ بے خاں نے پڑھا۔ یہ اُس شادی کے اشتہار پر تبصرہ تھا۔ ان صاحب نے ان دونوں لڑکیوں کی ہمت کی بڑی تعریف کی تھی اور اُسے ہندو مسلم اتحاد کی طرف ایک بڑا اقدام بتایا تھا۔

بے خاں نے یہ خط پڑھ کے سیفی صاحب سے پوچھا: "پنڈت جی! اس معاملے میں آپ کی کیا رائے ہے ؛ اگر ہندو لڑکیاں مسلمانوں سے اور مسلمان لڑکیاں ہندوؤں سے شادیاں کریں۔ تو کیا واقعی اس سے ہندو مسلم اتحاد میں ترقی کا امکان ہے؟"

سیفی صاحب ہنسنے لگے۔ کہا: "میرے سر میں آج کل پھوڑے ہیں۔ میں ذرا چند قدم پر ڈاکٹر باور کے یہاں جا رہا ہوں۔ فرصت ہو تو چلے چلیے۔ راستے میں آپ سے خوب باتیں ہو سکیں گی۔"

راستے میں بے خاں نے پھر اپنا سوال دُہرایا۔

پنڈت سیفی پھر ہنسنے لگے۔ "بے خاں صاحب میرا ایک پوتا ہے۔ جس کی عمر بائیس سال ہے۔ میری ایک جوان پوتی ہے۔ جس کی عمر اُنیس سال ہے۔ آپ مجھ سے یوں پوچھتے کہ اگر میرا پوتا مجھ سے آ کے کہے: "دادا میں فلاں مسلمان لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" اور میری پوتی مجھ سے آ کے کہے: "دادا میں فلاں مسلمان لڑکے سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔" تو اس وقت میرے احساسات کیا ہوں گے۔ میں کیا فیصلہ کروں گا اور میں اُنھیں کیا مشورہ دوں گا۔"

بے خاں نے کہا: "ہاں اس سوال کی پوری اہمیت تو اُسی وقت واضح ہو سکتی ہے۔ جب اپنے قریب ترین عزیزوں کے لیے اس قسم کا مشورہ درپیش ہو۔"

پنڈت جی نے کہا: "بے خاں صاحب اگر مجھے یقین ہو کہ میرا پوتا یا میری پوتی کسی مسلمان گھرانے میں شادی کریں تو ہندو مسلم اتحاد پر اچھا اثر پڑے گا۔ تو میں پہلا شخص ہوں گا۔ جو

انتہائی خوشی سے ان شادیوں کی اجازت دوں۔ لیکن اب میری عمر اسی سال کی ہونے کو آئی ہے۔ میں نے ہمیشہ یہی دیکھا ہے کہ جب اس قسم کی کوئی شادی یا کوئی تعلق ہوجاتا ہے تو ہندو مسلم اتحاد میں رخنہ ہی پڑتا ہے۔ اتحاد کا تو امکان کم ہوتا ہے۔ رخنے اور شورش کا امکان زیادہ ہے۔"

بے خاں نے کچھ سوچ کے کہا: "لیکن پنڈت جی ایک ایسی سوسائٹی لیجیے۔ جس میں یہ فرقہ وارانہ تعصبات باقی نہ رہیں۔ کبھی تو ہندوستان سے یہ تعصبات رخصت ہوں گے۔"

سیفی صاحب کہنے لگے۔ "صاحب اکبر کے زمانے میں تو ایسی ہی سوسائٹی تھی۔ اکبر نے ہندو عورتوں سے شادیاں کیں۔ اکبر کی اولاد نے کیں۔ اس سے کیا خاک اتحاد پیدا ہوا؟ کیا نتیجہ نکلا؛ اورنگ زیب۔ جزیہ۔ خانہ جنگی اور انگریزوں کی حکومت۔ پھر جب ہندوستان کے کسی حصے میں کسی ہندو راجہ کا زور ہوا تو اس نے مسلمان عورتوں سے اکبر کا بدلہ لینے کی کوشش کی یہ آج کا نہیں صدیوں کا تجربہ ہے۔"

اتنے میں یہ دونوں ڈاکٹر کے مکان کے قریب پہنچے۔ لیکن اس کے مطب میں اتنا مجمع تھا کہ پنڈت جی نے کہا: "کچھ دیر باہر ہیں اس درخت کے نیچے ٹھہریں۔ دیکھیے کیسی ٹھنڈی چھاؤں ہے۔"

اسی بحث کو جاری رکھنے کے خیال سے بے خاں نے کہا: "خیر جب اس قسم کی شادیاں زیادہ ہوں گی تو یہ صورت باقی نہ رہے گی۔"

"اچھا صاحب! اجتماعی نقطۂ نظر سے جانے دیجیے۔ انفرادی نقطۂ نظر کو لیجیے میں نے اپنے بال دھوپ میں سفید نہیں کیے ہیں۔ تھوڑے دنوں کے بعد جب میاں بیوی کے ابتدائی جوش اور عشق کا خاتمہ ہوجاتا ہے تو میں نے تو یہی دیکھا ہے کہ ایسی نوتے فیصدی شادیوں میں نہ لڑکا خوش رہتا ہے نہ لڑکی۔ اجتماعی ماحول سے الگ ہو کے خانگی زندگی میں قدرتی آسودگی کیسے باقی رہ سکتی ہے۔ رفتہ رفتہ میاں اور بیوی دونوں میں ابتدائی مذہبی تعلیم کے اثرات عود کر آتے ہیں۔ میاں بیوی اور بیوی میاں کی بیگانہ رسموں، بیگانہ فصلوں سے بیزار ہونے لگتے ہیں۔"

"نہیں۔ پنڈت جی اس بنا پر آپ کوئی کلیہ نہیں قرار دے سکتے۔" بے خاں نے کہا۔

"اچھا صاحب، آپ نہیں مانتے ہیں نہ مانیے۔" پنڈت سیفی نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے ہاتھ کی تیسری انگلی اٹھا کے کہا۔ "تیسرا مسئلہ ہے اس قسم کی شادیوں یا تعلقات کے متعلق عوام اور خواص کی ذہنیت کا۔ عوام کو تو آپ رہنے ہی دیجیے۔ خواص کو لیجیے دیکھیے صاحب، ڈاکٹر اقبال کو بھی کشمیری دختر کے برہمنے ہی سے عشق کی سوجھی۔ آپ تو کشمیر جا چکے ہوں گے؟ آپ ہی بتائیے، وہاں کی مزدور پیشہ مسلمانیوں تک کا حسن پنڈتانیوں سے کہیں بڑھ کے ہے یا نہیں؟ پھر کوئی جمالی احساس تو شاید ڈاکٹر صاحب مرحوم کے اس شعر کا محرک نہیں تھا۔ انھوں نے تو یہ فرمایا اور اب جوابی حملے ہو رہے ہیں۔ کوئی صاحبزادے ہیں رامانند ساگر۔ ان کے افسانوں میں میں نے دیکھا ہے کہ بالعموم ہیروئن مسلمان ہوتی ہے اور ہیرو ہندو۔"

ہوتے ہوتے دوسرے مباحث پر باتیں ہونے لگیں۔ پردے کا ذکر آیا تو پنڈت جی کہنے لگے۔ "صاحب پردے کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ پنجاب کے بعض دیہاتوں میں عورتیں عموماً گرمیوں کے زمانے میں ایک ہی چادر سے جسم ڈھانپتی ہیں۔ دروازے کے سامنے سے اگر میں گذروں تو وہ چادر سے اپنا منہ چھپا لیں گی۔ لیکن اگر میرالڑکا گذرے تو اپنا منہ نہ چھپائیں گی۔ یہاں پردے سے شاید تعظیم مراد ہے۔ یہی تو میں کہتا ہوں کہ پردے کی کئی قسمیں ہیں۔"

ڈاکٹر ڈیاور کے مطب کا مجمع اب چھٹ چکا تھا۔ پنڈت سیفی اور بے خاں دونوں اُن کے مطب میں پہنچے۔

سہ پہر کو الف خاں نے کناٹ پلیس کے سبزہ زار پر ایک بلند قامت، سُرخ و سفید لڑکی کو دیکھا۔ زیادہ سے زیادہ نچلے متوسط طبقے کی۔ ایک ملگجا سا سُرخ شلوار پہنے۔ اُس کے ساتھ سات آٹھ برس کا ایک لڑکا تھا۔ جس کے بال سکھ وضع سے بندھے ہوئے تھے۔ بار بار وہ الف خاں سے آنکھ لڑاتی اور الف خاں مسکراتا ہوا طرح طرح سے اُس کے قریب سے ہو کر ٹہلتا رہا۔ ایک آدھ بار آنکھ بھی ماری۔ سبزہ زار کے وسط میں آ کے اُس نے لڑکے کے

لیے آئس کریم خریدی۔ جس میں سے آدھی خود کھائی۔ پھر آنکھ لڑانے کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ وہ سبزے کے قطعے سے نکل کر سڑک کو عبور کر کے ایک سکھ دوکاندار کی دوکان میں چلی گئی۔ اور الف خاں کو اپنا تعاقب ختم کرنا پڑا۔ سبزے پر بیٹھے ہوئے کچھ بے فکرے جو یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ اُس کی طرف دیکھ کے، آپس میں کچھ کہہ کے ہنسنے لگے۔

ترکمان دروازے کے سامنے، اروِن ہسپتال کے مقابل جو میدان ہے۔ اُس میں بے خاں نے برقعہ پوش عورتوں کے دو قافلے دیکھے۔ سیاہ چمکتے ہوئے، دُھلے ہوئے بُرقعے' یہ قافلے ایک دوسرے سے تیس گز آگے پیچھے چلے جا رہے تھے۔ کوئی مرد ساتھ نہ تھا۔ تانگہ والا جو بڑا زندہ دل تھا۔ برابر گھوڑے سے مذاق کر رہا تھا۔ آخر بے خاں نے اُس سے سوال کیا۔

"یہ عورتیں کون ہیں؟"

"گرہستنیں ہیں بابو جی۔"

"کہاں جا رہی ہیں۔" بے خاں نے پوچھا۔

"آج ذرا ٹھنڈا ہے نا بابو جی، سیر کرنے، عیش منانے کو نکلی ہیں۔"

"اچھا یہ عیش بھی مناتی ہیں۔"

"اور نہیں تو کیا بابو جی۔ دن کے دس بجے، اُن کے میاں بچارے دفتروں کو سدھارے اُس کے بعد بابو جی جتنی کہیے اُتنی سریچھ بہو بیٹیوں کے پاس آپ کو لے چلوں یا ہوٹل میں آپ کے پاس لے آؤں۔"

"نہیں بھئی۔ تم جھوٹ کہہ رہے ہو۔ یہ شریف عورتیں بھلا ایسا کیا کرتی ہوں گی۔"

"بھگوان کی قسم بابو جی۔ دھرم سے میں تو ایسی بیبیوں کو جانتا ہوں۔"

"نئی دلّی میں یا پُرانی دلّی میں۔"

"دونوں جگہاں بابو جی۔ جہاں جی چاہے وہاں چلیے اور سو میں سے دس پانچ تو ایسی بھی نکل آئیں گی جو آپ سے دام بھی نہ لیں۔"

"تو پھر وہ کیوں ایسی بات کرتی ہیں؟"

"آپ پڑھے لکھے لوگ ہیں آپ جانیں۔ مَیں تو جانوں کہ اُنھیں ایک طرحوں کی لت پڑ جاتی ہے مگر زیادہ تر تو پیسے ہی کے لیے جاتی ہیں۔"

"اور اُن کے مرد کچھ نہیں بولتے۔"

"بابوجی بعض تو ایسی چلتی ہوئی ہوتی ہیں کہ اُن کے مردوں کے پھرشتوں کو بھی خبر نہیں ہونے پاتی۔ بعض کے مرد ایسے بے حیا ہوتے ہیں کہ روپے کی لالچ میں کچھ نہیں بولتے۔"

"نہیں جی۔"

"حضور مَیں آپ کو کناٹ پلیس میں کتنی دھوتیاں بندھی ہوئی، شلواریں پہنی ہوئی۔ سرپچھ لڑکیاں بتادوں جو گوروں کے ساتھ، سانڈو گھانس کے مُلک والوں کے ساتھ ماری ماری پھرتی ہیں۔ بابوجی میں نے خود اپنے ہندوستانی بھائیوں کو دیکھا ہے۔ مَیں دھرم سے کہتا ہوں۔ مَیں نے خود ایک بابوجی کو دیکھا کہ جو اسی میرے تانگے میں بٹھا کے اپنی بیٹی کو سانڈو گھانس کے مُلک کے ایک افسر کے پاس لائے۔"

"اچھا۔"

"حضور ان سانڈو گھانس کے رہنے والوں کے پاس بڑے بڑے ہرے ہرے نوٹ بہت سے ہیں نا۔ بس سوسو کے چار پانچ نوٹ انھوں نے بابوجی کے ہاتھ میں پکڑا دیے اور اُن کی لڑکی کو لے کے چلتے بنے۔"

"مگر یہ سانڈو گھانس کے مُلک کے رہنے والے شریف تو بہت ہوتے ہیں۔" بے خاں نے کہا۔

"ہاں بابوجی۔ راہ چلتی عورت کو چھیڑتے نہیں۔ ہم کالے آدمیوں سے اخلاق سے باتیں کرتے ہیں۔ بابوجی ٹامی تو کبھی کبھی ہمیں مار بھی دیتے ہیں مگر سانڈو گھانس والا سپاہی ہمیشہ دو آنے زیادہ دیتا ہے۔ مگر بابوجی بھگوان کی قسم کوئی مجھے قلعہ کا سارا خزانہ بھی لادے تو میں اپنی جورو یا بیٹی کو ان کے پاس نہیں لانے کا۔ مَیں کچھ سرپچھ نہیں۔ یہی نیچ کمینہ ہوں۔ گریب آدمی ہوں۔ ایک وقت پیٹ بھر کھانا مل گیا تو بھگوان کی کرپا ہے۔ نہیں تو کبھی زیادہ کی لالچ نہیں کرتا مزدور

سبھا میں کام کرتا ہوں۔ دو دفعہ جیل بھگت چکا ہوں۔"

"بھئی تم تو بڑے عجیب آدمی نکلے۔ مزدور سبھا میں تم کب سے ہو؟" بے خاں نے سوال کیا۔

"بابوجی۔ یہی کوئی پانچ چھ برس سے۔"

کناٹ پلیس میں شام کے جھٹ پٹے سے کچھ پہلے الف خاں نے ایک لڑکی کو نقاب اُلٹے مقابل سمت سے آتے دیکھا۔ الف خاں نے فوراً پہچان لیا کہ یہ حسینہ ہے۔ وہ آنکھیں چمکا کے مُسکرایا۔ مگر وہ اُس کی طرف ایک اُچٹتی ہوئی سی نظر ڈال کے چلی گئی۔ مناسب فاصلے پر الف خاں نے اُس کا تعاقب کیا۔ وہ ایک کُتب فروش کی دوکان میں داخل ہوئی۔ وہیں وہ دُبلی سی بیمار لڑکی اور اُس کی ماں بھی تھیں۔ پھر وہ تینوں باہر نکلیں۔ الف خاں نے سوچا کہ اگر ان کا اور زیادہ پیچھا کیا گیا تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔

مگر رات کے بارہ بجے جب پکاڈلی سے واپس ہو کے وہ کافی ہاؤس گیا تو موٹے ویٹر نے اُس سے کہا کہ "اُس نے بھی اُن لڑکیوں کو کناٹ پلیس کا چکر لگاتے دیکھا تھا۔ مگر آج وہ کافی ہاؤس نہیں آئیں۔"

۹

۱۶ر اپریل

نے وی کو میں چائے پینے کے بعد الف خاں نے شیلا کے سامنے دو طرح کی تجویزیں پیش کیں۔ ایک تو سینما اور اُس کے بعد کھانا۔ دوسرے دلی کے آثارِ قدیمہ میں سے کہیں کی سیر۔ شیلا نے کہا: "میں اس گرمی میں سینما تو نہیں جاتی۔"

آج پھر شیلا کے ماتھے پر ٹیکے کی بہار تھی۔ رنگین بلاؤز نما قمیص کی تراش سے اُس کا سینہ ہر سانس سے متلاطم معلوم ہو رہا تھا۔ ہلکے سبز رنگ کا دوپٹہ ایک ہار کی طرح کاندھوں پر پڑا تھا اور اُس کی رنگت پر بہت کھِل رہا تھا۔ شلوار اور قمیص میں وہ فراک کے

مقابل کس قدر خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔

"پُرانے قلعے چلوگی؟" الف خاں نے میز کے نیچے اُس کے جُوتے کو اپنے جُوتے سے ایک ہلکی سی ٹھوکر دے کر کہا۔

"وہاں اندر جلنے کی اجازت تو نہ ہوگی؟" شیلا جواب میں مسکرائی۔

"باہر ہی سے ایک پورا چکّر لگا کے واپس آ جائیں گے۔"

شیلا آج اپنے ڈرائیور کو نہیں لائی تھی۔ الف خاں نے اُس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ وہاں کسی مزاحمانہ تلاطم کی گنجائش نہ تھی۔

اُس سڑک سے گذر کے جو جے پور ہاؤس کے سامنے سے پُرانے قلعے کو جاتی ہے قلعہ کے بیرونی دروازے کے اندر شیلا نے گاڑی پارک کی۔ اُس نے اور الف خاں نے شیشے اُوپر چڑھائے۔ شیلا نے کنجی بند کی۔ سڑک سڑک دو تین منٹ چلنے کے بعد الف خاں نے ایک پگڈنڈی کی طرف اشارہ کیا۔

"دیکھو ڈارلنگ کسی معصوم لڑکی کو اغوا کرنا قانونی اور اخلاقی جرم ہے۔" شیلا نے ہنس کر کہا۔

پگڈنڈی گنجان اور خاردار جھاڑیوں سے ہو کر گذرتی ہے۔ یہ دراصل قلعے کے ایک پچھلے دروازے کی طرف جاتی ہے۔ مگر وہ دروازہ اب بند ہے۔ راستے میں بیسیوں بار کانٹوں سے دامن اُلجھتے ہیں اور خصوصیّت سے اگر کوئی لڑکی شلوار اور دوپٹہ پہنے ہو تو بار بار اُس کا راستہ روک کے کانٹے یہ کہتے ہیں کہ واپس جاؤ یا اپنے عاشق سے اور قریب ہو جاؤ۔

چنانچہ ان کانٹوں میں، منظرِ عام سے ذرا الگ ہو گئے، الف خاں نے شیلا کو لپٹا کے پیار کیا۔

"تم نے کاش کسی اور FLIRTATION کا انتخاب کیا ہوتا۔" شیلا نے کہا۔

"دیکھو ان کانٹوں سے میرے بازو لہو لہان ہو رہے ہیں۔"

الف خاں نے کہا: "یہ تو اور بھی زیادہ رومانٹک ہے۔" پھر اُس نے ایک اور بوسہ لے کر کہا: "کبھی تمھیں اس مقام کے قُرب وجوار میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔ جن گیدڑوں

کی صدائیں رات رات بھر دُور دُور تک آتی ہیں۔ وہ یہیں کے رہنے والے ہیں۔ سُنا گیا ہے کہ لکڑ بھگّے وغیرہ قسم کے جانور بھی کبھی کبھی نظر آ جاتے ہیں۔ مگر وہ تمھاری آنکھوں کے بان پڑتے ہی وہیں ڈھیر ہو جائیں گے۔"

اب پگڈنڈی اس خارزار سے الگ ہو کے فصیل کے نیچے کھلی ہوئی جگہ سے گذر رہی تھی۔ آفتاب کی آخری کرنیں فصیل کے بالائی حصّے پر پڑ رہی تھیں اور اُن کا سونا مدھم پڑتا جا رہا تھا۔ ریل کی ایک پٹڑی آئی۔ وہ بلند دروازہ آیا جو اب بند تھا۔ قلعے کا چکر لگا کے دونوں پھر کھلی ہوئی جگہ میں آ گئے۔ جہاں پٹڑیوں پر کچھ مال کے ڈبّے تھے۔ اب آدم زاد زیادہ نظر آنے لگے۔ اس لیے ایک جگہ چھُپ کے جہاں ایک درخت اور ایک ریل کے ڈبّے کی آڑ تھی۔ الف خاں نے ایک اور طویل بوسہ لیا اور اُس نے محسوس کیا کہ شیلا کا تنفّس اُس کے لبوں کی حرارت میں پگھل رہا ہے۔

اُس نے موٹر کی طرف جاتے ہوئے شیلا سے پوچھا: "کھانے سے پہلے کاک ٹیل ہو گی؟"

"کہاں؟" اُس نے آہستہ سے پوچھا۔ اب بھی اُس کا جسم متاثر اور بے چین معلوم ہوتا تھا۔ وہ سنبھلنے نہ پائی تھی۔

"کشمیری گیٹ میں میرے ہوٹل میں۔"

اعصابی ہیجان میں شیلا کی شوخی غالب آ گئی۔ "نوجوان آدمی کیا اس کا مطلب وہی ہے جسے قانونی زبان میں بدکاری کی دعوت کہتے ہیں؟"

الف خاں نے ذرا سٹپٹا کر کہا۔ "نہیں، نہیں میں تو صرف ـــــ اگر تمھیں مجھ پر اعتبار نہیں تو کناٹ سرکس کے قریب ہی کہیں چلو۔"

"نہیں، مجھے تم پر اعتماد ہے۔" شیلا نے موٹر اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا: "جتنا کسی کو اپنے جلاّد پر ہوتا ہے۔ یو روگ۔" اور وہ شرارت سے الف خاں کی طرف دیکھنے لگی۔

سکریٹریٹ کے سامنے سے پارلیمنٹ اسٹریٹ سے ہوتی ہوئی وہ کناٹ پلیس پہنچی۔ اور برابر الف خاں کی کھسیانی ہنسی کا لطف لیتی رہی، ایک سیکنڈ کے لیے نرولا کا رُخ کیا۔ پھر گاڑی

کو پکاڈلی کے سامنے روکا۔ لیکن قبل اس کے کہ الف خاں اُترنے کے لیے دروازہ کھولے پھر ایکسلریٹر دبا کے آگے بڑھی۔ بالآخر امپیریل ہوٹل کے پھاٹک میں داخل ہوئی اور الف خاں کے دل میں ساری اُمیدیں بیٹھ گئیں۔ اتفاق سے شوفر باہر ہی تھا۔ اُس نے پپا اور ممّا کو پوچھا اور کہا "واپسی کے بعد کہہ دینا کہ میں مسٹر خان کے ساتھ شام کے کھانے پر مدعو ہوں۔" یہ کہہ کے اُس نے موٹر پھر اسٹارٹ کی۔ الف خاں کی جان میں جان آئی۔ لیکن ظالم نے پھر کناٹ پلیس کا رُخ کیا اور الف خاں نے کہا۔ یہ کمبخت آج کی شام تو ہاتھ آنے سے رہی۔

لیکن پھر جب کناٹ پلیس کا چکّر کاٹ کے اُس کی گاڑی باہر نکلی تو سامنے جامع مسجد دوُر پر نظر آرہی تھی۔ پھر دلی دروازے سے ہوتی ہوئی جب گاڑی کشمیری گیٹ کی طرف چلی تو الف خاں اطمینان سے مُسکرایا۔

اپنے کمرے میں اُس نے خود کاک ٹیل بنایا۔ آنکھوں کے نشے کے ساتھ شراب کا نشہ آہستہ آہستہ چڑھتا گیا۔ لبوں، ہاتھوں اور جسموں کو آزادی ملی۔ اپنے نشہ سپردگی میں بھی شیلا نے احتیاطی تدابیر کی طرف سے اطمینان کر لیا۔ جب دونوں کھانے کے لیے باہر اُترے تو شراب اور جسم دونوں کے نشے کا سرور باقی تھا۔ بے خاں سے جلدی سے چھٹکارا حاصل کر کے اور کھانا ختم کر کے دونوں پھر اوُپر الف خاں کے کمرے میں آئے۔

رات کے ساڑھے گیارہ بجے پسینے سے ماتھے کی بِندی بہہ چکی تھی۔ برقی روشنی میں دونوں ایک دوسرے کے عُریاں جسم کی دمک سے تھک چکے تھے۔ شیلا نے کہا "ڈارلنگ اب میرا جانا ضروری ہے۔ اگر مجھے اور زیادہ دیر ہوئی تو پپا ناراض ہوں گے۔"

اسٹیرنگ وہیل پر شیلا کا ہاتھ اس مضبوطی سے جما ہوا تھا کہ اس دسویں بارہویں نمبر کے عاشق کا نام، جو اَب باقاعدہ عاشقوں کی فہرست میں آگیا تھا۔ اب زیادہ دلچسپی کا باعث نہ رہا تھا۔ کل کے تجربے نئے اور انوکھے ہوں گے اور یہ واقعہ محض ایک سلسلہ بن جائے گا۔ موٹر کی رفتار دھیمی کر کے اُس نے بائیں ہاتھ سے ہینڈ بیگ کھول کے سونے کا سگریٹ کیس نکالا۔ ان میں سے ایک چھوٹا سا معطّر "مائی ڈارلنگ" لائٹر سے سلگایا۔ لائٹر اور کیس دونوں کو پھر بند کر کے ایک زور کا کش لیا۔ سر کے بال، ایک جنبش سے لہرا کے پیچھے پھینکے۔ اسٹیرنگ

وہیل پر پھر بایاں ہاتھ بھی رکھا اور اکسلریٹر دبا کے رفتار تیز کی اور سوچنے لگی "لیکن کم از کم الف خاں میں اتنی شرافت تو ہے کہ اُس نے میری طرف براہِ راست توجہ کی۔ ورنہ سدیشور اور جان کرمپ نے تو خمتا سے ابتدا کی تھی۔۔۔۔"

۱۰

۱۷ اپریل

رات کے آٹھ بجے جب بے خاں اپنے ہوٹل کو واپس جا رہا تھا تو پریس روڈ سے ذرا آگے ہی اُس نے محسوس کیا کہ اُس کے تانگے اور ایک مقابل تانگے میں مقابلہ ہو رہا ہے۔ روشنی میں اُس نے دیکھا کہ اگلے تانگے میں ایک نوجوان عورت سیاہ برقعہ پہنے بیٹھی ہے۔ اُس کا تانگہ اس دوڑ میں آگے بڑھ گیا۔ پھر اُس عورت کے تانگے والے نے اپنے تانگے کو بڑھانے کی کوشش کی۔ جس میں وہ کامیاب ہوا۔ اور جب وہ تانگہ آگے نکلا تو اُس نے دیکھا کہ نوجوان عورت نقاب اُلٹے ہے۔ اُس کا سُرخ و سفید نوجوان چہرہ سڑک کی مدھم روشنی میں بھی جگمگا اُٹھا اور کامیابی کی شریر مُسکراہٹ اُس کے چہرے پر نظر آئی۔ بے خاں نے اپنے تانگے والے سے کہا: "تم ہارنا نہیں۔" اُس نے جو چابک لگایا تو گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ بے خاں کا تانگہ آگے نکل گیا۔ سڑک پر اب ذرا سا اندھیرا تھا۔ اس لیے بے خاں نے ہاتھ ہلا کے اپنی فتح کا اعلان کیا۔ دوسرے تانگے نے بھی آخری زوردار کوشش کی۔ دلّی دروازے کے قریب وہ آگے نکل گیا اور برابر سے نکلتے وقت برقعہ پوش نے ٹھینگا دکھایا، اور اُس کی ہنسی سی آواز ہوا کے جھونکوں کے ساتھ آہستہ سے پہنچی۔ دریا گنج کی چہل پہل اور روشنی میں دو تین منٹ اپنے حُسن کی بہار بے خاں کو دکھا کے اور خود اُس کی صورت اچھی طرح دیکھ کے برقعہ پوش نے اپنے چہرے پر نقاب ڈال لی۔ بے خاں نے اپنے تانگے والے سے اس تانگے کا تعاقب کرنے کو کہا۔ ایک بڑی سی ڈیوڑھی میں، کچھ ہی دُور آگے، وہ تانگہ رُکا۔ باہر بہت سے نوکر چاکر تھے۔ یہ سب بے خاں نے سڑک پر سے گذرتے ہوئے دیکھا۔ اور کوئی آدھا فرلانگ آگے بڑھ کے اپنا تانگہ روکا۔ اتنے میں وہ دوسرا تانگہ والا سواری

کو اُتار کے آہی گیا اور یہ معلوم کرکے بے خاں کو تعجب اور خوشی ہوئی کہ بیگم صاحبہ اپنے تانگے والے سے پوچھ چکی تھیں کہ اس دوسرے تانگے میں جو صاحب ہیں تم انھیں جانتے ہو؟ جب اُس نے کہا۔ نہیں۔ تو بیگم صاحبہ خاموش ہوگئیں۔ یہ معلوم کرکے بے خاں کو حیرت اور عبرت ہوئی کہ یہ ڈیوڑھی بیگم صاحبہ کے خُسر کی ہے جو پُرانی دلّی کے بڑے عمائدین میں شمار ہوتے ہیں اور خود اُن کے میاں صاحب جائداد نواب زادے ہیں۔ دوسرے تانگے والے نے کہا بھی۔ "بابوجی اپنا نام اور پتہ تو بتلاتے جایئے۔ شاید ہم آپ کی خدمت کرسکیں۔" اگر الف خاں ہوتے تو اس زرّین موقعہ سے ضرور فائدہ اُٹھاتے۔ لیکن بے خاں نے اُسے ڈانٹا۔" اگر تُو نے آئندہ سے ایسی بدمعاشی کی تو تجھے پولیس میں پکڑوا دوں گا۔" اور ایک گمنام خط اِن بیگم صاحبہ کے میاں کو لکھ دیا۔ جس پر الف خاں نے اُسے مُسلسل کئی دن تک ملامت کی۔

۱۱

۱۸ر اپریل

الف خاں، شیلا کو اُس کے ہوٹل پہنچا کے واپس لوٹا تو نزولا کے قریب اُس نے تین نوجوانوں کو جو پتلون اور قمیص پہنے تھے۔ ایک دروازے میں جھانکتے دیکھا۔ وہ ٹھہر کر دیکھنے لگا کہ یہ کیا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان میں سے ایک نے بلیٹ کے اسے مخاطب کیا۔ "آپ کچھ ڈھونڈھ رہے ہیں؟"

الف خاں نے جواب دیا۔" نہیں۔ اور آپ؟"

" جی ہاں۔ ہم تو لڑکیاں ڈھونڈھ رہے ہیں۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

اُس کے بعد تعارف ہوا۔ اسی نوجوان نے کہا:" میرا نام ویاس ہے۔ مَیں فوج میں لفٹنٹ تھا۔ حال ہی میں مَیں نے نوکری چھوڑی ہے۔ فی الحال بیکار ہوں۔ یہ میرے دوست حسینی ہیں۔ اُن کی ایک بڑی دوکان کناٹ پلیس میں ہے جو آپ نے دیکھی ہوگی اور یہ تیسرا میرا دوست کھڑک سِنگھ ہے۔ کچھ کام نہ ہو تو ہمارے ساتھ چلیے۔ اور آپ کون ہیں؟"

ذرا سوچ کے الف خاں نے جواب دیا۔" بی۔ این۔ رستم جی۔"

" آپ پارسی ہیں ؟ بمبئی سے آئے ہیں ؟" حسینی نے پوچھا۔

" وہاں کیا کرتے ہیں ؟" ویاس نے سوال کیا۔

" آپ اپنی حد تک رکھیے گا۔" الف خاں نے رازداری کے لہجے میں جواب دیا۔

" مَیں آئی۔ سی۔ ایس ہوں اور بمبئی میں چونگی کا ناظم ہوں۔"

اس کا کناٹ پلیس کے ان تینوں پیشہ ور آوارہ گردوں پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس کے بعد الف خاں نے اُنھیں کافی ہاؤس میں کافی پلائی۔ کافی ہاؤس کا منیجر الف خاں کو علیحدہ لے گیا اور اُس سے کہا کہ حسینہ کے والد کی شکایت کی بنا پر موٹے ویٹر کو ملازمت سے الگ کر دیا گیا۔ جس نے الف خاں کا کارڈ حسینہ کو دیا تھا۔ اور منیجر نے الف خاں سے درخواست کی کہ" آپ آئندہ کافی ہاؤس میں کوئی ایسی حرکت نہ کیجیے گا۔ ورنہ ہم مجبوراً آپ کو نہ آنے دیں گے۔" لیکن جب واپس آنے پر ویاس نے الف خاں کو مسٹر رستم جی۔ آئی۔ سی۔ ایس کہہ کر مخاطب کیا تو بچارا منیجر بھی جِہ گُنم کے عالم میں اُس کی صورت تکنے لگا۔

۱۲

۱۹ر اپریل

الف خاں نے دوپہر کا کھانا شیلا اور دیو خاندان کے ساتھ امپیریل ہوٹل میں کھایا۔ چار بجے وہ کناٹ پلیس آیا۔ حسینی کی دوکان کے قریب ویاس کھڑا تھا۔ ویاس نے فرضی مسٹر رستم جی آئی۔ سی ایس یعنی الف خاں کو اپنا دُکھڑا سُنایا۔ لیڈی .... کالج کی دو لڑکیاں حسینی کی دوکان کے پیچھے کے راستے سے غائب ہوگئی تھیں۔ ایک گھنٹہ گذر چکا تھا۔ اور وہ باہر نہیں نکلی تھیں۔ الف خاں فوراً حسینی کی دوکان کے اندر پہنچا۔ ایک چاندی کا سگریٹ کیس خریدا اور حسینی کے دفتر کا خس کا پردہ اُٹھا کر اطمینان کر لیا تھا کہ نہ حسینی کا پتہ تھا نہ دونوں لڑکیوں کا۔ ویاس نے حسینی کو ماں کی گالی دے کر کہا:" حرام زادے نے وعدہ کیا تھا۔ دونوں میں سے ایک سے مجھے ملائے گا۔ جب سے میری فوج کی نوکری چھوٹی۔ سالے نے طوطے کی

طرح آنکھیں بدل دی ہیں ... ... وہ دیکھو وہ کیا جا رہا ہے"۔

اور واقعی، اس دھوپ میں، سامنے کے سبزہ زار پر، دو بڑی ہی حسین اور نازک لڑکیوں کے ساتھ جن میں سے ایک فراک پہنے تھی، دوسری شلوار، حسینی صاحب تشریف لیے جا رہے تھے۔

الف خاں نے دیاس کو تو وہیں چھوڑا اور خود حسینی اور ان دو لڑکیوں کا تعاقب شروع کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پوسٹ آفس کے قریب حسینی اور ایک لڑکی تو چلے گئے۔ اور دوسری لڑکی پوسٹ آفس کے اندر گئی۔ الف خاں بھی اُس کے پیچھے پیچھے اندر پہنچا۔ یہ لڑکی ذرا گندمی رنگ اینگلو انڈین تھی اور رنگ بھی اپنی ساتھی سے ذرا دبتا تھا۔ مگر خد و خال دلکش تھے۔ الف خاں نے بات شروع کرنے کے لیے کہا "کتنی گرمی ہے"۔ تو اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اتفاق سے، لفافے خریدتے جب اس لڑکی نے دس روپیہ کا نوٹ بابو کو دیا تو بابو نے ایک روپیہ کم واپس کیا۔ الف خاں نے فوراً بابو کو ڈانٹا اور بابو نے گھبرا کے معافی مانگتے ہوئے ایک روپیہ مس صاحبہ کے حوالے کیا۔ لڑکی نے ایک ڈاکیے سے پوچھا "یہاں کہیں قلم ہے"۔ اور ڈاکیے نے ایک میلے سے میز کی طرف اشارہ کیا۔ الف خاں نے جلدی سے اپنا فونٹین پن دیا۔ جس سے لکھے ہوئے افتتاحیوں سے ہندوستان کے سیاسی لیڈر تھراتے تھے۔ اس طرح بات چیت شروع ہوئی۔ لڑکی نے اپنا نام بتایا "پامیلا" اُس کی سہیلی پنجاب کی تھی اور اُس کا نام دِل آرا تھا۔

اس نام پر چونک کے الف خاں نے پوچھا "آپ کی سہیلی دل آرا، مسٹر میمندی کی صاحبزادی تو نہیں؟"

"ہاں"۔

"آپ کو معلوم ہے۔ وہ کہاں گئی ہیں"۔

"نے دی کو یا کہیں اور چائے پینے گئے ہوں گے۔ وہ کہہ تو یہی رہے تھے"۔

جلدی سے اُس نے پامیلا کا دیاس سے تعارف کرایا، جو اَب پوسٹ آفس کے

دروازے پر کھڑا تھا اور قبل اس کے کہ ویاس پامیلا سے بات بھی کر سکے۔ وہ دونوں کو حیران چھوڑ کے چلتا ہوا۔

اُس نے نے دی کو کو چھان مارا۔ کہیں حسینی اور اُس کی دوست کا پتہ نہ تھا۔ واپس ہو کے وہ بادل ناخواستہ پھر کناٹ پلیس کی طرف لوٹا۔ دل ہی دل میں جھنجھلاتا ہوا کہ دل آرا کے چکر میں وہ پامیلا کو بھی کھو بیٹھا تھا۔ لیکن اتنے میں کچھ ہی آگے اُس نے حسینی اور دِل آرا کو ایک دوکان سے نکلتے دیکھا اور اُن کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

یوُں بھی وہ اُن سے مِل ہی لیتا۔ لیکن اس وقت قدرت نے پھر ذرا سی مدد کی دل آرا کے بالوں کا ہاتھی دانت کا کِلپ گر گیا۔ الف خاں نے وہ کلپ اٹھایا۔ جس پر نہایت نفیس کام بنا ہوا تھا۔ اس لڑکی کی خوبصورتی کی طرح اُس کی نفاست پسندی، اور ذوق میں بھی کوئی کلام نہ تھا۔ پھر وہ ایسے بد معاش کے ساتھ کیوں پھر رہی تھی ؟ یہ تو ظاہر ہے کہ حسینی، ویاس اور اس کے سارے گروہ کی زندگی کا مقصد بجز کناٹ پلیس کے چکر کاٹنے، اور لڑکیوں کو آوارہ بنانے، خود آوارہ گردی کرنے کے اور کچھ نہ تھا۔ ہر بڑے شہر میں اس قسم کے حشرات الارض ہوتے ہیں۔ اُن کے لیے زندگی کی اور کوئی قدر نہیں۔

اتنے میں وہ دونوں ایک کیمسٹ کی دوکان میں پہنچے۔ اُن کے پیچھے پیچھے الف خاں بھی اندر گیا۔ حسینی نے پہلے تو اُسے نہ پہچاننا مناسب سمجھا۔ لیکن اُس نے بلا اُس کی طرف توجہ کیے لڑکی کو مخاطب کیا۔ "معاف کیجیے گا مس صاحبہ۔ یہ کِلپ آپ کے بالوں سے گرا تھا۔"

"اوہ تھینک یُو۔" کہہ کے دل آرا پلٹی۔ اُس کی آنکھیں الف خاں سے چار ہوئیں اور نیچے نہیں جُھکیں۔

حسینی نے اب یہ کہنا مناسب سمجھا۔ "مجھے تعارف کی اجازت دیجیے۔ آپ مسٹر رستم جی آئی۔ سی۔ ایس، بمبئی کے ناظم جنگی ہیں اور آپ . . .!"

"آپ کے دوست کو کچھ غلط فہمی ہو رہی ہے۔" الف خاں نے ہنس کر کہا۔ "آپ کے والد نے آپ سے شاید میرا ذکر کیا ہوگا۔ میرا نام الف خاں ہے۔ میں ٹائمز آف مدراس کا اڈیٹر ہوں۔ مس دِل آرا آج صبح ہی آپ کے والد کا خط ملا۔"

یہ کہہ کے اُس نے کیمسٹ کے چوبی کاؤنٹر پر دِل آرا کے سامنے وہ خط رکھ دیا۔ شادی کے اشتہار کا اُس نے جواب دیا تھا۔ یہ اُس جواب کا اشتہار دینے والے صاحب مسٹر میمندی جو گورنمنٹ آف انڈیا میں محکمہ ـــــــ میں جائنٹ سیکریٹری ہیں، کی جانب سے جواب تھا۔

غالباً حسینی کے ساتھ اس طرح پائے جانے کی وجہ سے دل آرا کے چہرے کا رنگ ذرا سفید ہو گیا۔

"یہاں سے چلو" حسینی نے دل آرا کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"نہیں" یہ کہہ کے دل آرا نے حسینی کا ہاتھ جھٹک دیا۔ پھر وہ ذرا بدحواسی کے عالم میں الف خاں سے مخاطب ہوئی "مجھے آپ سے مِل کے بہت خوشی ہوئی"

"اگر آپ نے اب تک چائے نہ پی ہو تو میرے ساتھ نے وی کو میں چائے پیجیے گا"

حسینی نے جلدی سے کہا "شکریہ ہم لوگ چائے پی چکے ہیں"

الف خاں نے کہا "دوبارہ سہی"

دِل آرا جو اَب اپنے حواس کو پوری طرح مجتمع کر چکی تھی۔ کہنے لگی "میں تو ضرور پیونگی۔ مجھے پیاس بھی بہت معلوم ہو رہی ہے"

حسینی نے الف خاں کی طرف ذرا خشمناک نظروں سے دیکھ کے کہا "مجھے دوکان واپس جانا ہے۔ خدا حافظ مسٹر رستم جی آئی۔ سی۔ ایس۔ ..."

"آپ کو ذرا غلط فہمی ہوئی ہے میرا نام الف خاں ..." ...

"خیر خدا حافظ۔"

چائے کی بجائے ملک شیک پیتے ہوئے دل آرا نے پوچھا "تو پھر کل آپ پپا سے ملنے آئیں گے؟"

"مَیں تو آپ سے ملنے آؤں گا" الف خاں نے کہا "لیکن آپ حسینی کو کیسے جانتی ہیں؟"

"کیوں کیا آپ انھیں اچھا آدمی نہیں سمجھتے؟" ... ... اور ایک ایسی تیز چالاک سی روشنی دِل آرا کی نظر میں پیدا ہوئی کہ الف خاں نے اُس سے یا اُس کے والد سے ملنے کا ارادہ

بالکل ترک کر دیا ـــــ اس لڑکی سے اور شادی!

"نہیں، مَیں اتنا بے وقوف بھی نہیں۔" الف خاں نے اپنے آپ سے کہا۔

الف خاں، بے خاں سے دل آرا کا ذکر کر رہا تھا۔ "اُسی شام کو۔ سُرخی مائل بیضوی چہرہ، لمبی ٹیڑھی نشیلی آنکھیں، پتلے پتلے سُرخ ہونٹ، کوئی سترہ سال کی عمر ہوگی ... اور اس قدر ہوس۔ کپڑے بڑی نفاست اور حُسنِ مذاق سے پہنے ہوئے تھی۔ ایک ہاتھ میں ایک سونے کی چوڑی۔ گول گول گدرائی ہوئی کلائی۔ جب میں حسینی کا ذکر کر کے اُس کی آنکھوں کو ٹٹولنا چاہتا۔ پہلے تو وہ مجھ سے شطرنج کھیلنے کی کوشش کرتیں۔ اور آخر اقبالِ جُرم سے سہم کر جھک جاتیں۔"

"تو پھر تم میمنڈی صاحب سے ملنے نہ جاؤ گے۔"

"تم ہی بتاؤ بے خاں میں جا کے کیا کروں۔ یہ لڑکی شادی کے قابل نہیں۔ ۲۲ کو یہاں سے روانگی ہے۔ اس لیے معاشقے کا وقت نہیں اور یوں بھی شیلا ہی کو سنبھالنا مشکل ہے سارا وقت اسی خرافات میں گذرا، اور ان دو ہفتوں میں مَیں کچھ کام نہ کر سکا۔"

"پھر؟" بے خاں نے پوچھا۔

"پھر کیا! مَیں میمنڈی صاحب کو ٹیلیفون کیے دیتا ہوں کہ مَیں تو بر دکھائی کے لیے کل حاضر نہیں ہو سکتا۔ ہاں میرے ایک دوست ہیں بے خاں صاحب ..."۔

الف خاں اُوپر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ بے خاں لاؤنج ہی میں ایک آرام کرسی پر بیٹھے بیٹھے سوچنے لگا۔ وقت اور روشنی کی سرحدیں پیچھے رہ گئیں اور تخیّل نے حقیقت کی جگہ لے لی اور اگر الف خاں کی جگہ مَیں ہوتا اور آج شام کو دل آرا کو اپنے ساتھ قطب صاحب لے جاتا۔

اور تخیّل کے سیلاب میں بے خاں کے تانگے نے قطب مینار کا رُخ کیا۔ دل آرا کا جسم گرمی اور دھوپ کی وجہ سے پسینے کے دھارے بہا رہا تھا۔ راستے بھر وہ اِدھر اُدھر کی باتیں

کرتا رہا۔ قطب صاحب کی سیڑھیوں کے اُوپر اس گرمی میں اُس نے دِل آرا کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھاما۔ اُس کا چہرہ گرمی سے تمتما رہا تھا۔ اُس نے دل آرا کے شانوں پر ہاتھ رکھ کے پھر اُس کے چہرے کو دیکھا۔ غور سے دیکھا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ اس ظاہرا معصومیت اس مریم نُما، عصمت مآب چہرے کے پیچھے کسی طرح کی جبلّی ہَوس پرستی ہوگی۔ اس نے اسی طرح دل آرا کے شانے پکڑ کر اُس کی معصوم پیشانی کو چومنا چاہا۔ لیکن توازن بگڑ گیا۔ دِل آرا کے چہرے اور اُس کے اپنے چہرے کے مکانی توازن اور تناسب کو کسی لاشعوری کشش نے بگاڑ دیا اور اُس نے اپنے لبوں کے مقابل دل آرا کے لب محسوس کیے اور ساتھ ہی اس عالمِ تخیّل میں اُس کے دل کو ایسا سخت صدمہ ہوا۔ حسینی اور دل آرا کی دوستی کا خیال کر کے ایسا دھچکا لگا کہ اُس کے لب دل آرا کے پسینے سے بھیگے ہوئے لبوں سے علیحدہ ہوگئے۔ اُس کے دل میں بے ربط طور پر یہ خیال پیدا ہوا کہ قطب صاحب کی لاٹ بھی مینارِ بابل کی طرح ایک مینار ہے اور توریت میں مینارِ بابل کو معشوقہ کی ناک سے تشبیہہ دی گئی ہے اور لال بجھکڑ کا یہ خیال ہے کہ کنواں اُلٹ کے مینار ہو جاتا ہے اور بابل کے کنوئیں میں ہاروت اور ماروت قید ہیں اور ان دونوں فرشتوں کو زُہرہ نے گمراہ کیا تھا جو آج بھی آسمان پر اتنا خوبصورت ستارہ بن کے چمک رہی ہے اور اگر آج میں یعنی بے خاں الف خاں، الف خاں مثبت بے خاں یعنی الف بے خاں نہ دیکھ لیتا کہ یہ خوبصورت ستارہ دِل آرا حسینی کے ساتھ ہے تو کیا عجب ہے کل اُس کا حُسن دیکھ کے میں اُس سے شادی کرنے کو تیار ہو جاتا۔ ایک لمحے کے اندر ایک طوفان سا اُس کے اعصاب کے توازن کو بہالے گیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اُس کا ہاتھ اُٹھا۔ ایک بھرپور تھپڑ اُس نے دل آرا کے گال پر لگایا۔ جب اُس کا ہاتھ ہٹا تو اُس نے پانچ اُنگلیوں کے گہرے سُرخ نشان وہاں دیکھے۔

دل آرا اس قدر سہم گئی ہوگی کہ اُس کی دہشت دیکھ کے اُس کا دل پسیجنے لگا۔ دل آرا نے ایسے انسانوں کے قصّے سُنے ہوں گے۔ جنھیں عورتوں کو قتل کرنے، اُن کے جسم میں چھُریاں بھونکنے، اُن کی بوٹی بوٹی الگ الگ کرنے میں مزا آتا ہے۔ کہیں یہ بھی تو اُسی قسم کا شیطان نہیں تھا۔ کہیں وہ اُسے قطب مینار کی بلندی سے نیچے پھینک نہ دے۔ وہ

اپنے آپ کو رحم کے لیے اُس کے قدموں پر ڈالنے ہی والی ہوگی کہ اُس نے اُس کے چہرے پر مہربانی اور محبت کے آثار دیکھے اور بجائے کچھ کہنے کے چھوٹے بچّوں کی طرح پھُوٹ کر رونے لگے گی۔ عورت کی اندرونی سمجھ نے اُسے سب کچھ سمجھا دیا ہوگا۔ "میں آپ سے خدا کی قسم کھا کے کہتی ہوں۔ مَیں نے حسینی کے ساتھ کچھ نہیں کیا۔ اُس نے دو چار مرتبہ مجھے پیار ضرور کیا۔ میں قسم کھا کے کہتی ہوں۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔"

دل آرا کی پیٹھ تھپک کے وہ اُسے دلاسا دینا شروع کرے گا۔ دل آرا کی ہچکیاں سسکیوں میں بدلنے لگیں گی۔ "زندگی کے اس راستے میں کوئی حقیقی راحت نہیں۔" اس نے اپنے آپ کو کہتے سُنا۔ اپنے آپ کو کہتے سُنے گا۔ "جب سچّی محبت ہو تو دوسری بات ہے ورنہ دوسری جنس کی ہوس میں ٹھوکریں کھانا عورت کے لیے بہت مُہلک ہے۔ بیماریاں، حمل، بدنامی، موت، جو انجام نہ ہو تھوڑا ہے اور جب سچّی محبت ہو تو یہ بھی سوچ لینا چاہیے کہ مرد اس قابل بھی ہے یا نہیں اور اگر وہ اس قابل نہیں تو پھر اور ہر چیز کی طرح محبّت کا بھی مقابلہ کرنا چاہیے۔ محبت کو بھی شکست دینا چاہیے۔ اس میں فرد کی فتح اور اجتماع کی بھلائی ہے ...... دیکھو دل آرا، سامنے التمش کا مقبرہ، یہ رضیہ کا باپ تھا۔ رضیہ اور ہر چیز کو تسخیر کر سکی۔ محبت کو شکست نہ دے سکی۔ اُس کی قدریں چاند بی بی اور اہلیہ بائی کے مقابلے میں گھٹیا تھیں اور وہ زندگی کا کھیل ہار گئی۔ کیوں دل آرا ...... ؟"

اب دل آرا نے پہلی مرتبہ ایک جارحانہ حملہ کیا۔ "یہ آپ مردوں کو کیوں نہیں سمجھاتے؟"

تخیّل کی چوڑی سڑک، اب ایک تنگ بند گلی بن گئی۔ جس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا بے خاں نے جمائی لی۔ سامنے لاونج اور کھانے کے کمرے کے درمیانی دروازے کے اوپر گھڑی میں ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ وہ اُٹھا اور اپنے کمرے کو جانے کے ارادے سے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ دل آرا پیچھے۔ لاونج کی روشنی میں، گزرے ہوئے لمحوں میں گم ہو چکی تھی۔

۱۳

۲۰ اپریل

اُن میں سے ایک یقیناً بنگالن تھی۔ لیکن دوسری جو شلوار پہنے تھی یا تو دہلی کی تھی یا

شاید یو۔ پی کی۔ کیوں کہ اُس کا ہندی لہجہ بڑا پیارا تھا۔ تیسری بھی ہندی خوب بولتی تھی بنگالن البتہ ہندی سمجھتی تھی مگر انگریزی ہی میں جواب دیتی تھی۔

تینوں آرمی اینڈ نیوی کے زینے پر باتیں کر رہی تھیں۔ تینوں بہت خوش حال معلوم ہوتی تھیں۔ غالباً گورنمنٹ آف انڈیا میں اعلیٰ افسروں کی بیویاں تھیں۔ بنگالن بڑی خوبصورت تھی اور جالی کی ساڑی پہنے نازک سا سگریٹ پی رہی تھی۔

قریب سے گذرتے ہوئے بے خاں نے شلوار پوش کو یہ کہتے سُنا: "مَیں نے مسرا صاحب سے کہا: ہندوستانی عورتوں کو سفید مردوں کے ساتھ پھرتے دیکھ کے تو آپ اعتراض کر رہے ہیں۔ مگر آپ نے اس پر بھی کبھی غور کیا ہے کہ ہندوستانی مردوں کو سفید میموں کے ساتھ پھرتے دیکھ کے شاید ہمیں بھی بُرا معلوم ہوتا ہو۔۔"...

۱۴

۲۱۔ اپریل

ناشتے پر صبح کے اسٹیٹسمین کی یہ خبر بے خاں نے الف خاں کو سُنائی:

"سوشل اور پرسنل کے کالم میں یہ خبر تم نے دیکھی:۔" مس دِل آرا میمندی، جو مسٹر کے۔ اس۔ ان میمندی جائنٹ سکریٹری محکمہ ——— گورنمنٹ آف انڈیا اور مس شہناز میمندی کی اکلوتی صاحبزادی ہیں، اور مسٹر کے۔ اچ۔ جینی جو دہلی کے مشہور تاجر اور الیسٹ سَن اور کرکس کمپنی کے ڈائریکٹر ہیں، کی نسبت کا اعلان کیا گیا ہے۔"

۱۵

۲۲۔ اپریل

الف خاں شیلا کا یہ خط پڑھ کے مُسکرانے لگا:

"ڈارلنگ! تو آج تم سچ مچ جا رہے ہو؟ گیارہ بجے یہاں آؤ۔ ہم دونوں لنچ ساتھ کھائیں۔ سہ پہر کو احتیاط سے ممی کی طرح حنوط کر کے میں تمھیں گرینڈ ٹرنک ایکسپریس

کے ڈبے میں رکھوادوں گی۔ چوتھے دن مدراس پہنچ کے تم پھر سے بدمعاشیاں شروع کردوگے۔ بہت پیار۔

تمھاری شیلا

۱۶

"انتظار خانہ۔ دہلی اسٹیشن۔

ہم مکرّر اس کا اعادہ کرتے ہیں کہ مذکورہ بالا بیانات اور واقعات سچ ہیں۔ اور ان میں کسی قِسم کا مبالغہ یا تحریف نہیں۔

الف خاں

بے خاں"

○○

میرا دشمن میرا بھائی

اِتنے میں شہرزاد کو شام ہوتی ہوئی دکھائی دی اور وہ خاموش ہوگئی۔ پھر جب اُنیس سو چھیالیسویں سال کی ایک تاریک رات آئی اور درباری اپنی اپنی مسندوں پر بیٹھ گئے اور ایک سناٹا سا چھا گیا تو اس نے کہا اے بادشاہ یہ سندباد جہازی کے دوسرے نئے سفر کی کہانی ہے۔ یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب ہارون الرشید حاتی بغاوت کے بعد کسی دُور دراز ملک میں رُوپوش تھا۔ زمین سے شہد کی نہروں کے بجائے تیل کے چشمے اُبل رہے تھے، جن پر سفید چیونٹیوں کے دَل کے دَل اُمنڈ رہے تھے۔ ذرّے کے مرکز کو توڑا جا چکا تھا۔ آسمان پر انسان عقاب اور رُخ کے پیٹ میں بیٹھ بیٹھ کر اُڑ رہے تھے۔ دجلے کے لبوں پر کف آنا صدیوں کے لیے غائب ہو چکا تھا اور دجلہ کی رفتار نہ مستانہ تھی اور نہ کوئی دجلہ کو دیوانہ کہہ سکتا تھا۔

شہرزاد نے کہا اے بادشاہ سندباد جہازی کے مکان پر دسترخوان بچھا تھا۔ اور وہ اس کا منتظر تھا کہ کہیں سے کوئی مہمانِ عزیز آ نِکلے، اور جب اُس نے دروازہ پر دستک کی آواز سُن کر اچانک دیکھا تو اُسے یقین نہیں آیا۔ وہی تین مہمان چہروں پر کپڑا ڈالے کھڑے تھے۔ جو صدیوں پہلے چھُپ چھُپ کر گلیوں میں گشت لگایا کرتے تھے۔ وہی جنھوں نے سوتے جاگتے کے قصّے کو ایک لطیفہ بنا دیا تھا۔ وہی جو کہتے تھے کہ راتوں کو چھُپ چھُپ کے

پھرنے سے دن داغ اور آنسو محو ہو سکتے ہیں۔ اور سند باد جہازی نے انھیں پہچان لیا۔ ان میں سے ایک جو سب سے معزز معلوم ہوتا تھا۔ ہارون الرشید (رشید حالی نہیں) تھا اور دوسرا اُس کا وزیر بزرگ مہر تھا، اور تیسرا اُس کے غلام کا غلام ایاز تھا۔

مچھلیوں کی زبانوں کا قورمہ کھلانے کے بعد سمندر پار کے اُس سالارِ بازرگاں خواجۂ تاجراں سندباد جہازی نے ہارون الرشید کی فرمائش پر اپنے اپنے سفر کی داستان یُوں شروع کی:
یا امیرالمومنین تو میری عجیب وغریب سیاحتوں کی کئی داستانیں سُن چکا ہے۔ تجھے معلوم ہے کہ کس طرح اجنبی تاجروں نے مجھے کھال میں سی دیا اور رُخ مجھے اٹھالے گیا۔ اور میں نے اپنے آپ کو اژدہوں کی وادی میں پایا۔ جہاں جواہرات ہی جواہرات تھے۔ میرا جہاز مقناطیس کے پہاڑ سے جا ٹکرایا میری گردن پیرِ تسمہ پا کے بوجھ سے اکڑ اکڑ گئی ۔ لیکن اے امیرالمومنین جس سفر کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ ایسا انوکھا اور عبرت خیز ہے کہ سُننے والے کو چاہیے اُسے سوزن کی نوک سے اپنی آنکھ کے حاشیے پر لکھے۔

اے امیرالمومنین یہ اُس ملک کے سفر کا حال ہے۔ جسے ہندوستان کہتے ہیں۔ جہاں دن رات سُورج چمکتا ہے۔ مگر دن نہیں نکلتا۔ جہاں زمین سونا اگلتی ہے۔ مگر انسان کا پیٹ نہیں بھرتی، جہاں واقعی سانپ بچھو، طرح طرح کے حشرات الارض ہوتے ہیں مگر انسان سے زیادہ زہریلا اور کوئی کیڑا نہیں ہوتا۔ جہاں سے ہزاروں طلسماتی داستانیں نکلی ہیں۔ مگر جو خود ایسا طلسم ہے۔ جو کسی داستان میں سما نہیں سکتا۔ اے امیرالمومنین اِسی ملک ہندوستان میں ایک شہر کلکتہ ہے۔

جب میں تجارت کے لیے اس شہر میں پہنچا تو مجھ سے کسی نے کہا۔ یہ شہر طلسمات میں گرفتار ہے۔ فرنگ کی ایک ساحرہ ہے جس نے اس پر جادو کر دیا ہے۔ اس کی عمارتیں چار منزل پانچ منزل تک اٹھتی جاتی ہیں اس کی سڑکیں کسی طلسمی شہر کی سڑکوں کی طرح کشادہ ہیں پھر بھی طلسمات کا یہ اثر ہے کہ ہزاروں آدمیوں کو ان چار منزل پانچ منزل کی عمارتوں میں رہنے کی جگہ نہیں ملتی۔ حالاں کہ ان میں سے اکثر عمارتوں میں ایک آدمی چار پانچ کمروں پر قابض ہے اور اکثر تو کئی کئی عمارتیں ایک ہی کی ملکیت ہیں مگر کسی کے کام نہیں آتیں۔ اور سڑکیں جو راستہ چلنے کے لیے ہیں اُن پر راتوں کو ہزارہا انسان سوتے ہیں۔ یا امیرالمومنین شاید تجھے یہ سُن کے تعجب نہ ہو

کیوں کہ تیرے زمانے میں بھی یہی ہوا کرتا تھا۔ لیکن مجھے تو حیرت معلوم ہوتی ہے۔

بادشاہ نے شہرزاد سے کہا اگر تو اسی طرح مہمل بکتی رہی تو میں اگلی شام سے پہلے تیرا سر قلم کروا دوں گا جیسے اس سے پہلے میں ہزاروں عورتوں کے سر قلم کروا چکا ہوں۔ اگر تجھے کوئی قصہ سنانا ہو تو سُنا۔

شہرزاد نے کہا "اے بادشاہ پھر سندباد جہازی نے امیرالمومنین کو اپنے سفر کا حال سُنانا شروع کیا۔

سندباد جہازی نے ہارون الرشید سے کہا: "اے امیرالمومنین جب میں تجارت کے سلسلے میں اس شہر میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ بہت سے جوان وردیاں پہنے ہیں اور بھالے لیے سڑکوں کے چوراہوں پر کھڑے ہیں، بعض جوان سڑکوں پر گشت کر رہے تھے اور راہگیروں کو شک کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ بہت سی لکڑی کے ڈبے جن میں بیٹھنے کی نشستیں بنی ہوئی تھیں اور جو سڑکوں کے درمیان لوہے کی پٹریوں پر چلا کرتے ہیں جیسے دجلہ میں کشتیاں، بیکار کھڑے تھے۔ اسی قسم کے اور کئی وضع کے ڈبے، جن کے پہیے ایک ایسی شے سے منڈھے ہوئے تھے جسے ربر کہتے ہیں، کبھی کبھی سڑکوں پر سے گذر جاتے، ان کی رفتار گھوڑوں کی رفتار سے کہیں زیادہ تیز تھی لیکن ان کی بھی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ یا امیرالمومنین یہ شہر کلکتہ شہر خموشاں معلوم ہو رہا تھا۔ چار سے زیادہ آدمی ایک ساتھ نکل نہیں سکتے تھے۔ دوکانیں اکثر و بیشتر بند تھیں۔ میں نے بہت کم لوگوں کے ہونٹوں پر ہنسی اور چہروں پر اطمینان دیکھا۔ اکثروں کے چہرے زرد تھے اور پریشان ہر شخص ایک دوسرے کو شک کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ہر شخص کسی نادیدہ اجنبی دشمن سے ہراساں معلوم ہوتا تھا۔

میں نے ان وردی پوشوں میں سے ایک سے پوچھا کہ اے جوان یہ اس شہر کا کیا حال ہے یہ کون سا طلسم ہے۔ جس کا یہ اثر ہے؛ کیا اس شہر کے رہنے والوں کے دماغ ماؤف ہیں؛ وہ کون سا دشمن ہے جس سے یہ خائف ہیں؟

وردی پوش نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھ کر کہا۔ اے اعرابی تو اس شہر میں اجنبی معلوم ہوتا ہے۔ تو کون ہے اور کہاں سے آیا ہے؟ میں نے کہا۔ میرا نام سندباد جہازی ہے میں بغداد کا تاجر اور ہارون الرشید کی رعایا ہوں۔ اس سرزمین میں تجارت و سیاحت کی غرض سے آیا ہوں۔ میں نے بڑے بڑے طلسم دیکھے ہیں لیکن آپ کے شہر کا راز میری

سمجھ میں نہیں آیا۔

وردی پوش میری طرف دیکھ کر حقارت سے مُسکرایا۔ تو اس شہر کا راز معلوم کرنا چاہتا ہے۔ تو شہر کے اندر کی طرف جا، شاہراہوں سے تنگ سڑکوں پر، تنگ سڑکوں سے گلیوں میں، گلیوں سے اندھیاری گلیوں میں اور اس شہر کا راز خود بخود تجھے معلوم ہو جائے گا۔

اِتنے میں قریب ہی سے ایک چیخ کی آواز سُنائی دی اور وردی پوش مجھے چھوڑ کر اس طرف لپکا۔ مَیں بھی اس وردی پوش کے پیچھے لپکا تو کیا دیکھتا ہوں ایک زخمی پڑا ہے اور اس کی پُشت پر دونوں شانوں کے درمیان چاقو کے ایک زخم سے خُون اُبل رہا ہے۔ جس نے چاقو کا وار کیا ہے، وہ بے تحاشا دوسری طرف بھاگ رہا ہے اور ایک وردی پوش اُس کا پیچھا کر رہا ہے۔ مگر اُسے پکڑ نہیں پاتا۔

امیرالمومنین یہ محض تیرے زمانے کا خون تھا جو میری رگوں میں منجمد نہیں ہوا۔ مَیں نے انسان کو دوسرے انسان کا خون بہاتے دیکھا ہے۔ مگر کسی ذاتی دشمنی سے۔ مَیں نے ایک فوج کو دوسری فوج سے باقاعدہ اور بڑی بہادری سے لڑتے دیکھا ہے، مَیں نے یک چشم دیو کو محض اپنا پیٹ پالنے کے لیے انسانوں کو بھُون بھُون کر کھاتے دیکھا ہے، مگر مَیں نے کبھی محض تفریح اور تماشے کے لیے، بلا کسی وجہ، بلا کسی مقصد، بلا کسی حکم کے ایک انسان کو دوسرے انسان کے پیٹ میں چھُرا بھونک کے بھاگتے نہیں دیکھا تھا۔

پھر اے امیرالمومنین مَیں آگے بڑھا۔ اور مَیں نے ایک راہگیر سے پوچھا کہ یہ اس شہر میں کیا ہو رہا ہے؟ اُس راہگیر نے سر سے پیر تک میری طرف دیکھا، اور کوئی جواب دیے بغیر آگے بڑھ گیا۔

مَیں چوڑی شاہراہوں سے تنگ سڑکوں کی طرف ہو لیا۔ مَیں نے دیکھا کہ ایک بڑی عمارت جل رہی ہے، شعلوں کی کئی گز گز لمبی زبانیں اژدہوں کی طرح نکل نکل کے ہر شے کو نگلنا چاہ رہی ہیں۔ مَیں نے سوال کیا یہ آگ کیسے لگی۔ تو میرے قریب جو شخص کھڑا تھا۔ اس نے کہا فسادیوں نے اس گودام میں آگ لگا دی ہے۔ مَیں نے سوال کیا کن فسادیوں نے، تو اس شخص نے جواب دیا۔ اے اجنبی کیا تجھے معلوم نہیں کہ اس شہر میں ہندو مسلم فساد ہو رہا ہے۔

تنگ سڑکوں اور تنگ گلیوں کے درمیان میں دیکھتا گیا ہوں کہ لوگ ایک دوسرے پر تیزاب پھینک رہے ہیں، وہ چہرے جن کو خدائے تعالیٰ نے حسین بنایا ہے، تیزاب کی آگ میں جھلس رہے ہیں۔ لوگ ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں اور کٹ کٹ کر گر رہے ہیں۔

مَیں تنگ گلیوں میں پہنچا۔ وہاں ایک عورت کی دِل دوز چیخ سُنائی دی۔ کھڑکی میں روشنی تھی، اور مَیں نے دیکھا کہ دو ہٹے کٹے مرد جن کی آنکھوں میں وحشیوں کی سی سفاک چمک تھی۔ اُس عورت کی زبردستی عصمت دری کر رہے ہیں۔ خیر مَیں نے ان میں سے ایک کو جو شہر کے کسی بڑے مدرسے کا طالبِ علم تھا، اس عورت کے چہرے پر تیزاب چھڑکتے دیکھا۔

اندھیاری گلی میں مَیں نے دیکھا کہ لوگ چھوٹے چھوٹے بچّوں کو پکڑ پکڑ کر زندہ آگ میں جھونک رہے ہیں۔ مَیں نے وہ دہشت اور کرب کی حالت دیکھی، مَیں نے ماؤں کی وہ دِل ہلانے والی بین کی فریادیں سُنیں مَیں نے معصوموں کے چہرے پر وہ مظلومانہ ہراس دیکھا کہ جہنّم کے مظاہر کو بھی شرم آجائے۔

ایک شخص ایک شیر خوار بچّے کو گردن پکڑ کے اُٹھائے ہوئے تھا اور پورا مجمع اُن وحشیوں کے ہجُوم کی طرح چیخ رہا تھا جو بچّوں کو بھُون بھُون کر کھاتے ہیں۔ مَیں نے اس شخص سے کہا کہ اس معصوم نے تیرا کیا بگاڑا ہے۔ اُس شخص نے مجھے غور سے دیکھا، بچّے کو تو اُس نے ایک مکان سے نکلتے ہوئے آگ کے شعلوں میں پھینکا اور وہ میری طرف چاقو کھینچ کے لپکا۔ ایک طالبِ علم نے جو ہاتھ کا بنایا ہوا کپڑا جسے کھادی کہتے ہیں، پہنے ہوا تھا۔ اُسے یہ کہہ کے روکا، یہ تو کسی باہر کے مُلک کا رہنے والا ہے، اور پاکستان کا اس نے نام بھی نہ سُنا ہوگا۔ اسے کیوں مارتے ہو؟ مگر اس درمیان میں مجمع میرے اطراف جمع ہوگیا تھا، لوگ چاقو نکالے ہوئے چیخ چیخ کر اپنی زبان میں کچھ نعرے لگا رہے تھے، جن کا مطلب اے امیر المومنین مَیں سمجھ نہ سکا۔ لیکن اُن کی نیت کسی طرح میرے ساتھ دوستی کی نہ تھی۔ یہ کچھ لوگ جو تعداد میں کم تھے۔ اُنھیں روک بھی رہے تھے۔ مگر ایک شخص نے چیخ کے کہا۔ یہ اعرابی

ہے تو کیا ہوا یہ تھا ہے تو ہمارا دشمن اور اس کے ساتھ ہی میرے شانے میں اُس کا چاقو گھسا میں درد سے بے تاب ہو کر گر پڑا۔ مَیں نے اپنے جسم میں ایک اور چاقو کی چبھن محسوس کی اور پھر مَیں بے ہوش ہو گیا۔

اے امیرالمومنین جب مجھے پھر ہوش آیا تو مَیں نے اپنے آپ کو ایک ایسی تنگ اور نہایت درجہ تاریک جگہ پایا جہاں مجھے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ پہلے تو مجھے یہ گمان ہوا کہ یہ جگہ قبر ہے۔ جس پر جہنم کی بدترین عفونت کے دروازے کھول دیے گئے ہیں۔ مَیں نے پہلو بدلا تو اپنے جسم میں چاقو کے زخموں کی تکلیف محسوس کی۔ پھر بھی مجھے بڑی دیر تک یہ گمان نہیں ہوا کہ مَیں زندہ ہوں میرے جسم کے نیچے ایک ایسی سڑی بدبودار غلاظت بہہ رہی تھی کہ چند منٹوں کے بعد میرا ہوش پھر جاتا رہا۔

معلوم نہیں اور کتنی دیر تک مَیں اس عدم شعور کے عالم میں رہا۔ لیکن پھر یقینی طور پر مجھے وہ تنگ و تاریک جگہ نظر آئی۔ جہاں مَیں تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ قبر ہے۔ اور مَیں نے اپنی قوت متاثرہ کو اس بدبودار سیّال رطوبت کا عادی بنانا چاہا، جسے مَیں اپنے جسم کے نیچے بہتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

پھر اے امیرالمومنین مَیں نے بھوک محسوس کی۔ اور بھوک کے احساس کے ساتھ مجھے شک ہونے لگا کہ مَیں زندہ ہوں۔ لیکن اگر میں زندہ ہوں تو کہاں ہوں؟۔ کیا کسی نے مُردہ سمجھ کے مجھے قبر میں دفن کر دیا ہے۔ اس تصور سے پہلی مرتبہ مجھ پر خوف کی کپکپی طاری ہوئی۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ پہلی مرتبہ نہیں تھی جو مَیں زندہ دفن ہوا۔ اب سے صدیوں پہلے جب مَیں ایک سفر کے اثنا میں اُس بادشاہ کی سلطنت میں تھا، جہاں زندہ شوہر مُردہ بیویوں کے ساتھ اور زندہ بیویاں مُردہ شوہروں کے ساتھ دفن کر دی جاتی ہیں تو مجھے بھی زندہ دفن کر دیا گیا تھا۔ مَیں اُس موت اور عفونت اور سڑتے گلتے ہوئے جسموں کے تہ خانے میں بھی زندہ رہا جب کوئی زندہ کسی مُردے کے ساتھ دفن ہوتا تو مَیں کسی چوڑی سی ہڈی سے اس مدفون زندہ مرد یا عورت کا بھیجا پاش پاش کر دیتا تھا۔ اور اُس کے حصّے کا آزوقہ کھا لیتا لیکن اس بدبودار قبر میں جہاں مَیں تھا سوا سسک سسک کر مرنے کے اور کیا صورت تھی؟

مَیں نے غور کرنا چاہا کہ مَیں کہاں ہوں وہ تنگ دیواریں جن میں مَیں مقید تھا۔ پکّی سیمنٹ کی تھیں، اور اُن کے درمیان غلاظت کی ایک نالی بہہ رہی تھی۔ یہ جگہ یقیناً قبر نہیں تھی۔ اور سوچ سوچ کے مَیں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ اس شہر کلکتہ کی زمین دوز عفونت کی نالی ہے انسان کی ساری غلاظت اس نالی میں جمع ہو جاتی ہے۔ مَیں نے ایسی نالیاں اکثر اپنی دوسری سیاحتوں میں فرنگستان میں بنتی دیکھی تھیں۔

جوں ہی مجھ پر اس وحشت ناک حقیقت کا انکشاف ہوا۔ مَیں اپنی یاس و ہراس کی کیفیت دُہرا نہیں سکتا۔ مجھے اپنے سامنے بدبُو اور بھوک کی ایسی موت کی تصویر نظر آنے لگی جس کے مقابلے میں کتّے کی موت ہزار درجے غنیمت ہے۔

میری بھوک بڑھتی گئی۔ مجھے وقت کے گذرنے کا احساس ہونے لگا۔ حالاں کہ جس جگہ میں تھا وہ اتنی تاریک تھی کہ وہاں سورج کی روشنی کا شُبہ بھی داخل نہ ہو سکتا تھا۔ میری آنتیں اژدہے بن گئیں، اور بھوک کی شدّت میں معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو کھا جائیں گی۔ میرا پورا جسم ایک قطرہ پانی کے لیے ترس گیا۔ میری قوتِ شامہ رفتہ رفتہ اس سخت بدبُو کی عادی ہو گئی۔

اس طرح شاید چار پانچ دن گذر گئے ہوں گے۔ یہاں تک کہ بھوک اور پیاس نے مجھے دیوانہ کر دیا۔ مَیں نے اُس غلاظت کو نگل کے بھوک اور پیاس کو بجھانا چاہا۔ جو انسان کے جسم کی نکلی ہوئی عفونت تھی۔ لیکن میں اُس غلاظت کو کھا نہ سکا۔

اور اس کے بعد مجھ پر ایک ایسی کمزوری اور بے حسی طاری ہوئی گویا مجھے کسی بات کی خبر تھی نہ فکر۔ میری آنتوں کے اژدہے ایک دوسرے سے لڑ لڑ کے تھک گئے تھے اور اب اُن پر بھی موت کی نیند طاری ہو رہی تھی۔ میرے دماغ کے اندر البتہ کسی ہتھوڑے کی ضرب کھٹ کھٹ برابر لگتی رہی۔

یہ کھٹ کھٹ کی ضرب بڑھتی گئی، اور میری آنکھیں جو میرے باقی جسم کی طرح غشی کے عالم میں تھیں، اس جانکنی کے عالم میں بھی چونک اُٹھیں کھٹ کھٹ کی آواز کے بعد مدّھم سی روشنی کی ایک کرن نظر آئی۔ وہ مزدور جو یہ نالیاں صاف کرتے ہیں اُوپر کا ڈھکن کھول کے نالی کو

صاف کرنے کے لیے اُتر رہے تھے۔ تقریباً ہفتے بھر بعد انسان کی آواز پھر میرے کان میں آئی۔ کسی نے گویا کہا۔ یہ کسی آدمی کی لاش ہے لیکن میری آنکھیں متحرک تھیں۔ کسی اور نے کہا نہیں یہ زندہ ہے اور روشنی کے تیز لمس اور اُمید کی تکلیف دہ چمک سے میں پھر بے ہوش ہو گیا۔

یا امیرالمومنین ایک شفا خانے میں میرا علاج ہوا۔ میرے زخم مندمل ہوتے لیکن میرے دل پر جو زخم لگا تھا۔ وہ ہرا رہا۔ مَیں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا جو مَیں گھائل کیا گیا۔ اس غلیظ موری میں پھینکا گیا۔ جہاں مجھے مجبور ہو کے اِنسان کے جسم سے نکلی ہوئی غلاظت تک جان بچانے کے لیے نِگلنا پڑی۔ جب میں شفا خانے سے نِکلا تو مَیں نے ہندوستانی وضع کے کپڑے پہنے اپنے سامان سے وہ جڑاؤ خنجر نکالا۔ جو مَیں نے بغداد کے بازار میں آج سے کئی سو سال پہلے خریدا تھا۔ اور خنجر کو اپنے کپڑوں میں چھپا کے نکلا کہ ایک نہ ایک کو مار کے اپنی تکلیف کا بدلہ ضرور لوں گا۔

مَیں نے اب چوروں کی چال چلنا سیکھی۔ میرا لباس اِتنا شریفانہ تھا کہ وردی پوشوں کو مجھ پر شک نہ ہو سکتا تھا۔ میں احتیاط سے شہر کے اُن حصوں کی طرف چلا، جہاں مجھ پر حملے کا امکان تھا۔ یہاں تک کہ مَیں ایک سنسان گلی میں پہنچا۔ رات تاریک تھی۔ مَیں نے کسی کے قدموں کی چاپ سُنی۔ مَیں دُبک کے ایک دروازے سے لگ کے کھڑا ہو گیا۔ گلی کے چراغ کی دُھندلی سی روشنی میں مَیں نے ایک شخص کو دھوتی باندھے آتا دیکھا۔ مَیں نے اپنے دِل میں کہا کہ اب میرا بدلہ لینے کا وقت آگیا ہے۔ مَیں اس کافر سے اُس سارے عذاب کا بدلہ لوں گا۔ جو عذاب قبر سے زیادہ مہیب تھا۔ اور جو مجھ اجنبی کو بلا قصور بھگتنا پڑا۔

جب یہ شخص جو دھوتی باندھے تھا، میرے قریب سے گذرا تو میں اپنا جڑاؤ خنجر نکال کے اُس پر اس طرح جھپٹا جیسے کوئی درندہ اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔ مَیں نے اُس پر خنجر کا وار کیا۔ وہ زمین پر گرا۔ مَیں نے اس کی گردن کے قریب دوسرا وار کیا۔ اور اُس شخص نے جو ضعیف تھا اور دھوتی باندھے تھا، آہستہ آہستہ کلمۂ شہادت پڑھا۔

یا امیرالمومنین معلوم ہوتا تھا کہ مجھ پر بجلی گری۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ہندوستان

کے اس خطے میں جس کو بنگال کہتے ہیں دیہاتی ہندو اور مسلمان ایک ہی وضع کا لباس پہنتے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ جس کسی پر دشمن سمجھ کے وار کرو وہ ہمیشہ اپنا بھائی ہی ہوتا ہے۔

مَیں اُس بوڑھے کی لاش سے لپٹ گیا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ مَیں نے ارادہ کیا کہ اُسی جڑاؤ خنجر سے اپنی جان لے لوں۔ مگر پھر مَیں سوچنے لگا کہ اِس سے مخلوق کو کیا فائدہ ہوگا۔ لوگ سمجھیں گے کہ مجھے بھی کسی غنڈے نے مار ڈالا ہے۔ کوئی اس واقعے سے سبق حاصل نہ کر سکے گا۔

مَیں نے روٹی حاصل کرنے کے لیے انسانوں کو قتل کیا ہے۔ میرے ہاتھ سے ایک آدھ معصوم کی بھی جان جا چکی تھی۔ لیکن اے امیرالمومنین اپنے آپ کو ایسا سیاہ کار قاتل مَیں نے اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ اپنے کو مجرم اور قاتل سمجھنے، اپنے بھائی کا قاتل سمجھنے کا عذاب ایسا سخت تھا کہ اس کے مقابل اس گندی موری کا عذاب کچھ نہیں تھا۔

مَیں نے بالآخر فیصلہ کر لیا۔ مَیں ان وردی پوشوں کی چوکی پر پہنچا۔ ان کے افسر سے مَیں نے کہا کہ مجھے گرفتار کر لو۔ مَیں نے ایک انسان کا خون کیا ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ مقتول ہمیشہ قاتل کا بھائی ہوتا ہے۔ مَیں نے ہابیل اور قابیل کا قصہ پڑھا تھا۔ مگر اُسے پڑھ کر مَیں بھول گیا تھا۔ یہ دیکھو میرے کپڑوں پر خون کے چھینٹے، وردی پوشوں کے افسر نے مجھ سے پوچھا کہ تو کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔

مَیں نے کہا مَیں سندباد جہازی ہوں جو دوبارہ زندہ دفن ہوا۔ جس کی گردن نے پیر تسمہ پا کا بوجھ سہارا، جو یک چشم دیو کی سیخ پر کباب ہو جانے سے بال بال بچا۔ مجھ سندباد جہازی کو مجھ قاتل کو گرفتار کر لو اور پھانسی دو۔

وردی پوشوں کا افسر بے اختیاری کی ہنسی ہنسا اور کہا۔ مَیں سندباد جہازی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ مَیں نے اس کی سات سیاحتوں کا حال پڑھا ہے اُسے مرے تو صدیاں

ہو گئیں۔ ہارون الرشید کے بغداد کو ہلاکو نے جلا ڈالا۔ اے امیر المومنین اُسے کسی طرح باور نہیں آیا کہ تمام تر وقت محض ایک آن ایک لمحہ میں اور ماضی اور مستقبل دونوں حال میں موجود ہیں۔ اے امیر المومنین وہ مجھ کو اور تجھ کو اور خود اپنے آپ کو معدوم سمجھا۔ اور اس نے مجھ قاتل کو گرفتار کرنے سے انکار کر دیا۔

تب مَیں نے اُسے اپنا جڑاؤ خنجر دکھایا۔ جس سے گرم گرم خون ٹپک رہا تھا۔ مَیں نے کہا یہ دیکھو اسی خنجر سے مَیں نے ایک انسان کو قتل کیا ہے۔

وہ خوب ہنسا اُس نے کہا کسے بے وقوف بنا رہے ہو یہ خنجر تو دلی کے عجائب خانے میں رکھا ہوا ہے۔

دوسرے دن صبح اُٹھ کے اُس افسر نے اپنے ساتھی سے کہا۔ رات کو مَیں نے ایک عجیب خواب دیکھا.... ...!

○○

کٹھ پتلیاں

اس نے پھر ٹیلی فون کیا۔ اور ٹیلی فون پر پھر وہی قہقہوں کا سیلاب آیا۔ "کون؟ گز؟ (وہ غضنفر کو آکسفورڈ کے زمانے سے گز کہا کرتی تھی) تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ یہاں؟ پور (Poor) بوائے کہاں ٹھہرے ہو' امپیریل۔ ہاں' ہاں' ضرور' ضرور آؤ۔ سنو' آج شام کو کچھ کام ہے؟ تو پھر ڈرنکس کے لئے آؤ۔ نک؟ نک دورہ کرنے ڈیرہ اسماعیل خاں گئے ہوئے ہیں۔ تمہیں مکان مل جائے گا؟.... اچھا شام کو چھ بجے کے قریب۔"

غضنفر نے آہستہ سے ٹیلی فون کا ریسیور رکھا۔ سامنے فیروز پور کی وہی دونوں خوش پوش منیجر سے کسی چیز کی فرمائش کر رہی تھیں۔ کھانے کے کمرے میں لاٹری دیا تا کا خون کیا جا رہا تھا۔ جی چاہتا تھا' دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی جائیں۔

"اولڈ جل۔" اس نے پتلون کی جیب میں ہاتھ گھسیٹرے۔ اور جل کا خیال کر کے مسکراتا ہوا اپنے کمرے کی طرف جانے لگا۔

جل کو وہ کیمبرج کے زمانہ سے جانتا تھا۔ اب تک وہ اسنیپ کہیں پڑا تھا۔ جس میں کنگس کالج کے پھاٹک میں کھڑے ہو کے اس نے جل نے اور روبن شٹائن نے تصویر کھنچوائی تھی۔ تصویر میں اس کا موٹا سبز اونی کوٹ بڑا ڈھیلا ڈھالا معلوم ہوتا تھا۔ وہ بالکل حاملہ معلوم ہو رہی تھی۔ حالانکہ بیچاری۔ خیر فرشتہ تو وہ اس زمانے میں بھی نہیں تھی۔

ابھی تک کین روبن اشتائن سے اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔

کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ وسط یورپ سے کیوں انگلستان اور خصوصاً کیمبرج آئی ہے۔ کیونکہ یونیورسٹی سے جل کو کوئی خاص واسطہ نہیں تھا۔ مگر اس سال ڈیڑھ سال کے عرصے میں وہ انگریزی بالکل انگریزوں کے بہجے میں بولنے لگی تھی۔ لیکن اس کے آداب اور اخلاق وسط یورپ ہی کے تھے۔ کچھ وی آنا اور کچھ بودا پست۔ وی آنا زیادہ اور بودا پست کم۔

فشرباستائی سے بودا پست کے دوسرے سرے تک چاندنی راتوں میں کشتی دو چکر کرتی تھی۔ ایک رات کے آٹھ بجے سے دس بجے تک۔ دوسرا چکر دس بجے سے بارہ بجے تک۔ ایک طرف بودا اور ترکوں کی یلغار اور قرون وسطیٰ، دوسری طرف پست اور ہاپس برگوں کا آخری زمانہ اور بیسیوں صدی۔ روبن اشتائن نے اسی کشتی پر دس سے بارہ بجے تک والے چکر میں جل کے ساتھ وی آنا کا والتس ناچتے ناچتے کہا تھا۔ "سرت لک" ہنگروی زبان کے یہی دو لفظ اسے یاد تھے۔ اور الفاظ کی ضرورت ہی کیا تھی۔ جل کی روح جرمن تھی۔ صد فی صد آسٹریائی۔ اس نے چڑ کے کہا۔ "ہنگروی میں تو مجھ سے عاشقی مت کرو۔" اور تھوڑی دیر کے بعد جذبات کی رو میں وہ بھی بہہ گئی۔ چاندنی میں سبزی سے ڈھکا ہوا ڈینیوب کے بیچوں بیچ "جزیرہ مارگرت" تھا۔ خوابوں کی پامال دنیا۔ لیکن ماریا تھریسا کی یاد نس نس میں دوڑ گئی۔ ڈینیوب نیلی نہ سہی۔ گدلی سہی۔ چاندنی رات میں ملگجی سہی لیکن مارگرت ازل کے پاس تو چاندنی جادو سا کرتی معلوم ہوتی تھی۔ اور چھوٹے سے بینڈ کے سامنے کھڑے ہو کر کسی نے گانا شروع کیا۔

"ملکہ۔"

"حسین ملکہ۔"

"وہ صرف ملکہ نہیں۔"

"عورت بھی ہے۔"

کئی سال پہلے کا وی آنا اور بودا پست پھر سے زندہ ہو گیا۔ اس دریا کی روانی میں جو ان دو شہروں کو ملاتا ہے۔ وسط یورپ، رومان اور گیتوں کی شاہراہ۔

اس رات روبن اشتائن نے پروپوز کیا اور جل نے مان لیا۔

"بالکل اسی طرح" روبن اشتائن نے چٹکی بجا کے غضنفر کو سمجھایا۔

"اس طرح" جل نے بھی چٹکی بجائی۔

تعطیلات کے زمانے کے حالات جو ہنی مون کے زمانے کے حالات تھے، روبن اشتائن نے سنانے شروع کئے۔

اور پھر کئی سال گزر گئے۔ مارچ کی ایک شام تھی۔ ہواؤں کی خنکی ذرا کم کم ہو گئی تھی۔ یہ ہوائیں پرانے قلعے کو تو زیب دیتی تھیں لیکن نئی دلی کے اس طویل و عریض سبزے پر جو مہاراجاؤں کے محلوں سے شروع ہو کے امپریل سیکریٹریٹ کے قریب ختم ہوتا تھا۔ جس کی آبیاری کے لئے وہ نہریں پھر سے جاری کی گئی تھیں جو صدیوں پہلے چاندنی چوک میں خشک ہو چکی تھیں۔ اس سبزے پر یہ ہوا ذرا غیر سی معلوم ہوتی، اجنبی اور ناگوار۔ ابھی تو مارچ ہی کا موسم تھا۔ موسم کو اتنی جلدی گرمی کی ذرا سی بھی جھلک دکھانے کا کیا حق تھا۔ ابھی تو چھ مہینے پڑے تھے۔

انڈیا گیٹ سے آگے سبزے کے کنارے کنارے، ٹہلتے ٹہلتے یہ دونوں چلے جا رہے تھے۔ غضنفر اور شفیع۔ ایک جگہ ٹوٹے ہوئے بام و در نے سنایا بھی۔ ان فرنگیوں کو حکومت کرنا کیا خاک آئے گا۔ یہاں مغلوں نے حکومت کی ہے۔

شفیع نے گھڑی دیکھی۔ "سوا سات۔ ڈنر تو ساڑھے آٹھ سے ہے نا؟ اطمینان سے کپڑے بدل سکتے ہیں۔"

"میں سوچ رہا تھا کہ مغلوں کے زمانے میں دلی لاکھ شاندار رہی ہو۔ طبعی زندگی بسر کرنے کا ہنر یورپ والوں ہی کو آتا ہے۔ اسی سبزے کو دیکھئے نا۔ اس کی کشادگی کو یہ نہیں کہ ذرا سے علاقے میں سرو کے یا چنار کے ہزار درخت لگا دیئے ہوں۔"

"ہاں" شفیع نے پان چباتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

دفعتاً غضنفر نے آنکھیں پھاڑ کے سامنے دیکھا۔ یہ تو جل تھی۔ ایک آنریبل ممبر کے ساتھ۔

بے اختیار غضنفر کی زبان سے نکل گیا۔ "جل، جل تم یہاں کہاں۔"

جل "ہلو" کہہ کے تصنع سے مسکرائی۔ جلدی سے آنریبل ممبر سے اس کا تعارف کرایا۔ شفیع کی طرف دیکھ کے سر ہلایا۔ معذرت کی اور چل دی۔

"اچھا تو یہ بات تھی۔" غضنفر نے اپنے آپ سے ذرا بلند آواز سے کہا۔
شفیع ہنسنے لگا۔ "یہاں یہ کچھ عرصہ سے ہے۔ تمہیں معلوم نہیں تھا؟ سر ذوالفقار حسینی کی سیکرٹری ہے۔ فرخندہ نگر بھی آئی تھی۔ ان ہی کے ساتھ۔ سر ذوالفقار حسینی کو انکل کہتی ہے۔"

"اچھا" غضنفر نے کہا۔

"ہاں جنوری میں۔ اور تمہیں ایک لطیفہ سناؤں۔ جب تابندہ نگر اسٹیشن پر سر ذوالفقار کے سیلون میں سامان رکھا جانے لگا تو میں نے کہا کہ میم صاحب کا بچھونا پرائیویٹ سیکرٹری والے ڈبے میں لگاؤ۔ وہ جلدی سے کہنے لگی، 'نہیں' میں اور انکل ایک ہی کمرے میں سوتے ہیں۔"

غضنفر ہنسنے لگا۔ "ہاں کیمبرج میں بھی جل ذرا شوقین مزاج ہی تھی۔ ہم کہا بھی کرتے تھے تمہیں بجائے کیمبرج کے آلڈر شاٹ میں رہنا چاہیے۔"

"تم اسے کیمبرج کے زمانے سے جانتے ہو؟"

"ہاں۔"

شفیع نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ "ساڑھے سات" اور دونوں سبزے کے اس پار انڈیا گیٹ سے ہوتے ہوئے گیسٹ ہاؤس کی طرف مڑ گئے۔

تین چار روز بعد شفیع نے کہا۔ "ہز ہائی نس آج اسے بھی بلوانا چاہتے ہیں۔"

"کسے؟" غضنفر نے پوچھا۔

"تمہاری اسی دوست جل کو۔ ذرا مہمانوں کو ٹیلی فون تو کر دو۔ سر جیری رائس مین۔ سر ذوالفقار حسینی۔ مسز آر کے نہرو۔ مسز روبن اشتائن۔"

"ہز ہائی نس کو معلوم ہے؟" غضنفر نے پوچھا۔

"نہیں، تم پوچھ آؤ" شفیع نے کہا۔

"ابھی تو وہ بر آمد نہیں ہوئیں۔"

"خیر دوسروں کو تو ٹیلی فون کر دو۔"

اور جب ہز ہائی نس بر آمد ہوئیں۔ گہرے سبز سلک، بال پیچھے کی طرف مڑے ہوئے اور چہرے پر کولڈ کریم۔ تو غضنفر نے فرشی سلام کے بعد عرض کیا۔ "یور ہائی نس۔ ہز ہائی

نس نے آج کے لنچ کے مہمانوں کی یہ فہرست بھیجی ہے۔"

اپنے لانبے نوکدار سرخ ناخنوں سے فہرست غضنفر کے ہاتھ سے تقریباً کھینچ کے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی اپنی خواب گاہ میں چلی گئیں۔

"ٹمپریچر کتنا تھا؟" شفیع نے آہستہ سے پوچھا۔

"ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔" غضنفر نے جواب دیا۔ اور ہر ہائی نس کی خواب گاہ کے پردے کی طرف اشارہ کیا۔

اسی طرح لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی، اور چہرے پر بڑے ناگوار طنز کا تبسم لئے ہوئے ہر ہائی نس واپس آئیں۔ شفیع نے بو کیا۔ اور ہٹ گیا۔ دو ناخنوں کی چٹکی سے کاغذ پکڑ کے ہر ہائی نس نے غضنفر کے ہاتھ میں دیا۔ اس پر مسز روبن اشتائن کے نام پر گہری سرخ لکیر کھنچی ہوئی تھی۔

"پلیز غضنفر، ہز ہائی نس سے کہہ دو کہ میرے میز پر کسی وزیر کی ناجائز محبوبہ کے لئے کوئی مقام نہیں۔ چند نام اور فہرست میں بڑھا دو۔ مہارانی کوچ کلاں اور لیلا..... تھینک یو....." اور پھر اپنی لیڈی کمپینین کو بہت ہی مرئل آواز میں پکارتی ہوئی وہ آگے کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ "جے نی.... جے نی۔"

غضنفر نے فہرست شفیع کے ہاتھ میں دی اور کہا یہ تو ہز ہائی نس کا ارشاد ہے اب تم ہز ہائی نس سے عرض کر دو۔

ہز ہائی نس ابھی باتھ روم سے آئے تھے۔ صرف ایک تولیہ باندھے۔ چھوٹا سا قد، سینے پر بال۔ بے انتہا مظلوم معلوم ہوتے تھے۔ نواب مطمئن جنگ کمر فرط مستعدی سے خمیدہ اور ٹانگوں سے زاویہ قائمہ بناتی ہوئی ہز ہائی نس کے ہر فقرے پر یا تو بڑی سیاست سے مسکرا کے خاموش ہو جاتے یا "جی قبلہ پیر و مرشد" کہہ کر ہاتھ جوڑتے۔

"سب ریاستوں کو دیکھو نواب" ہز ہائی نس ارشاد فرما رہے تھے۔ سب جگہ نوجوان بادشاہ ہیں۔ رئیسوں کو پچاس پچپن سال سے زیادہ زندہ نہیں رہنا چاہئے اور اپنے ولی عہدوں کیلئے جگہ خالی کر دینا چاہئے۔"

نواب مطمئن جنگ بڑی شاطرانہ سیاست سے مسکرائے۔ اور کوئی جواب نہ دیا۔ اے۔ اے۔ ڈی۔ سی نے البتہ ہاتھ جوڑ کے کہا۔ "بجا ارشاد، سرکار۔" لیکن مطمئن جنگ

نے ادھر ادھر گردن کو ذرا ذرا خم کر کے دیکھا۔ معلوم نہیں ان بٹلروں اور آرڈرلیوں میں کتنے خان حضرت کے جاسوس ہیں۔

"بڈھا منحوس مرنے کا نام نہیں لیتا۔" ہزہائی نس نے پاجامہ پہنتے پہنتے اپنی تقریر جاری رکھی۔ یہ ارشاد اپنے والد ماجد کے متعلق تھا۔ "کیوں کیا خیال ہے نواب؟"

نواب مطمئن جنگ پھر اسی شاطرانہ مسکراہٹ کے بل پر بچ نکلنا چاہتے تھے۔ لیکن ہزہائی نس نے اب کے تو ان سے براہ راست جواب طلب کیا تھا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کے انھوں نے عرض کیا۔ "قبلہ پیر و مرشد' فارسی کی ایک مشہور مثل ہے۔ دیوار ہم گوش دارد۔ میں عرض کروں گا کہ سرکار کا فرمانا بالکل درست ہے لیکن ذرا احتیاط....."

ایک آرڈرلی ہزہائی نس کا ازار بند باندھ رہا تھا۔ دوسرا تن زیب کا کرتہ لئے کھڑا تھا کہ ہزہائی نس اسے زیب تن فرمائیں۔ اتنے میں شفیع اندر آیا اور فوجی سلام کے بعد لنچ کی فہرست ہزہائی نس کے سامنے بڑھا دی۔

"کیا ہے؟" ارشاد ہوا۔

"سر جیری وائس مین کو غضنفر نے ٹیلی فون کیا تھا اور شارٹ نوٹس کی معافی چاہی تھی۔ انھوں نے آج آنے سے معذرت کی ہے۔ کوئی اور اینگیجمنٹ ہے۔" شفیع نے تمہید باندھی۔ وہ ایک دم سے جل روبن اشتائن کے نام کے کاٹے جانے کا ذکر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"خیر پروا نہیں۔ نواب میری طبیعت تو انگریزوں سے گھبراتی بھی بہت ہے۔" قمیض میں گلا پھنساتے ہوئے ہزہائی نس نے نواب مطمئن جنگ سے کہا۔ اور یہ واقعہ تھا جب کوئی بڑا انگریز مدعو ہوتا تو ہزہائی نس پہلے ہی سے شکم سیر ہو کے دیسی کھانا کھا کے لنچ یا ڈنر پر جاتے اور وہاں صرف بصیغہ مجبوری کچھ چکھ لیا کرتے تھے۔ چونکہ انگریزوں کی بہت اعلیٰ سطح کی گفتگو ان کی سمجھ میں نہ آتی اس لئے وہ ہمیشہ شکار کے موضوع پر آ جاتے۔ اور جب کوئی اور موضوع چھڑ جاتا تو بڑے لمبے چوڑے قہقہے لگاتے۔ مہمانوں کو گاڑی تک جا کے رخصت کرتے۔ ان کا کوئی ذاتی آرڈرلی لائٹر جلاتا اور وہ سگار سلگاتے۔ اور بڑے ہی خراب موڈ میں گالیاں بکتے ہوئے اپنے بیڈ روم چلے جاتے تھے۔

"قبلہ پیر و مرشد۔" نواب مطمئن جنگ نے کہا۔ "انگریزوں سے گھبرانے کی کوئی

بات نہیں وہ تو سرکار کی خوشامد کرتے ہوئے آتے ہیں۔ جب تک ان سے دوستی نہ ہوگی کیسے کام بنے گا۔ پیرو مرشد کو ایک دن تخت و تاج سنبھالنا ہے۔"

میجر شفیع نے بڑی دلچسپی سے جواں سال "قبلہ پیرومرشد" اور بڈھے "مرید" مطمئن جنگ کو دیکھا۔ پیری اور مریدی کا کیا دلچسپ سلسلہ تھا۔ اور پھر عرض کی۔

"سرکار' ہزہائی نس نے مہارانی کوچ کلاں اور لیلیٰ کا نام بڑھا دیا ہے۔

"اس چھ.... ال کا۔ نواب میں نے اپنی بیوی سے کتنا کہا۔ ان رنڈیوں سے دوستی مت بڑھاؤ۔ مہتاب جنگ نے تو دوسری شادی کرلی ہے آج کل مہارانی کوچ کلاں کس کو رکھے ہوئے ہے.....؟"

یہ دیکھ کر کہ ہزہائی نس کا موڈ ذرا ذرا ظرافت کی طرف مائل ہو رہا ہے۔ میجر شفیع نے ہنس کر کہا۔ "سرکار کچھ دن ہوئے ٹائمز آف انڈیا میں ایک اشتہار آیا تھا۔ ضرورت ہے ایک جگولو کی۔ درخواستیں براہ راست مہارانی کوچ کلاں کے پاس بھیجی جائیں۔"

"ہا' ہا' ہا" ہزہائی نس نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔ سماں ہی بدل گیا۔ نواب مطمئن جنگ بھی دیوار کا سہارا لے کر خوب ہنسے۔ اور ہزہائی نس نے خمیدہ پشت نواب صاحب سے کہا۔ "نواب کیا خیال ہے' ایک درخواست آپ بھی بھیج دیجئے۔"

اس پر ایک قہقہہ خود انہوں نے لگایا۔ نواب صاحب بھی مسکرائے۔

یہ دیکھ کر کہ موڈ ذرا ٹھیک ہے میجر شفیع نے عرض کی "ہزہائی نس نے جل روبن اشتائن کا نام کاٹ دیا ہے۔"

یک لخت ہزہائی نس کا موڈ بدل گیا۔ پہلے تو انہوں نے ہرہائی نس کو ماں کی گالی دی۔ اور نواب مطمئن جنگ سے کہا۔ "نواب ذرا آپ جا کے میری بیوی کو سمجھائیے۔ میں زبانی جل روبن اشتائن کو سرکلاؤ آکن لک کے یہاں کاک ٹیل پارٹی میں دعوت دے چکا ہوں۔ اس کا آنا ضروری ہے۔ کیا خیال ہے؟"

"بجا' قبلہ پیرومرشد۔" نواب مطمئن جنگ نے طوفان کو ٹالنے کے لئے جلدی سے کہا۔ "میں ابھی ہرہائی نس کو سمجھا دوں گا۔"

ہرہائی نس سے وہ لاؤنج میں ملے۔ فرشی سلام پر ہرہائی نس نے ان سے بیٹھنے کیلئے کہا اور انہوں نے ذرا لمبی چوڑی تمہید باندھ کر ہرہائی نس کو راضی کرلیا۔

لنچ سے پہلے جب غضنفر برآمدے میں مہمانوں کا انتظار کر رہا تھا۔ نواب مطمئن جنگ نیلے لاؤنج سوٹ پر دستار باندھے۔۔۔ نئی دلی میں بھی دستار ان سے نہیں چھوٹتی تھی۔۔۔۔ آئے اور ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ اور پھر دستار اتار کے اپنا گنجا سر کھجاتے ہوئے' انہوں نے غضنفر کو مخاطب کر کے ایک مصرعہ پڑھا۔

"کوہ کن گرسنہ مزدور طرب گاہ رقیب"

ایک خنجر سا غضنفر کے جگر کے آر پار ہو گیا۔ سچ ہے دربار کی زندگی اس کے سوا اور کیا تھی۔ تعیش کے باسی پلاؤ کے چند سوکھے لقمے۔ اور پھر بھی یہی نواب مطمئن جنگ جو کسی آزاد ملک کے سفیر بڑی کامیابی سے بن سکتے تھے۔ اپنے ہر جملے میں اپنے ان پڑھ نوجوان آقا کو "قبلہ پیرو مرشد" کہتے تھے۔ یہاں دولت کی بارگاہ پر علم و فضل کی جبینیں بلا کچھ حاصل کئے' بلا فائدہ اٹھائے جھک جھک جاتی تھیں۔ ہزہائی نس کو چار ہی دن پہلے سر جنگ بہادر نے "سرکار' سرکار" کہہ کے مخاطب کیا تھا۔ ایشیا کے خمیر جاگیرداری میں ابھی کتنی جان باقی تھی۔ ابھی کتنا جادو باقی تھا۔

ہرہائی نس روپہلے بیل بوٹوں سے بھری ہوئی سفید جگمگاتی ساڑھی اور سفید موتیوں کے ہار پہنے جلدی جلدی آئیں ان کے ہاتھ میں ٹیبل پلین تھا۔ "غضنفر..... یہ تم نے کیا کیا۔ خدا کیلئے جلدی سے بدلو۔ تم نے لیلا کو پرنس لیلا آف کوچ کلاں لکھا ہے۔ یہ مہارانی کی بڑی توہین ہے۔ اسے مس لیلا مہتاب جنگ بنا دو۔ جلدی' جلدی' نیا کارڈ ٹائپ کرواؤ۔ خدا کا شکر ہے میری نگاہ پڑ گئی۔ ورنہ کتنی مہمل قسم کی غلطی تھی.... پلیز نواب صاحب آپ بیٹھے رہیے.... شفیع سے کہئے جب تک کوئی مہمان آئیں تو وہ انہیں ریسیو کر لے۔"

ساڑھی میں ہرہائی نس سے لمبے لمبے ڈگ نہیں بھرے جاتے تھے ان کے لمبے رعب دار قد پر ساڑھی شاہانہ ملبوس ضرور معلوم ہوتی تھی۔ لیکن وہ تیزی سے اندر چلی گئیں اور غضنفر نے ٹائپسٹ کو لیلا کا نام بدلنے کیلئے بلا بھیجا۔ "نواب صاحب مجھے نہیں معلوم تھا کہ حرام کی اولاد اپنے باپ کے نام سے مشہور ہوتی ہے۔ ماں کے نام سے نہیں۔ سوسائٹی کے آداب لکھنؤ کی گلیاں ہیں۔ ہمیشہ کوئی نیا سا راستہ نکل آتا ہے۔"

نواب صاحب مسکرائے' سر کھجایا۔ اور اقبال کے تارے چاند اور موج بے تاب

کی طرح کوئی جواب نہ دیا۔

اور پھر مہمانوں کے آنے سے پہلے ہزہائی نس لاؤنج میں آ گئے۔ ایک آدھ منٹ بعد ہرہائی نس بھی آ گئیں۔ غضنفر اور شفیع مہمانوں کو موٹر سے لاؤنج تک لاتے رہے اور ان سے ڈرنکس کے متعلق پوچھتے رہے۔ دوسری ہی موٹر سر ذوالفقار حسین کی تھی۔ ان کے سر کے زیادہ تر بال سفید ہو چکے تھے۔ اور ان کے ساتھ ہلکے گلابی رنگ کا بڑا خوبصورت گون پہنے جل روبن اشتائن تھی۔

"ہیلو گز۔" جل نے غضنفر کی طرف ہاتھ بڑھایا جس پر ایک بڑی خوبصورت انگوٹھی جگ مگا رہی تھی۔ اور پھر سر ذوالفقار حسین کی طرف مخاطب ہو کے وہ کہنے لگی "انکل' میں نے اس سے پہلے گز سے آپ کا تعارف کرایا ہو گا' یاد ہو گا میں جب کیمبرج میں تھی یہ بھی اس زمانے میں کیمبرج میں تھے۔"

"اچھا؟ بڑی خوشی ہوئی۔" سر ذوالفقار نے بے خیالی میں اپنا ہاتھ بلکہ دو تین انگلیاں غضنفر سے ملائیں۔ اور ہزہائی نس سے ملنے کے لئے بڑھے جو اس درمیان میں بے صبری سے برآمدے میں آ گئے تھے۔ لگے ہاتھوں جل سے ذرا مذاق کرنے کے لئے۔

ایک دو منٹ کا وقفہ غضنفر کو مل گیا تھا۔ "جل اتنے دنوں بعد تم سے مل کے بڑی خوشی ہوئی۔"

"سچ مچ؟" جل نے پوچھا۔

"تم سے ملنا تو قریب قریب ناممکن ہے۔" غضنفر نے آہستہ سے کہا۔

"جب انکل سیکرٹریٹ میں ہوں تو تم مجھے ٹیلی فون تو کر ہی سکتے ہو جب انکل گھر میں ہی رہتے ہیں تو میں مصروف رہتی ہوں۔" جل نے کہا۔

"ظاہر ہے۔" غضنفر نے ملے جلے طنز اور اخلاق سے کہا۔

"گز' ہم میں بالکل تبدیلی نہیں ہوئی۔ سچ مچ تم سے مل کے خوشی ہوئی.... او یور ہائی نس۔" اس اثنا میں سر ذوالفقار ہزہائی نس کے قریب بیٹھ کے گملٹ کا گلاس ٹرے سے اٹھا رہے تھے اور ہزہائی نس جل کے پاس آ چکے تھے۔

"اب آپ کیسی ہیں۔ مسز روبن اشتائن۔ میرا خیال تھا آپ آج نہیں آئیں گی۔ دغا دے جائیں گی۔" ہزہائی نس نے زور سے قہقہہ لگایا۔

"اب.... ہز ہائی نس میں آپ سے ایک راز کی بات کہوں۔ میں کبھی دغا نہیں دیتی۔ کبھی نہیں۔" جل ہنسی اور اپنا ہاتھ ہز ہائی نس کے ہاتھ سے چھڑایا۔ جو اب تک ان کے پنجے میں ڈھیلا پڑا ہوا تھا۔ ایک اور موٹر پورٹیکو میں آ کے رکی تھی۔ غضنفر اس طرف بڑھا اور شفیع جل کو اندر لاؤنج میں لے گیا۔ جہاں ہر ہائی نس نے ایک بڑی چوڑی "سویٹ" سی مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا۔ لیکن ہاتھ نہیں ملایا اور اسی طرح سر ذوالفقار حسینی سے باتیں کرتی رہیں۔

غضنفر جب واپس آیا تو اسے صاف نظر آ گیا کہ ہر ہائی نس کا یہ "اسنب" چاقو کی طرح جل کے کلیجے میں اتر چکا تھا۔ پھر بھی وہ ہر ہائی نس اور مسز آر کے نہو سے برابر اخلاق سے ہنس ہنس کے باتیں کئے جا رہی تھی۔

ہز ہائی نس کے دائیں ہاتھ پر مہارانی کوچ کلاں کو کرسی دینے کے بعد غضنفر میز کے سرے پر اپنی جگہ پر آ کے بیٹھ گیا۔ ہز ہائی نس اب مہارانی کوچ کلاں سے ہنس ہنس کے بڑے تپاک سے باتیں کر رہے تھے۔ یہی چھ.... ال" تھی۔ جس پر صبح کو قہقہے اڑ رہے تھے۔

جل غضنفر کے سیدھے ہاتھ پر تھی۔ اسے دیکھ کر وہ مسکرائی۔ اس میز پر ظاہر ہے اسے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ محض "برداشت کی جا رہی ہے۔"

"ذرا خیال تو کرو کسے معلوم تھا اتنے سال بعد یہاں دلی میں ملاقات ہو گی۔" اس نے جل سے کہا۔

"دنیا بڑی مختصر ہے۔" جل نے اختصار سے کہا۔

ہز ہائی نس نے زور سے قہقہہ لگایا۔ اپنے ہی کسی مذاقیہ جملے پر اخلاقاً" اپنا کانٹا اپنی پلیٹ میں رکھ کے مہارانی کوچ کلاں' اپنا سفید ہوتا ہوا سر پیچھے جھکا کے ہنسنے لگیں۔ اخلاقاً" ہر ہائی نس نے مصنوعی ہنسی میں اپنے دانتوں کی ذرا سی خوبصورت جھلک دکھائی اور سر ذوالفقار حسین سے جو ان کے داہنے ہاتھ پر بیٹھے تھے آسام کے مردم خوروں کے مزید حالات سننے لگیں۔

"جل۔"

"کیا گز؟"

"میں ایک سوال پوچھ سکتا ہوں۔" غضنفر نے آہستہ سے جل سے پوچھا۔

"پوچھو۔"

"تم خوش ہو؟" اس نے بچوں کی طرح پوچھا۔

"خوشی، مائی ڈیئر بوائے۔" جل ہنسی۔ دنیا دار کی بے تکلف سی ہنسی۔ "خوشی بڑی اضافی چیز ہے، ہاں میں خوش ہوں، بڑا مکان، باغ، بیوک..... ہر چیز۔ اس سے زیادہ عورت اور کیا چاہتی ہے؟"

"شاید، تم ٹھیک ہی کہتی ہو۔" غضنفر نے آہستہ سے کہا۔ اور اس نے وہ فرانسیسی کہاوت دہرائی۔ "شاکاں ساوی۔"

آہستہ آہست جل نے وہی الفاظ دہرائے۔ "شاکاں ساوی" اور پھر خود ہی انگریزی میں ان الفاظ کا ترجمہ کیا۔ "ہر ایک کے لئے اس کی زندگی..... لیکن گز..... چیراپ..... تم کس قدر مار بڈ ہوتے جا رہے ہو۔ کس چیز نے تمہیں بدل دیا ہے..... یہاں کے موسم نے 'یا دربار نے؟"

"کچھ موسم نے، کچھ دربار نے، کچھ زندگی نے، بہر حال جل اتنا میں مانتا ہوں کہ اس قدر بلازے محسوس کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

اوہ چیراپ اولڈ بوائے یاد ہے تمہیں کبھی کبھی میں کیمبرج میں بھی میلنکلی ڈاک کہتی تھی۔"

لنچ کے بعد جب مہمان جا چکے اور ہز ہائی نس کا آرڈرلی ان کا سگار سلگا چکا اور وہ بھی اپنے کمرے کو رخصت ہو چکے تو نواب مطمئن جنگ' اپنی لیڈی کمپینین جینی اور غضنفر کی موجودگی میں ہر ہائنیس نے لنچ پر تبصرہ شروع کیا۔ "سر ذوالفقار حسین اچھے خاصے چارمنگ آدمی ہیں۔ لیکن جینی ان سے پانچ منٹ سے زیادہ عرصے کے لئے کسی موضوع پر گفتگو کرنا ناممکن ہے۔ قطعا" قطعا" ناممکن اور میرے شوہر۔ کیوں نواب صاحب مہارانی کوچ کلاں سے وہ مذاق جو انہوں نے کیا تھا کتنا ٹیکٹ لس تھا۔ میں نے تو پیٹھ پر سردی کی جھرجھری سی محسوس کی لیکن سننا سب کو چاہئے تھا..... ہاہاہا..... ہنسا ضروری تھا..... اور وہ عورت..... جل روبن اشتائن۔ کیوں غضنفر؟ میں نے تمہیں اس کنارے پر دیکھا کہ تم اچھی خاصی ترقی کر رہے تھے۔ نو بجے دس تو تم جل ہی سے باتیں کرتے رہے؟..... غضنفر

تم اسے برداشت کیونکر کر سکتے ہو...... تمہارے ذوق پر مجھے حیرت ہوتی ہے......"

"یور ہائی نس میں کیمبرج کے زمانے سے اسے جانتا ہوں۔" غضنفر نے کہا۔

"اور جینی، تم اس طرح خاموش بیٹھی رہیں..... جیسے..... جیسے مہاتما گاندھی اپنی خاموشی کے روزے کے دن..... ہاہاہا..... مگر تم کیا کرتیں۔ ایک طرف غضنفر جل سے فلرٹ کر رہے تھے......"

"نہیں، یور ہائی نس" غضنفر نے ہنس کر احتجاجاً" کہا۔

"دوسری طرف" ہر ہائی نس نے اس کی پروا کئے بغیر کہا۔ "نواب صاحب مہارانی کوچ کلاں کو ہز ہائی نس کے حملوں کے بعد ذرا ذرا سے اخلاق کا سہارا دے رہے تھے..... میں نے یہ تو محسوس کیا نواب صاحب کہ آپ بھی ٹیکٹ فل تھے۔ میرے شوہر تو بچاری مہارانی پر توہین کی بوچھاڑ کر رہے تھے۔ میں اب تک اس ہندوستانی مذاق کرنے کے طریقے کی عادی نہیں ہوئی۔ اسی لئے میں اصرار کرتی ہوں کہ ہر دعوت میں کم سے کم ایک بڑے انگریز کا شامل ہونا ضروری ہے۔ میرے شوہر کے لئے بریک کی ضرورت ہے..... کیوں نواب صاحب آپ کو مجھ سے اتفاق نہیں...... خیر اتنا تو آپ مانیں گے کہ بڑا ہی ناکام لنچ تھا۔"

نواب صاحب شاطرانہ سیاست سے بغیر کچھ کہے ہوئے ہنسے۔ اور ہر ہائی نس کو جو چاکلیٹ کھاتی ہوئی لمبے لمبے ڈگ بھرتی اپنی خواب گاہ کی طرف جا رہی تھیں انہوں نے اور غضنفر نے جھک کر سلام کیا۔ ہز ہائی نس نے "خدا حافظ نواب صاحب کہا اور پردے کے پیچھے غائب ہو گئیں۔

اور سال ہی بھر بعد جب غضنفر صبح کو ہز ہائی نس اور ہر ہائی نس کے پاس خبروں کا روزانہ خلاصہ بھیج رہا تھا، جو ہر صبح بھیجا جاتا تھا۔ تو اس نے ایک خبر پر سرخ پنسل سے نشان لگایا۔ خبر یہ تھی کہ "جل روبن اشتائن سے سر ذوالفقار حسین نے شادی کر لی ہے۔

دل ہی دل میں وہ اس خیال سے مسکرایا کہ اس سال جب انو سٹیچر کے لئے دہلی جانا ہو گا تو وائسرائے کے میز پر جل کو ہر ہائی نس کے مقابل بہت اونچی جگہ ملے گی۔ کیونکہ جل کا نمبر فہرست مراتب میں پانچواں ہو گا۔ اور ہر ہائی نس کا اور تمام شہزادیوں اور راجکماریوں کی طرح گیارھواں۔ نواب مطمئن جنگ نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا.... اور

اپنی ریاست کے وزیر اعظم کے ذریعے سے کوشش بھی کی تھی کہ گیارہ سے آٹھ نمبر ہو جائے۔ خطاب کی وجہ سے مگر کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

اور اس زمانے میں جب کہ یہ لوگ لنچ کے میز پر بور ہوتے جاتے تھے اور دوسروں کو بور کرتے تھے۔ جب کہ ان کی زندگی کی سب سے بڑی ٹریجڈی کوئی ناکام لنچ یا ناکام ڈنر تھی۔ براعظم نے ایک خون میں ڈوبی ہوئی انگڑائی لی۔ لیکن ابھی ابتدا تھی۔ ابھی ایک کروڑ آدمی بے گھر نہیں ہونے پائے تھے۔ ساٹھ ستر ہزار عورتیں اغوا نہیں ہوئی تھیں۔

اپریل ۱۹۴۷ء کا دوسرا ہفتہ تھا جب غضنفر وہاں پہنچا۔ آنریبل سر ذوالفقار حسین اب آنریبل نہیں رہے تھے اور صبح کے اخبار نے اطلاع دی تھی کہ وہ مقبولیت عام حاصل کرنے کیلئے ڈیرہ اسماعیل خان گئے ہوئے ہیں۔

غضنفر نے جل کو ٹیلی فون کیا۔ ٹیلی فون پر قہقہوں کا روپہلا سیلاب آیا۔

"کون؟ گز؟ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ پور بوائے؟ کہاں ٹھہرے ہو؟ امپیریل میں؟ ہاں' ہاں' ضرور' ضرور آؤ۔ سنو' آج شام کو کچھ کام ہے۔ آج شام کو؟ تو ڈرنکس کیلئے آؤ۔ مکان تمہیں مل جائے گا؟ پرانی سیکرٹریٹ سے ذرا آگے۔ بند علی مینشن۔ اچھا شام کو چھ بجے کے قریب چیریو۔"

غضنفر نے تانگہ لیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اتنی دور کی لٹخ لٹخ عذاب جان ہو جائے گی۔ جب وہ پہنچا تو شام کا سرمئی رنگ کالا پڑ چکا تھا۔ جل روبن اشتائن مسکراہٹ ہونٹوں کے علاوہ گالوں کی ہر ہر شکن پر کھیلتی ہوئی' ڈرائنگ روم میں آ کے ہلو' کہہ کے صوفے پر دوسری طرف بیٹھ گئی۔ اس کے ہونٹ جوانی کے رس سے چمک چمک کے اب کچھ افسردہ ہو چلے تھے۔ سفید دانت اسی طرح زندہ دل' زندگی سے بھرے ہوئے مگر اب ذرا مصنوعی طور پر "گراں دام" کے آداب اختیار کئے ہوئے۔ لیکن سر ذوالفقار حسین کی بیوی اب بھی انچ انچ جل روبن اشتائن تھی۔ غضنفر نے اسے شادی کی مبارک باد دی۔ اور ادھر ادھر دیکھا تو ڈرائنگ روم یوں ہی سا تھا۔ کوینس وے والے عالی شان مکان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ غضنفر سے پوچھ کے اس کے لئے اس نے وہسکی منگوائی اور اپنے لئے

شیری۔ شیری کا گلاس سنبھالنے میں سلیکس کی شکنیں جا بجا اس کے سڈول جسم پر پڑیں۔

"گزشتہ مرتبہ تم سے دلی میں ملاقات نہیں ہوئی۔" اس نے پوچھا۔

"نہیں گزشتہ سال میں انوسٹیچر کے زمانے میں ساتھ نہیں آسکا۔"

وہ قہقہہ لگا کے ہنسنے لگی۔ "کاش تم وائسرائے کے ڈنر میں موجود ہوتے۔ مجھ سے پانچ نشست پیچھے تمہاری والی ہرہائی نس کی نشست تھی۔ مجھے حیرت ہے کہ ایک لقمہ بھی ان کے حلق سے کیسے اتر سکا۔" اور پھر اس نے ڈنر کی تفصیلات بیان کرنی شروع کیں۔

اور وہسکی اور سوڈا۔

اور باتیں بڑھتی ہی گئیں۔ اب گفتگو کا موضوع نواب امتیاز خاں تھے۔ "غضنفر کیا کیمبرج میں تمہارا اور امتیاز کا ساتھ نہیں رہا؟ نہیں، تو پھر ان کی تم سے کس طرح دوستی ہوئی؟" غضنفر نے لاکھ کہا کہ امتیاز نے کیمبرج میں نہیں آکسفورڈ میں تعلیم پائی۔ مگر وہ اصرار کرتی ہی رہی کہ نہیں اس زمانے میں امتیاز برابر کیمبرج ہی میں تھے۔

ایک اور وہسکی اور سوڈا۔ ایک اور شیری۔ غضنفر نے اپنے آپ کو دفعتا" کوئی اور اجنبی محسوس کرنا شروع کیا۔ گویا اس وقت وہسکی اور سوڈا، اور شیری سے جو حال پیدا ہوا ہے وہی حال ہے اور ماضی اور مستقبل کا وجود نہیں۔

غضنفر سے باتیں کرتے کرتے وہ ٹیلی فون منگواتی ہے۔ "یعقوب ہیں..... جیک..... سنو..... جیک تم میرا ایک کام کر دو گے..... سلی..... اسٹوپڈ" پھر قہقہوں کا سیلاب ابلتا ہے۔ "..... سنو تو میں کیا کہہ رہی ہوں..... میری بہن کیلئے ایک پارسل انگلستان لے جاؤ گے....." وہ ٹیلی فون میں ہنستی ہے اور ریسیور کو نیچے رکھ دیتی ہے۔

وہ پھر امتیاز کا ذکر چھیڑتی ہے۔ اب داستان واضح ہوتی جاتی ہے۔ غضنفر اس کا پرانا ملاقاتی اس کی ہمت افزائی کرتا جاتا ہے۔ وہ اور زیادہ رازدارانہ طرز گفتگو اختیار کر لیتی ہے۔ نئے لیڈر اور پرانے لیڈر کی رقیب آج نئے لیڈر سے گورنر کی ملاقات ہوئی ہو گی۔ نئی وزارت کی تشکیل کے لئے۔ اور اس کا شوہر جو پرانا لیڈر ہے صوبے کا وزیر اعظم بننے سے محروم رہ جائے۔ یہ کون سا انصاف ہے۔

(اور غضنفر اپنے وہسکی کے گلاس سے سرگوشی کرتا ہے، اس طرح کہ جل نہ سننے پائے جو اسے بڑی سرگرمی سے قائل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ جل اولڈ گرل۔ تم

نے بوڑھے آنریبل ممبر سے شادی اسی تقریب میں تو کی تھی تاکہ اپنے صوبے کے وزیر اعظم کی بیوی بنو)

"عوام نہ امتیاز کو پسند کرتے ہیں' نہ نئے لیڈر کو۔ وہ میرے شوہر کو پسند کرتے ہیں۔" سلیکس سڈول جسم پر لہرائے اور عنابی ہونٹوں نے شیری سپ کی۔ "دوسرے لیڈر بھی عام طور پر ان دونوں کو پسند نہیں کرتے۔ میرے شوہر کو پسند کرتے ہیں۔" غضنفر دل ہی دل میں مسکرایا اور سنتا رہا۔ "لیکن نیا لیڈر امتیاز کو پسند کرتا ہے۔ اور تمہیں معلوم ہے کہ نئے لیڈر کی قابلیت کچھ یوں ہی سی...... ول ول..... بوائے صاحب کیلئے اور وہسکی اور سوڈا۔ امتیاز ہی وہ طاقت ہے جو نئے لیڈر کے پیچھے کام کر رہی ہے۔"

بالآخر غضنفر نے کہا۔ "جل' خدا کے لئے..... تمہارے صوبے کے معاملات سے میں اچھی طرح واقف نہیں......"

غضنفر سے اور قریب ہو کے جل نے کہا۔ "گز اولڈ بوائے تم فرخندہ نگر واپس کب جاؤ گے؟"

"ابھی کچھ ٹھیک نہیں۔"

"ابھی کچھ دن تو یہاں رہو گے نا؟"

"ہاں کچھ دن۔"

"امتیاز سے ملو گے نا؟"

"غالباً۔"

"دیکھو گز' محض اس لئے کہ تمہیں اس صوبے کی سیاسیات سے واسطہ نہیں۔ ممکن ہے تمہاری بات کا اثر ہو۔ گز اولڈ بوائے۔ اس سے مل کے اسے سمجھاؤ کہ میرے شوہر' اس کے مخالف نہیں' دشمن نہیں۔ وہ نئے لیڈر کا ساتھ چھوڑ دے تو نئے لیڈر کی ساری حیثیت تاش کے پتوں کی طرح بیٹھ جائے گی۔ امتیاز ابھی جوان ہے۔ تمہاری ہی اتنی عمر ہو گی۔ اور میرا شوہر------ وہ اتنا زیادہ جوان نہیں۔ امتیاز کو میرے شوہر کے بعد صوبے کا وزیر اعظم بننے کا موقع مل ہی جائے گا۔"

جل کی آنکھیں چمک رہی ہیں۔ وہ شیری کا گلاس ختم کرتی ہے۔ یقیناً اس سلسلے میں فرخندہ نگر کے بچارے گز کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ امتیاز کی اس سے بڑی پرانی دوستی

ہے۔ وہ دفعتاً" پھر ٹیلی فون کا ریسیور اٹھاتی ہے۔ نمبر ملاتی ہے "یعقوب' یعقوب..... جیک..... جیک" جیک کا ٹیلی فون پر پتہ نہیں۔ وہ "بلاسٹ ہم" کہہ کے ریسیور پھر رکھ دیتی ہے۔

وہ اٹھ کر کمرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاتی ہے اور ملازم سے جس کے سر پر بڑا سا صافہ ہے کہتی ہے کہ کمرے کے باہر کا دروازہ بند کر دو۔ نوکر شک کی نظروں سے غضنفر کی طرف دیکھتا ہے۔

دروازہ بند کر کے نوکر کھڑکی سے اندر جھانکتا ہوا چلا جاتا ہے۔ جل پھر اپنے صوفے پر آ کر بیٹھ جاتی ہے۔ "غضنفر آج شام تم کیا کر رہے تھے؟ میرا مطلب ہے کہیں جانے والے تھے؟ کہیں نہیں؟..... تو پھر کھانا یہیں کیوں نہ کھا لو۔ اپنی گاڑی کو واپس بھیج دو..... کیا کہا تم تانگے میں آئے ہو؟ میں کہتی ہوں گز تم بالکل پرولتاری ہوتے جا رہے ہو؟..... ہاہاہا..... تانگہ واپس بھیج دو۔ سنو' میں سیکنڈ شو میں سینما جا رہی ہوں۔ تمہیں امپیریل میں چھوڑ دوں گی۔ نہیں سینما ساتھ نہیں۔ سینما ایک اور دوست کے ساتھ جا رہی ہوں۔"

غضنفر کو حیرت ضرور ہوئی۔ یہ کیمبرج والی جل عجیب' بڑی ہی عجیب عورت تھی۔

یہ کھانے کی دعوت تو بالکل ایسی چیز معلوم ہوتی تھی جیسے آلڈس ہکسلے کے کسی ناول میں کسی خاتون کی غیر متوقع ہمت افزائی۔ اس نے دعوت شکریہ کے ساتھ قبول کر لی۔

"گڈ ڈیئر" جل نے معافی چاہی۔ "میں ذرا جا کے نہا آؤں۔ ذرا کپڑے بدل لوں۔"

"ضرور۔"

پہلے وہ بائیں کمرے کی طرف جاتی ہے۔ اس کے شوفر نے مارواڑی پگڑی پہنی ہے۔ اس کو دیکھ کر وہ ہسٹریائی ہنسی ہنستی ہے۔ اور ہنستی ہوئی آ کے یہ خبر غضنفر کو سنا جاتی ہے' جو آہستہ آہستہ وہسکی کے تازہ بھرے ہوئے گلاس کا ایک کش لیتا ہے۔ بالکل سگریٹ کی طرح۔ پھر وہ دائیں کمرے میں جاتی ہے جو غالباً اس کا ڈریسنگ روم ہے۔ جس کے آگے ٹائلز کا غسل خانہ ہے۔ غضنفر دل ہی دل میں دعا کرتا ہے کہ یہ سیکنڈ شو لے جانے والا متوقع مہمان' یہ یعقوب' یہ جیک..... جیک۔ غلام' چڑیا کا غلام..... ہمارے

گنجفے میں بازیٔ غلام نہیں...... یہ جیک آج نہ آئے...... دائیں کمرے کے پار سے ٹب سے پانی سے جل کے جسم کے کھیلنے کی خوشگوار آواز آ رہی ہے۔ وہ ادھر ادھر دیکھ کر کوئی ملازم تو قریب نہیں آنکھیں بند کر کے دونوں ہاتھوں کی بیچ کی انگلیاں قریب لا کے فال دیکھتا ہے' نہیں یہ جیک نہیں آئے گا۔ پھر بھی سوڈا اور وہسکی کے نئے گلاس کے ساتھ غضنفر نے آنے والے مہمان کا تصور قائم کیا۔ ایک نوجوان تیس سال سے کچھ اوپر۔ ذرا تیز قسم کا۔ عین اس وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ شک کرنے والا نوکر جس لہجے میں بات چیت کرتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے یہ جیک ہی ہے "صاحب بڑی دیر سے یہاں آپ کا انتظار ہو رہا ہے" وہ ڈریسنگ روم تک جا کے یہ پیغام اپنی مالکہ کو سناتا ہے۔ پھر ٹیلی فون باتھ روم پہنچا دیا جاتا ہے۔ بالکل اس طرح جیسے امریکی فلموں میں ہوا کرتا ہے۔ غضنفر ٹیلی فون کے لانبے سے تار کو دیکھ رہا ہے۔ ہیڈی لامار یا رتا ہے ورتھ یا کوئی اور "او مٹ گرل" اپنے باتھ ٹب سے اپنے کسی چاہنے والے کو ٹیلی فون کر رہی ہے۔ باتھ ٹب کی طرف سے دلربایانہ محبوبانہ قہقہے کی آواز آتی ہے۔ جیسے سیماب' جیسے پگھلی ہوئی چاندی۔ "کھانے پر آج مت آؤ۔" نہیں تم نہیں آسکتے۔ قہقہہ بجھ جاتا ہے۔ اس کی جگہ عورت کے تلون کی ہسٹریائی چیخ ہے۔ "کیونکہ...... کیونکہ ایک مہمان اور ہے" "کیا؟" "میں سمجھی تم نہیں آؤ گے۔ میں نے اور کسی کو مدعو کر لیا ہے۔" "ہیونز میں کیا کروں تم مجھے پاگل کئے دے رہے ہو...... میں کہہ رہی ہوں کھانے پر کوئی اور مدعو ہے جس سے مجھے ضروری باتیں کرنا ہیں۔ کھانے کے بعد......" "میں کیا کروں۔" لیکن تلون اور ہسٹریا نے ہتھیار ڈال دیئے۔ "اچھا تو پھر سیدھے کشمیری گیٹ کی طرف' پھر اولڈ سیکرٹریٹ۔ پھر سیدھی طرف مڑو' پھر بائیں طرف۔" اور آخر میں دلربایانہ قہقہہ گونجا۔ "ایڈیٹ۔" چھیڑنے والا معشوقانہ قہقہہ "اسٹوپڈ" اور قہقہے زندگی سے بھرے ہوئے' ہر قہقہے سے زندگی کی صحت نمایاں۔ پھر فلم اسٹار' ہیڈی لامار کے باتھ ٹب میں غوطہ لگانے کی مبہم سی سرسرائی ہوئی آواز...... اور غضنفر کے پسینے کی طرح ملازم ٹیلی فون کا ریسیور اٹھائے ہوئے واپس آتا ہے۔

رقیب آ ہی جائے گا۔ غضنفر دل ہی دل میں فیض کی رقیب والی نظم کا ایک آدھ شعر گنگناتا ہے۔ چند ہی منٹ میں ایک موٹر آتی ہے۔ اس نوکر کے ساتھ ایک شخص اندر آتا

ہے۔ عمر چالیس سے زیادہ پچاس کے قریب اور ایسی زبردست صیہونی ناک جو اٹھان میں جمی ڈیورنٹ کی ناک سے کچھ ہی کم ہو گی۔ قطعا" شنوزل وہ اپنے ساتھ وہسکی کی ایک بوتل لایا ہے اور نوکر سے کہتا ہے "ایک بڑا انڈیل دو۔ غضنفر انکار کرتا ہے شکریہ ادا کرتا ہے۔ خاموشی بے معنی خاموشی۔ ناگوار خاموشی۔ غضنفر آنے والے کا جائزہ لیتا ہے۔ اتنے میں نہائی دھلی، مہکتی ہوئی جل آ جاتی ہے۔

"ہلو جیک"

"ہلو جل۔"

غضنفر بچپن کا آموختہ دل ہی دل میں دہراتا ہے۔ جیک اینڈ جل۔ وینٹ اپ دی ہل۔"

"جل، میں.... میں...." جمی ڈیورنٹ کی بڑی سی ناک احتجاجا" بڑا وہسکی میں غرق ہو جاتی ہے۔

"مجھے تعارف تو کرانے دو۔" جل ہلکا روپہلا، کھوٹے روپے کا سا قہقہہ لگاتی ہے۔ عورت ہر ناگوار موقف پر قابو پا لیتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ اس کا تعلق اس کے اپنے ڈرائنگ روم یا کھانے کے میز سے ہو۔

"یہ مسٹر غضنفر علی خاں ہیں۔ فرخندہ نگر کی سول سروس میں کچھ ہیں۔ وہاں عہدوں کے عجیب و غریب نام ہوتے ہیں۔ کیوں گز، اور یہ جیک......"

پھر وہ یعقوب یا جیک کا تفصیلی تعارف کراتی ہے۔ لیکن یعقوب کا اس صدمہ سے جانبر ہونا مشکل ہے کہ راستہ بھٹک کر اس نے موٹر کو غلط سڑک پر موڑ لیا تھا "جل تمہیں معلوم ہے میں بندہ علی روڈ کی طرف بھٹک گیا تھا تم نے کہا تھا بندہ علی مینشن۔ میں سمجھا بندہ علی روڈ۔ میں بندہ علی روڈ کی طرف نکل گیا تھا۔"

اس صدمے کو بھلانے کیلئے وہ بڑا وہسکی کا ایک بڑا سا گھونٹ حلق کے نیچے بڑی تہذیب اور متانت سے اتارتا ہے۔

یعقوب کو اردو بالکل نہیں آتی۔ صرف انگریزی، اور انگریزی بھی نہیں، صرف آکسونین۔

اب بھی جل غضنفر کو سکھا پڑھا کے امتیاز کے پاس بھیجنا چاہتی ہے اور لگے ہاتھوں

یعقوب کے رشک کو بھڑکانا بھی چاہتی ہے۔ وہ اخلاق کو عشوے سے ضرب دے کے حاصل ضرب کو مصلحت پر تقسیم کرتی ہے۔ "جیک تمہاری آج کہیں اور دعوت ہے نا؟ تم کہیں اور جا رہے ہو نا؟" یعقوب کہتا ہے "میں یہ ڈرنک ختم کر کے چلا جاؤں گا۔" بہت بہت شدید آکسونین۔ جل جیک کو اور زیادہ ستاتی ہے۔ معلوم نہیں یعقوب کو غضنفر سے ملانے یا غضنفر سے کچھ دیر "بزنس" کی گفتگو کیلئے۔ غضنفر کو بہرحال لطف آ رہا ہے۔ دفعتاً وہ یعقوب سے کہتی ہے۔ "مگر جیک تمہاری کوئی اور ڈیٹ ہے نا آج؟"

"اس سے کیا تعلق؟" اور جیک بڑا کی باقیات الصالحات کو گلاس میں ہلاتا ہے۔

"تمہاری آج پکاڈلی میں ڈیٹ ہے نا؟"

وہ دفعتاً لگام کھینچ لیتا ہے۔ "میں تو آج یہیں کھانا کھا کے جاؤں گا۔"

رفتہ رفتہ حسین میزبان کو اس کھیل میں شکست ہو رہی ہے۔ غضنفر کو لطف آ رہا ہے۔ ملازمین جو صورت حال کے مستقبل سے واقف ہیں، پہلے ہی سے تین کیلئے میز لگا چکے ہیں۔

بالآخر وہ ایک قہقہے کے ساتھ ہار مان کے کہتی ہے "تو پھر تم ٹھہر ہی جاؤ۔" جیک کہتا ہے۔ "نہیں میں چلا جاؤں گا۔" جل کہتی ہے "نہیں ٹھہرو۔" جاؤ، ٹھہرو، جاؤ، ٹھہرو۔ خالص ترین آکسونین۔ جیک کی بلند و برتر ناک اور اس کا چھوٹا سا دہانہ بہت ناراض ہیں۔ سخت شکایت کے عالم میں۔ بہت بہت ناراض اور بالآخر اخلاق اور عشوے اور مصلحت کی یہ چوسر بازی ختم ہوتی ہے اور جیک کہتا ہے "تم نے مجھے مدعو کیا ہے کہ نہیں؟ میں غلط سڑک..... اس بندہ علی روڈ پر صدیوں تک..... آدھے گھنٹے تک بھٹکتا پھرا۔ اور اب تم کہتی ہو مت آؤ۔ جاؤ میں کہتا ہوں کہ یہ سب بہت غیر معمولی ہے بہت غیر معمولی۔" آکسونین کے ساتھ لمبی اونچی ناک چمک چمک اٹھتی ہے۔

اس درمیان میں غضنفر پس منظر میں غائب ہو گیا ہے۔ بڑی ناکام صورت حال۔ ڈرائنگ روم کی ملکہ جل اسے پھر سے گفتگو میں گھسیٹ لاتی ہے۔ "غضنفر امتیاز کے بڑے دوست ہیں۔ یہ دونوں ہمارے زمانے میں کیمبرج میں تھے۔"

"میں شرط لگا سکتا ہوں کہ امتیاز کبھی کیمبرج میں نہیں رہے۔ وہ آکسفورڈ میں....."

"ہاں وہ آکسفورڈ ہی گئے تھے۔" غضنفر نے توثیق کی۔

"کس کالج میں تھے، آپ کو یاد ہے؟"

"میڈلین" غضنفر نے جواب دیا۔

آکسونین کے کان کھڑے ہوئے "آپ کا مطلب ہے ماڈلن یقیناً ان آٹھ دس برسوں میں تلفظ بدل تو نہیں گیا۔" اب آکسونین کو انتقام کا موقع مل گیا۔ ہم ڈیورنٹ ن ناک شکاری پرندے کی طرح اپنے شکار پر جھپٹی "یقیناً ماڈلن کے قریب کوئی اور کالج تو نہیں بنایا گیا جس کا نام میڈلے اے این ہے؟"

جل بھی اس پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ اس شام کی حد تک جیک نے غضنفر پر مکمل فتح پالی۔ اس کی شام بہرحال تباہ کر دی۔ صرف ایک لفظ کے غیر شائستہ تلفظ کی پکڑ سے۔ اب جل نے بھی تصفیہ کر لیا۔ کھانے کا مہمان خاص جیک ہے۔ گز نہیں۔ اب وہی خاص مہمان ہے جو شوہر کے غائبانے میں آیا کرتا ہے۔ اولیت اسی کو حاصل ہے۔ اس دوست کو نہیں جو شوہر کی طرف سے جا کے پیروی کرے۔ چنانچہ کھانے کے میز پر وہ جیک کو اپنے سیدھے ہاتھ پر بٹھانا چاہتی ہے۔ اور غضنفر کو اپنے مقابل۔ لیکن جیک پکے آکسونین کی طرح شکست خوردہ غنیم سے اخلاق برتتا ہے اور غضنفر کو جل کے سیدھے ہاتھ پر بٹھاتا ہے۔

غضنفر اپنی حسین میزبان جل کو دیکھ رہا ہے۔ اس نوجوان تر و تازہ سیدھی سادی آسٹرین لڑکی سے کتنی مختلف ہے۔ جسے وہ دس بارہ سال پہلے کیمبرج میں جانتا تھا۔ حسین میزبان اس کی بائیں جانب بیٹھی ہے بھرے ہوئے بازو اور عریاں شانے اور پختہ سینہ اور ان سب میں ملی جلی کسی سینٹ کی انوکھی خوشبو۔

جیک ابھی تک سڑک کے غلط موڑ کے صدمے سے جانبر نہیں ہوا اور اگر بندہ علی روڈ پھر بھٹکنے کا ذکر نہیں تو پھر میڈلے والے اے این کالج۔

"بائی دی وے آپ فرانسیسی جانتے ہیں۔"

"آ ے بیاں" یہاں جیک گز کو شکست نہیں دے سکتا تھا۔

تلخی کو اپنی کھانے کے میز سے مٹا دینے کیلئے جل اپنے پہلے فرانسیسی میک اپ کا قصہ مزے لے لے کے سناتی ہے۔ اس میک اپ میں اسے دیکھ کر اس کے انگریز دوستوں کو ایسا صدمہ......

اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ "معاف کرنا" وہ کھانے کے کمرے کے باہر دوڑ جاتی ہے۔ "ہلو" اور پھر وہی کھنکھناتی ہوئی ہسٹریائی معشوقانہ ہنسی۔

جیک سڑک کے غلط موڑ کو نہیں بھول سکتا۔ "اس نے کہا بندہ علی مینشن میں سمجھا بندہ علی روڈ۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس بدبخت شہر میں بندہ علی مینشن اور جگہ ہے اور بندہ علی روڈ اور جگہ۔ بلیزز۔"

اور زیادہ بورنگ آکسونین۔ جب غضنفر اس کے متعلق پوچھتا ہے تو وہ کہتا ہے "فرگٹ اٹ' میں ان بڑے آدمیوں میں سے نہیں۔ میں کوئی نہیں میں کوئی نہیں۔ میرے وزیر ہونے کا کوئی امکان نہیں۔"

وقفہ' مزید آکسونین' جل ٹیلی فون پر قہقہے لگا رہی ہے۔ برنجی' روپہلے سنہرے قہقہے۔ وہ بے صبری سے سوپ پینے لگتا ہے۔ "اس کا انتظار مت کیجئے۔ یہ سب غیر معمولی ہے' بہت غیر معمولی۔"

غضنفر پھر بھی اپنی میزبان کا منتظر ہے۔ سوپ پلیٹ کے حاشیے پر اس کا مونوگرام بنا ہے۔ اسے وہ پڑھتا ہے۔ "جے آر" با آواز بلند۔

"جولیانہ روبن اشتائن۔" غضنفر سے جیک جلدی سے کہتا ہے "اس کی خوشامد میں میں نے ایک آدھ بار کہا تھا۔ جولیانا رے جی نا۔ ملکہ جولیانا۔ لیکن ایسی باتوں سے دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ پلیز اپنا سوپ ختم کیجئے۔ ورنہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ یہ ممکن ہے آدھے گھنٹے تک ٹیلی فون کرتی رہے۔"

آہستہ آہستہ غضنفر نے بھی سوپ پینا شروع کیا۔

"میں جل' جولیانا سے بہت عرصے سے واقف ہوں۔" جیک نے سوپ پیتے پیتے کرکرے توس کا ایک ٹکڑا منہ میں رکھ کے کہا۔ "مجھے اندیشہ ہے کہ یہ دہری زندگی بسر کرتی ہے۔"

وہ پھر سوپ پلیٹ پر جھک گیا اور اپنے الفاظ بڑی رازداری سے زور دے کے دہرائے۔ "یہ دہری زندگی بسر کر رہی ہے۔"

ٹیلی فون پر اور زیادہ ہسٹریائی ہنسی۔ اس کی آواز میں عشوہ اور تنبیہہ ملے جلے ہیں۔ شوخی سے ڈانٹ کے کہتی ہے۔ "ادھر دیکھو۔ میں تم سے ایک بات کہوں میرے

شوہر پرسوں واپس آجائیں گے ' پرسوں۔" اور پھر اور زیادہ عشوہ ریز قہقہے اور آخر میں اختتامی لفظ "ایڈیٹ۔"

پھر جل واپس آجاتی ہے۔ "معاف کرنا آپ لوگوں کو میرا انتظار کرنا پڑا۔" اس کے چہرے پر قہقہوں کی سرخی دوڑ رہی ہے۔ "معلوم ہے کون تھا؟"

"مجھے پروا نہیں" جیک نے جواب دیا۔

"ایڈیٹ" جل مسکرائی۔ چکن اپنی پلیٹ میں لیتے ہوئے اس نے کہا۔ "یہ رائٹر والا انند تھا۔ مجھ سے گورنر اور نئے لیڈر کی گفتگو کی کہانی کہہ رہا تھا..... ہاہاہا۔ گورنر کے ساتھ اتنی لمبی چوڑی اور اتنی اکیلی اکیلی ملاقات آج تک کسی نے نہیں کی۔ ہنستے ہنستے میرے پھیپھڑوں میں درد ہو رہا ہے۔" اس نے ہسٹریائی قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "اتنی لمبی چوڑی اور ایسی اکیلی اکیلی ملاقات۔ اور نئے لیڈر صوبے کے نئے وزیر اعظم نہیں بن سکیں گے، نہیں بن سکیں گے۔" ہسٹریا اور خوش طبعی کے عالم میں اس نے پھر قہقہہ لگایا۔

"ٹیک اٹ ایزی۔" جیک نے جل سے کہا۔ غضنفر کو آکسونین لہجے میں امریکن سلینگ سن کر ذرا تعجب ہوا۔

اور کھانا ہوتا رہا۔ چکن اور پھر ڈزرٹ۔

کھانے کے بعد شوفر کو گھر بھیج دیا گیا۔ "گز' میں اور جیک سینما جا رہے ہیں تمہیں امپیریل پر اتار دیں گے۔ تم سے امتیاز کے متعلق تو گفتگو ہو ہی نہ سکی۔ کل تفصیل سے باتیں کریں گے۔ میں لنچ کے وقت امپیریل میں آجاؤں گی۔"

جیک نے جل سے کہا۔ "تمہارے شوہر کی قسمت پر مجھے رشک آتا ہے ان کی عمر اب کیا ہو گی؟"

"باون" جل ہنستی ہے۔

"مجھے رشک آتا ہے۔ بڑا ہی خوش قسمت آدمی ہے۔"

جل صوفے پر نیم دراز ہے۔ جیک آکے اس کے قدموں کے قریب بیٹھ جاتا ہے۔ غضنفر کو اس کا احساس ہوتا ہے کہ کہیں وہ مخل تو نہیں ہو رہا ہے۔ چھوٹے چھوٹے گلاسوں میں لکر آتی ہے۔

"جل تمہیں جم خانے کی وہ شام یاد ہے؟" جیک کہتا ہے۔

"ہاں۔" جل جواب میں ہنستی ہے۔
"اس روز مجھے سچ مچ تم سے عشق تھا۔"
"ایڈیٹ۔"
"بس صرف بیس منٹ تک۔" آکسونین؟
"جیک تم ایڈیٹ ہو۔" جل آہستہ آہستہ لکر سپ کرتی ہے۔
"یہ بیس منٹ مجھے بار بار یاد آتے ہیں۔"
"اسٹوپڈ" جل کے چہرے پر بڑی خوبصورت مسکراہٹ ہے۔
غضنفر محسوس کر رہا ہے کہ وہ اس راز و نیاز میں خواہ مخواہ مخل ہو رہا ہے۔
جل لکر ختم کر کے اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ "بیچارے گز کو نیند آ رہی ہو گی۔ چلو، ہم تمہیں امپیریل پہنچا دیں۔"
جیک ڈرائیو کر رہا ہے۔ جل اس کے بازو بیٹھی ہے۔ گز پیچھے بیٹھا ہے۔ جل جیک سے مہاراجہ کپور تھلہ کے ڈرائنگ روم کا ذکر کر رہی ہے۔ "یہاں سے وہاں تک عورتوں کی قد آدم برہنہ تصویریں تھیں۔ پانچ منٹ مہاراجہ نے مجھے ان تصویروں کے درمیان تنہا چھوڑا۔ پھر پوچھا کہ ڈرائنگ روم پسند آیا۔ میں نے کہا ڈرائنگ روم تو بہت اچھا ہے لیکن آرٹ کی پسند کی حد تک میرا ذوق اتنا تربیت یافتہ نہیں۔"
امپیریل آ گیا تھا۔ "اچھا" سو لانگ گز ڈیئر، کل لنچ پر۔"
اور جیک نے کہا۔ "ماڈلن کے متعلق وہ ریگ معاف کر دینا۔ گڈ نائٹ۔"
"گڈ نائٹ۔" کہہ کے امپیریل کے باہر کے گیٹ کے سامنے غضنفر اترا۔ سامنے ایک تانگے والے کی لاش کو پولیس کی لاری پر رکھا جا رہا تھا۔ معلوم نہیں کس نے اس کے چھرا بھونک دیا تھا۔ آئندہ ہونے والے فسادوں کیلئے انسان کی پسلیوں پر چھریاں کبھی کبھی تیز کی جاتی تھیں۔
غضنفر کو ابکائی سی آئی۔ ذرا لڑکھڑایا۔ "کاک رابن کو کس نے مارا؟" اس نے پوچھا والٹ ڈزنی کی نقل میں چڑیوں کا ایک کارٹون تھا جو اس نے کئی سال پہلے دیکھا تھا۔
"کاک رابن کو کس نے مارا۔" اس نے سرور کے عالم میں گنگنانا شروع کیا۔
بے اختیار دو نام اس کی زبان پر آ گئے۔ "جیک اور جل۔" مگر ملزموں کی فہرست

مکمل نہیں ہوئی تھی۔ ہوٹل کے کاؤنٹر سے اس نے اپنے کمرے کی کنجی لی۔ اور لڑکھڑاتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اور بھی کوئی ملزم تھا۔ اس نے سرور کے عالم میں سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے الزام کی انگلی اپنی طرف اٹھائی۔

بڑی مشکل سے اس نے ہچکی ضبط کی اور جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

○○

جھُوٹا خواب

کہتے ہیں پہلے یہ میز کا برقی پنکھا تھا، بڑھتے بڑھتے جنگی جہاز بن گیا۔ اس کا رنگ سُرمئی تھا، اور اب تک اس کے نچلے حصے پر آنکھ کی ایک بڑی سی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس کا جاپانی نام کسی سے پڑھا نہ جاتا تھا۔ اس لیے سورابایا میں سب اسے "آنکھ مارو" کہا کرتے تھے۔

میرے جاوی میزبان نے جس کی کشتی میں مَیں اس جہاز کی طرف جا رہا تھا، مجھ سے کہا۔ "جاپانی اس جہاز کو اسی طرح چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔ اب اس میں صرف ہماری سردار زادی اور اس کا اسٹاف رہتا ہے۔"

سردار زادی کو اخبار نویسوں کی ملاقات سے کوئی خاص نفرت نہ تھی۔ مگر اُسے باہر ڈاکٹر سوئیکارنو کی کسی کانفرنس میں شریک ہونے جانا تھا، پھر بھی اس نے کہا کہ وہ مجھے ایک دو منٹ وقت دے سکے گی۔ وہ جب برآمد ہوئی تو گہرے چاکلیٹ رنگ کا چینی تراش کا فراک پہنے تھی۔ مجھے جیسی توقع تھی وہ کچھ ایسی ہی تھی۔ پرل بَک کے ناولوں کے امریکی فلموں میں لوئی رائز اور کیتھرین ہپ برن کے ایک عجیب امتزاج کا نمونہ۔ اس کی آنکھوں کی تراش چینی تھی اور لبوں کی تراش ہندوستانی۔ اس وجہ سے کبھی کبھی وہ ایسی تعلیم یافتہ ہندوستانی لڑکی معلوم ہوتی جو فیشن ایبل تو بہت ہو مگر جس کو اب بھی بزرگوں کی موجودگی میں سر پر ساڑی کا پلّو بار بار ٹھیک کر لینے کی عادت ہو۔

مجھ سے ہاتھ ملا کر وہ کہنے لگی۔" غالباً مسٹر جہازی ؟ مسٹر جہازی میں بڑی خوشی سے آپ کو تفصیلی ملاقات اور سوالات کا موقع دیتی۔ مگر حالات ذرا نازک ہیں مجھے جمہوریت کے صدر سے ملنے جانا چاہیئے۔ ممکن ہے کہ جاپانیوں کا تخلیہ کرانے کے بہانے برطانوی فوجیں بہت جلد اُتر جائیں۔ میں دو تین گھنٹے کے اندر واپس آجاؤں گی۔ اگر آپ انتظار کر سکیں تو ...."

میں سندباد جہازی، رائٹر کا نمائندہ، سَر کے خم سے اس کا شکریہ ادا کر کے مُسکرانے لگا۔ میں ضرور اس کا انتظار کروں گا۔

وہی موٹر بوٹ جو مجھے اس جنگی جہاز "آنکھ مارو" تک لائی تھی، سردار زادی کو دُور چمکتے ہوئے خاکی ساحل کی طرف لے گئی۔ جہاں سُورابیا کی آبادی تھی، اور میرا جادوئی میزبان بھی پُراسرار ملّاح کی طرح اس کے ساتھ غائب ہو گیا۔ صرف سردار زادی کے لباس کی بھینی مدھم خوشبو باقی رہ گئی۔ جو بارش سے نم زمین میں کھلتے ہوئے پھُولوں کی خوشبو کی سی تھی۔

اس کو جا کے ابھی ایک ہی گھنٹہ ہوا تھا کہ قریب کے ایک برطانوی جنگی جہاز سے ایک فوجی کشتی "آنکھ مارو" کی طرف آئی۔ نائب امیرالبحر کے سفید ٹوپی فارم کو میں نے پہچان لیا، آپ سب نے پہچان لیا۔

نائب امیرالبحر نے کوموڈور کے ساتھ پورے جہاز کا ایک چکّر لگایا: "فی الحال اس کو یہیں لنگرانداز رہنے دیں گے۔ میں نے ایک بات سوچی ہے۔ یہ میرے ہیڈ کوارٹرز بننے کے کام آسکتا ہے۔ کیوں کوموڈور ...."

کوموڈور جونز، عہدِ الزبتھ کا ملّاح، جس نے سر والٹر ریلے کے ساتھ بحرِ اوقیانوس کو کھنگال ڈالا تھا، جس نے کیپٹن کُک کے ساتھ آسٹریلیا کا سفر کیا تھا، ایک معمولی ملّاح کی طرح کہنے لگا۔ "آئی۔ آئی۔ سر۔"

"ہمارے جہاز سے میرا اور اپنا سامان منگوالو۔"

"آئی۔ آئی۔ سر۔"

"اور جتنے آدمیوں کی ضرورت ہو۔ آٹھ اِنچ والی توپیں بڑی اچھی حالت میں ہیں۔ میں

جنرل کرسٹی سن سے پوچھوں گا۔ ممکن ہے ضرورت پیش آئے۔ کچھ ہند ایشیائی اور جاوی جہاز پر ہیں۔ جن کی ضرورت ہے انھیں رہنے دو۔ جو خطرناک ہیں، انھیں ساحل پر پہنچا دو یا قید کر دو۔"

"آئی۔ آئی۔ سر۔"

اور پھر دفعتاً اپنی چھوٹی سی عینک کو اپنی ناک پر چڑھا کر اور اوپر سے نیچے تک مجھے دیکھ کے نائب امیرالبحر نے سوال کیا۔ "اور آخر تم کون ہو؟"

"سندباد جہازی۔"

"کیا خرافات؟" ——— میں نے کہا۔ "رائٹر کا ہندوستانی نمائندہ جس کی گردن میں پیر تسمہ پا کا بوجھ ہے جس نے پہاڑ کو دریافت کیا، اور جو اژدہوں کی وادی سے زندہ سلاڈی خوشی واپس آیا۔"

نائب امیرالبحر نے کوموڈور جونز سے کہا۔ "ممکن ہے یہ شخص کارآمد ثابت ہو ——— ہندوستان نے اس جنگ میں دو ہی طرح کے اسلحہ سے ہماری مدد کی ہے ——— گورکھا سپاہی اور انفارمیشن افسر۔ ایک جان بیچتا ہے، دوسرا ایمان۔ اس کو ایک ریڈیو سیٹ، ایک قلم، کچھ کاغذ کچھ تار کے فارم دے دو۔"

"آئی۔ آئی۔ سر۔"

اور امیرالبحر چلا گیا۔ پھر دو گھنٹے ہو گئے۔ تین گھنٹے ہو گئے اور میں ڈرنے ہی لگا کہ کہیں سردار زادی واپس نہ آ جائے۔ وہ ایک بار اگر ان منشورِ اوقیانوس اور والوں کے ہاتھ پھنس جائے تو پھر اس کا ان کے چنگل سے نکلنا ناممکن ہے۔

اس رات مجھے نائب امیرالبحر اور کوموڈور کے ساتھ ایک ہی میز پر کھانے کی عزت بخشی گئی۔ نائب امیرالبحر، قدامت پسند، شریف اور بڑا ہی کم سخن آدمی تھا۔ کوموڈور جونز کا لہجہ کاکنی تھا۔ وہ بھی بات چیت ذرا کم ہی کرتا تھا۔ اس لیے میں ہی بکواس کرتا رہا۔

"جزیرے کی کیا حالت ہے؟"

کوموڈور جونز نے کہا۔ "یہ دنیا کے متموّل ترین جزیروں میں سے ہے۔ دنیا میں سب

سے زیادہ ربڑ اور سب سے زیادہ کونین ..... ۔"

نائب امیر البحر آہستہ سے کھنکھارنے لگا۔ اور کوموڈور جونز خاموش ہو گیا۔ اور پھر نائب امیر البحر نے کہا۔ "ہمیں اس جزیرے کی معاشیات اور سیاسیات سے کوئی دلچسپی نہیں، ہم صرف جاپانیوں کا یہاں سے تخلیہ کرانے آئے ہیں ..... مسٹر جہازی کیا خبریں ہیں؟"

"خبریں؟ ایک خبر بڑی اہم ہے۔ ہمالیہ، قراقرم اور ٹان شان کے شمال میں ریچھ اپنے زخموں کو چاٹ رہا ہے، اور دو لق لق ایک کی گردن، دوسرے کی گردن میں حمائل، آسمان پر، اس کے سر پر اڑ رہے ہیں اور ان کی چونچوں میں ایک تھیلی کے دو ڈور، اور ایک تھیلی میں ایک طاقتور ذرہ ہے، جس میں وہ طاقت اور وہ آگ ہے جس سے آفتاب اپنی قوت حاصل کرتا ہے۔ اور امن کے پیغامبر، یہ لق لق کہہ رہے ہیں کہ اس تھیلی کا منہ بند رکھنا چاہئے۔ ہم اس تھیلی کی دونوں ڈوریاں اپنی ہی چونچوں میں رکھیں گے۔"

نائب امیر البحر کھانا ختم کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ "اچھا حضرات چکن الاترک بڑے مزے کا تھا۔ مجھے کچھ کام ہے۔ کافی میں اپنے کیبن میں پیوں گا۔ گڈ نائٹ۔"

"گڈ نائٹ سر۔" کوموڈور جونز نے کہا۔ اور پھر میں اور وہ چاندنی رات میں ٹہلنے لگے۔ یہاں تک کہ ایک دن گذرا، دو دن گذرے کئی دن گذر گئے اور سردار زادی واپس نہیں آئی۔ اور کبھی میرا ریڈیو اور کبھی کوموڈور جونز مجھے گورکھوں اور جاوا والوں میں جھڑپوں کے قصے سناتے اور میں ٹائمز آف انڈیا، اور اسٹیٹس مین اور اسی قسم کے دوسرے اخبارات کو خبریں بھیجتا۔ میں لکھتا:

"سورابیا۔ فلاں تاریخ۔ انڈونیشیا کے اور برطانوی سپاہیوں میں جھڑپ ہوئی۔ اب جاپانی سپاہی کھلم کھلا برطانوی سپاہیوں کے ساتھ جاوا کے باشندوں کے خلاف لڑ رہے ہیں۔"

اور کوئی طلسمی طاقت بجلی کی لہروں کا گلا گھونٹ دیتی۔ کیوں کہ ہندوستان کے بڑے انگریزی اخباروں میں یہ خبر یوں شائع ہوتی:

جاپانی افسر انڈونیشیا کے نام نہاد "قوم پرستوں" کے قائد ہیں۔

(ہمارے نامہ نگارِ خصوصی، سندباد جہازی، مقیم سُورابیا کے قلم سے)

جب میں ولندیزیوں کے مظالم کی خبریں بھیجتا تو انڈونیشیا کے باشندوں کی بے رحمی کی خبریں چھپتیں۔ اور ایک دن میں نے نائب امیرالبحر سے پھر پوچھا۔

"کیا اب تک جاپانی فوجی قیدیوں کا تخلیہ نہیں ہو سکا؟"

"بریگیڈیر میلابی کے بے رحمانہ قتل کے بعد ......"

لیکن کوموڈور جونز جو، اب امیرالبحر سے زیادہ ہوشیار ہو گیا تھا۔ کہنے لگا۔ "اگر آپ قطع کلام کو معاف کریں، سر۔ ہم اپنے ولندیزی حلیفوں کو کیسے دغا دے سکتے ہیں"۔

نائب امیرالبحر زیادہ تر باہر رہتا، اور اب "آنکھ مارو" کی توپیں گرجنے لگی تھیں۔ ہر گرج کے بعد جو شعلہ توپ کے دہانے سے نکلتا اس کو میں سُورابیا کے شہر میں ایک دھماکہ بنتے اپنی آنکھوں سے دیکھتا چیخوں کی آواز ہوا کی ایسی مدھم لہروں پر آتی کہ سوائے میرے کسی کو سُنائی نہ دیتی۔

اور آخر، ایک دن میں نے کوموڈور جونز سے دوپہر کے کھانے کے بعد پوچھا۔

"کوموڈور۔ اس انتخاب میں تم نے قدامت پسندوں کے لیے رائے دی ۔ یا مزدوروں کے لیے"۔

"مزدوروں کے لیے"۔

اور پھر وہ بے معنی نظروں سے سمندر کی نیلی اُٹھتی ہوئی موجوں کی طرف دیکھنے لگا اور پھر ایک بے معنی خاموشی چھا گئی۔ اس خاموشی کو تین طیاروں نے توڑا۔ جو سُورابیا پر بم گرا رہے تھے۔

میں نے پھر سوال کیا۔ "کوموڈور تم کس شہر کے رہنے والے ہو؟"

"کاونٹری" اس نے موجوں کے جھاگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ سُورابیا سے ایک زور کے دھماکے کی آواز آئی۔ اور کوموڈور نے چیخ کر کہا۔ "آسمان کے لیے چُپ ہو جاؤ۔ تم میرے اعصاب پر ......"

"آئی۔ آئی۔ سر"۔

اور دو ایک گھنٹے کے بعد "آنکھ مارو" کی توپیں پھر گرجیں۔ پھر سُورابیا سے دھوئیں کے بادل بلند ہوئے۔ پھر حاملہ عورتیں اور بچے لاشیں بن گئے۔ پھر کسی کی ٹانگ اُڑ کے کسی درخت کی ٹہنی سے جا اٹکی۔ پھر کسی کا ہاتھ اُڑ کے کسی خندق میں جا گِرا۔"

"کوموڈور۔"

"کیوں ؟ اب کیا ہے ؟"

"تمھارا لائق نائب امیرالبحر کی طرح کسی مے فیر یا ویسٹ اینڈ کے خاندان سے تو نہیں ہے ؟"

"نہیں میرا باپ مزدور تھا۔ میرا دادا کوئلے کی کان کھودتا تھا۔ اور کوئلے کی کان میں دب کے مرا۔ میرا پَر دادا ... ... اوہ چُپ کرو۔ تم ہندوستانی ... ..."

اور وہ مجھ سے چند قدم ہٹ کے جہاز کے عرشے کے آہنی کٹہرے کے پاس کھڑا ہو کے وہ زور سے پائپ کا کش لینے لگا۔ میں اس کے پاس گیا تو وہ ہٹ کے دوسرے کٹہرے کی طرف چلا گیا۔ اور میں، سندباد جہازی، جس کی گردن نے پیر تسمہ پا کا بوجھ سنبھالا تھا اس سے کہنے لگا۔ "تم کوموڈور جونز، تم ارنسٹ بیون ان موجوں کے جھاگ میں کب تک چھپو گے۔ ان موجوں کے اس پار آسٹریلیا ہے، یہاں کے بندرگاہوں کے مزدور۔"

"مجھے معلوم ہے۔ مجھے معلوم ہے۔" اس کا موٹا دبیز چہرہ پسینے سے تر ہونے لگا۔ "مگر ہمارے ولندیزی حلیف ... ..."

"اور ان موجوں کی دوسری طرف ہندوستان ہے، یہ ایک بہت بڑا قبرستان ہے جہاں چالیس کروڑ مُردے دفن ہیں۔ اور سب مُردے بھوت بن گئے ہیں۔ اور اس بات پر جھگڑ رہے ہیں کہ قبرستان کے دو ٹکڑے ہو سکتے ہیں یا نہیں ہو سکتے۔ میرے دوست کوموڈور جونز تمھیں اپنے ولندیزی حلیفوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ تم اس قبرستان میں اپنی انگور کی بیلوں کو ہمیشہ کی طرح اُگانا چاہتے ہو ... ..."

ہماری خارجی حکمتِ عملی میں تسلسل ہے۔ قدامت پسند ہوں یا خارجی مزدور، خارجی حکمتِ عملی کے تسلسل کو ... ..."

اس رات چاندنی سمندر کے نیلے حسن پر بھی پڑی، اور سورابیا کے بڑھتے پھیلتے ہوئے قبرستان پر بھی، نائب امیرالبحر آج "آنکھ مارو" پر نہیں آیا تھا۔ اور کوموڈور مجھ سے، میری صورت سے بیزار، عرشے پر الگ ٹہل رہا تھا کہ میں نے ساحل کے قریب ایک آہٹ سی سُنی۔ چاندنی کے طلسم سے خاکی ساحل سمٹ کر جہاز کے بالکل قریب آگیا تھا۔ اور پھر میں نے نومبر کی ہوا کی خنک لہروں پر سردارزادی کے لباس کی بھینی مدھم خوشبو کو محسوس کیا۔ جو بارش سے نم زمین میں کھلتے ہوئے پھولوں کی خوشبو کی سی تھی۔

ساحل پر جو کھنچ کے جہاز سے بہت قریب پہنچ گیا تھا، وہ چاندنی میں گہرے چاکلیٹ کے رنگ کا چینی تراشں کا فراک پہنے نظر آئی۔ اس کی آنکھوں کی تراش چینی تھی، اور میں ڈرنے لگا کہ اگر کہیں وہ جہاز پر آگئی تو اس کا گرفتار ہوجانا یقینی ہے، اور میں چاہتا تھا کہ اسے اشارے سے منع کردوں۔ میں نے ذرا پیچھے ہٹ کر دیکھا تو کوموڈور عرشے کے قریب اسی طرح ٹہل رہا تھا۔

سردارزادی کے ہاتھ سے ایک پرندہ اُڑا۔ یہ شاہین یا شہباز نہیں تھا۔ جو مغل اور ترک اور ایرانی بادشاہوں کے ہاتھ سے اُڑا کرتا تھا۔ یہ ایک ہُدہُد تھا۔ لمبی چونچ والا کٹھ پھوڑ۔ اور اس کے پنجوں میں، پروں میں نجاری کے تمام اوزار تھے۔

اور وہ جہاز کے ایک کیبن کی فولادی دیوار کو اپنی لمبی چونچ سے کھُٹ کھُٹ توڑنے لگا۔ اس آواز سے کوموڈور کے کان چوکنے ہوئے۔ میں نے اُسے پھر باتوں میں لگانے کی کوشش کی۔ "منشورِ اوقیانوس کا غالباً یہاں اطلاق نہیں ہوتا۔ یہ تو بحرالکاہل ہے۔ اور منشورِ اوقیانوس ان ملکوں کے لیے ہے۔ جن کے ساحلوں کو اوقیانوس کی لہریں دھوتی ہیں ...."

کوموڈور نے اس طرف آکے اس "کھُٹ کھُٹ" کی آواز کی تحقیق کرنی چاہی۔ میں نے کہا۔ یہ آواز نائب امیرالبحر کے کیبن کے اندر سے آرہی ہے۔ وہ کیبن کے اندر چلا گیا اور میں باہر آکے ہُدہُد کو دیکھنے لگا۔ نائب امیرالبحر کے کیبن اور جہاز کی بیرونی آہنی دیوار کے درمیان دو فیٹ کی ایک پتلی سی گیلری تھی۔ ہُدہُد نے اس گیلری میں اس سوراخ سے، جو اس نے فولادی دیوار میں اندر آنے کے لیے بنایا تھا، اور کیبن کی دیوار کے سوراخ کے درمیان، ہلکے نارنجی کاغذ کا ایک چوخانہ ناستہ سا بنا لیا تھا۔ اور اس خانے میں چھپا ہوا، وہ خود نظر نہ آتا تھا۔

کوموڈور نے کہا۔" وہاں نائب امیرالبحر کے کیبن میں تو کچھ بھی نہیں۔ پھر اس نے کاغذ کے اس چوخانے کی طرف دیکھا جو کسی عجیب چینی قندیل کا فانوس معلوم ہوتا تھا، اور اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی اور پھر مجھ سے کہا۔" چلو نائب امیرالبحر کے کیبن میں بیٹھیں۔ میں نے کچھ برانڈی اور گرم پانی منگوایا ہے۔"

لیکن کوموڈور کے بشرے سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے شک ضرور ہے۔ اور مجھے وہ کسی قسم کے جرم میں شریک سمجھتا ہے۔

ہم دونوں نائب امیرالبحر کے کیبن میں آئے۔ یہاں سردارزادی کا سارا زیور تھا۔ زیور نائب امیرالبحر نے ایک شیشے کے شفاف صندوق کی تہ میں رکھا تھا۔ صندوق کی تہ میں سب ہی طرح کے زیور تھے۔ موتیوں کا ایک ست لڑا ہار تھا۔ جس کی قیمت کم سے کم دس ہزار ہوگی، اور جواہرات کی مختلف چیزیں۔ شیشے کا صندوق اوپر سے ملا ہوا تھا، اور اس میں پانی بھرا ہوا تھا، اور پانی میں چھوٹی چھوٹی سنہری مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ میں اور کوموڈور دونوں بیٹھے برانڈی پی رہے تھے کہ ہدہد کی کھٹ کھٹ کرنے کی آواز بند ہوگئی۔ جواہرات کے اس شیشے کے صندوق سے ایک طلائی گولی، جس کا قطر ایک انچ سے بھی کم ہوگا، ایک مقناطیسی قوت کے ساتھ آہستہ آہستہ اوپر بلند ہونا شروع ہوئی۔ یہ گولی کوڑیالے سانپ کی جلد کی طرح طلائی چیتوں سے ترشی ہوئی تھی اور یقیناً زیور میں شامل نہیں تھی۔ وہ آہستہ آہستہ کسی طرح کے مقناطیسی جذب کی وجہ سے بلند ہو رہی تھی، اور زمین کے جذب کے مقابل اونچائی کا جذب اسے کھینچ رہا تھا۔ کوموڈور تو کیا یہ طلسم خود میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اور میں سوچتا رہا کہ یہ گولی کس چیز کا طلسم ہے۔ اس کا رمز کیا ہے؟ آزادی؟ عفت، انسانیت؟

ہدہد نے اپنی لمبی چونچ سے کھٹ کھٹ۔ کھٹ کھٹ کر کے جو سوراخ آہنی پتر میں کیا تھا، اس میں یہ گولی غائب ہوگئی، اور بت میں اور کوموڈور دونوں اپنی حیرت پر غالب آئے۔ وہ جلدی سے جہاز کے دروازے کی طرف بھاگا۔ اور اس کے ساتھ میں ساحل لکڑی کی ایک پرانی وضع کی کشتی، ڈونگے جیسی کشتی بن گیا تھا۔ جس پر لکڑی کا ایک بدوضع کیبن تھا۔ میں نے خیال کیا کہ سردارزادی اس میں ہوگی، مگر وہ شاید کیبن کے اندر تھی،

نظر نہیں آئی۔ ایک ادھیڑ عمر کی جاوی عورت، جس کے انداز سے بڑے وقار کا اظہار ہوتا تھا، کیبن کے باہر کھڑی تھی۔ ایک شعلہ چمکا، جیسے جوہری بم کی تابش دو مکعب فیٹ میں محدود ہو گئی ہو۔ ہُد ہُد اس کشتی اور کیبن تک پہنچ چکا تھا۔ ایک ملاح نے جو فلم میں کام کرنے والے ایکٹروں کی طرح مُنہ پر روغن لگائے ہوئے تھا، آگے بڑھ کر بانس کو جنگی جہاز "آنکھ مارو" کے فولاد سے اُڑا کے اپنے لکڑی کے ڈونگے کو سمندر میں تیرا لیا۔ اور میں، سندباد جہازی، جس نے یک چشم دیو کو یکے بعد دیگرے انسانوں کو سیخ پر بھُون کے کھاتے دیکھا تھا، ڈرا۔ اور فرطِ حیرت سے کھڑا کا کھڑا ہی رہ جاتا۔ مگر میں نے کوموڈور جونز کو حرکت کرتے دیکھا، اور ڈرا کہ ایک توپ کا گولہ اور یہ چوبی کشتی ہمیشہ کے لیے سمندر کی تہ میں جا بیٹھے گی مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ ڈاکٹر نے میرے لیے مچھلی کا تیل تجویز کیا تھا؛ جو مجھ سے پیا نہ جاتا تھا اور میں بالاخانے سے پیچھے کی طرف روز ایک چمچہ تیل پھینک دیا کرتا تھا یہاں تک کہ بڑے بھائی نے میری چوری پکڑلی۔ اور میں نے ان سے منّت کر کے کہا۔ والد سے اس کا ذکر نہ کیجیے گا اور میری منّت سے وہ مان گئے۔ اور انھوں نے کہا۔ اس پر مٹّی ڈال دو۔ ورنہ ایک نہ ایک دن مچھلی کے تیل کی بُو سے والد کو معلوم ہو ہی جائے گا۔ اسی طرح میں کوموڈور جونز کی طرف پلٹا۔ اس کے دونوں بازوؤں کو مضبوطی سے پکڑ کے میں نے کہا: "جونز، میرے رفیق، میرے بھائی، تم کہتے ہو تمھارے باپ، تمھارے دادا مزدور تھے، میں تم سے صرف ایک درخواست کرتا ہوں، اس چوبی کشتی کو نکل جانے کی صرف دو دن کی مُہلت دو۔ اگر یہ بچ گئی تو اچھا۔ ورنہ دو دن کے بعد اگر پیچھا کرتے میں یہ تمھیں نظر آگئی تو اسے ڈبو دینا۔ یا نائب امیرالبحر سے اس کا ذکر کر دینا۔ دو دن کی مُہلت دو۔ صرف دو دن کی۔"

کوموڈور جونز نے غصّے اور بے صبری سے اپنے بازوؤں کو میری گرفت سے چھڑاتے ہوئے کہا: "میں دو دن نہیں، تین دن کی مُہلت دینے کو تیار ہوں، مگر یہ کشتی بچ کے زیادہ دُور نکلنے نہیں پائے گی۔ دیکھتے ہو یہ کشتی دراصل جہلم کا ڈونگا ہے۔ خیر دو دن سہی۔ مگر دو دن کے بعد میں نائب امیرالبحر کو اطلاع دے دوں گا سمجھے؟ یہ میرا

فرض ہے۔"

اور مَیں سند باد جہازی، جس کی گردن نے پیرِ تسمہ پا کا وزن برداشت کیا تھا، سوچنے لگا۔ یہ جہلم کا ڈونگا بحرالکاہل میں کیسے آ سکتا ہے۔ مگر چوبی کشتی کے تختے جہلم کے ڈونگوں کے تختوں کی طرح سوکھے اور کھردرے تھے اور وہی لمبے لمبے سیاہ کیلے۔ یقیناً یہ سب خواب ہے۔ مگر میری پلکیں گُتھ گئیں۔ مَیں نے آنکھیں کھولنا چاہیں۔ اور کسی نے پپوٹوں کو گوند لگا کے چپکا دیا۔ اور مجبوراً پھر مَیں خواب کی دنیا میں واپس جا کے اپنی ڈائری لکھنے لگا۔ ہر روز فل اسکیپ سائز کا ایک صفحہ اور ایک دن خیال آیا ان صفحوں کو گِننا چاہیئے۔ اور مَیں نے گِننا شروع کیا۔ ایک صفحہ فی روز کے حساب سے دو دن نہیں، تین دن نہیں، تین دن نہیں، بائیس دن نہیں، تینتیس دن ہو چکے تھے۔ اور اب تک کوموڈور جونز نے نہ اس چوبی کشتی کا تعاقب کیا تھا، نہ امیرالبحر سے اس کا ذکر کیا تھا۔ مگر یہ تو غالباً خواب تھا۔۔۔ ... اور خواب اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔

○○

پوشامالن

رات کے ڈیڑھ بجے تک ڈاکٹر قربان حسین پٹ بستر پر کروٹیں بدلتے رہے اور انھیں نیند نہ آئی۔ مقابل کھڑکی کے سفید حلبی شیشوں کے پَٹ کھُلے ہوئے تھے۔ چاند نیم سفید بدلیوں کے ظلم کا شکار، تالاب کے پانی پر چمک رہا تھا اور تالاب پر ہوتی ہوئی خنک، فرحت بخش ہوا کے جھونکے تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کھُلی ہوئی کھڑکی سے داخل ہو کے ڈاکٹر قربان حسین کو تسلّی دیتے۔ اس بارش میں تالاب کا پانی، پھر اُن کے باغ میں گھُس آیا۔ تالاب کی سرحد میں پائیں باغ لگانا، یہ بھی تو ڈاکٹر صاحب کی زیادتی تھی۔ اس باغیچے کی سرحد پر جولیموں کے درخت تھے۔ وہ اکثر تالاب کی یورش کے زمانے میں سُوکھ جاتے۔ لیکن بارش کے بعد جاڑوں ہی کے زمانے میں کچھ آفتاب اور کچھ تالاب کے بند کے اُس طرف کی نشیبی زمین کے کھیت اپنا خراج طلب کرتے اور تالاب معافی مانگتا ہوا ڈاکٹر قربان حسین کے باغ سے کھِسکنے لگتا۔ وہ چٹانیں جو بارش کے زمانے میں تالاب میں غرق ہو جاتیں۔ اب آہستہ آہستہ سَر نکالتیں۔ پھر کمر تک باہر نکل آتیں اور رفتہ رفتہ پانی اُن کے قدموں کو چھُوتا ہوا پَرے ہٹ جاتا اور دوسرے سال کے مرگ کے وقت تک کبھی کبھی یہ تالاب بالکل ہی خشک ہو جاتا۔ دھوبیوں کے گھاٹ ویران ہو جاتے۔

ڈاکٹر قربان حسین اُن لوگوں میں تھے جو کرشن پلّی کی نو آبادی میں سب سے پہلے منتقل

ہوئے۔ حیدرآباد کے جدید فنِ تعمیر میں جن لوگوں نے نت نئی ندرتیں داخل کیں۔ اُن میں ڈاکٹر قربان حسین بھی شامل تھے۔ ان کے کئی مکانات تھے۔ مکانات میں مُدوّر برج کی ضرورت کو سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب موصوف نے محسوس کیا تھا اور اب تو یہ حال ہے کہ حیدرآباد کے ہر" جرمن ڈیزائن" کے مکان میں ایک مُدوّر برج یا مُدوّر کمرا ضرور ہوتا ہے۔ اس دائرے یا نیم دائرے سے مکان کے خطوطِ مستقیم اور زاویہ ہائے قائمہ کی یکسانی میں ذرا کمی آتی ہے۔ ڈاکٹر قربان حسین صرف معمارِ اعظم ہی نہ تھے۔ وہ بڑے جہاندیدہ اور جہاں گشت آدمی تھے۔ اپنے پائیں باغ اور تالاب کی سالانہ جنگ میں وہ اکثر سویڈن کی جھیل نارشپنگ کا نغمہ سُنتے، جہاں انھوں نے کئی ماہ قیام کیا تھا۔ وہ تاشقند میں اُس زمانے میں موجود تھے جب ازبکستان کی جمہوریت شوریٰ نے تصفیہ کیا کہ ازبک زبان روسی رسم الخط میں لکھی جائے۔ اس تبدیلی سے وہ خوش نہیں تھے۔ قدامت پسندی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ روسی رسم الخط اختیار کرنا، ایک آزاد جمہوریت شوروی کا خود ارادی فعل نہیں ہوسکتا۔ جاوا میں انھوں نے وہاں کے باشندوں کے ناچ دیکھے تھے۔

یہ اُن کی زندگی کا وہ پس منظر تھا۔ جس سے قربان حسین کے بہت سے مداح ناواقف تھے۔ کیوں کہ ڈاکٹر صاحب موصوف ہندوستانی مسلمانوں میں اپنی قابلیت اور اپنی جدّت کی وجہ سے بڑی شہرت رکھتے تھے اور زیادہ تر لوگ اُن کے نام سے ان کی تصانیف یا اُن کے نظریوں کی وجہ سے واقف تھے۔ صرف چند دوستوں کو، تالاب کے کنارے اُن کے مکان کی ان خصوصیات کا علم ہے۔

اس رات ڈاکٹر قربان حسین کی شب بیداری کی وجوہات بظاہر بہت زیادہ اہم نہ تھیں۔ کسی نامعلوم سبب سے اُن کے تمام ملازمین نے تنخواہ کی زیادتی کا مطالبہ کیا تھا۔ وہ اسپتال سے تھکے ماندے آئے تھے کہ انھیں ایک محضر ملا، جس پر تمام ملازمین کے دستخط یا انگوٹھوں کے نشان تھے۔ اس محضر نے ڈاکٹر صاحب موصوف تک یہ خبر پہنچانا چاہی تھی کہ تقریباً چار سال سے دُنیا میں ایک عالمگیر جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ جس کی وجہ سے اشیاء بہت گراں ہیں یا تو سب نوکروں کی تنخواہ میں اضافہ کیا جائے یا سب کو اجازت دی جائے کہ اُن کی نوکری

چھوڑ کے اور فوج یا متعلقہ کارخانہ جات میں بھرتی ہو کے سرکار عالی یا سرکار عظمت مدار سے رزق یا موت طلب کریں۔ یہی درخواست اگر زیادہ معقولیت سے پیش کی جاتی تو ڈاکٹر قربان حسین فوراً تمام ملازمین کی تنخواہ بڑھا دیتے۔ کیوں کہ اور تمام کنواروں کی طرح ڈاکٹر صاحب بے حد فراخدل تھے۔ لیکن یہ دھمکی یا الٹی میٹم کا انداز انھیں بالکل پسند نہ آیا۔ تاشقند میں رسم الخط کے معاملے میں انھیں ماسکو کا دخل در معقولات پسند نہ آیا تھا۔ یہ تو اُن کے گھر کا معاملہ تھا۔

انھوں نے تنخواہوں کو بڑھانے سے انکار کر دیا اور سب نوکروں کو بیک جنبش موقوف کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں رات کا کھانا راک ویو ہوٹل میں کھانا پڑا۔ وہاں سے واپس ہوئے تو حلق میں خراش محسوس ہوئی۔ کوئی آدمی ایسا بھی نہ تھا جو غرارے کے لیے پانی گرم کرتا۔

رات بھر وہ اپنے نوکروں کی اس ہڑتال پر غور کرتے رہے اور رفتہ رفتہ اُن پر یہ سارا راز ظاہر ہونے لگا۔ ہو نہ ہو۔ یہ اُس پوشا مالن کی کارستانی ہے جو باغ خاص میں ملازم ہے، اور جو ڈاکٹر صاحب موصوف کے برطرف شدہ مالی ناگا کی بیوی ہے۔ رات کے ڈیڑھ بجے اُٹھ کے ڈاکٹر صاحب نے بجلی کا بٹن دبایا۔ اپنا ڈریسنگ گون پہن کے لائبریری والے کمرے میں پہنچے اور نواب مطمئن جنگ بہادر ناظم باغ خاص و باغات خاص دیگر ممالک محروسہ سرکار عالی کے نام ایک نیم سرکاری خط لکھا۔ جس کا متن یہ ہے:

"تالاب منزل
کشن باغ
حیدرآباد۔ دکن
مورخہ ۲۲ آبان ۱۳۵۲ فصلی

عزیزی نواب صاحب

مَیں افسوس کے ساتھ آپ کو اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ آج میرے یہاں نوکروں میں جو شورش ہوئی ہے۔ اس کی محرک ایک مالن ہے جو باغ خاص میں ملازم ہے۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ میرے مالی ناگا کی بیوی پوشا مالن اس مصیبت کا باعث ہے۔ حال حال میں وہ باغ خاص کے بڑے مالی کی منظورِ نظر بن گئی ہے۔ اُسی نے میرے نوکروں کو بھڑکایا کہ وہ اُس کا مطالبہ کریں کہ

انھیں بھی سرکاری نوکروں کے برابر تنخواہ دی جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے اس پوشا مالن کے شوہر ناگا مالی، اور اُس کے ساتھ اور تمام نوکروں کو برطرف کردینا پڑا۔ حالانکہ اس وجہ سے کام کی بڑی سخت تکلیف ہے۔

اس واقعہ سے ہم سب کو عبرت حاصل کرنی چاہیئے۔ مجھے اُمید ہے کہ میرے دوست اور خیر خواہ ان شورش پسند لوگوں پر نگرانی رکھیں گے اور اُن کے ساتھ کوئی رعایت نہ کریں گے

اس مقدمے کو میں آپ کے علم میں اس لیے لا رہا ہوں کہ آپ جو سزا یا جُرمانہ مناسب سمجھیں، عاید فرمائیں۔

مَیں اس تکلیف دہی کی معافی چاہتا ہوں۔

مخلص

قربان حسین"

۲

نواب مطمئن جنگ بہادر ہر مسودے کی پانچ مرتبہ اصلاح کیا کرتے تھے۔ پانچویں اصلاح کے بعد مسودہ اصلاح سے پہلے کے، یعنی سب سے پہلے مسودے کی صورت اختیار کرلیتا۔ ان اصلاحوں کا مقصد محض احتیاط تھا۔ پہلے یہی حکم ہوا تھا کہ نواب صاحب موصوف کو محتاط جنگ کا خطاب عنایت فرمایا جائے۔ لیکن چونکہ اطمینان احتیاط کا نتیجہ ہے ،اور موصوف کا نام بھی اطمینان خاں تھا۔ اس لیے مطمئن جنگ کے خطاب سے سرفرازی ہوئی۔

نواب مطمئن جنگ باغ خاص کی ایک بارہ دری میں اجلاس فرماتے تھے۔ اجلاس کے حصّے میں دروں کو نہایت اعلیٰ درجے کی اخروٹ کی لکڑی کی اوٹ سے بند کردیا گیا تھا جس حصّے پر اجلاس ہوتا تھا۔ اس پر پہلے تو شاہ آبادی فرش پر ایک شطرنجی بچھی تھی۔ پھر شطرنجی کی جگہ قالین بچھایا گیا۔ پھر قالین اٹھا دیا گیا اور شاہ آبادی فرش کی جگہ سنگِ مرمر کا فرش ہوا اور بالآخر وزیر اعظم سلطنتِ برطانیہ کی تشریف آوری کے موقع پر ترمیم و تعمیر کے لیے جس رقم کی منظوری ہوئی تھی۔ اُس کی بنا پر یہ سنگِ مرمر کا فرش بھی بدل دیا گیا اور اُس کی جگہ ٹائلز بچھائی گئیں۔ ہر مسودے کی طرح فرش کی بھی پانچ مرتبہ اصلاح ہوئی۔

اطمینان کے اور احتیاط کے اصولوں پر پوری طرح عمل کرنے کی وجہ سے نواب مطمئن جنگ کا حیدرآباد بھر میں کوئی دشمن نہ تھا۔ اور دوست بہت کم تھے۔ انھوں نے سوائے چپراسیوں پر آٹھ آنہ جرمانے کے کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ جب کوئی ان سے ناراض ہوتا تو وہ حسنِ اخلاق یا حسنِ مذاق سے اُسے رام کر لیتے۔ انھیں کبھی غصہ نہ آتا۔ اور اگر کسی اور کو اُن کے سامنے غصہ آتا تو اُن کے حسنِ اخلاق کی وجہ سے فوراً اُتر جاتا۔ خود بہت محنت سے کام کرتے۔ ہر کارروائی کو اس تفصیل سے سر انجام دیتے کہ لبسا اوقات کام کا وقت گذر جاتا۔ ہر مراسلے کی چار پانچ نقلیں برائے اطلاع اپنے ماتحتین یا دوسرے غیر متعلقہ عہدہ داروں کو ضرور بھیجتے۔

نواب صاحب کی پیشی کا منتظم جُھک کے آداب بجالایا اور کاغذات پیش کرنے لگا۔ طرح طرح کی مثلیں، مالیوں کی خطاؤں اور تقررات اور تبدیلیوں سے لے کے ماہرین نباتیات کی تحقیقات کی رپورٹوں تک کے متعلق ہر مثل پر تجویز ہوتی۔ اور کاٹ جاتی اور پھر تجویز ہوتی۔ بالآخر ڈاکٹر قربان حسین کا خط پیش ہوا۔ جس کا جواب نواب صاحب نے فوراً اسٹینوگرافر کو تحریر کرایا۔ گھومنے والی کرسی گھما گھما کے اپنے ماتحتین سے اُس کی داد طلب کی اور بالآخر پانچویں اصلاح کے بعد یہ جواب ڈاکٹر قربان حسین کو بھیجا۔

"باغِ خاص

۲۴؍ آبان ۱۳۵۳ف

عزیزی قربان حسین

آپ کے مراسلہ نوشتہ ۲۲؍ آبان ۱۳۵۳ف کا بہت بہت شکریہ۔ جو آپ نے ازراہ عنایت روانہ کیا ہے۔

بدقماش عورتوں کی سازشیں کئی سلطنتوں کو تباہ کرنے کا باعث ہوئی ہیں اور آپ کو تو علم ہی ہے کہ ٹرائے کی لڑائی کی وجہ ہیلن آف ٹرائے کے حسنِ جہاں سوز کی کشش قرار دی جاتی ہے۔ اگر کبھی مالن نے جو باغِ خاص میں ملازم ہے۔ آپ کے گھرانے کے نوکروں میں انقلاب برپا کر دیا تو اُسے اُس کی داد ملنی چاہیئے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ اس واقعے کو زیادہ اہمیت نہیں دیں گے۔ اور اگر یہ واقعہ اور زیادہ سنجیدہ اور خطرناک صورت اختیار کرے تو آپ اس میں مزاحمت

نہ فرمائیں کہ پوشامان کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں آجائے۔ اگر ایسے روشن ابواب ہماری زندگی کی تاریکی کو کم نہ کریں تو یہ غیر دلچسپ دُنیا رہنے کے قابل نہ رہے گی۔ مجھے اُمید ہے کہ مکرّر غور کے بعد آپ میری رائے سے اتفاق کریں گے۔

مہربانی کے احساسات کے ساتھ

آپ کا مخلص

مطمئن جنگ"

[نواب صاحب کے پیشی کے منتظم کا بیان ہے کہ پانچویں اصلاح سے قبل نواب صاحب نے قربان حسین کو عزیزی ڈاکٹر قربان حسین صاحب لکھا تھا۔ لیکن ان سے بے تکلفی کا اظہار کرنے کے لیے اور اُنھیں بزرگانہ تسلی دینے کے لیے 'ڈاکٹر' اور 'صاحب' کے الفاظ کاٹ دیے۔ اسی طرح "مہربانی کے خیالات کے ساتھ" والا فقرہ تیسری اصلاح میں بڑھایا گیا اور چوتھی اصلاح میں بدل کے "مہربانی کے احساسات کے ساتھ" بنا دیا گیا۔ نواب مطمئن جنگ بہادر نے پانچویں اصلاح کے بعد جب خط کے مبیضے پر دستخط فرمائے۔ تب بھی پیشی کے منتظم سے فرمایا "یہ جملہ اب بھی مجھے ذرا کھٹک رہا ہے۔ مگر اب چلنے بھی دو۔ اس خط کا جواب لکھتے لکھتے دو دن گذر گئے ہیں۔ مزید تعویق مناسب نہیں" منتظم صاحب نے یہ تعمیل حکم خط کو اسی حالت میں بھیج دیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔]

سُنایا گیا ہے کہ ڈاکٹر قربان حسین صاحب نے صدر المہام (وزیر) متعلقہ سے اپیل کی ہے۔

○○

کالی رات

گرینڈ ٹرنک ایکسپریس دس گھنٹے لیٹ تھی۔ سکندر آباد کے پلیٹ فارم پر انتظار کرنے والوں کا اضطراب بڑھتا جاتا تھا اور جب سگنل گرا تو دلوں کی دھڑکن کئی گنی تیز ہو گئی اور قاضی پیٹھ سے وہ گاڑی آ ہی گئی جس میں گرینڈ ٹرنک ایکسپریس کے دو ڈبے کٹ کر حیدر آباد تک آتے ہیں۔ وہ تینوں اس ڈبے کی طرف لپکے جس پر سفید تختے پر حیدر آباد لکھا ہوا تھا۔ ڈبے کی کھڑکیاں بند تھیں۔ ان تینوں کے دل ڈوب گئے۔ کسی کا جھانکتا ہوا چہرہ کسی کھڑکی سے نظر نہیں آیا۔ گاڑھی دھکا کھا کے ٹھہری تو ایک کمپارٹمنٹ کا دروازہ جو اچھی طرح بند نہیں تھا جھٹکے، سے خود بخود کھل گیا۔

تینوں میں سب سے چھوٹے بھائی نے لپک کے کھلے ہوئے دروازہ کے اندر قدم رکھا، اوپر کی جالی پر ایک ٹوٹی ہوئی ٹوکری رکھی تھی۔ اس کے سوا کسی قسم کا سامان نہ تھا۔ کوئی جاندار کوئی آدمی اس ڈبے میں نہ تھا، اور فرش پر نشستوں پر، لکڑی کی دیوار پر خون کے دھبے ہی دھبے تھے، جمے ہوئے سیاہ خون کے، جس پر راستے بھر خاک اور غبار نے استہ کاری کی تھی۔

اب باقی دونوں بھائی بھی اندر جھانک کے یہ منظر دیکھ چکے تھے۔ ناامیدی سے آخری مقابلے کے لئے اس امید کو برقرار رکھنے کیلئے کہ ممکن ہے وہ لوگ دلی سے روانہ ہی نہ ہوئے ہوں، تینوں نے مسافروں کے نام پڑھنے شروع کئے۔ دھول سے اٹے ہوئے کارڈوں پر نام صاف اور نمایاں تھے۔

مسٹر باقر علی خاں

مسز باقر علی خاں

مس باقر علی خاں

مسٹر سکندر علی خاں

اور قریب ہی فرسٹ کلاس کوپے پر جو کارڈ تھا اس پر دولہا دلہن کا نام صاف صاف درج تھا۔ مسٹر مسز تہور علی خاں۔ کوپے کا دروازہ کسی رحمدل گارڈ نے مقفل کر دیا تھا۔

گارڈ آیا اور اس نے بیان کیا دہلی اور متھرا کے درمیان گرینڈ ٹرنک ایکسپریس پر حملہ ہوا تھا۔ تینوں بھائیوں کے دل ڈوب گئے۔ جب صدمہ ایسا شدید ہو تو نشتر کی تیزی اپنا اثر یکبارگی نہیں کرتی۔ پہلے تو معلوم ہوتا ہے کہ اعصاب اور دماغ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ امید، ناامیدی کے یقین کے مقابل اپنا دھندلا سا چراغ جلتا رکھنا چاہتی ہے۔ ممکن ہے ان سب کے نام کے کارڈ لگ گئے ہوں مگر یہ اس ٹرین سے روانہ نہ ہوئے ہوں، دہلی میں تین چار دوستوں، پاکستان کے ہائی کمشنر اور حکومت ہند کے ایک افسر کو جوابی تار دے کے تینوں بھائیوں نے یہ تصفیہ کیا کہ ان میں سے ایک سب سے چھوٹا غضنفر ہوائی جہاز سے دہلی جائے شاید کچھ سراغ ملے۔

اور جس وقت یہ تینوں بھائی اسٹیشن کے تار آفس سے تار دے رہے تھے ایک سکھ ایک بابو سے پوچھ رہا تھا بابو جی بنگلور کی گاڑی کس پلیٹ فارم سے جاتی ہے، بابو نے اسے جلدی سے کچھ جواب دیا۔ اس سکھ کے کپڑے میلے تھے، کیس اور پگڑی پر دھول جمی ہوئی تھی۔ صرف قمیض اور شلوار پہنے تھے کمر کے گرد ایک پٹکا تھا جس سے کرپان بندھی ہوئی تھی۔

وہ ٹہلتا ہوا دوسرے سکھ کے پاس آیا جس کا حلیہ اس سے ملتا جلتا تھا اور اس سے پنجابی میں کچھ کہنے لگا، پھر دونوں نے گٹھریاں اٹھائیں اور دو جھکی ہوئی برقعہ پوش شکلیں جو

ان کے ساتھ تھیں انہیں کہنیاں ماریں، دونوں شکلیں ان کے پیچھے پیچھے چلیں۔

خفیہ پولیس کے دو جوان دیر سے ان کی طرف تاک لگائے تھے، اب وہ ریلوے پولیس کے دو کانسٹیبلوں سمیت ان کے سامنے آ گئے۔

"سردار جی۔ تم سکھ ہونا، تمہارے ساتھ یہ برقعے والیاں کیسی؟"

اکھڑ پنجابی میں ایک سکھ نے جواب دیا۔ "ہماری عورتیں پردہ کرتی ہیں۔"

خفیہ پولیس والوں کی تشفی نہیں ہوئی۔ انہوں نے اپنے انسپکٹر کو پہلے ہی اطلاع کر دی تھی۔ کانسٹیبلوں نے کہا۔ "ہم ان عورتوں سے پوچھنا چاہتے ہیں یہ کون ہیں۔"

اس مرتبہ سکھ نے اردو میں جواب دیا۔ یہ عورتیں پنجابی جانتی ہیں اردو نہیں جانتیں، اس پر حجت ہونے لگی۔ خفیہ پولیس کا ایک نوجوان ایک اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر کو بلا لایا جو پنجابی تھا۔ اس نے پنجابی میں پوچھا مگر عورتوں نے جواب نہیں دیا اور اب دونوں سکھ ذرا ذرا بوکھلانے لگے۔

ریلوے پولیس کے انسپکٹر نے موقعہ پر پہنچ کے ان دونوں عورتوں کو زنانہ ویٹنگ روم بھجوایا، وہاں جب ان عورتوں کے برقعے اتارے گئے تو دو خوبصورت جوان لڑکیاں نکلیں جن کے ہاتھ پیچھے کمر پر بندھے ہوئے تھے اور جن کے منہ کو رومالوں سے بند کر دیا گیا تھا۔ ان میں سے ایک تو وہیں بے ہوش ہو کے گر پڑی۔ دوسری نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے زنانہ ویٹنگ روم کی عورتوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"پانی۔"

اور پھر ان لڑکیوں نے اپنی بپتا سنائی۔ وہ فیروز پور کے ایک زمیندار گھرانے کی لڑکیاں تھیں۔ شام تک افواہیں ہی افواہیں تھیں۔ رات کو ست سری اکال کے نعرے لگے، شور ہوا، برچھے اور کرپان چمکے، باپ بھائی سب مارے گئے، یہ دونوں مال غنیمت بن گئیں، اور اس کے بعد یہ دونوں سکھ انہیں شہر سے شہر لئے پھرتے تھے۔

پولیس کی سختی پر دونوں سکھوں نے بھی اقبال کیا۔ وہ چکلالہ کے قریب بڑھئی کا کام کرتے تھے، دونوں بھائی تھے، مسلمانوں سے ان کا یارانہ تھا۔ پھر کچھ گڑبڑ شروع ہوئی، وہی جو ان کے دوست تھے انہوں نے ان کا گھر لوٹا۔ ان کی عورتوں کو ان کے سامنے بے عزت کیا۔ ایک سکھ نے سسکیاں لے لے کے کہا کہ اس کے سامنے اس کی عورت کی

چھاتی کاٹ ڈالی گئی اور اس کے بعد ان باقی ماندہ زخمی سکھوں کا سفر شروع ہوا' میلوں کا سفر' ہزاروں کا سفر' سفر جس میں بھوک تھی موت تھی طلب تھی۔ پھر آزاد پاکستان کی سرحد ختم ہوئی۔ آزاد ہندوستان کی سرحد شروع ہوئی' یہاں فیروز پور کے قریب لوٹ ہو رہی تھی۔ یہ بھی لوٹ میں شریک ہو گئے اور ان دو مسلمٹیوں کو لوٹ کا مال بنا کے لے چلے' انہوں نے سنا تھا کہ بنگلور میں فرنیچر اچھا بنتا ہے اور وہ ادھر ہی کے ارادے سے نکلے تھے۔

تینوں بھائیوں نے رات کو کھانا نہیں کھایا' تینوں کو یا تو نیند نہیں آئی یا ایسی نیند آئی جس میں اور بیداری میں کوئی فرق نہیں' ہر چیز غیر یقینی اور مبہم تھی' ہندوستان کے اخبارات سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ دہلی میں معمولی سا فساد ہے' پاکستان ریڈیو احتیاط برت رہا تھا۔ صرف بی بی سی سے دہشت ناک خبریں آتی تھیں اور ہندوستانی بھائی بی بی سی کی بدنیتی کا دکھڑا رو رہے تھے کہ دہلی کے اتنے معمولی سے واقعے کو افسانہ بنا دیا۔ یہ سب تھا مگر تینوں بھائی غیر جانبداری سے دہلی کے واقعات کا اندازہ نہیں لگا سکتے تھے' اس مرتبہ ان کی اپنی رگیں' نبضیں' اعصاب' خون کی گردشیں متاثر تھیں' اس سے پہلے کلکتہ میں فساد رہا' بمبئی میں فساد رہا' وہ افسوس کرتے رہے۔ غضنفر بمبئی میں تھا' فساد ہوا۔ وہ سینما سے باہر نکلا تو چاروں طرف پتھر برس رہے تھے۔ ہندو پتھر اور مسلمان پتھر' بت پرستوں کے پتھر اور خدا پرستوں کے پتھر اس نے یا علی مشکل کشا مدد کہہ کے ایکسلریٹر دبایا۔ ایک پتھر ونڈ اسکرین سے کوئی نصف انچ کے فاصلے سے نکل گیا۔ اس نے ایکسلریٹر اور زور سے دبایا' اور لاابالیانہ فارسی کا ایک فقرہ اس کے ذہن میں آیا جس پر وہ بچپن میں ہنسا کرتا تھا۔
"یک ڈھیلا سن سنات من منات رسید کردم کہ اگر کچھانہ منکائے لیت تو سر شکستہ بود۔"
سوڈے کی بوتلوں اور تیزاب سے البتہ ڈر معلوم ہوتا تھا۔ مگر یا علی مشکل کشا مدد' بمبئی میں فساد ہوا تو کیا ہوا۔ یہی نا کہ بسوں نے راستہ بدل دیا۔ بی' روٹ کی بسیں میرین ڈرائیور کے راستے چلیں۔ چلو سمندر کی ہوا کھاؤ۔ گلیوں میں کہیں فساد ہو رہا ہو گا ہونے دو۔

پھر پنجاب میں فساد ہوا۔ کیا مارا ہے کیا مارا ہے۔ اس وقت تک یہ تین بھائی نہیں تھے' پانچ بھائی تھے۔ پانچوں خوش تھے کہ واہ وا مسلمانوں نے سکھوں کو کیا مارا ہے۔

ہندوؤں کو کیا مارا ہے؟ یہ سب پنجاب کی مسلم لیگ کا کارنامہ ہے' افتخار حسین خاں ممدوٹ کا' ان کا نہیں۔ اچھا تو پھر میاں افتخار الدین کا؟ اچھا وہ بھی نہیں تو پھر بیگم شاہنواز کا اور سر فیروز خاں نون کی انگریز بیگم' بھئی وہ تو غضب کی دلیر عورت نکلی' اچھا ان میں سے کسی کا نہیں؟ تو پھر یہ میجر خورشید انور کا کارنامہ ہے۔ بھئی ہم مانے لیتے ہیں یہ پنجابی مسلمان کا کارنامہ ہے' اقبال کی وہ نظم ہے نا۔

اور اپریل میں جب غضنفر لاہور گیا تھا تو کیا دھاک تھی' مگر ہندو اور سکھ جوابی حملے کی تیاری کر رہے تھے' وہ روپ شوری کا اسٹوڈیو دیکھنے ملتان روڈ پر لاہور سے سات میل دور گیا۔ اسٹوڈیو وغیرہ سے دلچسپی کسے تھی' ان دنوں وہ کلجیت کور کے چکر میں تھا جس نے منورما کی جگہ سنبھالی تھی۔ بچارے شوری نے ایک اسٹوڈیو جلنے کے بعد دوسرا بنایا تھا اس کی ہمت کی داد دینی ضروری تھی۔ کیا اب بھی اس کی جورو ایکٹرسوں سے اتنا ہی جلتی تھی اور پھر سروپ شور نے اسے دوسرے دن کھانے پر بلایا۔ مال پر اس چھوٹے سے ریستوران میں کیا نام تھا اس کمبخت ریستوران کا وہاں وہ عجیب و غریب جوڑا تھا۔ سعید جس نے اس سکھ لڑکی شیلا سے پندرہ برس ہوئے شادی کی تھی۔

اور شیلا کا ہسٹریا۔ گرٹن کی تعلیم کو' کیمبرج کی قلعی کو' بین الفرقہ جاتی شادی' اور متاہل زندگی کو صرف چند ہفتوں کی اس لڑائی نے ملیا میٹ کر دیا تھا۔ جس میں اس کے ماں باپ کے فرقے پر اس کے شوہر کے فرقے نے عارضی طور پر فتح پائی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ غضنفر کم سے کم نام کی حد تک مسلمان ہو گا۔ پھر بھی اس نے پورک پر اصرار کیا۔ اس نے غضنفر سے پوچھا۔ وہ کس قسم کا مسلمان ہے۔ کرویان (اعتقاد والا) یا پراتیکال (عمل والا) اس نے کہا اس مرتبہ وہ گولر دادی جائے گی۔ جہاں "تھینک ہیون ایک بورڈنگ ہاؤس کا اشتہار آیا ہے کہ صرف اعلیٰ درجے کے ہندو اور سکھ خاندان رہ سکتے ہیں۔" اس نے کہا۔ "کبھی کبھی مجھے شبہ ہوتا ہے کہ سعید بھی مسلم لیگر ہے۔ حالانکہ آپ کو معلوم ہے ہم دونوں کا کوئی مذہب نہیں' ہماری سول میرج ہوئی ہے۔ ہم انسان ہیں۔" پھر ایک مشہور مسلمان لڑکی کا ذکر آیا تو وہ کہنے لگی۔ "جانتے ہو وہ سعید سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ مگر میں نے سعید کو چھین لیا' اور جانتے ہو' سکھ جو چاہتے ہیں لے کے رہتے ہیں۔"

اور اسی پارٹی میں رونیش چندر سے --- "جی میں وہ رمیش چندر نہیں جس کے

مضامین پیپلز ایج میں آتے ہیں۔ وہ بمبئی والے رومیش چندر ہیں--- مگر میں بھی پارٹی کا رکن ہوں' پارٹی آفس آئیے--- روپ کہہ رہی تھی۔" بھائی نان وایولنس آپ کا کیا خیال ہے۔ ایک پارٹی اگر وایولنس کرے یا نان وایولنس....." بچارے روپ کی بچاری جلتی بھنتی ہوئی۔ ایکٹرسوں کی بازاری کشش کی دائمی رقیب گریجویٹ بیوی سے باتیں کرتے کرتے رومیش چندر نے غضنفر سے کہا۔ "آج میرے پاس بھی کچھ لوگ آئے تھے کہہ رہے تھے مسلمانوں سے بدلہ لینا ہے۔ چار ہی آنے چندہ دیدو۔ میں نے پہلے تو انہیں سمجھایا۔ جب انہوں نے کسی طرح نہیں مانا تو میں نے کہا۔ "مجھے تیس روپیہ تو تنخواہ ملتی ہے۔ اس میں سے تمہیں کیا دوں۔"

پھر باتوں باتوں میں کسی نے کہا۔ "نہنگ۔"

غضنفر نے پوچھا۔ "نہنگ کیا؟"

رومیش نے جواب دیا۔ "جی یہ ذرا سرپھرے سکھ ہوتے ہیں' معلوم ہے امرتسر کے ہنگامے کے متعلق یہ کیا کہتے ہیں' جب مسلمانوں نے حملہ کیا یہ لوگ کسی میلے میں گئے تھے ورنہ مزہ چکھا دیتے۔" اور پھر رومیش پورے ہندوستان کی مجموعی حماقت پر ہنسا۔

"اور سکھ۔" مسز سعید نے کہا۔ "اور اب یہ دعوی ان کانوں سے سننا پڑتا ہے کہ مسلمان بھی بہادر ہو سکتے ہیں۔"

"وایولنس' نان وایولنس۔"

"پروتما داس گپتا۔"

"میں نے اپنے کانوں سے پاکستان ٹائمز کے دفتر میں سردار شوکت حیات خاں کو میاں افتخار الدین سے یہ کہتے سنا کہ سکھوں نے بارہ لاکھ کی جیپ اور لاریاں خریدی ہیں۔"

"پٹیالہ"

"بہاولپور۔"

"ہم لوگوں نے یہ طے کیا تھا کہ تانگوں ہی پر نہ بیٹھو پیدل چلو' لاہور کے سالے سب تانگے والے مسلمان ہیں۔"

"کلجیت کور۔"

"نہیں کافی نہیں، کچھ نہیں...."

اور ٹرین پر جب وہ ایک فرضی نام ڈی سلوا بتا کے شملہ جا رہا تھا تو وہ لالہ جی کس مزے سے تیاریوں کا ذکر کر رہے تھے۔ "لاہور میں ہم صرف دفاعی لڑائی لڑیں گے۔ لیکن امرتسر سے لیکر دہلی تک ایسا مزہ چکھائیں گے کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے۔"

شملہ میں غضنفر کا اصلی نام سب کو معلوم تھا لالہ جی اسے آخر تک ڈی سلوا ہی کہتے رہے، خیریت ہوئی ورنہ بیچاروں کو کیسا صدمہ ہوتا کہ دشمن سے سارا کچا چٹھا کہہ دیا تھا۔

رات کو غضنفر کو باقی دونوں بھائیوں کی طرح نیند نہیں آئی، کس قدر واہیات بے معنی مہمل سی بات تھی کہ شام کو گرینڈ ٹرنک ایکسپریس کا ڈبہ اس کے ماں باپ بھائیوں کے خون سے رنگا ہوا تھا اور وہ سروپ شوری کی پارٹی اور پنجاب کے ہنگاموں کی دوسری قسط کی تیاری کے قصے یاد کر رہا تھا۔ لیکن نشتر چبھتا رہا اور دماغ کو بے معنی مہمل چیزوں کی یاد آتی رہی اور اگست کی آخری تاریخوں میں امجد--- اپنے آپ کو آزاد مسلمان کہتا ہے نیشنلسٹ۔ کسی نے مجھ سے پوچھا کہ یہ آزاد مسلم کیا ہوتے ہیں۔ میں نے کہا مادر پدر آزاد--- امجد نے کہا دیکھو اب مشرقی پنجاب میں تمہارے مسلمان پٹ رہے ہیں، اب دیکھو ہندو اور سکھ کیسی مار مار رہے ہیں۔

امجد پر اس کا خون کھولنے لگا اور نشتر پھر جگر کے آرپار ہو گیا۔ ماں باپ، بھائی بہن ریل کے ڈبے میں خون کے چھینٹے، خون کے چھینٹوں پر گرد، کارڈوں پر نام، ناموں پر گرد۔

ہندوستان کی تمام ریل گاڑیوں میں کوئی گرینڈ ٹرنک ایکسپریس سے زیادہ نامعقول نہیں۔ جس طرح ترکی یورپ کا مرد بیمار تھا یہ گریٹ انڈین پے نن شلا ریل گاڑیوں کی زن بیمار ہے، کوئی سیاسی بحران ہو کوئی ہنگامہ؟ سب سے زیادہ اثر اس پر ہوتا ہے۔ اس کے وجود کی ذمہ داری اور کئی حماقتوں کی طرح مرحوم سر اکبر حیدری پر ہے جنہوں نے قاضی پیٹھ اور بلھار شاہ کے درمیان لائن بنوائی۔ اس کے بعد کچھ دنوں تک تو یہ ایکسپریس بنگلور سے مدراس ہوتی ہوئی پشاور تک سسکتے ہوئے سانپ کی طرح رینگ جاتی تھی، پھر انتہائی شمال اور انتہائی جنوب کی کمپنیاں اس کے رینگنے، اس کی بکوڑا چال سے عاجز آ گئے۔ یہ صرف مدراس سے دہلی تک لنگڑاتی ہوئی چلتی رہی مگر ہر قدم پر بیمار، کوئی اور ٹرین

گزرنے والی ہو یہ بچاری چھوٹے موٹے اسٹیشن پر بھکاریوں کی طرح کھڑی ہے۔ ۱۹۴۲ء کے ہنگاموں میں تو اس کا حال ہی نہ پوچھو چوبیس چوبیس گھنٹے لیٹ ہو جاتی تھی۔ بھلا کہیں یہ ممکن تھا کہ بھارت ماتا کو آزادی کا سرسام ہو جائے اور گرینڈ ٹرنک ایکسپریس اس سے متاثر نہ ہو۔

پرانی دلی کے اسٹیشن پہنچ کے میر باقر علی خاں اور ان کے اہل و عیال کی جان میں ذرا جان آئی، کہ اب دلی سے نکلے اور جان بچنے کی امید بندھی۔ پلیٹ فارم نمبر ۹ پر ان کے وطن جانے والی گاڑی کھڑی تھی۔ شہر میں جو ہنگامہ تھا اسٹیشن بھی اس سے متاثر تھا مگر اتنا زیادہ نہیں، پولیس بہت تھی اور اسے دیکھ کر ڈھارس بندھتی تھی۔ وہیلر کے بک اسٹال پر سستے رسالے اور ان سے زیادہ سستے ناول اسی طرح پڑے تھے، قلی اسی طرح ٹھیلے دھکیل رہے تھے۔ مدراسی رجمنٹ کے سپاہی پتوں میں دال چاول کھا رہے تھے، پلیٹ فارم پر اسی طرح تھوک، قے اور ہر طرح کی مرکب غلاظت کا لیپ تھا۔ ای آئی آر کے ہر ڈبے اور بی بی اینڈ سی آئی کے ایئر کنڈیشنڈ ڈبوں کو دیکھ دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ یہاں بھی تمدن دم توڑ رہا ہو گا، ان کی سب کی نشستیں محفوظ تھیں، وہ دو دن کے بھوکے پیاسے تھے۔ مگر اسٹیشن پر انہیں کچھ کھانے کو تو ملا اس میں کوئی شک نہیں کہ کچھ سکھ اور کچھ غنڈے جو غالباً راشٹریہ سیوک سنگھ کے ہوں گے، ڈبوں کے اطراف چکر مار رہے تھے، مگر اب وہ ان کا کیا بگاڑ سکتے تھے، کوئی دم میں ریل چلے گی اور وہ ان غنڈوں کی دسترس سے باہر ہو جائیں گے۔

وہ خود بچ گئے تھے۔ یہ ایک معجزہ تھا ان دو دنوں میں انہوں نے کیا کیا دیکھا اور کیا کیا سنا تھا ان میں سے ہر ایک کو ایک خاص واقعے سے دلچسپی، عبرت اور وحشت تھی۔ ان میں سے ہر ایک نے ایک ہولناک واقعے کو اس پورے خواب پریشاں کی انتہا سمجھ کے چن لیا تھا۔

بلوچ رجمنٹ کے سپاہی جو انہیں موت کے منہ سے نکال لائے تھے انہیں کیسے کیسے واقعات سنا گئے تھے، سکینہ کا دل لرز اٹھا۔ وہ ریل کے ڈبے کے کارڈ کی مس باقر علی خاں تھی۔ بیس سال مثنویوں اور غزلوں کی معشوقہ سے چھ سال بڑی۔ اس چھ سال کے عرصے میں اس نے بی۔ اے کر لیا تھا اور بی ٹی کی تیاری کر رہی تھی۔ ان فسادات کے زمانے

میں وہ اکثر سوچتی رہتی کہ ابسن کی ہلڈا کی طرح کیا سچ مچ اٹھا کے لے جائے' جانے میں لطف آتا ہو گا۔ پھر اسے مزید تفصیلات کا علم ہوا اور یہ لطف ختم ہو گیا۔ مثلاً ایک بلوچی سپاہی نے اس کی موجودگی میں اس کے باپ کو یہ قصہ سنایا کہ اکثر عورتوں کو خراب کرنے کے بعد ان کی چھاتیاں کاٹ ڈالی جاتی ہیں یا کرپان سے ان کے شکم کو چیرا جاتا ہے' یا کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ عورت کے سامنے اس کے مرد یا باپ بھائی کو مارا جاتا ہے اور ان کے اعضاء اس کے منہ میں گھسیٹرے جاتے ہیں۔ ابسن کی ہلڈا کے وا کنگ بہت شریف تھے' وہ عورتوں کو اٹھا کے چھوٹی چھوٹی طاؤس نما کشتیوں میں امریکہ کی سیر کرانے لے جاتے تھے جہاں سے ابھی تک ہالی وڈ کے فلم' آتشک کے جراثیم اور امریکی سیاح پرانی دنیا نہیں آئے تھے۔

سکندر پر ایک اور خاص واقعے کا اثر تھا۔ میر درد روڈ پر ایک چھوٹے سے مکان میں دو بہنیں اکیلی رہ گئیں' دروازے ہی پر عابدہ کا شوہر مارا گیا۔ عابدہ حمل سے تھی' وہ کہیں بھاگ نہ سکی۔ لیکن زاہدہ کوٹھے پر چڑھ کے منڈیر سے دبک گئی اور نیچے تماشہ دیکھتی رہی' کچھ لوگ سامان نکالتے اور لوٹتے رہے' چبوترے پر عابدہ ننگی کی گئی اس کے اطراف سات آٹھ وحشیوں کا ہجوم تھا' جن کی داڑھیاں اور پگڑیاں ان کی خباثت کا جزو معلوم ہوتی تھیں۔ عابدہ حمل سے تھی ایک ایک کر کے انہوں نے عابدہ کو خراب کیا یہاں تک کہ اس کی چیخیں گھٹ گئیں' سسکیاں بند ہو گئیں' آنکھیں ساکت ہو گئیں۔ وہ بے حس و حرکت ہو گئی۔ زاہدہ سے دیکھا نہیں گیا مگر وہ دیکھتی گئی وہیں اوپر سے منڈیر کی آڑ سے اور جب وہ ساتوں آٹھوں اپنا منہ کالا کر چکے تو دو تین تو ہائیں ہائیں کرتے رہے مگر ان میں سے ایک نے کرپان کھینچ کے شرمگاہ سے حلق تک عابدہ کا جسم چاک کر دیا' زاہدہ کی نگاہوں کے نیچے دنیا گھوم گئی۔ یہ زمین یہ دھرتی ماتا چکر کھانے لگی اور چکر ذرا تھما تو اس نے ایک ہی لحظہ کے اندر طے کر لیا کہ تھمے کیوں' مگر وہ گرے تو اس طرح گرے کہ کسی کے ہاتھ نہ آئے' مثلاً خون میں لت پت ہونے کی وجہ سے عابدہ کتنی کراہت بھری معلوم ہو رہی تھی۔۔۔۔ اس کی سگی بہن سہی۔۔۔۔ عابدہ۔ میری آپا۔ چشم زدن میں زاہدہ نے پھر طے کر لیا۔ چبوترہ پتھر کا تھا' اگر وہ سر کے بل کودے تو کلیجہ پاش پاش ہو جائے گا۔ ان حیوانوں میں سے کوئی تو اسے ہاتھ نہ لگائے گا۔ چشم زدن میں

اس کا بھیجہ پاش پاش ہو گیا۔ ایک فاتح نے دوسرے سے "سونی کڑی" کے متعلق کچھ کہا' دوسرے نے اسے جواب میں ماں کی گالی دی کہ اس کی صورت تو پہچانی نہیں جاتی تجھے کیا معلوم سونی تھی یا کیسی تھی' جب بلوچ سپاہی تخلیہ کرانے پہنچے تو بہت دیر ہو چکی تھی اور سکندر نے ان دو نامعلوم بہنوں کے نام عابدہ' زاہدہ رکھے' یہ نہ سہی کوئی اور نام سہی۔ اصغری اکبری' جمال آرا حسن آرا' ناہید جہاں خورشید جہاں.... کوئی نام سہی.... ان کا انسانی حافظہ میں زندہ جاوید ہونا ضروری ہے۔

دہلی اور متھرا کے درمیان ریل گاڑی رکی۔ روک لی گئی' اس سے پہلے بھی ریل گاڑیاں رکی ہیں۔ ہزاروں مرتبہ۔ سگنل نہیں گرا' بھینسیں گزر رہی ہیں' کسی نے زنجیر کھینچ لی' کیا ہوا۔ ہوا یہ کہ سینکڑوں راہزن تھے۔ چمکتی ہوئی کرپانوں کا میلہ لگا ہوا تھا' راشٹریہ سیوک سنگھ والے اسٹاف کا کام کر رہے تھے۔ اہم ترین کام یہ تھا کہ مسلمانوں کو ریل سے اتار لیا جائے۔ معلوم ہوتا تھا چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں سے ہزاروں بارد سفر اتارنے والے کیڑے ابل آئے اور انہوں نے انسانوں کی ہیئت اختیار کر لی۔ "جے ہند۔" "ست سری کال۔" "جے بلی دیو۔" شور پکار۔ شکار کا شور۔ قصابوں کا نعرہ' بکروں کی آوازیں۔ جو اتر نہیں رہے تھے ان پر ویسے ہی کرپانوں اور تلواروں کے وار ہو رہے تھے۔

تہور نے اپنے کوپے کو اندر سے مقفل کر لیا تھا۔ کھٹ کھٹ کھٹ۔ اور گالیاں۔ اس کی نئی نویلی دلہن جو ہفتہ بھر پہلے بیاہ کے آئی تھی اس سے چمٹ گئی۔ معرکہ کربلا میں شادی کا سماں تھا' ہزاروں انیس اور دبیر مرثیے پڑھ رہے تھے' مرثیے' نوحے' سوز' کربلا ہی کربلا۔ اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد۔ مگر اس وقت زندگی کے کوئی آثار نہ تھے' کوئی امید نہ تھی' چھن سے کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا۔ دلہن جس کی مانگ کی افشاں پر پسینہ کے بڑے بڑے قطرے ابھر آئے تھے جیسے تارے غرقاب ہو جائیں۔ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اب تہور اور اس کی دلہن اور ان باہر کے وحشیوں کے درمیان صرف دبیز شیشن کھڑکی حائل تھی۔

تہور نے اپنا ریوالور کٹ بیگ سے نکالا۔ "دو چار کو مارے بغیر تو یار لوگ مریں گے نہیں نظام الملک آصف جاہ کی فوج کا نام بدنام نہ ہو گا۔" صرف چار گولیاں تھیں' یہ

ریوالور بھی دلی میں کس مصیبت سے بچا تھا۔ ایک اور یورش میں دینی شین بھی نیچے گری۔ ایک شخص نے کھڑکی کے اندر منہ ڈالا۔ اور تہور سے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "اترو" تہور نے اسے ڈانٹا۔ ایک اور سکھ نے کرپان کھینچ کر مارا جو تہور کے بائیں ہاتھ میں لگا۔ تہور نے یکے بعد دیگرے دو فائر کئے' دو آدمی گرے۔ لیکن دو گولیاں بھی ختم اور کچھ لوگ اس کے ڈبے کی طرف جھپٹے۔ اس نے خود کھڑکی سے دیکھا کہ دو آدمی اس کی بہن کو پکڑے لئے جا رہے ہیں' جھپٹ کے اس نے دینی شین پھر جلدی سے بند کر لی اور جو حملہ آور جھپٹے تھے پھر دینی شین کو گرانے کی کوشش کرنے لگے۔

"بتول"

دلہن نے اس کی طرف دیکھا۔ دلہن کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ ہفتہ بھر پہلے محبت کی کپکپی تھی۔ اب خوف کی اور موت کی۔

"تم موت سے تو نہیں ڈرتیں۔ یہ لوگ تمہیں بہرحال زندہ نہ چھوڑیں گے۔"

اور دلہن نے صرف اتنا کہا۔ "میں عزت کے لئے ڈرتی ہوں۔"

"ابھی دو گولیاں باقی ہیں۔"

دلہن نے آہستہ آہستہ سر ہلایا۔ دینی شین پر حملہ آوروں کی یورش بڑھ گئی۔ اس نے اپنے پورے جسم کا بار دینی شین پر ڈالا کہ وہ نہ کھلنے پائے۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے' اس کی دلہن اس سے لپٹ گئی اور اس کے ہونٹوں سے اپنے ہونٹ مل کے اس نے آہستہ سے کہا۔ "تمہیں جناب امیر علیہ السلام کے سپرد کیا۔"

"اللہ حافظ۔"

"اللہ حافظ۔"

اس نے ریوالور کی نال اپنی دلہن کی کنپٹی پر رکھ کر لبلبی دبا دی' دلہن کے دونوں ہاتھ جو اس کی گردن میں حمائل تھے چھوٹ گئے' خون اور بھیجہ ملا جلا۔ اس سے دیکھا نہیں گیا۔ تھوڑی دیر پہلے وہ کتنی خوبصورت تھی' میں نے اسے چاہا اور اسے مٹا دیا۔ اور اتنے میں اس کے جسم کے بار کے باوجود دینی شین گری اور ایک کرپان پیچھے سے اس کی پسلیوں کے آرپار ہو گئی۔ حملہ آور سکھ نے اسے ماں کی گالی دی اور جھک کے کوپے کے بند دروازے کی سٹکنی کھول دی۔ سامان کی لوٹ شروع ہو گئی۔

اور تہور علی خاں کے ریوالور کی آخری گولی بے فائدہ باقی رہ گئی۔

اس کے والد میر باقر علی خاں کے کمپارٹمنٹ کا زیادہ برا حشر ہوا۔ جب اس ڈبے میں سکھ گھسے تو پہلا وار انہوں نے سکندر پر کیا۔ وہ گھائل ہو کر گرا۔ پھر انہوں نے باقر علی خاں کی بیوی کو مارا اور آخر میں باقر علی خاں کو۔ جب ایک نے سکینہ پر کرپان اٹھایا تو راشٹریہ سیوک سنگھ کے ایک سورما نے کہا۔ "نہیں جی یہ بڑی سندر لڑکی ہے۔ اسے رہنے دو۔ اسے ہم شدھ کریں گے کیوں ری لڑکی چلے گی تو۔"

لڑکی اپنی ماں کی لاش سے لپٹ کر رو رہی تھی اور ماں کے خون سے اس کے کپڑے تر تھے پھر راشٹریہ سیوک سنگھ کا وہ سورما ساتھی اس لڑکی کو پکڑ کے جھاڑیوں کی طرف لے گیا۔

وہ زندہ ہے یا مردہ۔ احساس کی رو اس قدر ست تھی کہ سکندر کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آیا اسے مردہ جان کے ریل گاڑی سے کھینچ کے کسی نے نیچے ڈال دیا تھا کہ سامان لوٹنے میں اس کی لاش حائل نہ ہو۔ احساس کی رو اس قدر ست تھی کہ اسے زندگی کا کم ہی احساس ہوا۔ اس نے ہاتھ ہلانا چاہا معلوم ہوتا تھا سیدھا ہاتھ اب کبھی اس کا ساتھ نہ دے گا۔ سر میں برابر دھماکے ہو رہے تھے۔ مسلسل دھماکے' آنکھوں میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ لیکن کچھ کچھ اندھیرا رات کا بھی تھا۔ جس میں چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں' پستہ قد بھوتوں کی طرح دور دور کھڑی تھیں۔ اس نے سیدھے ہاتھ سے ناامید ہو کے بائیں ہاتھ کو منانا چاہا اس نے کچھ دیر قوت ارادی کا ساتھ دیا۔ پھر بے جان ہو کے کسی چیز پر گر پڑا۔ گھاس جیسی ریشہ ریشہ چیز پر' یہ کسی لاش کی داڑھی تھی۔ اس نے لاش کے منہ پر ہونٹوں پر ہاتھ پھیرا' غیر ارادی طور پر اور عین اس وقت گیدڑوں کی آواز آئی گی ہوا ہوا ہو۔ لیجئے انسان کے مہمان آپہنچے۔ کس زبردست پیمانے پر ان کی ضیافت کی تیاری کی گئی تھی۔ اس نے پہلی مرتبہ خوف کی تیز لہر اپنی ریڑھ کی ہڈی کے اس سرے سے اس سرے تک محسوس کی۔ جب اپنا سیدھا ہاتھ بغاوت کرے اور بایاں ہاتھ پوری طرح قبضے میں نہ ہو اور ٹانگیں (غالباً) کسی مری ہوئی عورت کی زلف گرہ گیر میں الجھی ہوئی ہوں تو گیدڑوں کے تیز دانتوں کا مقابلہ کون کرے گا۔ اس سے تو کرپان ہی اچھے تھے۔

آسمان پر چار پانچ تارے تھے۔ اور یہ کالی رات خوبصورت تھی۔ ایک بانکی تلنگن

سی تھی جس کا کالا کالا روپ اس پورے خون آشام منظر پر چھایا ہوا تھا۔ وہ سوچنے لگا اور سب کا کیا حشر ہوا؟ سر کے دھماکے تیز ہو گئے۔ اتنی تکلیف تھی' اتنا رنج تھا۔ پھر بھی ایک جدائی تھی۔ جب یہ تکلیف یہ رنج انتہا کو پہنچا اور پھر احساس ہو گیا۔ اور سب کا کیا حشر ہوا۔ ماں باپ بہن کا' بھابھی کا' بھائی کا؟ اس تاریک رات میں اتنی لاشیں پڑی ہیں۔ کونسی لاش کس کی ہے؟ اس نے سر گھمانا چاہا' اور ایسا سخت درد ہوا گویا کسی نے گردن مروڑ دی۔ اور اتنے میں گیدڑوں کی آوازوں سے زیادہ بھاری ایک گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ یہ کوئی اور ریل گاڑی تھی۔ پھر نئے قاتل' نئے مقتول؟ نہیں یہ چھوٹی سی ٹرین فوجیوں کی تھی جو زخمیوں اور مردوں کو لے جانے آئی تھی۔ اس نے انجن کی روشنی دیکھی۔ معلوم ہوتا تھا سر کے اندر ریل کے پہیے گھسے جا رہے ہیں۔ سر میں پھر ایک زور کا دھماکا ہوا اور احساس کی رو کہیں ڈوب گئی....

دو لالٹینیں اس کے قریب بھی رکیں۔ وہ بے ہوش تھا۔ ڈاکٹر نے کہا یہ مرا نہیں۔ اسٹریچر پر اٹھا کے اس کی زندہ لاش وہاں سے ہٹائی گئی اور اسے کچھ ہوش نہ تھا۔

وہ رات' وہ بانکی تلنگن پشاور سے لے کر سہارن پور تک بڑے خون آشام حسن سے چھائی ہوئی تھی۔ ایسی تاریک راتوں کو غلام ہندوستان کے بیٹے رنڈیوں کے کوٹھوں پر جایا کرتے' اب پشاور سے سہارن پور تک کسی کو رنڈی کے کوٹھے پر جانے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی' وہ عورت جو پیسے سے خریدی جاتی تھی۔ اب تلوار کے زور سے خریدی جا رہی تھی۔ سینکڑوں' ہزاروں' لاکھوں' محبت کیلئے نفرت کیلئے' انسانیت کیلئے' بہیمیت کیلئے---- عورت کے بغیر مفر نہیں۔ اب اس کے بچوں کی کسی کو ضرورت نہیں تھی' وہ بھالوں' سنگینوں' برچھوں' تلواروں سے چھد کر تڑپ تڑپ کر سو گئے تھے۔

اور دفعتاً" کالی رات' بانکی تلنگن' اپنی تاروں بھری افشاں لہرا کے سمٹی' اس نے انگڑائی لی۔ ہوا چلی۔ جھاڑیوں کے پتے سرسرائے۔ رات نے لاشوں سے اپنا تعارف کرایا۔ مجھے پہچانتے ہو میں قرون وسطیٰ سے اور اس سے پہلے کی صدہا صدیوں کی آتی ہوں۔ میری آغوش میں تمہارا نطفہ قرار پایا۔ تم نے جنم لیا' تم رینگنے' تم گھٹنیوں کے بل چلے' تم کھیل کود کے پڑھ لکھ کے جوان ہوئے۔ تم نے بیاہ کئے۔ جھوٹ بولا کئے' اپنے ساتھیوں کو اپنے آپ کو دھوکا دیا کئے۔ اور آج میری ہی آغوش میں تم اس طرح پڑے

ہوئے ہو کہ کبھی نہ اٹھو گے-----

کیونکہ میں صرف دائمی، تاریخی مدامی رات نہیں میں والپرگس رات ہوں، جب بھتنیاں ناچتی ہیں اور جادو گرنیاں جھاڑوؤں پر سوار ہو کے ملاء اعلیٰ کی سیر کرتی ہیں۔ میں والپرگس رات ہوں۔ اور میرا شباب ابھی پر بہار ہے، ابھی تم نے کیا دیکھا ہے۔ تم جو محض ایک معمولی سر راہگذر حادثے سے فنا ہو چکے۔ میں جادو بھری رات ہوں۔ والپرگس رات ہوں، میں ہندوستانی معشوقہ کی زلف ہوں اس کی آنکھ کی پتلی ہوں، میں مشرقی شاعر کی شب دیجور ہوں، شب فراق ہوں، میں تم سے کیا بتاؤں کہ اپنی ہزاروں آنکھوں سے میں نے ملتان، راولپنڈی، لاہور، امرتسر، جالندھر، گڑ گاؤں، دہلی اور دہرہ دون میں کیا کیا دیکھا۔ ابھی میں اور کیا کیا دیکھوں گی۔

ہسپتال میں جب سر اور گردن کے زخم پر پٹی باندھی جا رہی تھی اور ایک سو پانچ کے قریب بخار تھا، سکندر کے لاشعور نے اس تاریک رات کی سیڑھیاں چڑھنا شروع کیا۔ ایک ستارے سے دوسرے ستارے تک، ایک تاریکی سے دوسری تاریکی تک، یہاں تک کہ سیڑھی ختم ہو گئی اور آسمان بھی بہت دور تھا۔

تب والپرگس رات سے اس نے گڑگڑا کے اس نے کرسمس کا ایک جرمن کیرول دہرایا۔ "ہائی لی گاناخٹ، شون ناخٹ۔" (مقدس رات، خوبصورت رات) ہسپتال کی دیوار پر کوئی تیز روشنی پڑی۔ ممکن ہے اس روشنی کی کرن اس کے دماغ ہی سے نکلی ہو۔ وہ سیڑھی کے سب سے اونچے زینے پر کھڑا تھا اور سیڑھی ہوا میں ادھر سے ادھر جھول رہی تھی کہ اتنے میں جادو گرنی کی جھاڑو رات نے اس کے حوالے کر دی اور بھی کتنی لاشیں تھیں جو جھاڑوؤں پر بیٹھی آسمان کی نیلاہٹ کی طرف جا رہی تھیں۔ نہیں، مگر اسے تو نیچے زمین کی طرف اترنا تھا۔

اس کا پورا جسم پلاسٹر میں بندھا تھا۔ وہ کروٹ نہیں لے سکتا تھا۔ ذہنی طور پر اس نے کروٹ لی اور تکیئے کو ٹانگ کے نیچے دبا کے پلنگ کی پٹی کو بھینچ کے سو گیا۔ کالی رات کی طرح اس کے لاشعور نے اس کے بیمار جسم سے تھوڑی دیر کے لئے بچ نکلنے کیلئے ایک انگڑائی لی اور عام انسان کے لاشعور میں ضم ہو گیا۔

اب وہ پھر سیڑھی کے سب سے اونچے زینے پر کھڑا جھول رہا تھا اور معلوم ہوتا تھا

کہ سیڑھی اب گری' اب گری' دور دور تک کسی جادوگرنی کی جھاڑو کا پتہ نہ تھا۔ یہاں تک کہ سکینہ کا' بتول کا' کسی کا پتہ نہ معلوم ہوتا تھا تمام لاشیں جو جھاڑوؤں پر بیٹھی آسمان کی نیلاہٹ کی طرف جا رہی تھیں' اب وہاں پہنچ گئیں۔ تمام طائراں بام حرم اپنے کابکوں میں بیٹھے آرام سے غٹرغوں کر رہے تھے۔ اور وہ اسی طرح سیڑھی کے سرے پر' اب گرا' اب گرا۔

اور عام انسان کا لاشعور اس کے بیمار لاشعور کو پھر ہسپتال اس کے پاس بھیج کے سیڑھی پر اکیلا جھولنے لگا۔ اس سیڑھی پر وہ کتنے ہزار سال کی مشقت سے چڑھا تھا۔ اس نے کتنے حربے ایجاد کئے تھے' کیسے کیسے اوزار تراشے تھے' اور اب یہ سیڑھی جھول رہی تھی۔ گرنے کے قریب تھی' پشاور سے سہارن پور تک ہیروشیما سے لیک سکس تک۔

اس خطرے کے عالم میں جبکہ سیڑھی ٹوٹ کر گرنے کے قریب تھی اس عام انسان نے اعتراف کیا میں انسان ہوں' میں وہی ہوں جو ارتقا کی سیڑھی کی اتنی منزلیں طے کر کے یہاں پہنچا ہے۔ زندگی کے مرکز سے حیات کے کتنے مظاہرے نکلے! لیکن ایک محیط پر پہنچ کر سب کے سب رک گئے۔ میں اکیلا تھا جس نے اس محیط کو پار کیا۔ میں نے جبلت کو چھوڑ کے عقل کا راستہ پکڑا۔ میں نے موٹی کھال اتار دی' کپڑے بنائے' میں نے سانپوں کی پرستش کی اور سانپوں کو مارا' میں نے بیل کو' گھوڑے کو' بھاپ کو' بجلی کو' جوہر کو اپنا غلام بنایا' لیکن میں نے اپنے آپ کو بھی اپنا غلام بنایا' میں نے اتنا سب کیا' پھر بھی میں کتنا مجبور ہوں۔ اس وقت تک ایک اسپیشل ٹرین شرنارتھیوں سے بھری گوجرانوالہ سے آ رہی ہے' میں ہی اس ٹرین میں ہوں اور آزادی' خود ارادیت اور اطمینان کی طرف جا رہا ہوں۔ میں ہی اس ٹرین پر برین گن' اسٹین گن' مشین گن سے موت کی بوچھار کر رہا ہوں۔ میرے ہی دماغ سے' میرے ہی ارادے سے وہ تمام قیاسات' حسابات' اعمال' افعال پیدا ہوتے ہیں جن سے فطرت میری غلام ہے اور میرے ہی ارادے سے تلوار اٹھتی ہے اور اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اور ایک لمحے کے اندر سب غائب فنا ہی فنا۔

اور تب انسان کے ارادے اور عمل اور قوت اور تخیل نے اپنی جڑیں ساری کائنات میں پھیلائیں نہ صرف روشنی بلکہ ہر قسم کی توانائی جیسے حرارتی' برقی' مقناطیسی توانائی کا بھی وزن ہوتا ہے۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ توانائی اور مادہ اصل میں ایک ہی چیز

کی مختلف حالتیں ہیں اور ایک دوسرے میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔ یہ کہہ کے آئن شائن کا شاگرد خاموش ہو گیا۔

کیسی توانائی' کیسا مادہ' پناہ گزینوں کی ٹرین ایک اندھیاری گلی سے دوسری اندھیاری گلی جا رہی تھی' جو فوجی افسر حفاظت کیلئے مامور تھا اس نے اپنے صوبیدار میجر سے کہا۔ یار اس ڈبہ میں وہ عورت بڑی خوبصورت ہے۔ اگلے اسٹیشن پر دو چار سپاہیوں کی مدد سے صوبیدار میجر اس بیس سال کی حسین عورت کو اپنے افسر کیلئے اور سترہ اٹھارہ سال کی ایک اور سانولی سی لڑکی کو اپنے لئے اتار لایا اور اس کے ساتھی روتے گالیاں دیتے رہ گئے' اور جب ٹرین سرحد کے پار پہنچی تو ڈاکٹروں نے معائنہ کیا کہ دونوں عورتوں کے جسم سوج گئے ہیں۔

اے انسان دیکھ کسی دن یہ ذی مفاصل کیڑے' یہ چیونٹیاں' یہ شہد کی مکھیاں' یہ مکڑیاں تجھے شکست دیں گی۔

"اخلاقی فضیلت نہ انسان کے اندر جوں کی توں ودیعت کی گئی ہے اور نہ اس کی فطرت کی مخالف ہے۔ اگر اخلاق انسانی فطرت کے بنے بنائے موجود ہوتے تو ان کے حصول کا کوئی مسئلہ بھی پیش نہ آتا اور جبلت کے خلاف ہوتے ان کا حصول ناممکن ہوتا' حقیقت یہ ہے کہ انسان کے اندر اخلاق کے حصول کی صلاحیت فطرت کی طرف سے ودیعت کی گئی ہے۔ یہ ایک بالقوہ صلاحیت ہے' اس کے بالفعل آنے کیلئے صرف علم نہیں بلکہ عادت کی ضرورت ہے۔"

اچھا' یہ بات ہے۔ اور آپ کا اسم شریف؟ ارسطو' اچھا آیئے میں آپ کو انسان کے اخلاق کی سیر کراؤں۔ دیکھئے یہ ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی کی ایک گلی ہے' یہ دیکھ رہے ہیں آپ یہ فوج کے سپاہی ہیں' اور ان کے پیچھے پیچھے یہ دس' بارہ' پندرہ مادر زاد ننگی لڑکیاں چلی آ رہی ہیں۔ ان کے ہونٹ خشک ہیں' ان کے بال الجھے ہوئے ہیں' ان کے ننگے پیر جھلس چکے ہیں۔ ان لڑکیوں میں دو تین ایسی بھی ہیں جنہوں نے گھر سے باہر قدم نہیں نکالا تھا۔ ان میں سے کسی کا جسم تو کیا کسی کا چہرہ بھی کسی غیر مرد نے نہیں دیکھا تھا' ان کے جسم سڈول ہیں اور ان میں جوانی کا رس بھرا ہے' یہ شریف لڑکیاں کہلاتی تھیں اور اسلئے مرغیوں کی طرح ڈربے میں بند رکھی گئیں کہ شریف بچے پیدا کریں' اب

تو انہیں دیکھ رہا ہے ارسطو' یہ کیا ہے؟ تو اپنی آنکھوں پر ہاتھ کیوں رکھے لے رہا ہے؟ اور ایک ذرا تیز لڑکی نے جو پہلے بڑی شوخ و شنگ ہو گی پلٹ کے ارسطو سے کہا۔ "دیکھ ہمیں اچھی طرح دیکھ' ہمیں سیکڑوں مرد خراب کر چکے ہیں' آ تو بھی خراب کر لے۔"

کورو کشیتر میں سری کرشن نے ارجن کو تعلیم دی' دسویں ادھیارے کے دوران میں اس نے کہا کہ میری ذات ہر شے کی خلاق ہے' مجھ ہی سے ہر ایک شے نکلتی ہے' جنہیں اس حقیقت کا عرفان ہے' وہ مجھ ہی سے دھیان لگاتے ہیں۔ وہ میرے ہی آرزو مند ہیں' میری ذات سے ہم آہنگ ہیں میرے نغمہ عشق کا سامان ہیں۔ جو لوگ اس طرح میری محبت میں ڈوبے ہیں میں انہیں بدھی کا یوگ بخشتا ہوں۔

لاکھوں شرن ارتھی اسی کورو کشیتر کے میدان میں جمع تھے۔ جیسے زمین کے نیچے چیونٹیاں' جیسے دیمک' جیسے حشرات الارض۔ ہیضہ بیماریاں' سر شام آدمیوں کا ایک سیلاب تھا جو سینکڑوں میل سے مختلف دھاروں میں بہتا چلا آیا تھا اور یہاں اس کا بند سا باندھ دیا گیا تھا' راستے بھر یہ انسان دن کو چلتے رہے' لٹتے رہے' راتوں کو ٹھہرتے رہے' لٹتے رہے' ان کے بچے ذبح کیے گئے' ان کے جوان مارے گئے' ان کی عورتیں چھینی گئیں۔ پھر انہوں نے سرحد پار کی اب سردار پٹیل اور مہاراجہ پٹیالہ کی عملداری تھی۔ اب دن کو یہ چلتے رہے' لوٹتے رہے' چھاپے مارتے رہے' راتوں کو ٹھہرتے رہے' لوٹتے رہے۔ چھاپے مارتے رہے۔ بچوں کو ذبح کرتے رہے' جوانوں کو مارتے رہے' عورتوں کو پکڑتے رہے' جس طرح ٹڈی دل آ کے ہزارہا میل تک کھیتوں کو صفاچٹ کر دیتے ہیں' انہوں نے ہندوستان کی انسانیت' اخلاق' تہذیب کو ختم کر دیا۔

انہوں نے فاقے کیے' ہوائی جہازوں سے روٹیاں برسیں' اب اپنے اس مصنوعی شہر' پانڈوؤں اور کوروؤں کی اس رزمگاہ میں ان کی روحیں فاقہ کر رہی ہیں' عفونت' غلاظت' سڑاہند' ایک کیمپ آفیسر نے اپنے پرانے ساتھی فوجی افسر سے کہا۔ ان لوگوں سے ناک میں دم ہے' کسی کی بیٹی پاخانے جا رہی تھی' کسی نے اس کی چھاتیاں دبا دیں۔ وہ فریاد لے کر آیا۔ کوئی کسی کی جورو پر چڑھ بیٹھا۔ وہ فریاد لے کے آیا۔ کسی نے اپنے ہم فرقہ جھگڑے والے کو لوٹ لیا۔ چلو اب پولیس سے جھگڑا کرو۔

رات بانکی تلنگن نے ایک اور انگڑائی لی۔ اور اس کے افشاں کے تارے ایک

ایک کر کے کم ہونے لگے اور تب انسان کے شعور نے وہ سیڑھی جس کے سب کے اوپر کے زینے پر وہ جھولا جھول رہا تھا' ایک کنوئیں میں لٹکا دی جو لاشوں سے بھرا ہوا تھا۔ ممکن ہے کوئی لاش پھر سے سیڑھی کے تمام زینے چڑھ کے اوپر کے زینے تک پہنچ جائے اور انسان کا شعور پھر سکندر کے لاشعور میں ضم ہو گیا' جو پلاسٹر میں بندھا ہوا ایک سو پانچ بخار میں بھنتا ہوا ہسپتال میں اپنے بستر پر بستر کی عظیم الشان وسعت میں کروٹیں بدل رہا تھا"۔

غضنفر دوسرے ہی دن دکن ایئرویز کے ہوائی جہاز سے دلی روانہ ہوا۔ امید کے خلاف امید کا دیا جھلملاتا رہا' یہ ساری آگ ہمارے لیڈروں نے لگائی ہے۔ اس آزادی سے اس تقسیم سے' اس پاکستان سے اس ہندوستان سے کیا مل گیا۔ اچاریہ کیا شاندار نام ہے۔ اور اکساؤ' اکساؤ ملک---- ارے یہ بھی خیال نہیں کہ چنگیز اور ہلاکو مسلمان نہیں۔ مسلمانوں کے قاتل تھے' ان کی پیروی کی دھمکی دینا کیا ضروری تھی۔ اس دن میاں بشیر احمد سر سے ہاتھ لگائے بیٹھے تھے کہ پنجاب لیگ کے صدر اور معتمد میں یہ حجت تھی کہ فسادات کے مقابلے کیلئے کون زیادہ چندہ دے اور نتیجہ یہ کہ کسی نے چندہ نہیں دیا اور پھر ان سب سے بڑھ کے اکی دکی داستان' اس داستان کا خیال آتے ہی اپنے ماں باپ' بہن بھائیوں کی یاد کی خلش ذرا کم ہوئی' پریشانی سے دماغ میں جو الجھاؤ تھا وہ ذرا کم ہوا اور وہ خود بخود مسکرانے لگا۔ یہ اکی دکی داستان اس کا جواب شاید ہی ملے.....

اور ہوائی جہاز میں اونگھتے اونگھتے غضنفر نے سوچا' کیا یہ لاکھوں اس لئے مرے کہ یہ لوگ حکومت کریں۔ پاکستان پر' ہندوستان پر...... یہ مزے اڑائیں اور انسان مارے جائیں۔ اور میرے اپنے ماں باپ' بھائی بہن..... ہوائی جہاز اتر رہا تھا۔ نربدا بڑی شان و شوکت سے ایک گندے نالے کی طرح نیچے بہہ رہی تھی۔ ایک پہاڑ زن سے ہوائی جہاز کے نیچے سے آ کر گزر گیا اور بھوپال کا تال' ایک چوڑے سے نیلے نگینے کی طرح نظر آیا' اس کے بعد گوالیار پھر دہلی۔

دہلی پہنچ کے غضنفر نے ایک لمحہ رائیگاں نہیں کیا۔ گورنمنٹ آف انڈیا میں اس کے کافی دوست تھے۔ وہ ایک ہندو دوست کے ہاں ٹھہرا۔ وہ موقعہ واردات پر گیا جہاں اس نے اپنی ماں' باپ تہور اور بتول کی لاشیں پہچانیں۔ کٹی' سڑی' گلی لاشیں' سکینہ کا

کچھ پتہ نہیں چلا۔ اور اب تک پتہ نہیں۔ کوئی دو سو قدم کے فاصلے پر جھاڑیوں کے جھنڈ میں ایک نوجوان لڑکی کی برہنہ لاش تھی۔ سینکڑوں جانوروں کی ہوس سے پامال جسم سوج گیا تھا' اور درندوں نے اس کے بے ہوش جسم کو تنہا چھوڑنے سے پہلے ایک بڑے سے پتھر سے اس کا چہرہ اور سر کچل دیا تھا۔ لاش پہچانی نہ جا سکتی تھی۔ غضنفر جس نے پندرہ سال پہلے سے اب تک اپنی بہن کو ریشم میں ملبوس دیکھا تھا کیونکر پہچان سکتا کہ یہ جوان لڑکی کون تھی' پھر مہینوں بعد جب خواجہ شہاب الدین کا بیان اخباروں میں چھپا کہ ایک گریجویٹ لڑکی ایک ان پڑھ کمہار کی کنیز اور داشتہ کی حیثیت سے زندگی گزار رہی ہے' تو تینوں بھائیوں کی نبضیں تیز ہوئیں اور پھر ڈوب گئیں' مگر وہ تو کپور تھلہ کا ذکر تھا' اور وہ لڑکی کوئی پنجابی لڑکی ہو گی جو پاکستان پہنچا دی گئی ہو گی۔

پھر وہ ہسپتال گیا اور اس نے اپنے بھائی سکندر کو دیکھا جو گردن اور سر کے زخم سے بے ہوش سرسام کے عالم میں تھا۔

سکندر اعظم' ارسطو کا شاگرد۔ ارسطو نے فوجیوں کی حفاظت میں برہنہ عورتوں کو دیکھ کر آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ ہزار ہا سال پہلے اس نے سکندر سے کہا تھا' ساری دنیا فتح کر سکندر' ارسطو' انسان کامل۔

کالی رات آئی۔ بانکی تلنگن۔ مانگ میں تاروں کا افشاں' پیشانی پر چاند کا جھومر' انسان جو سیڑھی کے سب سے اونچے زینے پر فضا میں جھول رہا تھا' اس نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اور انسان کامل ہونے کا دعوی کیا۔ جاننا چاہئے کہ انسان کامل بذات خود جمع حقائق وجودیہ کے مقابل ہے وہ اپنی لطافت میں حقائق علویہ کے مقابل ہے اور کثافت میں حقائق سفلیہ کے مقابل ہے۔ حقائق خلقیہ سے اولاً" جو چیز اس کے مقابل ہے وہ عرش ہے۔

ارتقاء کی سیڑھی سے انسان کامل عرش کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دیکھو میں برق کا پیغام بر ہوں میں ایک بڑا سا قطرہ ہوں جو ابر سے ٹپکا ہے۔ برق بہرحال انسان کامل ہے' یوں کہا زرتشت نے۔

پاکستان اور ہندوستان کی سرحد پر ایک معبد میں جو معلوم نہیں مسجد تھا یا گوردوارہ یا مندر یا کلیسا' ایک عورت کی لاش سڑ رہی تھی اور یہاں سے دیوی ماتا انسان کو کائنات

کو' انسان کامل کو جنم دیتی ہے' وہاں ایک کتاب کا ورق بہیمیت اور قتل کے بعد ٹھونس دیا گیا تھا۔ ذرا ہندوستان کے وزیر اعظم اور پاکستان کے قائد اعظم کو بلاؤ۔ اس کالی رات میں شاید وہ پڑھ کر بتا سکیں کہ یہ ورق کس مقدس کتاب کا ہے۔ قرآن مجید کا؟ مقدس وید کا؟ گرنتھ صاحب کا؟ انجیل مقدس کا؟ کیونسٹ مینی فسٹو کا؟ برگساں کی ارتقائے تخلیقی کا؟

شرما کے انسان کامل نے سیڑھی پھر اس کنوئیں میں لٹکا دی جس میں لاشیں سڑ رہی تھیں اور نیچے اترنا شروع کیا۔ اس زینے پر جہاں درندے تھے۔۔۔۔ اس زینے پر جہاں حشرات الارض تھے جہاں لاشوں میں بلبلاتے ہوئے کیڑے تھے اور پھر انسان کامل معدوم ہو گیا۔

جب غضنفر ماں باپ کی اور اس نامعلوم لڑکی کی لاش سپرد خاک کر کے آیا تو ہسپتال میں سکندر سرسام کی حالت میں ختم ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "بڑا افسوس ہے...... اس کی جان بچانے کی ہم نے بہت کوشش کی۔"

OO

جادُو کا پہاڑ

(۱)

میدان

صبح کے چھ بجے دھُوپ نے دماغ میں گھنٹے بجانا شروع کیے۔ بُش شرٹ میں مرد عورتوں جیسے معلوم ہوتے ہیں۔ سلیکس میں عورتیں مردوں جیسی معلوم ہوتی ہیں۔ پتلے سُرخ ہونٹ مُسکرائے۔ "آپ تو آج بڑے جامہ زیب نظر آرہے ہیں"۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں نے پتلے سُرخ ہونٹوں کے پیچھے لمبے نوکدار دانتوں کو نظر انداز کر دیا۔ انسان گوشت خور جانور ہے۔ دھوپ نے دماغ پر ہتھوڑے جمائے۔ "آپ بھی تو آج بڑی خوبصورت معلوم ہو رہی ہیں"۔ اور پتلے سُرخ ہونٹ پھر مُسکرائے۔ نیلی آنکھیں ناچیں۔ بھُورے کٹے ہوئے بال ہوا میں لہرائے۔

"اوہ تھینک یو"۔ اور پتلے سُرخ ہونٹوں نے سیٹی بجائی۔ کُتّے کی مادہ دُم ہلاتی ہوئی آئی۔

پھر دھوپ نے آنکھوں میں برچھیاں چبھوئیں۔ ہلکے آسمانی رنگ کا دوپٹہ لہرایا۔ شلوار پہنے ہوئے۔ الف لیلہ اور شکنتلا اور صاف گوئی۔ ادب اور شاعری میں سُرین کی تعریف کرنے میں ہرج ہی کیا ہے۔ خدُا نے یہ کیا عجیب و غریب چیز بنائی ہے جس کو عورت کہتے ہیں اور عورت نے یہ کیا عجیب و غریب چیز پہن رکھی ہے جس کو شلوار کہتے ہیں۔ لوٹے دار فراک نُما قمیص پر ہلکا آسمانی دوپٹہ پھر لہرایا۔ موٹے عنابی ہونٹ مُسکراہٹ کے لیے ذرا پھیلے اور گرمی کی شدید

شکنیں دُور ہوگئیں۔ پھر کالی رسیلی آنکھوں نے دو تیر جوڑے ۔"شیام! گیٹ کتنے بجے کھُلتا ہے؟"
"نو بجے کے دس یا بیس منٹ پر۔ بھئی مجھے یاد نہیں۔ سامان سب رکھوا دیا ہے تو چلو۔"
اور ٹوسیٹر کا دل زور سے دھڑکا۔ موٹر سائیکل کے دل کی طرح۔ بُش شرٹ نے اسٹیرنگ وہیل سنبھالا۔ پنجابی حُسن نے اینگلو انڈین حُسن اور بُش شرٹ کے درمیان اپنے لیے جگہ محفوظ کر لی۔

"یوکلپٹس، یوکلپٹس، یوکلپٹس، مجھے یوکلپٹس سے سخت نفرت ہے۔" اور اکسلی ریٹر پر پاؤں زور سے پڑا۔ یوکلپٹس کے سب درخت پیچھے رہ گئے۔
"اچھا، سخت نفرت ہے؟" نیلی آنکھوں نے پوچھا۔ لیکن نیلی آنکھوں میں پانی ہی پانی ہوتا ہے۔ تیر نہیں ہوتے۔
موٹے عنابی ہونٹوں سے کچھ اُوپر جو دو کالی رسیلی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اُن میں تیر البتہ تھے۔ ایک دم سے اسٹیرنگ وہیل چلانے والے سخت ہاتھوں پر تیروں کی بارش ہوئی۔ بایاں رُخسار، کنپٹی کے بال، ناک کی نوک کا بایاں رُخ، اور چوڑا شانہ بھی تیروں کی زد میں آگئے۔ بائیں آنکھ تو مجرُوح بھی ہوگئی ہوتی۔ مگر سامنے سے سیلاب کی طرح اُمنڈتی ہوئی تارکول کی سڑک پر کھیلنے میں منہمک تھی۔" نفرت تو مجھیں بہت سی چیزوں سے ہے۔ میرے بال بنانے کے طریقے سے۔ اُس خوشبُو سے جو گریس لگاتی ہے۔ کیوں گریس؟ ٹی۔ ایس ایلیٹ کی شاعری سے ہوٹل کے منیجر کی حماقت آمیز مسکراہٹ سے، اپنی خطرناک ذہانت سے، آنریبل فنانس ممبر کے انگریزی لہجے سے، سر محمد عثمان کی ترکی ٹوپی سے ... ..."
"کملا، بھگوان کے لیے ... ..."
گریس نے کھڑکی سے جادُو کے پہاڑ کی طرف دیکھا۔ گھروندے بلندی پر دُھندلی دھُوپ میں چمک رہے تھے۔" ترکی ٹوپی؟ ... ... ہاں مجھے بھی ترکی ٹوپی ایسی زیادہ پسند نہیں۔"
موٹے عنابی ہونٹ پھڑکے مسکرائے۔ سینہ تن گیا اور شیام کے حواس نے محض لاشعور کی قوّت سے اس تناؤ کو محسوس کیا۔ کملا نے کہا۔" گریس ایسا ہے تو آؤ۔ ہم تم جگہ بدل لیں تم میرے شوہر کے پاس یہاں بیٹھ جاؤ اور وہ جو کہے۔ ہاں میں ہاں ملاتی جاؤ۔"

سامنے دُور سے ایک فوجی لاری آتی ہوئی دکھائی دی۔ "کملا ڈارلنگ، یہ بڑی بداخلاق ہے۔" اور شیام نے آتی ہوئی فوجی لاری پر نظریں گاڑ دیں۔

"مجھے بڑا افسوس ہے گریس ڈارلنگ، تم خفا تو نہیں ہوگئیں۔" اور عنابی موٹے ہونٹوں نے سُرخ سُرخ اینگلو انڈین رُخسار کا بوسہ لیا۔ شیام کے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ فوجی لاری زوُں سے گذر گئی۔ کالے جمے ہوئے بال، بھورے بالوں سے الگ ہوگئے۔

"یہ سُور فوجی لاریوں کے ڈرائیور موٹر چلانا تو جانتے ہی نہیں۔"

دایاں ہاتھ! فراک نما قمیص کی چھینٹ ہوتی بوُٹے دار آستین میں لپٹا اُوپر اٹھا۔ اور شیام کی گردن میں حمائل ہوگیا۔

اور پھر راجپور۔ باغوں کا گاؤں، ہرا ہی ہرا، سبز ہی سبز، جھاڑیاں، لپستہ قد جھاڑیاں جیسے نباتی شیطان، نباتی چڑیلیں۔ ایک دوسرے سے دست و گریبان، کبھی دوُر دوُر پر ایک دوسرے کو تاکتی ہوئی، شیطانی، خاردار نیتیں۔ یہ نباتی چڑیلیں۔ ابھی دیوار کے ٹھنڈے فرشتے بہت دوُر ہیں، بہت دور، بہت اُوپر۔

دروازہ بند تھا۔ فوجی لاریاں، ایک دو تین، پھر ایک ٹیکسی، پھر سہارنپور یو پی نمبر ۲۴۴۸ پھر ایک اسٹیشن ویگن، پھر رام پور کی ایک گاڑی۔ پھر، پھر۔ ٹوسیٹر کے قلب کی حرکت دھیمی پڑی، پھر بند ہوگئی۔ آفتاب نے نباتات تارکول کی سڑک اور کمر تک ننگے فوجی سپاہیوں کے قہقہوں میں آگ لگا دی۔ لوہے کی سلاخوں کی طرح جلتی ہوئی اُنگلیوں نے دستی نکالی اور پیشانی اور گردن سے پسینے کا دریا اُبل پڑا۔

"گرمی بہت ہے۔ ہے نہیں۔" کملا نے معصومیّت سے پوچھا۔ حالانکہ خود اُس کے کپڑے پسینے سے جسم پر چپک رہے تھے۔

"بالکل دوزخ کی طرح۔" گریس نے دھوُپ کی عینک اُتار کے پیشانی صاف کی۔ ہلکا سانولا ہاتھ پھر اپنے پتی کی گردن میں حمائل ہوا۔ کچھ فوجی سامنے کی لاری پر مُسکرائے اور ایک دوسرے کو ایسٹ اینڈ کی خالص ترین کاکنی میں گالیاں دینے لگے۔ کملا نے لپ اسٹک نکال کے ہونٹوں کے شکنوں کے علاج کی ذرا کوشش کی۔ پھر مایوس ہو کر اپنا سر شیام کے کندھے

پر رکھ دیا۔

"کملا بھگوان کے لیے، اوّل ہی اتنی گرمی ہے ... ... ذرا ہٹ کر بیٹھو۔"

"ڈارلنگ! یہ بڑی بد اخلاقی ہے ... ... خیر مَیں ہٹی جاتی ہوں۔"

"تھینک یو ... . معاف کرو ڈارلنگ، مگر مجھے اس کمبخت گرمی سے سخت نفرت ہے۔ اس سخت گرمی میں ڈرائیو کرنے سے سخت نفرت ہے۔"

"تمھیں مجھی سے سخت نفرت ہے؟"

"کملا یہ سڑک بھی کوئی لڑنے کی جگہ ہے؟ ڈارلنگ بھگوان کی قسم مجھے تم سے بہت محبت ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ۔ اور یہ تمھیں اچھی طرح معلوم ہے۔"

گریس نے اظہار اور ردّ عمل کے تمام دروازے بند کر لیے۔ اس ٹوسیٹر میں نہ شیام اور کملا تھے اور نہ ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔

جنّت کا دروازہ کھُلا، فوجی پہنچے، لاریوں کی ـــــ ان بیسویں صدی کے ہاتھیوں کی ـــــ چنگھاڑ شروع ہوئی۔ اور سب موٹروں نے حرکت کی۔

کملا اپنے محاذ پر قائم تھی۔

"اب میں تمھارے پاس تو ہرگز نہ بیٹھوں گی۔"

"دیکھو، بیوقوفی کی باتیں نہ کرو۔"

پیچھے سے دو موٹروں نے ہارن بجائے اور آگے نکل گئیں۔

"نہیں میں تو تمھارے پاس ہرگز نہیں بیٹھوں گی۔ گریس مہربانی کر کے دروازہ کھولو میں یہیں سے ڈوُن اور ڈوُن سے دلّی واپس چلی جاؤں گی۔"

اب گریس نے ردّ عمل کی ضرورت محسوس کی۔ "کملا ڈارلنگ! بیوقوفی کی باتیں نہ کرو۔ شیام کا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"بہر حال اب میں شیام کے پاس نہیں بیٹھوں گی۔ گریس کیا تم مجھ پر ایک عنایت کر سکو گی؟"

؟ ـــــ!

"آؤ تم یہاں بیچ میں بیٹھ جاؤ۔ میرا جی چاہے گا تو تمھاری گردن میں باہیں ڈال لوں گی"
بُش شرٹ کا کالر، دھوپ اور گرمی سے کُشتی ہار کے، ہیجان ہو کے پیچھے کے گدّے کے سرے پر بے جان سا ہو کے گر گیا۔

"کملا، تم .... تم بالکل ناممکن ہو؟" اور سورج کا شعلہ اُس کے بھیجے کو پُھک رہا تھا۔

پتلے سُرخ ہونٹ مُسکرائے۔

"پلیس گریس"

"گریس۔ اچھا بیچ میں تم ہی آجاؤ سہی"

نسوانی اعضا میں غضب کی لچک اور پیچ و خم کی صلاحیت ہوتی ہے۔ کسی کے موٹر سے اُترے بغیر اور جگہ دیے بغیر گریس ہنستی ہوئی کملا کے اوپر سے ہو کے بیچ میں بیٹھ گئی۔

اور چڑھائی شروع ہوئی۔

برق و باراں یا زلزلے کے قلم تراش نے ایک پہاڑی کو کاٹ دیا تھا اور ہر بارش میں اس سے لاکھوں کروڑوں سنگریزے جھڑتے تھے۔ جن سے آس پاس کے تمام پہاڑی نالوں کے دامن بھرے ہوئے تھے۔

اور پھر ایک پُل آیا۔ اور باقاعدہ چڑھائی شروع ہوئی۔ تارکول کی لکیر تارکول کا سانپ بن گئی اور ہر موڑ پر گاڑی کے مسافر ایک طرف جھک سے جاتے اور رفتہ رفتہ.... ... رفتہ رفتہ ... ...

پہلے شیام نے محسوس کیا کہ اُس کا گھٹنا، گریس کے گھٹنے سے، اُس کی ران گریس کی ران سے ان پہاڑی موڑوں پر جب مل جاتی ہے تو ایک برق سی دوڑ ....

اور کنکھیوں سے کملا کی طرف دیکھا وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ پہاڑ کی ڈھلوان اور یہ درخت۔ یہ ناممکن درخت۔

"یہاں دیودار تو نظر ہی نہیں آتے ہیں"۔ گریس نے ناگوار خاموشی کا سلسلہ ختم کیا۔

"ہاں ڈارلنگ"۔ کملا نے گریس کے بالوں پر آہستہ سے ہاتھ پھیرا۔ "البتہ اوپر اوپر

کہیں کہیں دیودار ہیں۔ ورنہ یہاں تو زیادہ تر شاہ بلوط ....."

"مجھے شاہ بلوط سے سخت نفرت ہے۔" شیام نے کہا اور ایک موڑ پر پھر اُس نے گریس کے جسم کا ہلکا سا لطیف دباؤ محسوس کیا اور اُس کے جواب میں ہلکا سا دباؤ..... لیکن گریس کملا کی طرف ذرا ہٹ گئی۔

"ڈیمن اٹ آل" شیام کے ذہن نے ایک فرضی سگریٹ کا کش لیتے ہوئے سوچا۔ "اب یہاں اُوپر تو اتنی گرمی بھی نہیں۔ یہ عورت کیوں سرک کے ہٹ گئی ..... یہ عورتیں ..... یہ عورتیں ..... یہ ہمیشہ غلط کام کرتی ہیں۔ کملا آ کے لپٹتی ہی جائے گی۔ گریس ہٹتی ہی جائے گی" کہ اتنے میں ایک موڑ اور آیا۔

پہاڑ کے موڑ اور جسم کے دباؤ اور لمس کا سلسلہ جاری رہا..... یہاں تک کہ گریس کملا سے ہنس ہنس کے باتیں کرتی رہی۔ مگر اُس کے جسم کا مدافعانہ سمٹاؤ کم ہوتا گیا۔ یہاں تک یہاں تک۔

کہ کملا کی نظر جو پڑی تو شیام اور گریس ٹانگ سے ٹانگ بھڑائے بیٹھے تھے۔ ایک لمحے کے لیے نینوں کے بان زہر آلود ہو گئے۔ شیام کے لاشعور میں اس زہر سے ہلچل سی مچ گئی۔ برقی رو دفعتہً رُک گئی۔ اس کی ٹانگ ہٹ گئی اور موٹر کی رفتار تیز ہو گئی۔ گریس کے چہرے پر سُرخی دوڑ گئی اور کملا کے چہرے پر مکاری کی اِنتہائی پُرخلوص مُسکراہٹ "ہاں ڈارلنگ۔ مسز ساجد علی کی پارٹیوں میں جاتے ہوئے میں کانپتی ہوں۔ ایک دن سیر کے بعد انھوں نے ڈاکٹر تلچاپورکر سے میرا تعارف کرایا اور ڈاکٹر تلچاپورکر نے جھپٹ کے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ گریس ڈارلنگ۔ یقین مانو اس شخص نے ہاتھ سے پلاؤ اور قورمہ کھایا تھا اور ہاتھ شاید رومال میں پونچھ لیا ہو۔ لیکن دھویا ہرگز نہیں تھا، تمام چکنائی ویسی ہی لگی ہوئی تھی۔ خود میرے ہاتھ سے تین دن تک اس چکنائی کی بُو نہ گئی اور مجھ سے کھانا نہیں کھایا گیا۔ شیام سے پوچھو کیوں یہ ڈارلنگ تم کو یاد ہے نا؟"

جھوٹی ہنسی موڑ پر شاہ بلوط کے درختوں میں گونجی: "ہاں ڈارلنگ مجھے یاد ہے۔ لیکن ڈاکٹر تلچاپورکر بڑے قابل آدمی ہیں۔ انھوں نے صوبۂ مدراس کے حق خود ارادیت پر جو کتاب

لکھی ہے، بڑی دلچسپ ہے۔"

"سچ مچ ڈارلنگ، مجھے بڑی شرم آتی ہے گریس ڈارلنگ۔ آج کل مجھ سے پڑھا نہیں جاتا۔ میں نے یہ کتاب نہیں پڑھی اور شیام پیارے تم کو یاد ہے۔ وہ مصنف جو ہمارے یہاں گذشتہ سال لنچ پر آیا تھا؟"

"کون کراکا۔"

"نہیں، بیوقوف۔ نہیں شیام ڈارلنگ۔ وہ انگریز مصنف جو آیا تھا۔ بیورلی کچھ۔ بیورلی ہلز نہیں وہ تو ہالی وُڈ والی پہاڑی ہے"۔ ...

نقرئی قہقہوں میں ہلکے سُرخ ہونٹوں کے پیچھے سے تیز گوشت خور دانت نمودار ہوئے۔

"بیورلی نکلس۔ یقیناً"۔ اسٹیرنگ وہیل کے ناخدا نے موڑ پر اس خوبی سے اپنا توازن باقی رکھا کہ ران ران سے اور گھٹنا گھٹنے سے مس نہ ہونے پائے۔ حالانکہ موڑ اتنی شدید قسم کا تھا (یا اگر موڑ مونٹ ہے تو تھی) کہ کملا اور گریس ایک دوسرے سے قریب قریب بغل گیر ہوگئیں۔

"ہاں بیورلی نکلس۔ اس نے اپنی کتاب بھی بھیجی تھی۔ وہ بھی میں نے نہیں پڑھی"۔ اور کملا شریر بچے کی طرح ہنسنے لگی۔

"ڈارلنگ ڈارلنگ"۔ شیام نے تنبیہہ کے لہجے میں کہا۔ "میں تو تمھیں شدت سے منع کرتا ہوں۔ کبھی اس کتاب کی تعریف نہ کرنا اور اگر سوسائٹی میں کبھی اس کا ذکر آجائے تو اُس کی سخت مذمت کرنا۔ وہ کتاب بڑے تعصب سے لکھی گئی ہے۔ دیکھو یاد رکھنا"۔

"کیوں ڈارلنگ کیا وہ بہت بری کتاب ہے؟"

"ہاں"۔

"تب تو میں اُسے ضرور پڑھوں گی"۔ اور کملا نے بچوں کی طرح تالیاں بجائیں۔

اسٹیرنگ وہیل پر پھر سخت ہاتھوں کی گرفت مضبوط ہوگئی اور دونوں ہونٹ بھنچ گئے۔ "ایک دن میرے ہاتھوں تمھارا۔ ..."

...... خون ہوگا۔" کملا نے ہسٹریائی قہقہے کے ساتھ جُملہ پورا کیا "شیام کبھی تو جدّت دکھاؤ۔ یہ دھمکی تو تم مجھے ڈیڑھ سال سے برابر ایک دن آڑ دیے جا رہے ہو۔"

گریس نے جلدی سے پہاڑی کے اوپر اشارہ کیا اور بے شک چوٹی سے نیچے دُور تک اُترتا ہوا جادو کا شہر صاف نظر آرہا تھا۔ منصوری، سوئٹزرلینڈ کا کوئی پہاڑی قصبہ جو ہمالیہ کے جنوب میں چھ ہزار فیٹ کی بلندی پر آباد کر دیا گیا ہو۔ وہی طرزِ تعمیر۔ ویسی ہی شیشے کی کھڑکیاں۔ وہی چوٹی سے منزل بہ منزل اُترتے ہوئے مکانات، وہی پہاڑی پگڈنڈیاں۔ وہی ہلکی ہلکی دُھند۔

"دیودار۔" کملا تالیاں بجا کے پھر طفلانہ خوشی سے چلائی۔

سورج نے دماغ پر گرمی کے ہتھوڑے مارنے چھوڑ دیے تھے۔ کھجوروں اور کھجور نما درختوں کی دنیا سے کئی ہزار فیٹ اوپر یہ نئی دُنیا آباد تھی۔ دیودار اگرچہ کم تھے مگر سچ مچ کے دیودار۔ ویسے نقلی دیودار نہیں جو بنگلور میں گریس کے گھر پر کرسمس کو منوّر ہوتے تھے۔

"یہ مقام ایسا بُرا تو معلوم نہیں ہوتا۔" گریس نے دفعتہً سنجیدہ ہو کر کہا۔

"نہیں، بالکل نہیں، میں نے اب تک جتنے ہل اسٹیشن دیکھے ہیں۔ اُن سب میں مجھے یہی سب سے زیادہ پسند ہے۔"

"لو ڈارلنگ ہم پہنچ ہی گئے،" شیام نے کملا کی طرف دیکھا جو دیوداروں اور اس بلندی کے دوسرے درختوں کی خنک خوشبو سے مست ہوئی جا رہی تھی۔

اور ایک اور شاندار موڑ کے بعد سنتری نے ہاتھ کا اشارہ کیا اور وہاں جہاں سب گاڑیاں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ اگر یک سر موئے برتر پرم ...... تو پھر ...... تو پھر ...... صوبے کے گورنر اور ہر کس و ناکس میں کیا فرق باقی رہ جائے۔

۲

پہاڑ

خدا نے انسان کو اپنی صورت کے مطابق بنایا۔ خدا نے انسان کو دنیا میں اپنا خلیفہ بنایا۔ اور انسان نے انسان کو بندر بنایا، کتا بنایا، خنزیر بنایا، بیل بنایا، گدھا بنایا۔ ایک انسان دوسرے کو "اُلّو کا پٹھا" اور "گدھا" کہہ کے خوش ہوتا ہے اور وہ جو اُلّو کا پٹھا یا گدھا کہا جاتا ہے۔ بُرا تو مانتا ہے مگر اس گالی کو اس قدر سخت نہیں سمجھتا جیسے اس گالی کو جس میں کسی قریبی عزیزہ کی ذلت کی جائے۔ پہاڑوں پر انسان نے انسان کو گھوڑا یا گدھا یا بیل ـــــ جو سمجھ لیجیے وہ ـــــ بنا کے اُسے سواری میں جوتا ہے جو سواری یہ جُتا ہوا انسان کھینچتا ہے۔ وہ رکشا کہلاتی ہے۔ جس طرح امیر آدمی اپنی بگھیوں کے گھوڑوں کو زرّیں جھول پہناتے ہیں۔ اسی طرح راجے مہاراجے اپنے رکشا کھینچنے والوں کو زرّیں وردیاں پہناتے ہیں۔ مگر کرائے کے ٹٹو کی طرح کرائے کا رکشا کھینچنے والا غلیظ اور بدبودار ہوتا ہے۔ خارشی ہوتا ہے اور بہت سی ایسی بیماریوں کا شکار ہوتا ہے۔ جن سے ٹٹو محفوظ ہوتے ہیں۔ کرائے کے ٹٹو کو چینہ اچھا ہی مل جاتا ہے۔ کیونکہ انسان اگر جانور کا مالک ہو تو بے زبان جانور پر رحم کرتا ہے اور اگر کہیں انسان کا مالک انسان ہو تو پھر رحم کرنا اپنے آپ پر ظلم کرنا ہے۔ کیوں کہ انسان سب جانوروں سے زیادہ دھوکا باز اور مکار ہے۔ جبھی تو سلسلۂ ارتقا کو دھوکا دے کر وہ اپنی دُم صدیوں پیچھے چھوڑ آیا۔ جب ہی تو اس نے زبان اور عقل کو اپنا آلۂ کار بنایا … اگر کہیں یہ رکشا کھینچنے والا کبھی محسوس کرنے لگے کہ میں صدیوں پیچھے اپنی دُم چھوڑ آیا ہوں، میری کھوپڑی میں عقل ہے۔ میرے منہ میں زبان ہے، میرے ہاتھ میں طاقت ہے تو پھر کیا ہو؟ اور رکشا کا مالک کانپ اٹھتا ہے۔ پھر نہ رکشا باقی رہے نہ رکشا کا مالک … …

الغرض بے دُم کے چھ جانور رکشا میں بے دُم کے تین انسانوں کو نشیب کی طرف لے کے دوڑتے ہوئے، بلندی کی طرف پوری طاقت کے ساتھ کھینچتے ہوئے، شارل ویل پہنچا آئے۔ دیودار کے درخت ابھی چھوٹے چھوٹے تھے۔ لیکن سروں پر آفتابِ قیامت کی طرح نیزے بھر کے فاصلے پر نہ تھا، ابھی انسان کے حشر و نشر کا زمانہ دور تھا۔ بڈھے بڈھے کرنل، اور ان کی اپنی اور زیادہ تر دوسروں کی بیویاں کافی پی رہی تھیں اور سب کی سب ایک ساتھ باتیں کر رہی تھیں۔

آدھے گھنٹے کے بعد شیام نے بیئر کا دوسرا گلاس ختم کر کے کملا سے کہا "ڈارلنگ اگر دس منٹ اور ان بوڑھے کرنلوں کو میں بیئر پیتا دیکھتا رہا تو پاگل ہو جاؤں گا۔۔۔۔ اور وہ تمھاری سہیلیاں، ڈپٹی کلکٹروں کی بیویاں ۔۔۔۔۔۔ مجھے ڈپٹی کلکٹروں کی بیویوں سے سخت نفرت ہے ۔۔۔۔۔"

"چلو چلیں، مال تک ایک چکر لگا آئیں۔ کیوں گریس ڈارلنگ تم ہمارے ساتھ چلو گی؟"

"ہاں بڑی خوشی سے، میں اس سے پہلے کبھی مسوری نہیں آئی۔"

"لنچ باہر کہیں کھائیں گے۔"

"ہاں کملا ڈارلنگ، مجھے شارل ویل کے کھانے سے سخت نفرت ہے ۔۔۔۔ بیرا" اور شیام اُٹھ کے اپنی فیلٹ ہیٹ لانے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

منصوری کے پیچھے ہمالیہ کی ایک ذرا زیادہ اونچی چوٹی پر برف کا بانکا تاج ہلکی شفاف دھوپ میں جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ کھڈوں میں اِکّے دُکّے دیودار، نیچے شاہ بلوط کے درختوں کو حقارت سے دیکھ رہے تھے۔ ایک دوکان میں ریشمی پائتابے پندرہ روپے جوڑ تھے، اور دوکان کا مالک کتھئی رنگ کے کھدر کی واسکٹ پہنے توند سہلا رہا تھا۔

"رام رام کیا لوٹ ہے۔"

چھوٹے سے پُل پر ہو کر، چھوٹے سے چوبی زینے کو، اور چوبی زینے سے نیچے کتابوں، پرچوں اور لکھنے پڑھنے کی دوکان کو راستہ جاتا تھا۔ جہاں سفید فام اینگلو انڈین بڑھیا ایک راجکماری کے ہاتھ پارکر قلم اور چاندی کی پنسلیں بیچ رہی تھی اور راجکماری کی کالی ساری پر ایک ایک فسٹ قطر کے روپہلے ستارے کڑھے ہوئے تھے۔

رشک اور نسوانی پسندیدگی سے کملا کی کالی رسیلی آنکھوں نے راجکماری کی طرف دیکھا۔ پھر مال کی دوسری دوکانوں کا جائزہ لینے لگیں۔ ایک نجومی کی دوکان پر بڑا سا ہاتھ تھا۔ قسمت، نجوم، ستارے، ہوروسکوپ، عملیات۔

"گریس ڈارلنگ، آؤ اس نجومی کو اپنا ہاتھ دکھلائیں۔"

"کملا کملا....." اور شوہر احتجاجاً خاموش ہو گیا۔

"ڈارلنگ! میں تو ضرور اپنا ہاتھ دکھاؤں گی۔ تم نہیں آتے ہو نہ آؤ ... ... اور تم ہم لوگوں کے ساتھ ساتھ پھر کیوں رہے ہو؟ مجھے اور گریس دونوں کو کورسٹ خریدنے ہیں... تم اُدھر جاؤ، ہم اِدھر جاتے ہیں۔"

"میں کدھر جاؤں؟"

"میں بتاؤں؟ وہ تمھیں یاد ہے۔ اس طرف آتے ہوئے ہم نے ڈاکٹر علی کا سائن بورڈ پڑھا تھا۔ دل، ہسٹریا اور موٹاپے کا اسپیشلسٹ۔ شیام پیارے ذرا ڈاکٹر علی کے پاس ہو آؤ نا؟"

"ڈارلنگ کیا تمھارا مدعا یہ ہے کہ میرا دل کمزور ہے یا مجھے ہسٹریا ہے، حالاں کہ تم جانتی ہو۔ ہسٹریا تمھیں ہے۔"

"نہیں شیام پیارے دل تو تمھارے پاس ہے ہی نہیں۔ کمزور یا بے زور کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ہسٹیریا مجھے سہی لیکن موٹاپا تو تمھیں ضرور ہے۔"

"گریس۔ کیا تمھارا خیال بھی یہی ہے کہ میں موٹا ہوں؟"

"نہیں شیام تُم موٹے تو نہیں ہو...."

"گریس، گریس، شیام کا دماغ مت خراب کرو۔ ان کا وزن ایک سو نوے پونڈ ہے تمھارے خیال میں جب تک ساڑھے تین سو پونڈ وزن نہ ہو۔ کوئی آدمی موٹا نہیں ہو سکتا۔ شیام پیارے مانو نہ مانو تمھیں اختیار ہے۔ خیر دل، ہسٹیریا، موٹاپے کا اسپیشلسٹ نہ سہی۔ اور کہیں ہو آؤ۔ گریس تمھارے سامنے کورسٹ انتخاب کرتے ہوئے شرمائے گی، کیوں گریس؟ شیام پیارے کیملس ہمپ کا ایک چکر نہ لگا آؤ۔ اونٹ کا کوہان کمر کا گھیر کم کرنے کے لیے مفید ہے۔"

"تو تھینک یو، یہ مال، کیملس ہمپ سے کیا کم ہے؟"

"تو میونسپل پارک سہی۔ سنا ہے وہاں اسنیپ ڈریگن کے پودے چھ چھ فیٹ اونچے ہیں۔ اور پھول۔ پھولوں کی تعریف ہی نہیں ہو سکتی ... ... سو لانگ ... گڈ بائی ڈارلنگ

...... ٹھیک پونے دو بجے ہیک مین میں۔ ایک میز ریزرو کرالینا۔ اُدھر کونے کے کمرے میں، جہاں سے دیودار بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں ...... بیچ کے ہال میں ہرگز نہیں ...... سولانگ ...... ڈار ...... لنگ۔"

منصوری بھر میں یہی ایک سڑک اُسے پسند تھی، نیچے تپتے ہوئے دوزخ میں ڈیرہ دون کی سفید عمارتیں اور سبز درخت اور تارکول کی وہ حرافہ راجپور کے گلزار کی طرف سے آتی ہوئی، اور اُس کے سینے پر سینکڑوں فوجی لاریوں، بسوں، موٹروں کے ٹائروں کا مساس۔ اسی لیے تو سڑک کو مونث کہتے ہیں ...... اور دور دور تک پہاڑ کے سلسلے پر پھیلی ہوئی کوٹھیاں۔ پگڈنڈیاں پہاڑوں پر چڑھتی ہوئی، اُترتی ہوئی، درختوں کے جھنڈوں میں چھپتی ہوئی، نمودار ہوتی ہوئی۔ ہیک مین گرینڈ ہوٹل کی عمارت میں ساڑی کی وہ دکان جہاں سے راجکماری نے فٹ فٹ بھر کے قطر کے روپہلے تاروں والی ساڑی خریدی ہوگی اور دوسری جانب چاکلیٹ، کینڈی، چوسنے کا گم ...... مٹھائی، مٹھائی ...... مٹھائی سے اُسے سخت نفرت تھی ...... جہاں ایک پگڈنڈی جزیرہ بن گئی تھی۔ وہاں لاریاں ہی لاریاں اور موٹریں۔ کسی مہاراجہ کی رولس رائس اور اُس کی اپنی ٹوسیٹر۔ اُس نے لکی اسٹرائک آہستہ آہستہ سُلگایا اور جنگلے کا سہارا لے کر کھڑا ہوگیا۔

میلے کچیلے بدبودار رکشا قلی کچھ دور پر بیٹھے گانجہ، چرس یا اسی قسم کی کوئی نشہ آور چیز پی رہے تھے۔ جنگلے کے پاس کچھ فاصلے پر چھ سات امریکن سپاہی، آپس میں ہنسی مذاق کی باتیں کر رہے تھے۔ سب کے سب یہودی تھے۔ سب کی ناکیں لانبی اور بال بالکل کالے تھے۔ "شلومیل" اُن میں سے ایک لمبی ناک والے نے دوسرے لمبی ناک والے سے کہا۔ نیچے تارکول کا لانبا سانپ بل کھاتا ہوا، پیچ در پیچ، خم بہ خم۔ منصوری کی کالی زلف، جو چار ہزار فیٹ نیچے اُترتی چلی گئی اور اُس پر بند چھت کی ایک کالی موٹر جوں کی طرح رینگتی ہوئی۔ اُدھر اُس کے سامنے سے دو خوش پوش سکھ اور اُن کے درمیان گلابی سوٹ پہنے ایک بڑی خوبصورت عورت گذری۔ "کتابیں؟ کیڑی کتابیں؟" لدھیانے کے لہجے میں اور لاہور کے لہجے میں ذرا فرق ہے۔

کملا کے ساتھ دن رات رہ کے اس نے اس فرق کا اندازہ لگایا تھا۔ پہاڑی راستے کے پیچ و خم کے قریب کسی عمارت کی سبز زمرّدیں چھت روشنی میں جگمگائی اور دور بہت نیچے ڈیرہ دون کے دوزخ کو ابر کے ایک ٹکڑے نے تھوڑی دیر کے لیے سائے میں لے لیا۔ اُدھر دور پہاڑی دھند، بہت ہلکی سی دھند ایک موہوم سے جسم کے جانور کی طرح اوپر اٹھی، ایک انگڑائی لی اور اوپر کی طرف غائب ہو گئی۔ ایک ادھیڑ انگریز عورت کے ساتھ ایک ہندوستانی نوجوان ہاتھ میں ہاتھ دیے گذرا۔ لیڈی اردن کالج کی تین خوبصورت چڑیلیں قدم سے قدم، شلوار سے شلوار ملائے، اُدھر دیکھ کے ہنسیں، اور بیچ والی نے فقرہ چست کر ہی دیا۔ "اُس کی ماں معلوم ہوتی ہے"۔ شیام نے لکی اسٹرائک کا ایک ہلکا سا کش لے کے آنکھ ماری اور بیچ والی خوبصورت چڑیل ہونٹ بھینچ کے اپنی ساتھیوں سے کچھ بولی، پھر تینوں کچھ بولیں پھر تینوں کی چھ چمکدار آنکھوں نے شیام کی طرف دیکھا۔ تین خوبصورت ہونٹوں کے جوڑے کھی کھی ہنسے اور لیڈی اردن کالج کی شریر خوبصورت چڑیلیں سامنے کی پگڈنڈی پر چڑھنے لگیں۔ شیام نے آہستہ سے ہاتھ ہلایا۔ لیکن قدم سے قدم، شلوار سے شلوار ملاتے تینوں پریاں اوپر چڑھتی ہی چلی گئیں۔ جہاں مکان کی، شیشے کی کھڑکیاں آدھی کھلی ہوئی تھیں۔ پھر کلکتہ یونی ورسٹی کے ایک پروفیسر صاحب اپنی ایک پارسن شاگرد کے ساتھ گذرے جو کہہ رہی تھی، "بال ترشوانے کے اور بہت سے فائدے ہیں۔ پروفیسر آپ کو آرمی بیرکٹ کی ضرورت ہے۔ آخر آپ چھ چھ ماہ تک بال کیوں نہیں ترشواتے۔ کیا محض اس لیے کہ جو فوج ہندوستان پر قبضہ کیے ہوئے ہے۔ وہ پابندی سے ہر آٹھویں روز بال ترشواتی ہے اور آپ اس کو بدیسی طریقہ سمجھتے ہیں ہیں؟" پروفیسر صاحب جو اب جنگلے کے قریب کھڑے نیچے کا منظر دیکھ رہے تھے، ہنسے، کھدر کی قمیص کی جیب سے پان نکال کے کھایا، اونی شال جو وہ اوڑھے ہوئے تھے، اُسے پھر سے اوڑھا۔ اپنی پارسن شاگرد کے گال پر ہلکی سی چٹکی لی۔ "ٹھہر میں تیرے باپ سے شکایت کروں گا کہ مہرو اب مجھے بنانے لگی ہے"۔ مہرو اپنے وینٹی کیس سے پاوڈر بکس نکال کے اپنی صورت پر غازے اور سُرخی کے تناسب کا اندازہ لگا رہی تھی: "پروفیسر کم سے کم کھانے سے پہلے اپنے بال تو ٹھیک کر لیجیے۔ یہ لیجیے آئینہ"۔ پاوڈر بکس کے آئینے

میں اپنی صورت دیکھ کے پروفیسر نے اپنے ہاتھ سے اپنے بال تو ٹھیک کیے اور پاؤڈر کیس کو اس بے احتیاطی سے بند کیا کہ ہلکا گلابی رنگ کا پاؤڈر فضا میں اور مہرو کی پارسی وضع کی ہلکی نارنجی ساڑھی پر بکھر گیا۔ "اوہ پروفیسر" اُس نے ذرا احتجاج اور شوخی سے کہا اور پروفیسر کے ساتھ سیوائے کی طرف چلی گئی۔ اسی اثنا میں ایک رکشا پر چودہ پندرہ برس کی ایک نوجوان لڑکی ڈھیلے پائنچوں کا پاجامہ پہنے، ڈھلکی ہوئی اوڑھنی کمر پر ڈالے، نیم دراز، ہرکس و ناکس، ہر نوجوان سے آنکھیں ملاتی اور مسکراتی رکشا میں بہتی ہوئی چلی گئی ____ تب شیام نے گننا شروع کیا...... اینگلو انڈین عورتیں زیادہ، اور ہندوستانی کم۔ مگر یہ عورت رام رام بنارس کا ہندو حسن۔ بھگوان نے اسے مٹی سے نہیں مکھن سے بنایا ہے۔ مکھن کا جیسا رنگ، اجنتا کی دیویوں کی جیسی آنکھیں، بھاری بنارسی ساڑھی: "بھابی جی، آپ نے وجے لکشمی کا وہ نیا بیان پڑھا؟" پھر تین اینگلو انڈین لڑکیاں، پھر ایک شلوار۔ پھر تین سکھ اور دو سکھنیاں پھر یہ مدراسن نوگز کی سوتی ساڑی، چمپئی، رنگ زیادہ تر صورتیں واہیات، اُس نے بجھتے ہوئے سگریٹ سے دوسرا لکی اسٹرائک سلگایا۔ کبھی کبھی ایک آدھ صورت لبوں پر سرخی اور رخساروں پر غازہ لگائے بغیر بڑی سانولی سلونی معلوم ہوتی اور نیچے کے تپتے ہوئے میدانوں کی پری کی طرح ساڑھی میں لپٹی آہستہ آہستہ موڑ پر نظر سے غائب ہو جاتی۔ نیچے پہاڑی راستے اُترتے چڑھتے، بل کھاتے، خم کھاتے، آس پاس کی پہاڑیوں کے سینکڑوں خوبصورت بنگلوں کی طرف غائب ہو جاتے۔ ایک بھاری بھرکم میم صاحب ایک نجومی سے کہہ رہی تھیں: "اچھا بابا ہے تم ہمارے گھر پر آنے مانگتا۔ ہم انام دے گا۔" اور شیام نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ اب کملا کو آنا چاہیے۔ میم صاب۔ کراچی مچا چا۔ لندن میں ۱۰۶۶ء وغیرہ وغیرہ۔ پھر سکھ ہی سکھ آئے۔ طرح طرح کے خوش پوش سکھ، کچھ جو نیلے فلالین کے پتلون اور بڑے اچھے سلے ہوئے کوٹ پہنے تھے اور اُن کے ساتھ بڑی فیشن ایبل وضع کی شلواریں پہنے ہوئے سکھ عورتیں۔ شیام نے لکی اسٹرائک کا ایک اور کش لیا۔ دو خوبصورت سے چہرے ہلکے سنہرے بال، گلابی رخسار۔ پھر نیلے یونیفارم پہنے چھوٹی چھوٹی انگریز لڑکیاں ۔ اُدھر سے گذریں۔ پھر دو میمیں گذریں، جن میں سے ایک کے جوزئی رنگ کے بال آنکھوں میں کھب گئے، کمخواب کی شیروانی پہنے۔ سر پر اُسی کپڑے کی ٹوپی اوڑھے حنائی داڑھی سے چہرہ منور

کیے ہوئے ایک صاحب جو غالباً رام پور کے رہنے والے ہوں گے۔ قریب سے گذرے۔ اب آفتاب کی چمک ذرا تیز ہوگئی۔ ایک قبول صورت بھولی بھالی سانولی سی لڑکی ایک نوجوان کے ساتھ خاموش چلی جا رہی تھی۔ مولانا نے اُس کی طرف غور سے دیکھا۔ ایک اینگلو انڈین شیام کے بالکل قریب سے ہوکر گذری اور آنکھ لڑا کے مسکرائی۔ شیام نے پھر لکی اسٹرائک کا ایک کش لگایا۔ مُسکرایا۔ ہنسی تو پھنسی۔ ایک چھوٹی موٹی خاتون جو لکھنؤ کے ایک مشہور خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ کوئی تیس سال کی عمر ہوگی۔ سفید ساڑی پہنے، کمر لچکاتی، بالکل میدے کی لوئی جیسی صورت قریب سے گذریں۔ اور اگر شیام کو سگریٹ کے دھوئیں نے دھوکا نہیں دیا تو انھوں نے بھی یقیناً آنکھ لڑائی۔ جنگلے کے پاس ایک لمحے کے لیے ٹھہر کے نیچے سڑک کے پیچ وخم کا ملاحظہ فرما رہی تھیں کہ اتنے میں ایک مانوس آواز نے شیام کی گھورتی ہوئی آنکھ اور مُسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے ہونٹوں کو جھنجھوڑ کے بیدار کر دیا۔

" یقیناً مسٹر شیام سُندر کول آپ مجھے پہچانتے ہی ہوں گے۔ میرا نام کملا کماری کول ہے اور اب سے ڈیڑھ سال پہلے آپ کو یاد ہوگا۔ میری آپ کی شادی ہوئی تھی۔ اس وقت مجھے سخت بھوک لگی ہے۔"

لکھنؤ کی خاتون نے یہ دیکھ کر کہ مدعیہ کا دعوے زوردار ہے۔ فرار کی ٹھانی اور پان چباتی ہوئی بائیں جانب سیوائے کی طرف چل دیں۔

گریس نے کہا۔" مَیں اس قدر تھک گئی ہوں کہ اب گرنے ہی والی ہوں۔"

ہیک مین میں دسترخوان ذرا سا میلا تھا۔ رکابیاں بھی میلی ہی تھیں۔ بیرے کام میں ذرا سُست تھے۔ گورے بہت زیادہ تھے۔ باقی ہر چیز بہت اچھی تھی۔ کھانا مزے کا تھا۔ ملی گی ٹانی سوپ۔ کولڈ میٹ اور اس کے ساتھ بے مثل سیلڈ جس میں پیاز کے ٹکڑے بھی شامل تھے۔

" سیلڈ تو بالکل آسمانی ہے۔" گریس نے مزے لے کر کہا اور آخر میں اسٹرابیری اور کریم۔ لیکن سب سے زیادہ دلچسپ جو چیز تھی۔ وہ قریب کے میز پر ایک عورت تھی جو

بالکل کارمین میرانڈا کی نقل معلوم ہوتی تھی۔ اس میز کے "باسی" کسی عجیب و غریب زبان میں باتیں کر رہے تھے۔

"بیرے بیرے" کملا نے آواز دی۔

"کیوں کیا ہے؟"

"شیام تم تو بیرے نہیں ہونا؟"

"نہیں مگر کیا کام ہے؟"

"میں یہ پوچھوں گی کہ یہ لوگ کون ہیں؟ ... کیوں بیرے یہ کون لوگ ہیں؟"

"جی یہ ہمارے ملازم ہیں۔"

"تمھارے ملازم ہیں؟" بیرا کشتی اٹھائے اٹھائے ہنسا۔ "جی ہجور میرا یہ مطلب نہیں کہ میرے ملازم ہیں۔ ہجور یہ ہمارے ہوٹل کے ملازم ہیں۔ یہ عورت ڈانس کیبریٹ کا کام کرتی ہے۔"

"اچھا، اچھا۔ جاؤ۔ کافی لاؤ۔" شیام نے کہا۔

گریس بولی "یہ عورت غالباً پول ہے؟"

"رومانی۔ زبان فرانسیسی سے ملتی جلتی ہے۔" اور اسی درمیان میں ایک آدمی نے جو بھورے کوردورائے کا پتلون، اور سفید پولو شرٹ پہنے تھا، اُس کے شانوں پر ہاتھ گڑا دیے کوئی مذاق کی بات کہہ رہا تھا اور وہ عورت اپنے کولھے مٹکا رہی تھی اور قینچی کی طرح برابر زبان چلائے جا رہی تھی۔

کافی کا چمچہ نیچے گرا اور کملا اُسے اٹھانے کے لیے جھکی۔ شیام اور گریس دونوں ابھی تک رُومانوی عورت کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے جو کولھے مٹکاتی جاتی تھی اور قینچی کی طرح زبان چلائے جا رہی تھی۔ اور چمچہ اٹھاتے میں کملا نے دیکھا۔ گریس اور شیام دونوں کے پیر اُس رقص کے سُر پر تھرک رہے ہیں جس کو ہال میں ہوٹل کا آرکسٹرا بجا رہا تھا۔ لیکن تھرک اس طرح رہے ہیں کہ بار بار دونوں کے جُوتے ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ جاتے ہیں اور جُوتے کبھی کبھی ٹخنوں سے بھی لڑ جاتے ہیں مگر رقص کی تھرک جاری ہے۔

جلدی سے وہ سیدھی بیٹھ گئی اور ایک گہری شک کی نظر سے اُس نے اپنے شوہر اور اپنی سہیلی کی طرف دیکھا۔ پھر کھڑکی سے باہر اُس کی نظر دیو داروں پر پڑی۔ جن کے گہرے سبز حُسن نے اُس کی آنکھوں کو موہ لیا۔ باہر دھوپ بھی بڑی آب و تاب، بڑی خوبصورتی سے چمک رہی تھی اور ہوا میں جھاڑیوں اور بیلوں کی ٹہنیاں آہستہ آہستہ رقص کر رہی تھیں۔ ہوا کے آرکسٹرا کا سُر زیادہ معصوم تھا۔ اُس میں ٹہنیاں ٹہنیوں سے مل جاتی تھیں۔ کبھی کبھی پھنس جاتی تھیں، مگر ٹخنوں اور جُوتوں کے میل کی طرح ان میں کسی طرح کا تصنع نہیں تھا۔ کسی میز کے دسترخوان کے نیچے پناہ لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ اور کملا نے اپنے دل میں درد کی ایک عجیب کسک محسوس کی۔ کالی رسیلی آنکھیں شیام کے چہرے پر جم گئیں اور اُن میں پانی چھلکنے لگا۔

"کیا ہوٹل کو واپس چلو گی؟"

کملا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وینٹی کیس آڑے آیا۔ پاؤڈر لیف نے گالوں پر غازہ لگاتے لگاتے اُن آنسوؤں کو بھی اُچک لیا جو گرنے ہی والے تھے۔

شیام نے چند سیکنڈ کے بعد کہا: "ایکسلسیر میں اچھا فلم ہے۔ شوٹنگ سائرن میٹنی میں چلتی ہو؟"

"میں نے اُرمیلا اور پریش سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ میں اُن سے ملنے جاتی ہوں تمھاری خوشی ہوٹل جاتے ہو، ہوٹل جاؤ۔ سنیما جاتے ہو۔ سنیما جاؤ۔"

گریس بولی: "کملا ڈارلنگ۔ اپنی سہیلی سے پھر مل لینا۔ سنیما چلو، فلم بہت اچھا ہے۔"

"تو تم دونوں سنیما جاؤ۔ میں تو اُرمیلا سے ملنے جاؤں گی۔ تین سال سے میں نے اُرمیلا کو نہیں دیکھا۔"

شیام نے کہا: "کملا پیاری ... ..." اور اُس نے اپنی بیوی کی آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسو نہیں دیکھے۔

کملا نے گھڑی دیکھی اور جھوٹی ہنسی ہنسنے لگی۔ آنسو بِنا چھلک کے گرے ہوئے محض قوتِ ارادی سے کہیں غائب ہو گئے۔

اور اُرمیلا کے پاس بھی کسی طرح اُس کا جی نہیں لگا۔ اُرمیلا اور پریش نے چائے کے لیے اُسے روکنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن اُس نے یہی بہانہ کیا کہ شیام سے میں نے سینما کے بعد ملنے اور ساتھ چائے پینے کا وعدہ کیا ہے۔

اکسلسیر میں میٹنی ختم ہونے میں ابھی گھنٹہ بھر کی دیر باقی تھی۔ کھوج، جلن، کھوج، جلن،

"بابو جی ٹکٹ مل سکیں گے۔"

"جی۔ مگر فلم تو آدھے سے زیادہ دکھایا جا چکا ہے۔ خیر اگر آپ دیکھنا ہی چاہتی ہیں تو ذرا ٹھہریے۔ ہاں سنیے ...... بالکونی، صرف بالکونی میں ایک دو جگہیں خالی ہیں۔ یہ لیجیے ...... جی تین روپے بارہ آنے۔"

اندھیرا ہی اندھیرا۔ شاید دماغ میں اندھیرا تھا۔ آنکھوں میں دھند بھری تھی اور دماغ کی ایک رگ زور زور سے دھڑک رہی تھی، اُس نے پھر آنسو پونچھے۔ فلم، اب صاف نظر آرہا تھا اور وہ فلم دیکھنے میں محو ہو گئی اور پھر وہ سلسلۂ خیالی میں کھو گئی۔ اب سے چار برس پہلے جب وہ ولسن کالج بمبئی میں ایم۔ اے میں پڑھتی تھی۔ بس گرانٹ روڈ پر رُکی تھی۔ اور ایک ریلا اُسے بس کے اندر بہا لے گیا۔ جہاں اتنی بھیڑ تھی کہ کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہ تھی۔ گندی سڑی ہوئی سانسوں میں اسے عجیب کراہت معلوم ہوئی۔ اتنے میں سامنے سے ایک نوجوان نے ہٹ کے اُس کے لیے جگہ بنا دی۔ "آپ آرام سے کھڑی ہو جائیے" نوجوان اپنے دونوں ہاتھوں سے آہنی ریلنگ پکڑ کے کھڑا ہو گیا۔ اور وہ خود بے جان سی ہو کے اُس کے سہارے کھڑی ہو گئی اور پھر جو بس آگے بڑھی تو اُس نے محسوس کیا کہ نوجوان کا جسم اُس کے جسم سے چمٹا ہوا ہے۔ اُس کے کالے لہراتے ہوئے بال نوجوان کے کندھوں پر چھائے ہوئے ہیں۔ اُس کی پشت، کولھے، پیر سب اُس کے جسم کے سہارے قائم ہیں۔ اور اُس نے ایک برقی رو اور ایک آگ سی محسوس کی۔ جس میں وہ پگھلنے لگی۔ آگے جہاں بس ٹھہری وہاں بہت سے لوگ اُتر گئے۔ کئی نشستیں خالی ہوئیں۔ وہ خود جھپٹ کے ایک ایسی نشست پر بیٹھ گئی۔ جہاں پہلے ہلکے بھورے رنگ کے بالوں والی ایک اینگلو انڈین لڑکی بیٹھی تھی ...... وہ نوجوان جس کے جسم کے لمس نے اُس کے سارے بدن میں آگ لگا دی تھی کسی

دوسری نشست پر بیٹھ گیا اور اُسے گھورتا رہا۔ محض اُس کی نگاہوں سے بچنے کے لیے کملا نے اپنے بازو میں بیٹھی ہوئی اینگلو انڈین لڑکی سے پوچھا "میں نے غالباً آپ کو کہیں دیکھا ہے ؟" اینگلو انڈین لڑکی نے اُس کی طرف دیکھا "یس۔ آف کورس۔ میں وِلسن کالج میں تھرڈ ایر میں ہوں اور آپ شاید ام۔ اے میں ....." اور اُس کے بعد دونوں گھُل مل کے باتیں کرنے لگیں۔ یہاں تک کہ چوپاٹی روڈ پر جب نوجوان اُتر کے چلا گیا تو کملا کو معلوم بھی نہیں ہوا۔ یہ اینگلو انڈین لڑکی گریس تھی ... ...

اور اب اندھیرے میں اُسے گریس صاف نظر آئی، نیچے ڈریس سرکل میں۔ اُس کے شانوں کے گرد کسی کا ہاتھ تھا۔ شیام کا ہاتھ۔ وہی ہاتھ جو اُس کے، کملا کے، جسم کے ہر نشیب و فراز، اس کی جلد کے ہر راز، ہر خال، ہر مسّے، ہر نشان سے واقف تھا اور اُس کی آنکھیں سینما کے پردے سے ہٹ کے اُدھر جم گئیں۔ گریس کے بھورے بال، سر کی جنبش کے ساتھ ــــ اور اس جلن کے باوجود کملا کو ماننا پڑا کہ گریس کے سر کی جنبش بڑی خوبصورت ہے ــــ شیام کے سیاہ چکنے بالوں سے مس کرتی۔ سیاہ چکنے بال، جس میں خود اُس کی اپنی، کملا کی اپنی، اُنگلیاں بار بار کنگھی کر چکی تھیں۔ پھر اُس نے شیام کے ہونٹوں کو گریس کے رُخسار کا ہلکا سا اُچٹتا ہوا بوسہ لیتے دیکھا اور اُس کا دل کسی اتھاہ سمندر کی تہہ کی طرف ڈوبنے لگا۔ ڈوبنے لگا۔

اب سے دو سال پہلے دلّی جم خانہ میں شیام سے برج ٹیبل پر پہلی ملاقات ہوئی تھی اور شیام ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے گورنمنٹ آف انڈیا کے اس محکمے میں انڈر سکریٹری مقرر ہوا تھا۔ روشن آرا میں ناچ اور ناچتے میں مدّت کے بعد پھر وہی برقی رو، اُسی آگ کا احساس جو بس میں اس اجنبی نوجوان کے جسم کے لمس سے پیدا ہوئی تھی۔ پھر میر درد روڈ پر خود اُس کے پتا کے مکان کی ٹی پارٹیاں۔ ڈے دی کو میں ٹھنڈے برف کے شربت، اور موسیقی ... ... اور پھر چھ مہینے کے اندر بیاہ ... ...

اتنے میں کملا نے محسوس کیا کہ بازو کی نشست پر جو شخص بیٹھا ہے، اُس کا ہاتھ اُس کے اپنے ہاتھ سے مس کر رہا ہے۔ اُس نے دائیں طرف ذرا کنکھیوں سے دیکھا۔ یہ ایک سردار جی تھے۔ نیلی فلالین کا قمیص، امریکن وضع کا اسپورٹ جیکٹ۔ بڑی ہی اسٹریم لائنڈ داڑھی ــــ

اور دل کی ایک فوری بغاوت کے ساتھ جو ایک لمحہ اندر بھڑک کے غدر بن گئی۔ کملا اُسی طرح بیٹھی رہی اور اُس نے اپنا ہاتھ نہیں ہٹایا۔

انیگلز۔ انیگلز۔ انیگلز۔ وہ کالج کے زمانے کی اشتراکیت کے دن بھی کیا عجیب وغریب دن تھے۔ اور اس دن مالتی سے جو لڑائی ہوئی تھی۔ مالتی انیگلز کا بار بار حوالہ دیتی تھی کہ ہر سوسائٹی میں جہاں عورتیں دبائی گئی ہیں۔ انھوں نے انتقام کا ذریعہ ڈھونڈھ ہی نکالا ہے ... ...

اب سردارجی کا شانہ اُس کے شانے سے مس کر رہا تھا اور پورا بازو اُس کے بازو سے۔ اُس نے پھر بھی ہاتھ نہیں ہٹایا ..... انتقام کا ذریعہ ڈھونڈھ نکالا ہے ..... اسی اثنا میں نیچے ڈریس سرکل میں پھر شیام نے گریس کے رُخسار کا اُچٹتا ہوا بوسہ لیا اور کملا کا دل ڈوبنے لگا۔ اتھاہ سمندر کی گہرائیوں کی طرف وہ ہندوستانی جو اپنی عورتوں کو مکان کے پچھلے حصّے میں بند رکھتے ہیں۔ وہ بھی انتقام کا کوئی نہ کوئی ذریعہ ڈھونڈھ ہی نکالتی ہوں گی۔ لاہور میں اُس کا بھائی اکثر کہا کرتا تھا۔ "گھونگھٹ میں لہر بہرہ بُرکے ہیں سارا شہر" یہ بُرقعہ۔ یہ کپڑے کا بھی ہوتا ہے اور خیالات اور فرائض اور ہندوستانی بیوی کے دھرم کا بھی بُنا ہوا ہوتا ہے ...

اب سردارجی کے ہاتھ نے اُس کے ہاتھ کو اپنی گرفت میں لے لیا اور پھر اُس نے وہی برقی رو محسوس کی جو اَب سے چار سال پہلے بس میں اُسی اجنبی نوجوان کے جسم کے لمس ... . لیکن اُس نے اپنا ہاتھ نہیں چھڑایا .. ... انیگلز۔ انیگلز۔ انیگلز۔ مگر الف لیلہ میں بھی تو اس قسم کے بہت سے قصّے ہیں .. ... اور برقی رو بھڑک کے آگ کا شعلہ بن گئی۔ سردارجی کی کرخت اُنگلیاں اُس کے سینے کے سخت جوان جوبن سے کھیلنے لگیں۔ اور وہ کانپ گئی۔ انیگلز ... اتنے میں سیدھے رُخسار پر بے شمار بال چُبھے۔ اُس کی ناک نے بدبُودار سانس کے ایک جھونکے کو محسوس کیا اور اُس کے رُخسار نے سردارجی کے بوسے کو۔ اور برقی رو یکلخت رُک گئی۔ بھڑکی ہوئی آگ اس ایک جھونکے سے فرو ہوگئی۔ اب ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے میں شیام کے سوا کوئی نہ تھا۔ صرف شیام ہی شیام تھا۔ لیکن شیام کا بازو تو ابھی تک نیچے ڈریس سرکل میں گریس کے شانوں کے گرد حمائل تھا۔

وہ دفعتہً اُٹھ کھڑی ہوئی اور ہانپتی ہوئی ہال سے باہر نکل آئی۔ بالکونی کے دوسرے

تماشائی جو سردار جی کا تماشہ کنکھیوں سے دیکھتے رہے ہوں گے۔ اُسے غور سے دیکھ کے سنیما کے پردے کی طرف پھر متوجہ ہوگئے۔ جہاں آخری ناچ ہو رہا تھا۔ اور سینکڑوں لڑکیوں کا کورس پیر پٹک رہا تھا۔

سردار جی بھی پیچھے ہی پیچھے باہر نکل آئے۔ مگر یہ دیکھ کر ذرا جھکرائے کہ وہ عورت جس نے انھیں اتنی آزادی برتنے دی۔ زینے کے قریب زارو قطار رو رہی ہے۔ انھیں آتے دیکھ کر وہ جلدی جلدی سیڑھیاں اُتر کے ہیک مین کے احاطے میں غائب ہوگئی اور سردار جی وہیں کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔

پانچ دس منٹ بعد وہ پھر آئی۔ سردار جی کی طرف اُس نے نظر اُٹھا کے بھی نہ دیکھا سینما کے باہر برآمدے میں شیام اور گریس کھڑے انتظار کر رہے تھے۔ اُس کے چہرے پر تازگی تھی اور اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اُس کے ہونٹوں پر بے ساختہ اور بڑا ہی دلکش تبسم تھا۔ "شیام ڈارلنگ فلم کیسا تھا؟ گریس ڈارلنگ معاف کرنا تمھیں انتظار کرنا پڑا مگر اُرمیلا نے کسی طرح اُٹھنے ہی نہیں دیا۔ چلو اب پونے چھ ہیں۔ وہیں شارل ویل میں چائے پئیں گے۔ رکشا، رکشا۔"

اور سردار جی جو ہکا بکا یہ سب تماشہ دیکھ رہے تھے۔ کھڑے دیکھتے رہے۔ شیام اور گریس کو انھوں نے بھی ڈریس سرکل میں دیکھا تھا۔ "گریس ڈارلنگ، پہلے تم۔ میں بیچ میں بیٹھوں گی۔ مجھے ذرا زکام معلوم ہو رہا ہے اور اس کے سوا میری طبیعت چاہ رہی ہے کہ ذرا اپنے پتی کے پاس بیٹھوں۔ کیوں شیام یہاں مسوری میں تو اتنی گرمی نہیں۔"

چھ جانور رکشا میں تین انسانوں کو لے چلے اور شیام نے کملا کی طرف دیکھا۔ کالی آنکھوں کے تیروں میں ملامت کا ایسا زہر تھا کہ شیام کی نظریں گویا یہ کہہ کر جھک گئیں "دیوی مجھے شما کرو۔" اور اُس کے ہاتھ نے بے اختیار کملا کے ہاتھ کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

"شیام ڈارلنگ، تم نے اینگلز کی سب کتابیں پڑھی ہیں؟"

چھ جانور رکشا کو کھینچ رہے تھے۔

○○

دیاسلائی کی اہمیت

کچھ عجیب وغریب طریقے پر آزاد کو یورپی تمدن میں دیاسلائی کی اہمیت کا احساس ہوا۔

سب سے پہلے آزاد نے اُسے پیرس کے اسٹیشن گار دِلیاں پر دیکھا۔ اندازہ لگایا کہ وہ امریکن ہے، اور اُسی گاڑی سے سفر کررہی ہے۔ ویژاں پر اُسے یقین ہوگیا کہ وہ تنہا سفر کررہی ہے۔ لی آں کے اسٹیشن پر اُس نے اس سے پہلی مرتبہ بات کی۔ اور مارسٹی پہنچتے پہنچتے اس سے دریافت کیا کہ وہ کہاں جارہی ہے۔ ژوآں لے پاں۔ خود آزاد مانٹی کارلو پہنچ کر دم لینا چاہتا تھا۔ مگر خیر ژوآں لے پاں ہی سہی۔

ویژاں اور لی آں کے درمیان ایک کہنہ سال امریکی ہمسفر نے آزاد سے کہا کہ لہجے سے معلوم ہوتا ہے یہ لڑکی ممالک متحدہ امریکہ کی کسی جنوبی ریاست کی ہے۔ جنوبی ریاستوں کے لوگوں کا نسلی تعصب امریکہ سے باہر بھی اچھا خاصہ مشہور ہے مگر یہ نسلی تعصب زیادہ تر حبشیوں کے ساتھ ہے۔ ہندوستانیوں وغیرہ کی حد تک صرف اس کا ہلکا سا اثر باقی رہ جاتا ہے، اس کی تصدیق آزاد کو لی آں اور مارسے ٹی کے درمیان ہوئی۔ کہنہ سال امریکی لی آں پر اُتر گیا تھا۔ آزاد نے اس لڑکی سے بات چیت شروع کی۔ اس کی ابتدائی بے رُخی کو توڑنے کی کوشش کی۔ اور تہیہ کرلیا کہ بجائے مانٹی کارلو کے ژواں لے پاں میں قیام کیا جائے۔

مارٹی کے اسٹیشن پر ریویرا جانے والی گاڑی تیار کھڑی تھی۔ لیکن شام ہونے لگی تھی، اور جو کچھ تھوڑی بہت بے تکلفی اس لڑکی سے پیدا ہو چلی تھی اُس میں فرق آنے لگا تھا۔ آزاد نے اصرار کیا کہ وہ اپنا نام بتلائے۔ بہت دیر تک مذاق اور لیت و لعل کے بعد اس نے نام بتایا کے برگن۔ پھر وہ تاریک ہوتے ہوئے سمندر کا نظارہ دیکھنے میں محو ہو گئی۔ تاریکی سمندر پر، پہاڑیوں کے نشیبوں میں، مکانوں کی کھڑکیوں کے اندر، یہاں تک کہ شاہراہوں پر پھیلتی ہی چلی جا رہی تھی۔ ساں رفائی تک جو رات کی تاریکی اور جولائی کے دُھندلکے میں آویزش رہی، بالآخر تاریکی غالب آگئی۔ ریویرا کے کنارے میڈی ٹرینین کا تموج تاریکی میں ریشم کا کالا طوفان بن گیا۔ اب آزاد کی ہم سفر امریکن لڑکی کھڑکی سے صرف تاریکی کا سماں دیکھ سکتی تھی۔ سمندر کی تاریکی اور زمین کی تاریکی میں فرق کا سماں بھی ایک خاص کیفیت رکھتا ہے۔ چلتی ریل سے گہری تاریکی، ہلکی تاریکی میں ملتی معلوم ہوتی ہے۔ کہیں کہیں روشنیوں سے اس میں خلل پڑتا ہے۔ مگر یہ وہ منظر ہے جو ریویرا کے سوا شاید ہی کہیں اور نظر آئے۔ اُس لڑکی نے جو خلیج میکسیکو تک ذہنی طور پر ٹکرا کے پلٹ آئی تھی کہا "میں نے ایسا خوبصورت منظر آج تک نہیں دیکھا۔"

تھوڑی دیر بعد جب ہلکی تاریکی اور گہری تاریکی کے سماں کا لُطف بھی جاتا رہا تو وہ بھی ہٹ آئی۔ وہ بہت مسرور معلوم ہوتی تھی۔ یہ ریویرا کے ماحول اور سمندر کی ہلکی ہوا کا اثر تھا۔ اب آزاد نے اس سے جو ریویرا کے مختلف شہروں کے متعلق اپنی معلومات کا اظہار کیا تو اُس نے بڑی دلچسپی ظاہر کی۔

جب گاڑی نرواں لے پاں پہنچی تو اسٹیشن پر ہی لڑکی نے زبردستی آزاد کو خدا حافظ کہا۔ آزاد اس سے پوچھتا ہی رہا کہ کس ہوٹل میں ٹھہرو گی؟ مگر وہ تو اس ریل کی ملاقات کو ریل ہی پر ختم کر دینا چاہتی تھی۔ آزاد بھلا اس امریکی حُسن کو اس قدر آسانی سے کھو دیتا۔ اس نے دیکھ لیا کہ ایک ہوٹل کا ملازم اس لڑکی کا سامان سنبھالنے لگا۔ اس ملازم کی ٹوپی پر ہوٹل کا نام لکھا تھا۔ "گراند او تیل وِزامریکین"۔

آزاد نے اپنے دل میں کہا "جانی بچ کر کہاں جاؤ گی۔ امریکہ تک تمھارا پیچھا نہ کروں تو سہی۔"

اسٹیشن کے باہر آزاد نے ٹیکسی لی۔ اس کے ساتھ تھوڑا ہی سامان تھا۔ دو چھوٹے چھوٹے سوٹ کیس اور بس۔ ٹیکسی والی سے اُس نے گراند اوتیل وِزامریکین چلنے کے لیے کہا، یہ ہوٹل اسٹیشن سے قریب ہی تھا۔ کوئی تین منٹ میں ٹیکسی ہوٹل کے دروازے پر جا کھڑی ہوئی۔ ہوٹل کا دروازہ ایسا گھومتا ہوا دروازہ تھا، جس کے چار پَٹ ہوتے ہیں۔ ایک طرف سے کوئی اندر آئے تو دوسری طرف سے کوئی اور باہر جا سکے۔ غرض اِس گھومتے دروازے میں آزاد نے غلط طرف سے داخل ہونا چاہا۔ اُدھر سے کوئی آرہا تھا۔ اس کشمکش میں دروازہ رُک گیا۔ اور آزاد کا ایک سوٹ کیس اُس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ اُس کو اٹھانے کے لیے وہ ہٹا تو وہی امریکن لڑکی باہر نکلی، اور اگرچہ وہ ذرا سُست معلوم ہوتی تھی، جیسے ابھی کسی بات پر غصہ آیا ہو۔ لیکن آزاد اور اُس کے سُوٹ کیس کو دیکھ کر وہ مُسکرائی۔ باہر نکل کے وہ کہنے لگی کہ اُس نے اس ہوٹل میں جگہ کا انتظام کیا تھا۔ لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کمرے کو منیجر نے کسی اور کے حوالے کر دیا۔ ہوٹل کا ملازم اسے خواہ مخواہ یہاں لے آیا۔ آزاد جوڑواں لے پاں کی جغرافیہ سے کافی واقف تھا۔ ایک ایسے ہوٹل کو جانتا تھا جو گاؤں سے تقریباً آدھ میل کے فاصلے پر سمندر کے کنارے پر تھا۔ یہ ہوٹل چھوٹا سا تھا۔ زیادہ تر فرانسیسی ہی اس میں ٹھہرتے تھے اور سیاح کم آتے تھے۔ آزاد نے اس سے اس ہوٹل کی سفارش کی، اور جس ٹیکسی میں آزاد آیا تھا اُسی میں دونوں بیٹھ کے اس ہوٹل پہنچے جس کا نام "اوتیل الساس" تھا۔

ٹیکسی ہی میں پھر دونوں میں وہی بے تکلفی پیدا ہو گئی جو مارسٹی پہنچنے اور شام کے دھند لکے سے پہلے تھی۔ آزاد نے اسے بجائے مس برگن کہنے کے کیہ کہ کر مخاطب کیا اور اس درمیان میں ہوٹل بھی آگیا۔

جب دونوں ہوٹل میں پہنچے تو چھوٹے سے فربہ اندام، زندہ دل فرانسیسی منیجر نے یہ تجویز کی کہ دونوں کے لیے ایک ہی بڑا کمرہ کافی ہوگا۔ کیوں کہ دونوں بھائی بہن معلوم

ہوتے ہیں۔ اس پر کے بہت ہنسی اور کہا اگر دونوں کے درمیان رات کے وقت ایک ہلکی سی دیوار حائل رہے تو زیادہ مناسب ہے!

بہرحال دونوں کو پاس ہی پاس کمرے ملے۔ کمروں میں جانے سے پہلے دونوں نے طے کر لیا کہ رات کا کھانا ساتھ ہی کھائیں گے۔ پیرس سے ریویرا تک سفر بڑا طویل اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ آزاد نے ہاتھ مُنہ دھو کے کپڑے بدلے۔ آئینہ میں اپنی ہیئت کذائی کو بار بار دیکھا اور اُس کو ذرا ٹھیک کرنے کی کوشش کی۔ اور کوئی آدھ گھنٹے کے بعد یہ سمجھ کر کہ اس درمیان میں گے بھی کپڑے بدل چکی ہوگی، اُس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ گے نے کہا۔ "آؤ۔" آزاد اس کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ اپنے بال ٹھیک کرنے اور لبوں کو سُرخی لگانے کے آخری مراحل طے کر رہی تھی۔ اُس نے آزاد کی طرف پلٹ کر اس طرح دیکھا گویا صدیوں کی دوستی ہے۔ کہا: "کپڑے بدل کر تم بڑے خوبصورت معلوم ہو رہے ہو، مگر ریل پر تم گرہ کٹ معلوم ہو رہے تھے۔" اور پھر وہ ذرا طنز سے مُسکرائی۔

آزاد نے سوال کیا "اسی لیے اسٹیشن پر آپ مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھیں۔"

زور سے ہنس کے ـــــ سُرخ لِپ اسٹک میں بجلی چمکی۔ اس نے سَر کے بالوں کو سمیٹ کے آخری جنبش دی اور کہا۔ "یس سَر۔"

پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور آزاد کی طرف پلٹی: "مگر اب تم شریف معلوم ہو رہے ہو۔ اور بھی مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ اس لیے تم کھانے کی میز تک مجھے اپنے ساتھ لے چل سکتے ہو۔" یہ کہہ کر اُس نے آزاد کا بازو پکڑا۔ آزاد نے مذاقاً سَر کو جنوبی یورپ کی شولری کے انداز میں بہت زیادہ خم کیا۔ کمرے کے دروازے کو مقفل کر کے اُسی طرح آزاد کے بازو کا ذرا سا سہارا لے کے وہ ہوٹل کے پیچھے کے دروازے سے باہر نکلی۔ کیوں کہ کھانے کے میز ہوٹل کی پیچھے کی دیوار سے لے کر سمندر کے کنارے تک پھیلے ہوئے تھے۔ جہاں ہوٹل کی اُس کھلی طعام گاہ کی حدود ختم ہوتی تھیں وہاں سمندر سے لے کر ہوٹل کی دیوار تک بڑی خوبصورت باڑھ تھی، جس پر زرد زرد پھول کھلے ہوئے تھے۔

آزاد نے ایک ایسا میز چُنا جو سب سے دُور تھا۔ اب میز جو سمندر اور باڑھ کے

اِتصال کے موقع پر بچھا ہوا تھا۔ آزاد جس کرسی پر بیٹھا وہ سمندر کے قریب تھی۔ اور کے جس پر بیٹھی وہ باڑھ کے قریب تھی۔ اس میز تک بجلی کی روشنی بھی بہت کم آتی تھی۔ گہری اور ہلکی تاریکی کی جو جنگ ریل پر ختم ہو گئی تھی۔ یہاں پھر سے جاری تھی؛

ابھی خاصی رات آگئی تھی اور چار ہی پانچ لوگ وہاں موجود تھے۔ آزاد اور کے کے میز کے پاس تو کوئی اور نہ تھا۔ دُور ایک بُڈھا فرانسیسی بیٹھا پیتا جا رہا تھا اور ایک کاغذ پر کچھ لکیریں کھینچتا جا رہا تھا۔ ایک اور میز پر کوئی تین چار متوسط العمر عورتیں بیٹھی زور زور سے باتیں کر رہی تھیں۔ ان سے قطع نظر اس وقت تنہائی کا سا لُطف تھا۔

کھانے پر آزاد اور کے میں بڑے مزے مزے کی باتیں ہوئیں۔ دونوں نے اپنے حیاتِ معاشقہ کے واقعے سُنائے۔ کھانے کے بعد — کریم وماند کے کئی چھوٹے چھوٹے گلاس خالی کرنے کے بعد دونوں اور زیادہ کھُلے آزاد نے کے کی تعریف شروع کی اور اپنا حالِ دل سُنایا۔ اس سے کہا کہ امریکی حُسن ایک خاص چیز ہے، اور امریکی لڑکیوں کی طبیعت کا کیا کہنا۔ بڑی صاف گو ہوتی ہیں، اور محبت کے عالم میں صاف ہاں یا نہیں۔ اور جنوبی ریاستوں کا امریکی حُسن تو اور لاجواب ہے۔ پھر امریکی لڑکیوں میں کے حُسن میں سب کی سرتاج ہے۔ اور کے کیانتی کے بہت ہی ہلکے سرور میں، اور ریویرا کے ماحول، سمندر کی ہوا اور نیم تاریکی کی وجہ سے بہت خوش ہو رہی تھی، مُسکرا رہی تھی اور کھلی جا رہی تھی۔ آزاد نے میز پر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا، تو اس نے اپنا ہاتھ ہٹانے کے لیے خفیف سی جنبش کی لیکن اسے ہٹایا نہیں۔

وہ کمبخت ادھیڑ عمر کی عورتیں، اسی طرح زور زور سے باتیں کر رہی تھیں۔ مگر وہ کم سے کم دس گز دُور تھیں اور اِدھر دیکھ بھی نہیں رہی تھیں۔ ایک گارساں (خادم) بھی کھڑا تھا۔ وہ بھی کوئی آٹھ دس گز دُور تھا، اور اس طرف نہیں بلکہ ہوٹل کی طرف دیکھ رہا تھا۔

کے نے کیانتی کا ایک اور گلاس خالی کیا۔ اور ریویرا کی تعریف میں ایک ایسا کلمۂ صفت استعمال کیا جس سے سرُور کی بُو آتی تھی۔ پھر آزاد کی بھی تعریف کی: "تم بہت مہربان ہو مجھے تم بہت پسند آئے۔" اس پر آزاد نے اپنے ہاتھ کی گرفت اور مضبوط کر دی تو اُس نے

ہاتھ چھڑا کے آزاد سے سگریٹ کی فرمائش کی۔

آزاد نے اسے سگریٹ نکال کر دیا، اُس نے آزاد کے دونوں ہاتھ پکڑ کے دیاسلائی سے سگریٹ سُلگایا۔ دیاسلائی کی روشنی میں آزاد نے دیکھا کہ اس کا چہرہ سرور اور مسرت اور شرارت سے چمک رہا ہے۔ اس کے بعد آزاد نے خود بھی سگریٹ جلا کے اپنی کُرسی سمندر سے دُور اور اس کی کُرسی کے قریب کھینچ لی۔ اور سرگوشیوں میں اس سے اظہارِ محبت کے لیے کہا: "مَیں نے آج ہی صبح تم کو پہلی مرتبہ دیکھا اور اب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مَیں کئی سال سے تم پر عاشق ہوں۔"

وہ آہستہ سے ہنسی اور ذرا خوش ہو کے اس نے کہا۔ "سچ مچ؟"

اس کے بعد آزاد اور کیا کہتا۔ اس نے دیکھا کہ یہی موقع ہے عمل کا۔ جھک کر آہستہ سے اس لڑکی کے رُخسار کو چُوما۔ مگر ایک ہی سکنڈ کے عرصے میں اس نے اپنے ایک رُخسار پر کسی چیز کے زور سے پڑنے کی آواز سُنی اور ساتھ ہی وہ تکلیف محسوس کی جو بچوّں کو مدرّس کا تھپڑ پڑنے کے بعد محسوس ہوتی ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ اس امریکی حسینہ کی پانچ نازک انگلیوں کی کارستانی ہے۔ یہ اُس بوسے کا انعام ہے۔

قبل اس کے کہ وہ معافی مانگ سکتا یا کچھ کہہ سکتا، مَیگی نے اپنا بیگ اُٹھایا اور چل دی۔ آزاد نے جلدی سے متوسط العمر عورتوں کی طرف دیکھا وہ اسی طرح زور زور سے باتیں کر رہی تھیں۔ اس طرف جو تماشا ہوا وہ انھوں نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ اور گارساں بھی اسی طرح کھڑا دُور ہوٹل کی عمارت کو فلسفیانہ انداز سے دیکھ رہا تھا۔ آزاد نے اپنے دل میں کہا، خدا کا شکر ہے کسی نے دیکھا نہیں۔ پھر اطمینان سے گرین لائیٹس کا گلاس ختم کیا اور خادم کو پکارا "گارساں"۔

خادم آیا، اُس نے بِل پیش کیا، پیسے واپس کیے۔ آزاد نے انعام دیا تو اسے لے کر سر خم کیا، پھر آہستہ سے کہا "مسیو"۔

آزاد نے ذرا گھبراہٹ کے لہجے میں پوچھا۔ "کیا؟"

خادم نے کہا: "جب مسیو نے مدموزیل کا سگریٹ سُلگایا تو مسیو نے خیال نہیں فرمایا کہ مدموزیل نے دیا سلائی پھونک مار کر نہیں بُجھائی۔ مسیو نے دیا سلائی کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا۔ اس لیے بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔"

آزاد کو کچھ غصّہ آیا۔ کچھ شرم محسوس ہوئی، کچھ ہنسی آئی۔ بہرحال اس نے گارساں کا شکریہ ادا کیا، اسے کچھ اور انعام دیا اور اٹھا۔

صبح سویرے پہلی بس جو مانٹی کارلو جاتی تھی اُس پر آزاد نژواں لے پاں سے، اس ہوٹل سے اُس کے خادم سے، امریکی حسینہ سے بھاگا۔

○○

ڈبل لائف

آخر آج تم نے بے قرار ہو کر میرے گلے میں باہیں ڈال دیں! حیران ہوں کہ یہ تبدیلی کیوں؟ ذرا سوچو، دو برس پہلے کیسے گمان ہو سکتا تھا کہ تم اس طرح مجھ سے ملنے نئی دہلی کے اس ہوٹل میں آؤ گی۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ ایک دفعہ جب میں نے تم سے کوالٹی میں آئس کریم کھانے کے لیے کہا تھا تو تم نے نہایت اخلاق سے جواب دیا تھا کہ تم نئی دہلی میں کسی کے ساتھ دیکھی جانا پسند نہیں کرتیں۔ تمھیں بھی تو یاد ہوگا کہ میں نے سینما دیکھنا صرف اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ تم میرے ساتھ نہیں جا سکتی تھیں۔ کتنا خیال تھا تمھیں زبانِ خلق کا، کتنی فکر تھی تمھیں اپنے نام کی! کتنے فخر سے تم کہا کرتی تھیں کہ دہلی یونیورسٹی میں تم ہی وہ تنہا لڑکی ہو جس کے متعلق لوگوں کو کبھی باتیں بنانے کا موقع نہیں ملا۔ تم اکثر کہتی تھیں کہ اگرچہ تم مجھ سے ملنا جلنا پسند کرتی ہو لیکن میری خاطر تم اپنے نیک نام کو خطرے میں نہیں ڈال سکتیں، اس لیے میرا تمھارا ساتھ باہر دیکھا جانا مناسب نہیں۔

حیران ہوں کہ آج تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ کہاں گئے وہ تمھارے بلند آہنگ دعوے مشرقی روایات کے تحفظ؟ کیا ہوئے وہ تمھارے فلسفیانہ نظریے، مرد عورت کے صحت مند تعلقات کے متعلق، یاد تو ہوگا کہ تم اپنے کو پتھر کی وہ چٹان کہا کرتی تھیں جسے کوئی بھی سیل بہا کر نہیں لے جا سکتا۔ جس سے ٹکرا کر جذبات کی بے پناہ لہریں ساکت ہو جاتی ہیں۔ جو

سرد و گرم زمانہ کے اثرات سے بے نیاز ہوتی ہے۔ اور یہ سچ ہے کہ مَیں نے کبھی تمھاری آنکھوں میں وہ چمک نہیں پائی جو مَیں دیکھنا چاہتا تھا، تمھارے تبسّم میں کبھی وہ نکھار نہیں پیدا ہوا جس کا مَیں متمنّی تھا، تمھاری آنکھوں کے گہرے ساکت سمندر میں نہ میری خاموش التجائیں ہلچل پیدا کر سکیں اور نہ میری بے چین آنکھیں ان کی تھاہ پا سکیں۔

تم عجیب تھیں، بہت ہی عجیب! باتیں کرنے پر آؤ تو پھول برسایا کرو، نہ جی چاہے تو دو لفظوں میں ٹال دو۔ عرصے تک تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں تمھارے لیے گوارا ہوں یا ناگزیر۔ میں پہلی ملاقات کبھی نہیں بھول سکتا۔ باوجود اس کے کہ وہ کاروباری تھی۔ بیگم برلاس نے جب میرا تعارف کرایا تو تمھارے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ تھی اسے رسمی ماننے کے لیے مَیں ہرگز تیار نہیں اسی وقت مَیں نے تہیہ کر لیا کہ تم سے قریب ہو کر تمھیں دیکھوں گا۔ لیکن دوسری ملاقات میں تم نے ایسی بے رُخی برتی کہ مَیں شرمندہ بھی ہوا اور حیران بھی۔ تم کشمیری دروازہ پر بس کے انتظار میں کھڑی تھیں۔ مَیں اُدھر سے گزرا اور مَیں نے تمھیں اپنی موٹر میں لے چلنے کی درخواست کی۔ تم نے مُسکراتے ہوئے میری درخواست رد کر دی۔ یہ مسکراہٹ پہلی ملاقات والی مُسکراہٹ سے کچھ مختلف تھی —— خوبصورت کہنی ایک ایسے چمکتے ہوئے چاقو کے پھل کی طرح جسے ہاتھ لگاتے انگلی فگار ہو جائے۔ اس کے بعد میں بہت بے چین ہو گیا اگر تمھیں معلوم ہوتا کہ وہ رات مَیں نے آنکھوں میں کاٹ دی تو تم ہنسو گی۔ لیکن کیا خبر تمھیں پہلے ہی معلوم رہا ہو کہ مجھ پر کیا بیتے گی اور شاید اسی لیے تم نے یہ کھیل کھیلا ہو۔ اس بات نے میرے مردانہ وقار کو سخت ٹھیس پہنچائی اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ مَیں آئندہ تم سے کبھی نہیں ملوں گا۔

—— کاش مَیں اپنے اس فیصلے پر قائم رہتا۔ کاش تم مجھے اس پر قائم رہنے دیتیں۔ لیکن اس رات ریڈیو اسٹیشن پر تم کس قدر مختلف تھیں۔ مَیں ویٹنگ روم میں بیٹھا اپنی تقریر پر آخری نظر ڈال رہا تھا۔ مَیں نے تمھیں آتے ہوئے نہیں دیکھا۔ تم میرے بالکل قریب آگئیں اور بڑے تپاک سے سلام کر کے میرے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گئیں۔ مَیں تمھارے رویّے میں اس تبدیلی پر سخت متعجب ہوا۔ کس قدر بے تکلفی سے گھُل مل کر باتیں کیں اس رات تم نے! ریڈیو

والے تمھاری خوشامد میں لگے ہوئے تھے۔ لیکن تم نے ان کو ذرا بھی مُنہ نہیں لگایا۔ شاید اس دفعہ تم انھیں گرانے کی خاطر مجھے چڑھا رہی تھیں۔

پھر تقدیر نے اپنی چال چلی اور ہم دونوں کو ایک ہی راستے پر ڈال دیا۔ ہماری تقرری ایک ہی ہسپتال میں ہو گئی اور ہم ساتھ ہی بیٹھنے لگے۔ پتہ نہیں تمھارے اوپر اس کا کیا اثر ہوا۔ لیکن میں اس تبدیلی سے بہت خوش ہوا۔ میں نے سوچا اس طرح مجھے تمھارے تکبّر اور تلوّن سے لڑنے کا موقع ملے گا۔ اور شاید میں تم کو راہ پر لا سکوں۔ لیکن تم نے کچّی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ تم سارا دن میز پر نظر گاڑے مریضوں کے چارٹ بنایا کرتیں۔ اور میں باوجود کوشش کے کچھ کام نہ کر سکتا۔ کئی بار ایسی صورت نکلی کہ ہم لوگ ذرا سا دھیان بٹا کر بات کر سکیں۔ لیکن تم نہایت ہوشیاری سے ٹال گئیں اور مجھے ذرا موقع نہ دیا۔ آخر تنگ آ کر میں نے زیادہ تر باہر رہنا شروع کر دیا۔ کبھی مریضوں کے وارڈ میں کبھی لیبوریٹری میں کبھی دوسرے ڈاکٹروں کے پاس۔ دو چار دن تو تم نے بظاہر اس تبدیلی پر توجہ نہیں کی۔ لیکن آخر شاید تم سے بھی ضبط نہ ہو سکا اور تم نے دبی زبان سے شکایت کی کہ میں سارا دن غائب رہتا ہوں۔ اور تم اکیلی گھبرایا کرتی ہو۔ اور میرے یہ کہنے پر کہ میں کمرے میں رہ کر بھی تو تمھاری دلجوئی کا باعث نہیں ہوتا۔ تم نے گویا شکست مانی اور اقرار کیا کہ ہم لوگوں کو کام کے ساتھ ساتھ آرام بھی جاری رکھنا چاہیئے۔ تم نے خود کہا کہ اس طرح کام ہلکا ہو جاتا ہے اور دماغ کا زنگ چھٹتا رہتا ہے۔

اس طرح ہم باتیں کرنے لگے۔ ہسپتال، مریض، ڈاکٹر، سیاست، ادب، فلسفہ، نفسیات اور موسیقی سے گزر کر موضوع کا رُخ ذاتیات کی طرف ہوا۔ تعلیم، گذشتہ زندگی، ذمہ داریاں، ذاتی پسند وغیرہ زیرِ بحث آنے لگے۔ پھر میں نے تمھاری نارنگیاں کھانی شروع کیں اور تم میرے تھرمس سے چائے پینے لگیں۔ اب تمھارے ہونٹوں کی مسکراہٹ پر غمی کی تہہ سی کھلنے لگی۔ رفتہ رفتہ ہم بہت بات کرنے لگے۔ ہم دونوں ہی باتونی تھے، جب بھی وقت ملتا تم میری میز کے قریب والی آرام کرسی پر بیٹھ جاتیں اور ہم باتوں کے طوفان میں بہنے لگتے اور آخر ایک دن باتوں باتوں میں تم نے اقرار کیا کہ تمھیں میری باتیں پسند ہیں اور جس دن میں غیر حاضر رہتا ہوں تمھارا جی نہیں لگتا۔

لیکن اتنی قریب رہ کر بھی تم فاصلہ پر رہیں۔ دوستی کا ذکر کرتے وقت تم ہمیشہ صحت مند کی صفت لگا دیتیں اور مجھے اس بات سے بے انتہا چڑ ہونے لگی۔ یہ دوستی کا کیا ڈھکوسلا ہے، میں سوچتا، تم کیوں نہیں اقرار کر لیتیں کہ تم عورت ہو میں مرد ہوں اور ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ پھر ہمارے راستے میں کیا ہے؛ دوستی کی یہ اکیڈمیک صورت بالکل پسند نہ تھی۔ لیکن میں اس اُمید پر کہ رفتہ رفتہ تمھارے سینے کا دل بھی میری طرح گوشت پوست کا ہو جائے گا، دوستی کی اسی شکل کو نباہتا رہا۔

لیکن کب تک؛ آخر تنگ آ کر ایک دن میں نے تمھیں چھیڑ دیا۔ میں نے باتوں باتوں میں اپنی دوستی کو فلرٹیشن سے تعبیر کیا تو تم تنک گئیں اور بولیں کہ ہماری دوستی جنس سے بالاتر خالص دوستی ہے۔ میں نے کہا کہ محترمہ ہم کب تک اس طرح ایک دوسرے کو فریب دیتے رہیں گے۔ گلاب کو کچھ بھی نام دیجیے، گلاب ہی رہے گا۔ یقین کیجیے کہ ہمارے آپ کے تعلقات فلرٹیشن کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ہم دونوں کے تحت الشعور میں صرف ایک جذبہ کارفرما ہے اور وہ ہے ایک مرد اور ایک عورت کی باہمی کشش۔ میری اس جرأتِ رندانہ سے تمھاری جبین پُرشکن ہو گئی اور میں نے بات ٹال کر موضوع بدل دیا۔

لیکن میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اگر ہماری دوستی خالصاً صحت مند تھی تو تم کوشلیا، بملا اور شمع سے کیوں کھٹکتی تھیں۔ آج میں سوچتا ہوں کہ میں نے تمھاری خاطر ان بے چاریوں کو کتنا دکھ پہنچایا تو میرا ضمیر مجھے ملامت کرنے لگتا ہے۔ آخر کسی طرح وہ تم سے کم نہیں۔ وہ بھی تمھاری طرح مجھے پسند کرتی تھیں لیکن ان کے پاس اس پسند کے لیے کوئی اکیڈمیک نام نہیں تھا۔ وہ میرے جذبات سے کھیلنا نہیں چاہتی تھیں۔ وہ سیدھی سادی نارمل لڑکیاں تھیں جو مجھ میں مرد دیکھتی تھیں اور مرد ہی پسند کرتی تھیں۔

اور پہلے تو تم بھی کوشلیا کی بڑی مدّاح تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ تمھیں نے اس کی تعریفیں کر کر کے میرے دل میں اس کے لیے جگہ پیدا کی۔ لیکن جب ایک دن تمھیں منیجر خان نے بتا دیا کہ چمسفورڈ کلب میں میں کوشلیا کے ساتھ رہا تھا تو اسی دن سے کوشلیا کے متعلق تمھاری رائے بدل گئی۔ تم اس کے زور سے بولنے کا مذاق

اُڑانے لگیں ۔ اس کے رنگوں کا بھونڈا پن تمھیں کھٹکنے لگا ۔ اور تو اور اس کی کالج کی زندگی کی روایات بھی تم تک پہنچنے لگیں ۔ جب بھی تمھیں معلوم ہوتا کہ میں اور کوشلیا کہیں ساتھ دیکھے گئے، تمھارے چہرے کا رنگ بدل جاتا ۔ اُس وقت تم کس قدر مختلف نظر آتیں ۔ تمھارے جذبات سے، تمھارے آبنوسی چہرے پر احساسات کی لکیریں اُبھر آتیں ۔ اور یہ بات میری بہت ہمت افزائی کرتی ۔ میں سوچتا کہ تمھارے سینے میں بھی ضرور دل ہے اور وہ ضرور میرے لیے دھڑکتا ہے ۔ ورنہ کوشلیا کے لیے یہ جلن کیوں ہوتی ۔ تم اس بات سے اثر ہی کیوں لیتیں ۔ ایک دن تم کوشلیا اور کپور کے SCANDAL کی بات مزے لے لے کر مجھے سنا رہی تھیں اور میں اس سے کوئی اثر لینے کے بجائے لطف اندوز ہوتا رہا ۔ اس دن تم کس قدر مایوس ہو گئی تھیں ۔ میں بچہ تو نہیں تھا ۔ تمھاری گفتگو کا مقصد اس کا ردِ عمل سمجھتا تھا میں جانتا تھا کہ ایک نہ ایک دن تم خود گھبرا کر تہذیب، شرافت اور اخلاق سے مزین یہ صحت مند دوستی کا نقاب اُتار پھینکو گی اور اپنی اصلی صورت میں میرے سامنے آجاؤ گی اور اپنی دلآویز آغوش میرے لیے وا کرو گی ۔

سب سے مزے کی بات تو یہ تھی کہ میرے لیے تم ہملا سے لڑ بیٹھیں ۔ وہ غریب تم پر جان دیتی تھی ۔ میرے سامنے اس نے بارہا تمھاری شان میں قصیدے پڑھے ۔ وہ جانتی تھی کہ میرے دل میں تمھارے لیے کیا جذبات ہیں اور ان کا احترام کرتی تھی ۔ ہملا کی شرافت کی تو تم بھی قائل تھیں ۔ کشمیر کی شوخ بیٹی پہاڑوں کی برفانی ہواؤں کی طرح آزاد طبیعت کی مالک تھی جو دل میں سوچتی، زبان پر لاتی، صاف مجھ سے محبت کا اقرار کرتی تھی ۔ لیکن کبھی اس نے تمھیں راستے سے ہٹانے کی کوشش نہیں کی ۔ وہ کہتی تھی کہ وہ مجھے اس وقت سے پسند کرتی ہے جب میں ریڈیکل ڈیموکریٹک کانفرنس میں شرکت کے لیے لاہور گیا تھا ۔ میری آتشیں تقریر اور اس کے دل میں دہکتے ہوئے لاوے کا درجۂ حرارت ایک ہی تھا اور اسی دن سے وہ میری پرستش کرنے لگی تھی ۔ لیکن جب میں اس سے ملا تو تم مجھ پر چھا چکی تھیں ۔ راجن کو جب اس مثلث کا پتہ چلا تو وہ حیران رہ گیا ۔ کہنے لگا کہ تم نے ہملا کو قابو میں نہیں کیا ہے شیرنی کو پالتو بنا لیا ہے ۔ اس پر سارا لاہور فدا تھا، یہ عورت نہ تھی شعلہ تھی، جدھر بھڑکتی دو چار

جلا دیتی۔ سمجھ میں نہیں آتا تم میں کیا ہے۔ جو یہ تم پر ریجھ گئی۔

ایک رات ہم کئی دوست عمر خیام میں کھانا کھا رہے تھے۔ بملا بھی تھی۔ تمھارا ذکر نکل آیا تو نہ جانے کون مجھ سے ہمدردی میں کہنے لگا کہ میں بہت بدنصیب تھا مطلب یہ تھا کہ تم کسی پروگرام میں میرے ساتھ نہیں ہوتیں۔ بملا بولی کہ ان کی بدنصیبی جنگل کی آگ کی طرح ہے جو کسی کو جلا کر ٹھنڈی ہو جانے کے بجائے یکے بعد دیگرے قطعات کے قطعات جلاتی چلی جاتی ہے۔ جانے کتنے معصوم دل ان کی بدنصیبی کا ماتم کر رہے ہیں۔ لیکن بے بس ہیں۔ اس رات میں جھنجھلا اُٹھا۔ مجھے تمھارے اوپر سخت غصہ آیا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میرا تکیہ آنسوؤں سے تر تھا۔

دوسرے دن ہی میں بملا کے ہاں گیا۔ وہ مجھے اداس دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر لائی۔ بولی اگر تمھیں میری وجہ سے دُکھ پہنچا ہے تو مجھے افسوس ہے لیکن میں تمھیں یوں برباد ہوتے کب تک دیکھوں؟ کسی کو کیا حق ہے تمھارے جذبات سے کھیلنے کا جب وہ تمھارے ساتھ آؤٹنگ کے لیے جانا تک پسند نہیں کرتی۔ پھر میں نے وہ تمام بہلاوے دہرائے جو میں تمھاری زبان سے سُننے کا عادی تھا۔ اس پر بملا زور زور سے ہنسنے لگی۔ ایک تلخ ہنسی، زہر میں ڈوبی ہوئی اور بولی "تم نے کتنی دنیا دیکھی ہے۔ پھر بھی کتنے بھولے ہو۔ آج شام کو ہمارے ساتھ شمی کے یہاں چلو، پھر میں تمھیں بتاؤں گی کہ دُنیا کیا ہے"۔

شام کو ہم دونوں ویسٹرن کورٹ پہنچے۔ شمی ہماری ہم جماعت رہی تھی۔ کہنے لگی آیئے مسٹر عاشق (وہ مجھے مذاق میں مسٹر عاشق کہتی تھی) ٹھیک وقت پر آئے۔ ذرا دیر کرتے تو گئے تھے کام سے۔ پھر ہم چائے پینے لگے۔ چند ہی منٹ گذرے تھے کہ اس نے مجھے کھڑکی کے پاس بُلایا۔ خبر ہے کہ میں نے کیا دیکھا؟ تم میجر خان کی موٹر میں بیٹھی ہوئی تھیں میرے اوپر جیسے بجلی گر پڑی۔ کاٹو تو خون نہ تھا بدن میں۔ خان نے اُتر کر دروازہ کھولا، تم اس کے ہاتھ کا سہارا لے کر نیچے اُتریں۔ اور ہاتھ میں ہاتھ دیے سیڑھیوں پر چڑھنے لگیں۔ میں واپس آ کر بیٹھ گیا اور باوجود کوشش کے اپنے دل کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ بملا نے بتلایا کہ تم روز شام کو میجر خان کے ساتھ یہاں آتی ہو اور یہاں سے روشن آرا کلب جاتی ہو۔ اس نے

کہا کہ آج ہم دونوں شمی کی طرف سے اسی کلب میں مدعو ہیں۔ اس رات مَیں نے دیکھا کہ تم کس طرح گلاس سے گلاس ڈبنا لڈرپی رہی تھیں۔ تمھاری زندگی کا یہ پہلو میرے لیے بالکل نیا تھا اور اس نے میرے تخیلات کے گھروندے کو آن کی آن میں مٹی میں ملادیا۔ دُہری زندگی کیا ہوتی ہے۔ مَیں نے کتابوں میں تو پڑھا تھا لیکن اس سے دوچار کبھی نہ ہوا تھا۔ آج دُہری زندگی کی زندہ مثال میرے سامنے تھی۔ میرے جذبات اور احساسات تمھاری دو زندگیوں کی چکّی میں پس رہے تھے۔ اس وقت مجھ پر جو گزری اس کی شِدّت کا مجھے آج تک اندازہ ہے، لیکن اسے تسلیم کرنے کی سکت آج بھی نہیں۔ مَیں نے زندگی میں ایسی شکست کبھی نہ کھائی تھی اور آج اپنی آنکھوں سے اپنی شکست کا ڈھنڈورا پٹتا دیکھ رہا تھا۔ بِملا اور شمّی کو میری حالت کا اندازہ تھا۔ انھوں نے دوبارہ اس موضوع کو نہیں چھیڑا۔ اور مجھے کھانے کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن میرا دل بہت بے قابو ہو رہا تھا۔ مَیں نے ان سے اجازت لی اور تنہا نکل کھڑا ہوا۔ تھوڑی دُور جاکر اچانک میرا رُخ شمشاد منزل کی طرف ہوگیا۔

باہر لان ہی پر مجھے شمع مل گئی۔ وہ سفید بُراق کپڑوں میں ملبوس فردوس کی حوُر معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں چنبیلی کے پھول تھے۔ اس نے قریب آتے ہی وہ پھول میرے اوُپر برسادیے۔ اور اپنی عادت کے مطابق مذاق کرنے لگی۔ پھر اچانک مجھے سنجیدہ دیکھ کر وہ خاموش اور سنجیدہ ہوگئی اور میری پریشانی کا باعث پوچھنے لگی۔ مَیں اسے کیسے بتاتا کہ مَیں اُس کے ہاتھوں مار کھاکر آیا ہوں جس کے باعث ہمیشہ تمھیں نظر انداز کرتا رہا۔ میں نے کہا:

"شمع میری طبیعت بہت خراب ہے ایک پیالہ کافی پلواؤ۔"

ہم جاکر لان کے اس سِرے پر بیٹھ گئے جہاں چاندنی پُوری آب وتاب سے نور برسا رہی تھی۔ اتفاق سے مَیں بھی سفید قمیص اور سفید پتلون پہنے ہوئے تھا۔ شمع کہنے لگی، ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ چاند کی ندی میں سیماب کی دو مچھلیاں تیر رہی ہیں۔ مَیں نے کہا۔ شمع اس وقت شاعری مت کرو۔ وہ بولی فلسفیوں کی صحبت میں رہتے رہتے شاعری سے بھی

نفرت ہوگئی۔ یہ تمھاری طرف اشارہ تھا۔ میرے دل پر شدید چوٹ لگی۔ میں نے کہا خدارا شمع اس وقت جلی کٹی باتیں نہ کرو۔ میرا دل بہت غمگین ہے۔ ہوسکے تو ایک گانا سُناؤ۔ شمع میرے قریب آگئی اور دھیمے سُروں میں ایک درد بھرا گیت گانے لگی۔ یاد نہیں کیا بول تھے۔ اس گیت کے لیکن اسے سُن کر مجھے تسلی ہوئی اور میرا دل ہلکا ہوگیا۔ لیکن گاتے گاتے شمع کی آواز بھرّانے لگی اور تھوڑی دیر میں اس کی ہچکیاں بندھ گئیں اور وہ مجھ سے لپٹ کر سسک سسک کر رونے لگی۔

ذرا دیر بعد ہم اُٹھ کر اُوپر چلے گئے اور کافی پینے لگے۔ اس وقت ذرا دل ٹھہرا ہوا تھا۔ میں نے تمھارے متعلق سوچنا شروع کیا۔ تم کس قدر مختلف تھیں کوشلیا، بِملا، شمّی اور شمع سے تم اندر سے کچھ اور باہر سے کچھ۔ یہ اندر باہر ایک سی۔ تم نے اپنے اُوپر بلند آہنگ گفتگو اور عظیم فلسفیانہ نظریوں کا ملمع چڑھا کر میری آنکھوں میں چکا چوند پیدا کردی۔ انھوں نے اپنا دل نکال کر میرے سامنے رکھ دیا اور میں ان کی قدر نہ کرسکا۔ اس وقت شمع کے سامنے میں بڑی شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ اس غریب نے برسوں میری خاموش پرستش کی تھی۔ اس کی دیوانگی ضرب المثل بن گئی تھی۔ میری خاطر اس نے سوسائٹی چھوڑ کر گوشہ نشینی اختیار کی۔ رنگین اور ریشمی کپڑے پہنا چھوڑ کر سادہ اور سفید لباس پہننے لگی۔ بس گیت سیکھا کرتی اور گیت گایا کرتی۔ میں اکثر اس کے ہاں جاتا۔ جب بھی جاتا ہمہ تن محبت بن جاتی۔ ہنستی ہنساتی۔ گیت گاتی اور گاتے گاتے اُداس ہو جاتی۔ پھر کبھی چلیے Ridge پر چلیں اور ہم سڑک پار کر کے اجیت گڈھ کے ٹیلے پر چڑھنے لگتے۔ اور اس کی ویران اور سُنسان سڑکوں پر گھومتے رہتے —— دیوانوں کی طرح بے مقصد بے ارادہ۔ اس طرح میں ان جراحتوں کی چارہ گری کرتا تھا جو تمھاری عجیب حرکتیں اور تمھارے نت نئے فلسفیانہ اصول میرے دل پر لگاتے تھے۔ اور جب رات گذر جاتی تھی اور صبح آتی تھی تو یہ تمھاری اصلاح کی اُمید کا نیا سُورج میری زندگی کے اُفق پر طلوع ہوتا تھا۔ اور میں پچھلے زخم بھول کر مستقبل کی یاد میں کھو جاتا تھا۔

لیکن کلب والی رات کے بعد جو صبح ہوئی اس میں ایسا کوئی سُورج طلوع نہیں ہوا اور میں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس ڈھونگ کو ختم کردینے کا فیصلہ کرلیا۔ پھر بھی میں نے تم سے اس انکشاف

کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔

رفتہ رفتہ میرے تمھارے تعلقات رسمی ہونے لگے تھے۔ میری گفتگو سے وہ بے تکلفی، وہ شدّت، اور وہ عقیدت مفقود ہونے لگی جو تم مجھ سے بطور خراج محبت وصول کرتی تھیں۔ تم نے اس تبدیلی کو محسوس کیا اور اس کی بابت دریافت کیا۔ لیکن میں تمھیں یقین دلاتا رہا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تم سے ملتا بھی، باتیں بھی کرتا۔ ہم ساتھ کھاتے پیتے بھی، اُٹھتے بیٹھتے بھی، لیکن یہ سب رسمی تھا۔ محض رواداری کی خاطر۔

وقت بیتتے کیا دیر لگتی ہے اور پھر وقت بھی کیسا خونی، طوفانی، حشر انگیز! ملک کی تقسیم ہوگئی اور ہونی کو انہونی کرنے کی خاطر کیسی کیسی درندگی اور وحشت کے کھیل کھیلے گئے گنگا اور جمنا میں اتنا پانی نہ بہا ہوگا جتنا انسانی خون گنگا جمنا کی سرزمین میں بہہ گیا۔ لاکھوں کی آبادی اِدھر سے اُدھر ہوگئی۔ دلّی کا منظر تحلیل ہو کر کراچی میں تبدیل ہوگیا اور ایک نئی دُنیا نئی اُمنگوں کو اپنے دامن میں لیے مستقبل کے اُفق پر جگمگانے لگی۔

دلّی چلی گئی لیکن دلّی کی یاد دل سے نہ جا سکی۔ حالات سُدھرے تو جی میں آئی کہ یادوں کے اِس تاج محل پر آن کے دو پھول چڑھا آؤں۔ اور میں پھر دلّی آگیا۔ ہائے یہ میر مرزا داغ کی دلّی نہیں رہی۔ شوبھا سنگھ اور سجن سنگھ کی دلّی نہیں ہی لیکن کیا کروں کہ یہاں کی گلی گلی میں اپنے افسانوں کے پلاٹ بکھرے ہوئے ہیں یہاں کی ہواہیں دل نشیں یادیں تیر رہی ہیں۔ چپّہ چپّہ پر میرے ماضی کی کہانیاں لکھی ہوئی ہیں۔

دو برس! ذرا سوچو کہ دو برس کا عرصہ کتنا طویل ہوتا ہے۔ پھر بھی کتنا مختصر! آدمی بدلنا شروع کردے تو اس میں کیا سے کیا ہو جائے، جیسے صدیاں بیت گئی ہوں۔ اور وہ کٹنے کو یوں کٹ جائے جیسے ایک پل۔ ان دو برسوں میں مجھ پر کیا بیتی، تم نے بھول کر بھی نہ پوچھا۔ لیکن میں تمھاری پل پل کی خبر لیتا رہا۔ ہاں اس بے تعلقی اور کشیدگی کے باوجود مجھے تمھاری فکر تھی۔

اور تمھیں بھی میرے دلّی آنے کی خبر مل ہی گئی۔ اور آج صبح نئی دلّی کے اس ہوٹل میں تم مجھ سے ملنے آگئیں۔ کتنی گرمی تھی آج تمھاری گفتگو میں۔ کتنی چمک ہے تمھاری آنکھوں میں، کیا نکھار ہے تمھارے تبسّم میں۔ جیسے تم وفا کے چشمے میں غوطہ لگا آئی ہو۔ اب کیوں

مجھ سے ملنے میں اندیشۂ رُسوائی نہیں ہے؟ کیوں تمھیں بدنامی کا ڈر نہیں ہے۔ اب بھی تو میں وہی ہوں۔ گوشت پوست کا انسان، ایک مرد! ارے، تم نے تو بے قرار ہوکر میرے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ یہ بات صحت مند دوستی کے شایانِ شان نہیں ہے۔ یہ بڑی غیر صحت مند نشانی ہے۔ شرافت اور عزت کے لیے مُہلک!

میری جان بڑی دیر کردی تم نے!! اب تو میں بھی دُہری زندگی گذارتا ہوں، بالکل تمھاری طرح۔ دراصل اب ہی تو میں تمھارے لائق ہوا ہوں۔ آؤ ایک پیار دو، پھر ہم چل کر چائے پیئیں گے۔

○○

ستا پیسہ

ناصر نے پھر گھڑی دیکھی۔ رام لال ہاتھ پر ٹھڈی دھرے ہوئے کیب رے کے مسخروں کو دیکھ رہا تھا۔ ناصر نے وسکی کا گلاس اٹھایا۔ اور قریب قریب نیٹ یعنی خالص وسکی چڑھا گیا۔ پھر بھاسکر کو ماں کی گالی دے کے کہا۔ "وہ اور تارا ابھی تک نہیں آئے۔"

ادھر کیب رے کے مسخرے بار بار ٹانگیں چیر چیر کے فرش پر گر رہے تھے۔ ایک آدھی سے زیادہ ننگی عورت ٹانگیں چھت کی طرف اٹھائے دونوں کہنیوں کے بل کھڑی منہ سے رومال اٹھا رہی تھی۔ جب وہ اٹھا چکی اور پورا ہال تالیوں سے گونجا تو رام لال نے بھی آہستہ سے وسکی کا گلاس اٹھایا۔ اس طرح جیسے کوئی کسی بڑی نازک سی لڑکی کو پیار کرے، ذرا سی وسکی چکھی اور پھر کیب رے کی طرف دیکھنے لگا۔

اس نے آہستہ سے سگریٹ سلگایا۔ اور پھر سگریٹ کیس ناصر کی طرف بڑھا دیا۔ ناصر نے بھاسکر کو پھر گالی دی اور سگریٹ کا ایک لمبا سا کش لیا۔ اور ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کوئی بوائے نظر آجائے تو اور وسکی منگوائے۔

اب کیب رے کے فرش پر دو لڑکیاں قلابازیاں کھا رہی تھیں۔ سرخ و سفید سنہرے بال ہر قلابازی کے ساتھ بکھر جاتے۔ ان کے اعضا بجلیوں کی طرح کوند رہے تھے۔ نیلی نیلی آنکھیں تیز سپاٹ لائٹ میں چمک رہی تھیں۔ ان کے ہونٹوں پر وہ دائمی مصنوعی مسکراہٹ تھی جو بچپن سے شروع ہوئی تھی۔ اور جو اس وقت تک باقی رہے گی جب ان

کے ہاتھ پاؤں شل ہو جائیں گے۔ اور ان کی کمریں اور ان کے دھڑ قلابازیوں کے کام کے نہ رہیں گے لیکن اس درمیان میں وہ فرش کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک کبھی ایک ہی ساتھ، کبھی متضاد سمتوں سے قلابازیاں کھاتی ہوئی اپنے جسم کو ناممکن طریقوں پر موڑتی ہوئی کبھی عورت، کبھی بچھو کبھی چھلاوہ معلوم ہوتی ہوئی سارے مجمع پر سحر ساکر رہی تھیں۔ جو شراب اور سگریٹوں اور اپنے ساتھ کی خوب صورت عورتوں تک کو بھول کے ہر غیر معمولی اور غیر متوقع قلابازی پر دیوانہ وار تالیاں بجاتا۔ خدا نے نسوانی جسم کو حسین بنایا، مرد کو لبھانے کے لئے افزائش نسل کے لئے۔ مرد نے نسوانی جسم کی دو قسمیں قرار دیں، قیدی جس کی قسمت میں عمر قید ہے۔ اور کھلونا جو قلابازیاں کھاتا ہے۔ ایک موٹا سا میمن سیٹھ جس نے گیارہ شادیاں کی تھیں۔ چار شرعی اور سات غیر شرعی اور جس نے ہر بیوی کے نام ایک بلڈنگ لکھ دی تھی۔ سوچنے لگا کہ اس طرف کی قلابازی کھانے والی کس طرح ہتھے چڑھے گی۔ رام لال نے انگڑائی لی۔ اور کل صوبہ بمبئی کے فنانس ممبر سے اپنی گفتگو کے متعلق سوچنے لگا۔ اس نے پھر بڑی متانت سے وسکی کا ایک گھونٹ پیا۔ اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے شارک اسکن کے جاکٹ پر سے سگریٹ کی راکھ کو جھاڑا۔ اور پھر قلابازی کھانے والیوں کو دیکھنے لگا۔

کسی نے اس کے شانے پر آہستہ سے ہاتھ رکھا۔ وہ سمجھا بھاسکر ہو گا۔ لیکن یہ ایک اجنبی تھا۔ ادھیڑ عمر کا نیلے ٹوئیڈ کا سوٹ پہنے۔ بھڑکدار ٹائی میں سونے کا پن لگائے جیسے ابھی ابھی سٹاک ایکسچنج میں سٹہ کھیل کر آرہا ہو۔ ناصر کی آنکھیں بالکل سرخ تھیں۔ وہ اجنبی کو نہ پہچان کر مند سی گئیں۔ مگر رام لال نے اس کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔ اجنبی کے ساتھ ایک چوڑا چکلا سا سفید فام نوجوان تھا، جو یا تو اینگلو انڈین تھا یا پھر ان "سرطان زدہ" نوجوانوں میں سے ایک جو بیسیوں کی تعداد میں ہیمرا سمتھ کے ناچ گھر میں حلقہ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ کسی اچھی لڑکی کی تلاش یا پال جونسن کے انتظار میں۔ ان کے پیچھے دو لڑکیاں تھیں۔ ایک دراز قد، سڈول، صحت مند اور بشرے سے ذرا چالاک اور مغرور معلوم ہوتی تھی۔ دوسری پستہ قد، ذرا موٹی سی، عمر میں کوئی تیس سال کے لگ بھگ، سیاہ بال کٹے ہوئے مگر بڑی بھاری ساڑی پہنے ہوئے۔

رام لال اجنبی کی طرف پھر ذرا تعجب سے دیکھ کے، مگر اس کے ساتھ لڑکیوں پر

ایک نظر ڈال کے اٹھ کھڑا ہوا۔ ناصر نے آنکھیں بند کئے ہی کئے دل ہی دل میں بھاسکر اور تارا کو پھر ایک گالی دی۔ رام لال نے اجنبی سے آنکھوں ہی آنکھوں میں پھر کچھ پوچھنا چاہا۔ اتنے میں قلابازیاں ختم ہوئیں۔ ننگے ریشمی جسم جن میں ہڈی نہیں ہوتی۔ مجمع کی تالیوں کے ہجوم میں ازلی ابدی جھوٹی مسکراہٹ کے حصار میں جھکے، پھر جھکے اور دروازہ کے اس طرف غائب ہو گئے۔ ایک دم سے تمام روشنیاں کھلیں اور پورے ہال میں روشنی، باتوں کی آواز اور سگریٹوں کے دھوئیں کا سیلاب آگیا۔

اجنبی نے رام لال سے کہا: "ہم لوگوں کو کوئی میز نہیں مل سکا۔ دیکھئے نا پورا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ ہم آپ کے ساتھ بیٹھ سکتے ہیں۔"

رام لال نے کہا۔ "ضرور۔"

"ضرور۔ جی ضرور۔" ناصر نے جھوم کر کہا۔ اور بوائے کو پکار کر سب کے لئے وسکی لانے کو کہا۔

اور واقعی رام لال نے دیکھا کہ آج تاج محل ہوٹل کے ٹی روم میں بڑا مجمع تھا۔ ایک میز تو کیا ایک کرسی بھی خالی نہ تھی۔ بوائے دو کرسیاں اور لایا تب کہیں ادھیڑ اجنبی، سرطان زدہ نوجوان اور دونوں لڑکیوں کے لئے جگہ نکل سکی۔

مائیکروفون نے اعلان کیا "اگلا ناچ رمبا ہے۔" ادھیڑ اجنبی، چھوٹی موٹی عورت کو لے کر ناچنے اٹھا۔ ناصر بھاسکر کو ایک اور گالی دے کے ہاتھ منہ دھونے ہال کے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں بیچ کا حصہ ناچنے والوں سے بھر گیا۔ وہ ادرک کے رنگ کے بالوں والی لڑکی۔ اس کی ناک سے معلوم ہوتا ہے یہودن ہو گی۔ پولینڈ کی پناہ گزین۔ اس امریکن لوئی ننٹ کے گال سے گال ملا کر کس طرح ناچ رہی ہے۔ رام لال نے سگریٹ کا ایک کش لیا۔ اور یہ انگریز کپتان، اس کی مونچھیں تو دیکھو پھر ہم جارج پنجم کی حکومت کے ابتدائی زمانہ کی طرف واپس جا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ سیاہ پوش لڑکی، دراز قد، بالائی کے بنے ہوئے رخسار نیلے ریشم کی آنکھیں کس وقار سے ناچ رہی ہے۔ معلوم نہیں پارسی لڑکیاں اب فراک کیوں پہننے لگی ہیں۔ شاید اس وجہ سے کہ امریکن اور انگریز سپاہی ساڑیوں سے گھبراتے ہیں۔ رام لال نے بڑی احتیاط سے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل کے بجھایا۔ اور وسکی کا ایک ہلکا سا گھونٹ اس طرح لیا گویا یہ اس سیاہ پوش انگریز

لڑکی کے بالائی کے بنے ہوئے رخساروں کا لمس تھا۔

دو تین سکھوں نے ناچتے میں پنجابی لڑکیوں کو لپٹ کے "دہلی چلو" کا نعرہ لگایا۔ انگریز افسران کی طرف کچھ سراسیمگی اور کچھ حقارت سے دیکھ کے اپنے ساتھ کی ناچنے والیوں سے موسم کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ میمیں نوجوان افسروں کی آغوشوں میں ناچتے ناچتے مسکرائیں۔ لکھنؤ کی ایک لڑکی نے لدھیانہ کے ایک نوجوان سے کہا "دیکھئے پھر آپ مجھ پر ترچھی نظر کا الزام لگائیں گے۔۔۔۔۔" ایک خوبصورت سے گجراتی سیٹھ نے ایک خوبصورت سی رائیپوری حسینہ سے کہا۔ "جون سات آٹھ دن میں نیا مال آئیگا۔۔۔۔" اور خوبصورت سی رائیپوری حسینہ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

رام لال نے دیکھا کہ اس کی اپنی میز سے دراز قد، سڈول جسم والی حسینہ اور چوڑے چکلے "سرطان زدہ" نوجوان کی آنکھوں میں باہم شرارے چمکے۔ اس نے دیکھا کہ دونوں کے دانت، صحت مند اور چوڑے چوڑے چمکنے لگے۔ اور ایک لمحہ کے اندر دونوں رقص کرنے والوں کے ہجوم میں غائب ہو گئے۔

رام لال نے اپنے شارک اسکن کے اجلے کوٹ پر سے راکھ جھاڑنا چاہی۔ مگر راکھ کہیں گری ہی نہیں تھی۔ اور پھر وہ سوچنے لگا کہ صوبہ بمبئی کا یہ فنانس ممبر کس قسم کا آدمی ہو گا جس سے مجھے کل ملنا ہو گا۔ ریاست کسی اور کو بھیجتی۔ مجھے کیوں چنا۔ بوائے نئے گلاسوں میں وسکی اور برانڈی بھرے ہوئے آیا۔ رام لال کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اس نے سوڈے کے شیشے میز پر رکھ دیئے۔ اور چلا گیا۔ رام لال نے دیکھا دروازے کے باہر ناصر، بھاسکر اور اس کی بیوی تارا سے حجت کر رہا تھا۔ تارا بھاسکر کے بازو میں بازو ڈالے جھول رہی تھی۔ اور ناصر کو بیوقوف بنا رہی تھی۔ اور پھر بھاسکر اور تارا اوپر اپنے کمرے کو چلے گئے۔ ناصر سیڑھیوں کی طرف بڑھا اور پھر اسی دبلی سی پارسی رنڈی کو دیکھ کر جو ہر شام سو بار لفٹ میں نیچے سے اوپر جاتی ہے، اور سو بار سیڑھیوں سے نیچے اترتی ہے۔ اگر تاج محل ہوٹل میں کسی کو دیکھ کر لرزہ آجاتا ہے تو اسی کی مکڑی جیسی مسکراہٹ سے، ناصر پھر بھاسکر کو گالیاں دیتا ہوا واپس آیا۔ اور رام لال نے چور بازار میں خریدے ہوئے چسٹر فیلڈ اس کی طرف بڑھا دیئے۔ "دیکھا سالا، بھاسکر نہیں آیا۔ کہہ رہا تھا، کھانا ساتھ کھائیں گے۔ میں تو رنز جاتا ہوں۔ رام تیرا جی چاہے تو تو سالے بھاسکر کے ساتھ

کھانا کھالے ورنہ اس کو اس کی جورو کے ساتھ زہر مار کرنے دے۔ بیٹے نے گھنٹہ بھر انتظار کرایا۔ اور خود سینما چل دیا تھا۔"

وسکی کا گلاس دو گھونٹ میں ناصر نے چڑھا کر کہا۔ "میں چلا۔"

رام لال نے کہا۔ "بیٹھ تو سہی۔ دیکھ یہ ہماری میز پر جو لوگ آئے ہیں ذرا ان سے باتیں کریں گے۔ دو لڑکیاں ہیں، شاید گٹھ جائیں۔"

"خاکسار کو تو نیند آ رہی ہے۔ رام تیرا جی چاہے تو تو شکار کھیل۔"

"کھانا بھی نہ کھائے گا۔ اتنا پی کے کھانا نہیں کھائے گا تو دو دن میں جگر بیکار ہو جائے گا۔ مرجائے گا۔"

"رام پیارے آج تو یاروں کو نیند بہت آ رہی ہے۔ تیرے سر کی قسم یاروں کو دو عورتیں پسند ہیں۔ ایک تو وسکی۔ کیا بی جان پری خانم ہے واہ واہ۔ اور دوسرے نیند۔ باقی تمام عورتیں۔ رنڈیاں ہیں خدا حافظ رام!" اور وہ چل دیا۔

آخر رمبا ختم ہوا۔ اور ہال بھر میں تمام میزوں پر ناچتے ہوئے تمام جوڑے واپس آئے جیسے کشتی نوح سے کبوتروں کے سینکڑوں جوڑے کسی نامعلوم جزیرے کو دیکھنے کے لئے اڑ گئے ہوں اور تھکاوٹوں کی لذت اور مسکراہٹوں کے جھوٹ کی شاداب ٹہنیاں اپنے ہونٹوں اور اپنے خون کی روانی میں دبائے پھر اپنے اپنے کابکوں میں آ بیٹھیں۔

رام لال نے اجنبیوں کی طرف وسکی اور برانڈی کے گلاس بڑھائے۔ اور ادھیڑ اجنبی نے جو اپنی چھوٹی موٹی سی معشوقہ کے ساتھ بڑا کامیاب ناچ ناچکے بہت خوش معلوم ہوتا تھا۔ انگریزی میں کہا۔ "آیئے ہم سب اپنا تعارف تو کرالیں۔ میرا نام شیوداسانی ہے۔"

"میرا نام رام لال ہے۔"

"بڑی خوشی ہوئی۔"

"بڑی خوشی ہوئی۔"

"یہ" اور ادھیڑ اجنبی مسکرایا۔ "ان کو تو آپ نے سینما کے پردے پر بارہا دیکھا ہو گا۔ ارونا مشہور سٹار پہلے نیو تھیٹرز میں تھیں۔ اب میری کمپنی میں ہیں---- جی،

جاگیردار پروڈکشنز اور یہ ان کی بہن ارمیلا ---- اور یہ جو جو تمہارا اصلی نام مجھے یاد ہی نہیں رہتا۔"

خالص ترین کائی میں چوڑے چکلے نوجوان نے جواب دیا۔ "ہر گش مائز۔ آپ جانتے ہوں گے یہ جرمن نام ہے مگر میں باش نہیں۔ میں نہیں۔ میں اینگلو سیکسن ہوں۔ خالص اینگلو سیکسن۔"

رام لال نے فوراً تصفیہ کر لیا کہ "اینگلو انڈین نہیں ہو سکتا۔"

کائی نوجوان نے کہا۔ "خالص اینگلو سیکسن۔" اور پھر اپنا گلاس اٹھا کے کہا۔

"ہیرس بسٹ۔"

"ہیرس بسٹ۔"

ایک بڑا سا گھونٹ پی کے کائی نوجوان نے کہا۔ "یس سر۔ خالص اینگلو سیکسن۔ کیوں پیٹ۔"

شیوداسانی نے ہندوستانی میں رام لال کو سمجھایا کہ یہ ارونا کا اصلی نام ہے۔ وہ کلکتہ کی رہنے والی ہے اور اینگلو انڈین ہے۔ اور اس کا نام پیٹریشیا ہے۔

سرطان زدہ' کائی نوجوان نے کہا۔ "لیکن یہ بھی یاد رکھئے میں ہر جگہ یونین جیک گھماتا نہیں پھرتا۔ میں اٹلی کی طرف ہوں۔ نہیں نہیں۔ نو سر مجھے چرچل نہیں چاہئے۔ نوپ نوکس نوپ۔ وہ سکھ چلا رہے تھے نا دہلی چلو' دہلی چلو۔ مجھے ان سے ہمدردی ہے۔ سچ مچ مجھے ہمدردی ہے۔" اب فاکس ٹراٹ کا راگ بجنا شروع ہو گیا تھا۔ کائی نوجوان کے پاؤں میز کے نیچے تھرکنے لگے۔ اور اس نے اپنی انگلیاں ارونا (بیٹ) کی انگلیوں میں الجھا کے کہا۔ "ڈارلنگ' یہ ناچ میرا ہے۔"

"لالچی" دراز قد' سڈول' صحت مند اینگلو انڈین ایکٹریس نے جواب دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"خدا حافظ۔ پا۔" کائی نوجوان نے تھرکتے ہوئے کہا۔

شیوداسانی نے موٹا سا چرچل سگار سلگاتے ہوئے رام لال سے کہا۔ "دونوں کی نسبت ہو گئی ہے۔"

رام لال نے "اچھا۔" کہا اور دور کے میز پر ایک نوجوان جوڑے کو دیکھنے لگا۔ یہ

مصر کا کونسل جنرل اور اس کی سیکرٹری تھی۔ آنکھیں چار ہوئیں تو اس نے کونسل جنرل کی طرف مسکرا کے دیکھا۔ کونسل جنرل نے مسکرا کے اس کے سوال کا جواب دیا۔

اور یہ دیکھ کر کہ رام لال کی رسائی سوسائٹی میں اوپر تک ہے۔ سیٹھ شیوداسانی نے پوچھا۔ "آپ کیا کرتے ہیں بزنس مین ہیں۔"

"نہیں میں سرکاری ملازم ہوں۔ فی الحال تو آنند نگر میں فنانس سیکرٹری ہوں۔ اور آپ تو غالباً" فلم کمپنی کے ڈائریکٹر ہیں۔"

"پروڈیوسر' ڈائریکٹر۔" سیٹھ شیوداسانی نے کہا۔ "پہلے میں فلم بیچا کرتا تھا۔ اس سے پہلے سٹاک بروکر تھا۔ اس سے بھی پہلے لاہور میں ایک بینکنگ کمپنی میں اسی روپے کا ملازم تھا۔ آپ کچھ پئیں گے۔"

"نہیں۔" پھر رام لال نے دیکھا کہ دروازے پر کھڑے بھاسکر اور تارا اس کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ کھانے کے کمرے کو چلنے کے لئے۔ "اب آپ اجازت دیں تو ذرا میں اپنے دوستوں کے ساتھ جاؤں۔"

"ضرور۔ ضرور۔ اپنی میز پر جگہ دینے کا بہت بہت شکریہ۔ آپ یہیں ٹھہرے ہیں تاج میں؟"

"جی ہاں۔"

"کمرہ نمبر؟"

"تینتالیس۔"

"میرا ٹیلی فون نمبر 31784 ہے۔ کسی دن آیئے میں میرن ڈرائیو پر رہتا ہوں۔ راج کنول بھون۔ فلیٹ نمبر 4۔ دیکھئے یہ میرا کارڈ ہے۔"

"بہت بہت شکریہ۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔" اور اس سے ہاتھ ملا کے رام لال دروازے کی طرف چلا۔ جہاں تارا بھاسکر کے کاندھے پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔

دوسرے ہی دن غافل اور ہوشیار سرکار نے قیامت کر دی۔ صبح کو اخباروں میں اعلان چھپا کہ ہزار کے نوٹ واپس کر دیئے جائیں۔ اور تفصیلات بتائی جائیں کہ یہ کس طرح حاصل ہوئے ہیں۔ چور بازار میں ایک بڑا دھماکہ ہوا۔ اور اگرچہ ہزار کے نوٹ بھی

بہت جلد چور بازار کی جنس بن گئے۔ مگر فوری اثر جو ہوا وہ ایسا تھا جیسے کسی پر اچانک فالج گرے۔

بمبئی میں اس زمانہ میں سیکشن 93 تھا۔ انتخابات ہونے والے تھے۔ کانگرس کی حکومت ابھی برسر اقتدار نہیں آئی تھی نگران کار حکومت کے فنانس ممبر نے رام لال سے چلتے چلتے کہا۔

"ہاں خوب یاد آیا ڈائریکٹر جنرل پولیس نے ٹیلی فون کیا تھا کہ کئی سو سیٹھ آپ کی ریاست آنند نگر گئے ہیں ہزار کے نوٹوں کا لطیفہ آپ کو یاد ہے نا۔۔۔۔ گڈ آفٹر نون۔"

جب وہ تاج واپس پہونچا تو ٹیلی فون آپریٹر نے کہا نمبر 31784 سے آپ کے لئے ٹیلی فون آیا تھا۔

دراز قد، سڈول، صحت مند ایکٹریس ارونا (پیٹ) کی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ پھر سیٹھ شیوداسانی کے سر کے کھچڑی بال اور سرطان زدہ نوجوان دور افق کے اس پار کہیں غائب ہو گیا۔

لیکن وہ تھکا ہوا تھا۔ ہاتھ منہ دھو کے وہ کھانے کے کمرے میں گیا۔ تاج کا جیسا بدمزہ کھانا شاید ہی کہیں ملتا ہو۔ اس نے منٹ ساس کے ساتھ روسٹ مٹن کو زہر مار کیا۔ ناریل کے پانی کی آئس کریم کھائی۔ کافی گڑ ڈال کے پی۔ اور چور بازار کے بلیک اینڈ وائٹ سگریٹ سے ذرا تشفی ہوئی۔ اور وہ اسی طرح کپڑے پہنے پہنے بستر پر لیٹ گیا۔ پنکھا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ آہستہ خرام تاتاری معشوق کی طرح۔ قیامت کی، یہ کیب رے کے سفید پاؤڈر سے تھپے ہوئے جسموں کی قلابازیوں کی چال نہیں تھی۔ اور وہ سوچنے لگا سوا عورت کے میں نے ہر چیز کو معشوقہ سمجھ کے برتا، وسکی کو، اپنی ملازمت کو، پنکھے کی ہوا کو، اپنی متین ٹائیوں کو، اپنے کپڑوں کی کریز کو، چور بازار کے سگریٹوں کو، اپنے لمبے لمبے ناخنوں۔۔۔۔۔ پھر اس نے تارا کو اپنے تصور میں بھاسکر کے بازو میں بازو ڈالے تاج کی دوسری منزل پر سیڑھیوں کے پاس جھولا جھولتے دیکھا۔ اور سوچنے لگا اگر میں نے کبھی شادی کی، میں اس طرح کسی کو سرراہ جھولا جھولتے دیکھوں گا۔ تو۔۔۔۔ اور وہ کوئی قاتل مگر ہلکی اور معشوقانہ سزا سوچنے لگا۔ سب سے اچھی موت وہ ہے جو سمندر کی لہروں کے نیچے جھاگ کے نیچے، نیلے پانی کے نیچے واقع ہو۔۔۔۔۔ تو میں کسی کو تھیلے میں سی کے

سمندر میں ڈال دوں گا۔ اس نے ناصر سے ایک جلن سی محسوس کی۔ اس کی ہربات میں قیامت اور قلابازی ہے۔ جو چیز ہو اسے ایک گھونٹ میں پی جاتا ہے۔ روند ڈالتا ہے' مسل ڈالتا ہے خواہ وسکی ہو' جم خانہ ہی سہی۔ خواہ عورت ہو' دوست کی بیوی سہی خواہ سگریٹ ہوں۔ 555 ہی سہی جو سوائے چور بازار کے کہیں نہیں ملتے۔

پنکھا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ آہستہ خرام تاتاری معشوق کی طرح۔ یہ کائستھ ہونے کی سزا تھی کہ رہو ہندوستان میں اور پڑھو غزلیں۔ اور تصور کرو تاتاری معشوق کا۔ مثنوی گلزار نسیم اور فنانس کی مسلوں' کارروائیوں' ہر سال بجٹ بنانے' اسکیموں' تنخواہوں پر اعتراض کرنے میں کتنا فرق ہے۔ کتنا فرق ہے۔

جب وہ سو کر اٹھا تو بھاسکر اور تارا دروازہ کھٹکھٹا رہے تھے۔ کمبخت کبھی جو ایک دوسرے سے جدا ہوں۔ شادیاں سب کی ہوتی ہیں مگر ایسی شادی شاید ہی کسی کی ہوئی ہو۔ تارا نے ہاتھ جوڑ کے نمستے کیا۔ وہ مسکرایا۔ تارا اس کی میز پر ٹائم' لائف اور اسپورٹنگ ٹائمز کے پرچے الٹنے پلٹنے لگی۔ وہ جلدی سے ہاتھ منہ دھو کے آیا پھر سے ٹائی باندھنے لگا۔

ولنگڈن سے وہ سب کھانا کھا کے دس بجے کے قریب لوٹے۔ اور ناصر کو رٹز پر اتار دیا۔ ناصر تارا سے لگ کے بیٹھا تھا۔ اور تارا تھی کہ موٹر میں بھاسکر سے لپٹتی چلی جاتی تھی۔ ناصر کے اترنے کے بعد اس نے ذرا اطمینان کی سانس لی۔

"چلو چاندنی رات ہے قلابہ چلیں۔"

ڈرائیور نے قلابہ کی طرف گاڑی کو موڑا۔

رام لال نے کہا۔ "تم دونوں تو ٹہلنے چلے جاؤ گے میں اکیلا مکھیاں مارتا رہوں گا۔"

"نہیں جی ہم تم کو چھوڑ کے نہیں جائیں گے۔" بھاسکر نے کہا۔

"دادا ہم نے آپ کے لئے ایک ایسی اچھی لڑکی ڈھونڈی ہے۔" تارا نے کہا اور اس کے ہونٹوں کی سرخی دانتوں کے اطراف اور اس کی بندی کی سرخی پیشانی کی بے نمک سفیدی میں مسکرائیں۔ اور رام لال نے محسوس کیا کہ بے نمک سفید پیشانی' اور سرخ بندی' اور ہونٹوں کی لالی اور چمکتے ہوئے دانت سب اس کے اپنے بازو سے لپٹے ہوئے جھولا جھول رہے ہیں۔

دور میلوں تک سمندر پر چاندنی اور دھند میں خاموش سی آویزش تھی۔ یہ سب

چور بازار کے سگریٹوں کا دھواں معلوم ہوتا تھا۔ ناریل کے درخت خاموش کھڑے تھے۔ ہوا میں خوش گوار ٹھنڈک تھی۔ اور رام لال نے دو انگلیاں اپنے ہونٹوں پر رکھ کے بڑی شائستگی سے جماہی کو روکا۔

رات کے گیارہ بجے جب وہ پہنچا تو پھر یہ پیغام لکھا ہوا ملا کہ نمبر 31784 سے ٹیلی فون آیا۔ ایک اور پیغام میں لکھا تھا کہ دس بجے پھر ٹیلی فون آیا' سیٹھ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ ان سے کل صبح بات کر سکتے ہیں۔

اور صبح ساڑھے سات بجے اس نے نمبر ملایا' 31784۔ ایک زنانی آواز نے کہا۔ "ہلو۔" اس نے اپنے دل میں کہا اروناعرف پیٹریشیا عرف پیٹ۔ پھر کہا۔ "میں سیٹھ شیوداسانی سے پھر بات کر سکتا ہوں؟"

"آپ کا نام؟"

"لال۔"

"لال! کہاں سے؟"

"تاج سے۔"

"کہاں سے؟" زنانی آواز نہیں سمجھی۔

"تاج محل ہوٹل سے۔ لال۔"

"اوہ مسٹر رام لال۔"

"جی ہاں۔ آپ ارونا ہیں۔"

"جی نہیں۔ ارمیلا۔ کیوں کیا آپ ارونا سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"مجھے سیٹھ شیوداسانی نے ٹیلی فون کیا تھا۔"

"جی ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔ معلوم ہے۔ میں ابھی ان کو بلاتی ہوں۔ آپ ذرا ٹھہریئے۔" اور پھر اس نے آواز سنی۔ "پا۔ پا۔"

پھر آواز آئی "پا۔ مسٹر رام لال ٹیلی فون پر ہیں۔"

پھر سیٹھ شیوداسانی کی ہانپتی ہوئی آواز آئی۔ "اوہ ہلو مسٹر رام لال۔ آپ کیسے ہیں۔ میں نے کل بھی ٹیلی فون کیا تھا۔۔۔ جی کوئی خاص بات نہیں۔۔۔۔ آج یہاں میرے

فلیٹ میں ایک چھوٹی سی پارٹی تھی---- جی بالکل انفارمل- بے تکلف سی---- آپ آ سکیں گے-"

"ضرور-" رام لال نے ارونا کو تاج میں ناچتے دیکھا- "کتنے بجے؟"

"آٹھ بجے- بالکل انفارمل سی-" پھر سیٹھ شیوداسانی کی آواز میٹھی سی پھنکار بن گئی- "میں نے دو تین لڑکیوں کو بلایا ہے- ارونا تو ہوگی ہی- اس کا منگیتر بھی ہوگا- اس کے علاوہ اور بھی---- بالکل انفارمل سی پارٹی جی---- ضرور آنا-"

"میں ضرور آؤں گا-"

"پتہ تو آپ کو یاد ہے نا- راج کنول بھون- فلیٹ نمبر4- پہلی منزل پر، سمندر کے رخ---- میرین ڈرائیو پر----"

"جی ہاں آپ کا کارڈ میرے پاس ہے-"

"تو پھر آپ آئیں گے نا- ضرور-"

"ضرور- بہت شکریہ-"

"ضرور-"

"بہت شکریہ-"

رام لال بھاسکر کی گاڑی میں میرین ڈرائیو چلا- راستہ ہی میں سکھ شوفر نے کہا کہ ادھر کہیں گوالیار نٹنگ کے پاس اس کی بھی کہیں دعوت ہے- رام لال نے اسے جانے کی اجازت دیدی- اور سوچا کہ تاج ایسا یہاں سے کتنی دور ہے- واپسی میں پیدل ہی چلا آؤں گا- راج کنول بھون کے باہر صرف ایک بڑی سی بیوک کھڑی تھی- اوپر کی منزل میں ایسی زیادہ روشنی بھی نہ تھی- اور نہ چہل پہل کے کوئی خاص آثار تھے اسے ذرا حیرت بھی ہوئی- چوکیدار نے اسے راستہ بتایا- اور سیڑھیاں چڑھ کے اس نے دائیں طرف گھنٹی کا کھٹکا دبایا- ایک منٹ انتظار کیا- وہ دوبارہ کھٹکا دبانے ہی والا تھا کہ شرٹ سلیوز اور کورووارئے کے پتلون میں سیٹھ شیوداسانی کی شکل دروازے کے کواڑ اور دیوار کے درمیان نظر آئی اور ان کی آواز آئی- "اوہ مسٹر لال- تشریف لایئے- تشریف لایئے-"

معلوم ہوتا تھا کہ کسی سے ٹیلی فون پر باتیں کرتے کرتے وہ دروازہ کھولنے کے لئے

آئے تھے۔ رام لال کو بٹھا کے وہ پھر ٹیلی فون پر باتیں کرنے لگے۔ "تم لوگ نو بجے تک آ جانا۔ نو بجے تک۔ ہاں نہیں۔۔۔۔۔۔ وہی نئی ایکسٹرا لڑکی۔ نہیں جی۔ ایسی تو ہو جو سوسائٹی میں بات چیت کر سکے۔ نہیں۔ تم رہنے دو۔۔۔۔۔ اچھا دیکھو نو سے پہلے نہیں۔"

سیٹھ شیودا سانی بے حد گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے ڈرائنگ روم کا دروازہ بند کیا۔ "معاف کیجئے گا۔" کہہ کے سگریٹوں کا ڈبہ رام لال کے سامنے رکھا۔ اور کھڑکی کو بھی اچھی طرح سے بند کیا۔ رام لال ذرا پریشان ہو کر یہ سب دیکھ رہا تھا۔ شیودا سانی پھر۔ "معاف کیجئے گا۔ دوسرے مہمان آتے ہی ہوں گے" کہہ کے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

رام لال نے ڈرائنگ روم کا جائزہ لیا۔ دیواروں پر ہلکا پینٹ' فرش پر بڑے بڑے چکنے چکنے ٹائلز' اور ان پر کم از کم دس ہزار کا بخارا کا قالین' تہرے اسپرنگ کے صوفے۔ اخروٹ کی تپائیاں۔ چاندی کے ایش ٹرے' ایک دیوار پر ارونا کی قد آدم تصویر۔ اور اس کے سوا اور کئی تصویریں جن میں کسی سے بھی کسی خاص بلند ذوقی کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔

سیٹھ شیودا سانی پرتگالی برانڈی کا ایک بہت بڑا شیشہ اور سوڈے کی بوتلیں لئے ہوئے آیا۔ یہ سب میز پر رکھ کے پھر اندر چلا آیا۔ اور ایک چھوٹی سی کشتی میں گلاس لے آیا۔ کہنے لگا میں نے آج سب نوکروں کو چھٹی دے دی ہے۔ یہ سب آپ کو عجیب معلوم ہوتا ہو گا۔ مگر زمانہ نازک ہے اور کسی پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا اور اس نے بڑی شک کی نظروں سے رام لال کی طرف دیکھا۔

رام لال بہت حیران تھا۔ محض اپنے طبعی سکون اور آہستگی کی وجہ سے پریشانی نہ اس نے محسوس کی نہ اس کا اظہار کیا۔ یہ تو ظاہر تھا کہ سیٹھ شیودا سانی اسے کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ مگر یہ بند دروازہ کیوں؟ بند کھڑکیاں کیوں؟ اور یقیناً اس نے دوسروں کو نو بجے سے پہلے نہ آنے کے لئے ٹیلی فون کیا تھا۔ رام لال سمجھا تھا کہ رومان اور راز اور اسرار اور سراغ رسانی کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔

سیٹھ شیودا سانی نے دو گلاسوں میں آدھی آدھی برانڈی انڈیلی۔ رام لال عموماً" چھوٹے پیگ کا عادی تھا۔ مگر اس وقت انکار کو وہ کمزوری سمجھا۔ مگر اپنی رفتار کو بہت ہی کم رکھنے کا فیصلہ کر کے اس نے گلاس اٹھا لیا۔ سیٹھ شیودا سانی جو اب ذرا سکون کے عالم میں تھا قریب کے صوفے پر بیٹھ کے گلاس کو بجلی کی روشنی میں اٹھا کے اور ایک آنکھ

کھول کے' ایک بند کر کے گویا گلاس کو بجلی کی روشنی میں پرکھ کے کہنے لگا۔ "یہ بڑی پرانی برانڈی ہے۔ اس کا میرے پاس بہت بڑا سٹاک ہے۔ اور میں نے یہ فوج سے خریدی تھی ---- ایسی برانڈی آپ کو بمبئی میں شاید ہی کہیں ملے۔ اچھی سے اچھی مدیرا اس کے سامنے ہیچ ہے۔ ہیرس بیسٹ۔

"ہیرس بیسٹ۔"

سیٹھ شیوداسانی نے اسے سگریٹ دیا۔ اور پھر خود سگریٹ سلگا کے لمبا سا کش لے کے کہنے لگا۔ "مسٹر لال میں آپ سے دھرم سے کہتا ہوں میں ایماندار آدمی ہوں۔ میں نے دھوکا دے کے روپیہ نہیں بنایا۔"

"بے شک' بے شک۔" رام لال نے جواب دیا۔

"آپ کو انکم ٹیکس اور محصول زائد منافع کی شرح تو معلوم ہے نا۔ لاکھوں روپے کماؤ تو آپ کے ہاتھ میں سرکار صرف تھوڑے سے روپے رہنے دیتی ہے۔ اور باقی سب ہضم کر جاتی ہے۔ بتاؤ ہم لوگ کیا کریں۔ روپیہ بینک میں جمع کرایا تو ہاتھ سے گیا۔"

رام لال نے آہستہ آہستہ طنز سے مسکرا کے سگریٹ کا ایک کش لیا۔ اور کہا۔ "سیٹھ صاحب آپ کے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ سرکار نے یہ ہزار روپے کے نوٹ والا قصہ تو چور بازار والوں کے لئے اٹھا کھڑا کیا ہے۔"

"مسٹر لال ---- یہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں" سیٹھ شیوداسانی نے برانڈی ختم کر کے پھر سے آدھا گلاس بھر کر کہا۔ "یہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ مگر ہم تو پسے جا رہے ہیں۔ دیکھئے نا میرے کئی دھندے ہیں۔ میں کہتا ہوں میں محنت کرتا ہوں۔ سرکار کو زائد منافع کیوں دوں۔ اور بہرحال اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ اب تو میرے پاس جتنے نوٹ ہیں وہ بینک میں جمع ہونے سے رہے۔ اب مجھے فکر ہے میں کیا کروں۔"

وہ جلدی جلدی سگریٹ کے کش لینے لگا۔ اس نے پھر سے رام لال کے گلاس میں برانڈی ڈالنی چاہی۔ رام لال نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔

دو تین منٹ تک خاموشی رہی۔ پھر سیٹھ شیوداسانی دفعتاً" اٹھ کھڑا ہوا۔ اور رام لال کے قریب آ کے اس سے سرگوشی کے انداز میں کہنے لگا۔ "میں دس فیصدی کمیشن دینے کے لئے تیار ہوں۔"

"کیسا کمیشن؟"

"دیکھئے نا آپ آنند نگر کے رہنے والے ہیں- وہاں فنانس سیکرٹری ہیں- آپ کا اثر ہے- ابھی ریاستوں میں اس قانون کی پابندی نہیں ہوئی- آپ چاہیں تو میری بڑی مدد کر سکتے ہیں-"

رام لال نے کوئی جواب نہیں دیا- اس نے سگریٹ کے ہلکے ہلکے دو تین کش لئے- پھر مسکرایا اور کہنے لگا- "دیکھئے سیٹھ صاحب میں زیادہ امیر تو نہیں مگر بھگوان کی کرپا سے اچھی خاصی جائیداد ہے اور میں نے اب تک کبھی بد دیانتی نہیں کی- اس کے علاوہ مجھے بلیک مارکیٹ کرنے والوں سے زیادہ ہمدردی بھی نہیں-"

اس کا خیال تھا کہ یہ جواب سیٹھ شیوداسانی کو خاموش کر دے گا- کھڑکی کے پٹ کھل جائیں گے- اور یہ "کاروباری" گفتگو برانڈی کے گلاس میں تحلیل ہو جائے گی-

"میں نے آپ کو دس فیصدی دینے کا آفر کیا ہے- اس وقت بازار میں چار فیصدی سے زیادہ کمیشن پر کوئی نوٹ نہیں بیچ رہا ہے- اور میں کچھ دس پانچ نوٹ آپ کو نہیں بیچ رہا ہوں- تیس لاکھ کے نوٹ-"

"کتنے؟" رام لال کی ساری متانت اور آہستگی رخصت ہو گئی-

"تیس لاکھ- دس بیس تیس لاکھ- جن کا کمیشن دس فیصدی کے حساب سے تین لاکھ ہوا- تین لاکھ مفت میں- رام لال جی ذرا ہوش کی دوا کرو- روز روز ایسا ستا پیسہ نہیں ملتا- آپ کو میں نے محض اس لئے بلایا ہے کہ ایک دم معاملہ طے ہو جائے-"

"تین لاکھ-" اور رام لال کی سانس گلے میں گھٹ کے رہ گئی- اس کے چہرے پر وہ چمک آئی جو کسی دوشیزہ پر بدکاری کی پہلی ترغیب انگیز دعوت کے ساتھ آتی ہے- اور اس سے پوچھے بغیر سیٹھ شیوداسانی نے پھر آدھا گلاس برانڈی انڈیل کے سوڈا ملا کے اس کے آگے بڑھا دی-

اس نے بجائے آہستہ آہستہ پینے کے ایک بڑا سا گھونٹ حلق سے اتارا- اس طرح نہیں جیسے کوئی محبوبہ کا ہلکا سا پیار لے' اس طرح جیسے کوئی کسی قحبہ کے گال میں کاٹ کھائے- اور سیٹھ شیوداسانی نے دیکھ لیا کہ منتر قریب قریب چل گیا-

کامیابی کی امید بندھی تو شیوداسانی نے ایک اور وار کیا- "لڑکیاں آتی ہی ہوں

گی۔ آپ سے باتیں کرنا تھیں اس لئے میں نے انہیں ذرا دیر میں آنے کو کہا۔"

"کون لڑکیاں؟" "دو تو وہی جن کو آپ دیکھ چکے ہیں۔ ارونا اور ارمیلا۔ ارونا تو اڑتی ہوئی ناگن ہے۔ دو نئی لڑکیاں ہیں۔" پھر اس نے کہا۔ "اجی رام لال جی۔ ہم جانتے ہیں تم جوان آدمی ہو۔ اب ہمارے بال سفید ہو رہے ہیں تمہارے ہیں موج کرنے کے دن۔"

"تیس لاکھ!" رام لال اب تک اس رقم کو برانڈی کے گلاس میں غرق نہیں کر پایا تھا۔ "سیٹھ صاحب آپ نے اتنے روپے کمائے کیسے؟ فلم کے کاروبار میں اتنی آمدنی ہے؟"

"یقین نہ ہو تو ادھر آیئے۔" سیٹھ شیوداسانی نے دوسرے کمرے میں بجلی کا بٹن دبایا۔ ایک بظاہر بڑی معمولی سی الماری کو کھولا۔ اس میں قد آدم آہنی تجوری تھی۔ تجوری اور رام لال کے درمیان کھڑا ہو کے اس نے پیچدار نمبروں کو گھمایا۔ دونوں آہنی پٹ کھلے اور اس نے ہزار ہزار روپوں کے نوٹوں کے بنڈل کے بنڈل' بیسیوں بنڈل نکال نکال کر رام لال کو دکھانا شروع کئے۔ اور پھر اسی طرح ان کو رکھ کے رام لال اور تجوری کے درمیان حائل ہو کے تجوری بند کی۔ الماری بند کی اور کہا۔

"رام لال جی! اس میں سے تین لاکھ تمہارے۔"

رام لال کچھ جواب دیئے بغیر آ کے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اور سوچنے لگا یہ کاغذ کے سینکڑوں پرزے ان میں اتنی طاقت ہو کہ موٹروں کے انجن ان کے حکم سے دھڑکیں۔ ان کے اعجاز سے سربفلک عمارتیں کھڑی ہو جائیں۔ ان کے طلسم سے ہزار ہا مزدور اور کاریگر صبح سے شام تک کام کریں' ان کے سحر سے حسین سے حسین عورتوں کے ریشمیں ملبوس اتر جائیں۔ اور ان کے جسم تہرے سپرنگ والے صوفوں پر اسی بجلی کی روشنی کی عریانی میں چمکنے لگیں۔ پھر سے اس کی آہستہ روی' متانت' آہستگی عود کر آئی۔ اب کے پھر برانڈی کا گلاس اس نے اس طرح منہ سے لگایا جیسے کوئی اپنی باعصمت محبوبہ کی کالی مخملیں زلفوں کا بوسہ لے۔

پھر آہستہ آہستہ اس نے کہا۔ "سیٹھ صاحب میں بھگوان کی قسم کھا کے آپ سے اتنا تو وعدہ کر سکتا ہوں کہ آج آپ نے جو باتیں مجھ سے کیں ان کا ذکر میں کسی سے نہیں

کروں گا۔ آپ اپنے مختار ہیں۔ مگر میری پندرہ سال کی نوکری ہونے کو آئی۔ اب تک بہت دیانت سے میں نے عمر بسر کی ہے۔ مجھے معاف کیجئے۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔" سیٹھ جی نے اب پھر سے اپنے گلاس میں برانڈی انڈیل کے اور سوڈا ملا کے کہا اور پھر رام لال کی طرف دیکھ کے وہ ذرا ہنسے۔ "رام لال جی آپ بیکار ڈرتے ہیں۔ سب انتظام میں کرلوں گا۔ آپ کے اثر کی ضرورت ہے۔"

رام لال نے کوئی جواب نہیں دیا اس کی آنکھیں ارونا کی قد آدم تصویر پر لگی ہوئی تھیں۔

شیوواسانی نے کہا۔ "کیسی سندر لڑکی ہے۔"

"ہاں بہت خوبصورت ہے۔"

"آپ کو پسند ہے؟"

رام لال ہنسا۔ گویا اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ اس نے بات بدلنے کے لئے پوچھا۔

"سیٹھ جی یہ سب روپیہ آپ نے فلموں میں کمایا۔"

"زیادہ تر فلموں میں۔ دیکھئے نا مزدور آج کل جنگ کے زمانہ میں ڈیڑھ روپے کے قریب کما لیتا ہے۔ ہفتہ میں دو بار تو وہ خود آ کے سینما دیکھ لیتا ہے۔ میں نے سوچا کہ ایسے فلم کیوں نہ بنواؤں جس میں یہی مزدوروں، نیشنلزم، سوشلزم بھارت ماتا وغیرہ کا ذکر ہو۔ اجی مسٹر لال قومی خدمت بھی ہو اور اپنا کام بھی پورا ہو۔ میں نے سوچا کہ ذرا تھوڑی بہت لکھی پڑھی ایکٹریسیں نوکر رکھوں۔ اور جی فلم کی کہانی لکھنے کے لئے میں نے ایک ترقی پسند ادیب کو نوکر رکھا۔ انکو مزدوروں سے بہت ہمدردی ہے مگر آج کل ٹیکسیوں میں پھرتے ہیں۔ میں انہیں ڈیڑھ ہزار روپے تنخواہ دیتا ہوں۔ وہ دو سو روپیہ مہینے مکان کا کرایہ دیتے ہیں اور ایک ایکٹریس کو رکھ چھوڑا ہے۔ جعفری اس کا نام ہے۔ خیر جی ہمیں اس سے کیا۔ تو جناب مزدور سینما دیکھیں سوشلزم کا پرچار ہو مگر ٹکے ہمیں مل جائیں۔ ہمیں اور کیا چاہئے۔"

"سینما کے علاوہ آپ اور کوئی کاروبار نہیں کرتے؟"

"کوئی خاص کاروبار بڑے پیمانہ پر تو نہیں۔ چھوٹے موٹے دھندے کئی ہیں۔ مثلاً جب جنگ شروع ہوئی تو میں نے کہا کہ اب جرمن دوائیں تو نہیں آنے کی۔ میں نے

بمبئی کے ہر کیمسٹ کی دکان پھر پھر کے دوائیاں خرید لیں۔ اس میں کوئی دس بیس لاکھ بنا لئے۔ اب چھوڑیئے ان باتوں کو۔ تو یہ کہئے ارونا آپ کو پسند ہے؟"

"آپ تو مذاق کر رہے ہیں۔ کوئی خاص بات نہیں۔"

"نہیں جی آپ جوان آدمی ہیں۔ دیکھئے میں نے اور بھی لڑکیاں بلوائی ہیں۔ اب وہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔ سن لیجئے میں ابھی ایک ہوائی جہاز چارٹر کرتا ہوں۔ پورا ڈیکوٹا۔ آپ کے آنند نگر میں فوجی ایروڈرم تو ہے نا۔ وہاں ہم تینوں ساتھ چلیں گے۔ آپ اور میں اور ارونا۔ اور یہ سامان بھی پہنچ ہی جائے گا۔ پھر آپ۔۔۔۔"

اور قبل اس کے کہ رام لال کوئی جواب دے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ سیٹھ شیوداسانی نے پہلے لپک کے کھڑکی کے پٹ کھول دیئے۔ اور سمندر کی طرف سے خنک ہوا کا ایک ناگوار جھونکا آیا۔

اتنے میں پھر سے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی اور کسی نے گہری آواز میں لفظ کو کھینچ کر کہا۔ "پا۔ آآ۔۔۔۔"

"آیا۔ آیا۔" کہہ کے سیٹھ شیوداسانی نے دروازہ کھولا۔ دروازہ کے سامنے "سرطان زدہ" نوجوان آر۔ اے ایف کی وردی میں کھڑا تھا۔ اور اس کے پیچھے ساڑیوں میں، چمکتی ہوئی، مادھو داس رگھوناتھ داس کی شاہکار سنہرے کام کی ساڑیوں میں لپٹی ہوئی، جگمگاتی ہوئی دونوں اینگلو انڈین ایکٹرسیں کھڑی تھیں۔

"سرطان زدہ" نوجوان نے وہیں سے اپنا چوڑا چکلا دہانہ پھیلا کے ایسٹ اینڈ کی شستہ ترین کاکنی میں اے کو ایچ اور ایچ کو اے بنا کے کہا۔ "پا۔ پا۔ پا تم کو دیکھ کے مجھے شرم آتی ہے۔" پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے دروازے کے دونوں طرف رکھے اور کہا۔ "پا! تم پی رہے تھے نا۔ خوب پی رہے تھے۔۔۔۔ پا تم کو دیکھ کے مجھے شرم آتی ہے۔ بیٹ ڈارلنگ۔ بیٹ۔۔۔۔ پا کو دیکھو ساری برانڈی پی گئے۔" اور پھر رام لال سے مخاطب ہو کے اس نے پوچھا۔ "کیوں مسٹر لال اس ہمارے پا نے کتنی بوتلیں پی ڈالیں۔"

"صرف تین چار گلاس۔" رام لال نے کہا۔ لڑکیاں مسکرائیں، وہ ان کے جواب میں مسکرایا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ارمیلا نے کہا۔ "جو ہمیں اندر تو جانے دو۔" اور

دونوں لڑکیاں جو کے ہاتھوں کے نیچے سے جھک کر اندر آ گئیں۔

"یہ دوسروں کے گھر میں زبردستی گھسنا ہے۔ پیٹ مجھے تم کو دیکھ کے شرم آتی ہے۔ تم پا سے بدتر ہو----- کیوں مسٹر لال؟"

رام لال ہنسا اور اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"آپ صرف ہنس رہے ہیں اور جواب نہیں دیتے۔" سرطان زدہ کائی نوجوان نے پھر اپنے چوڑے دہانے کے اندر سے چوڑے چوڑے سفید دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے انگلی سے اسے دھمکاتے ہوئے کہا۔ "مسٹر لال آپ سچے ہیں مگر دیانتدار نہیں۔"

سیٹھ شیوداسانی نے کہا۔ "اور تم جو۔ جو تم دیانتدار ہو۔ مگر سچے نہیں ہو۔"

دونوں اینگلو انڈین ایکٹرسوں نے ہنس کے ایک ساتھ کہا۔ "ہاں تم دیانتدار ہو مگر سچے نہیں ہو۔"

"وہ کیسے پا۔ وہ کیسے پیٹ۔ وہ کیسے ڈک۔ میں چاہتا ہوں تم فوراً فوراً بتاؤ وہ کیسے۔"

مثلاً تم خود ابھی ریڈیو کلب میں پورا ایک بوتل وہائٹ ہارس پی کے آئے ہو۔" ڈکسی (ارمیلا) نے کہا۔

"مثلاً تم کو اتنا بھی ہوش نہیں کہ تم سر کے بل کھڑے ہو یا پیروں کے بل۔" شیوداسانی نے کہا۔

سرطان زدہ نوجوان نے جھک کے اپنے پیر چھوئے اور کہا۔ "یہ ہیں میرے پیر۔" اپنا سر چھوا اور کہا۔ "یہ ہے میرا سر۔ میں پیر کے بل کھڑا ہوں۔ پیٹ ڈارلنگ۔ پا دیانتدار ہیں مگر سچے نہیں ہیں۔"

رام لال جو اسی متانت سے اس عجیب مجمع میں کھڑا تھا اپنے دل میں کہنے لگا۔ یہ سرطان زدہ کائی ایسا برا نہیں۔ میں بھی اسے جو کہا کروں گا۔

محض بات کرنے کی خاطر مسکرا کے اس نے کہا۔ "ہاں جو۔ میں گواہی دیتا ہوں۔ تم سچے بھی ہو اور دیانتدار بھی۔"

جو دروازے سے آگے بڑھ آیا' اور صوفے کے دستے پر بیٹھ گیا۔ "دیکھا پا آخر مجھے ایک دوست مل گیا۔ لاؤ دوست اپنا ہاتھ دو"---- ایک ہاتھ میں اس نے رام لال کا

ہاتھ لیا۔ "یہ میں نے ڈیوک آف ونڈسر----- معاف کرنا ایڈورڈ ہشتم سے بھی کہا تھا۔ ہی از اے جالی گڈ فیلو۔ فار ہی از اے جالی گڈ فیلو۔"

"پا۔" ارونا نے شیوداسانی کو کھینچ کے اپنے پاس بٹھا لیا۔ "پا۔ جو نے ریڈیو کلب میں پوری ایک بوتل وسکی پی ہے۔ وہائٹ ہارس۔"

"اسی لئے تو نشے میں جھوم رہا ہے۔" سیٹھ شیوداسانی نے کہا۔

"نشہ۔ نشہ میری طرف دیکھو ڈارلنگ۔ پیٹ ڈارلنگ۔ میری آنکھوں کی طرف دیکھو۔ بھلا میری آنکھوں میں نشہ ہے۔ اور اگر ہے بھی تو مسٹر لال میں نے سوڈے کی دس بوتلیں پیں۔ سوڈے کی دس بوتلیں۔ اس میں تھوڑی سی وسکی تھی۔ مگر اس سے کیا ہوتا۔"

"آ۔ آ۔ آ۔" پیٹ ڈارلنگ (ارونا) نے کہا۔

"آ۔ آ۔ آ۔" ارمیلا نے انگلی نچا کے دھمکی دی۔

"تم سچے ہو۔ مگر دیانت دار نہیں ہو۔" ارونا نے کہا۔

"تم دیانت دار ہو مگر سچے نہیں ہو۔" سیٹھ شیوداسانی نے کہا۔

شیوداسانی نے دفعتاً ارمیلا سے پوچھا۔ "وہ دونوں لڑکیاں نہیں آئیں۔"

"لڑکیاں۔ لڑکیاں۔ لڑکیاں۔ پا تم کو دیکھ کر مجھے شرم آتی ہے" جو نے کہا۔ "دیکھو تمہارے سر کے بال تو سب سفید ہو گئے ہیں۔ کیوں مسٹر لال؟"

ارمیلا نے شیوداسانی سے کہا۔ "وہ جعفری تو سنیریو رائٹر کے ساتھ وارسووا گئی ہے۔ اور اوشا معلوم نہیں کہاں مر گئی۔"

شیوداسانی نے ایک تیز نظر رام لال پر ڈالی، جو ارونا کے شفاف بازوؤں پر پاؤڈر کی چمک سے مسحور سا تھا۔

پھر ارمیلا اور ارونا ہاٹ کیس سے کھانا نکال کر لائیں۔ بے تکلف سا کھانا تھا۔ مرغ پلاؤ، نرگسی کوفتے، دو تین طرح کا سیلڈ۔ روسٹ چکن۔ گولڈن پڈنگ۔ کالی کافی۔

اور بڑے مزے سے باتیں ہوتی رہیں۔ جو کل واپس جا رہا تھا۔ اور یہ بمبئی میں اس کی آخری رات تھی۔ ایک پوری وہائٹ ہارس کی بوتل نے ظرافت کے تمام طبق اس پر روشن کر دیئے۔ اس کے کاکنی لہجے میں ایسے ادبی لطیفے جنم لے رہے تھے کہ رام لال کو

افسوس ہوا۔ کاش وہ اپنی نوٹ بک میں ان لطیفوں کو لکھ لیتا۔

ساڑھے دس بجے پارٹی ختم ہوئی۔ جو نے کہا "مجھے چرچ گیٹ سے ٹرین مل جائے گی۔" لیکن سیٹھ شیوداسانی نے اپنی جیب سے سو گیلن کے کوپنوں کی کتاب نکال کے ہوا میں لہرائی۔ چور بازار کا معجزہ۔ اور کہا۔ "یہ کوپن کس لئے ہیں۔"

رام لال نے اجازت چاہی تو سیٹھ صاحب نے کہا۔ "آپ سے تو پوری گفتگو ہو ہی نہیں سکی۔ ابھی ایسی جلدی کیا ہے۔ آپ اپنی گاڑی میں آئے ہیں۔"

"نہیں میں اپنے ایک دوست کی گاڑی میں آیا تھا۔ میں نے گاڑی واپس کر دی ہے۔ تاج کتنی دور ہے ٹہلتا ہوا چلا جاؤں گا۔"

"نہیں مسٹر لال یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ مگر آپ کو نیند نہ آ رہی ہو تو چلئے۔ پہلے جو کو ورلی تک چھوڑ آئیں چاندنی رات ہے۔ بڑے مزے کا ڈرائیو ہے۔ پھر میں آپ کو تاج پہنچا آؤں گا۔"

رام لال تیار ہو گیا۔ جو نے ارونا کا ہاتھ پکڑ کے اسے اپنے ساتھ بیوک میں اندر بٹھا لیا۔ شیوداسانی نے اسٹیرنگ وہیل سنبھالا اور رام لال اس کے ساتھ آگے بیٹھ گیا۔

بیوک نیلے اور کالے رنگ کی تھی۔ اور چاندنی میں بالکل نیلم پری معلوم ہوتی تھی۔ سمندر پر چاندنی میں گھلی ہوئی دھند دور تک پھیلتی چلی گئی تھی۔ بالکل چور بازار کے امریکن سگریٹوں کے دھوئیں کی طرح۔ اور ادھر دور پر ماہی گیروں کی چھوٹی چھوٹی کشتیوں کے بادبان معلوم ہوتا تھا کسی نے اس دھند پر تصویر کی طرح چپکا دیئے ہیں۔ میرین ڈرائیو پر ابھی موٹریں کافی تعداد میں آ جا رہی تھیں۔ کچھ جوڑے بینچوں پر بیٹھے عاشقی کر رہے تھے۔ کچھ میاں بیوی انگریز، گجراتی، اجنبی مسلمان، پارسی ہاتھ میں ہاتھ دیئے تیز تیز ٹہل رہے تھے۔ کنارے کی مینڈھ پر کچھ کمیونسٹ بیٹھے غالباً سندھ اسمبلی کے انتخابات اور جی۔ ایم۔ سید کے مستقبل کے متعلق رائے زنی کر رہے ہوں گے۔ سیدھے ہاتھ کی عمارتیں، دیووں کے گھروندے ختم ہوئے۔ میدان آیا۔ اس پار بی۔ بی اینڈ سی۔ آئی کی لوکل چلی جا رہی تھی چوپاٹی آئی۔ موٹر نے ہارن دیا۔ کترائی۔ عمارتوں کے ہجوم میں سے ہوتی ہوئی وارڈن روڈ پر ہوتی ہوئی بھولا بھائی ڈیسائی کے مکان کے سامنے جا نکلی۔ آگے بڑھی۔ اور تیز اور تیز۔

رام لال نے سنجیدگی اور آہستگی سے سر کو ذرا پلٹا کے دیکھا۔ ارونا جو کے آغوش میں گال سے گال لگائے چپکی بیٹھی تھی۔ رام لال پھر سامنے روشنیوں کی قطار کو دیکھنے لگا---- جو صف بستہ باڈی گارڈ کی طرح بیوک کی تیز روشنی کو سلام کرتی ہوئی گزر جاتیں۔ اور ورلی میں آر۔ اے۔ ایف کے کیمپ کے قریب اس نے دفعتاً" بریک دبایا۔ اور انجن کو خاموش کر دیا۔

ایک طویل بوسے کے بعد جو ارونا کو چھوڑ کے نیچے اترا۔ اس کی ساری ظرافت ختم ہو چکی تھی۔ معلوم نہیں اس نے ارونا کے کان میں کیا آخری پیغام محبت دیا تھا۔

سیٹھ شیوداسانی نے گاڑی موڑی۔ جو جا چکا تھا۔ اس نے ارونا سے کہا۔ "تم سامنے ہم لوگوں کے ساتھ آجاؤ۔"

ارونا نے آہستہ سے انکار میں سرہلایا۔ اور رام لال نے اس سرہلانے کے انداز میں دیکھ لیا کہ اس پر اس الوداعی ہم آغوشی اور بوسے کا سحر طاری ہے۔ اس لئے جب شیوداسانی نے اس سے پیچھے کی نشست پر جا بیٹھنے کو کہا تو اس نے بھی انکار کر دیا۔

ورلی گزر جانے پر سیٹھ شیوداسانی نے کہا۔ "کل ہوائی جہاز تیار رہے گا۔"

"میں بالکل مجبور ہوں۔" رام لال نے جواب دیا۔

"آپ قطعاً" مجبور نہیں۔" سیٹھ شیوداسانی نے کہا۔ "آدمی کو دنیا میں عملی بننا چاہئے۔"

رام لال نے پھر اسی آہستہ روی، متانت، آہستگی سے کنکھیوں پر پیچھے دیکھا۔ ارونا کی طرف۔ اپنے منگیتر سے رخصت اور الوداع کا طلسم اس پر اسی طرح طاری تھا۔ وہ بالکل بیخبر، عشق کی چادر میں ملفوف، چاندنی کی چادر سے غافل بھی چلی جا رہی تھی۔

رام لال نے انکار میں سرہلایا۔ "ناممکن۔"

سیٹھ شیوداسانی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

پھر میرین ڈرائیو آگئی۔ اس نے کہا۔ "مسٹر لال ابھی تو گیارہ بجے ہیں۔ ہم آپ کو اتنی جلدی نہ جانے دیں گے۔ میرے پاس بڑی اعلیٰ درجہ کی کریم دے ماند آئی ہے۔ ایسی کہ رجواڑوں میں بھی کہیں نہ ہو۔ اس کے دو ایک گلاس تو پی لیجئے۔ اور دیکھیے رات ابھی جوان ہے۔"

رام لال نے کہا۔ "نہیں سیٹھ جی پھر کبھی۔ اب تو مجھے تاج ہی پہنچا دیجئے۔"

"نہیں ہم آپ کو اتنی جلدی نہ جانے دیں گے۔ کیوں ارونا!"

جیسے کسی نے زبردستی طلسمات کا دروازہ کھول دیا ہو۔ نقش سلیمانی پر ہاتھ مارا ہو۔ وہ چونک پڑی۔ "کیا پا؟"

میں نے کہا "ہم اتنی جلدی مسٹر لال کو نہ جانے دیں گے۔"

"ہاں ہرگز نہیں۔" اس نے اخلاق سے کہا۔ اور پھر اپنے اطراف طلسمات کا حصار باندھ لیا۔ پھر اپنے فلیٹ واپس پہنچ کے سیٹھ شیوداسانی نے کہا۔ "مسٹر لال اگر آپ ہاتھ دھونا چاہتے ہیں تو اس خواب گاہ کی طرف ادھر آگے باتھ روم ہے۔"

جب وہ پھر خواب گاہ کی طرف واپس آیا تو بلا ارادہ آئینہ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اور جیب سے کنگھی نکال کے اپنے بال ٹھیک کرنے لگا۔

اس نے کسی کو سسکی لیتے سنا۔ درد اور کرب کے عالم میں ارونا کی آواز دوسرے کمرے سے سنائی دی۔ "نہیں پا۔ آج جو رخصت ہوا ہے آج نہیں۔"

"تو کیا تم چاہتی ہو میں تباہ ہو جاؤں۔ تم خود تباہ ہو جاؤ۔ ڈکسی تباہ ہو جائے۔ جو سے شادی کر لینا۔ یہ لال تم سے شادی کب کر رہا ہے۔---- جاؤ۔"

تین چار منٹ بعد کسی نے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس نے کہا۔ "پلیز کم ان۔" ارونا ہاتھ میں کریم دے ماند کے دو گلاس لئے آئی۔ رام لال نے اس کے چہرے پر وہی مسکراہٹ دیکھی۔ وہ قلابازیوں والی ازلی ابدی جھوٹی مسکراہٹ۔

پھر اس نے ٹیلی فون پر سیٹھ شیوداسانی کی آواز سنی۔ "کاکا۔ ایرویز۔ ہلو۔ ہلو۔ کل میں نے جس ڈیکوٹا کو ریزو کا آرڈر دیا تھا آنند نگر جانے کے لئے۔ ہاں۔ وہ بالکل طے ہے۔ ہم صبح ساڑھے چھ بجے جوہو ایروڈرم پہنچ جائیں گے۔ بالکل طے۔

قلابازیوں والی ازلی ابدی جھوٹی مسکراہٹ۔ دراز قد، سڈول، صحت مند، تم سچے ہو مگر دیانتدار نہیں۔ تم دیانتدار ہو مگر سچے نہیں۔ میرے دوست تم سچے نہیں۔ دیانتدار نہیں۔ کریم دے ماند۔ مسکراہٹ کی دانتوں میں۔ ہونٹوں میں قلابازیاں۔ تین لاکھ۔ کس نے طلسمات کی لوح کو چند منٹ میں ریزہ ریزہ کر دیا۔ کس نے نقش سلیمانی کو بگاڑ دیا۔ کس نے اس جن کو جو سمندر کی تہہ میں ایک بوتل میں دفن تھا، آزاد کر دیا۔ اور وہ

سمندر پر دھند کے مینار کی طرح چھا گیا۔ جیسے چور بازار کے امریکن سگریٹوں کا دھواں۔ اور رام لال نے ازلی ابدی جھوٹی مسکراہٹ سے کہا "تم آج بڑی خوبصورت معلوم ہو رہی ہو۔"

"سنیریو۔"

اور اس نے دونوں ہاتھوں میں سڈول، صحت مند رخساروں کو تھام لیا۔ مسکراہٹ ہی مسکراہٹ تھی۔ ازلی، ابدی ہزاروں کے نوٹوں کی جتنی قیمت طلسمات کا دور دور کہیں پتہ نہ تھا۔ ایک آنسو تک مسکراہٹ نے پاس نہ پھٹکنے دیا۔ اور رام لال نے بڑی متانت سنجیدگی، آہستگی سے ارونا کے سرخ صحت مند ہونٹوں کو چوم لیا۔

○○

پاپوش

دلبر علی خاں چھوٹے سے جاگیر دار ہیں جس زمانے میں حیدرآباد کے نواح میں کرشن پلی کی پہاڑیاں ایک بڑا فیشن ایبل محلہ بن گیئں انھوں نے یہاں بلندی پر ایک چھوٹا سا مکان بنوالیا۔ تین کمرے، ایک برآمدہ، باہر ایک برآمدہ اور چبوترہ۔ اور پہاڑی کی ڈھلوان پر ایک بے ہنگم سا باغ جس میں نیم، ببول اور بہت سے خودرو پودوں کے ساتھ ساتھ دو چار سرو کے درخت تھے۔ سُرخ پھولوں کی جاپانی بیلیں تھیں۔ گلاب البتہ کئی قسم کے تھے۔

اس باغ میں اور برآمدے میں تعطیلات کے دنوں میں دلبر علی خاں یا اُن کے خاندان کے متفرق افراد، محلّہ کے دوسرے بنگلوں کے رہنے والوں کو ٹہلتے نظر آتے ہیں۔ دلبر علی خاں کو جاگیر سے کوئی چار پانچ سو روپیہ ماہوار کا اوسط مل جاتا تھا اور اُن کے پاس دو موٹریں بھی تھیں۔ ایک چھوٹی سی ڈی۔ کے۔ ڈبلیو اور ایک بڑی شورلٹ۔ شورلٹ پر ٹیکسی کا نمبر تھا اور اُس کی رجسٹری بھی انھوں نے ٹیکسی کی حیثیت سے کرائی تھی۔ اس سے فائدہ یہ تھا کہ پٹرول راشننگ کے اس تکلیف دہ زمانے میں انھیں تیس گیلن کے قریب پٹرول مل جاتا۔ لیکن دلبر علی خاں نے سرکاری نوکری بھی کرلی تھی۔ محکمۂ ــــــ میں وہ انسپکٹر تھے نلکے پر کبھی اپنی چھوٹی گاڑی اور کبھی بڑی شورلٹ میں بڑی شان سے جاتے۔ اُن کے افسر بھی اُنھیں نواب صاحب کہتے اور باوجود اس کے کہ وہ اپنے افسروں کو ہمیشہ اپنے سے برتر

سمجھتے اور تعظیماً "صاب" کہتے، مگران کی بھی عزت کی جاتی تھی۔ اپنے آبا و اجداد کی طرح نواب دلبر علی خاں کا بھی راسخ عقیدہ تھا کہ سرکاری ملازمت سے عزت ہوتی تھی۔ خواہ وہ سرکاری ملازمت انسپکٹری ہی کیوں نہ ہو۔ ورنہ بیکار نوابوں کی آمدنی کتنی ہی ہو، اُن کو کون جانتا ہے؟ نوکری میں اتنی عزت تو ضرور ہے کہ اگر دس افسروں کا حکم ماننا پڑتا ہے تو دس ماتحتوں پر حکم چل بھی سکتا ہے۔ اس لیے نواب دلبر علی خاں اپنے ڈھلوان پہاڑی کے باغیچے میں صرف تعطیلوں میں ہی نظر آتے ہیں۔ تین لڑکے جوان تھے۔ تینوں یونی ورسٹی میں پڑھتے تھے۔ ایک ال۔ ال۔ بی کر رہا تھا۔ ایک بی۔ اے میں تھا۔ ایک انٹر میڈیٹ کے سالِ اوّل میں، کالج کے وقت سے پہلے، اور اُس کے بعد یہ تینوں اس باغیچے میں اکثر کاشت کاری میں مصروف رہتے۔ خصوصاً برسات میں جب موسمی پھولوں کے بیج بوئے جاتے اور بھٹے، کیلے اور بہت سی اجناس کی تخم ریزی کی جاتی۔ ان میں سے ایک لڑکا برآمدے میں پابندی سے مغربین کی نماز پڑھتا نظر آتا۔

کرشن پلی میں کوئی بھی زیادہ پردہ نہیں کرتا۔ ان پہاڑیوں میں پردہ تو پردہ تخلیہ بھی ذرا مشکل ہی ہے۔ بنگلے ٹیلوں پر اور نشیبوں میں اس طرح بکھرے ہیں کہ ہر ایک بنگلا دوسرے کے لیے منظرِ عام ہے۔ مکانوں کو ہوادار بنانے کے لیے کھڑکیوں کی وہ کثرت ہے کہ ایک مکان سے دوسرے مکان کے کمرے کا سارا فرنیچر گن لیجیے۔ اسی لیے نواب دلبر علی خاں کے گھرانے میں بھی پردے کا کوئی ایسا خاص اہتمام نہ تھا۔ اُن کی بیگم جو چالیس سال کی ہوں گی۔ اکثر "نا ملے" نوکروں اور "دماغ چوٹی حرام زادی" ماماؤں کو ڈانٹتی ہوئی برآمدے میں یا باغ میں نظر آتیں۔ کبھی بھینسوں کو چرانے والا چھوکرا نہ آتا تو وہ اپنے باغ میں بھینسوں کی رکھوالی بھی کر لیتیں۔ آس پاس کے تمام بنگلوں میں پچیس سال سے کم عمر کی لڑکیاں اُنھیں سکینہ خالہ کہتیں۔ وہ تھیں بھی جگت خالہ ہر ایک کے دُکھ درد میں شریک۔ ہمسایوں میں کسی کے یہاں زچگی ہو، کسی کا بچہ بیمار ہو۔ وہ برابر مدد کے یا خدمت کے لیے موجود۔ بعض بعض سے تو اُن کے اتنے مراسم تھے کہ گھر کی مالکہ گرمیوں میں اپنے میاں کے ساتھ بنگلور یا مہا بلیشور جاتیں تو اپنے بچّوں کو اور گھر کی کنجیوں کو سکینہ خالہ کے سپرد کر جاتیں اور جب واپس آتیں تو انھیں حیرت ہوتی کہ سکینہ خالہ کے خانہ داری کے زمانے

میں خرچہ اندازے سے بہت کم ہوا ہے۔

جب گشن بلی کے کسی خالی بنگلے میں کوئی نئے لوگ آتے تو کسی اور بیگم کے ساتھ سکینہ بیگم ملاقات کے لیے سب سے پہلے پہنچتیں۔ انکسار میں کوئی کمی نہ کرتیں۔ یہاں تک کہ بعض دماغ چوٹی چھوکریاں اُن کے انکسار کو بیوقوفی سمجھنے لگتیں۔ جب صدرالمہام بہادر کا کاغذات ممہور کی بھتیجی نے گشن بلی میں ایک مکان کرائے پر لیا تو سکینہ بیگم تیسرے ہی روز ملنے کو پہنچیں۔ اور دل افروز سلطان یعنی صدرالمہام بہادر کی بھتیجی کو ادب سے جھک کے سلام کیا۔ دل افروز نے کہا "خالہ مجھے آپ کو سلام کرنا چاہیے۔ میں چھوٹی ہوں آپ بڑی ہیں آپ مجھے شرمندہ کرتی ہیں"۔ تو یہ بات سکینہ خالہ کی سمجھ میں بھی آگئی اور انھوں نے تلافی مافات کے لیے دل افروز کی چٹ چٹ بلائیں لیں اور دل افروز اور اُس کے دولہا کو دعائیں دیں۔

سکینہ بیگم اور نواب دلبر علی خاں کے دو لڑکیاں بھی تھیں۔ ایک زینب تھی جو اب کوئی سولہ سترہ سال کی ہوگئی تھی۔ زینب پر پابندی زیادہ تو نہ تھی مگر وہ ماں باپ سے پوچھے بغیر دل افروز، مہرنگار، شوبھا یا اور کسی "آپا" کے بنگلے نہ جاسکتی تھی۔ جب دفتر کے وقت ان آپاؤں کے میاں چلے جاتے، تب وہ کبھی سکینہ بیگم کے ساتھ، کبھی اپنی چھوٹی بارہ سالہ بہن شہربانو کے ساتھ ان سب کے یہاں جاتی۔ یوں ان لڑکیوں پر بھی پردے کی کوئی سخت پابندی نہ تھی۔ برآمدے میں وہ عموماً پھرتی رہتیں۔ محلّے کے دو بڈھے بھائیوں میں سے کسی سے آمنے سامنے آکے بات چیت تو نہ کرتیں مگر دُور سے ان کو دیکھ کے چھپنے کی بھی کوشش نہ کرتیں اور گشن بلی میں کوئی کسی سے چھپتا ہی نہیں تھا۔

سکینہ بیگم کے ملازمین میں صرف ایک قابل ذکر ہے۔ یہ ایک پانچ سال کا چھوکرا ہے جسے مہینے ہوئے دلبر علی خاں نے دورہ کرتے ہوئے جوگی پیٹھ کے قریب اس یتیم و یسیر لڑکے کو ایک ایک دانہ چاول کے لیے ترستے ہوئے دیکھا تھا۔ شہربانو ضد کرنے لگی کہ ہم اس کو پالیں گے۔ یوں تو وہ اُسے گاؤں سے اٹھا نہیں لاسکتے تھے۔ دلبر علی خاں نے دریافت کیا۔ تو معلوم ہوا۔ اُس کی صرف ایک پھوپھی ہے جسے خود ہی کچھ کھانے کو میسّر نہیں۔ پانچ روپے دے کے دلبر علی خاں نے اُس سے یہ لڑکا لے لیا اور اُس کا نام حُر رکھا۔ حُر اس لیے کہ خریدتے ہی شہربانو نے اسے

آزاد کر دیا تھا اور نوکر رکھ لیا تھا۔ یہ بچہ حُرّ اب آدھی اُردو اور آدھی تلنگی تتلا کے بولتا تھا۔ اور بیک وقت نوکر بھی تھا اور کھلونا بھی۔ زینب اور شہر بانو دونوں کی مار بھی کھاتا تھا اور دونوں اُسے چاہتی بھی بہت تھیں۔ حُرّ اس عمر میں اس طرح کام کرتا تھا کہ تمام ہمسایوں کو حیرت تھی۔ محرّم کے روٹ یا حلوے کی سینی اُس کے سر پر رکھ دی جاتی۔ اور شہر بانو یا سکینہ بیگم اُس سے کہتیں: "حُرّ! یہ حصّہ لے جا کے مہرنگار کے یہاں دے کے آ۔ اگر گرایا تو پھر دیکھ"۔

اور یہ بچّہ، کالی، چھوٹی سی شکل، بمشکل ڈیڑھ فٹ کا قد، پہاڑی پگڈنڈی سے، سرکس کے مسخرے کی طرح سر پر تھالی کا بوجھ سنبھالے اُترتا۔ ہمیشہ بالکل ٹھیک بنگلہ کا رُخ کرتا۔ وہاں کوئی اُس کے سر سے تھالی اُتار کے حصّہ لے لیتا۔ شکریہ کی چِٹھی لکھ کے تھالی میں رکھ دیتا۔ اگر کوئی خدا ترس ہوا تو ذرا سی مٹھائی حُرّ کو بھی کھلا دیتا۔ حُرّ پر اگر کوئی زیادہ مہربان ہوتا تو یہ پانچ سال کا بچّہ جو مشین کی طرح کام کر سکتا تھا اپنے کو بچّہ سمجھ کے رو دیتا۔ وہ بچوں کی طرح شرمیلا تھا اور نوکری کی تو مجبوری تھی۔ لیکن اجنبیوں کی دخل اندازی اور اُن کا زبردستی کا رحم اور پیار اُسے گوارا نہیں تھا۔

سکینہ بیگم اور دلبر علی خاں اور اُن کے بچّے جب کھانا کھاتے تو وہ دور بیٹھا ہوا کھانے کو دیکھا رہتا۔ لیکن جب وہ کھانا کھا چکتے تو پھر کسی نوکر یا ماما کی مجال نہیں تھی کہ دسترخوان کے یعنی خاصے کے کھانے میں سے ایک لقمہ بھی حُرّ سے پہلے کھائے۔ بچے ہوئے دسترخوان سے جو چیز اُسے پسند آتی۔ وہ سب سے پہلے اُسے اپنی مٹی کی رکابی میں اُنڈیل لیتا اور اگر کوئی ماما اُسے چھیڑتی اور دسترخوان اُٹھاتے وقت کوئی چیز حُرّ کو نہ لینے دیتی تو وہ رونے لگتا: "دیکھ دُرّاسانی"۔ اور دُرّاسانی (مالکہ) یعنی حُرّ کی شہر بانو یا چھوٹی بی بی فوراً ماما کو ڈانٹتی "کیوں گے (ری)۔ کیوں چُپ کی چُپ ستارئی (رہی ہے) اُس کو"۔ یا اگر کہیں کوئی ماما ایسا غضب کرتی کہ حُرّ کے کھانے سے پہلے سچ مُچ کچھ کھا لیتی تو پھر موقع کی اہمیت کے لحاظ سے سکینہ بیگم کو غصّہ آتا: "کیوی ری نشندی حرام زادی ــــ کھا کھا کے کیسی نکل رہی ہے دیکھ حرام کی چُڑیل کو"۔ الغرض حُرّ کا مرتبہ دلبر علی خاں کے گھرانے میں ہندوستانی نوکروں سے زیادہ اور ولایتی کُتّے کے برابر تھا۔

گرمیوں کے دنوں میں چھٹی لے کے دلبر علی خاں اکثر اپنی جاگیر کو جایا کرتے تھے۔ لیکن

سکینہ خالہ اور بچے اُن کے ساتھ بہت کم جاتے تھے۔ اُس کی وجہ ہمسائے کی تمام بیگمات کو معلوم تھی۔ سکینہ خالہ دل افروز سے کبھی کبھی دُکھڑا روتیں۔ "بی بی۔ مَیں کیا بولوں آپ سے میری پالی ہوئی چھوکری، وہی مُنڈی کاٹی، چھہ ... ... ال گلزار۔ ہمارے صاب، اُس پرتیج (پرہی) نیت خراب کیے ہیں۔ میرے سے بولے۔ سکینہ۔ تیرے کو ڈاکٹراں تین مہینے کا پرہیز بتائے ہیں ..." ..

"وہ کاہے کا پرہیز؟" دل افروز کی والدہ نے چھالیا کترتے ہوئے پوچھا۔

اپنی والدہ کے اس بے احتیاط سوال اور اُن کی ناسمجھی پر جھینپ کے دِل افروز نے کہا: "چُپ بیٹھو ممّا!"

مگر سکینہ خالہ تشریح پر تُلی ہوئی تھیں۔ "قریب آنے کا پرہیز آپا"۔ بڑی بی سمجھ کے، مُسکرا کے پھر چھالیا کاٹنے لگیں۔ دل افروز جھینپ کے سوچنے لگی۔ سکینہ خالہ کو اپنے گھر کے سارے بھید اس طرح بیان کرنے کی کیا خاص ضرورت تھی۔

پھر سکینہ خالہ نے کہنا شروع کیا: "میرے سے بولنے لگے۔ سکینہ تیرے کو ڈاکٹراں تین مہینے کا پرہیز بتلائے ہیں۔ مَیں پھر گلزار سے تین مہینے کا متعہ کرلیتاؤں۔ تیرے پیر پڑتاؤں سکینہ۔ مَیں اُس کو یہاں حیدرآباد لالیتاؤں۔ مَیں بولی نواب تمھارے کو شرم نہیں لحاظ نہیں۔ ماشاءاللہ سے تین بیٹے، ایک بیٹی جوان جہان ہے۔ پچاس سال کی عمر ہونے کو آئی۔ پانچ برس میں کیا بولتے ہو کہ وظیفہ لے کے اللہ اللہ کرنے کا وخت آئیں گا اور اب یہ سب کاماں کریں گے۔ قسم امیر علیہ السلام کی، تم اُس لونڈی کو لاؤ تو سہی، میں تمھارا گھر چھوڑ کے نہیں چلی گئی تو بولو۔ جی بی میرا مہر پچاس ہزار ہے۔ کیا مَیں اُس کو چھوڑوں گی۔ حضرت عباس کی قسم دعویٰ کر کے ایک ایک کوڑی جھڑا لوں گی ... ... مہر برابر وصول کرنا بی بی۔ خدا کی شان ہے جو لونڈی میری پاپوش کے برابر نہیں تھی۔ سو اُنے آج کے دن میری سوکن بنے گی۔ مَیں اپنے بچّوں کو لے کے نہیں چلی گئی تو اُنے دیکھنا۔ مَیں اُس کی لونڈی باندی ہوں کیا۔ اُنے بے چارہ سمجھتا ہوں گا۔ میرے کو پچاس ہزار میں خرید لیا۔ مگر پچاس ہزار میں پہلے دھروالیوں گی۔ میری شادی کچھ ایسی ویسی ہوئی تھی۔ بی بی مَیں

نواب گذارش جنگ کی بیٹی ہوں۔ کچھ ہنسی ٹھٹھا نہیں۔ میری شادی میں مہاراجہ کشن پرشاد، حیدری صاحب، آپ کے بچا، سب لوگاں آئے تھے۔ اب تک ہمارے دیوان خانے میں تصویر لگی ہے۔ آپ کبھی آئے تو دیکھو۔ ... آپ لوگوں میں اچھا ہے یہ متعہ وتعہ کا جھگڑا نہیں"۔

دل افروز کی والدہ نے کہا۔" تو کیا ہوا۔ ہم لوگوں میں متعہ نہیں تو مرداں نکاح متعہ کے بغیر ہی عورتوں کو گھروں میں ڈال نہیں لیتے کیا؟"

"ہاؤ۔ یہ بھی ٹھیک بات بولے آپ"۔ سکینہ بیگم نے اُن کی رائے سے اتفاق کیا۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کسی طرح نواب دلبر علی خاں وہ کر ہی گذرے جس کا اندیشہ تھا انھوں نے اُس چھوکری گلزار سے متعہ کر لیا۔ گلزار کی ماں اور اُس کی نانی اس سے پہلے اسی گھرانے میں نوکر تھیں۔ گلزار یہیں پیدا ہوئی تھی اور اُس کی جوانی، بھینس کی جوانی کے آتے ہی سب ریجھ گئے۔ نواب دلبر علی خاں تو ایک طرف نواب دلنواز علی خاں یعنی اُن کے والد جن کی عمر اب اسّی سال کے اوپر تھی۔ جن کی پشت خم ہو چکی تھی اور جو بات بات پر کھانستے تھے اور ہر محفل میں نواب افضل الدولہ مرحوم کے زمانۂ سلطنت کا ذکر کرتے تھے۔ وہ نواب دلنواز علی خاں تک اس نوجوان بھینس کے قدردانوں میں تھے۔ اُس سے ہاتھ پیر دبواتے۔ اُسے حکم دیتے کہ اُن کے سامنے ہی بیٹھی رہے۔ ابھی ساغرو مینا مرے آگے، اور اُن کے نوجوان پوتوں کا پوچھنا ہی نہیں تینوں گلزار پر ترچھی ترچھی میٹھی میٹھی نگاہیں ڈالتے۔ مگر جب انھیں معلوم ہوا کہ یہ نوجوان بھینس والدِ بزرگوار کو پسند آئی ہے تو یہ شریف لڑکے مجبوراً دست بردار ہو گئے اور نواب دلبر علی خاں نے متعہ کر کے اُسے رکھ ہی لیا مگر حیدر آباد میں نہیں، جاگیر میں۔

اُس سال حیدر آباد میں اس کڑاکے کی گرمی ہوئی کہ خدا کی پناہ۔ اور کشن پلّی کے پتھریلے ٹیلے دن کے گیارہ بجے سے تپنا شروع کر دیتے۔ حیدر آباد میں لو نہیں چلتی۔ لیکن اس سال اپریل ہی سے ہوا میں لو کی سی گرمی تھی۔ تالاب، کنٹے سب سوکھ گئے تھے اور خود حسین ساگر اور گنڈی پیٹھ میں بہت تھوڑا سا پانی رہ گیا تھا۔ اس لیے جب دلبر علی خاں نے اپنی بیوی اور بچوں

کو جاگیر چلنے کے لیے کہا تو ان کی بیوی اگرچہ کہ یہ کہہ کے کئی دن تک انکار کرتی رہیں۔ نواب میں تو نہیں آتی۔ وہاں تم اُس حرام زادی سنڈی کو رکھے ہیں۔ اُس کو دیکھتے ہی میرا ہاتھ اُٹھیں گا۔ اور میں اپنی پاپوش اُس کو کھینچ کے ماروں گی۔ پھر تم میرے سے لڑیں گے۔ اور جوان جہان بچوں کے سامنے تھکا فضیحتی ہوئیں گی۔ یہ سب کائیں کو۔ تم جاؤ۔ میں آتیچ (آتی ہی) نئیں" لیکن گرمیوں کی شدت سے مجبور ہو کے وہ اور بچے بالآخر تیار ہو گئے۔

جاگیر پہنچ کے سکینہ خالہ گلزار سے اُسی طرح کا سلوک کرتیں جیسا نوکرانیوں سے کیا جاتا ہے۔ لاکھ نواب نے اُس سے منع کیا ہو۔ لیکن اُس حرام زادی کی کیا مجال جو حُرّ سے پہلے دسترخوان کا بچا ہوا ایک ٹکڑا بھی وہ کھالے۔ گلزار کو وہ وہی کھانا دیتیں جو اور سب نوکروں کو ملتا۔ ناشتے میں جُوار کی روٹی۔ دو پہر میں باجرہ کی روٹی اور موٹے چاول اور دال۔ شام کو موٹے چاول اور ایک گھارا سالن یا کڑھی۔ دلبر علی خاں کچھ کہتے تو سکینہ بیگم بپھر کے کہتیں "یہ لونڈی رنڈی نوکروں کا کھانا نہیں تو کیا سرداروں کا کھانا کھائیں گی۔ میری اور میرے بچوں کی پاپوش کی برابری کریں گی؟"

ایک دن سکینہ بیگم نے اپنے میاں اور گلزار کو اُس کی کوٹھری میں دیکھ لیا تھا۔ دن بھر وہ چڑچڑاتی اور غصہ کرتی رہیں۔ شام کے کھانے پر صحن میں وہ اُن کے میاں، اور سب بچے بیٹھے تھے۔ کھانا صحن میں شطرنجی پر ہوتا تھا اور ذرا اوّل وقت ہی ہو جاتا تھا کہ پتنگے پریشان نہ کریں۔ حُر شطرنجی سے ذرا دُور بیٹھا دسترخوان اور اُٹھتے ہوئے نعمتوں پر نظر جمائے تھا۔ گلزار قریب ہی کھڑی کھانا کھلا رہی تھی اور دلبر علی خاں کو دیکھ دیکھ کے ہنس رہی تھی۔

سکینہ بیگم کا خون دفعتہً کھول اُٹھا "جا یہاں سے مُردار۔ یہاں کیا نخرے کر رئی ہے"۔

دلبر علی خاں نے کہا "اُنے کیا کر رئی ہے بے چاری"۔

"بے چاری؟" سکینہ بیگم کی آواز چیخ بن گئی۔ "اُنے بے چاری ہے۔ ایک تم

بیچارے، ایک اُنے بیچاری۔ شرم نہیں آتی بڈھے تیرے کو۔ دیکھ یہ تیری جوان بیٹی بیٹھی ہے تو اس کے اور بچوں کے سامنے ایک ادنیٰ چھوکری سے ہنسی ٹھٹھا کر رہا ہے۔ یہ رنڈی، چھ ... ... ال کو اشارے کر رہا ہے۔ یہی سبخ (سبق) دے رہا ہے۔ جوان بیٹی کو آج تو میں یہ حرام زادی کی چوٹی کاٹوں گی۔"

"دیکھو سکینہ۔ تم چُپ نہیں بیٹھے تو میں مزہ بتاؤں گا۔" نواب دلبر علی خاں کو بھی اب غصہ آرہا تھا۔

"کیوں کیا کریں گے تم میرے کو۔ کیا مزہ بتائیں گے جی۔ ساری عمر چُپ بیٹھی نا جی میں۔ چُپ بیٹھ بیٹھ کے تو آج یہ حال ہوا۔ کیا کریں گے تم میرے کو۔ بولو نا۔" سکینہ بیگم نے ہسٹریا کے عالم میں چیختے ہوئے بکنا شروع کیا۔

دلبر علی خاں چُپ ہو گئے، مگر سکینہ بیگم کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ گلزار کی طرف مخاطب ہوئیں۔

"نکل یہاں سے رنڈی، مُردار، مال زادی۔" اور یہ دیکھ کر کہ گلزار اپنی جگہ سے نہیں ہل رہی ہے۔ انھوں نے اپنی جُوتی اٹھائی اور اُسے مارنے کو اُٹھیں۔

دلبر علی خاں نے جھپٹ کے جُوتی اُن کے ہاتھ سے چھین لی اور اسی جُوتی سے سکینہ بیگم کو مارنا شروع کیا۔ اپنے تین جوان بیٹوں۔ اپنی بیٹیوں کے سامنے۔ سکینہ بیگم اور زور زور سے چیخنے اور رونے لگیں۔ "مارو میرے کو مارو، آج تم میرے کو مار ڈالو۔" دونوں لڑکیاں ایک دوسرے کو لپیٹ کر رونے لگیں۔ مختر بھی بجائے کھانے کی طرف گھُورنے کے چیخیں مار مار کر رونے لگا۔ تینوں لڑکے اُٹھ کے بے طاقت بُتوں کی طرح بے حس و حرکت کھڑے ہو گئے اور گلزار نے ہنسنا شروع کیا۔ ہسٹریا اور فتح کی ملی جُلی ہنسی۔ آج ایک جوان لونڈی نے بڈھی مالکہ پر فتح پائی تھی۔ جو پاپوش بچپن سے اُس کے سر پر پڑتی رہی تھی۔ آج بیگم صاحبہ کے جسم پر برس رہی تھی۔

اِتنے میں منجھلے لڑکے نے بڑے سے آہستہ سے کہا۔ "بھائی یہ حرام زادی ہنس رہی ہے۔" اس پر بڑے نے فوراً اپنا جُوتا سنبھالا اور گلزار کی طرف جھپٹا۔ دلبر علی خاں اپنی بیوی کو چھوڑ

کے اس سے لپیٹ گئے۔ بڑے لڑکے نے غضبناک لہجے میں کہا: "ابا، آپ نے ہماری ماں کو جوتوں سے مارا۔ اس حرام زادی کے لیے۔ اور یہ کھڑی ہو کے ہنس رہی ہے۔ میں تو آج اس کو مار ڈالوں گا۔ چھوڑیئے آپ"۔ باپ کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔ اور بیٹا باپ پر جُوتا نہ اُٹھا سکا۔ جُوتا اُس کے ہاتھ سے گِر گیا اور وہ پھُوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ لیکن اتنے میں منجھلے اور چھوٹے لڑکے نے اپنے اپنے جُوتے سنبھالے اور گلزار پر پل پڑے۔ بڑے لڑکے نے اب باپ کو اپنی جوان آہنی گرفت میں اس طرح پکڑ لیا کہ وہ ہِل نہ سکتے تھے۔ چھوٹے اور منجھلے لڑکے نے اپنی ماں کے اس جُملے کی بھی پروا نہ کی "! عباس۔ رشید تم نکو (نہیں) مارو۔ تمھارے باپ نے اس کے ساتھ متعہ کیا ہے"۔ جُوتے تڑا تڑ تڑا تڑ گلزار پر پڑتے رہے۔ یہاں تک کہ اس کی ناک سے خون بہہ نکلا اور وہ بیہوش ہو کے گِر پڑی اور اُس کو مار کھاتے دیکھ کے سب ہی نے اپنی مسرت کو ضبط کیا، شہر بانو تک نے مگر پانچ سال کا غلام محمد کھِلکھلا کے ہنس پڑا۔

سکینہ بیگم دوسرے دن صُبح کی گاڑی سے بڑے بیٹے کو ساتھ لے کے حیدر آباد آئیں۔ مگر اپنے گھر نہیں اپنی پھوپھی کے گھر۔ تین مہینے ہو گئے اب تک انھوں نے اپنے میاں دلبر علی خاں کے گھر میں قدم نہیں رکھا ہے۔ لیکن اور سب بچے باپ ہی کے ساتھ ہیں۔ گلزار سے متعہ کی تجدید ہو چکی ہے مگر وہ حیدر آباد نہیں بُلائی گئی۔ جاگیر ہی میں ہے۔ جہاں بڑی تعطیلوں میں دلبر علی خاں چلے جاتے ہیں۔ معلوم نہیں۔ سکینہ بیگم کا ارادہ مہر اور نان نفقے کا دعویٰ کرنے کا ہے یا نہیں۔ وہ گوشن پلی میں بہت کم لوگوں کے پاس ملنے کو آئیں۔

دفتر کے دنوں میں تینوں لڑکے کالج چلے جاتے ہیں۔ خود دلبر علی خاں دفتر کو اور شہر بانو بھتیجیوں کے اسکول کو۔ زینب جو مدرسے نہیں بھیجی جاتی۔ گھر میں اکیلی رہ جاتی ہے۔ صرف دو نوکر اور ایک بڑھیا اور ایک ذرا سا مُحر۔ معلوم نہیں کس مصیبت سے اُس کا سارا دن کٹتا ہے۔ باپ سے پُوچھ کے کبھی جب محلّے کے سارے دُولھے بھائی اپنی اپنی

کچہریوں اور دفتروں کو چلے جاتے ہیں تو وہ دل افروز آپا یا مہر نگار آپا سے ملنے جاتی ہے اور جلد ہی واپس آجاتی ہے۔ شام کے چار بجے حُر کو ساتھ لے کے، کوئی نصف میل کے فاصلے پر اپنی والدہ سکینہ بیگم سے ملنے جاتی ہے اور اُن کی خوشامد کرتی ہے۔ سکینہ بیگم راتوں کو اُٹھ اُٹھ کے وظیفے پڑھتی اور دعائیں مانگتی ہیں کہ اُن کی جوان بیٹی پر پنجتن کا سایہ رہے۔ خدا اُسے ہر طرح کے شر اور ہر بُری نگاہ سے بچائے رکھے۔ لیکن اُن کا دل یہ کسی طرح نہیں مانتا کہ اس لڑکی کی حفاظت کے لیے بھی وہ اپنے شوہر کے گھر واپس آنے کا نام لیں۔

○○

آبِ حیات

"اور خدائے تعالیٰ نے کہا۔ دیکھو! آدمی ہمارے جیسا ہو گیا ہے۔ کیونکہ وہ نیک اور بد کو پہچاننے لگا ہے اور اب کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنا ہاتھ بڑھائے اور زندگی کے درخت کا پھل بھی کھالے اور غیر فانی ہو جائے۔

اس لئے خدائے تعالیٰ نے اسے باغ عدن سے نکلوا دیا تاکہ وہ اس زمین میں ہل چلائے جس کی مٹی سے وہ بنایا گیا تھا۔

اس لئے اس نے انسان کو باہر نکلوا دیا اور اس نے باغ عدن کے مشرق میں فرشتوں کو مقرر کیا، جن کے ہاتھ میں چمکتی ہوئی تلواریں تھیں جو ہر سمت پلٹ سکتی تھیں، تاکہ وہ زندگی کے درخت کے راستے کی نگہبانی کریں۔"

(توریت۔ کتاب آفرینش)

گل گامش، بابل کا سب سے طاقت ور انسان، جس سے بابل کے دیوتا لرزتے تھے، اپنے دوست این کی دو کی لاش کے سامنے کھڑا تھا، اس کے چہرے کے اعصاب غضب اور رنج کی شدت سے کھنچ گئے تھے۔ اس کے جسم کا فولاد اس آگ میں جل رہا تھا جو اس

فولاد کو جلا سکتی تھی، پگھلا نہیں سکتی تھی۔

اور گل گامش نے یوں بین کیا، دیوتاؤں کے سے وقار سے۔

"میرے دوست، میرے چھوٹے بھائی جو پہاڑوں کی ڈھلوان پر میرے ساتھ جنگلی جانوروں اور میدانوں کے شیروں کا شکار کرتا تھا۔ این کی دو میرا دوست، میرا چھوٹا بھائی جو میرے ساتھ پہاڑوں کے دامن میں گورخر اور میدانوں میں شیروں کا شکار کرتا تھا، جو میرے ساتھ ساتھ ہر معرکہ سر کر سکتا تھا، جو چوٹی دار چٹانوں پر چڑھا اور جس نے آسمان کے سانڈ کو پکڑا اور ہلاک کر دیا۔ جس نے ہواوا کو اٹھا کے پٹک دیا جو جنگلوں میں رہتا تھا۔ بتا اب یہ کون سی نیند ہے جس نے تجھے جکڑ لیا ہے؟ تو سیاہ پڑ گیا ہے اور مجھے دیکھ نہیں سکتا۔"

گل گامش کے دوست کی لاش نے آنکھیں اوپر نہیں اٹھائیں۔ گل گامش نے اس کے دل پر ہاتھ رکھا۔ اس کے دل کی دھڑکن خاموش تھی۔

اور تب یہ ہوا کہ رنج کی جگہ غضب اس طاقت ور، اس ہیبت ناک انسان پر طاری ہونے لگا۔ گل گامش پر جس سے دیوتا بھی پناہ مانگتے تھے۔ اس کا دوست کسی معرکے میں، کسی بڑی لڑائی میں، شیروں کے جنگل میں یا کسی اور انسان یا دیوتا کی تلوار سے ہلاک نہیں ہوا تھا۔ ایک بیماری تھی، ایک بخار تھا، جس نے اس کے طاقت ور ساتھی کو اس قدر جلد نیچا دکھایا۔ وہ جو گل گامش کا ساتھی تھا اور کوئی اس کو نیچا نہ دکھا سکتا تھا۔

گل گامش نے اپنے دوست کو چادر سے چھپا دیا تھا، جیسے دلہن چادر سے چھپائی جاتی ہے اور گل گامش کی شیر جیسی آواز گونج اٹھی۔ بار بار اور پھر بار بار وہ اپنے دوست کی طرف پلٹتا اور اپنے بال نوچتا اور اپنے ناخنوں سے اپنے جسم سے زرق برق لباس تک کو کھسوٹنے لگتا۔ یہ نقصان ایسا تھا کہ وہ اسے حقیقت سمجھنے کے لئے تیار نہ تھا۔ گویا یہ محض ایک خواب تھا جس کی کوئی اصلیت نہ تھی---- یہ کہ این کی دو مر ہی نہیں سکتا۔ اور وہ اسے سچ ماننے سے انکار کر رہا تھا۔ سات دن اور سات راتیں گزر گئیں اور اس نے اپنے دوست کو دفن نہیں کیا۔ کیونکہ ابھی اسے یہ امید تھی کہ اس کے بین کی آواز سن کر اس کا دوست جاگ اٹھے گا۔

یہاں تک کہ سات دن اور سات راتیں گزر جانے کے بعد ایک سفید سا کیڑا این

کی دو کی ناک سے باہر نکلا۔ یہ اس کی نشانی تھی کہ اس کی لاش اندر سے سڑنے لگی ہے اور تب گل گامش کو یقین آیا کہ انسان کی تقدیر اس کے دوست این کی دو پر غالب آچکی ہے۔ اور اب گل گامش کے لئے یہی باقی رہ گیا تھا کہ وہ کبھی چین نہ لے' آرام نہ اٹھائے اور بھٹکے ہوئے شکاری کی طرح گھاٹی گھاٹی' میدان میدان سر ٹکراتا پھرے۔

جنوبی بابل میں ایک شہر تھا اروک۔ اروک کے سردار ہی کا نام گل گامش تھا۔ وہ انسان تھا' دیوتا نہیں تھا۔ ہر قلیس کی طرح' ایک درمیانی کڑی جس میں انسان کی قوت اور مجبوری تھی' لیکن دیوتاؤں کا سا آہنی عزم اور استقلال۔۔۔ یہ گل گامش ظالم اور جابر تھا اور اس کی رعایا اس سے خوش نہیں تھی۔ یہ بھیڑ بکریوں اور عورتوں کا خراج وصول کرتا تھا۔ اس کے دل میں درد نہیں تھا اور اسے دوسروں کے درد کا احساس نہیں تھا۔ یہاں تک کہ اس کی رعایا نے تنگ آ کے بابل کے دیوتاؤں سے دعا مانگی کہ وہ گل گامش ہی جیسا ایک اور طاقت ور انسان پیدا کریں۔ اس کا ثانی' تاکہ یہ دونوں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے رہیں اور رعایا کو چین ملے۔

دیوتاؤں نے اروک کی رعایا کی فریاد سن لی اور این کی دو کو پیدا کیا۔ گل گامش کا مدمقابل اور حریف بننے کی جگہ وہ اس کا دوست' ساتھی اور حلیف بن گیا۔ طاقت ور انسان اکثر ایک دوسرے کے دوست بن جاتے ہیں۔ اور تب تو گل گامش کے تکبر' اس کی طاقت اور اس کی چیرہ دستیوں کی کوئی حد نہیں رہی۔ اب وہ اپنی رعایا کو بھیڑ بکریوں کی طرح بہت معمولی شکار سمجھتا تھا۔ اس کی اور این کی دو کی زد سے آسمانی شکار محفوظ نہیں تھے' انسانوں کی کیا حقیقت تھی۔

ان دونوں نے دور دور اور بڑے بڑے خطرناک معرکوں کا بیڑا اٹھایا۔ یہ اس گنجان جنگل میں گھس گئے جو سورج کے دیوتا این لل کی ملکیت تھا اور جس کی حفاظت کے لئے اس نے ایک بڑے مہیب دیو ہواوا کو مقرر کیا تھا۔ لیکن ان دونوں نے ہواوا کو اٹھا کے پٹک دیا اور اسے ہلاک کر ڈالا اور سورج کے دیوتا این لل کے جلال کو مشتعل کر دیا۔

جب گل گامش اور این کی دو اس ہولناک شکار سے واپس آ رہے تھے تو اشتر کی حسین آنکھ نے گل گامش کا مردانہ جلال و جمال دیکھ لیا اور اس پر عاشق ہو گئی۔ یہ اشتر اس زمانے میں اور اس ملک میں انانہ کہلاتی تھی۔ اشتر کے کئی نام تھے اور وہ عورتوں

کی سرتاج اور زندگی کی خالقہ اور سب سے بڑی دیوی تھی۔ وہ کہیں اشتر تھی، کہیں اشتارتے، وہی ستارہ تھی جسے آسمان پر زہرہ کہتے ہیں اور جو اپنی شہوت ناک نظروں سے انسانوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے، جس نے ہاروت اور ماروت کو بابل کے کنوئیں میں قید کیا، جیسے حضرت یوسف کے بھائیوں نے یا زلیخا نے حضرت یوسف کو ------- یہ اشتر مصر میں آئی سس یا دریائے نیل تھی۔ یہی افروڈائے ٹی یا وی نس تھی یعنی حسن کی یونانی دیوی اور عشق کے دیوتا کیوپڈ کی ماں، لیکن یہی جونو بھی تھی۔ دیوتاؤں کے دیوتا زیس کی بیوی۔ اصل میں یہ اشتر تموز کی ماں، بیوی اور بہن تھی جو ہر سال قتل ہوتا تھا اور جاڑے آجاتے تھے۔ اور نباتات پر خزاں آجاتی تھی اور انسان اور جانور مرجھائے سے رہتے تھے، یہاں تک کہ اشتر جا کے تموز کو زیریں دنیا میں پھر سے زندہ کرتی اور دنیا پر بہار آجاتی۔ شاخوں سے شگوفے پھوٹ نکلتے، مصر میں دریائے نیل میں زمین کو زرخیز بنانے والی طغیانی آجاتی، لبنان کے جنگل ہری ہری پتیوں سے لہلہانے لگتے۔ مندروں میں اور میدانوں میں عورتیں اپنے جسم اجتماعی عاشقی کے لئے وقف کر دیتیں، جانوروں کی جھولیں بھر جاتیں۔

یہی اشتر تھی، یہی اشتر جس کے راج کو صدیوں بعد یسوع مسیح نے درہم برہم کرنا چاہا اور مریم مجدلین کو اس کے چنگل سے چھین لیا۔ اسی کے چنگل میں حضرت یوسف کا حسن اسیر ہو ہی رہا تھا کہ بال بال بچ گیا۔ اور ان واقعات سے ہزاروں سال پہلے اسی اشتر نے گل گامش کا انسانی جمال دیکھا جو جلال کی ایک کیفیت تھی۔ اور وہ گل گامش پر عاشق ہو گئی جیسے وہ ہزاروں سال بعد وینس بن کے ایک چرواہے پر عاشق ہونے والی تھی۔

اشتر کی آنکھوں کے جادو نے گل گامش پر کوئی اثر نہ کیا۔ اس کے خون میں غارت اور ریخت اور فتح کا جنون موجیں مار رہا تھا۔ عشق ایک تخلیقی فعل ہے اور عشق انا کی شکست ہے۔ اپنے اور اپنی حیات اور اپنے جسم کی شکست کا اعتراف ہے۔ عشق زمانے میں زندگی کے تسلسل کا بیج بونا ہے اور اس وقت فتح اور طاقت کے غرور میں گل گامش کے ذہن میں بھی یہ تصور نہیں آسکتا تھا کہ وہ فانی ہے یا اس کی زندگی یا اس کا جسم فانی ہے اور یہ کہ زندگی کے تسلسل کے لئے یہ ضروری ہے کہ جب وہ مرجائے تو کوئی

اور جسم باقی رہ جائے جو اس کے جسم کے تخم سے بنا ہو اور اس طرح زندگی موت کا' اور حیات فنا کا مقابلہ کرے۔ نہیں وہ اپنے آپ کو دیوتاؤں کی طرح لافانی' نہ مٹنے والی ہستی اور باقی سمجھتا تھا۔

اور جب اشتر نے دیکھا کہ اس کے حسن کا گل گامش پر کوئی اثر نہیں۔ ایک معمولی انسان ہو کے وہ دیویوں کی دیوی کو ٹھکرا رہا ہے' تو شدت غضب میں اس نے بھی وہی کیا جو مصر کی زلیخا کرنے والی تھی۔ اس نے گل گامش اور اس کے دوست این کی دو کو ہلاک کرنا چاہا اور اسے ہلاک کرنے کے لئے آسمانی سانڈ کو بھیجا جس کی سانس میں آگ تھی۔ لیکن گل گامش اور اس کے دوست نے اس آسمانی سانڈ کو بھی ہلاک کر ڈالا۔ اور کچھ طنز اور کچھ جلال کے عالم میں گل گامش نے اس سانڈ کا فالس اکھیڑ کے اشتر کے منہ پر دے مارا۔

سورج کے دیوتا این لل کو اس حرکت پر بڑا غصہ آیا۔ کیونکہ ابھی تک تو شاید وہ اور تموز الگ الگ تھے' مگر صدیوں بعد وہ ایک ہی تو ہونے والے تھے۔ تموز مصر میں اور سیرس اور ایشیائے کوچک اور رومتہ الکبریٰ میں اے ٹس اور یونان میں اڈونس بننے والا تھا۔ اور اشتر اس کی ماں' بیوی اور بہن تھی—— ازلی تانیث' دیوی کی یہ ہتک وہ برداشت نہ کر سکا مگر گل گامش اور این کی دو پر ذاتی الزام جو اس نے لگایا وہ یہ تھا کہ گل گامش اور این کی دو نے اس مہیب دیو کو ہلاک کیا تھا جو اس کے جنگل کا چوکیدار تھا اور اس نے ایک معمولی سی بیماری' معمولی سا بخار بھیج کے گل گامش کے رفیق اور ساتھی این کی دو کو ہلاک کر دیا۔

اور اس طرح این کی دو جس سے گل گامش کے ساتھ پہاڑوں کی ڈھلوان پر گور خر مارے تھے اور میدانوں میں شیر۔ جس نے ہواوا اور آسمانی سانڈ کو ہلاک کیا تھا' بالکل اتنی آسانی' ایسی حقیر آسانی سے مر گیا جیسے مکھی مرتی ہے یا پھر مچھر مرتا ہے' یا جیسے کوئی برساتی کیڑا ہلاک ہوتا ہے۔

گل گامش کو اس پر سخت رنج و تعجب تھا۔ اب وہ ظالم اور جاہل نہیں رہا تھا۔ اور اب رعایا پر ظلم کرنے کا زمانہ نہیں رہا تھا۔ اب اس کے اپنے پیکر میں انسانی شعور نے پہلی مرتبہ قضا و قدر سے انصاف کا مطالبہ کیا۔ اس انصاف کا جو بابل کی رعایا اپنا حق

سمجھتی تھی- یہ کہ ہر خطا انسان کے خلاف ہی ہو سکتی ہے اور اس کی سزا ملتی ہے لیکن قدرت میں' قدرت کے اعمال اور افعال میں خطا اور سزا اور جزا کا کوئی تصور نہیں' یہ کہ جس کی خطا زیادہ ہوتی ہے اسے سزا نہیں ملتی' بے گناہ کو ملتی ہے- مثلاً گل گامش اور این کی دو کا ہی واقعہ ہے- ہواوا اور آسمانی سانڈ کو ہلاک کرنے میں بڑا حصہ گل گامش کا تھا لیکن وہ محفوظ رہا- اشتر کی ہتک گل گامش نے کی لیکن وہ محفوظ رہا اور سورج کے دیوتا نے این کی دو کی جان لی جو محض اس کا شریک اور رفیق تھا- آخر موت کا کیا جواز ہے؟ اور انسان کو فنا کے دروازے سے کیوں گزرنا پڑتا ہے' گل گامش نے سوچنا شروع کیا- یقیناً موت سب سے بڑی سزا ہے- یہ نفرت کی انتہا ہے- قتل اس کو کیا جاتا ہے جسے ہم اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے ہیں اور اسے معاف نہیں کر سکتے اور اسے زندگی کے روپ میں نہیں دیکھ سکتے- لیکن یہ سزا قدرت بلا کسی خاص امتیاز کے' بلا معیار' بے انصاف' بے مقصد ہر ایک کو دیتی ہے' کبھی جلدی کبھی دیر میں' مگر کیوں؟ آخر کیوں؟

اس سوال کا جواب نہ اسے ملا' نہ اہل بابل کو جنھوں نے اس کی داستان تخلیق کی اور وہ آوارہ پھرتا رہا- وہ این کی دو کا غم بھول گیا- وہ جو معمولی انسانوں سے لے کر آسمانی سانڈ تک سب کو زیر کر چکا تھا- اب صرف ایک دشمن کو زیر کرنا چاہتا تھا- موت کو-

یہاں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ گل گامش موت سے ڈرتا نہیں تھا- اگر وہ موت سے ڈرتا ہوتا تو اب سے بہت پہلے جب اس مہیب دیو سے لڑتے لڑتے این کی دو کی ہمت جواب دینے لگی تو وہ این کی دو کو سختی سے یہ کیوں سمجھاتا-

"میرے دوست! وہ کون ہے جو آسمان کی بلندی تک بلند ہوا تاکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ سورج کے دیوتا شمس کے ساتھ ہم مکان رہے- وہ محض انسان ہی تو ہے- اس کی زندگی کے دن محدود ہیں خواہ وہ کوئی معرکہ کیوں نہ سر کرے- وہ محض ہوا ہے اور تم ابھی سے موت سے ڈرتے ہو- تمہاری ہمت اور طاقت کہاں ہے؟ دیکھو میں اس دیو پر حملہ شروع کرتا ہوں اور تم ٹھہر کے چلا کے کہو "ہاں بڑھو- ڈرو مت" اور اگر میں مارا جاؤں تو شہرت کی وجہ سے میرا نام تو زندہ رہے گا- لوگ کہیں گے مہیب دیو ہواوا سے لڑتے میں گل گامش مارا گیا-"

اس طرح کی موت کے تو کوئی معنی تھے مگر یہ کیا کہ معمولی سی بیماری آئے اور این

کی دو جیسے کڑیل پہلوان کا کام تمام ہو جائے۔ اور گل گامش نے موت کا مقابلہ کرنے اور موت کو شکست دینے پر کمر ہمت باندھی۔ یہ اس کا آخری اور سب سے بڑا معرکہ تھا---- سب سے بڑی مہم۔

اب ایک ہی خیال تھا' ایک ہی فکر' ایک ہی مقصد جو دن رات گل گامش کے دل و دماغ پر حاوی تھا۔ یہ کہ کس طرح موت کو شکست دی جائے' کس طرح فنا کو فنا کیا جائے' اور سوچتے سوچتے گل گامش کو یاد آیا کہ اس کے اجداد میں سے ایک شخص تھا (شاید وہی جسے عبرانی خضر علیہ السلام کہتے ہیں) جو اب موت کے سمندروں کے اس پار' دنیا کے اس دوسرے سرے پر رہتا تھا' اس نے بقائے دوام حاصل کرلی ہے۔ صرف اس نے' کسی اور نے نہیں--- اور کسی انسان کو بقائے دوام نصیب نہیں ہو سکی۔ بقائے دوام کا راز اسے معلوم ہو گا۔ اور گل گامش نے تہیہ کیا کہ وہ اس کے پاس جائے گا اور یہ راز دریافت کرے گا۔

چنانچہ تن تنہا گل گامش نے دور دراز کا سفر شروع کیا۔ اس نے ان پہاڑوں کو طے کیا جن کے اس پار آفتاب غروب ہوتا ہے۔ پھر اس نے وہ اندھیارا راستہ طے کیا جس سے آفتاب رات بھر گزرتا ہے۔ وہ مایوس ہو گیا کہ اب پھر کبھی وہ روشنی کو نہ دیکھ سکے گا اور بالآخر وہ ایک بحر ذخار کے کنارے پہنچا۔ راستہ میں اسے جو کوئی ملتا اس سے وہ اس لافانی بزرگ اتنا پشتم تک پہنچنے کا راستہ پوچھتا اور بقائے دوام کی تفصیلیں پوچھتا اور بار بار اسے ایک ہی جواب ملتا:-

"گل گامش تم کہاں مارے مارے پھر رہے ہو۔ بقائے دوام جس کی تمہیں آرزو ہے تمہیں نہیں مل سکے گی۔ کیونکہ جب دیوتاؤں نے انسان کو بنایا تو موت اس کے نصیب میں لکھ دی اور زندگی کا راز اپنے دلوں میں محفوظ رکھا۔ گل گامش کھاؤ' پیو اور مزے اڑاؤ۔ چین سے زندگی بسر کرو۔ دن رات ناچو گاؤ۔ نئے نئے کپڑے پہنو' نہاؤ' پانی سے سر دھو لو۔ اپنے بچے کی طرف دیکھو جو تمہارا ہاتھ پکڑے ہے اور اپنی بیوی کو اپنی آغوش میں لے کے راحت بخشو۔ انسان کو انہیں چیزوں میں مگن رہنا چاہیے۔"

لیکن گل گامش عام انسانوں کا راستہ چلنے نہیں نکلا تھا۔ وہ اپنی جستجو سے باز آنے والا نہ تھا۔ بقائے دوام کی آرزو اس کے تن بدن کو جلائے دے رہی تھی اور وہ آگے

بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ سمندر کے کنارے اسے ایک کشتی ملی اور ایک کشتی بان جو اتنا پشتم کا ملازم تھا۔ وہ اسے موت اور فنا کے اس بحر ذخار کے اس پار اتنا پشتم کے پاس لے گیا۔ اس نے اتنا پشتم سے پوچھا کہ بقائے دوام کیونکر حاصل ہو سکتی ہے۔۔۔۔ لیکن اتنا پشتم بھی اس کی مدد نہ کر سکا کیونکہ خود اس کو بقائے دوام اتفاقاً" کچھ ایسے عجیب حالات میں حاصل ہوئی تھی جن کا دوبارہ پیش آ سکنا ناممکن تھا۔ بہت عرصہ ہوا' بڑے قدیم زمانے میں جب دیوتاؤں نے انسان کی بدعنوانیوں اور گمراہیوں سے تنگ آ کر بنی نوع انسان کو نیست و نابود کرنے کا تصفیہ کیا تو ان کے مشورے سے سورج کے دیوتا این لل نے زمین پر ایک عالمگیر طوفان بھیجا۔ اس طوفان میں اتنا پشتم اور اس کی بیوی اور اس کے بچوں کے سوا اور سب ڈوب گئے۔ اتنا پشتم کو پہلے سے آنے والے طوفان کی اطلاع مل گئی تھی۔ اس نے ایک بڑی کشتی بنائی' جس میں وہ خود' اس کے بال بچے' تمام جانوروں کے ایک ایک جوڑے کے ساتھ سوار ہو گئے۔ این لل کو کچھ دنوں کے بعد افسوس ہوا کہ اتنا بڑا طوفان بھیجنا جلد بازی کا کام تھا' اور اسے خوشی ہوئی کہ اتنا پشتم نے زندگی کے اتنے نمونے ہلاک ہونے سے بچا لئے۔ اس کے انعام میں اس نے اتنا پشتم کو بقائے دوام عطا کی۔ لیکن ایسے واقعات بار بار پیش نہیں آتے۔

گل گامش سنتا رہا۔ وہ عبرانیوں سے بہت پہلے گزرا تھا' اس لئے وہ چونک نہیں پڑا کہ ہائیں یہ تو حضرت نوع علیہ السلام کا قصہ ہے اور بقائے دوام نوح کو نہیں خضر کو عطا ہوئی اور این لل نے نہیں عطا کی خدائے بزرگ و برتر نے عطا کی۔ گل گامش موجودہ سائنس دانوں سے بہت پہلے گزرا تھا اس لئے اس نے یہ نظریہ نہیں بنایا کہ طوفان نوح شاید بحیرہ روم کے بھرنے کی یاد ہو۔ جب جبل الطارق کے پاس کی چٹانوں کو توڑ کے بحیرہ اطلانتک کا پانی ایک بہت بڑے رقبے میں گھس آیا' جس میں انسان آباد تھا' اور جہاں آبادیاں تھیں وہاں آج بحیرہ روم ہے۔ اور نہ گل گامش نے یہ نظریہ بنایا کہ یہ بابل اور ار کی زمین میں خلیج فارس کا خروج تھا۔ اور نہ اس نے اس نظریئے پر غور کیا کہ جب آخری برفانی دور کے گزر جانے پر قفقاز اور ارارات کا بہت سا برف پگھلا ہو گا تو شاید دجلہ اور فرات میں ایسی طغیانی آئی ہو کہ سارا ملک پانی میں ڈوب گیا ہو۔ نہیں گل گامش کو ماضی کے واقعات کی فکر نہیں تھی۔ وہ مستقبل کی فکر میں مبتلا تھا۔

اتنا پشتم نے گل گامش سے کہا۔ لیکن تمہیں موت سے لڑنے کی ایسی ہی تمنا ہے تو ضرور لڑو۔ پہلے نیند سے لڑو۔ اور وہ اس طرح کہ ایک جادو کی نیند ہے، اگر تم اس نیند سے جاگ سکے تو ممکن ہے موت کے بعد جاگ سکو۔ گل گامش جادو کی نیند سو گیا لیکن جاگنا اس کے بس سے باہر تھا۔ وہ ہلاک ہونے ہی والا تھا کہ اتنا پشتم کی بیوی کو اس پر رحم آیا اور اس نے اسے جادو کی نیند سے جگا دیا۔

لیکن گل گامش کی مہم ناکام ہو چکی تھی۔ بالآخر اس ہیبت ناک ہمت ور آدمی نے ہار مان لی اور اتنا پشتم سے اروک واپس جانے کی اجازت چاہی۔ اتنا پشتم کی بیوی نے اپنے خاوند سے درخواست کی کہ رخصت ہوتے وقت وہ گل گامش کو کوئی تحفہ دے اور اتنا پشتم نے الوداعی عطیے کے طور پر اسے یہ گر بتایا کہ سمندر کی تہہ میں ایک درخت ہے، جو اس کے پتے کھالے اس کا بڑھاپا چلا جاتا ہے اور اس طرح وہ مسلسل جوان رہتا ہے۔ یہ بقائے دوام کا راز تو نہیں تھا لیکن طبعی موت کا علاج ضرور تھا اور گل گامش اس دوسری قوت سے نہیں ڈرتا تھا جو دشمنوں کا مقابلہ کرنے میں، کسی مہم کو سر کرنے میں آ جائے۔ اتنا پشتم کے آخری تحفے سے پھر اس کی ڈوبتی ہوئی ہمت نے ایک نئی جولانی محسوس کی۔ امید کی ایک نئی کرن نظر آئی اور وہ اس لافانی مرد بزرگ سے رخصت ہوا۔

اتنا پشتم کا ملاح جو اسے موت کے سمندر کے اس پار لایا تھا، پھر اسے لے چلا۔ اس نے سمندر میں ٹھیک اس مقام پر اسے لا پہنچایا، جہاں سمندر کی اتھاہ گہرائی میں جوانی کو واپس لانے والا تحفہ تھا۔ گل گامش نے غوطہ لگایا اور سمندر کی تہہ سے اس بیش بہا پودے کو اکھیڑ لایا اور پھر گل گامش کو وہی ملاح جس کا نام ارشانابی تھا اس کے دارالحکومت اروک واپس لے چلا۔ وہ دونوں خلیج فارس کے کنارے پہنچے اور پھر پیدل زمین پر منزل مقصود کی جانب روانہ ہوئے لیکن دن بڑا گرم تھا، آفتاب تیز تھا، زمین تپ رہی تھی، منزل دور تھی اور سفر سخت تھا۔ ایک چشمہ نظر آیا جس کا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی دیکھ کر اس کا جی چاہا کہ نہا کے ذرا ٹھنڈا ہو لے۔ اس نے کپڑے اتارے اور نہانے کے لئے چشمہ میں اتر پڑا۔ جوانی کو واپس لانے والے پودے کو بھی اس نے چشمہ کے کنارے ہی چھوڑ دیا تھا۔ ایک سانپ نے اس پودے کی خوشبو سونگھی، اپنے بل سے باہر نکلا، اور پودے کو لے کر غائب ہو گیا۔ وہ بھی تو ایک سانپ ہی تھا جس نے آدم و حوا کو نیک و بد

کے درخت کا پھل کھانے کی ترغیب دی تھی جس کی پاداش میں وہ جنت عدن سے نکالے گئے۔ اہل بابل بہرحال اس کے قائل تھے کہ چونکہ سانپوں نے گل گامش کے لائے ہوئے جوانی اور زندگی کے درخت کے پتے کھالئے اس لئے سانپ کبھی نہیں مرتے۔ جب وہ بوڑھے ہو جاتے ہیں تو پرانی کینچلی اتار پھینکتے ہیں۔ اور تب گل گامش نے اپنی پہلی اور آخری شکست پر ماتم کیا۔ چشمے کے کنارے بیٹھ کے، ملاح ارشابانی سے خطاب کر کے اس نے رونا شروع کیا۔۔۔۔۔ وہ جو کبھی نہیں رویا تھا، این کی دو کی موت پر بھی نہیں۔۔۔۔۔ اس کے دونوں رخساروں پر آنسو بہنے لگے اور اس نے کہا:

"ارشابانی کس کے لئے میں نے اپنے بازوؤں کا اتنا زور، اتنی طاقت صرف کی؟ کس کے لئے میں نے اپنا خون جگر خرچ کیا؟

مجھے خود کوئی نعمت میسر نہ آسکی۔ ہاں زمین کے اندر رہنے والے سانپوں کی میں نے ضرور بڑی خدمت سرانجام دی۔"

اور اہل بابل کو اپنے سوال کا جواب نہ مل سکا۔ اور وہ زندگی اور موت کا چیستان حل نہ کر سکے۔

(۲)

ایک یونانی نوجوان تھا۔ یا اسے نیم دیوتا، نیم نوجوان کہہ لیجئے کیونکہ اس زمانے تک انسانی ذہن خداؤں اور انسانوں میں زیادہ امتیاز نہیں کرنے پایا تھا۔ خیر اس نوجوان کا نام فاری سس تھا۔ یہ ایک چشمے کے کنارے بیٹھا ہوا تھا اور پانی میں عکس دیکھ رہا تھا۔۔۔۔۔ اپنا عکس۔

اور اسے یقین تھا کہ اس کے اپنے عکس سے زیادہ حسین اور کوئی شے نہیں۔ یہ کہ اس جیسا کوئی اور پیدا نہیں ہو سکتا اور وہ اسی طرح سالہا سال چشمے کے کنارے بیٹھا اپنا عکس دیکھتا رہا۔

یہ چشمہ بھی شاید ویسا ہی تھا، شاید وہی تھا۔ جیسے وہ چشمہ جس میں نہانے کیلیے گل گامش نے کپڑے اتارے تھے۔ اور جس کے کنارے اس نے سدا بہار جوانی کا پودا کھو دیا تھا، جسے سانپ چرا لے گئے تھے۔ شاید یہ فاری سس وہی گل گامش تھا مگر اب وہ ہیرو

نہیں رہا تھا۔ اس کی جلال کی خصوصیات رخصت ہو گئی تھیں، جمال ہی جمال باقی رہ گیا تھا۔

اور چشمے سے جو آواز بلند ہوئی، صدائے بازگشت، وہ ایک پری بن گئی، ایک عورت۔ وہ اس خوش جمال انسان پر عاشق تھی۔ چاہتی تھی کہ اس کے اپنے بطن میں اس خوش رو نوجوان کا تخم پھلے پھولے اور وہ ایسے ہی حسین بچوں کی ماں بنے۔ آخر اس عورت کا حضرت حوا سے کچھ تو ناطہ تھا جنھوں نے سانپ کے کہنے سے نیکی اور بدی کے علم کا پھل پہلے خود کھایا پھر حضرت آدم کو کھلایا اور اس کے بعد خدائے تعالیٰ نے بقائے دوام کے درخت پر فرشتوں کو پہرہ دار مقرر کر دیا کہ کہیں انسان جو نیکی اور بدی کے علم سے واقف ہو گیا تھا بقائے دوام بھی حاصل نہ کر لے۔

چنانچہ فارسی سس نے اس پری کی آواز نہیں سنی اور اپنا عکس دیکھتا رہا اور اپنے ہی عکس پر عاشق ہوتا گیا اور یہ پری، یہ عورت اس کے عشق میں گھل گھل کے محض صدا، محض ندا، محض صدائے بازگشت بن گئی۔ اور سدا بہار جوانی کا پودا سانپوں کے قبضے میں رہا۔ یہاں تک کہ فارسی سس کو اس چشمے پر شک ہوا جس میں وہ اپنا عکس دیکھ رہا تھا۔ کیا یہ چشمہ محض ایک آئینہ تھا، ایک خطرناک آئینہ جس میں اپنے عکس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اور شاید یہ آئینہ کسی کی حسین آنکھ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ایک عورت کی حسین آنکھ۔ اور اسی آنکھ کی شکل کا ایک پھول ایران میں کھلا۔ ایرانیوں نے فارسی سس کا کچھ کچھ قصہ یونانیوں سے سنا تھا اور انہوں نے اس پھول کا نام نرگس رکھ دیا۔

لیکن نہ یہ چشمہ اکیلا تھا، نہ یہ نوجوان اکیلا اور نہ وہ عورت وہ پری اکیلی تھی جو عشق کے غم میں گھلتے گھلتے صدائے بازگشت بن گئی تھی۔ کیونکہ بلاد فلسطین میں ایک مقدس درخت تھا جس کے سائے میں ایک کنواں تھا اور ایک اور نوجوان چاند کی روشنی میں اس میں اپنا عکس دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے حسین جسم کو چاند کی روشنی میں نیم عریاں کر دیا تھا کیونکہ چاند کے حسن اور اس کے حسن میں ایک طرح کی مشابہت تھی۔ یہاں تک کہ اس نوجوان کے والد اسے ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے وہاں آ نکلے۔ ان کی مقدس آنکھوں پر شک اور ملامت کا سایہ پڑا اور گزر گیا۔ اور انہوں نے اپنے بیٹے سے کہا "یوسف اپنی پوشاک ٹھیک کر۔"

اس کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کو کئی کنوؤں، کئی چشموں، کئی زندانوں سے سابقہ پڑا اور ان سب میں ان کا اپنا عکس جلوہ فگن تھا۔ فارسی سس کی طرح اپنا عکس انہوں نے چشمے میں نہیں، دلوں میں دیکھا۔ مگر کچھ دل کھرے ہوتے ہیں اور کچھ کھوٹے۔ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں اناج کا ایک خوشہ ہے اور ان کے بھائیوں کے ہاتھوں میں بھی اناج کے خوشے ہیں مگر بھائیوں کے ہاتھ کے اناج کے خوشے ان کے ہاتھ میں اناج کا جو خوشہ ہے اس کے سامنے سر تسلیم خم کر رہے ہیں۔ مصر کی قحط سالی میں یہ خواب پورا ہوا، مگر اس وقت ان کے بھائیوں کو پسند نہیں آیا۔ پھر انہوں نے خواب میں دیکھا کہ سارے کواکب ان کے سامنے سر تسلیم خم کر رہے ہیں۔ یہ خواب بھی ان کے بھائیوں کو پسند نہیں آیا، جو کچھ دنوں بعد ان کو ایک کنوئیں میں پھینک آئے۔

اور تین دن کنوئیں کی تہہ میں گزار کے حضرت یوسف نے تزکیہ نفس سیکھا۔ پھر فارسی سس کی صدائے بازگشت کی طرح زلیخا ان پر عاشق ہوئی۔ وہی نیکی اور بدی کا علم۔ مگر ابھی اپنے عکس کی محبت مٹنے نہیں پائی تھی اور اس مرتبہ جس غار، جس کنویں، جس زندان میں حضرت یوسف کو قضا و قدر نے اسیر کیا اس میں بجائے تین دن کے تین سال گزارنے پڑے۔ یہاں تک کہ تموز اور اوسیرس کا سبق ان کی آنکھوں نے یاد کیا کہ کس طرح ہر سال دریائے نیل میں طغیانی آتی ہے اور زرخیز مٹی کی ایک تہہ جم جاتی ہے۔ پھر سے زندگی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔ بہار میں زندگی کا پھر سے نمو ہوتا ہے۔ نباتات، جمادات اور انسان اور زلیخا کو بالآخر عشق کا ثمر ملا اور حضرت یعقوب کی آنکھیں روشن ہوئیں۔

لیکن حضرت یوسف کے زمانے میں جب بیدار مغز اور نحیف الجثہ فرعون اخناتون، مذہبی تجربہ کر رہا تھا۔ اس کے ہم وطن بقائے دوام کا ایک اور بڑا دلچسپ راستہ ڈھونڈ چکے تھے۔ انہوں نے جسم کے زوال سے قطعاً" انکار کر دیا تھا۔ اگر جسم باقی رہ جائے تو روح ایک دن لوٹ ہی آئے گی۔ ایک دن مردہ جسم میں زندگی جاگ اٹھے گی جیسے بہار میں مردہ درخت میں کونپل پھوٹتی ہے۔ جیسے مردہ زمین سے نباتات پیدا ہوتی ہیں۔ اور انہوں نے مردہ جسم کی حفاظت شروع کی۔ پہلے ناک کے راستے سے تیز اوزار کے ذریعے سارا بھیجا نکال لیا اور اس میں خوشبودار مسالے بھر دیئے۔ پھر بائیں طرف مردے

کے پیٹ کو چیرا- اس کی ساری آنتیں نکالیں اور مسالے بھر دیئے- نفیس اور باریک کپڑے کی کئی کئی گز لمبی پٹیوں میں سارا جسم لپیٹا اور اس کو کپڑے میں ملفوف کر کے اس پر اسی مردے کی تصویر بنائی اور یہی تصویر لکڑی کے تابوت پر تاکہ جان دھوکا نہ کھانے پائے اور جب واپس آئے تو اسی جسم میں واپس آئے- حضرت یوسف کے ہمراہی عبرانی ہنستے تھے کہ مصری مردوں کو دیوتا مانتے ہیں اور ان کے دیوتا مردہ ہیں- اس سرزمین میں موت حیات پر حاوی تھی- فنون لطیفہ کی محرک اور ان کی سرتاج تھی- زندگی پر حاوی تھی مگر انتظار زندگی ہی کا تھا' زندگی کے دوام کا' زندگی کے واپس آنے کا' عبرانی ان پر ہنستے رہے' یوں معاذ اور قیامت اور مسیح موعود پر عبرانیوں کا عقیدہ بھی راسخ تھا- مگر خیر یہ دوسری بات ہے- اس وقت تک عبرانیوں کو وہ شبہ نہیں پیدا ہوا تھا جو ایک زوال پسند شاعر کو اپنے معشوق کے متعلق کئی ہزار سال بعد پیدا ہوا یہ کہ:-

قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے

(3)

ایک تھا "میں" تیرھویں صدی عیسوی میں' مغربی یورپ میں' میں نے ایک خواب دیکھا- یہ کہ بہار کا موسم ہے- جب نباتات میں نئے سرے سے زندگی کی لہر دوڑتی ہے- مئی کی صبح ہے اور بلا کسی مقصد کے محض زندگی کی جوئے رواں کے کنارے کنارے چلا جا رہا ہوں لیکن رفتہ رفتہ اپنا مقصد' اپنی منزل مقصود مجھ پر روشن ہوتی جاتی ہے- میں ایک باغ دیکھتا ہوں جس کے چاروں طرف چوکونی چار دیواری ہے- باغ کے باہر کی طرف ان تمام بھوتوں کی تصویریں ہیں جنہیں باغ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں- ان بھوتوں کے نام ہیں حسد' بخل' غربت' غم' ضعیفی' میں ان بھوتوں اور چڑیلوں کی تصویریں دیکھنے کے بعد باغ کی طرف دیکھتا ہوں- چار دیواری سے زیادہ بلند خوشنما درختوں کی ٹہنیاں ہیں جو غنچوں اور پھلوں سے لدی ہوئی ہیں- چڑیوں کے زمزموں کی آواز آ رہی ہے- میں ڈھونڈھ رہا ہوں کہ اس چار دیواری میں دروازہ کہاں ہے جس کے راستے میں باغ میں داخل ہوں- دروازہ آخر مل ہی جاتا ہے جس کی چوکیدار ایک عورت ہے جس کا نام تن آسانی ہے- وہ مجھے بتاتی ہے کہ اس باغ کا نام باغ نشاط ہے اور نشاط دراصل ایک سردار

ہے جو اپنے ساتھیوں کے ساتھ درختوں کے سائے میں عیش مناتا ہے اور یہ درخت اس نے زیادہ تر مشرق سے یعنی عربوں کے ملک سے یہاں لا کے نصب کئے ہیں۔

اس باغ نشاط میں میں کئی دلچسپ مردوں اور عورتوں سے ملا۔ ایک تو حضرت مذاق تھے جن کے ہونٹوں پر ہمیشہ تبسم رہتا اور جو بذلہ سنجی سے باز نہیں آتے۔ ایک خاتون تھیں اخلاق بیگم' بات اس طرح کرتی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا بچھی جا رہی ہیں۔ لیکن ان سب سے زیادہ جس سے مل کر میں متاثر ہوا ایک چھوٹا سا دیوتا تھا کیوپڈ' عشق کا دیوتا۔ یہ وہ تھا جو بڑوں بڑوں کا مان توڑتا تھا۔ جس کی ایک نظر سے زہد مرجھا جاتا تھا۔ جس کی آنکھوں کی تپش سے عصمتیں پگھل جاتی تھیں۔ عشق کے دیوتا کے ساتھ ساتھ ایک اور نوجوان تھا جس کے ہاتھ میں دو ترکش تھے اور ہر ترکش میں پانچ پانچ تیر تھے۔ پہلے ترکش میں جو تیر تھے ـــ ان میں سے ہر ایک پر اس کا نام کھدا ہوا تھا اور ان پانچوں تیروں کے نام یہ تھے۔ حسن' سادگی' سخاوت' ساتھ' خوش وضعی' اور دوسرے ترکش میں جو ٹیڑھے میڑھے تیر تھے ان کے نام تھے۔ غرور' بدمعاشی' بے شرمی' بے آرزوی' پریشاں خیالی۔

عشق کے دیوتا کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے میں نے ایک حسینہ کو آتے دیکھا جس کا نام حسن تھا اور بھی کئی حسین جوڑے اس کے ہم رکاب تھے لیکن مجھے یہاں ان کے تفصیلی ذکر کی فرصت نہیں۔ میں تو اپنی بپتا بیان کروں گا۔ عشق کے دیوتا نے اپنے ساتھی خوش منظر کو حکم دیا کہ مجھ پر تیر برسائے۔ اب میں باغ کے درختوں میں چھپتا پھرتا تھا اور عشق کا دیوتا اور اس کا ساتھی میرا تعاقب کر رہے تھے۔ تازہ گھاس اور پھل دار درختوں کے درمیان جہاں بھانت بھانت کی چڑیاں چہچہا رہی تھیں یہ تعاقب جاری رہا۔ یہاں تک کہ تھک کے میں ایک کنوئیں کے کنارے بیٹھ گیا۔

وہی کنواں جس کے کنارے گل گامش نے سدا بہار جوانی کا درخت کھو دیا۔

یا وہ کنواں جس میں فارسی سس اپنے عکس کو دیکھتا رہا اور عاشق ہوتا رہا اور اس نے اس پری کو ٹھکرا دیا جو اس کے فراق میں گھل گھل کے صدائے بازگشت بن گئی؟

یا وہ کنواں جس میں حضرت یوسف کے بھائیوں نے انہیں قید کیا تھا۔ وہی قید جو زلیخا کو ٹھکرا کے انہیں بھگتنا پڑی؟

بہرحال میں ایک کنوئیں کے کنارے بیٹھ گیا۔ جس کے کنارے صنوبر کا درخت تھا

اور کہتے ہیں کہ فرانس کے بڑے پرانے بادشاہ پے پن کے زمانے سے اب تک ایسا خوبصورت درخت کبھی روئے زمین پر نہیں اگا۔ اسی، درخت کے نیچے سنگ مرمر کی ایک چٹان سے ایک چشمہ پھوٹ نکلا تھا۔ سنگ مرمر پر ایک چھوٹا سا کتبہ تھا۔ "یہاں حسین فارسی سس نے وفات پائی" میں اب آپ کو حسین فارسی سس کا قصہ کیا سناؤں، وہ تو آپ سن ہی چکے ہیں کہ پری اس کے فراق میں گھل گھل کے صدائے بازگشت بن گئی۔ مگر فارسی سس نے عشق کے دیوتا کی نافرمانی کی تھی اور عشق کے دیوتا نے اسے اپنے ہی عکس کے عشق میں مبتلا کر دیا تھا اور اپنے عکس کے بے مصرف، بے فیض، بے نتیجہ عشق میں اس نے جان دے دی۔ کیونکہ اس طرح بقائے دوام حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ چشمہ جس کے کنارے میں بیٹھا تھا آب حیات کا چشمہ نہیں تھا۔ نہیں یہ تو فارسی سس کا خطرناک آئینہ تھا، خطرناک چشمہ، جہاں زندگی فنا ہوتی ہے۔ میں نے اپنے دل میں خیال کیا کہ ذرا جھانک کے تو دیکھوں کہ یہ چشمہ کیسا ہے۔ اس کا پانی بڑا صاف تھا اس میں آئینہ کی سی جلا تھی۔ اس کے اطراف دو دو انگل اونچی گھاس تھی۔ کبھی یہ کنواں خشک نہ ہونے پاتا۔ لیکن میں نے جب غور سے اس کی تہہ کی طرف دیکھا تو مجھے دو چمکتے ہوئے سنگریزے نظر آئے۔ جیسے دو چمکتی آنکھیں۔ دو نرگس کے پھول۔ جب سورج چمکتا تو یہ دونوں سنگریزے اس طرح جگمگاتے کہ کنویں کی ساری تہہ اس کی روشنی سے روشن ہو جاتی۔ پورے باغ کا عکس ان دونوں سنگریزوں میں نظر آ جاتا۔ تب میں سمجھا کہ یہی دو چمکتی آنکھیں (معلوم نہیں کسی عورت کی آنکھیں؟ یا اس کی اپنی آنکھیں؟) وہ خطرناک آئینہ تھیں جن میں اپنی پرستش کر کے فارسی سس نے اپنی جان دی۔ خدا جانے فارسی سس کے علاوہ اور کتنوں نے اس آئینے میں اپنی صورت دیکھ کے ہلاکت کا راستہ اختیار کیا۔ کیونکہ وہ خطرناک منزل ہے جہاں بڑے بڑے دل گردے والے بے بس ہرن کی طرح شکار ہو جاتے ہیں جہاں لوگوں کو غم و غصہ کا شکار ہونا پڑتا ہے۔

لیکن اب میں اپنی داستان پھر سے بیان کرتا ہوں۔ ان سنگریزوں میں جہاں میں نے سارے باغ کا عکس دیکھا وہاں میں نے ایک گلاب کا درخت بھی دیکھا۔ اس میں ایک گلاب کا پھول لگا تھا۔ یہ پھول کیا تھا ایک ایسی دوشیزہ تھی کہ معلوم ہوتا تھا یہ سارا باغ اسی کے لئے لگایا گیا ہے۔ لیکن جہاں پھول ہوتے ہیں وہاں کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ اس

حسینہ کے اطراف ایک ایسا حصار تھا خار دار جھاڑیوں کا' کانٹوں کا کہ اس تک پہنچنا ناممکن تھا۔ میں اس حسینہ گلاب کے دیدار ہی میں محو تھا کہ عشق کے دیوتا کو موقعہ مل گیا اور اس نے پے در پے پانچوں تیر چلائے۔ حسن' سادگی' سخاوت' ساتھ' خوش وضع' میرے قلب و جگر ان تیروں سے چھلنی ہو گئے۔ زخموں سے چور چور ہو کے میں نے عشق کے دیوتا کی اطاعت قبول کی اور اس نے ایک سنہری کنجی سے میرے قلب کو مقفل کیا تاکہ میرے دل پر اسی کا راج رہے۔ اس نے مجھے عشق کے مراسم اور آداب سکھائے۔ اس نے کئی ساتھی میری مدد کے لئے مقرر کئے مثلاً خوش بیانی' ذکر حبیب' راز داں اور دیدار۔ لیکن سب سے بڑا دوست جو اس نے مجھے عطا کیا ایک شخص تھا جس کا نام چارہ ساز تھا اور جو اخلاق بیگم کا بیٹا تھا۔ چارہ ساز نے کہا کہ "جناب میں آپ کی گلاب کے درخت تک رہنمائی کروں گا۔ اس طرح کہ کانٹوں سے آپ کا دامن نہ الجھنے پائے۔" اس کی رہنمائی میں میں کانٹوں سے دامن بچاتا ہوا گلاب کے درخت کے قریب قریب پہنچ گیا۔ لیکن دفعتاً" ایک بدنہاد آدمی گلاب کے درخت کے قریب ہی کہیں سے نمودار ہوا۔ اس کا نام رقیب یا نگہبان تھا۔ یہ وہیں کہیں گھانس پات میں چھپا بیٹھا تھا کہ ہر ایسے شخص کو گرفتار کرلے جو گلاب کے پودے کی طرف ہاتھ بڑھائے اور یہ اکیلا نہیں تھا اس کے ساتھ اور بھی کئی عورتیں تھیں مثلاً زبان خلق' حیا' شرم۔ لیکن ان سب میں یہ رقیب جو اصلی نگہبان تھا بڑا ہی روسیاہ تھا۔ بڑا اونچا پورا۔ اس کی آنکھیں شعلوں کی طرح چمکتی تھیں۔ اس سے اور چارہ ساز سے پہلے تو کچھ بحث ہوئی۔ مگر رقیب کے تیور دیکھ کے چارہ ساز بھاگ کھڑا ہوا اور میں رقیب کے نرغے میں اکیلا رہ گیا۔ مجھے ایک شریف خاتون نظر آئی جس کا نام عقل تھا اور جو عشق کو محض حماقت سمجھتی تھی۔ اس نے مجھے نصیحت کرنا شروع کی کہ عشق سے باز آؤ یہ محض جنون ہے۔ زبان خلق تمہیں بدنام کرے گی۔ حیا کو خود میں نے حسینہ گلاب کی حفاظت کے لئے مامور کیا ہے۔ اور جب وہ سب کچھ کہہ چکی اور مجھے قائل نہ کر سکی تو وہ بھی رخصت ہو گئی۔ عشق نے میرے لئے ایک اور مددگار مقرر کیا۔ یہ میرا رفیق اور راز دان تھا۔ اس راز دان نے کہا کہ یہ رقیب بڑا ہی بے ڈھب آدمی ہے مگر خوشامد سے یہ بھی رام ہو سکتا ہے۔ اس کی بات مان کے میں رقیب سے سمجھوتے کی بات چیت کرنے کے لئے بڑھا لیکن رقیب نے خار دار جھاڑیوں سے آگے

مجھے نہ بڑھنے دیا- میں نے بہرحال اس سے لجاجت سے کہا کہ "میں اپنے کئے پر نادم ہوں کہ آپ کی اجازت کے بغیر اس گلاب کے درخت کے اس قدر قریب آگیا- کیا کروں میں عشق کے دیوتا کا غلام ہوں اور محبت نے مجھے مجبور کر دیا- مجھے صرف محبت کرنے کی اجازت دو- کیونکہ محبت کرنا یا نہ کرنا ایک ایسی بات ہے جو میرے اختیار سے باہر ہے- میں مجبور ہوں میں آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا مگر مجبور ہوں" اس پر رقیب ذرا نرم پڑا اور اس نے کہا "تیری نیت ایسی بری نہیں معلوم ہوتی- تو میرے گلاب کے درخت سے دور رہ- تیرا جتنا جی چاہے دور سے محبت کر، مجھے اس سے سروکار نہیں مگر دوشیزہ گلاب سے دور رہنا" یہاں میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ یہ رقیب پرانے معنوں میں گلاب کے درخت کا نگہبان تھا- نئے معنوں میں میری طرح حسینہ گلاب کا عاشق نہیں تھا-

بہرحال کچھ اپنی چرب زبانی سے اور کچھ اپنے رفیقوں کی مدد سے میں نے رقیب کو اس حد تک رام کیا کہ مجھے گلاب کے پاس جانے کا موقع ملا اور مجھے حسینہ گلاب کا پہلا بوسہ نصیب ہوا لیکن یہ بوسہ جو وصال عرضی سے بھی بہت کم تھا، غضب ہو گیا- سب سے پہلے زبان خلق نے چہ میگوئیاں شروع کیں- پھر رشک اور حیا نے زور پکڑا- رقیب کو ان سب نے لعنت ملامت کی کہ وہ میری اور میرے ہوا خواہوں کی باتوں میں آگیا اور اب رقیب نے خود افسوس کرنا شروع کیا کہ کیوں اس نے غفلت برتی- اب رشک نے حسینہ گلاب اور گلاب کے درخت کے اطراف ایک فصیل تعمیر کی، خندق بنائی اور میرے لئے اس تک پہنچنا ناممکن بنا دیا- رشک کے تمام ساتھیوں اور رقیبوں نے اس نئی فصیل کی حفاظت شروع کی- اب میں تھا اور فراق کا عالم، میں تڑپتا تھا اور کسی طرح گلاب تک پہنچ نہ سکتا تھا-

لیکن اب عشق کے دیوتا نے امید کو میری امداد کے لئے مامور کیا- یہی نہیں عشق کے دیوتا نے اپنے تمام سرداروں کی ایک مجلس مشاورت طلب کی اور بالاخران سب نے مل کر اس حصار پر حملہ کیا جو رقیب نے حسینہ گلاب کے اطراف بنایا تھا- ایک ایک کر کے زبان خلق، شرم، حیا اور رقیب سب زیر ہو گئے اور مجھے گلاب تک رسائی نصیب ہوئی- گلاب کے درخت تک، حسینہ گلاب تک، گل بکاؤلی تک، یہ آب حیات کے چشمے تک پہنچنے کا دوسرا اصول تھا جو سانپ نے حضرت حوا کو سکھایا تھا کیونکہ میں نے محسوس

کیا چشمہ آب حیات حسینہ گلاب کا دہن ہے۔

(4)[1]

ایک تھا بادشاہ، جس کا نام تھا عقل۔ اس کا ایک بیٹا تھا جس کا نام دل تھا۔ اور عقل نے دل کو اقلیم بدن کا سردار مقرر کیا۔ یہ شاہزادہ دل اقلیم بدن کا نظم و نسق اچھی طرح چلا رہا تھا کہ کسی نے چشمہ آب حیواں کا ذکر چھیڑ دیا اور یہ ذکر سن کر دل دیوانہ سا ہو گیا کہ آخر یہ کیسا چشمہ ہے جس کا ذکر ہر زبان پر ہے لیکن جو ہر نظر سے پوشیدہ ہے۔ بالآخر دل نے اپنے ایک معتمد رفیق نظر کو روانہ کیا کہ دنیا بھر کا چکر لگائے اور چشمہ آب حیواں کا سراغ لگائے۔

نظر ملک ملک زمین زمین تلاش کے ارادے سے روانہ ہوا۔ سب سے پہلے وہ ایک شہر پہنچا جس کا نام تھا عافیت۔ یہاں کے شہریار کا نام ناموس تھا۔ یہاں نظر کی دال زیادہ نہیں گلی۔ اس نے شہریار ناموس کی نصیحتیں سنیں اور آگے روانہ ہو گیا۔ حصار زہد میں اس نے ایک پیر مرد خمیدہ کمر کو دیکھا جس کا نام زہد تھا۔ اس نے اسے اپنے اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر وہ آگے بڑھتا چلا گیا اور شہر ہدایت پہنچا۔ یہاں کا بادشاہ قوم عاد سے تھا۔ پیل تن، دیو قامت، اس کا نام ہمت تھا اور بالآخر ہمت ہی سے اسے چشمہ آب حیات کا پہلا سراغ ملا۔

ہمت نے اسے خبر دی کہ ایک بہت بڑا شہنشاہ ہے جس کا نام عشق ہے۔ یہ بڑا ہی باجبروت شہنشاہ ہے۔ یہ شہنشاہ عشق پتھر سے مقناطیس بناتا ہے، یہ لوہے کو گلا کر موم کر دیتا ہے۔ یہ عشق ہی تو تھا جس نے سب سے پہلی شمع جلائی اور اس پہلی شمع پر پہلا پروانہ نثار ہوا۔ اسی نے باغ میں لالے کھلائے اور بلبلوں کے دل کو داغ دیا۔ اس شہنشاہ عشق کی ایک لڑکی ہے جس کا نام حسن ہے۔ ایسی پری رو کہ آسمان کا چراغ اس کا پروانہ ہے۔ جہاں سوز ایسی کہ اگر دریا کی طرف دیکھے تو پانی میں آگ لگ جائے۔ شہنشاہ عشق نے اپنی اس بیٹی شاہزادی حسن کو شہر دیدار کی حکومت سپرد کی۔ یہ شہر دیدار کوہ قاف کے قریب واقع ہے۔ اس شہر میں ایک جنت نما باغ ہے جسے باغ رخسار کہتے ہیں۔ اسی باغ رخسار کے کنارے چشمہ آب حیواں واقع ہے۔

لیکن جہاں ہمت نے نظر کو شہر دیدار اور گلشن رخسار اور چشمہ آب حیواں کا پتہ بتایا' وہاں یہ بھی جتا دیا کہ یہاں سے لے کر چشمہ آب حیواں تک راستہ بڑا ہی دشوار گزار اور خطرناک ہے۔ راستے میں بڑے ہولناک بیاباں آتے ہیں۔ بڑے خطرناک طلسمات ہیں۔ بڑے ہی سگ سیرت آدمی خوار راستے میں ملتے ہیں جن کا سرتاج ایک مہیب دیو ہے جس کا نام رقیب یا نگہبان ہے۔ شہنشاہ عشق کے حکم سے یہ رقیب دیو سیرت دارالملک دیدار کا دربان ہے۔ اگر تو اس کے چنگل سے بچ کے نکل گیا تب کہیں شہر دیدار تک تیری رسائی ہو گی۔ جا۔۔۔ خدا تیری مدد کرے۔

نظر ہمت کے بتائے ہوئے راستے پر روانہ ہوا۔ اس کے آقا نے اسے چشمہ آب حیواں کا سراغ لگانے بھیجا تھا۔ وہ خطروں سے ڈرے بغیر ہمت کر کے بڑھتا چلا گیا اور جب وہ اقلیم عشق میں پہنچا تو دیکھا یہاں عجیب حال ہے۔ گرمی کا یہ عالم ہے کہ آگ ہوا ہے اور ہوا آگ ہے۔ زمین پتھر کی طرح سخت اور پتھر فولاد کی طرح مضبوط' یہاں سرسبزی بھی تھی لیکن کچھ اور ہی طرح کی' آنکھیں نرگس کا پھول بن گئی تھیں اور لالے خون جگر سے سیراب تھے۔ جب اقلیم عشق میں قلعہ سنگسار کے پاس اس کا گزر ہوا تو رقیب کے سگ سیرت سپاہیوں نے اسے گرفتار کر لیا۔ جب نظر نے خود رقیب کو دیکھا تو سہم گیا۔ ایک سگ سیرت' سگ صورت سا شخص' قوی ہیکل' دیو پیکر' طول' بے اصول' ناقبول' بھول' دیو غول۔ رقیب نے اسے سرزنش کی کہ اس علاقے سے گزرنے کی تجھے آخر ہمت کیسے ہوئی۔ جہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ لیکن نظر ایک عیار تھا اس نے رقیب کو رشوت میں بہت سا سونا دیا اور اسے شہر دیدار اور باغ قامت تک پہنچا دیا گیا۔ باغ قامت کا سرور ایک بلند بالا' نازک اندام سا سردار تھا۔ اس نے رقیب دیو سیرت کو دیکھ کے پوچھا کہ اے پلنگ قلعہ' زور آزمائی' اے نہنگ قلزم ناآشنائی' آج تیرے ساتھ یہ بیگانہ اور اجنبی سا آدمی کون ہے اور یہ یہاں تک کیسے پہنچا۔ رقیب نے کہا کہ مجھے دارالکلب کی عام بیماری ہے اور یہ شخص میرا طبیب ہے۔ میں اسے ساتھ لیتا آیا۔ قامت ایک فریس تھا۔ اس نے مجلس آراستہ کی اور دیو سیرت رقیب کو اتنی شراب پلائی کہ وہ مدہوش ہو گیا۔ پھر اس نے نظر سے اس کا حال پوچھا کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ اور کس کام سے آیا ہے؟

اور جب قامت اور نظر کی کھل کے باتیں ہوئیں تو قامت نے نظر کو اپنا ہم راز بنا لیا۔ اسے باغ قامت کے عجائبات دکھائے۔ رخسار کے دو سرخ سرخ گلاب۔ ان پھولوں کے درمیان غنچہ دہن، موئے کمر، ابھی نظر باغ قامت کی سیر کر ہی رہا تھا کہ زلف مشکبار شکار کھیلنے آئی، اس کے ساتھ سینکڑوں حبشی سورماؤں کی فوج تھی اور کمند ڈال کے نظر کو گرفتار کر کے لے گئی اور نظر نے بھی اس قید سے گلشن رخسار کا نظارہ کیا۔ گلشن رخسار میں اس نے اور بہت سے عجائبات دیکھے اور مبہوت سا ہو گیا۔

نظر کا ایک بھائی تھا۔ ایک یوسف گم گشتہ جو ترکستان اور خاور کی سرحد پر رہا کرتا تھا۔ نظر اس کے حال سے آگاہ نہیں تھا۔ اس کا نام غمزہ تھا اور یہ شہزادی حسن کے دربار میں ایک بڑا ذی اثر افسر تھا۔ غمزہ نے شہزادی حسن کے حکم کی بنا پر نظر کو قید کر لیا اور قریب تھا کہ تلوار کے ایک وار سے اس کا سر قلم کر دے کہ اس نے دفعتاً" اس مہرہ کو دیکھ لیا جو نظر کے بازو پر بندھا ہوا تھا اور پہچان لیا کہ نظر جسے وہ قتل کرنا چاہتا تھا اس کا اپنا بھائی ہے۔ تلوار پھینک کے وہ اس سے بغل گیر ہو گیا۔

جب حسن کو یہ معلوم ہوا تو اس نے غمزے کو حکم دیا کہ نظر کو اپنے ساتھ گلزار رخسار میں لائے۔ جب خانہ و گلزار حسن کی نظر نے سیر کی تو اسے طرح طرح کے حسین نظر آئے۔ بتان چین و خطا، سمرقند کے شکریں دہن، خوارزم کے بلا چشم، عراق کے نگار، اصفہان کے سیہ چشم، شیراز کے تنگ دہن، گلہائے تبریز، ملیحان عرب، شکر ریزان مصر، نظر کثرت نظارہ اور شدت جمال سے مبہوت تھا کہ حسن نے اس سے سوال و جواب شروع کئے۔ حسن نے پوچھا ستارہ کا مقصود کیا ہے؟ نظر نے جواب دیا اس کی صنعت کا نظارہ کرنا۔ حسن نے پوچھا کہ چشم بینا کس لئے بنی ہے؟ نظر نے کہا رخسار زیبا کے مشاہدے کے لئے۔ اور اسی طرح کے سوال و جواب میں نظر نے اپنے شاہزادے دل کا ذکر کیا۔ حسن نے اپنا دل اسے دکھایا جو ایک گوہر سنگین تھا۔ اس کے مقابلے میں جب نظر نے شاہزادہ دل کا ذکر کیا جس کا دل، دل عادل اور دل عاشق تھا تو حسن اس کی گرویدہ ہو گئی۔

اب عشق کی آگ دونوں طرف لگی ہوئی تھی۔ حسن کا ایک پری تمثال غلام تھا جس کا نام تھا خیال۔ خیال کو حسن نے نظر کے ساتھ ملک بدن بھیجا اور حسن نے نظر کو

ایک طلسمی انگوٹھی دی کہ وہ اسے دل تک پہنچائے۔ اس طلسمی انگشتری کی خصوصیت یہ تھی کہ جو اسے منہ میں رکھ لیتا وہ خود تو سب کی نظروں سے روپوش ہو جاتا مگر خود سب کو دیکھ سکتا۔ اس انگشتری کی مدد سے مملکت عشق کے سپاہیوں کی آنکھ سے بچ کے نظر ملک بدن واپس پہنچ گیا۔ دل سے اس نے شہزادی حسن کے حسن و جمال کی کہانی سنائی۔ گلزار رخسار کا ذکر کیا کہ اسی جنت ارضی میں چشمہ آب حیات پنہاں ہے اور بجز ساقیان حسن گل رو کے کوئی اس آب حیات کے چشمے سے واقف نہیں۔ نظر اور خیال کی لسانی سے دل کا عشق اور شدت اختیار کر گیا۔ اب عشق نے جنون کی کیفیت اختیار کی اور دل نے شہر دیدار روانہ ہونے کا ارادہ کیا لیکن دل کے ایک ناصح مشفق ہمدرد کو اس سفر کے تہیے کا پتہ چل گیا۔ وہم نے دل کے والد شہنشاہ عقل کو آگاہ کر دیا اور عقل نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ اس جنون سے بچانے کے لئے اپنے بیٹے دل کو نظر بند کر دے۔ چنانچہ دل، عقل کے حکم سے نظر بند کر دیا گیا۔ ادھر زندان میں دل کی حالت غیر تھی۔ ادھر نظر پھر شہر دیدار میں حسن کے پاس پہنچا اور گلزار رخسار میں تشنگی کے عالم میں اسے چشمہ آب حیواں نظر آیا مگر جیسے ہی اس نے چشمے کا پانی پینے کے لئے منہ کھولا طلسمی انگوٹھی اس کے منہ سے چشمہ آب حیواں میں گر پڑی۔ نظر جو سب کی نظر سے چھپا ہوا تھا، سب کو نظر آنے لگا اور اسے رقیب نے گرفتار کر لیا۔

لیکن سب سے اہم واقعہ جو پیش آیا یہ تھا کہ چشمہ آب حیواں اس کی نظر سے غائب ہو گیا، جیسے سدا بہار جوانی کا درخت گل گامش کی نظر سے غائب ہو گیا تھا۔

نظر نے بہر حال رقیب کے چنگل سے نجات پائی۔ حسن نے غمزے کو نظر کے ساتھ پھر دل کی تلاش میں روانہ کیا۔ راستے میں حصار زہد پڑتا تھا۔ غمزے نے اس حصار کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ پھر ان دونوں نے پوستین پوش ترک درویشوں کا بھیس بدلا اور اپنی باتوں سے ناموس کو قلندر بنا دیا۔ یہ ناموس عقل کی مملکت میں ایک بڑا سردار تھا۔

لیکن توبہ کے سامنے نظر اور غمزے کی ایک نہیں چلی۔ یہ توبہ بڑا سخت جان سردار تھا۔ یہ غمزے کا نشان چھین کے شہنشاہ عقل کے سامنے لے گیا اور عقل نے اپنے بیٹے دل کو سمجھایا۔ بالآخر دل کو قائل کر دیا۔ اور دل ایک لشکر جرار لے کر اس ارادے سے روانہ ہوا کہ شہر دیدار کو مسخر کر لے۔ لیکن اب غمزے نے ایک نئی چال چلی۔ آہو کا

بھیس بدل کے اپنے ساتھ بہت سے آہوان ختن کو شریک کرلیا اور دل شکار کے شوق میں ان آہوؤں کے تعاقب میں روانہ ہوا اور اس طرح اپنے لشکر سے بچھڑ گیا۔ اب شہنشاہ عقل نے خود ایک بڑے لشکر کے ساتھ شہر دیدار کی تسخیر کا ارادہ کیا اور شہر دیدار کے قریب پہنچ گیا۔ اپنے شہر کو عقل کی زد میں پا کے شہزادی حسن نے اپنے باپ شہنشاہ عشق سے مدد مانگی اور عشق خونخوار کا مہیب لشکر دل کے لشکر کے مقابلے میں روانہ ہوا۔ زلف سرکش نے دل کی فوج پر شب خون مارا۔ ابروؤں نے کمان کڑی کی۔ مژگان نے تیر چلائے اور بالآخر خیال نے دل کو قید کرلیا۔ جب دل گرفتار ہوگیا تو عقل اور دل کی سپاہ کے قدم اکھڑ گئے۔ ادھر حسن نے دل گرفتار کو چاہ زندان میں گرفتار کردیا۔

شہزادی حسن اپنے گرفتار یعنی شہزادہ دل کی محبت میں گرفتار تھی۔ اس کی ایک سہیلی تھی وفا۔ اس کے ساتھ وہ گلزار کی سیر کو نکلی اور یہی وفا دل کو چاہ ذقن کی قید سے باغ آشنائی میں لے آئی۔ ادھر نظر آنکھوں میں آنسو بھر لایا اور شاہزادی حسن سے اس نے شہزادہ دل کی سفارش کی۔ حسن نے وفا سے مشورہ کیا۔ وفا تو یہ چاہتی تھی کہ حسن اور دل ایک دوسرے کے ہو جائیں لیکن ناز کا مشورہ تھا "خویش را مفروش ارزاں" ناز اور وفا میں بحث ہوتی رہی۔ بالآخر حسن نے خود ایک حل سوچا۔ حسن نے دل کو تبسم سے بے خود و بے ہوش کردیا اور پھر اپنے پہلو میں جگہ دی----

لیکن یہ وصال عارضی تھا۔ ابھی تک چشمہ آب حیواں دل کی نگاہوں سے دور تھا۔ اسی عالم میں دل پر ایک اور مصیبت پڑی۔ رقیب کی ایک بڑی ہی مکروہ صورت، مکروہ سیرت بیٹی تھی جس کا نام غیر تھا۔ وہ بھی دل پر عاشق تھی اور حسن سے جلتی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ایسی ساحرہ تھی جسے سحر سے صورت بدلنے میں کمال حاصل تھا۔ غیر نے ایک دن حسن کی صورت بنائی اور دل کو پھانسنے کی کوشش کی۔ اس کی اطلاع خیال نے حسن کو دی۔ اب حسن کے جلال کا عالم ہی اور تھا۔ دل نے غیر کے پہلو میں بیٹھ کر اس سے بے وفائی کی تھی۔ دل کو پھر قید کردیا گیا۔ اس مرتبہ چاہ ذقن میں نہیں بلکہ وادی عتاب میں۔ ادھر غیر جو فطرتاً "بدنہاد تھی" دل کے بھی درپے تھی - اس نے اپنے باپ رقیب سے دل کی شکایت کی اور رقیب نے دل اور اس کے رفیق نظر دونوں کو قلعہ ہجران میں قید کردیا جو بیابان فراق میں واقع ہے۔

لیکن غیر کی سازش کا حال شہزادی حسن پر آشکارا ہو ہی گیا۔ اب اسے ندامت ہوئی کہ ناحق اس نے دل کو اتنی سخت سزا دی اور اب دل کے فراق میں خود حسن کی حالت بگڑنے لگی۔ خیال نے حسن کا خط دل تک اور دل کا نامہ شوق حسن تک پہنچایا۔ صبر اور ہمت نے دونوں کو ڈھارس دی اور بالآخر ہمت نے حسن اور دل کی اس والہانہ محبت کی اطلاع شہنشاہ عشق کو دی۔ ہمت نے شہنشاہ عشق سے کہا کہ قدیم زمانے میں ایک شہنشاہ تھا جس کا نام فرد تھا۔ یہ شہنشاہ بڑا ہی عادل تھا۔ اس نے اپنی سلطنت کے دو ٹکڑے اپنے دو بیٹوں میں تقسیم کر دیئے۔ ان میں سے ایک مشرق کا تاجدار بنا' دوسرا مغرب کا۔ ان میں سے ایک بھائی کی نسل سے شہنشاہ عشق ہے اور دوسرے بھائی کی نسل سے شہنشاہ عقل۔

قائل ہو کے عشق نے اپنے ایک معتبر وزیر مہر کو عقل کے دربار روانہ کیا اور جب عقل اقلیم عشق میں پہنچا تو عشق نے اس کی بڑی خاطر تواضع کی اور اسے اپنی نیابت کی کرسی پر بٹھایا۔ یہ اس لئے کہ عشق کا مرتبہ اور عشق کی طاقت ہر حال میں عقل سے زیادہ ہے۔ پھر عشق نے ہمت کو بیابان فراق اور قلعہ ہجراں کی سمت روانہ کیا کہ وہ دل کو رقیب کے چنگل سے چھڑا لائے۔ جب ہمت دل کو اس قید سے چھڑا لایا تو شہر دیدار میں قامت نے دل کا استقبال کیا۔ بالآخر عشق اور عقل نے حسن اور دل کی شادی رچائی اور تب دل کو معلوم ہوا کہ چشمہ آب حیواں چشمہ دہن ہے اور پیار سے زندگی کی تجدید ہوتی رہتی ہے۔

شادی کے بعد جب دل گلشن رخسار کی سیر کو نکلا تو ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ یہ حضرت خضر علیہ السلام تھے۔ یہ آب حیواں کے چشمے کے کنارے تشریف رکھتے تھے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے دل کو اس طلسمات کا راز سمجھایا۔ یہ کہ دل ہی اصلی خزانہ ہے اور دوسری اشیاء طلسمات ہیں جو اس خزانے کی حفاظت کے لئے بنائی گئی ہیں۔ دل جان ہے اور تمام ذرات جسم ہیں۔ نظر فکر صواب ہے اور ہمت فیض راہ میں ہے۔۔۔۔۔۔ رقیب دیو سیرت دراصل نفس دوں ہے۔ غیر ابلیس لعین ہے۔ یہ وہی سانپ ہے جس نے حوا کو بہکایا اور جو گل گامش کا سدا بہار جوانی کا پودا چرا لے گیا۔

اور رہ گیا یہ چشمہ آب حیات' یہ چشمہ آب حیواں۔ یہ کیسا عجیب چشمہ ہے کہ

اس میں زندگی کھو بھی جاتی ہے مگر اس سے سیراب بھی ہوتی ہے۔ کبھی یہ سراب معلوم ہوتا ہے کبھی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے، کبھی اس کے کنارے سدا بہار جوانی کا پودا کھو جاتا ہے۔ اسی کنوئیں میں یوسف کو قید کی سزا ملتی ہے، اسی آئینے میں فارسی سس اپنا عکس دیکھ دیکھ کر ہلاک ہو جاتا ہے لیکن اسی سے زندگی ابلتی ہے اور زندگی کے دریا چاروں طرف جاتے ہیں۔ چاروں طرف اڈتے ہیں۔ اسی سے ابر اٹھتے ہیں اور چاروں کھونٹ زندگی کا مینہ برساتے ہیں۔ گل گامش فنا ہو جاتا ہے۔ یوسف کا حسن ایک دن باقی نہیں رہتا۔ فارسی سس کا عکس مٹ جاتا ہے اور صرف چمکدار سنگریزے باقی رہ جاتے ہیں لیکن انسان فنا نہیں ہوتا۔ ایک نسل کے بعد دوسری نسل۔ اسی چشمے کے فیضان سے انسان زندہ ہے۔ سب سے مقابلہ کرنے کے لئے---- سانپ سے، ابیلس سے، دیوتاؤں سے اور---- اس موذی سے جو اس کے اندر چھپا ہوا ہے۔

OO

موڈرن پبلشنگ ھاؤس، نئی دہلی-۲ کی پیش کش